WWW.PAKSOCIETY.COM
دل
ایک گلاب سا
پاک سوسائٹی
ڈا ایم سلطان فخر
WWW.PAKSOCIETY.COM

"افوہ امی یہ کیسا میس (MESS) پھیلا رکھا ہے آپ نے گھر میں۔" عنبر نے بھنائے ہوئے سے لہجے میں کہا۔
وہ کچھ دیر قبل ہی اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ اپنے تایا کے یہاں ایک تقریب میں شرکت کر کے واپس لوٹی تھی۔
"ہائیں کیا پھیلا رکھا ہے میں نے۔؟" اس کی امی خورشید جہاں نے تیوری پہ بل ڈال کر پوچھا۔
"اونہہ — یہ کاٹ کباڑ، یہ پھیلاوا۔ پہلے ہی اتنا کنجسٹڈ ہے یہ گھر۔اس پہ —"
"ہیں کیسا گھر ہے؟" خورشید جہاں نے کنجسٹڈ کا مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے پھر پوچھا۔
"افوہ۔آپ تو کچھ سمجھتی ہی نہیں امی۔میرا مطلب ہے یہ گھر کس قدر چھوٹا اور گھٹا گھٹا سا ہے۔ایک دم کبوتروں کی کابک کی طرح، اس پہ آپ نے اتنا کاٹ کباڑ بھر رکھا ہے۔"
عنبر نے ماں کو کنجسٹڈ کا مفہوم سمجھاتے ہوئے کہا۔
"اے لو خدا کی شان۔اسی گھر میں پیدا ہوئیں، پلی بڑھیں، پروان چڑھیں اور اب یہی گھر تمہیں کبوتروں کی کابک نظر آنے لگا۔ اے بچی یہی کیا کم شکر کی بات ہے کہ بری بھلی جیسی بھی ہے تمہیں عزت کی ایک چھت تو میسر ہے۔"
خورشید جہاں نے اس کی باتوں کو ناشکری پہ محمول کرتے ہوئے گویا ملامت سی کی۔
"خیر۔چھت تو وہ گھاس پھونس کی بھی ہوتی ہے امی جس کے نیچے ایک فقیر بھی عزت سے رہ لیتا ہے۔"
قائل ہونے کے بجائے ماں کی باتوں پر عنبر جل کر بولی۔
"اے آخر تمہارا مطلب کیا ہے ان باتوں سے؟" ماں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔
"یہی کہ جب ہم چھپّر تلے نہیں اسی سیمنٹڈ چھت کے نیچے رہتے ہیں تو ہمیں اپنے گھر کو کم از کم بنا سنوار کر تو رکھنا چاہیے۔"
"مگر یہ کام تو تمہارے کرنے کے ہیں بچی۔مجھ میں بھلا اتنی طاقت کہاں ہے۔میں تو کھانا ہی پکا دیتی ہوں تو یہی بہت ہوتا ہے۔"
"امی، میں صفائی ستھرائی یا جھاڑ پونچھ کا نہیں کہہ رہی۔یہ کام تو میں اور چھوٹی بھی کر لیتے ہیں۔" عنبر نے کہا۔
"کر لیتی ہو تو پھر مجھ سے شکوہ کیوں کر رہی ہو۔لے ہاں خواہ مخواہ آتے ہی میرے سر ہو گئیں۔جاؤ پہلے کپڑے بدلو جا کر۔"

ماں نے عنبر کی بے تکی باتوں پر جھلا کر کہا۔

"کپڑے بھی بدل لوں گی امی۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اس چھوٹے سے برآمدے میں یہ جو آپ نے سارے زمانے کا کاٹھ کباڑ بھر رکھا ہے یعنی یہ جست کا بڑا صندوق۔ اس پر آپ کے یہ ڈیکوریشن پیسز۔ یہ صراحی۔ گلاس۔ ناشتے دان۔ کولر جگ اور یہ برتن شرتن وغیرہ۔ اگر یہ ساری فالتو اور واہیات چیزیں یہاں سے ہٹوا دیں تو کم از کم یہاں بیٹھنے کی تھوڑی سی گنجائش تو نکل آئے گی۔"

"ہاں کم از کم یہ تخت ایک طرف کر کے کچھ مونڈھے کرسیاں ہی پڑ جائیں گی۔" چھوٹی نے جو اندر جاتے جاتے ماں اور بہن کی گفتگو سننے کمرے کی دہلیز پر ہی رک گئی تھی گویا عنبر کی بات کی تائید میں کہا۔

"ہاں امی! یہ بیٹھک میں جو اتنی الٹی سیدھی چیزیں پڑی ہیں یہ یہاں برآمدے میں آجائیں گی اور بیٹھک میں چند نئی چیزوں کا اضافہ ہوجائے گا۔" عنبر نے گویا بہن کی شہہ پا کر دل کی بات کہی۔

"اے بقول تمہارے کبوتروں کی کابک کی طرح ہے یہ گھر تو پھر کیا میں ساری چیزیں اپنے سر پہ اٹھائے اٹھائے پھرا کروں گی۔ کوئی اور جگہ ہے ان چیزوں کے رکھنے کی بھلا۔ کمروں میں تو تم کچھ رکھوانے ہی نہیں دیتیں۔"

خورشید جہاں دونوں بیٹیوں کی باتیں سن کر جلے کٹے انداز میں بولیں۔

"مگر امی۔ کمروں میں بھلا کون سا قیمتی سامان بھرا ہوا ہے۔ گنتی کی چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، دو پرانے بیڈ، ایک چوکی اور رائٹنگ ٹیبل۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

چھوٹی نے تمسخرانہ انداز میں ہنس کر کہا۔

"ہاں تو اور ہو بھی کیا سکتا ہے ہم غریبوں کے پاس۔ اصل میں ہر چیز کے لیے یہ چاہیے یہ۔ جو ہماری قسمتوں میں ہے ہی نہیں۔"

خورشید جہاں نے انگوٹھے کو انگلیٔ شہادت پہ مارتے ہوئے گویا پیسے کا اشارہ کیا۔

"خیر میں اس بات کو نہیں مانتی امی۔ پیسہ تو انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے جسے ہر صورت میں ہمارے پاس ہونا چاہیے تھا۔"

"مگر جب تقدیر میں نہیں تھا تو کہاں سے آتا بچی!" خورشید جہاں نے یاسیت سے کہا۔

"خیر تقدیر کا حال تو صرف خدا ہی کو معلوم ہوتا ہے۔ البتہ سننے میں یہی آیا ہے کہ انسان خود اپنی تقدیر بناتا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ ساری باتیں تو ابا کے سوچنے کی تھیں۔ مگر شاید انہیں ہمارے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا خیال ہی نہیں آیا۔" عنبر نے متاسف لہجے میں آخری فقرہ کہا۔

"اے لو اب مرے ہوئے باپ کو بھی الہانے دینے لگیں۔ ارے انہی فکروں نے تو خدا انہیں غریق رحمت کرے ایک دن بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ بے چارے نے بڑے ہاتھ پیر مارے، بڑی بھاگ دوڑ کی مگر افسوس کہ تقدیر نے ان کا ساتھ دیا نہ عمر نے ہی وفا کی۔"

شوہر کا خیال آتے ہی خورشید جہاں ایک دم ہی ملول ہو کر بولیں۔

"لیکن امی: ابا کا انتقال ہمارے بچپنے میں تو نہیں ہوا۔ صرف چار برس پہلے ہی تو ہوا ہے۔ میری عمر اس وقت سترہ سال کی تھی اور یہ چھوٹی زیادہ سے زیادہ چودہ برس کی ہوگی۔ البتہ عذیر ضرور چھوٹا تھا۔"

"ہاں مگر۔۔۔"

ماں نے کچھ کہنا چاہا تو عنبر نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"اگر مگر کیا امی۔ کم از کم میں نے تو ابا کو کبھی بھاگ دوڑ کرتے نہیں دیکھا۔ ان کا تو یہی معمول تھا کہ ملا کی دوڑ مسجد۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ رات گئے گھر لوٹتے تھے۔ وہ بھی شاید گھر کی بوریت کی وجہ سے۔"

"لے بس خاموش رہو گستاخ لڑکی۔ خبردار جو اب اپنے باپ کے متعلق کچھ کہا۔ لو بھلا۔ مرے ہوئے باپ کو بھی نہیں چھوڑا۔ حد ہو گئی بے ادبی کی۔"

خورشید جہاں عنبر کی بدتمیزی برداشت نہ کر سکیں۔ انہوں نے اسے بری طرح ڈانٹا۔

"مگر اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے امی! میں تو حالات کی ابتری کے پیش نظر کہہ رہی تھی۔"

ماں کے ڈانٹنے پر عنبر نے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی مگر ماں کو غصہ آ گیا تھا۔ انہوں نے اس کی بات سنی ہی نہیں سخت برہمی سے بولیں۔

"اے بس رہنے بھی دو۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہی تھیں۔ اصل میں تو بڑے بھیا کے گھر کے شاہانہ کر و فر دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں ہوا بھر گئی ہے جبھی تو تمہیں یہ اپنا چھوٹا سا عزت کا ٹھکانہ کبوتروں بلکہ چیل کی کال کوٹھری لگنے لگا ہے۔ کال کوٹھری۔"

"خیر کال کوٹھری تو کیا۔ اگر سچ پوچھیں تو میرا بھی کچھ یہی حال ہوتا ہے جیسا آپا کا ہو رہا ہے۔ جب میں وہاں سے آتی ہوں تو اس گھر کی ویرانی کو دیکھ کر کبھی کبھی تو۔۔۔ جی یہی چاہتا ہے کہ واپس بھاگ جاؤں۔"

چھوٹی نے جو ابھی تک وہیں کھڑی تھی گویا دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس کی بہن جو ہوئیں۔۔۔ وہی مثل ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ پھر تم اس سے پیچھے کیوں رہنے لگیں لیکن یہ بڑی خرابی کی بات ہے چھوٹی۔ انسان کو اپنی حیثیت اور اوقات سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ بھلا کہاں ہم اور کہاں بڑے بھیا۔ ہم تو اگر مر کر بھی دوبارہ پیدا ہو جائیں تو ان کی برابری نہیں کر سکتے۔"

خورشید جہاں نے جن کے نزدیک عنبر سے زیادہ چھوٹی سمجھدار تھی سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا۔

"کیوں، تایا ابا میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں امی۔ وہ ابا کے بڑے بھائی ہیں۔ ہمارا سگا خون ہیں ہم میں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف حیثیت کا تو ہے تو حیثیت بھی بنانے ہی سے بنتی ہے۔ ابا کی طرح اینالائزر کی جاب پر مدتوں سر کھپانے سے نہیں۔"

وہ جو ماں کے ڈانٹنے پہ جلی بھنی بیٹھی تھی اس نے پھر مرحوم باپ کو ہی نشانہ بنایا۔

"ارے پھر وہی باپ کا ذکر ارے وہ غریب تو تمہارے لیے مزدوری کرنے سے بھی نہیں چوکا۔ ڈیوٹی بھگتا کر محنت مزدوری کرنے جاتا تھا۔ اسی لیے گھر بھی دیر سے لوٹتا تھا۔"

جس بات کا ذکر وہ بچوں کے سامنے کرنا نہیں چاہتی تھیں بیٹی کی جلی کٹی سن کر آخر وہ زبان پر لے ہی آئیں لیکن عنبر کو پھر بھی یقین نہ آیا۔

"مگر فائدہ کیا ہوا امی۔ ہم تو جیسے تھے ویسے کے ویسے ہی رہے۔"

"ہلے ہائے کیسی باتیں کرتی ہے تو بچی۔ انہوں نے محنت کی کمائی کی ایک ایک پائی جوڑ کر یہ اوپر کی منزل تعمیر کرائی۔ پھر اس میں یہ کرائے دار بسائے تاکہ تھوڑی سی ہی سہی ایک لگی بندھی رقم تو ہر ماہ آتی رہے۔ کیا یہ تمہارے فائدے کی بات نہیں ہے؟"

خورشید جہاں نے بیٹی کی باتوں سے عاجز ہو کر اپنی پیشانی پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیے امی! کرائے دار بسانے سے ہمیں ایسا کیا حاصل ہو گیا۔ بڑی مشکلوں سے کہہ سن کر اب ڈیڑھ سو روپے ماہوار دے رہے ہیں یہ کرائے دار ہمیں۔ ڈھائی سو ہمیں ابا کی پنشن کے ملتے ہیں بھلا چار سو روپے میں بھی چار جانیں پل سکتی ہیں آج کے اس مہنگائی کے دور میں۔"

عنبر نے گویا ماں کو اپنی حیثیت جتائی۔

"اونہہ! اس پر آپ چلی ہیں تایا ابا کا مقابلہ کرنے۔ بقول امی کہاں وہ اور کہاں ہم۔"

ماں کے اس قدر منہ لگتے دیکھ کر چھوٹی نے گویا بڑی بہن پر طنز کیا۔

"خیر، یہ چھوٹائی بڑائی کا فرق بھی خود ہم نے ہی ڈالا ہے۔ ورنہ ہمارے ابا شروع ہی سے کام پر لگے رہتے کچھ بن کر دکھاتے تو آج تمہیں اتنی حسرت سے یہ سب نہ کہنا پڑتا۔" عنبر پھر باپ کا ذکر بیچ میں لائی تو خورشید جہاں تنک کر بولیں۔

"لے بس اب زیادہ میرا منہ کھلواؤ عنبر۔ تمہارے تایا کے امیر بن جانے کا مجھے سارا کچا چٹھا معلوم ہے۔ پہلے کارپوریشن میں ادنیٰ سی ملازمت کرتے تھے۔ خوب دل کھول کر دونوں دونوں ہاتھوں سے رشوت کا پیسہ بٹورا۔ پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا مگر چونکہ پوٹا تر تھا اس لیے خوب کھلا پلا کر کسی طرح مقدمے سے گلو خلاصی حاصل کر لی اور پھر سفارشوں کے ذریعے کسٹم کے محکمے میں کسی طرح ملازمت

حاصل کرلی۔ وہاں بھی ہیرا پھیری سے نہ گئے۔ بلکہ وہاں تو ان کی چاندی ہی چاندی ہوگئی۔ اتنا بنالیا کہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر اپنا ذاتی بزنس شروع کردیا اور اب سیٹھ ساہوکار کہلانے لگے۔ ورنہ تعلیم والیم کے نام پہ تو ٹھینگا ہیں ٹھینگا۔ دس جماعت بھی پاس نہیں۔"

"اچھا، کیا واقعی امی۔"

چھوٹی کو جیسے یقین نہ آیا۔

"ہاں تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں یا بہتان باندھ رہی ہوں ان پر۔ ارے یہ وہی بڑے بھیا تو ہیں جو اسی دو کمروں کے تنگ سے مکان میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں پلے بڑھے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی شادی بھی اسی گھر میں ہوئی تھی۔ سوائے چھوٹے رضوان کے باقی چاروں اولادیں بھی یہیں بیٹھک والے کمرے میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ چھوٹی تو خیر گود میں تھی مگر تم تو پانچ برس کی تھیں عنبر! کیا تمہیں یاد نہیں؟"

ماں نے چھوٹی سے بات کرتے کرتے اسے مخاطب کرکے پوچھا تو کچھ کچھ یاد ہونے کے باوجود اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"نہیں، مجھے تو بالکل یاد نہیں۔"

"خیر، نہ ہوگا۔ مگر مجھے تو خوب اچھی طرح یاد ہے۔ اس دوسرے کمرے میں جس میں آج کل ہم سوتے ہیں تمہارے دادا دادی اور پھوپھی رہا کرتے تھے۔ اور بیٹھک میں تمہارے باپ اور تایا۔ سنا ہے جب بڑے بھیا کی شادی ہوئی اور وہ تمہاری تائی کو بیاہ کر گھر لائے تو بھاوج کا لحاظ کرکے تمہارے باوا اپنے بوریے بستر سمیت یہاں برآمدے میں آپڑے تھے۔ میں تو ریحان اور شمسہ کی ولادت کے بعد جو اسی بیٹھک میں پیدا ہوئے تھے بیاہ کر لائی گئی تھی۔ پھر یوں ہوا۔"

وہ مزید کچھ کہتے کہتے ہنسیں۔ پھر بولیں۔

"میں بیاہ کر آئی تو بیٹھک کے بیچوں بیچ کھدر کا پردہ ڈال دیا گیا۔ بس اسی پردے کے اِس طرف اور اُس طرف ان کے یہاں بھی بچے پیدا ہوتے رہے اور ہمارے یہاں بھی۔"

ماں کے اِس طرف اور اُس طرف کہنے پر چھوٹی کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ عنبر اسے گھور کر بولی۔

"اس میں اس قدر کھی کھی کرنے کی کیا ضرورت ہے چھوٹی۔ ایسے واہیات قسم کے گھروں میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن اب اگر ہم کسی سے یہ کہیں بلکہ لاکھ یقین دلانے کی کوشش بھی کریں کہ تایا ابو ایسے تھے ویسے تھے تو کوئی بھی ہماری باتوں پہ یقین نہیں کرے گا بلکہ یہی سمجھے گا کہ ہم حسد جلن میں ان کے خلاف زہرافشانی کررہے ہیں۔"

"ہاں، یہ تو آپ سچ ہی کہہ رہی ہیں آپا۔" چھوٹی نے بہن کی بات پر قائل ہوکر کہا۔

"ہاں اور کیا۔ اصل میں تو آج کل صرف اور صرف حیثیت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ تایا ابو نے اتنی اونچی حیثیت بنالی ہے کہ ان کا کچا چٹھا جاننے والے بھی اب انہی کے گُن گاتے ہیں۔ اور اگر تایا ابو نے رشوت بھی لی تو کچھ برا تو نہیں کیا۔ میرا مطلب ہے اپنی اولاد کا مستقبل تو سنوار دیا۔ ابا کی طرح فکروں میں گھل گھل کر جان تو نہیں گنوائی۔"

عنبر نے پھر مرحوم باپ کو کریدا تو خورشید جہاں کے تو جیسے پتنگے ہی لگ گئے۔

"اے خدا سے ڈر لڑکی! ایک تو مرے ہوئے باپ کو ایک ساں بُرا بھلا کہے جارہی ہے اس پر گویا تیری نظر میں حرام حلال سب برابر ہے۔ شاید تیرے ان ہی خیالات کی وجہ سے قدرت نے تجھے ہر شے سے محروم کررکھا ہے۔"

"جی نہیں، خیالات کی وجہ سے نہیں بلکہ مفلسی کی وجہ سے۔ ان بدترین حالات کی وجہ سے جن کے ہم شروع سے شکار رہے ہیں، ہمیں ہر شے سے محروم کررکھا ہے۔" وہ بھی ماں کی بات پر چمک کر بولی۔

"بس اب اپنی اس تولہ بھر لگو کو تالو سے ہی لگا لو تو بہتر ہے۔ لو بھلا غضب خدا کا اُس بے چارے شریف اور غیور باپ کو بار بار الزام دے رہی ہے جس نے ناجائز کمائی اپنے اوپر حرام کرلی تھی۔ جی جان سے محنت کی۔ ٹھیلہ کھینچ کھینچ کر اتنی مشقت اٹھائی کہ پھیپھڑے بے کار ہوگئے۔ مگر بڑے بھائی کے سامنے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اور خدا سمجھے اس بڑے بھائی سے کبھی پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھائی تم کس طرح گزربسر کرتے ہو۔ مجال ہے جو ایک دھیلے سے بھی مدد کی ہو۔ مگر یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ ورنہ تمہارا غیور باپ کبھی اس سے ایک دمڑی بھی نہ لیتا کہ ساری کمائی تو۔۔۔ توبہ توبہ حرام کی ہوتی تھی۔"

"اف پھر وہی حرام حرام۔ اب یہ تو میں مان نہیں سکتی کہ سارا پیسہ ہی حرام کا ہوتا ہوگا۔ اصل میں یہ تو کچھ دنیا کا دستور سا بن گیا ہے کہ لوگ جسے ترقی کرتے دیکھتے ہیں ایسے ہی الزامات کے ساتھ اس پہ حرام کی کمائی کا لیبل لگا دیتے ہیں۔"

عنبر نے ماں کی کسی بات کو گردانا ہی نہیں اور جلے کٹے انداز میں بولی تو ماں کو بھی تاؤ آگیا۔

"اچھا تو گویا میں جھوٹی لپاٹن ہوں۔ تمہارے تایا پر بہتان باندھ رہی ہوں۔ حرام کی کمائی کا لیبل لگا رہی ہوں۔ یہی مطلب ہے نا تیرا۔"

"نہیں امی! آپ کو جھوٹا سمجھنے والا تو کوئی کمین اور ذلیل ہی ہوگا۔" چھوٹی جس کے لیے بڑی بہن کی باتیں اب ناقابلِ برداشت ہوگئی تھیں، تنک کر بولی۔

"لیکن خدانخواستہ میں آپ کو جھوٹا تو نہیں کہہ رہی۔ میں تو جو حقیقت ہے وہی بیان کررہی ہوں۔"

چھوٹی کی بات پر اندر ہی اندر تلملا کر عنبر نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

"لے ہٹو۔ کیا خاک حقیقت بیان کررہی تھیں۔ یہ کہو کہ منہ در منہ مجھے تو برا بھلا کہہ نہیں سکتیں اس لیے تم نے اپنے دل کا سارا غبار مرے ہوئے باپ پر نکالا۔"

"میں بتاؤں امی۔ یہ آپا کا ناریل آج اتنا کیوں چٹخ رہا ہے۔؟"

چھوٹی نے معنی خیز شوخی سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے ماں سے کہا تو وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر بولی۔

"تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو لُتری کہیں کی۔ جاؤ دفعان ہوجاؤ یہاں سے۔"

"لے لو۔ لے لو وہی مثل ہوگئی کہ کمہار پر بس نہ چلا تو گدھیا کے کان اینٹھے۔ اے اس غریب کو کیوں کھانے کو دوڑ رہی ہو۔ خود ہی دفعان کیوں نہیں ہوجاتیں یہاں سے۔"

ماں نے اپنے سامنے اس کے چھوٹی بہن کو لتاڑنے پہ الٹا اسے پھٹکارا۔

"ہیں ہیں خیر تو ہے پھوپھی جان یہ آپ کس کو اس بری طرح ڈانٹ رہی ہیں۔ کہیں کوئی ملازمہ ولازمہ تو نہیں رکھ لی آپ نے!"

اچانک سعد نے اندر سے وارد ہوکر پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔ تو جہاں اس کے اچانک نزول سے عنبر شرم و خجالت سے گڑ سی گئی وہاں چھوٹی بھی بلش ہوکر رہ گئی۔ البتہ خورشید جہاں جو غصے میں بھری بیٹھی تھیں جلے کٹے انداز میں بولیں۔

"اے میری کیا حیثیت کیا اوقات جو ملازمہ رکھوں گی۔ وہ تو آج اس عنبر پہ کچھ جنون سا سوار ہوگیا ہے۔ جب سے بڑے بھیا کے یہاں سے آئی ہے بلا کی طرح میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ یہاں برآمدے میں اتنا کاٹھ کباڑ پھیلا رکھا ہے۔ لو بھلا اب کیا یہ ساری چیزیں میں اپنے سر پہ رکھ لوں۔"

"مگر امی! آپا نے کوئی ایسی غلط بات تو نہیں کہی۔ یہ جو برآمدے میں الٹی سیدھی چیزیں رکھی ہیں انہیں کہیں اور بھی تو رکھا جاسکتا ہے۔"

سعد کے سامنے ماں نے اپنی سادگی میں ایک نجی بات بتادی تھی۔ اس لیے چھوٹی نے اپنی جھینپ مٹانے کی غرض سے کہا۔

"مگر کہاں رکھو۔ کون سی ایسی فالتو جگہ ہے اس گھر میں۔ وہی مثل ہے کہ چوہا بل میں سماتا نہیں اور دم سے باندھا چھاج۔"

خورشید جہاں نے چمک کر کہا۔

"وہ جو غسل خانے کے پاس چھوٹی سی کوٹھری ہے، اس میں رکھوا دیجیے نا۔"

چھوٹی نے زچ ہونے کے سے انداز میں کہا۔

"ہائیں کوٹھری میں!"

خورشید جہاں یوں بولیں جیسے چھوٹی نے کوٹھری کا کہہ کر کوئی بہت انہونی بات کہہ دی ہو۔

"جی ہاں امی۔ ویسے بھی اس کوٹھری میں خاصی گنجائش موجود ہے۔ اس میں جو بے کار چیزیں پڑی ہیں اگر ان کو ہٹا کر اس کو صاف کیا جائے تو یہ صندوق وغیرہ آرام سے وہاں رکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح اس برآمدے میں تو کم از کم کچھ تبدیلی آجائے گی۔"

چھوٹی نے ان کے سوال کا کوئی نوٹس لیے بغیر کہا۔

"ہیں۔ کیسی تبدیلی؟" انہوں نے پہلو بدل کر پوچھا۔
"مطلب۔ کچھ نئی چیزیں۔ یعنی فرنیچر وغیرہ۔"
چھوٹی نے سعد کی وجہ سے خواہ مخواہ ہی فرنیچر کی ڈینگ ماری۔
"اے کیسا فرنیچر۔ ایک پیڑھی تو خریدنے کے قابل نہیں ہو اور فرنیچر۔"
"مگر کیا مضائقہ ہے پھپھو جان۔ اگر یہاں سے یہ الٹی سیدھی چیزیں ہٹادی جائیں تو کم از کم یہ جگہ صاف ستھری تو نظر آئے گی۔ یوں بھی کوئی گھر اگر چوہے دان کے ہی برابر بھی ہو اسے سلیقے سے سجایا سنوارا جائے تو دیکھنے والے پر اچھا تاثر ہی چھوڑتا ہے۔"
سعد نے خورشید جہاں کو اتنی زیادہ سادگی برتتے دیکھ کر گویا دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ گو اس نے یہ بات چھوٹی کی بات کی تائید میں ہی کہی تھی مگر عنبر جو اس کے اچانک وارد ہو جانے سے پہلے ہی پیچ و تاب کھا رہی تھی اور محض اس وجہ سے وہاں جمی کھڑی تھی کہ سعد نے خورشید جہاں کو اسے پھٹکارتے ہوئے سن لیا تھا اور سخت شرمندگی محسوس کرنے کے باوجود اسے دیکھتے ہی وہاں سے جانے میں اپنی ہتک محسوس کر رہی تھی۔ سعد کے چوہے دان کہنے پر تلملا ہی اٹھی اور لڑنے کے انداز میں بولی۔

"اگر آپ کو ہمارا گھر چوہے دان لگتا ہے تو پھر آپ یہاں آنے کی زحمت ہی کیوں گوارا کرتے ہیں۔"
اور وہ جو اپنی بات کا اس قدر غلط مفہوم لینے پر گڑبڑا سا گیا تھا خجل سے انداز میں صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔
"ارے نہیں۔ آپ نے میری بات کا بہت غلط مطلب لیا ورنہ میں پھپھو جان کے چوہے کی مثال دینے پر کہہ رہا تھا۔"
"بس بس اب زیادہ مکھن نہ لگائیے سعد بھائی۔ من خوب می شناسم۔"
باقی فقرہ چھوٹی نے ٹھوڑی پر ڈاڑھی کا اشارہ کرتے ہوئے محض بہن کی اتنی سخت بات کا تاثر توڑنے کی غرض سے کہا۔ تو خورشید جہاں جنہیں عنبر کا اندازِ تخاطب بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ یوں بھی ان کے خیال میں وہ دن بدن منہ زور اور خودسر ہوتی جا رہی تھی انہوں نے اس کا غصہ چھوٹی پر اتارا۔
"کیا خوب می شناسم! بے ہودہ کہیں کی۔ تمہیں تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ بس جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہو۔ یہ غریب بچہ کوئی دنیا سے فالتو ہے کیا جو اتنی دور سے تمہارے بھائی کو پڑھانے آتا ہے۔ چلو اٹھو یہاں سے اور جا کر کپڑے بدلو۔ جب سے آئی ہو انہی کپڑوں میں بیٹھی ہو مسل دسل گئے تو۔"
اور چھوٹی جس پر ماں کی باتوں سے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا اپنی جھینپ مٹانے کو بگڑے بگڑے انداز میں بولی
"مسل دسل بھی گئے تو کوئی کرائے کے تو ہیں نہیں امی۔ اپنے ہی تو ہیں۔"
"اپنے بھی ہیں تب بھی احتیاط سے پہننے چاہئیں۔ بار بار دھلنے سے کپڑا اپنی آب کھو دیتا ہے۔ اور یہ تو تمہارے آنے جانے کے کپڑے ہیں۔ جاؤ جلدی سے بدل کر سعد کے لیے چائے بنا کر لے آؤ۔"
ماں کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے چھوٹی کو خواہ مخواہ ہی ڈانٹ دیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے لہجے میں تھوڑی سی نرمی پیدا کر کے کہا تو چھوٹی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر اندر چل دی۔ جب کہ عنبر تو تخت پر پڑا اپنا پرس اٹھا کر غڑاپ سے اندر کمرے میں غروب ہو چکی تھی۔
سعد اس کے لیے سخت ناپسندیدہ شخصیت بن کر رہ گیا تھا۔ اور وہ تو پہلے ہی اپنے گھر میں اس کی آمد و رفت کی روادار نہیں تھی۔ اس پر وہ اکثر و بیشتر ایسے موقعوں پر نازل ہوتا تھا جب یہ تینوں ماں بیٹیاں کسی خالص نجی قسم کے گھریلو مسئلے میں الجھی ہوئی ہوتیں اور وہ ان کے معاملات میں ٹانگ اڑانے بیٹھ جاتا۔ اس پر مستزاد ستم بالائے ستم یہ ہوتا کہ خود اس کی والدہ اس سے مشورہ طلب کرنے بیٹھ جاتیں۔ جب کہ ان کا سعد سے کوئی رشتہ بھی نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ اسے اپنا رشتہ دار کہتی تھیں۔ مگر جیسا دور پرے کا رشتہ وہ ظاہر کرتی تھیں عنبر ایسے رشتے اور رشتے داری کو بالکل مانتی ہی نہیں تھی۔ ابا کے دادا کے چچازاد بھائی کا پوتا ہوتا تھا سعد۔ بھلا یہ بھی کوئی رشتہ ہوا۔ وہ سوچتی۔ اس پر وہ اس کی ممانی کی سگی تایازاد بہن کا بیٹا بھی تھا اور چونکہ ممانی کے بچے خورشید جہاں کو پھپھو جان کہتے تھے اسی نسبت سے سعد بھی انہیں پھپھو جان ہی کہتا تھا۔ اصل میں

سعد کے والد برسوں پہلے ملتان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال بھی سعد کی صغر سنی میں ہو گیا تھا اس لیے سعد ایک طرح سے اپنے ددھیال والوں سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اب عرصے بعد کراچی آیا تھا تو سب سے ملاقات ہوئی تھی خورشید جہاں اور ان کے بچوں کی ملاقات بھی اس سے بہت اتفاقی طور پر ہوئی تھی۔
خورشید جہاں دونوں بیٹیوں اور بیٹے سمیت بہت دن بعد عید ملنے اپنے جیٹھ شاہنواز خان کے ہاں گئیں تو سعد بھی وہیں موجود تھا۔ خورشید جہاں چونکہ پردہ کرتی تھیں اس لیے ایک اجنبی صورت کے لڑکے کو جیٹھ جٹھانی وغیرہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیکھ کر واپس پلٹنے لگیں تو شاہنواز نے کہا۔
"ارے بھئی آؤ خورشید۔ اس سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو اپنے اکرام بھائی کا بیٹا سعد ہے۔ وہی اکرام بھائی جو تمہاری بھابی کلثوم کا تایازاد بہنوئی بھی تھا۔ تمہارا تو اس سے دوہرا رشتہ ہوتا ہے۔"
جیٹھ کے پکارنے اور پھر تعارف کرانے پر خورشید جہاں واپس جاتے جاتے لوٹ آئیں۔ سعد نے کھڑے ہو کر ادب سے انہیں سلام کیا اور انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ فوراً ہی اپنا بٹوہ کھول کر پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔
"لو بیٹا! یہ تمہاری عیدی ہے۔"
اتنے بڑے لڑکے کو عیدی کے طور پر پانچ روپے کی حقیر رقم دینے پر خورشید جہاں کی جٹھانی خالدہ خانم نے استہزائی سے انداز میں ہنس کر شوہر کی طرف دیکھا تو جواب میں شاہنواز خان انہیں گھور کر رہ گئے۔ اور سعد کو بھی جو پانچ کا نوٹ خورشید جہاں کو لوٹانا چاہ رہا تھا۔ خالدہ خانم کی یہ حرکت گراں گزری۔ اس نے پانچ کا نوٹ واپس کرنے کے بجائے خورشید جہاں کا دل رکھنے کو انہیں آداب کہتے ہوئے وہ نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ عنبر اور چھوٹی بھی ماں کے پیچھے ہی کھڑی تھیں۔ خورشید جہاں نے ساتھ کے ساتھ اس کا تعارف ان دونوں سے بھی کرا دیا۔
عنبر نے اس سمے آسمانی رنگ کا ریشمی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔
کانوں میں نازک طلائی آویزے
صندلی سی کلائیوں میں آسمانی رنگ کی کانچ کی چوڑیاں۔
اس نے اپنے لمبے اور گھنے بالوں کی چوٹی بائیں جانب سینے پر ڈال رکھی تھی
اور بس۔
کوئی میک اپ کیا تھا نہ کسی قسم کی ٹیپ ٹاپ۔
اس کی رنگت بہن اور بھائی سے بہت صاف تھی۔
اُجلی اُجلی سی۔
اس نے اٹھان بھی اچھی پائی تھی۔
اس کی اداؤں میں تمکنت بھی تھی وقار بھی
مزاج میں طنطنہ بھی بہت تھا اور انداز میں ایک لیادیا پن
گو وہ زیادہ وہاں نہیں رکی تھی
بلکہ اپنی چچازاد بہنوں کے پاس اندر چلی گئی تھی۔ اس کے باوجود
اس لمحاتی سی پہلی ملاقات میں ہی وہ سعد کے دل کو ایسی بھائی تھی کہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بار بار اسے دیکھے۔
اس سے باتیں کرے۔
کہ وہ تھی بھی اپنے خاندان میں یکتا
خورشید جہاں کو مدتوں بعد کوئی رشتے دار ملا تھا اس لیے عزیز کے ساتھ وہ اس کے پاس جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ ایک تسلسل کے ساتھ اس سے باتیں کیے جا رہی تھیں۔ جب تک دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا اس وقت تک انہوں نے سعد کے والد اور والدہ کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔

پھر کھانا ختم ہوا تو تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد خورشید جہاں نے واپسی کا قصد کیا۔ دونوں بیٹیاں ان کے پاس آگئی تھیں۔ عنبر نے اس خیال سے کہ اب کہیں وہ سعد کو اپنے گھر آنے کی دعوت نہ دے بیٹھیں پیش بندی کے طور پر آہستہ سے ان سے کہا۔

"اب کہیں اپنے ان نام نہاد بھتیجے کو اپنے پھٹیچر سے گھر میں آنے کی دعوت نہ دے بیٹھیے گا۔"

تو سادہ لوح ماں آہستہ سے جواب دینے کے بجائے ہنستے ہوئے انداز میں زور سے بولیں۔

"لو بھلا یہ بےچارہ ہم سے ملنے آئے گا ہمارے مکان سے تو نہیں۔"

اور پھر عنبر کے ہاتھ دبانے کے باوجود سعد سے مخاطب ہو کر بولیں

"اے بیٹا اب یہ نہ کرنا کہ یہاں ملنے کے بعد ہمیں بھول ہی جاؤ۔ ہم تمہاری حیثیت کے تو نہیں مگر تم ہمارے غریب خانے پر ضرور آنا۔"

"لیجیے پھپھو جان آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ رشتے داری میں حیثیت وحیثیت کا کیا سوال۔ میں ان شاء اللہ کسی دن ضرور آؤں گا۔"

چونکہ سعد نے خورشید جہاں کی بات سن لی تھی اس لیے عنبر کے خیال میں اس نے اس قدر انکسار سے کام لیا تھا۔

"مگر کسی دن کیا آپ تو پرسوں آجایئے۔ کیونکہ پرسوں میری چھٹی ہوگی۔" عذیر نے کہا جو اتنی سی دیر میں سعد سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ عنبر کو اس کا لہجہ خوشامدانہ سا لگا۔ اس نے فوراً ہی اسے گھرکا۔

"اب اس قدر بھی کسی کے سر نہیں ہوتے۔ تم تو بس انگلی پکڑتے پہنچا پکڑنے کی کوشش کرتے ہو۔"

"ارے نہیں، یہ عذیر تو بڑا پیارا کزن ثابت ہوا ہے اور آپ سے مل کر بھی بڑی مسرت ہوئی ہے مجھے۔" سعد نے اسے مخاطب کر کے گویا اس سے بات کرنے کی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کی تو اس کے بجائے چھوٹی نے بہت اٹھلا کر کہا۔

"جی ہاں جی ہاں اور مجھ سے مل کر تو کوفت کے سوا آپ کو کچھ حاصل ہی نہ ہوا ہوگا۔"

چھوٹی نے تو چھچھورپن کی انتہا ہی کر دی کہ بات بھی کہی تو ایسے دانت نکال کر جیسے اس کی خوشامد کر رہی ہو۔ عنبر اندر ہی اندر جل بھن کر رہ گئی۔ بلکہ دوسرے معنوں میں خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

یوں بھی اسے ماں کے ساتھ کھڑے ہو کر سعد سے باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے تایا، تائی اور چچازاد بھی وہیں موجود تھے اس لیے وہ جلد جلد سب کو سلام دعا کر کے جلدی سے باہر آگئی تھی۔

سعد اپنے چہرے بشرے سے ڈیسنٹ ہی نہیں خاصا باحیثیت لگ رہا تھا۔ اس نے آف وہائٹ شلوار سوٹ پر آف وہائٹ ہی قیمتی واسکٹ زیب تن کر رکھی تھی۔

کلین شیو۔

تر و تازہ چہرے پر سیاہ چمکیلی آنکھیں

چوڑی پیشانی۔

بڑی نفاست سے سنوارے ہوئے خمیدہ سے بال

کھڑی کھڑی سی ناک اور متبسم سا دہانہ

جیسے بس اس کے چہرے کو شگفتگی کے سانچے میں ڈھالا گیا ہو۔

اونچا اونچا قد مگر دبلا پتلا۔

کھلتی ہوئی گندمی رنگت

مجموعی اعتبار سے وہ خاصا پرکشش انسان تھا۔

گو اپنے لیے اس کی آنکھوں سے ہویدا پسندیدگی کو عنبر نے ایک ہی نگاہ میں بھانپ لیا تھا مگر اپنے تایا نادر ریحان کے سامنے ایک تو اسے کوئی جچتا ہی نہ تھا۔ دوسرے کم مائیگی کے کمپلیکس یا احساس نے اسے کچھ اس بری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ وہ اس لمحاتی ملاقات میں ہی سعد سے خار کھانے لگی تھی۔

دوسرے معنوں میں وہ اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ اسے تو ماں کی اس بات پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا کہ اس کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے سعد کو گھر آنے کی دعوت کیوں دی۔ تایا نے ان چاروں کو اپنی کار میں ان کے گھر ڈراپ کرا دیا تھا۔ ڈرائیور کی موجودگی کی وجہ سے تمام راستے وہ خاموش بیٹھی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی رہی تھی۔ مگر گھر پہنچتے ہی اس نے

ماں کی اس حرکت پر بڑا واویلا مچایا تھا۔

"آخر کیا ضرورت تھی آپ کو اسے گھر بلانے کی امی۔ میں نے کتنا منع بھی کیا تھا مگر آپ مانی ہی نہیں اور الٹا اس کے سامنے مجھے ہی شرمندہ کر دیا۔"

"اے تم کون ہوتی ہو منع کرنے والی۔ وہ میرا بھتیجا ہے۔ میں نے اسے بلا لیا میری مرضی۔"

ماں نے گویا اپنی مرضی کو پیش رکھتے ہوئے ترمخ کر کہا۔

"ہونہہ بھتیجا ہے۔ آج تک تو صورت دیکھی نہ کبھی سنا ہی کسی اکرام چچا کے بارے میں۔ اور آپ نے جھٹ سے رشتہ بھی جوڑ لیا۔ کمال ہے۔"

"اے کیا کمال ہے اور جمال ہے لگا رکھی ہے تم نے۔ کوئی میں نے زبردستی کا رشتہ تو نہیں جوڑا ہے۔"

"خیر، اگر امی نے سعد بھائی کو بلا بھی لیا ہے تو اس میں کون سی قیامت ہو گئی۔"

چھوٹی بھی اس کی باتوں سے عاجز آ کر بولی۔

"لو، تم قیامت کو کہہ رہی ہو اور میں یہ کہہ رہی ہوں کہ یہ جو اس کی نظر میں میں ہماری تھوڑی سی عزت بنی ہے وہ بھی خاک میں مل جائے گی۔ اگر وہ یہاں آ گیا تو۔ ویسے بھی ہم خواہ کتنی ہی ٹیپ ٹاپ کر کے جائیں دیکھنے والا ہمیں ایک ہی نظر میں پہچان لیتا ہے کہ ہماری کیا حیثیت ہے۔ کم از کم تایا ابو کی ویل آف فیملی کا تو ہم کسی طور بھی مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہ بات سعد نے بھی محسوس کی ہوگی۔ اور اب باقی جو کسر رہ گئی ہے وہ یہاں اس لوٹے پھوٹے گھر میں آ کر دیکھ لے گا۔"

عنبر نے چھوٹی کی بات پر تنک کر کہا۔

"اے دیکھ لے گا تو دیکھ لے میری بلا سے۔ اگر وہ ہمارے گھر اور حیثیت سے ہی ملنے آئے گا تو آئندہ نہ بھی آیا تو میری جوتی سے۔ مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی۔ اے ہاں۔ لو بھلا اب اس نگوڑ ماری حیثیت کی وجہ سے کیا ان سے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیں۔"

خورشید جہاں چٹختے ہوئے انداز میں بولیں۔

"امی! سچ ایک تو آپ کے سادگی برتنے پر کبھی کبھی خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اس پر آپ کے خیالات بھی کچھ ایسے ہیں کہ سچ مچ انسان کو مار ہی ڈالیں۔ آپ سے چپکے سے کوئی بات کہو تو آپ اپنی سادگی میں چیخ چیخ کر اس کا جواب دیتی ہیں۔ یہ نہیں دیکھتیں کہ دوسرا بھی سن رہا ہے۔ بلکہ آپ تو دانستہ دوسرے کو سناتی ہیں یہ سمجھ کر کہ وہ آپ کا اپنا ہے۔ آپ کی ہر بات سے اتفاق کرے گا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا امی!"

"اے تم کیا جتانا چاہ رہی ہو آخر کہ میں بالکل ہی جاہل اور گنوار ہوں۔ مجھے بات کرنے کی تمیز آتی ہے اور نہ میں موقع محل دیکھتی ہوں۔ کہیں جانے کے قابل ہی نہیں ہوں۔"

خورشید جہاں نے اس کی باتوں سے زچ ہو کر کہا۔

"نہیں نہیں توبہ! میرا یہ مطلب تو بالکل نہیں تھا۔ امی! میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ میں نے تو آپ سے چپکے سے کہا تھا کہ آپ سعد کو گھر نہ بلائیں اور آپ زور زور سے بولنے لگیں۔ جب کہ اس وقت وہاں عرفان، رضوان اور قمر آپا بھی موجود تھیں۔ سچ مجھے تو بڑی شرم آئی۔ پہلی ہی ملاقات میں کسی سے اس قدر بے تکلف ہو جانے پر۔ معلوم بھی ہے وہ تینوں بہن بھائی اسی بات پر ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔"

"اگر مسکرا بھی رہے تھے تو یہ ان کا اخلاق جانے۔ اصل میں والدین اپنے بچوں کو جیسی تربیت دیتے ہیں ویسے ہی وہ اٹھتے ہیں۔ بھابی جان کی تو یہ شروع ہی سے عادت تھی آنکھوں آنکھوں میں اشارے کرنا اور مسکرا مسکرا کر دوسرے کا مذاق اڑانا۔ مگر یہ کھلی منافقت ہوتی ہے۔ بداخلاق اور دل میں کھوٹ رکھنے والے ہی ایسی اوچھی حرکتیں کرتے ہیں۔ وہی مثل ہے جیسی روح ویسے فرشتے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری ایسی عادت ہے اور نہ میں نے تم بچوں میں ڈالی ہے۔"

مگر ماں کی ان باتوں پر عنبر نے کوئی توجہ نہیں دی اور اپنے ہی کسی خیال کے تحت بولی۔

"دیکھ لیجیے گا امی! سعد ہمارے اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں کبھی آئے گا ہی نہیں اور یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں۔"

"جب آپ کو ایسا ہی دعویٰ ہے تو پھر اتنی فسں (FUSS) بھی کیوں مچائی آپ نے۔" اس کے اس قدر شوق سے کہنے پر چھوٹی نے جل کر کہا۔

"بس اس خیال سے کہ اگر وہ سچ مچ آ ہی گیا تو—" وہ چھوٹی بہن کے طنز پر خجل ہو کر بولی۔

"اے اگر آ بھی گیا تو کوئی ہوّا یا لاٹ گورنر کا بچہ تو نہیں ہے۔ اگر ہم سے ملنا پسند کرے گا تو فبہا ورنہ وہ اپنی راہ ہم اپنی راہ لے ہاں اس کے نہ ملنے سے کوئی خدانخواستہ ہمارا دانہ پانی تو بند نہیں ہو جائے گا۔"

خورشید جہاں بیٹی کی باتوں سے عاجز ہو کر بولیں۔

"ہاں آپا! ہم پہلے ان سے کون سا ملتے تھے جو اب نہ ملنے سے کوئی فرق پڑ جائے گا۔ کیونکہ ملنے اور نہ ملنے کا انحصار تو خلوص دلی اور نیتوں پر ہی ہوتا ہے نا۔ پھر خواہ مخواہ یہ قبل وقت واویلا کیسی۔ ویسے بھی آج عید ہے۔ امی! میں عذیر کو ساتھ لے کر ذرا روشن سے عید مل آؤں۔"

چھوٹی نے بہت مقطعہ پن سے اپنی بات کہہ کر گویا ماں سے اپنی سہیلی کے ہاں جانے کی اجازت چاہی جو پڑوس ہی میں رہتی تھی تو انہوں نے بلا تامل اسے اجازت دے دی اور پھر چھوٹی کے جانے کے بعد عنبر سے بولیں۔

"تم سے تو یہ چھوٹی ہی کہیں زیادہ سمجھدار اور عقلمند ہے۔ تم اسی سے کچھ سیکھ لو۔" تو جواب دینے کے بجائے اونہہ کہہ کر عنبر نے سر کو زور سے جھٹکا اور دوپٹہ ایک طرف رکھ کر منہ دھونے غسلخانے میں چلی گئی۔ اس پر اس لمحے سخت کوفت اور جھنجلاہٹ سی سوار تھی۔

وہ تو بڑی خوشی خوشی سب سے عید ملنے تایا کے ہاں گئی تھی مگر وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ اس کا تایازاد ریحان اپنی کار لے کر دوستوں سے عید ملنے گیا ہوا ہے۔ آدھی خوشی تو یہ سنتے ہی کافور ہو گئی تھی باقی تین ساڑھے تین بجے دوپہر تک اس کا انتظار کرنے میں معدوم ہو گئی۔

اس کا جی تو چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر مزید اس کا انتظار کرے لیکن اس کی والدہ واپسی کے ارادے سے کھڑی ہو گئی تھیں۔ اس پر گھر میں اور کسی نے ان ماں بہنوں کو روکا بھی نہیں تھا۔ تایا نے البتہ محض منہ چھوانے کو اتنا ضرور کہا تھا کہ ابھی کیا جلدی ہے۔ رات کا کھانا کھا کر چلی جانا۔ اور اس کے ساتھ ہی ملازم کے ذریعے ڈرائیور سے بھی کہلوا دیا تھا کہ وہ انہیں ان کے گھر چھوڑ آئے۔

یوں بھی ماں نے واپسی کا قصد کر لیا تھا اور وہ کہنے سے بھی نہیں رکتیں۔ عنبر کا موڈ تو ریحان کی غیر موجودگی اور انتظار کی کوفت اٹھانے کی وجہ سے پہلے ہی سخت آف ہو رہا تھا۔ اس پر وہ سعد بھی تایا کے ہاں اچانک ٹپک پڑا تھا۔ اس پر مستزاد ماں اس پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی تھیں۔ کچھ اس لیے بھی وہ اسے زہر لگتا تھا۔

اصل میں ریحان سے اس کا رشتہ ہی کچھ اور تھا۔

یعنی وہ اس کا تایازاد ہی نہیں منگیتر بھی تھا۔ دادا دادی نے اس کے ماں باپ سے اس کے بچپن ہی میں اسے ریحان کے لیے مانگ لیا تھا۔ اسی لیے تایا کے گھر میں وہ ریحان کی منگیتر کی حیثیت سے ہی جاتی تھی اور سب سے بہت لیے دیے اور چوکنا سی رہتی تھی تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ چونکہ بے چاری غریب گھر کی بے حیثیت لڑکی ہے اسی لیے اتنی چھچھوری اور جاہلانہ حرکتیں کرتی ہے بلکہ ایک دم ان کلچرڈ اور رائیٹ کیٹس سے نابلد ہے۔ ادھر تایا کے گھر کا حساب کتاب ایک دم لندن پلٹ قسم کا تھا۔ ان کے ہاں جتنے بھی دوست احباب اور مہمان آتے تھے ایک تو چہکتے بہت تھے دوسرے ایسی فر فر انگلش میں باتیں کرتے کہ عنبر منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ حالانکہ تھوڑی بہت انگلش اسے بھی آتی تھی مگر صرف کام چلانے کی حد تک۔ کچھ اس لیے بھی وہ وہاں جا کر چپ چپ سی رہتی تھی۔

وہ تو اتنی نکیلی اور خوددار تھی کہ تائی اور تایازادوں کے بیگانہ اور تمسخرانہ رویّوں پر ان کے گھر میں کھڑے ہو کر پانی پینے کی بھی روادار نہ ہوتی اگر ریحان کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہ ہوتا۔ بس ایک وہی تو تھا اس گھر میں جو اس کی خاصی آؤ بھگت کرتا تھا اور اس کا تعارف اپنے احباب سے جن میں لڑکیاں بھی شامل ہوتی تھیں اپنی فرسٹ کزن کی حیثیت سے ہی کراتا تھا۔ وہی اسے تھوڑا سا ایڈوانس ہونے کی ترغیب دیتا رہتا تھا اور باتوں باتوں میں اسے تاکید بھی کرتا رہتا تھا کہ جب وہ کالج میں پڑھ رہی ہے تو انگلش بولنا بھی سیکھ لے اور اسی کے کہنے پر عنبر نے بڑی مشکلوں سے پیسے جمع کر کر کے انگلش

لٹریچر کی ایسی کتابیں خریدی تھیں جو انگلش کی استعداد بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

مگر یہ تو ان دنوں کی بات تھی جب وہ بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھی۔ تو اب اس بات کو بھی دو برس گزر گئے تھے اور اب وہ سیکنڈ ایر — میں تھی۔ وہ اب بھی بڑے ذوق و شوق سے انگلش سیکھ رہی تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ابتدا ہی سے چونکہ گھر کا ماحول ٹھیٹھ اردو اسپیکنگ تھا اسی لیے اسے ابھی تک انگلش زبان پر اتنا عبور حاصل نہیں ہو سکا تھا جتنا کہ اس کے تایازادوں کو تھا۔

بہر حال اس روز ریحان سے ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے بلکہ دوسرے معنوں میں اس کی غیر حاضری کی وجہ سے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ اس پر ایک تو ریحان کے بجائے سعد سے ملاقات ہو گئی۔ دوسرے اس کی ماں — جس طرح اس کی ماں اس پر اپنی شفقتیں لنڈھاتی نظر آئیں تو وہ اسے ایک دم زہر ہی لگا اور جیسا کہ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کے گھر کا کبھی بھول کر بھی رخ نہیں کرے گا۔ تو وہ بھی دھرا کا دھرا رہ گیا۔ کیونکہ دو روز بعد ہی ایک شام جب وہ اپنی ایک بہت ہی عزیز سہیلی کو جو اس سے عید ملنے آئی تھی رخصت کر کے بیٹھی تھی کہ وہ اچانک آ وارد ہوا

چھوٹی نے اسی سال گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا اور اتفاق سے اسی روز اس کے اسکول میں عید ملن پارٹی تھی جس میں اس کی کلاس کی لڑکیوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ وہ عذیر کو ساتھ لے کر اس پارٹی میں شرکت کرنے گئی ہوئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی تھی لہٰذا اس سمے عنبر اور خورشید جہاں ہی گھر پر موجود تھیں

عنبر پر تو اسے دیکھتے ہی جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ اس کی دستک پر دروازہ کھول کر اسے دروازے کے آگے کھڑا دیکھ کر شرم و خجالت کا کچھ ایسا دورہ پڑا تھا کہ وہ اسے وہیں چھوڑ بھاگ کر اپنے واحد رہائشی کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ تو خورشید جہاں نے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اس سے باتیں کرتی رہی تھیں اور باتیں بھی کیا اپنی سادگی اور سادہ لوحی میں انہوں نے اپنے تمام حالات سے اسے آگاہ کر دیا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اسے یہ تک بتا دیا تھا کہ ان کی گزر اوقات کس طرح ہوتی ہے اور وہ کیونکر اور کس طرح کھینچ تان کر اتنی تنگی ترشی میں بھی اپنے بچوں کو تعلیم دلوا رہی ہیں۔ انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کے جیٹھ کے بچے — اور ان کے نیچے بھی اسی گھر کی پیداوار ہیں اور ان کے ساتھ کس طرح ٹھنس ٹھنسا کر زندگی گزارتے رہے تھے مگر جوں ہی حرام کی روٹیاں منہ کو لگیں مارہ کی زندگی میں ہی انہیں چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے تھے۔

"اُف امی بولنے پر آئی ہیں تو بولے ہی چلی جا رہی ہیں۔" وہ اندر کمرے میں بیٹھی ان کی باتوں پر پیچ و تاب کھا کھا کر سوچ رہی تھی۔ وہ سعد کے سامنے پڑنے کی بالکل روادار نہیں تھی۔ لیکن ماں کے بار بار بلانے پر اسے جانا ہی پڑا۔

"اے پہلی مرتبہ تمہارا رشتے کا ایک بھائی آیا ہے عنبر کیا اس کی خاطر تواضع نہیں کرو گی۔ یوں بھی تم تو ایروں غیروں کے سامنے بچھ بچھ جاتی ہو۔ یہ تو اپنا ہے۔"

ماں نے اس کی بیزار صورت دیکھ کر گویا اس کے تیور بھانپتے ہوئے ڈھکے ڈھکے انداز میں سرزنش سی کی۔

"نہیں نہیں پھپھو جان تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں، میں خوب ڈٹ کر آیا ہوں۔" عنبر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سعد بولا۔

"اے چلو۔ ڈٹ کر بھی آئے ہو تو یہاں کون سا قورمہ متنجن پکا ہے جو میں تمہیں کھلاؤں گی۔ بس وہی گرم پانی کا میٹھا شربت یعنی چائے اور بسکٹ وغیرہ ہی تو ہوں گے۔ یوں بھی عید کا موقع ہے۔ میں تمہیں کچھ کھلائے پلائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔"

خورشید جہاں بڑے دلار سے بولیں۔

"مگر عید کو گزرے تو آج تین روز ہو گئے۔ باسی ہی نہیں تباسی ہو گئی ہے عید پھپھو جان۔" سعد نے ہنس کر کہا۔

"لے تباسی کیا چہ باسی بھی ہو جائے مگر عید کا سلسلہ تو دنوں چلتا ہے تبھی تو عید کے بعد ٹر مناتے ہیں چھوٹے لوگ۔ خیر اللہ معاف کرے۔ ہم کون سے بڑے لوگ ہیں۔ اس کے سامنے تو سب ایک ہی صف میں آئیں گے۔ اے ہاں۔

لے عنبر اسے تو کہنے دو۔ تم جا کر اس کے لیے چائے بنا کر لے آؤ۔" انہوں نے آخری فقرہ عنبر کو مخاطب کر کے کہا جو یوں کھڑی تھی جیسے جبراً کھڑی کر دی گئی ہو۔ ماں کے کہنے پر بادل ناخواستہ چائے بنانے باورچی خانے میں چلی آئی۔

محض اپنی کم مائیگی کے کمپلیکس میں اس نے چائے کے ساتھ کچھ زیادہ ہی اہتمام کیا تھا۔ یعنی کچھ ریحان کے خیال سے اور

کچھ اپنی سہیلی کی اچانک آمد کی وجہ سے اس نے دوپہر کو تازہ مٹھائی منگوائی تھی جسے پلیٹ میں سجا کر سموسوں، نمک پاروں اور چند موسمی پھلوں کے ساتھ ٹرے میں رکھ لیا تھا۔ اور اب ٹرے کو تپائی پر رکھ کر پلٹنے ہی والی تھی کہ ماں نے بڑے مسرور لہجے میں اسے مخاطب کرکے کہا۔

"اے سنا تم نے عنبر۔ یہ اپنے سعد میاں تو بڑے کام کے آدمی نکلے۔ یہ اب اپنے عذیر کو حساب اور الجبرا پڑھانے آیا کریں گے۔"

"اچھا" اس نے منہ ہی منہ میں کہا اور بڑے غیر ارادی طور پر اس کی جھکی جھکی اور کترائی کترائی سی نظریں سعد کی طرف اٹھیں۔ وہ بھی اس لمحے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں چار ہوئیں تو سعد نے اپنے مخصوص سے متبسم انداز میں اس سے کہا۔

"آپ بیٹھیے نا۔ اب یہ اتنے سارے لوازمات لے آئی ہیں تو میرے ساتھ شیئر بھی تو کریں۔"

تو اس نے جلدی سے نظریں کترا کر کہا۔

"نہیں، شکریہ۔ میں ابھی اپنی فرینڈ کے ساتھ بہت کچھ چکھ چکی ہوں۔" اور پھر پلٹ کر جانے لگی۔ تو ماں نے فوراً ٹوکا۔

"اے جا کہاں رہی ہو۔ ادھر آکر بیٹھو۔ اتنی آدم بیزاری اچھی نہیں ہوتی۔ چلو بھائی کی خاطر تواضع کرو۔ چائے بنا کر دو اسے۔ پہلی بار تو یہ تمہارے گھر آیا ہے۔ بھلا کیا سوچے گا کہ کچھ دے نہیں سکتے تھے تو کم از کم محبت اور اخلاق سے ہی پیش آجاتے۔"

اُف امی تو ایک دم ہی دوسرے کی عزت اتار کر رکھ دیتی ہیں۔ اس نے کلس کر دل میں سوچا اور طوعاً و کرہاً ماں کے مزید کچھ کہنے سے پیشتر جلدی سے بیٹھ گئی اور دل پر جبر کرکے ٹرے میں رکھے کھانے کے لوازمات سعد کو پیش کرنے لگی۔

"آپ تو شاید کالج میں پڑھتی ہیں نا" یہ محسوس کرلینے کے باوجود کہ وہ نہ صرف کترا رہی ہے بلکہ بیزار بھی ہے سعد نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں بی۔ اے میں ہوں" اس نے یوں کہا جیسے پتھر سا کھینچ مارا ہو۔

"اے ہو کیا۔ ابھی تو تم نے انٹر کا امتحان دیا ہے۔"

ماں نے رہی سہی بھی ختم کرکے رکھ دی۔

"جی ہاں مگر میرے پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں پاس ہو جاؤں گی۔" وہ جل کر بولی۔

"بالکل بالکل۔ پیپرز اچھے ہوئے ہیں تو ڈویژن بھی یقیناً اچھی ہی آئے گی۔"

ماں کی بات پر اسے جز بز سا دیکھ کر سعد جلدی سے بولا۔

"ہاں انشاء اللہ۔ میری بھی یہی دعا ہے کہ خدا اسے کامیابی عطا فرمائے۔ محنت بھی اس نے جان توڑ کر کی ہے۔ وہ بھی کسی سے مدد لیے بغیر، اس پر کامی بھی بہت ہے محنت کے ساتھ ساتھ۔"

اور اس سے پہلے کہ ماں اس کے کاموں پر روشنی ڈالتیں اور اسے یہ بتاتیں کہ وہ گھر کے کام کرنے کے ساتھ ٹیوشن بھی پڑھاتی ہے عنبر نے جلدی سے مٹھائی کی پلیٹ ان کی طرف بڑھا کر گویا انہیں مزید کچھ کہنے سے باز رکھتے ہوئے کہا۔

"لیجیے آپ بھی تو مٹھائی کھائیے امی آپ کو تو قلاقند بہت پسند ہے۔"

"نہیں اس وقت میرا جی نہیں چاہ رہا۔ تم سعد کو ہی کھلاؤ بلکہ میرے حصے کی بھی کھلا دو۔" انہوں نے کہا تو چار و ناچار اسے پھر سعد کو مٹھائی پیش کرنی پڑی۔

"اوہ شکریہ۔ میں زیادہ مٹھائی تو نہیں کھاتا۔ لیکن اب آپ کھلانے پر ہی مصر ہیں تو کھائے لیتا ہوں" سعد نے گلاب جامن کو چمچے سے کاٹ کر اس کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کچھ ایسے شوخ سے معنی خیز لہجے میں کہا کہ اس کے سامنے مزید ٹکنا عنبر کے لیے دوبھر ہو گیا۔

وہ پلیٹ کو ٹرے میں رکھ کر جانے کی غرض سے اٹھی تو وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا پھپھو جان۔ اب اجازت دیں۔"

"اے لو۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ ذرا دیر اور چھوٹی اور عذیر کا انتظار کرلو۔ پھر چلے جانا۔" خورشید جہاں نے کہا تو عنبر نے سخت جز بز ہو کر کہا۔

"یہ ٹھیک ہے امی! جب تک وہ دونوں واپس لوٹیں گے رات کے کھانے کا وقت ہو جائے گا۔ اب تو انہیں

رات کا کھانا کھلا کر ہی بھیجیے گا" اس نے چبھتے سے انداز سے کہا۔

"ہاں تو کیا مضائقہ ہے۔ گھر میں جو دال دلیا موجود ہے اس میں یہ بھی شریک ہو جائیں گے۔"

ماں نے بیٹی کے لب و لہجے کی طرف دھیان دیے بغیر اپنی فطری سادگی سے کام لے کر کہا لیکن سعد نے اس کے لہجے کی تلخی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے فوراً ہی کہا۔

"نہیں نہیں اب کچھ چیزیں آئندہ کے لیے بھی رکھیے پھپھو جان۔ ویسے بھی میرے ایک دوست نے مجھے کھانے پر مدعو کر رکھا ہے اس لیے اب چلوں گا ہی۔"

"اچھا۔ جاؤ سدھارو مگر اب آتے جاتے رہا کرنا۔ یہ نہیں کہ بھول بھال جاؤ۔" خورشید جہاں نے گویا با دلِ ناخواستہ اسے جانے کی اجازت دی تو وہ ان سے جلدی آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ اور اس کے جانے کے بعد وہ پھر ماں سے الجھ پڑی۔

"امی، خدا کے واسطے آپ اپنا یہ طریقہ یہ چلن بدل دیجیے۔"

"اے کیسا طریقہ، کیسا چلن۔ میں نے ایسی کون سی بے جا بات کی ہے جو تم اتنی تنک رہی ہو۔"

"لیجیے چھوڑ کیا دی۔ امی اگر ہم بے حیثیت بھی ہیں تو دیکھنے والا ایک ہی نظر میں ہمارے گھر کا حلیہ دیکھ کر ہمیں پہچان لیتا ہے۔ پھر بھلا اپنی کم مائیگی کو کہہ کر گویا خاص طور سے جتانا کیا کوئی اچھی بات ہے۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ آپ کچھ کہنے پر آتی ہیں تو موقع دیکھتی ہیں نہ محل اور نہ مصلحت۔ بس کہتی ہی چلی جاتی ہیں وہ بھی بھلا ایک بالکل ہی اجنبی اور نئے نئے ملاقاتی سے۔ آخر آج ہی کیا ضرورت تھی اس سے ایک دم ہی ساری باتیں کہنے کی۔"

"اے بس اب زیادہ میرے کان نہ کھاؤ لڑکی۔ لو بھلا خدا کی شان میری دادی رحمت جہاں مر گئیں اور ان کی جگہ تم پیدا ہو گئیں مجھے نصیحتیں کرنے والی۔ بس اپنی اوقات میں رہو اور جا کر اپنا کام کرو۔ سمجھیں۔"

خورشید جہاں نے اس کی تلخ ترش باتوں سے عاجز ہو کر الٹا اسے لتاڑا تو ٹرے اٹھا کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی وہ باورچی خانے کی طرف چل دی۔

کچھ ماں کی باتوں کے پیش نظر اور کچھ اپنی گئی گزری حیثیت کی وجہ سے اس نے تو یہی سمجھا تھا کہ سعد آئندہ اس کے گھر کا رخ نہیں کرے گا کہ خود عنبر نے بھی اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ کچھ ہی روز بعد پھر آ وارد ہوا۔

بلکہ گھر میں اس کی آمد و رفت کا سلسلہ ہی جاری ہو گیا۔ گو وہ روز نہیں آتا تھا مگر ہر دوسرے تیسرے ضرور آتا تھا اور عموماً سہ پہر کو ہی آتا تھا۔ عذر یہ تھا کہ وہ عذیر کو پڑھائی میں مدد دینے آتا ہے کہ وہ اس کی گھر میں آمد کو عذر پر ہی محمول کرتی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال ہی نہیں بلکہ اسے یقین تھا کہ وہ صرف اس کی وجہ سے آتا ہے۔ اصل میں تو عنبر نے پسندیدگی کے اس جذبے کو تو شروع دن سے اس کی نگاہوں میں موجزن نظر آیا تھا خوب اچھی طرح دیکھ اور محسوس کر لیا تھا کچھ اس وجہ سے بھی وہ اس سے خار کھانے لگی تھی اور جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ سعد ریحان کا کلاس فیلو رہ چکا ہے اور اس کی تایا کے یہاں بہت آمد و رفت رہتی ہے وہ اس سے بہت کٹتی تھی

اس میں شک نہیں کہ اپنی تایا زادوں کے بقول وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا تھی مگر جن حالات یا صورت حال سے وہ دوچار تھی ان میں اس کا اتنا زیادہ کمپلیکسڈ ہونا کوئی بے جا یا انوکھی بات نہ تھی۔

اس کے دادا ریلوے گارڈ تھے۔ اور جس زمانے میں وہ گارڈ لگے ہوئے تھے وہ بہت سستا زمانہ تھا۔ اس لیے تنخواہیں اور معاوضے بھی بہت قلیل تھے۔ ایک بیوی، دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے قلیل سے کنبے کی زندگی کی گاڑی تنگی ترشی سے کسی نہ کسی طرح چل ہی رہی تھی۔ سروس بہت پرانی ہو گئی تھی اس لیے انہوں نے بھاگ دوڑ کرکے محکمے کی طرف سے بہت کم نرخ پر ۱۲۰ گز کا پلاٹ حاصل کر لیا تھا اور پھر کچھ قرضہ لے کر، کچھ اپنی تنخواہ میں سے پس انداز کرکے ایک چھوٹا سا پکا گھر بنوا تعمیر کروا لیا تھا۔ قرض تو خیر وہ اپنی عمر کے آخری لمحات تک اتارتے رہے تھے مگر اپنے بیٹوں کو انہوں نے زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت تعلیم ضرور دلوائی تھی۔

اصل میں خود لڑکوں کا رجحان تعلیم کی طرف نہیں تھا۔ بڑے لڑکے شاہنواز نے میٹرک میں فیل ہو جانے کے بعد پڑھائی کو خیرباد کہہ کر میونسپل کارپوریشن کے محکمے میں ملازمت پکڑ لی۔

بڑے بھائی کی دیکھا دیکھی چھوٹے بھائی شہباز خان نے بھی جو انٹر تک پہنچ گیا تھا۔ انٹر کے کچھ عرصے بعد پڑھائی چھوڑ کر باپ کے ایک افسر کی سفارش پر فوڈ اینڈ ایگری کلچر ڈیپارٹمنٹ میں اینیلائزر کی ملازمت اختیار کر لی۔ گو تنخواہ بہت قلیل تھی پھر بھی باپ کی ساڑھے تین چار سو کی تنخواہ ۔ میں دونوں بیٹوں کی کمائیوں نے گھر کی آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا تھا۔ جس میں سے ماں نے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے بیٹی کا معمولی سا جہیز تیار کیا اور پھر اس کی شادی کر دی۔ کچھ عرصے بعد باپ کو بھی ریٹائرمنٹ مل گئی۔ وہ خاصا ضعیف ہو گیا تھا اور بیمار بھی رہنے لگا تھا۔

شاہنواز کا سہرا دیکھنے کے لیے دل سے خواہاں تھا۔ جب کہ شاہنواز خود بھی اپنا گھر بسانا چاہتا تھا۔ چنانچہ کنبے برادری کی ایک لڑکی خالدہ خانم سے جو خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور آٹھ جماعتیں بھی پڑھی ہوئی تھی شاہنواز کی شادی کر دی گئی۔

بھاوج بیاہ کر آئی تو جگہ کی تنگی کے باعث کہ دونوں بھائی بیٹھک والے کمرے میں رہتے تھے۔ شہباز خان نے اس کمرے کی رہائش چھوڑ کر اپنا ڈیرہ برآمدے میں جما لیا تھا۔ وہ اتنی قلیل تنخواہ میں شادی کرنے کا سرے سے قائل ہی نہ تھا۔ ادھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ شادی کے سال بھر بعد ہی بڑے بھائی کے یہاں بچوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو گویا لائن ہی لگ گئی اور یوں اخراجات میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے بھائی اور بھی اوپری آمدنی کا خوگر ہو گیا۔ بس یہی دیکھ دیکھ کر وہ شادی کے نام سے بدکتا تھا بلکہ کان پکڑتا تھا۔

لیکن ہوا کچھ یوں کہ اس کے ایک کولیگ کی ایک ہی بہن تھی جو عنفوان شباب ہی میں انتقال کر گئی تھی۔ بہن شادی شدہ تھی اور اس کے دو بچے کمسن بھی تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ بہن کے انتقال کے بعد اس کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ بچوں کی سوتیلی ماں دونوں بچوں کی موجودگی کو برداشت نہ کر سکی تو اپنے شوہر کو ان کے خلاف بھڑکا کر اسے اس قدر مجبور کر دیا کہ ایک دن تنگ آ کر وہ دونوں بچوں کو ماموں کے پاس چھوڑ گیا اور پھر پلٹ کر ان کی بات نہ پوچھی۔ ماموں نے ہی دونوں کی پرورش کی۔ وہ لاولد تھا اس لیے اس کی بیوی نے ماں بن کر ان دونوں بچوں کو پالا تھا۔ بھانجے کو تو میٹرک تعلیم دلوائی تھی البتہ بھانجی صرف پانچویں جماعت ہی پڑھ سکی تھی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کولیگ کی بیوی چند ماہ قبل انتقال کر گئی تھی۔ بھانجی جوان تھی اور گھر پہ تنہا ہی رہتی تھی۔ کیونکہ بھانجا ابھی زیر تعلیم تھا۔ نہ وہ گھر پہ رہ سکتا تھا نہ خود ماموں جو خود بھی ملازمت کرتا تھا۔ بھانجی کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا اور چاہتا تھا کوئی شریف اور معقول سا بر اس کے لیے تلاش کر کے جلد از جلد اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔

شہباز خان کو جب اس کی اس پریشانی اور تمام حالات کا علم ہوا تو اس نے بغیر سوچے سمجھے بلا تامل اپنی خدمات پیش کر دیں۔ کولیگ کی وہی مثل ہو گئی کہ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اس نے بھی بلا تامل اس کی پیشکش منظور کر لی۔

ادھر سے منظوری ملنے کے بعد شہباز خان نے اپنے ارادے ہی نہیں بلکہ اپنے فیصلے سے جب اپنے والدین اور بڑے بھائی کو آگاہ کیا تو والد نے خاصی رد و قدح کے بعد اسے اس لڑکی سے شادی کرنے کی اجازت دے دی جب کہ اس رشتے سے کوئی بھی خوش نہ تھا۔

بہرحال ایک دن انتہائی سادگی اور خاموشی کے ساتھ والدین، بھائی بھاوج، بہن بہنوئی اور دوست اور لڑکی کے بھائی کی موجودگی میں وہ نکاح کے دو بول پڑھوا کر اس لڑکی کو بیاہ لایا۔

کمرہ چونکہ ایک ہی تھا کہ دوسرے کمرے میں والدین رہتے تھے۔ اس لیے کمرے کے بیچوں بیچ کھدر کا موٹا سا پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ خورشید جہاں نے سچ ہی کہا تھا کہ اس پردے کے اِدھر اور اُدھر دونوں جیٹھانی دیورانی کے ہاں اولادیں پیدا ہوتی رہیں۔

اصل میں سستے زمانے تھے اور سیدھے سادے لوگ۔ قدرت کی طرف سے جو روزی مقرر کر دی جاتی تھی بس اسی پر صابر و شاکر رہتے تھے۔ یوں بھی زمانے نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ ہر فرد ہوس زر کا شکار نظر آتا۔ یا ہل من مزید کا خواہاں ہوتا۔ وہاں تو قدرت جو اسے دے دیتی اسے ہی اپنا مقدر سمجھ کر آمنا صدقنا کہہ کر قبول کر لیا جاتا تھا۔

گو یہ بھی نہ تھا کہ اس زمانے میں کوئی رشوت لیتا تھا نہ دوسرے ذریعے سے حرام کا پیسہ بٹورتا تھا بلکہ کالا دھندا ہی کرتا تھا بلکہ اس زمانے میں بھی سب کچھ ہوتا تھا لیکن کم ہی ہوتا تھا اور اس قدر اعلیٰ پیمانے پر اس قدر کھلم کھلا تو ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی آج کے دور میں کی ہے۔ چنانچہ کسی کو بھی اس بات کی حرص و ہوس نہ تھی کہ اپنے محدود وسائل اور کم حیثیتی میں وہ اس بات کا خواہاں ہوتا کہ اس کے پاس بھی فرج ہو رنگین ٹی وی۔ وی سی آر ہو۔ کار ہو اور دیگر زندگی کو سہولتیں اور آرام پہنچانے والی آسائشیں ہوں بلکہ وہاں تو جس کو اپنا ذاتی مکان میسر ہوتا تو اپنے محدود وسائل اور قلیل آمدنی میں بھی اس کا پوبارہ ہوتا۔ وہی مثل ہوتی کہ سر آیا پیر گیا۔ اور جو کرائے کے مکان میں رہتا وہ بھی اپنی محدود اور مختصر سی چادر سے باہر پیر نکالنے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ عنبر کے دادا ریلوے گارڈ تھے اور گارڈ کا عہدہ خاصا معزز ہوتا تھا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح قرض مانگ کر کے یہ دو کمروں اور تنگ سے صحن کا۔ مکان بنوایا تھا۔

خورشید جہاں کے ہاں جو شہباز خان کی برادری سے تو نہیں تھیں مگر ان کی طرح ذات کی پٹھانی ضرور تھیں۔ پہلوٹھی کی بیٹی پیدا ہوئی تھی جو بڑی پیاری اور نک سک سے درست تھی۔ ناک نقشہ باپ کا لیا تھا اور رنگ روپ ماں کا۔ کہ شہباز خان شکل و صورت کے لحاظ سے بڑا بانکا سا انسان تھا۔ دادا کی کمر اتنی جھک گئی تھی کہ وہ لکڑی ٹیک کر چلتے تھے۔ اصل میں انہوں نے شادی بھی خاصی پکی عمر میں کی تھی۔

شاہنواز کا بڑا بیٹا ریحان ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ یوں تو اس سے چھوٹی شمسہ کو بھی بہت چاہتے تھے مگر عنبر پیدا ہوئی تو کچھ پیدائشی طور پر ہی اتنی صحت مند اور پیاری تھی کہ دادا اس کی شکل دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

انہوں نے کچھ خاندانی روایات کے پیش نظر اور کچھ اپنے دونوں بیٹوں اور ان کی اولادوں کو آپس میں شیر و شکر کرنے کی غرض سے اور سب سے بڑھ کر اس وجہ سے بھی کہ اپنے دونوں بیٹوں کی پہلی اولادیں انہیں بے حد عزیز تھیں۔ عنبر جب دو برس کی ہوئی تو اسے ریحان سے منسوب کر دیا تھا۔ اور اس سلسلے میں باقاعدہ طور پر چھوٹی سی رسم بھی ادا کی تھی۔

باپ کے اس فیصلے کو دونوں بھائیوں نے بلکہ خورشید جہاں نے بھی دل سے قبول کر لیا تھا۔ ماسوا شاہنواز کی بیوی خالدہ خانم کے۔ جو خود کو پڑھا لکھا اور آزاد خیال ظاہر کرتی تھی اور جسے اپنے کھاتے پیتے خاندان، گھر کی بڑی بہو اور پہلوٹھی کا بیٹا جننے پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ بالکل اس رشتے کے حق میں نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بچپن میں طے کی گئی نسبتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں کیونکہ بڑے ہو کر ریحان کے خیالات نہ معلوم کیا ہوں گے۔ کیسی پسند ہو گی اور بڑا ہو کر وہ بزرگوں کے قائم کردہ اس رشتے کا پابند رہنا قبول بھی کرے گا۔ خالدہ خانم کے ان خیالات میں زیادہ تر تو ناپسندیدگی کا جذبہ شامل تھا کہ وہ اپنے سسرال والوں کو حقیر اور کم تر سمجھتی تھی ورنہ اس کی سسرال کی خاندانی روایات کچھ یہی تھیں کہ اپنے سگوں میں بچپن میں آپس میں رشتے طے ہو جاتے تھے۔

خالدہ خانم نے دبی زبان سے اپنے ان خیالات کا اظہار اپنے شوہر پہ بھی کیا تھا مگر شوہر نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا۔ جب کہ خالدہ خانم کو تو اس گھر اور اس کمرے میں کبھی رہنا گوارا نہیں تھا جسے وہ کابک کہتی تھی۔ شوہر سے بھی بارہا کہہ چکی تھی کہ وہ کہیں علیحدہ گھر لے لے۔ خود شاہنواز بھی دل سے یہی چاہتا تھا۔ مگر باپ کی زندگی میں تو ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا اس لیے الٹا بیوی کو ڈانٹ دیتا تھا۔

خالدہ خانم بڑی خر دماغ تنک مزاج فتنہ پرداز عورت تھی اور خورشید جہاں سے اس لیے بھی خار کھاتی تھی کہ وہ شکل و صورت، رنگ و روپ میں ہی نہیں سیرت میں بھی اس سے کہیں بہتر تھی۔ اور ذات برادری کی بھی نہیں تھی۔ اس کا ماموں کم مائیگی کا شکار ضرور تھا لیکن وہ غریب باپ کی بیٹی نہیں تھی۔ اس کا باپ قالینوں کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ ماموں کو سونپ کر خورشید جہاں کو بھول ضرور گیا تھا لیکن اس بات پر اس کے ماموں سے سخت ناراض تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر ایک کم حیثیت اور مفلوک الحال شخص سے اس کی شادی کیوں کر دی۔ اسی غصے میں وہ اپنے جوان اور پلے پلائے بیٹے کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اور یہ بات گھر کے ہر فرد کو معلوم تھی مگر اس کے باوجود

بھی خالدہ خانم دیورانی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اور اس کے خلاف شوہر اور ساس کے کان بھرتی رہتی تھی لیکن چونکہ سسر کا رعب داب گھر پر بہت تھا اس لیے اسے کھل کر کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ آپس کے لڑائی جھگڑوں کو بالکل نہیں پسند کرتا تھا اور اس کے دونوں بیٹے نہ صرف اس کا بہت ادب کرتے تھے بلکہ اس سے بہت ڈرتے بھی تھے۔ ورنہ شاہنواز کانوں کا بہت کچا تھا اور بیوی کی باتوں میں فوراً ہی آجاتا تھا۔ اسی لیے اس کے دل میں بھائی بھاوج کے خلاف ایک تکدر سا پیدا ہوگیا تھا۔

پھر جونہی باپ کی آنکھ بند ہوئی شاہنواز خان دو ڈھائی ماہ دنیا دکھاوے کو تو ماں کی اشک شوئی اور دلجوئی میں لگا رہا۔ پھر بالآخر ایک روز اس نے جگہ کی تنگی کا گلہ کرتے ہوئے کہ ایک ہی کمرے میں جو اتنا کشادہ بھی نہیں ہے چار دم بھائی بھاوج اور ان کے بچوں کے اور چھ دم ہمارے، اکٹھی دس جیتی جانیں بھلا کیونکر اور کس طرح گزارا کرسکتی ہیں۔

اس لیے میں نے شہر کے نواحی علاقے میں کرائے پر مکان لے لیا ہے۔ گویا علیحدگی کا اعلان کردیا۔ شہباز خان تو خاموش رہا کہ ایک تو چھوٹا بھائی تھا دوسرے بڑے بھائی کا ادب کرتا تھا۔ البتہ ماں نے بہت احتجاج کیا لیکن اس نے ماں کو کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر اور دم دلاسہ دے کر آخر راضی کر ہی لیا اور دو تین روز بعد بیوی بچوں سمیت نئے مکان میں شفٹ ہوگیا۔ یوں بھی چھوٹے بھائی کے مقابلے میں اس کی مالی حیثیت بہت مستحکم تھی۔

باپ نے ہمیشہ اپنی قلیل تنخواہ میں گزر بسر کی تھی مگر شاہنواز چونکہ میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھا اور کسٹمز کے محکمے، پی ڈبلیو ڈی، پولیس اور عدالت کچہریوں کے محکموں کی پیشانیوں پر رشوت ستانی اور بدعنوانی جس طرح برص کے بدنما داغ کی طرح ثبت ہوتی ہے اسی طرح کارپوریشن کے محکمے پر بھی یہ بدنما داغ ثبت ہوتے ہیں بلکہ بہت نمایاں ہوتے ہیں

چنانچہ باپ کی زندگی میں تو شاہنواز چوری چھپے یہ گھناؤنا کام کرتا تھا پھر بھی اس نے اس ناجائز آمدنی سے خاصی رقم جمع کر لی تھی اور باپ کے انتقال کے بعد تو گویا اسے کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ وہ دونوں دونوں ہاتھوں سے حرام کا پیسہ بٹورنے لگا تھا کہ ایسے کھانے پینے والے محکموں میں پیادے یعنی چھوٹے مہرے فیل، وزیر اور بادشاہ سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انہی کے ذریعے اوپر والوں کی جیبیں گرم ہوتی ہیں۔ گو رشوت کی پاداش میں شاہنواز کو کئی ماہ تک جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی تھی اور ملازمت سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تھے مگر چونکہ حرام اس کے منہ کو لگ گیا تھا اس لیے رہائی کے بعد وہ ہیرا پھیری سے باز نہیں آیا۔ اس نے ایک ملٹری کنٹریکٹر کے ہاں ملازمت اختیار کر لی اور خوب خوب ہاتھ مارے اور اتنا جمع کرلیا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر اپنا ذاتی کاروبار شروع کردیا جو دیکھتے ہی دیکھتے بہت قلیل عرصے میں ترقی کر گیا۔

اس کے برعکس چھوٹے بھائی شہباز خان نے اوپری آمدنی کو باپ کی طرح اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا اور جہاں تک ترقی

کرنے کا سوال تھا تو سرکاری ملازمت میں انکریمنٹ تو ہوتا رہا تھا لیکن ایک ہی ملازمت پر لگے لگے کئی برس ہو گئے تھے مگر ترقی نہیں ہوئی تھی۔

ادھر جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، مہنگائی بڑھتی جا رہی تھی۔ ادھر بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ اس سمیت اکٹھے پانچ افراد۔

یوں بھی جیتی جانوں کو تو ہر شے کی ضرورت ہوتی ہے۔

کھانا پینا، کپڑا لتا، تعلیمی اخراجات۔ اس پر مستزاد ہرج مرج سو بکھیڑے ہوتے ہیں زندگی گزارنے کے۔

جب کہ وہاں یہ عالم تھا کہ سر ڈھانپتے تو پیر کھل جاتے اور پیر ڈھانپنے کی کوشش کرتے تو سر کھل جاتا۔

کہ چادر ہی اتنی محدود تھی۔ پیٹ بھر کر دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی تھی۔

تینوں بچے بھی گورنمنٹ اسکولوں میں تعلیم پا رہے تھے۔

کہ اپنی تعلیم ادھوری رہ جانے کی کسر وہ اپنے بچوں سے پوری کرانا چاہتا تھا۔

گو فیس بہت قلیل تھی اس کے باوجود بھی یونیفارم کا اور کتابوں کا خرچ بھی تو تھا۔

اس نے شروع شروع میں بہتر ملازمت کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے تھے مگر اچھی تعلیم حاصل کی تھی نہ کوئی ہنر ہی ہاتھ میں تھا اسی لیے ہر جگہ اسے ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑا تھا۔

گو دونوں بھائیوں میں اب تک خوب بنی ہوئی تھی یعنی ملنا جلنا اور ایک دوسرے کی بات پوچھنے کا سلسلہ علیحدہ ہونے کے بعد بھی جاری تھا پھر بھی شہباز بہت نکیلا اور خوددار تھا۔ اس نے اپنے ناگفتہ بہ حالات کے تحت بڑے بھائی کے آگے کبھی دست سوال دراز کیا تھا نہ کسی معاملے میں اس سے مدد ہی چاہی تھی۔

ان دنوں سوزوکیوں پہ آڑھت کا مال لاد کر لے جانے کا اتنا رواج نہ تھا۔ گوداموں سے ہتھ گاڑیوں پر سامان لاد کر مزدور لوگ گوداموں اور دکانوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ اصل میں یہ طریقہ کار دکانداروں کو بھی سستا پڑتا تھا اور آڑھتیوں کو بھی ایسی آگ برستی مہنگائی بھی نہ تھی جیسی آج کے زمانے میں ہے۔ فی پھیرا دس بارہ روپے کا ہوتا تھا۔

شہباز خان نے بحالت مجبوری اسی کام کو اپنا دھندا بنا لیا تھا۔

وہ آفس سے اٹھ کر سیدھا گوردھن داس مارکیٹ آتا اور سہ پہر سے شام تک کئی پھیروں میں مال گوداموں سے دکانوں تک پہنچاتا تھا کہ پیشہ تو حبیب اللہ ہوتا ہی ہے اور اس کے خیال میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور بیوی بچوں کو ذرا ذرا سی چیز کے لیے ترسانے سے تو یہی کہیں بہتر تھا کہ محنت مزدوری کر لے۔

لیکن اپنے اس نئے دھندے کے بارے میں اپنے بیوی بچوں کو ہوا تک نہیں دی تھی بلکہ اپنے دیر سے لوٹنے کا سبب یہی بتایا تھا کہ دفتر میں اس کا کام بڑھ گیا ہے اس لیے اسے دیر تک مصروف رہنا پڑتا ہے۔

اصل میں رازداری برتنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے خاندان کے بیشتر افراد ملازمت پیشہ تھے اور باقی جو تھے وہ اپنا نجی کاروبار کرتے تھے۔

پھر اس نے محنت مزدوری سے جمع شدہ پیسے سے باپ کے ورثے میں چھوڑے ہوئے اس چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل تعمیر کرا کے اسے کرائے پر چڑھا دیا۔

گو محنت مزدوری کرنے اور کرایہ دار بسانے کی وجہ سے حالات پہلے کی نسبت قدرے بہتر ہو گئے تھے پھر بھی جمع جکڑی تو ساری بالائی منزل کی تعمیر میں برابر ہو گئی تھی۔ اسے دو دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونا تھا۔

بڑی بیٹی بالغ ہو چکی تھی اور ہائی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ چھوٹی ساتویں جماعت میں تھی اور بیٹا چوتھی جماعت میں اور عذیر کو تو وہ اعلیٰ تعلیم دلوانے کا خواہاں تھا۔

اس لیے کرائے کی رقم جو مبلغ [illegible] روپے ماہوار تھی اس نے بچوں کی تعلیم کے لیے مختص کر دی تھی۔ اس کی تنخواہ سے حسب معمول گھریلو اخراجات پورے کیے جاتے تھے کیونکہ محنت مزدوری کا پیسہ وہ جمع کر رہا تھا اور پورے تن من دھن سے اپنے کام پر جتا ہوا تھا۔

لیکن وائے قسمت۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔

ڈبل کام اور اتنی محنت مشقت اٹھانے اور معمولی اور گھٹیا کھانے کھانے کی وجہ سے اس کی صحت دن بدن جواب دیتی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن بوجھ ڈھوتے ڈھوتے تیورا کر گر پڑا۔

ہتھا ہاتھ سے چھوٹ جانے کی وجہ سے گاڑی پر لدی چند پیٹیاں پیچھے جا گریں اور کچھ آگے اس پر آ کر پڑیں۔ گہرا زخم تو نہیں آیا مگر گہری چوٹ ضرور لگی پھر بھی وہ ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا رکشہ میں بیٹھ کر گھر پہنچا۔

اور پھر جو بیمار ہو کر بستر سے لگا تو بے چارے کو اٹھنا ہی نصیب نہ ہوا۔ کئی روز صاحب فراش رہ کر ایک دن نہایت خاموشی سے اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔

اس کے انتقال کے بعد خورشید جہاں اور بچوں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ تو ایک علیحدہ روداد ہے۔

مگر جیسا کہ خورشید جہاں کا خیال تھا کہ شاہنواز خان جو چھوٹے بھائی کی بے وقت موت کا بہت سوگ منا رہا تھا ان کی اور ان کے بچوں کی کفالت کا ذمہ اپنے سر لے لے گا تو شاہنواز نے بس اس حد تک ہی ان کی کفالت کی کہ خورشید جہاں کی بیوگی کی عدت پوری ہونے کے بعد ایک جوڑا اور پانچ سو کی رقم ان کے ہاتھ میں رکھنے کے بعد روپے پیسے کے معاملے میں پھر پلٹ کر کبھی ان کی بات ہی نہیں پوچھی۔

وہ تو شوہر کرایہ دار بسا گیا تھا اور اس کی پنشن کے پونے دو سو روپے ملنے لگے تھے۔ کچھ خورشید جہاں محلے کے لوگوں کی سلائی کڑھائی کر کے بنا لیتی تھیں تو کسی نہ کسی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔

یوں بھی وہ شوہر کی طرح بہت غیور اور خوددار تھیں۔ خواہ فاقے بھی کرتیں مگر کبھی جیٹھ کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتیں۔

عنبر نے جب سے میٹرک پاس کیا تھا وہ محلے کے دو تین بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی تھی اور ٹیوشن کے پیسے سے کسی حد تک اپنے کالج کی فیس وغیرہ پوری کر لیتی تھی۔

اب اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا مرحوم باپ محض ان تینوں بہن بھائیوں کا مستقبل سنوارنے کے لیے کیسی کڑی محنت اور مشقت کرتا رہا تھا جو اس کے لیے جان لیوا ہی ثابت ہوئی تھی۔

ورنہ اولاد پر تو والدین کے حقوق اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ اولاد انہیں ادا کرتے کرتے تھک بھی جائے تو وہی مثل صادق آتی ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کہ اولاد والدین کی جتنی بھی خدمت کرے، جتنا بھی خیال رکھے کم ہی ہوگا۔

مگر عنبر کی سوچ بہت سطحی تھی، وہ ایسی باریکیوں میں جانے کی عادی نہ تھی۔ وہ تو ظاہری باتوں پر ہی توجہ دیتی تھی۔

اتنی بڑی ہو کر اور تعلیم پانے کے باوجود وہ اپنے والدین کی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ اسے تو بس اپنے مرحوم باپ سے سخت گلہ، سخت شکایت تھی کہ اس نے اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔

ادھر خورشید جہاں سب سے زیادہ اسی کی طرف سے پریشان رہتی تھیں۔ کہ یوں تو تقریباً ہر ماں کو بیٹی کے جوان ہوتے ہی اس کے فرض سے سبکدوش ہونے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے لیکن ان جیسی بے حیثیت اور بے یار و مددگار ماؤں کے لیے نوجوان بیٹیوں کی شادیاں ایک مسئلہ ہی بن جاتی ہیں اور عنبر کا یہ مسئلہ گو پہلے سے ہی حل شدہ تھا، اس کے باوجود بھی خورشید جہاں کو اپنی اور اپنے جیٹھ کی حیثیت کے پیش نظر ہر دم ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا، کہ کہیں ان کے جیٹھ جٹھانی اس پرانے رشتے کو توڑ نہ بیٹھیں۔ کہیں اپنی زبان سے نہ پھر جائیں۔

اسی خدشے کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنی جٹھانی اور ان کے بچوں کی بے رخی اور بے اعتنائی کے باوجود جیٹھ کے بلاوے پر یا تہواروں کے موقعوں پر اپنے تینوں بچوں کو ان کے یہاں ضرور بھیجتی تھیں۔ خود تو وہ کم ہی جاتی تھیں کہ ایک تو وہاں جانے کے لیے اچھا لباس میسر نہیں ہوتا تھا دوسرے وہاں جا کر ان کی قدر بھی نہ ہوتی تھی۔ اور پھر ان کے یہاں مکس حساب کتاب ہوتا تھا یعنی تقریبوں اور پارٹیوں میں خواتین کے ساتھ مرد بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ عنبر خود بھی بہت غیور

خودداری، تھوڑی تنک مزاج اور قدرے ہٹ دھرم تھی، مگر خونی رشتے سے زیادہ ایک قدیم قلبی تعلق کی وجہ سے اپنی تائی اور تایازادوں کی بے رخی کے باوجود وہاں جاتی ضرور تھی، اس کا اصل نام تو عنبرین تھا مگر پیار میں اسے عنبر ہی کہتے تھے۔ خود چھوٹی کا نام بھی فرحین تھا مگر بچپن ہی سے چھوٹی پکارا جانے لگا تو چھوٹی ہی پڑ کر رہ گیا۔ جب کہ عقل و دانش کے لحاظ سے عنبر کے مقابلے میں وہ بڑی ہی تھی۔

نہایت سمجھ دار اور معاملہ فہم۔

خود اعتمادی نہ سہی لیکن اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ بہت تھا۔

جبکہ بظاہر وہ لاابالی اور کھلنڈری سی نظر آتی تھی۔

اسے بھی عذیر کی طرح اپنے تایا کے گھر جانا زہر لگتا تھا مگر ماں کے اصرار اور بہن کی خوشی خاطر طوعاً و کرہاً اسے جانا ہی پڑتا تھا۔

اس روز بھی یہ دونوں بہنیں اپنی تایازاد قمرہ کی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کر کے واپس لوٹی تھیں۔ اصل میں ایک روز قبل ہی تائی نے اپنے گھر میں نہ صرف نیا فرنیچر ڈلوایا تھا۔ بلکہ نئی طرز سے گھر کی سیٹنگ بھی کرائی تھی، جس کی تعریف تقریباً سارے ہی مہمان کر رہے تھے، اور تایازاد بہنیں بہت فخریہ ایک ایک کو بتا رہی تھیں کہ ان کی ماں کا ذوق شروع سے ہی بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ وہ انتہائی سگھڑ یا سلیقہ پسند ہیں، صفائی ستھرائی کا تو انہیں مینیا ہے۔ بے ترتیبی اور میل کچیل تو یہ برداشت ہی نہیں کر سکتیں، اور تائی تھیں کہ اترائے جا رہی تھیں۔

تایازاد بہنوں نے تو اپنی ماں کے سگھڑ پن کو جتایا تھا لیکن اپنے کمپلکس میں عنبر یہی سمجھی کہ انہوں نے پس پردہ اس پر اور اس کی امی پر چوٹ کی ہے۔ یا پھر دوسرے معنوں میں خود اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ اس کا گھر اور گھر میں سیٹنگ بھی کچھ ایسی ہی ہو، جو کہ ناممکن ہی تھی۔

اس لیے گھر میں داخل ہوتے ہی بلاوجہ اس نے اپنی ماں سے الجھنا شروع کر دیا تھا۔ جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ سامان جسے وہ کاٹھ کباڑ سے تشبیہہ دے رہی تھی اگر برآمدے سے ہٹا بھی دیا جاتا تو بھی برآمدے کی خستہ حالی میں کوئی فرق نہ آتا۔ بس اسی احساس نے تو اسے سخت جھنجلاہٹ اور کوفت میں مبتلا کر رکھا تھا۔

اس پر مستزاد اس روز ریحان بھی اس سے بے رخی سے پیش آیا تھا۔ اس سے علیک سلیک کے بعد اس کے قریب بھی نہیں پھٹکا تھا۔ بس اپنے دوستوں سے ہی ہنستا بولتا رہا تھا۔ اور وہ اپنی بے بسی اور مجبوری کا سارا غبار گھر آ کر نکال رہی تھی۔ کہ تبھی سعد ایک دم ہی کہیں سے ٹپک پڑا تھا۔ نہ صرف ٹپک ہی پڑا تھا۔ بلکہ اس نے اس کی ماں کی ساری گفتگو بھی سن لی تھی۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ اس نے اس کے گھریلو معاملات میں دخل بھی دیا تھا۔ اور اس کے گھر کو چوہے دان سے تشبیہہ دے کر گویا تایا کے مقابلے میں اس کی بے حیثیتی پر کھلی چوٹ کی تھی، جبکہ وہ تو شروع ہی سے اس سے خار کھاتی آئی تھی اور اپنے گھر اس کی آمد و رفت بڑھتی دیکھ کر کئی مرتبہ صاف صاف الفاظ میں انہیں ٹوک بھی چکی تھی۔

"امی! اب آپ کو محلے والوں کے انگلیاں اٹھانے اور رشتے داروں کے باتیں بنانے کا خوف نہیں رہا جو آپ نے ایک غیر اور اجنبی شخص کو بلا روک ٹوک اپنے گھر میں آنے کی اجازت دے رکھی ہے" یا کچھ اس قسم کے اعتراضات کہ "وہ کیوں آتا ہے؟"

"آپ نے اسے اتنا سر کیوں چڑھا لیا کہ وہ ہمارے نجی معاملات میں بھی دخل دینے لگا؟"

"اگر آتا بھی ہے تو بیٹھک میں بیٹھ کر عذیر کو پڑھایا کرے۔ اندر آ کر ہماری کم مائیگی کا تماشا دیکھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟"

تو ماں کا ایک ہی جواب ہوتا۔

"اے نوج، وہ غیر اور اجنبی کیوں ہونے لگا۔ اس سے تو تمہارا دوہرا رشتہ ہوتا ہے دوہرا۔ تمہارے چچا کا بیٹا بھی ہے اور ممانی کا بھانجا بھی اور میں بھلا اسے کیوں سر چڑھانے لگی۔ میں تو الٹی اس کی احسان مند ہوں کہ وہ بے چارہ اتنی دور سے عذیر کو پڑھانے آتا ہے۔ وہ بھی مفت اور بسوں میں دھکے کھاتا ہوا۔ لو بھلا ناظم آباد کیا یہاں قریب رکھا ہے۔ دو بسیں بدلنی پڑتی ہیں نگوڑے کو۔ مگر تم تو ناشکرے پن کے ساتھ کسی کا احسان ماننا جانتی ہی نہیں ہو۔" اور سعد کی طرفداری میں ماں کے اتنے ٹھوس دلائل پیش کرنے پر اسے چپ ہی سادھ لینی پڑتی تھی۔

اسے تو اس بات پر بھی ملال ہی نہیں غصہ بھی تھا۔ کہ سعد سے نہ صرف عذیر کی گاڑھی چھننے لگی تھی بلکہ چھوٹی بھی خوب گھل مل گئی تھی۔ اور سعد سے کافی امپریس نظر آتی تھی۔ وہ ایک طرح روز کا ہی آنے والا تھا۔ لیکن چھوٹی اس کی آؤ بھگت اسی طرح کرتی جیسے وہ پہلی مرتبہ آیا ہو۔ یا بڑی اہمیت کا حامل ہو۔ اور تو اور دونوں بہن بھائی اس کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور نجانے دبی دبی آواز میں معلوم کیا کیا باتیں کرتے رہتے۔ اور اس بات پر وہ چھوٹی کو ڈانٹتی اور ٹوکتی رہتی تھی۔ مگر چھوٹی اس معاملے میں بالکل چکنا گھڑا ہی ثابت ہوئی تھی کہ یا تو اس کی ڈانٹ ڈپٹ کو مذاق میں اڑا دیتی یا پھر برا مان جاتی تو چمک کر کہتی۔

"اونہہ! آپ کو تو خوامخواہ ہی بے چارے سعد بھائی سے بلّلہی بغض ہو گیا ہے۔ ورنہ وہ تو بہت ہی بے ضرر۔ اور ڈیسنٹ انسان ہیں بلکہ بڑے کام کی شے ہیں۔" یوں بھی چھوٹی بہت عقلمند اور باشعور لڑکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی آپا اپنے حد سے بڑھے ہوئے احساس کمتری کی وجہ سے ہی سعد سے اس قدر خار کھاتی ہے۔

اپنے انٹرمیڈیٹ کے رزلٹ کا اسے بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ ماں تو اسے مزید تعلیم دلوانے کے حق میں نہ تھیں ان کا کہنا تھا کہ انٹر کرنے کے بعد وہ گھر میں بیٹھے اور اپنے بجائے عذیر کو زیادہ تعلیم دلوائے تاکہ وہ کسی قابل ہو سکے۔ مگر عنبر کی ضد تھی کہ وہ بی۔ اے ضرور کرے گی۔ رہا عذیر کو تعلیم دلوانے کا سوال تو جب تک وہ گریجویشن کرے گی۔ اس وقت تک عذیر میٹرک کر لے گا۔ اور پھر وہ اپنی ٹیوشنز کا سارا پیسہ اس کی تعلیم پر لگا دیا کرے گی، اصل میں عذیر کا رجحان تو سائنس کی طرف تھا۔ لیکن چونکہ حالات اجازت نہیں دیتے تھے اسی لیے اس کا ارادہ تھا کہ میٹرک کے بعد وہ کامرس لے لے گا۔ جبکہ ابھی تو وہ آٹھویں جماعت تک ہی پہنچا تھا اور اس سمے بھی جب عنبر ماں پہ انٹر کے بعد بھی پڑھنے کا ارادہ ظاہر کرتی تو ان کا دل چاہتا کہ بیٹی کو سمجھائیں کہ تم جو آگے پڑھنے کا سوچ رہی ہو تو اگر ادھر سے تمہارے تایا نے شادی کا تقاضا کر دیا تو پھر تم کیا کرو گی۔ مگر یہ بات بھی وہ ہمیشہ لبوں پہ روک کر رہ جاتیں کہ بے چاری حالات کے ہاتھوں اتنی بے بس اور لاچار تھیں کہ وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھیں کہ انہیں اپنے جیٹھ جیٹھانی کا ہی کچھ بھروسا نہ تھا۔

بہرکیف ایک دن عنبر کا رزلٹ بھی آؤٹ ہو گیا۔ وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔ اور اس کے لیے یہی بہت غنیمت تھا۔ کیونکہ اس نے کسی کی مدد کے بغیر جی جان سے محنت کی تھی۔ اور پھر انگریزی کے مضمون میں وہ شروع ہی سے کمزور تھی۔ پھر بھی پاس ہو گئی تھی۔ سعد نے تو اس کے اس کارنامے کو بڑا سراہا تھا۔ بڑی تعریف کی تھی۔ اور اسی خوشی میں اسی وقت بازار سے دو کلو مٹھائی بھی لے آیا تھا۔ اس روز چونکہ وہ بہت خوش تھی اس لیے اس نے بڑے روادارانہ لہجے میں نہ صرف اس سے بات کی تھی بلکہ اس کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ اور اتنی ساری مٹھائی لانے پر خوشی کا اظہار بھی کیا تھا۔

شاید سعد نے ہی تایا کے گھر والوں کو اس کے انٹر میں پاس ہو جانے کی اطلاع دی تھی۔ جو اگلے روز ریحان اور رضوان ایک کلو مٹھائی کا ڈبہ لیے اسے مبارک باد دینے آ گئے تھے، تائی نے تو جیسے اس گھر میں نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بس دادی کے اور اس کے والد کے انتقال کے موقع پر ہی آئی تھیں۔ اور تایا بھی بس ایک دو بار ہی آئے تھے۔ بہرحال عنبر کے لیے یہی بہت تھا کہ ریحان بنفس نفیس خود اسے مبارکباد دینے آیا تھا۔ خورشید جو شروع ہی سے اسے ہونے والے داماد کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ اور اس کی خاطروں میں بچھ بچھ جاتی تھیں۔ انہوں نے بہت سے لوازمات کے ساتھ چائے پلوانے کے بعد اس کے ہزار رسیاں تڑوانے کی کوشش کے باوجود اسے اور اس کے بھائی کو رات کھانا کھلوا کر ہی جانے دیا تھا۔

وہ جتنی دیر بیٹھا رہا تھا۔ زیادہ تر عنبر کی طرف ہی متوجہ رہا تھا اور اس سے ہی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے اسے پاس ہو جانے کی مبارکباد دی تھی اور اس کے مستقبل کے بارے میں بھی سوالات کرتا رہا تھا۔

کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے؟

کیا وہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے؟ وغیرہ

تو عنبر نے قدرے شرما کر اور قدرے اٹھلا کر کہا تھا۔

"ارادہ تو پڑھنے کا ہی ہے لیکن آپ کا آئندہ کے لیے جو ارادہ ہو گا۔ اسی کے مطابق کروں گی۔"

"ارے نہیں، مجھے تو بڑی خوشی ہوئی ہے یہ جان کر کہ تم آگے بھی پڑھنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ تم تو خوب پڑھو۔ علم انسان کی قابلیت میں اضافہ ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے اندر چھپی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ اور جہاں تک میرے ارادے کا تعلق ہے تو میرا تو گویا نصب العین ہی ہے یہ تعلیم کا حصول، یہ سمجھ لو کہ مجھ پر ایک جنون سا سوار ہے تعلیم حاصل کرنے کا" ریحان نے بڑی خوبصورتی سے اس کے سوال کی اصل مقصدیت کو گول کر دیا۔

"مگر آپ نے تو اکنامکس میں ایم اے کر لیا ہے، اب مزید کیا کرنا چاہتے ہیں آپ؟" وہ جو اس کے جواب پر بجھ سی گئی تھی۔ اس نے بیزاری سے پوچھا۔

"بھئی، میرے سامنے دو سبجیکٹس ہیں، ایک ایم۔ اے ایل ایل بی کر کے بار ایٹ لاء کرنا، دوسرا ایم۔ بی۔ اے۔ اور پاپا ہیں کہ ایم۔ بی۔ اے پر زور دے رہے ہیں کہ آخر تو مجھے ہی اُن کا کاروبار سنبھالنا ہے اور میرے اندر ان کے کاروبار کو ڈیل کرنے کی پوری صلاحیت ہونی چاہیے نا۔ بہت ممکن ہے اس کے لیے مجھے بیرون ملک بھی جانا پڑے۔" ریحان نے اپنے مستقبل کے پروگرام پر روشنی ڈالی تو اس کی صورت بالکل ہی اُتر کر رہ گئی۔

"اچھا!" اس نے لبوں تک آئی آہ کو اندر ہی گھونٹ کر آہستہ سے کہا۔

"اوہو اتنے لمبے لمبے سانس لینے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارا مسئلہ تو ہم سب سے پہلے حل کریں گے۔" ریحان نے اس کے اچھا کہنے کے انداز پر مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"بھئی، بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا مطلب اگر پہلے سے بتا دیا جائے تو ان کا مقصد فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔" ریحان نے عین اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑے دلنشین انداز میں مسکرا کر کہا تو لجانے کے باوجود وہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

وہ لگ بھی تو اتنا اچھا رہا تھا۔

اسٹیل گرے رنگ کی پینٹ اور ہلکے لیمن کلر کی ٹی شرٹ میں جو شاید امپورٹڈ تھی، اس کا بھرا بھرا جسم۔ چوڑا چکلا سینہ اور اُجلی اُجلی رنگت کا سُرخی مائل دمکتا ہوا چہرہ۔ اس کے دل میں اُترا جا رہا تھا۔

اس کی آنکھیں نیلی نہ سہی مگر سبزی مائل ضرور تھیں۔ جنہیں کرنجی آنکھیں بھی کہا جاتا ہے۔ اور عنبر تو بس انہی کرنجی آنکھوں کی دیوانی تھی۔

"بھئی، کوئی ہم تمہاری طرف سے غافل تو نہیں ہیں نا۔ بس ذرا مصروفیت بڑھ گئی۔ بلکہ یہ سمجھو کہ موقع کی تاک میں ہیں سمجھ گئیں نا۔" جواب میں اسے خاموش سا دیکھ کر ریحان نے گویا اسے دلاسا دیا۔

"جی نہیں، بالکل نہیں سمجھی۔" اس نے روکھا سا منہ بنا کر کہا اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"اب اس قدر بے ساختگی سے ہنس کر میرے دل پر آرے تو نہ چلاؤ۔" وہ غالباً اس کے کھلکھلا کر ہنسنے کے انداز پر مسحور سا ہو کر بولا۔ تو وہ اس کے دل پہ آرے چلانے کہنے پر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ اور اس کے اس بُری طرح ہنسنے پر آخر ماں نے اسے ٹوک ہی دیا۔

"اے آخر ایسے کیا چٹکلے چھوڑ رہے ہیں، یہ ریحان میاں جو تم یوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہی ہو۔"

"امّی! یہ باتیں ہی ایسی کرتے ہیں۔" عنبر نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، ابھی آپا کے ہنسنے پر ان سے کہہ رہے تھے کہ" چھوٹی نے جو ان دونوں کے قریب ہی بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اصل بات بتانی چاہی تو ریحان جلدی سے بولا۔

"جی ہاں میں ان سے کہہ رہا تھا کہ امتحان میں اپنی کامیابی پر اس قدر دانت نکالنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب اس سے بھی زیادہ دل جمعی اور محنت سے پڑھنا۔ ادھر ہاتھ پیر چھوڑ کر گھر میں نہ بیٹھ رہنا۔" ریحان نے جس انداز میں بات بنائی۔ عنبر تو عنبر چھوٹی بھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

"لیجیے چچی جان! بھلا اس میں بھی کوئی ہنسنے کی بات ہے جو یہ دونوں۔" ریحان نے کہنا چاہا تو خورشید جہاں جو اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں۔ بڑی بیزاری سے بولیں۔

"اے ان کو تو رہنے ہی دو، یہ دونوں تو پاگل ہیں ایک دم۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اس نے انٹر کر لیا یہی بہت ہے۔ اب تو اسے اپنے گھر بار کا ہونا چاہیے، یوں بھی یہ انیس بیس سال یہی عمر ہوتی ہے شادی کی۔"

"ارے نہیں چچی جان! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اب زمانہ دوسرا آ گیا ہے۔ یہ انیس بیس سال کی عمر تو بہت چھوٹی سمجھی جاتی ہے آج کل۔ اب اپنی شمسہ کو ہی لے لیجیے۔ تیئیسویں برس اس کی شادی ہوئی ہے، تیئیسویں برس۔ یوں بھی آج کل کم تعلیم یافتہ لڑکیوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔"

ریحان نے کہا تو چاہنے کے باوجود خورشید جہاں اس سے یہ نہیں پوچھ سکیں کہ آخر تم کب تک میری بیٹی کو بیاہ کر لے جاؤ گے۔

اور اگر تم کہیں بیرون ملک چلے گئے تو آخر کب تک لوٹ کر آؤ گے، یا میری بیٹی کو کب تک تمہاری راہ دیکھنی پڑے گی، البتہ انہوں نے اتنا ضرور کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم بیرون ملک جا کر کیا کرو گے بیٹے۔ تعلیم تو تم نے مکمل کر ہی لی ہے۔ اب باپ کا کاروبار سنبھالو، بھائی جان تو پہلے ہی بیمار رہتے ہیں۔ یاد رکھو موٹا آدمی دُبلے آدمی سے کمزور ہی ہوتا ہے اور ان پر یہ موٹاپا محض بادی کی وجہ سے چڑھا ہے۔ بلغمی مزاج معلوم ہوتا ہے ان کا۔" ماں نے موٹاپے کی بنیادی وجوہات پر روشنی ڈالنا شروع کی۔ عنبر نے اُکتا کر کہا۔

"خیر، اب تایا ابو اس قدر بھی موٹے نہیں ہیں کہ اپنا کوئی کام ہی نہ کر سکیں۔ اب یہ یہاں رہ کر ان کا ہاتھ بٹائیں یا مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک جائیں۔ میں تو ہر حالت میں اپنی پڑھائی جاری رکھوں گی۔"

"ہُرّا — یہ بات ہوئی نا، مجھے تم سے یہی امید تھی ڈیئر کزن۔" ریحان خوش ہو کر بولا۔ اور پھر خورشید جہاں سے اجازت لے کر جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے عنبر کو پھر تاکید کر گیا۔

"دیکھو، اب پڑھائی چھوڑ کر نہ بیٹھ جانا۔ بلکہ خوب دل لگا کر پڑھنا۔ مجھے پڑھی لکھی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

اس نے آہستہ سے اس کے شانے کو تھپک کر کہا اور پھر اپنے چھوٹے بھائی رضوان کے ساتھ رخصت ہو گیا، اور وہ اس کے جانے کے بعد بڑی دیر تک اس کی مسحور کن شخصیت اور باتوں میں ڈوبی رہی۔ یوں بھی اس روز اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا کہ ایک تو وہ اسے پاس ہونے کی مبارکباد دینے آیا تھا۔ وہ بھی مٹھائی لے کر۔ دوسرے کافی دن بعد۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اور باتیں بھی کیسی۔

شوخ سی معنیٰ خیزی میں لپٹی دل کو گدگدا دینے والی۔

وہ اسے بڑے اصرار سے تعلیم جاری رکھنے کی تاکید کر کے گیا تھا۔

اور وہ بھی تہیہ کر چکی تھی کہ ماں خواہ کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کریں، وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے گی۔

چھوٹی بھی جو سگا تایا زاد ہونے کے ناتے سگے بڑے بھائی کا رتبہ ہی دیتی تھی۔ اس کے آنے سے بڑی خوش ہوئی تھی۔ اور اس کے مزید تعلیم جاری رکھنے کے مشورے سے متفق بھی تھی۔ مگر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ جو مٹھائی ریحان اپنے ساتھ لایا تھا وہ عنبر کے پاس ہونے کی خوشی میں نہیں بھیجی گئی تھی بلکہ ریحان کی چھوٹی بہن ثمرہ کی نسبت کہیں قرار پا جانے کی خوشی میں بھیجی گئی تھی تو وہ ایکدم ہتھے سے ہی اُکھڑ گئی۔

"آخر کیا ضرورت تھی کہیں سے آئی ہوئی مٹھائی لانے کی۔ کیا اپنی جیب سے پیسہ خرچ کر کے ریحان بھائی تازہ مٹھائی نہیں لا سکتے تھے، یہ تو نہیں پاؤ بھی نہیں ہے، وہ بھی کئی دن کی باسی ہے۔ ایمان سے امّی نے مجھے اسی وقت بتا دیا ہوتا تو چاہے وہ بُرا مانتے یا بھلا میں یہ مٹھائی انہیں واپس لوٹا دیتی۔ ہاں بھلا کیا سمجھ رکھا ہے ان لوگوں نے ہمیں، کیا ہم ان چیزوں کے لیے ترسے پھڑکے ہیں۔"

"ارے چھوڑو چھوٹی، بڑی چیپ سی لگتی ہے یہ مٹھائی وٹھائی پر لڑنے کی بات، اگر وہ میرے لیے کچھ نہیں لائے تو نہ سہی یہی کیا کم ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں اپنی خوشی میں شامل کرنے کے قابل تو سمجھا یہ مٹھائی بھیج کر۔" وہ جو ابھی تک ریحان کے تصور میں مگن تھی اس نے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کچھ اتنے مصالحانہ انداز میں کہا کہ چھوٹی حیران رہ گئی۔ کیونکہ وہ تو ایسی ہی چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں کو گرفت کر لینے اور ایک ذرا سی احساسات کو ٹھیس پہنچانے والی بات پر جھگڑا کھڑا کر دینے کی عادی تھی۔ چھوٹی نے اس کی بات پر جل کر طنز کیا۔

"کمال ہے آپا! یہ آپ کہہ رہی ہیں، کیا اس لیے نا کہ ریحان بھائی نے تھوڑی دیر ہنس کر آپ سے بات کر لی ہے، مگر شاید آپ بھول گئیں کہ پچھلی بار جب آپ ان کے گھر گئی تھیں تو انہوں نے ڈھنگ سے آپ کو پہچانا بھی نہیں تھا۔"

"اگر نہیں بھی پہچانا تھا تو تمہیں کیا۔ جبکہ میں نے تو ذرا سا بھی فیل نہیں کیا تھا۔" وہ تنک کر بولی تو چھوٹی نے یہ سوچ کر پھر کچھ نہیں کہا کہ جب آپا کو ہی اپنی ناقدری کی پرواہ نہیں تو پھر میں کچھ کہہ کر کیوں بُری بنوں۔

ابھی تو رزلٹ ہی آیا تھا۔ گرما کی تعطیل کی وجہ سے تعلیمی ادارے بند تھے، عنبر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ گھڑی کی چوتھائی میں اپنے بی اے کا فارم بھر دے، وہ گھر میں بیٹھی کالج کھلنے کا انتظار کرتی رہتی، اس کی ایک ہی دوست تھی عالیہ، جو اس کی ہم جماعت بھی تھی اور جس نے اس کے ساتھ ہی انٹر کا امتحان دیا تھا، وہ پہلے بھی کئی بار عذیر کو ساتھ لے کر اس کے یہاں جا چکی تھی مگر ان دنوں اتفاق سے عالیہ بھی اپنے ماموں زاد کی شادی میں شرکت کرنے اسلام آباد گئی ہوئی تھی اس لیے بھی

اس کا وقت سخت بوریت میں گزر رہا تھا۔ یوں بھی آج کل تو بس ہر طرف پیسے کی بہار ہے۔ اس کے ساتھ جتنی بھی لڑکیاں پڑھتی تھیں ان میں سے بیشتر متمول اور کھاتے پیتے گھرانوں کی تھیں۔ جو اس کی طرح کالج کے بعد گھر میں گھس کر نہیں بیٹھتی تھیں بلکہ تھوڑی دیر آرام کر کے اپنی اپنی گاڑیوں میں مزے سے ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں۔ اور انہیں دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں بھی یہ خواہش چٹکیاں لیتی تھی کہ وہ بھی اسی طرح گھومے پھرے۔ اور موج منائے۔ مگر وہاں تو رکشہ کے کرائے کے پیسے بھی پاس نہیں ہوتے تھے۔ اسی لیے اس کا دل چاہتا تھا کہ ریحان اسے جلد سے جلد اپنا لے۔

جس دن سے وہ اس سے مل کر گیا تھا جانے کتنی بار اس کے دل نے تمنا کی تھی کہ وہ پھر آئے۔ اس کے پاس بیٹھے۔ اس سے باتیں کرے۔

مگر وہ کسی طرح آیا ہی نہیں۔ تب اس نے سوچا کہ وہ خود کیوں نہ تایا کے یہاں چلی جائے، یوں بھی بہت دن ہو گئے تھے، ان کے یہاں گئے۔ اسے یاد تھا ایک مرتبہ شمسہ نے کہا تھا کہ تم تو بس بلانے پر ہی آتی ہو، یہ نہیں ہوتا کہ کبھی خود بھی آ جایا کرو۔ اصل میں شمسہ کے اندر دوسروں کے مقابلے میں مروت اور اخلاص بہت تھا اور پھر اس نے اپنی عمر کے ابتدائی آٹھ نو برس اسی دو کمروں والے گھر میں گزارے تھے۔ اس لیے کبھی کبھی وہ بڑی یگانگت سے پیش آتی تھی۔ مگر ان دنوں تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہانگ کانگ گئی ہوئی تھی۔

بہر حال ماں بھی کئی بار کہہ چکی تھیں کہ وہ دونوں جا کر ان کی طرف سے قمرہ کی نسبت طے پانے کی مبارکباد دے آئیں، کچھ اس وجہ سے بھی اس نے بہت کہہ سن کر چھوٹی کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ عذیر کو ساتھ لے کر یہ دونوں تایا کے یہاں پہنچیں تو وہاں کوئی پارٹی ہو رہی تھی، خاصی تعداد میں مہمان مدعو تھے، اور تقریباً سب نے ہی نئے فیشن کے عمدہ عمدہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور ان تینوں بھائی بہنوں کو دیکھ کر تائی اور قمرہ وغیرہ کا تو منہ بن گیا تھا۔ تائی نے نہایت ناگواری اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے قمرہ سے سرگوشی میں پوچھا۔

"اُفوہ! ان مصیبتوں کو کس نے بلایا تھا اس وقت جو یہ ہماری ناک کٹوانے آگئیں۔"

"کیا پتا امی یہ تینوں کیسے نازل ہو گئے۔ ہم نے تو انہیں نہیں بلوایا تھا۔" قمرہ بھی بڑی بیزاری سے بولی۔

"ممکن ہے، بھائی جان نے بلوایا ہو۔" چھوٹے عرفان نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ہاں، ان کے سوا بھلا اور کون بلا سکتا ہے ان لوگوں کو۔" قمرہ نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

اصل میں قمرہ کی جس لڑکے سے نسبت طے ہوئی تھی اس کے چند رشتے دار انڈیا سے آئے ہوئے تھے اور انہی کے اعزاز میں یہ دعوت دی گئی تھی جس میں قمرہ کی چند سہیلیاں تائی اور تایا کے واقف کار اور تینوں لڑکوں کے دوست احباب ہی مدعو کیے گئے تھے۔ اور قمرہ بڑی اترائی اترائی ہوئی پھر رہی تھی۔ عذیر تو اتنے سارے مہمانوں کو دیکھ کر فوراً ہی واپس لوٹ گیا تھا۔ یہ دونوں ایک تو بن بلائے گئی تھیں۔ دوسرے بغیر اطلاع دیے گئی تھیں۔ اس پہ ان کے کپڑے بھی بہت سادہ سے تھے۔ اس لیے بھی یہ دونوں بُری طرح جھینپ رہی تھیں۔ ادھر اپنی اس جھینپ میں جب عنبر نے آتے ہی تائی کو ماں کی طرف سے مٹھائی بھیجنے کی مبارکباد دی تو انہوں نے تمسخرانہ سے انداز میں ہنس کر کہا۔

"اے یہ تو اب بہت پرانی بات ہو گئی۔ اب تو خیر سے قمرہ کی شادی ہونے والی ہے۔ اور تمہاری ماں کو اتنے دن بعد خیال آیا ہے مبارکباد دینے کا۔"

"وہ تائی اماں اصل میں ہمارا گھر سے نکلنا ذرا مشکل ہوتا ہے نا۔ بس اسی وجہ سے دیر ہو گئی ورنہ امی تو اسی روز سے برابر کہہ رہی تھیں جب مٹھائی آئی تھی تم جا کر تایا تائی کو مبارکباد دے آؤ۔" عنبر نے گویا صفائی پیش کی۔ مگر تائی نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ ایک مہمان خاتون کا استقبال کرنے آگے بڑھ گئیں۔

ان دنوں برکھا رُت شروع ہو چکی تھی مگر کراچی کا تو کچھ مزاج ہی نرالا ہے، کبھی ایک دن میں سارے موسم ہی ہو جاتے اور کبھی برسات کا موسم یونہی خشک ہی گزر جاتا ہے۔ اودی اودی بھری بھری بدلیاں بھی تیز ہواؤں کے ساتھ بھاپ بن کر اُڑ جاتی ہیں۔ اور اگر بارش شروع ہوتی ہے تو دنوں برستی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سڑکیں نہروں کا نقشہ پیش کرنے لگتی ہیں۔ اور ندیوں کے بند ٹوٹ جانے کی وجہ سے نواحی علاقوں میں سیلاب تک آ جاتا ہے۔ غرضیکہ جل تھل ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ موسم برسات کی ایک خشک سی شام تھی۔ آسمان پہ بدلیاں ضرور چھائی ہوئی تھیں لیکن ہوا رکی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے خاصی گرمی

ہو گئی تھی۔ مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام صوفے اور کرسیاں ڈال کر لان میں کیا گیا تھا۔ مگر آج کل کے مہمان ایک جگہ ٹک کر کہاں بیٹھتے ہیں۔ لابی سے لے کر اندر تک مہمان گھوم پھر رہے تھے۔ عنبر چھوٹی کے ساتھ اب تک کھڑی ہی تھی۔ وہ اس وقت اس قدر بے موقع یہاں آ کر پچھتا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں مہمانوں میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں کہ ریحان ہی کہیں نظر آ جائے تایا تو کہیں نظر ہی نہیں آئے تھے ورنہ وہ اُسے یقیناً ہاتھوں ہاتھ لیتے۔

ریحان مہمانوں کے درمیان گھرا بیٹھا ہنس بول رہا تھا کہ چھوٹے بھائی عرفان نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔

"بھائی جان! کیا آپ نے عنبر آپا اور چھوٹی کو بھی انوائیٹ کیا تھا؟"

"نہیں تو۔ مگر تمہیں ان کا خیال کیسے آیا؟" عرفان کے منہ سے عنبر اور چھوٹی کا نام سن کر ریحان کو تعجب سا ہوا تو اس نے پوچھا۔

"خیال تو نہیں آیا مگر انہیں یہاں دیکھ کر ذہن میں یہ سوال ضرور اُبھرا کہ وہ اچانک کیسے آگئیں۔" عرفان ایک حاضر جواب تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"خیر، اگر آبھی گئی ہیں تو اس میں اس قدر تعجب کی کیا بات ہے۔ ممکن ہے پاپا نے انہیں بلوایا ہو۔" عنبر اور چھوٹی کی اچانک آمد ناگوار گزرنے کے باوجود بھائی کے سامنے اس نے اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ پھر وہ اٹھ کر سیدھا عنبر کے پاس ہی آگیا۔

"کیوں بھئی تم دونوں یہاں کیسے؟ کیا بلوایا گیا تھا یہاں سے تمہارا؟" ریحان نے علیک سلیک بھی نہ کی اور چھوٹتے ہی پوچھا۔ تو عنبر کے جو خود یہاں آ کر نہ صرف پچھتا رہی تھی بلکہ سخت کمپلیکسڈ بھی ہو رہی تھی کچھ کہنے سے قبل ہی چھوٹی نے تڑخ کر کہا۔

"کیوں کیا ہمارے یہاں آنے پر کوئی پابندی لگی ہوئی ہے یا ہمارا یہاں آنا کوئی معیوب بات ہے جو آپ اس قدر متعجب ہو کر پوچھ رہے ہیں۔" اور چھوٹی کی بات پر ریحان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اسے ایک دم چھوٹتے ہی نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ تو اس نے ہنسی میں بات اُڑانی چاہی۔

"ارے نہیں نہیں، یہ کون کہہ رہا ہے۔ میں نے تو اسی لیے پوچھا کہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ کہ تم دونوں بھی آ رہی ہو یا تمہیں بھی بلایا گیا ہے۔ او ہو بھئی عنبر ذرا تم ہی اس چھوٹی کو سمجھا دو ورنہ میری بات تو اس کے چھوٹے سے ذہن میں نہیں سمائے گی۔" ریحان نے بڑی چالاکی سے کام لے کر گویا عنبر کو اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ تو عنبر اس کے اپنا پن برتنے پہ ساری کوفت اور شرمندگی بھول بھال کر چھوٹی سے بولی۔

"اے چھوٹی! اس میں اتنا بُرا ماننے کی کیا بات ہے، یہ سچ ہی تو کہہ رہے ہیں ہم تو یونہی بیٹھے بٹھائے دل چاہا تو چلے آئے، اب ان کو کیا معلوم تھا کہ ہم بھی آئے ہیں ظاہر ہے ہمیں دیکھ کر انہیں تعجب ہی ہوا ہوگا۔" اور چھوٹی نے سر کو جھٹک کر صرف اونہہ کہنے پر اکتفا کیا۔

"سنو، میں تو اس وقت ادھر قمرہ کے سسرالیوں کی تواضع میں مصروف ہوں تم دونوں ایسا کرو کہ لاؤنج میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ وہاں تمہیں کسی کی کمپنی بھی مل جائے گی۔" ریحان نے کچھ سوچ کر کہا۔ اور پھر عنبر کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

"آؤ چلو، میں خود تمہیں لاؤنج میں چھوڑ دیتا ہوں۔" تو عنبر اس کے قرب اور ہاتھ کے لمس سے مسحور ہو کر چپ چاپ اس کے ساتھ چل دی۔ چھوٹی بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"یہ کلر تم پر جچ تو بہت رہا ہے پیل اورنج ہے نا۔ مگر اس پارٹی کے لحاظ سے تمہارا یہ لباس بالکل موزوں نہیں۔" ریحان نے بڑی ترکیب سے اس کے سادہ سے لباس پر نکتہ چینی کی۔

"موزوں تو نہیں ہے لیکن یہ کیسے معلوم تھا کہ یہاں اتنے ٹھاٹھ سے دعوت ہو رہی ہے۔" عنبر نے قدرے اٹھلا کر کہا۔

"ہاں، لیکن یہاں تو عموماً ایسی پارٹیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ لہٰذا تم کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ میرا مطلب ہے تم عام دنوں میں بھی عمدہ لباس پہن کر آیا کرو۔"

ریحان نے آخر وہ بات جتا ہی دی جو کبھی ایسے موقعوں پر وہ اسے جتانا چاہتا تھا۔

"لیکن ہماری تو یہی عمدہ ترین ڈریسنگ ہوتی ہے ریحان بھائی جو ہم کر کے آئے ہیں۔ اب اس سے زیادہ ہماری بساط

ہے نہ ہوتا۔ کیونکہ ہمارا باپ ہمارے سروں پر نہیں ہے اور یہ بات آپ کو بھی معلوم ہے۔"

تو ریحان جس کے دل میں اپنی چچازادوں کی تھوڑی بہت ہمدردی تھی۔ دل ہی دل میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے ہنس کر بولا۔

"ارے تمہاری بات کون کر رہا ہے تم تو زرق برق لباس بھی پہن لو تو بھنگن ہی لگو گی۔ میں تو عنبر کی بات کر رہا تھا۔ ان پر تو معمولی لباس بھی بہت جچتا ہے۔"

"خیر، جچتا ہو گا۔ لیکن اگر میں بھنگن بھی لگتی ہوں تو یہ مت بھولیے کہ یہ آپا میری سگی بڑی بہن ہیں۔" چھوٹی اس کے مذاق پر چڑ کر بولی۔

"نہیں بھئی، مجھے تو اس میں بھی شک ہے۔ عنبر! تم گھر جا کر اس چھوٹی کے سر پہ چچی جان کا ہاتھ رکھوا کر ذرا ان سے یہ پوچھنا کہ انہوں نے اسے کسی بھوسی ٹکڑے والی سے خریدا تھا یا حلال خوری سے۔" ریحان نے اسے مزید چھیڑا تو اس کی بات پر عنبر زور زور سے ہنسنے لگی۔ جبکہ چھوٹی کا منہ بُری طرح پھول گیا۔ وہ جل کر بولی۔

"خیر، آپ بھنگن کہیں یا چماری، میں تو بالکل برا نہ مانوں گی۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ بیوی کو لونڈی کہا تو وہ ہنسنے لگی اور لونڈی کو لونڈی کہا تو وہ رونے لگی۔"

"ہاں ہاں، وہ تو تمہاری صورت سے ہی ظاہر ہے۔ بس ذرا سی ٹھیس لگنے کی دیر ہے۔ پھر ٹپ ٹپ تمہاری آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے۔" اور چھوٹی تڑاخ کر کچھ کہنا ہی چاہ رہی تھی کہ تائی جنہوں نے ریحان کو ان سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ زور سے اسے پکارا تو وہ فوراً ہی ان کی طرف پلٹ گیا۔ اور اس کے جاتے ہی عنبر نے چھوٹی کی خبر لی۔

"تم تو بہت ہی زبان دراز ہو گئی ہو چھوٹی۔ آخر وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ تم سے مذاق ہی تو کر رہے تھے۔ تمہیں ان سے اتنا منہ نہیں لگنا چاہیے تھا۔"

"ہونہہ۔ منہ لگنا کیسا، میں تو ان کو کھری کھری سنا دیتی ہوں، کیونکہ وہ جس طرح ہمیں ذلیل کرتے ہیں آپ کو تو ان کی محبت میں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ مگر کم از کم میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔" جب چھوٹی کا موڈ کسی بات پر آف ہوتا تھا کہ تو وہ بڑی بہن کی بھی نہیں رکھتی تھی۔

"مگر انہوں نے ایسا کیا کہہ دیا جو تمہاری غیرت پر تازیانہ بن کر لگا ہے۔ ہم واقعی اتنے سادہ لباس میں آئے ہیں۔ کہ کوئی دوسرا بھی اس پر ہمیں ٹوک سکتا تھا۔ سو انہوں نے بھی ٹوک دیا۔" عنبر اس وقت اس سے کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لیے ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

"جی ہاں اور اسی وجہ سے وہ ہمارا مہمانوں کے درمیان بیٹھنا گوارا نہ کر سکے۔ اور ہمیں لاؤنج میں بٹھانے کے لیے آئے، جہاں مہمان خواتین کے ساتھ آئی آیائیں اور نوکرانیاں بیٹھی ہیں۔ اور اب ہمیں یہاں بٹھا کر بالکل بھول ہی جائیں گے۔"

وہ دونوں ابھی تک لاؤنج کے باہر ہی کھڑی تھیں۔ عنبر نے چھوٹی کے جتانے پر اندر لاؤنج میں ایک نظر ڈال کر دیکھ لیا تھا وہاں واقعی آیائیں اور ملازمہ ٹائپ کی عورتیں بیٹھی تھیں، عنبر کو تاؤ تو بہت آیا مگر یہی سوچ کر ریحان کو معلوم ہی نہ ہو گا کہ لاؤنج میں کون بیٹھا ہے اس نے اپنے غصے کو پی لیا تھا۔ مگر چھوٹی پر یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ لاؤنج میں ایک نظر ڈال چکی ہے بلکہ وہ تو چھوٹی سے دل برداشتہ اور کبیدہ سی وہیں کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ اسے کہاں بیٹھنا چاہیے کہ تبھی قمرہ اپنی ایک سہیلی مینے کا ہاتھ پکڑے ایک اور اجنبی صورت لڑکی کے ساتھ اندر آئی تو عنبر کو سامنے لاؤنج سے آگے کھڑا دیکھ کر مینے نے اس کے قریب رک کر اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"ہائے عنبر آپا! آپ بھی آئی ہیں، مگر کب آئیں آپ، میں نے تو آپ کو دیکھا تک نہیں۔"

"بس ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو آئی ہوں، شاید اسی لیے تم نے مجھے نہ دیکھا ہو گا۔" عنبر نے بھی محبت سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا، تو وہ اس اجنبی صورت لڑکی سے مخاطب ہو کر بولی۔

"معلوم بھی ہے شیری یہ عنبر آپا قمرہ کی فرسٹ کزن ہیں۔" تو چھوٹی فوراً ہی بولی۔

"جی یہ صرف قمرہ آپا کی فرسٹ کزن ہی نہیں بلکہ ریحان بھائی کی منگیتر بھی ہیں۔"

"ہیں۔ ویری اسٹرینج۔ از ویٹ سو قمرہ۔" مینے نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے انتہائی بے یقینی کے ساتھ قمرہ سے پوچھا تو قمرہ نے جس کا منہ چھوٹی کی بات پر بن سا گیا تھا گول مول سے انداز میں جواب دیا۔

"ہائے تم ایسے پوچھ رہی ہو جیسے یہ کوئی بہت ہی انوکھی بات ہو۔ بھئی بچپنے میں جیسا کہ آپس کے کزنز میں ہوتا ہے کہ ان کے بڑے انہیں ایک دوسرے سے منسوب کر دیتے ہیں تو دادا دادی نے بھی کچھ یہی کیا تھا۔ مگر باقاعدہ کوئی رشتہ طے ہوا تھا نہ رسم ہی ادا کی گئی تھی۔" اور پھر اس سے پہلے کہ دونوں بہنوں میں سے کوئی اس کی بات کا جواب دیتی۔ قمرہ نے عنبر سے کہا۔

"ارے آیئے نا عنبر آپا! آپ بھی لان میں چل کر بیٹھیے، آپ تو ہم لوگوں سے ہمیشہ غیریت ہی برتتی ہیں۔" اور جواب میں عنبر تڑخ کر کچھ کہنا ہی چاہ رہی تھی کہ مینے نے جو اسے بہت پسند کرتی تھی اس کا ہاتھ پکڑ کر شوخ سے انداز میں کہا۔

"اوہو آیئے نا عنبر آپا۔ آپ کی یہ شرم تو کچھ قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔" تو اس کے اس فقرے پر شیری ہنسنے لگی۔ اور لحاظ مروت میں عنبر کو ان کے ساتھ لان کا رُخ کرنا ہی پڑا۔ جبکہ ریحان کی باتوں سے اس نے یہی اخذ کیا تھا کہ وہ ان دونوں کا لان میں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔ عنبر ان تینوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی، چھوٹی کو بُری طرح نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی کہ شیری کو آگے بڑھتے بڑھتے کچھ خیال آیا تو اس نے پلٹ کر چھوٹی سے کہا۔

"آیئے آپ بھی آیئے، آپ ان کی چھوٹی بہن ہیں نا۔" اس کا اشارہ عنبر کی طرف تھا۔ چھوٹی نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ان سب کے ساتھ باہر لان میں آ گئی۔ قمرہ ان دونوں کو لان میں چھوڑ کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ مہمانوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اور عنبر بیٹھنے کے بجائے ابھی تک کھڑی ہی تھی۔

اصل میں وہ ایک کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئی تھی۔

باہر بنگلے کے وسیع و عریض لان میں ہلکے پھلکے سنیکس اور مشروبات سے مہمانوں کی خاطر تواضع کی جا رہی تھی۔ اور اندر کہیں سے آتی عمدہ اور مرغن کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مہمانوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا گیا ہے اور وہ کھانے کے وقت تک رکنے کا ارادہ رکھتی تھی نہ اتنی دیر تک رکنا اسے گوارا ہی تھا۔ مبادا کہ دیر ہو جانے کی وجہ سے ماں ہول ہول بیت الخلا کا قبضہ ہی لے کر بیٹھ جائیں۔ کہ وہ شکی مزاج نہیں بلکہ احتیاط پسند تھیں۔ حد درجے محتاط رہتی تھیں کہ یوں بھی غریب کی پونجی صرف اور صرف اس کی آبرو ہی ہوتی ہے۔

مگر مشکل یہ تھی کہ اس کے روکنے کے باوجود عذیر واپس لوٹ گیا تھا، اور واپسی کا مسئلہ ایک مرتبہ پھر انہیں شرمندگی سے دوچار کرنے پر تلا تھا۔ اس پریشانی میں تو اس سے اسنیکس بھی نہیں کھائے گئے تھے، جبکہ قمرہ محض اپنی سہیلیوں کے دکھانے۔ یا دنیا دکھاوے کی غرض سے اسنیکس وغیرہ سے ان کی خاطر تواضع بھی کر چکی تھی۔

آخر رضوان اسے سامنے سے گزرتا نظر آیا تو اس نے اسے آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔

"اوہو آپ۔ مگر کب آئیں آپ؟ میں نے تو دیکھا تک نہیں کہیں جادو وادو کرنا تو نہیں سیکھ لیا۔"

رضوان نے گویا یوں انجان بن کر اپنی جھینپ مٹائی، کیونکہ اس نے آتے ہی انہیں دیکھ لیا تھا۔

"جی نہیں، نہ ہم زنبیل اوڑھ کر اچانک وارد ہوئے ہیں نہ مکھی بن کر۔ بلکہ اپنے پورے عدد سمیت آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی آئے تھے اب یہ اور بات ہے کہ آپ کی بینائی میں ہی کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو۔" چھوٹی نے تڑ سے جواب دیا تو رضوان کانوں کی لوؤں کو چھو کر بولا۔

"اُف خدا کی پناہ! زبان ہے یا چارہ کاٹنے کی مشین، ان سے تو میں جیت ہی نہیں سکتا۔"

"خیر چھوڑو اسے یہ تو یونہی سب کے منہ لگتی رہتی ہے، اس وقت تو تم میرا ایک پرابلم سولو کر دو۔" عنبر جسے صرف اور صرف گھر جانے کی پڑی تھی بیزاری سے بولی۔

"میں آپ کا پرابلم سولو کر دوں۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ کا پرابلم تو ممی، پاپا اور بھائی جان ہی سولو کریں گے۔" رضوان نے شوخ سے انداز میں پرابلم سولو کرنے کا مطلب کچھ اور ہی ظاہر کیا تو عنبر تو عنبر چھوٹی کو بھی ہنسی آ گئی۔ مگر عنبر فوراً ہی اپنی ہنسی

پر قابو پا کر بولی۔

"اب سب کے سامنے ایک آدھ جڑ دوں گی تمہارے۔ بدتمیز کہیں کے، میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ بلکہ میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ کوئی آتا جاتا ہو تو اس سے کہہ کر ہمیں ہمارے گھر ڈراپ کرادو۔ عذیر آتے ہی چلا گیا ورنہ میں تمہیں اتنی زحمت بھی نہ دیتی۔"

"اچھا اچھا! ڈراپ بھی کرا دیں گے مگر ابھی کیا جلدی ہے۔ کھانا کھا کر ہی تو جائیں گی نا آپ۔" رضوان نے کہا۔

"نہیں بھئی، اگر کھانا کھا کر گئی تو امی کو یقیناً ڈائریا کی شکایت ہو جاتی۔ ہماری طرف سے ہول کھاتے کھاتے۔ یوں بھی بس تھوڑی دیر کے لیے آئی تھی امی اور اپنی طرف سے تائی اماں اور تایا ابو کو قمرہ کی نسبت قرار پانے کی مبارک باد دینے۔ میرے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہاں کسی کی دعوت ہو رہی ہے۔ تم پلیز ابھی ابھی کسی طرح ہماری واپسی کا انتظام کر دو۔"

عنبر نے گویا اس قدر بے موقع اپنے یہاں آنے کے سلسلے میں اپنی پوزیشن صاف کر کے کچھ اتنی عاجزی سے کہا کہ رضوان اپنا سر کھجا کر بولا۔

"اچھا پھر ٹھیک ہے میں ابھی تھوڑی دیر میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔" اور پھر وہ گیٹ کی طرف جانے کے بجائے ادھر بڑھ گیا۔ جہاں مہمانوں کا جمگھٹا سا لگا تھا۔ پھر انہیں صرف دس پندرہ منٹ ہی انتظار کرنا پڑا۔ رضوان نے شاہنواز کی گاڑی میں ان کے جانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ سب سے رخصت ہونے لگیں تو تائی نے تو انہیں منہ تک نہ لگایا۔ تایا ان دنوں اسلام آباد گئے ہوئے تھے البتہ قمرہ اور عرفان نے مزور کہا کہ وہ ابھی سے کیوں جا رہی ہیں۔ مگر رکنے پر کسی نے بھی اصرار نہیں کیا۔ ریحان تو پھر عنبر کو نظر ہی نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ اس سے نہ ملنے کی حسرت دل میں لیے چھوٹی کے ساتھ اپنے گھر واپس آ گئی۔

اس سمے دن ڈوبنے کے آثار پیدا ہو چکے تھے،

انہوں نے لباس تبدیل کیے بغیر بیٹھک میں ہی لڑنا شروع کر دیا تھا۔ اور چھوٹی عنبر کی کسی دل جلا دینے والی بات پر کہہ رہی تھی۔

"لیکن میں نے تو ہزار بار کان پکڑ پکڑ کر توبہ کی ہے کہ میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی پھر بھی آپ مجھے گھسیٹ کر زبردستی وہاں لے جاتی ہیں۔"

"نہیں میں تو نہیں لے جاتی یہ امی ہی زبردستی تمہیں میرے ساتھ کر دیتی ہیں۔ اور اگر جاتی بھی ہو تو کون سا میری سات پشت پر احسان کر دیتی ہو تم۔ تمہارا بھی تو ان لوگوں سے سگا رشتہ ہوتا ہے۔" عنبر بھی اپنی بات کو در کھنے کی عادی تھی۔ وہ بھلا چھوٹی کی کسی بات سے دبنے والی تھی۔

"اے ایسی کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے تم دونوں پر جو آتے ہی لڑنا شروع کر دیا۔ اللہ رکھے یہ ڈھونک کی ڈھونک ہو گئیں تم دونوں پھر بھی ننھے ننھے بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر لڑنے بیٹھ جاتی ہو۔" خورشید جہاں جو ان دونوں کی آوازیں سن کر بیٹھک میں آ گئی تھیں انہوں نے دونوں کو جھڑکا۔

"آپ ذرا ذرا سی بات کہہ رہی ہیں امی! اس نے تو آج انتہا کر دی بدتمیزی کی۔ ریحان بھائی نے (وہ ریحان کو ماں کے سامنے ریحان بھائی ہی کہتی تھی) ذرا سا مذاق کر دیا، تو یہ پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گئی، ایسی زبان چلائی ان سے کہ کیا بتاؤں۔ وہ تو میری وجہ سے بہت لحاظ کر لیتے ہیں اس کا۔ ورنہ جواب میں کوئی سخت سُست بات کہہ دیتے تو اس کی کرکری ہو کر رہ جاتی سب کے سامنے، اصل میں امی ہمیں تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا مگر جب ہم تایا ابو کے یہاں پہنچے تو وہاں قمرہ کے منگیتر کے چچا کی جو اپنی فیملی کے ساتھ انڈیا سے آئے ہوئے ہیں دعوت ہو رہی تھی۔ اتنے سارے مہمان آئے ہوئے تھے اس لیے گھر سے سب افراد ہی ان کی خاطر داری میں لگے ہوئے تھے کہیں رضوان نے کہہ دیا کہ اس نے ہمیں گھر میں آتے دیکھا ہی نہیں، بس پھر کیا تھا یہ چھوٹی اس کے سر ہو گئی۔ ایسے لتے لیے کہ اسے کان پکڑتے ہی بنی۔ اور میرے ٹوکنے پر یہ میرے منہ الگ لگی۔ یہ تو کہیں لے جانے کے قابل بھی نہیں ہے امی۔"

عنبر نے زبانی طور پر اتنا لمبا چوڑا شکایت نامہ ماں کے سامنے پیش کر کے گویا چھوٹی کی طرف سے اتنی دیر سے دل میں بھرا غبار نکالا تو ماں نے جو چھوٹی کے مزاج اور فطرت سے اچھی طرح واقف تھیں چھوٹی کو مخاطب کر کے کہا۔

"کیوں چھوٹی! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ کیا میں نے تمہیں اس لیے بہن کے ساتھ بھیجا تھا کہ تم وہاں جا کر میری ناک کٹواؤ۔ ارے ایسا کیا کہہ دیا تھا ریحان نے تجھے جو تو جلے پیر کی بلی بن گئی تھی۔"

اور ماں کے آخری فقرے پر تو چھوٹی کے پیروں سے لگی تو سر تک جا پہنچی۔ وہ تو پہلے ہی بہن کی غلط بیانی پر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ بلکہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ ایک دم ہی یوں بھڑکی جیسے بتی میں تیل کی زیادتی سے لالٹین بھڑکتی ہے۔

"خیر کچھ کہنے کا تو وہ منہ ہی نہیں رکھتے امی۔ اور اپنی کھوٹ بھری باتوں سے وہ جو کچھ بھی ظاہر کرتے ہیں کم از کم میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں سچی اور کھری آدمی ہوں۔ اب آپا نے آپ سے میری شکایت ہی کی ہے تو میں بھی اپنی بات کیے بغیر نہ رہوں گی۔"

"دیکھا دیکھا، امی آپ نے کیسی کترنی کی طرح زبان چل رہی ہے اس کی۔" عنبر نے دیکھا کہ اب چھوٹی اس کی شکایت کرنے کے درپے ہو رہی ہے تو اس نے اس کی منہ زوری کے خلاف ماں کو ابھارنا چاہا۔ مگر چھوٹی نے سلسلۂ کلام جوڑ کر ماں کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"امی آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ عام دنوں میں بھی تائی اماں ہمیں دیکھ کر کتنی کترا جاتی ہیں اور دعوت پارٹی میں تو ہمیں پہچانتی ہی نہیں۔ انہوں نے آپا کو اپنی ہونے والی بہو کی نظر سے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کی اولاد بھی ہمیں منہ لگانے کے قابل نہیں سمجھتی۔ آج وہاں دعوت ہو رہی تھی، لوگ زیورات میں لدے خوب بہن اوڑھ کر آئے تھے۔ ادھر سے ہم مفلوک الحال بھانک وہاں پہنچے تو سب کے ہی منہ بن گئے۔ کسی نے بیٹھنے تک کو نہ کہا۔ قمرہ آپا نے تو پہچانا تک نہیں، اور تائی نے آپ کی مبارک باد بھی قبول نہیں کی۔

حتیٰ کہ وہ جو ہیں نا وہی آپ کے شہزادہ گلفام ریحان بھائی انہوں نے مہمانوں کے درمیان ہمارا بیٹھنا تک گوارا نہیں کیا۔ اور ہمیں باتوں میں لگا کر لاؤنج میں بٹھانے لے آئے جہاں مہمانوں کے ساتھ آئی آیائیں اور ملازمائیں بیٹھی تھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بڑی خوبصورتی سے انہوں نے ہمارے سیدھے سادھے کپڑوں پر تنقید کی۔ اور جب میں نے کھرا کھرا جواب دیا تو اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ہنسی مذاق پہ اتر آئے۔ یہی کچھ رضوان کے ساتھ بھی ہوا۔ اچھا بھلا ہمیں گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا مگر چندرا کر کہنے لگے کہ میں نے تو آپ دونوں کو دیکھا ہی نہیں کہ کس وقت آئیں۔ بس میں نے بھی ان کو اچھی طرح سنا دیں۔"

چھوٹی نے بہت جذباتی ہو کر باقی ماندہ بھڑاس اس طرح نکالی تو خورشید جہاں سرزنش کرنے کے بجائے اسے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بولیں۔

"اوہو، جہاں حیثیتوں کا فرق حائل ہو جاتا ہے آپس میں ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ مگر اتنی صاف گوئی بھی اچھی نہیں ہوتی بچی! کیونکہ دل بُرے کرنے سے بدمزگی اور نفرت کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔"

"مگر اس طرح ملنے سے تو نفرت ہی بھلی۔ کیونکہ میں تو اسے کھلی منافقت سمجھتی ہوں۔ کہ منہ پہ کچھ اور دل میں کچھ۔ آج کل کے رشتے دار تو ایسی ہی دوغلی فطرت کے ہو کر رہ گئے ہیں۔" چھوٹی بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

"نہیں چھوٹی! رشتے دار اگر بُرے بھی ہوتے ہیں تو بھی اپنے ہی ہوتے ہیں۔ ارے اب دم ہی کتنے رہ گئے ایک ایک کر کے تو ختم ہو گئے ہیں۔ جو جیتے ہیں اگر ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا جائے تو پھر اکیلا انسان تو ہنستا بھلا نہ روتا بھلا اور اگر عزیزوں میں بھی گھل مل کر رہنا چاہے تو اس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے چوزوں کے درمیان بطخ کے بچے۔ حالانکہ بطخ بھی مرغی کی طرح انڈے دیتی اور سیتی ہے مگر اس کے بچے تیرنا اور اڑنا جانتے ہیں جبکہ مرغی کے بچوں میں یہ خصلتیں نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کا مزاج اور خصلت یکسر مختلف ہوتی ہے۔ اور پھر رشتے داروں سے تو انسان کی شناخت ہوتی ہے۔ ارے رشتے داروں سے تو انسان کی عزت بنتی ہے بیٹی۔"

"اوہ! ایمان سے کبھی کبھی تو امی کی باتیں سن کر دل چاہتا ہے کہ دیواروں سے سر پھوڑ لوں۔ آپ تو بہت سادہ لوح اور نیک فطرت ہیں امی، بلکہ میں تو یہ کہوں گی چونکہ آپ پوزیشن میں نہیں ہیں اس لیے ایسا سوچتی ہیں ورنہ آپ کی طرح ساری انسانیت یہی سوچنے لگے تو پھر دنیا سے ہر برائی ہی اٹھ جائے۔"

چھوٹی سے سخت خفا اور کبیدہ ہونے کے باوجود ماں کی سیدھی سادی باتیں سن کر عنبر بولے بنا نہ رہ سکی۔

"جی امی! یہ تو آپا ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ اب تائی اماں کی مثال ہی لے لیجیے، کیا طنطنہ، کیا ٹھسا ہے ان کا۔ بیٹھے بیٹھے حکم چلاتی ہیں ہل کر پانی نہیں پیتیں، اس پر بیٹیاں ہیں کہ ان کے سلیقے اور سگھڑاپے کی تعریفیں کر کر کے نہیں تھکتیں۔"

چھوٹی نے بہن سے سخت چڑھتا ہونے کے باوجود اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ تبھی سعد نے برآمدے سے بیٹھک کے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں بھئی، یہ اتنی دیر سے کس کے گناہ معاف کیے جا رہے ہیں۔" تو عنبر کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُف اللہ یہ سعد برآمدے میں بیٹھے اتنی دیر سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ اس خیال نے اس کی سٹی گم کر دی۔ کچھ دیر کو جیسے اس کی گویائی سلب سی ہو گئی۔ کچھ بولا ہی نہ گیا۔ سعد بھی ایک چالاک تھا اسے خاموش اور اس قدر شرمندہ اور شرمسار سا دیکھ کر اس نے خورشید جہاں سے پوچھا۔

"کیا بات ہے پھپھو جان؟ یہ اچانک ہی محاذ جنگ پر اتنی خاموشی کیوں طاری ہو گئی۔" تو خورشید جہاں نے اپنی فطری سادگی سے کام لے کر کہا۔

"اے بات کیا ہو گی بچے بس وہی پرانی۔"

"اُفوہ امی کوئی ضروری تو نہیں کہ اپنی نجی باتیں دوسروں کو بھی بتائی جائیں۔" عنبر نے ماں کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کرخت سے لہجے میں ان کی بات کاٹی تو سعد فوراً ہی بولا۔

"جی ہاں پھپھو جان! یوں بھی بعض باتیں انڈر اسٹوڈ ہوتی ہیں یعنی اگر نہ بھی بتائی جائیں تو بھی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔"

"سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں مگر آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔" عنبر نے تڑخ کر کہا۔

عنبر جو غصے میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی، اپنی بات کہہ کر فوراً ہی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد سعد نے چھوٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"سنو پیاری سی بہن! رشتے داروں کی بے اعتنائی اور بے حسی سے اپنا دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں اس کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ ایسے خود غرض لوگوں کو منہ لگاؤ نہ ان کے یہاں جاؤ۔ دیکھو۔ وقت ایک ڈھلتی اُبھرتی چھاؤں ہے، کبھی ایک سا تو نہیں رہتا نا۔ تمہارا بھی تو کبھی وقت آئے گا نا، پھر تم سب سے سینہ سپر ہو کر ملنا۔ بلکہ تم سے سب بھاگ بھاگ کر ملنے آیا کریں گے۔"

"یہ باتیں آپ ان کو سمجھائیے ان کو، جو اپنی سادگی میں اپنے ان دوغلی فطرت رشتے داروں پر صدقے واری جاتی ہیں۔" چھوٹی نے سعد کی باتوں سے متاثر ہو کر، ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اے میں صدقے واری کیوں جانے لگی میں تو اللہ اور رسول پاکؐ کے احکام کی بجا آوری کرتی ہوں، دنیاداری نباہتی ہوں۔ یوں بھی رشتے دار جیسے بھی سہی مگر خود دوغلی فطرت کی نہیں ہوں نا۔ اب وہ دل میں کھوٹ رکھ کر ملیں یا بغض، مجھے اس سے کیا غرض۔"

خورشید جہاں کو رشتے داروں کے بارے میں سمجھانا شاید ممکن ہی نہ تھا۔ چھوٹی اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔

"ہائے قسمت۔ امی کے خیالات کو بدلنا تو برمودا ٹرائینگل کراس کرنے سے بھی مشکل کام ہے۔" تو اس کی مثال پر سعد زور زور سے ہنسنے لگا۔

"واہ یہ برمودا ٹرائینگل تمہیں کیسے یاد آیا؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کل ہی تو اس کے بارے میں اخبار میں ایک مضمون پڑھا ہے معلوم ہے امی یہ برمودا ٹرائینگل بحیرۂ الکاہل میں ایک ایسا مقام ہے جس میں بڑے بڑے بحری جہاز ڈوب گئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہوائی جہاز اس کے اوپر سے گزرتے ہیں تو وہ بھی لاپتا ہو جاتے ہیں۔ کوئی چیز اس مقام کو پار ہی نہیں کر سکتی۔" موڈ سخت آف ہونے کے باوجود چھوٹی نے جس انداز میں ماں کے سامنے برمودا ٹرائینگل کی وضاحت کی تو سعد قہقہہ لگائے بغیر نہ رہا۔ اور پھر خورشید جہاں سے جو معلوم کس غوطہ میں بیٹھی تھیں، مخاطب ہو کر بولا۔

"اچھا پھپھو جان! اب اجازت۔ اصل میں مجھے بھی آج ریحان نے رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا ہے۔ تیار ہونے میں وہاں جاتے جاتے بہت دیر ہو جائے گی۔"

"ارے اجازت کیسی، یہ تو تمہاری مہربانی ہے بیٹے جو تم اتنا وقت ضائع کرتے ہو یہاں آکر، جاؤ سدھارو۔ فی امان اللہ۔" خورشید جہاں نے ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اسے خدا حافظ کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

"واہ پھپھو جان! یہ سب کہہ کر شرمندہ کیے بغیر بھی تو آپ مجھے اللہ کی امان نہیں دے سکتی تھیں۔ خیر خدا حافظ، اور پھر چھوٹی کے سر پر دھپ لگاتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔ اور اس کے جاتے ہی اپنے رہائشی کمرے سے نکل کر عنبر بیٹھک میں آکر بولی۔

"دیکھا امی آپ نے، کیسا مکار انسان ہے یہ آپ کا بھتیجا بھی۔ ہماری زبانی سنا کہ آج تایا ابو کے یہاں دعوت ہو رہی ہے تو ہم پر امپریشن ڈالنے کو جلدی سے کہہ دیا کہ اسے بھی مدعو کیا گیا ہے جبکہ وہاں اسے کوئی منہ تک نہیں لگاتا۔"

"نہ لگائے منہ مجھے کیا۔ میرے لیے تو یہی کافی ہے کہ وہ محبت اور خلوص سے مجھ سے ملنے آجاتا ہے۔ اور تم بھی اسے گرا پڑا نہ

سمجھو۔ وہ بھی بڑے باپ کا بیٹا ہے، تمہارے تایا اب جاکر بنے ہیں مگر اس کا باپ ہمیشہ سے زمینوں اور جائیداد والا ہے۔" خورشید جہاں نے عنبر کی باتوں کی تردید گویا اس طرح کی تو وہ جل بھن کر بولی۔

"ہونہہ۔ آپ کو تو معلوم اس نے کیسا منتر گھول کر پلا دیا ہے۔" اور پھر پیر پٹختی ہوئی برآمدے میں چلی گئی۔

عنبر کو سب سے زیادہ رنج و افسوس تو اس بات پر تھا کہ سعد نے اس کی اور چھوٹی کی باتیں کیوں سنیں۔ وہ گھر میں آتا تھا تبھی تو یہ نوبت آئی۔ اب اگر واقعی وہ ریحان کی دعوت میں شریک ہوا تو یقیناً ہماری ساری باتیں ان سے لگائے گا۔ اور نہ معلوم کتنی نمک مرچیں لگا کر بیان کرے گا۔ عنبر نے اپنے حالات سے ایک تجربہ یہ بھی اُٹھایا تھا کہ لوگ رد کر سنتے ہیں اور ہنس کر اڑاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ کم ہی کسی پہ اعتبار کرتی تھی۔ اور اپنی نجی باتیں تو کسی سے کہتی ہی نہ تھی۔

علاوہ ازیں عنبر کو اس بات پر بھی رنج تھا کہ تایا کے یہاں جاکر اس کی قدر کیوں نہیں ہوتی۔ وہ ریحان سے ملے بغیر چلی آئی تھی، کچھ اس لیے بھی بڑی دل گرفتہ سی ہو رہی تھی۔ یہ ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ اسے یہ احساس بھی تھا کہ خود ریحان اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، اتنا با اختیار اور خودسر ہوتے ہوئے بھی وہ ماں کے سامنے ایک دم حکم کا غلام بنا ہوا ہے۔ بس انہی سارے احساسات نے اس کی خوبصورت آنکھوں سے بدلیاں سی برسا دیں۔

بہرکیف۔ ریحان سے اسے بچپن ہی سے ایک قلبی وابستگی اور لگاؤ تھا۔ جو ایک منگیتر کی حیثیت سے ہونا ہی چاہیے تھا۔ اور وہ بھی اپنی تائی اور تایازادوں کو خاطر میں نہیں لاتی بس سب کچھ ریحان کو ہی سمجھتی تھی۔ اور وہ اگر اس کا دیوانہ نہیں تھا تو بیگانہ بھی نہ تھا۔ اور چونکہ یہ ریحان کی خواہش تھی کہ مزید تعلیم حاصل کرے تو اسی خواہش کو اس نے اپنا ایمان بنالیا تھا۔ اور وہ تعلیمی ادارے کھلنے کے انتظار میں بیٹھی تھی جو بالآخر ایک روز کھل ہی گئے تھے۔

اس کی سہیلی عالیہ کا ارادہ بھی یہی تھا کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے بلکہ وہ تو ہائر اسٹڈیز کا ارادہ رکھتی تھی۔ یوں بھی وہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

بے حد اسمارٹ اور ایکٹو سی۔

انتہائی ذہین۔ چرب زبان اور ایڈوانس۔

اس کی کلاس میں ہمیشہ ڈسٹنکشن ہی آتی تھی اور عنبر ہمیشہ ایسی لڑکیوں سے دوستی گانٹھنے کی خواہاں رہتی تھی۔ یوں تو کلاس میں چند اور لڑکیاں بھی عالیہ کی طرح ذہین اور ویل آف تھیں لیکن عالیہ میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بہت منکسر المزاج تھی اور اس نے طبقاتی فرق کو اپنے اور عنبر کے درمیان حائل نہیں ہونے دیا تھا۔

ان دونوں سہیلیوں نے انٹر تو ایک زنانہ کالج سے کیا تھا۔ مگر انٹر کے بعد اس کالج میں مزید پڑھنا اس لیے گوارا نہ کیا کہ کالج میں تعلیم کا معیار اتنا اونچا نہ تھا جتنا وہ چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک مقامی کو ایجوکیشن کالج میں خود داخلہ لیا تھا، بلکہ بہت اصرار کر کر کے عنبر کو بھی اس میں داخلہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

عنبر چاہتی تو ماں سے اس بات کو چھپا بھی سکتی تھی کہ اس نے ایک کو ایجوکیشن کالج میں داخلہ لیا ہے لیکن چونکہ اس کا کردار بہت پختہ اور بے داغ تھا اور وہ ماں سے کوئی بات بھی چھپانے کی عادی نہ تھی۔ اسی لیے اس نے ماں کو صاف صاف بتا دیا تھا اور نتیجے میں ماں نے ایک طوفان سا کھڑا کر دیا تھا۔ بلکہ نہ صرف مخالفت کی اور برا بھلا کہا بلکہ سختی سے ممانعت کر دی کہ وہ لڑکوں کے ساتھ ہرگز ہرگز نہیں پڑھے گی۔ کیونکہ وہ تو سرے سے اسے مزید تعلیم دلوانے کی ہی روادار نہیں تھیں، اور عنبر خواہ کتنی ہی تنک مزاج اور خودسر سہی مگر ماں کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم بھی نکال سکتی تھی۔ اور ماں کے ہاتھوں سخت بے بس ہو گئی تھی۔

تب اس موقع پر سعد نے اس کی بڑی مدد کی تھی یعنی خورشید جہاں کو بہت سمجھایا بجھایا تھا اور اس کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان بھی دلا دیا تھا۔ اس پر چھوٹی نے بھی ماں کو سمجھانے بجھانے میں سعد کا ساتھ دیا تھا تب کہیں جاکر خورشید جہاں نے اجازت دی تھی۔ مگر دل سے وہ پھر بھی راضی نہ ہوئی تھیں بہرحال۔ اصولاً تو عنبر کو سعد کا احسان مند ہونا چاہیے تھا کہ اس کی سفارش پر ہی اسے کالج میں پڑھنے کا پروانہ ملا تھا۔ مگر اس کے دل میں سعد کے لیے جو ایک عناد سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بھلا ایک اتنی معمولی سی بات سے دور ہو سکتا تھا، وہ تو اس بات کا سارا کریڈٹ چھوٹی کو دیتی تھی کہ اس کی کوششوں سے

ماں نے اسے کو ایجوکیشن کالج میں پڑھنے کی اجازت دی ہے،

یوں تو سعد ہر دوسرے تیسرے روز ہی آتا تھا۔ اور آتا بھی تھا تو ایسے وقت جب وہ کالج سے آنے کے بعد گھر ہی موجود ہوتی تھی۔ یہ بات اور تھی کہ وہ عذیر کو اس کے کسی مضمون میں مدد دے کر بالا ہی بالا چلا جاتا تھا۔

اس روز بھی سعد بیٹھک میں عذیر کو ٹیوشن پڑھا رہا تھا۔ اور وہ برآمدے میں تخت پر بیٹھی ماں کے ایک پرانے دوپٹے پر ٹکی چکن کی بیل اُدھیڑ رہی تھی کہ تبھی عذیر نے اندر بیٹھے بیٹھے اسے پکارا۔

"آپا۔ اے آپا! ذرا ادھر آیئے پلیز۔" (یہ پلیز کہنا عنبر نے ہی اسے سکھایا تھا) لیکن چونکہ بیٹھک میں سعد موجود تھا، اس لیے اس نے تخت پر بیٹھے بیٹھے بیزاری سے کہا۔

"تم خود کیوں نہیں آجاتے بھئی، تمہارے پیروں میں کیا مہندی لگی ہے جو مجھے بلا رہے ہو۔"

"ارے نہیں آپا! بس ایک بات پوچھنی ہے۔ ذرا آپ ہی آجائیے نا۔"

عذیر نے جواب میں کہا تو چھوٹی نے جو رات کے کھانے کے لیے اُبلنے جانے والے چاول چُن رہی تھی۔ آہستہ سے اس سے کہا۔

"چلی جائیں نا آپا! پتا نہیں کیوں بُلا رہا ہے، سعد بھائی آپ کو کھا تو نہیں جائیں گے۔"

مگر یہ آخری فقرہ اس نے منہ ہی منہ میں کہا تھا ورنہ وہ سن لیتی تو غضب ہو جاتا۔

بہرحال چھوٹی کے اتنی رسانیت سے کہنے پر۔۔ قدرے تامل کے بعد گویا بادل ناخواستہ وہ اُٹھی اور بیٹھک میں جا پہنچی تو اسے دیکھتے ہی عذیر نے انگلش ورک بک اس کی طرف بڑھائی اور ایک سطر پر انگلی رکھ کر بولا۔

"یہ دیکھیں آپا! یہ انگریزی کا ایک جملہ ہے جس کا اُردو میں ترجمہ کرنا ہے۔"

"اوہو بھئی انگلش کا سینٹنس (SENTENEQ) کہو۔ انگریزی پڑھ رہے ہو تو انگلش کے ہی لفظ استعمال کیا کرو۔ اور ترجمہ نہیں ٹرانسلیشن کہو۔" وہ سعد پر اپنی انگریزی کی قابلیت کا رعب جمانے کی غرض سے بولی۔

"ہاں ہاں ٹرانسیمیشن۔ ٹرانسیمیشن۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا آپ کو تو واقعی انگریزی پر خاصا عبور حاصل ہے۔" وہ آنکھیں پھیلا کر غلط لفظ بولا تو عنبر نے اس کی طرف بالکل توجہ نہیں دی، البتہ عذیر ہنسنے لگا۔

"یہ اتنی جہالت آمیز باتوں پر بھی کھی دانت کیوں نکال رہے ہو۔ دکھاؤ کون سا سینٹیس ہے وہ۔" عذیر کی بے موقع ہنسی پر وہ تیوری چڑھا کر بولی۔ عذیر نے فوراً اپنی ہنسی روک کر وہ جملہ پھر اسے دکھایا اور بولا۔

"یہ سینٹنس ہے آپا YOU ARE VARY SELFISH۔" تو سعد کو ذلیل کرنے کی غرض سے وہ بڑے چُبھتے سے لہجے میں بولی۔

"مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تمہیں پڑھاتے ہیں، ان سے پوچھو، اتنا آسان سا سینٹنس ہے یہ تو۔"

"مگر یہ مجھے انگلش تو نہیں پڑھاتے آپا۔" عذیر نے کہا۔

"خیر خیر، اگر نہیں بھی پڑھاتا تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اتنا آسان سا جملہ بھی نہ سمجھ سکوں۔" اور پھر اس نے عذیر کے آگے سے ورک بک اٹھا کر وہ جملہ پڑھا اور بولا۔

"واہ یہ کیا مشکل ہے، یُو معنے تم۔ آر معنے ہو۔ ویری معنے بہت۔ سیل معنے بیچنا۔ اور فش کے معنے تو ایک چھوٹا سا بچہ بھی جانتا ہے یعنی مچھلی۔ تو اس کا مطلب ہے کہ تم بہت ساری مچھلی بیچتے ہو۔ بھئی لفظی معنے تو یہی ہیں مگر اصل مفہوم کچھ یوں بنتا ہے کہ تم بہت بڑے مچھیرے ہو۔ بھلا اتنا آسان تو ہے لیکن عذیر کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا۔"

کتاب پر نظریں ہٹا کر آخری فقرہ اس نے عنبر پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا تو چھوٹی جو یہ دیکھنے کے لیے عنبر کے پیچھے آگئی تھی کہ عذیر نے اسے کیوں بلایا تھا۔ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی، عذیر بھی میز پر سر ٹکا کر بُری طرح ہنسنے لگا۔ گو ہنسی تو عنبر کو بھی آئی تھی لیکن اسے سعد کی جہالت پر کوفت بھی بہت ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے غصے سے کہا۔

"اگر یہ اسی طرح تمہیں پڑھاتے رہے تو دیکھ لینا پڑھائی کا بیڑا تو غرق ہوگا ہی فیلیرز (FAILAIRES) کی لسٹ میں بھی ٹاپ پر تمہارا نام ہوگا۔ اور اس کی اس بات پر عذیر جو ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ اور

وہ جو اپنی دانست میں انگریزی کے جملے کا بہترین ترجمہ بتا کر اکڑا اکڑا سا بیٹھا تھا اس کے جلے کٹے فقرے پر متعجبانہ سے انداز میں بولا۔

"ہائیں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"جو کچھ کہہ رہی ہوں غلط تو نہیں کہہ رہی، جب آپ انگلش کے سبجیکٹ میں ماشاء اللہ اتنے لائق فائق ہیں تو دوسرے سبجیکٹس کا تو خدا ہی حافظ۔"

وہ بگڑے بگڑے انداز میں بولی۔ چھوٹی مسلسل ہنسے جا رہی تھی اور عذیر بھی دانت نکوس رہا تھا عنبر کی بات کا جواب دینے کے بجائے سعد نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"بھئی، یہ تم دونوں اس قدر ہنس کیوں رہے ہو۔ کیا میں نے کچھ غلط ترجمہ کیا ہے۔"

"کچھ۔" چھوٹی کھلکھلا کے ہنسی۔ تو عنبر کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور کر بولی۔

"تمہیں تو بس ہنسنے کا بہانہ چاہیے۔ چلو تم ہی انہیں اس سینٹنس کا مطلب بتا دو تاکہ انہیں کچھ تو شرم آئے۔" تو چھوٹی نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

"انہیں سب کچھ معلوم ہے آپا! یہ محض بن رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" سعد نے مسمسی سی شکل بنا کر پوچھا۔

"ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ تمہیں خود بھی معلوم نہیں۔" عنبر یہی سمجھی کہ چھوٹی کے پلے وہ جملہ نہیں پڑ سکا اس لیے ٹالنے کی غرض سے کہہ رہی ہے۔ اس پر جب عذیر نے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اوہو، آپ کو آتا ہے تو آپ ہی بتا دیجیے آپا، خوامخواہ میرا وقت خراب ہو رہا ہے۔"

عام حالات میں تو وہ ہرگز نہ بتاتی، مگر اس سمے کچھ تو اس پر غصہ سوار تھا اور کچھ سعد کو نیچا دکھانے اور خوار کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آگیا تھا، اسی لیے وہ برہم سے انداز میں بولی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم لوگ انگلش میں اتنے ہوپ لیس ہو ورنہ بہت آسان اور سیدھا سا مطلب ہے اس سینٹنس کا۔ اس کا مطلب ہے تم بہت خود غرض ہو۔ سیل فش خود غرض کو کہتے ہیں، مچھلی بیچنے یا مچھیرے کو نہیں کہتے۔ وہ FISHER MAN کہلاتا ہے۔"

"اوہ ہاں ہاں، میں بھی کچھ یہی بتانا چاہ رہا تھا مگر ان دونوں کے بلاوجہ ہنسنے کی وجہ سے غلط کہہ گیا۔" شرمندہ ہونے کے بجائے سعد نے یہ کہا تو سر کو زور سے جھٹک کر ڈیم اِٹ کہتی ہوئی وہ بیٹھک سے باہر نکل گئی۔

مگر اس طرح ۔۔ سعد کو ماں کی نظروں سے گرانے اور گھر میں اس کی آمد و رفت بند کرانے کا ایک بہانہ اس کے ہاتھ ضرور آگیا تھا۔ لہٰذا اس روز سعد کے جاتے ہی اس نے ماں کے سامنے اس کے خلاف خوب زہر اُگلا۔ مگر ماں کا ایک ہی جواب تھا کہ چلو اگر انگلش نہیں بھی آتی تو دوسرے مضامین میں تو وہ عذیر کو مدد دے دیتا ہے۔" ماں کہتیں بھی تو بہت مسکرا کر کہ وہ کلس رہ جاتی۔

وقت کا پہیہ اپنے معمول کی رفتار میں گردش کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اب تو وہ نیے کالج میں بھی اپنے قدم جما چکی تھی اور زیادہ تر اپنی پڑھائی میں ہی لگی رہتی تھی۔ اور اب چونکہ اخراجات زیادہ ہو گئے تھے، اس لیے اس نے مزید دو ٹیوشنز کا اضافہ کر لیا تھا۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ تھی کہ اسے کہیں باہر جا کر ٹیوشن پڑھانے کی اجازت نہیں تھی۔ بس محلے کے ہی چند بچے تھے جنہیں گھر بلا کر پڑھا دیا کرتی تھی، ورنہ گھر سے باہر یعنی کسی کے گھر جا کر ٹیوشن پڑھانے کا معاوضہ بھی زیادہ ملتا تھا۔ بہرحال ٹیوشنز کے پیسے اتنے ہو جاتے تھے کہ وہ اپنے کالج کی فیس اور جملہ اخراجات کسی نہ کسی طرح پورے کر لیتی تھی۔ وہ کالج سے گھر آتی۔ تھوڑی دیر آرام کرتی پھر ٹیوشن لینے والے بچوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو شام تک جاری رہتا۔

مغرب کے بعد وہ اپنے کالج کا کام یعنی اسٹڈی کرتی تھی ۔۔ یہ زندگی کا ایک معمول سا بن گیا تھا۔ جس سے باہر نکلنے کا وقت ملتا تھا نہ کبھی خیال ہی آتا تھا۔ چھٹی کا دن بھی، وہ زیادہ تر گھر پر ہی گزارتی تھی، اور اپنے اور گھر کے وہ کام انجام دیتی تھی جو کالج جانے کی وجہ سے یونہی ادھورے پڑے رہ جاتے تھے، یا پھر بہت ہوتا تھا تو ماں کی اجازت سے عذیر کو ساتھ لے کر دو تین گھنٹوں کے لیے عالیہ کے یہاں چلی جاتی تھی ۔ وہ بھی کبھی کبھی ۔ عالیہ کے اصرار سے بلانے پر ۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ مگر

اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ ریحان کو بھول جاتی ۔

وہ تو بچپن ہی سے اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا ۔

اس روز اس سے ملاقات تشنہ رہ گئی تھی تو اس بات کا احساس دل میں چٹکیاں سی لیتا تھا۔

وہ خود اس لیے اس کے یہاں نہیں گئی تھی کہ اس کا خیال ہی نہیں بلکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے کالج میں داخلہ لینے کے بعد اس سے ملنے ضرور آئے گا۔

مگر جب پورے تین ماہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ نہیں آیا تو وہ سعد کی طرف سے شدید بدگمانی میں مبتلا ہو گئی ۔ یقیناً اس چھچھورے شخص نے ہمارے خلاف اس سے کچھ لگائی بجھائی کی ہو گی۔ اس روز ہماری ساری گفتگو سن کر گیا تھا۔ ورنہ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ریحان اور میری خیر خبر لینے نہ آتے۔ امی جان ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ یہ بیچ والے اپنی جھوٹی سچی باتوں سے آپس میں اپنے سگوں کے دل بُرے کراتے ہیں۔ اب میں کیسے وہاں جاؤں۔

وہ لوگ تو کبھی پلٹ کر پوچھتے ہیں نہ بلاتے ہیں۔ اب تو تایا ابو نے دعوتوں میں بھی بلانا چھوڑ دیا ہے۔ خیر اس روز تو وہ اسلام آباد میں تھے اسی لیے تائی نے ہمیں نہیں بلایا تھا۔ مگر اب۔ یہ تو میں مان ہی نہیں سکتی کہ اس تین ماہ کے عرصے میں انہوں نے کوئی دعوت یا پارٹی ہی نہ کی ہو۔ بہر حال جا کر دیکھنا تو چاہیے۔ لیکن کیسے جاؤں۔ چھوٹی تو وہاں جانے کے ذکر پر ہی ایک دم بھڑک جاتی ہے، عذیر بھی مجھے تنہا لے جانے پر راضی نہ ہو گا۔ تو پھر کیا کروں؟ وہ بس یہی سوچتی رہتی۔

عذیر کے ششماہی امتحانات ہونے والے تھے اور سعد بڑی باقاعدگی سے تقریباً روز ہی اسے پڑھائی میں مدد دینے آ رہا تھا۔ یوں تو وہ کچھ ایسی عجلت میں آتا کہ عذیر کو پڑھاتے ہی چلا جاتا اور پڑھانے کے بعد کبھی وہ رُکتا بھی تھا تو صرف تھوڑی دیر کے لیے، وہ بھی اس وقت جب خورشید جہاں اسے باتوں میں لگا لیتی تھیں۔ وہ نیک نفس اور سادہ لوح خاتون چونکہ گھر سے شاذ ہی باہر نکلتی تھیں۔ اس لیے سعد سے اُن رشتے داروں کی خیر خیریت پوچھ لیتی تھیں، جن سے سعد کا میل جول تھا۔ اور بس، اور نہ خود سعد کے بارے میں۔ خود سعد کے بیان کے مطابق انہیں یہی معلوم تھا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر چکا ہے اور اب کسی اچھی سی ملازمت کی تلاش میں ہے جبکہ اس کی والدہ بھائی اس بات پر مصر ہیں کہ وہ کوئی کاروبار شروع کر دے۔ اور یہ بھی کہ شروع شروع میں وہ بس اور سائیکل پر ان کے گھر آتا تھا اور اب خورشید جہاں کی اصطلاح میں اس نے پھٹ پھٹیا پر آنا شروع کیا تھا۔ جس کی آواز کچھ ایسی تھی جیسے دو تین جیٹ طیارے اچانک گلی میں اتر آئے ہوں، اس کی رہائش کے بارے میں تقریباً سب کو یہی معلوم تھا کہ وہ ناظم آباد کے آخری سرے پر کہیں رہتا ہے۔ اس کے کتنے بھائی بہن ہیں والدہ بھی ہیں یا نہیں۔ ان باتوں کے متعلق کم از کم عنبر کو تو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ اس کے لیے تو اس کی نفرت میں اضافہ کرنے کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ایک پسماندہ سے علاقے میں رہتا ہے اور سیکنڈ ہینڈ بھی نہیں بلکہ تھرڈ ہینڈ۔ روغن اڑی اسکوٹر پر اس کے بھائی کو پڑھانے آتا ہے۔ اور وہ جو ہمیشہ اتنی عمدہ ڈریسنگ کر کے، اتنی ٹپ ٹاپ کے ساتھ آتا تو وہ بخوبی جانتی تھی کہ محض اسے پر چانے کی غرض سے اتنا اہتمام کر کے آتا ہے۔

اس کی زبانی جب خورشید جہاں کو معلوم ہوا کہ شمسہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ پھڑک ہی اٹھیں۔ حالانکہ شمسہ کے یہاں دو بیٹیوں کے بعد یہ بیٹا پیدا ہوا تھا۔ مگر بیٹا تھا وہ بھی جیٹھ کا نواسہ۔ بلکہ خود ان کا نواسہ۔ اور وہ تو خود مبارکباد کے لیے جانے کو بے تاب تھیں مگر گٹھیا کی تکلیف کی وجہ سے ان دنوں انہیں چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی جگہ عنبر اور چھوٹی بھیجنا ہی مناسب سمجھا۔

عنبر کی تو یہ خیر دلی تمنا تھی۔ دعوت والے روز تو خیر ملاقات تشنہ رہی تھی مگر اس روز جب وہ بہن کی نسبت طے ہو جانے کی مٹھائی لے کر اسے پاس ہونے کی مبارکباد دینے آیا تھا۔ تو عرصے بعد اس سے قدرے دلجمعی سے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ مگر اسی مختصر سی ملاقات میں ریحان نے کچھ ایسی سحر انگیز باتیں کی تھیں کہ ان پر غور کر کے اب اتنے دن بعد بھی اسے اپنے دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔

اس نے کہا تھا کہ وہ اس کی طرف سے غافل نہیں ہے۔

جلد ہی اس کے مسئلے کو حل کرے گا۔ اور وہ موقع کی تاک میں بھی ہے تو وہ یہی جاننا چاہ رہی تھی کہ آخر ان باتوں سے اس کا کیا مقصد تھا۔

وہ کس موقع کا انتظار کر رہا تھا، اور اس کے سلسلے میں کون سا قدم اٹھانے والا ہے۔ عنبر کے دل کو جب سے ہی ایک چینک سی لگی تھی یہ سب معلوم کرنے کی۔ اب ماں نے کہا تھا کہ تم چھوٹی کو ساتھ لے کر تایا کے یہاں چلی جاؤ۔ تو وہ خوشی خوشی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ جبکہ چھوٹی نے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر اس کے ساتھ جانے سے صاف صاف انکار کر دیا تھا مگر جب ماں نے ڈانٹا ڈپٹا تو اسے مجبوراً عنبر کے ساتھ جانا ہی پڑا۔

عذیر تو ماں کے کہنے کے باوجود کسی قیمت پر بھی وہاں جانے کے لیے تیار نہ ہوتا لیکن یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اسی روز وہ اپنے ایک استاد کے یہاں جو اپیے سینیا لائنز کے ایک کوارٹر میں رہتے تھے اپنے ایک ہم جماعت کے ساتھ ان کی عیادت کو جا رہا تھا۔ عنبر نے سوچا کہ یہ اور بھی اچھا ہے۔ بسوں میں دھکے کھانے اور دو بسیں تبدیل کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ ایک ٹیکسی کر لی جائے۔ جس میں وہ اور چھوٹی عذیر اور اس کے دوست کفیل کو ماسٹر صاحب کے یہاں اتارتے ہوئے تایا کے گھر کلفٹن چلے جائیں گے۔ اس نے جب یہ بات عذیر کو بتائی تو وہ خوشی خوشی بھاگ کر ٹیکسی لے آیا۔ جبکہ ماں سے یہ بات چھپائی گئی کہ وہ تینوں کفیل کے ساتھ ٹیکسی میں جا رہے ہیں، کیونکہ وہ زیادہ کرایہ خرچ ہونے کی وجہ سے ضرور اعتراض کرتیں۔ ان سے تو یہی کہا گیا کہ اگر رکشہ والے نے تین سواریوں کو بٹھا لیا تو رکشہ میں جائیں گے۔ ورنہ بس میں۔ اور یہ سب کچھ عنبر نے محض ریحان سے ملنے کے شوق میں ہی کیا تھا۔

وہ سہ پہر ساڑھے چار بجے کے قریب تایا کے یہاں پہنچیں تو گھر کی ایک پرانی ملازمہ سے معلوم ہوا کہ تمام کے تمام افرادِ خانہ تائی کی کسی دوست کی بیٹی کی مایوں کی رسم میں شرکت کرنے گئے ہوئے ہیں اور تایا بھی تین روز قبل اپنے کسی کاروباری دورے پر جاپان جا چکے ہیں۔ صرف چھوٹے صاحب دریحان ہی گھر پر ہیں اور ابھی کچھ دیر قبل ہی اپنے آفس سے آئے ہیں۔ تو عنبر کو جو اتنی دور سے اتنی کھکھیڑ اُٹھا کر وہاں پہنچی تھی، یہ سن کر کہ گھر کے تمام افراد کسی تقریب میں شرکت کرنے گئے ہوئے ہیں جتنی مایوسی اور کوفت ہوئی تھی وہ ریحان کے گھر میں موجودگی کا سن کر یک لخت خوشی میں بدل گئی ۔ وہ ایک دم ہی کھل کر لوٹی۔

"ارے تو یہ کہو کہ گھر میں کوئی موجود تو ہے مگر وہ تمہارے چھوٹے صاحب آخر ہیں کہاں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں جی اور کہاں ہوتے۔" ملازمہ نے بتایا۔

"اچھا تو اُن کو جا کر اطلاع دو کہ ہم آئے ہیں۔" عنبر نے "ہم" پر زور دے کر قدرے نخوت سے کہا۔

جواب میں ملازمہ نے تھوڑا سا تامل کیا۔ پھر ریحان کو اُن دونوں کی آمد کی اطلاع دینے چلی گئی۔

وہ دونوں لابی میں کھڑی تھیں۔ اصل میں تو خود ملازمہ نے ہی انہیں لابی میں روک لیا تھا۔ اس بات پر چھوٹی ناگواری سے بولی۔

"کس قدر اجنبیت کا احساس ہوتا ہے اِس گھر میں آ کر آپا! بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ہم اپنے سگوں سے ملنے نہیں بلکہ درخواست دینے یہاں آئے ہوں۔"

"ارے نہیں، یہ محض تمہارا کمپلکس ہے چھوٹی! ورنہ اونچے گھرانوں کا کچھ یہی دستور ہوتا ہے۔ یعنی کوئی منہ اُٹھا کر سیدھا اندر نہیں جاتا بلکہ اطلاع دے کر ہی جاتا ہے اور یہ بات ایٹی کیٹس میں شامل ہوتی ہے۔" عنبر جس کا دل اپنے منگیتر سے ملنے کی خوشی میں بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اس نے گویا چھوٹی بہن کو نئی تہذیب کے آداب سِکھائے۔

"چلیں شکر ہے آپ نے اتنے ایٹی کیٹس تو سیکھ لیے آپا۔ آئندہ کے لیے بھی آسانی رہے گی بشرطیکہ یہ بیل منڈھے چڑھ گئی تو۔" چھوٹی نے چُبھتے ہوئے سے انداز میں کہا اور اسے یوں لگا جیسے یہ کہہ کر چھوٹی نے اس کی خوشیوں پر زقند ماری ہو۔

"یہ کیسی منحوس باتیں کر رہی ہو تم، ذلیل کہیں کی۔" وہ تلملا کر بولی۔ اور جواب میں چھوٹی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ملازمہ آ گئی۔

"چھوٹے صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ اُن کے کمرے میں ہی آ جائیے۔" ملازمہ نے کہا۔ تو عنبر جو اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ اُس کی آمد کی خبر سن کر ریحان بھاگا بھاگا اس کے استقبال کو آئے گا۔ اس پر ملازمہ کے کہنے کا بیزار کُن سا انداز اس کی ساری خوشی کو خاک میں ملا گیا۔ کچھ دیر وہ یہ سوچتی رہی کہ اندر جائے یا یہیں لابی سے گھر واپس لوٹ جائے۔ پھر چھوٹی سے مخاطب ہو کر بولی۔

"آؤ چھوٹی! جب آ ہی گئے ہیں تو ان سے بھی ملتے جائیں۔"

"جی نہیں، آپ خود ہی ہو آئیں۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" چھوٹی نے تنک کر کہا۔ عنبر کو اس کے انکار پر تاؤ تو بہت آیا مگر ملازمہ سر پر ہی کھڑی تھی اس لیے اس کے سامنے وہ چھوٹی کو کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

"واہ! یہ کیا بات ہوگئی بھلا تم کیوں نہیں جا رہیں۔" غصّے کے باوجود ملازمہ کے سامنے اُسے زبردستی دانت نکالنے پڑے۔

"بس یونہی۔ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو میٹ ہِم۔ (میں ان سے ملنا نہیں چاہتی) چھوٹی نے ملازمہ کی وجہ سے انگلش میں کہا۔

"اینڈ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو گو الون۔ نہیں تم بھی آؤ۔" اس نے بھی انگلش میں جواب دے کر اردو میں باقی فقرہ کہا۔ اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تو چھوٹی کو بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ اندر جانا ہی پڑا۔ وہ دونوں طویل کوریڈور سے گزر کر بھرے پرے ریحان کے کمرے تک پہنچیں تب بھی ملازمہ سائے کی طرح اُن کے ساتھ لگی رہی۔

"بھئی تم جا کر اپنا کام کرو انوری! ہم خود اندر چلے جائیں گے۔" عنبر کو اس کا یوں پیچھے آنا بہت ناگوار گزرا اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ تب کہیں جا کر انوری وہاں سے ٹلی۔

"اونہہ! اس گھر کے ملازمین کا رویّہ مستقبل قریب میں ہونے والی بڑی بہو کے ساتھ ابھی سے ایسا ہے تو آئندہ کا تو خدا ہی حافظ۔" چھوٹی نے پھر ایک چرکا سا لگایا مگر اُسے چونکہ خود بھی ملازمہ کی بدتمیزی پر غصّہ آ رہا تھا اس لیے اُس نے چھوٹی کے طنز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ویسے بھی اس سمے دھڑکنیں تو بے قابو سی ہو رہی تھیں ریحان کے کمرے میں جانے کے خیال سے۔

پھر اُس نے ریحان کے کمرے کی دہلیز پر رُک کر جس کے آگے پردہ پڑا ہوا تھا ہلکے سے کھنکھار کر پوچھا۔

"کیا اندر آنے کی اجازت ہے؟"

"ہاں ہاں بھئی کیوں نہیں۔ آؤ، اندر تو آؤ۔"

جواب میں ریحان نے کہا تو پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوگئی مگر آگے بڑھنے کے بجائے پردے سے کچھ آگے ہی ٹھٹک گئی۔ اصل میں تو اُجالے سے ایک دم ہی اس کی خواب گاہ کے نیم تاریک ماحول میں آ کر کھڑی ہوئی تھی دوسرے خواب گاہ کے خوابناک اور طلسماتی سے ماحول میں ریحان نہ معلوم کس طرف سے ایک دم ہی اُس کی طرف لپکا تھا۔ چھوٹی اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی اس لیے وہ ٹھٹک سی گئی تھی۔ اور وہ بھی چھوٹی کو اُس کے پیچھے کھڑا دیکھ کر جہاں تک آیا تھا وہیں رُک گیا تھا۔

"اوہو! یہ چھوٹی تو دُم چھلّے کی طرح ہمیشہ تمہارے ساتھ لگی رہتی ہے ورنہ میں بھی حیران تھا کہ آج تم تنہا کیسے آ گئیں۔" اس نے کھسیائے ہوئے انداز میں تھوڑا ہنس کر کہا اور چھوٹی آئے تو جائے کہاں کے مصداق تلملا کر بولی۔

"جی نہیں، آپ کے کمرے میں تو کیا میں تو آپ کے گھر بھی آنے کی روادار نہیں تھی۔ یہ آپا ہی زبردستی مجھے لے کر آئی ہیں۔" اتنا کہہ کر چھوٹی تیزی سے پلٹ کر اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"ہاہاہا! دیکھا تیر نشانے پر کیسا فِٹ بیٹھا ہے۔ اگر میں یہ نہ کہتا تو چھوٹی تمہارے سر پر ہی سوار رہتی اور مجھے آج بھی تم سے بات کرنے کا موقع نہ ملتا۔"

چھوٹی کے بُرا مان کر چلے جانے پر ریحان نے گویا یہ کہہ کر اپنی جھینپ مٹانی چاہی۔

"چھوڑیں موقع ووقع کو۔ اب اپنی ایک غلط بات پر یوں ہنس کر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کریں ورنہ میں تو اتفاقاً اس وقت آ گئی ہوں۔ اگر نہ آتی تب آپ کیسے موقع ڈھونڈتے؟" اس پر تو پہلے ہی غصّہ سوار تھا۔ اب جو ریحان نے چھوٹی کو دُم چھلا کہہ کر اس کی تذلیل کی تو وہ ایک دم کھول ہی اُٹھی اور بڑے درشت لہجے میں بولی۔

"مگر اتفاقات ہی تو مواقع فراہم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں مائی ڈیر۔" ریحان نے صرف مائی ڈیر کہنے پر اکتفا کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ اور پھر سامنے ہی دیوار کے ساتھ ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک پھیلی ہوئی ڈارک براؤن چمچماتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گیا جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔

اس کی خوابگاہ کا فرنیچر بہت قیمتی اور شاندار تھا۔ اس پر پیروں تلے پورے کمرے کا احاطہ کرتا ہوا دبیز قالین

خوبصورت سیٹنگ۔ ہلکے سے زیرو پاور کے نیلے بلب کی خوابناک سی روشنی اور چار سو پھیلی ہوئی اسپرے کی بھینی بھینی سی مہک اور اے سی کی ٹھنڈک۔ یہ ساری ترتیب اور تزئین خوابگاہ میں طلسماتی سا ماحول پیدا کر رہی تھی مگر عنبر نے کسی چیز پر بھی توجہ نہیں دی۔ اُس کی شاکی سی نظریں صرف ریحان پر مرکوز رہیں۔

"ارے بیٹھو نا۔ یہ غیروں کی طرح دروازے کے آگے جم کر کیوں رہ گئیں؟"

وہ اُس کی طرف پلٹ کر دیکھے بغیر بولا تو وہ ایک دم ہی طیش میں آ گئی۔

"ہونہہ غیروں کی طرح۔ ہم تو غیروں سے بھی بدتر ہیں۔ جبھی تو آپ کی ملازمہ نے ہمیں اندر آنے کی بھی اجازت نہیں دی اور لابی میں ہی روک لیا۔ بلکہ بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔ جب کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اِس گھر سے میرا کیا رشتہ ہے۔"

"اوہو بھئی، اب اتنی سینٹیمینٹل (جذباتی) بھی نہ بنو۔ تم تو خواہ مخواہ ہی معمولی معمولی باتوں کو اَنا کا مسئلہ بنا لیتی ہو ورنہ ایسی باتیں تو ان ملازمین کی ڈیوٹی میں شامل ہوتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ گھر والوں کی طرف سے ملازمین کو کچھ ایسی ہی ہدایات دی جاتی ہیں تاکہ وہ ہر ایرے غیرے کو اندر بُلا کر نہ بٹھا دیں۔" ریحان بدستور اپنی الماری میں کچھ تلاش کرتا ہوا بولا۔

"اوہو تو آپ کے خیال میں، میں بھی ایرے غیروں میں شامل ہوں؟" ریحان کی بات پر اس نے بھڑک کر پوچھا۔

"ارے نہیں، تم ہر بات اپنے اوپر کیوں لے لیتی ہو۔ انوری نے واقعی تمہارے ساتھ بدتمیزی کی ہے میں اُسے ضرور چیک کروں گا۔ اس وقت تو بہت عجلت میں ہوں۔ اصل میں ٹھیک پانچ بجے مجھے ایک بہت ہی اہم میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔ ابھی تمہارے آنے سے ٹھیک پانچ منٹ پہلے ہی تو آیا ہوں۔" ریحان نے جلدی جلدی الماری میں سے اپنی چیزیں نکالتے ہوئے کہا تو اُسے اِس قدر عجلت میں دیکھ کر عنبر کے رہے سہے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ تلخ سے لہجے میں بولی۔

"پھر تو میں نے اس وقت یہاں آ کر سخت حماقت ہی کی ہے۔ نہ کوئی اور ملا اور نہ آپ کو ہی بات کرنے کی فرصت ہے۔"

"ارے نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ تم بیٹھو تو۔" ریحان الماری سے ہینگر پر لٹکا سوٹ نکالتا ہوا بولا۔

"نہیں، بیٹھ کر کیا کروں گی۔ میں تو ویسے بھی اس وقت صرف امی اور اپنی طرف سے شمسہ آپا کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی مبارک باد دینے آئی تھی۔"

ریحان کے بیگانہ سے رویّے نے اسے بددل سا کر دیا تھا۔ وہ بیٹھنے کی روادار ہی نہ تھی۔

"لیکن میں تو موجود ہوں اور تمہارے لیے شاید یہی کافی ہو گا۔" ریحان اپنا سوٹ قریب ہی پڑے ایک خوبصورت صوفے پر رکھ کر بولا۔

"جی ہاں بلکہ بہت کافی ہو گا۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولی۔

"اوہو بھئی، اس میں اس قدر خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ جب آ ہی گئی ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ ہی جاؤ۔" ریحان اب اُس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

"کیوں بیٹھنا ایسا کیا ضروری ہے۔ آپ جلدی میں ہیں اور آپ کو تیار بھی ہونا ہے اور پھر وہ ایسی کیا خاص بات ہے جو اتنی عجلت میں بھی آپ بتانے پر مصر ہیں؟"

وہ بیٹھنے کے لیے اب بھی آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"خاص بات ہے جبھی تو کہہ رہا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤ۔"

ریحان نے اِدھر اُدھر دیکھ کر عجیب سے انداز میں ہنس کر کہا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کے اتنے اصرار سے کہنے پر اس سے لگ کر بھی بیٹھ جاتی مگر اس وقت نہ معلوم کیوں اُسے اس کے کمرے میں بیٹھنا کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ پھر بھی وہ تھوڑا سا آگے بڑھ کر بیڈ کے قریب پڑی کوچ پر ٹک سی گئی۔

"اچھا اب بتائیے۔" اس نے بیٹھنے کے بعد کہا۔ اور ابھی ریحان جو اسی کوچ پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا اس

سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دفعتاً خواب گاہ کے دوسرے گوشے سے جو نسبتاً تاریک تھا سعد کی آواز آئی۔

"اچھا بھئی ریحان میں تو اب چلتا ہوں۔"

"ارے نہیں، بس پانچ منٹ اور ٹھہرو۔ اتنے میں جھٹ پٹ تیار ہو جاتا ہوں۔" ریحان نے جواب میں سعد سے کہا۔

"نہیں، بس اب مجھے جانے ہی دو۔ پہلے ہی کافی لیٹ ہو گیا ہوں۔ ایسا ہی ہے تو مجھ سے وہیں آ کر مل لینا۔ اچھا خدا حافظ۔" سعد نے کہا اور اسی دم اُس کی خوابگاہ سے باہر نکل گیا۔

مگر ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔

یا وہ کب کمرے سے نکلا۔

عنبر نے کچھ سُنا نہ محسوس کیا۔

اس قدر غیر متوقع اور اچانک طور پر سعد کی آواز سُن کر تو اس کے حواسوں پر بجلی سی گر پڑی تھی اور جب سناٹوں کی زد میں اس بُری طرح آ گئی تھی کہ اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا اور اندر ہی اندر زیر و زبر ہوتی سی کیفیت میں مبتلا تھی۔

یوں جیسے کوئی اُسے زور زور سے پھٹنیاں دے دے کر ملامت کے ڈونگرے اس پر برسا رہا ہو۔

گو خواب گاہ کافی کشادہ تھی مگر کچھ نیم تاریک ہونے کی وجہ سے اور کچھ ریحان جس طرف کھڑا تھا اس سمت متوجہ ہونے کے سبب نیلے بلب کی خوابناک سی روشنی بھی اُسی حصّے پر زیادہ پڑ رہی تھی۔ اُس نے اس گوشے کی طرف دیکھا ہی نہ تھا جہاں سعد بیٹھا تھا۔

یا پھر اُس کی آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھ گئی تھی۔

جو سعد کا جیتا جاگتا پورا وجود اُسے نظر ہی نہ آ سکا تھا۔

اس کے ہوش گُم تھے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔

کہاں غارت ہو گئی تھی اس کی وہ چوکنا اور محتاط رہنے کی عادت۔

کہاں مر گئی تھی وہ حِس جو ایک ذرا سے غیر معمولی پن کا اُسے فوراً احساس دلا دیتی تھی اور جس پر اُسے بڑا ناز تھا۔

کیا وہ ریحان کی محبّت میں ایسی اندھی اور بے حمیت ہو گئی تھی کہ اُسے کچھ نظر ہی نہیں آیا۔

غصّے، کوفت اور احساسِ ذلّت کی شدّت نے اُسے کھولا کر رکھ دیا تھا۔ وہ فوراً ہی کھڑی ہو کر غصّے سے بھبک کر بولی۔

"یہ کیا شرافت تھی بھلا۔ آپ کو ذرا بھی شرم نہیں آئی۔"

اور ریحان کی سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ آخر وہ ایک دم ہی کس بات پر سیخ زیر پا ہو رہی ہے۔ البتہ اس کے اس قدر ڈپٹ کر بات کرنے سے وہ گڑبڑا سا گیا کہ نہ معلوم اس سے کون سی خلافِ تہذیب حرکت سرزد ہو گئی۔

"ہیں کیا مطلب۔ کچھ دماغ تو درست ہے تمہارا۔ میں نے بھلا ایسی کون سی بے شرمی کی بات کر دی؟" اس نے متعجب سے انداز میں پوچھا۔

"یہ بے شرمی نہیں تو اور کیا تھا۔ یہ جو آپ نے سعد کو اپنے کمرے میں گھسا رکھا تھا اور مجھے بتایا تک نہیں کہ وہ بھی یہاں براجمان ہے۔" وہ ریحان کے چند را کر بات کرنے پر کچھ زیادہ ہی بھڑک کر بولی۔

"لیکن میرا بتانا ہی کیا ضروری تھا۔ تمہاری آنکھیں نہیں تھیں کیا۔ تم خود دیکھ لیتیں۔ وہ تمہارے سامنے ہی تو بیٹھا تھا۔" ریحان نے یہ بات کچھ ایسے لب و لہجے میں کہی جیسے وہ سعد کو دیکھ لینے کے باوجود انجان بن رہی ہو۔

"اگر دیکھ لیتی تو آپ کے کمرے میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ رُکتی مگر میری کم بختی کہ میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں۔"

"چلو خیر، اگر تم نے اُسے نہیں دیکھا تو اِس سے کیا فرق پڑ گیا۔" ریحان کھڑا ہو کر بولا کہ اسے جانے کی جلدی تھی۔

"ہیں یعنی کچھ فرق نہیں پڑا۔ یہ جس انداز میں آپ مجھ سے بات کر رہے تھے اس کے باوجود بھی؟" ریحان کی بے پروائی پر تو وہ کلس ہی اُٹھی۔

"مگر کس انداز میں بات کر رہا تھا میں تم سے۔ کوئی رومانس لڑا رہا تھا نہ عشقیہ مکالمے بول رہا تھا بلکہ سیدھی سادی شریفانہ گفتگو

ہی ـــــ کررہا تھا۔ یہ کہو کہ تمہاری پرائیویسی میں اُس کی وجہ سے خلل پڑتا ہے۔ اُس نے تمہاری باتیں سُنی ہیں اس لیے تم اتنا تپا دکھا رہی ہو۔" ریحان کو اس کے خواہ مخواہ غصہ دکھانے پر تاؤ آیا تو الٹا اس پہ چوٹ کرتے ہوئے کہا مگر شاید غصے اور تپے میں عنبر نے اس کے فقرے کی گہرائی کو محسوس نہیں کیا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات ہی نہیں بلکہ مجھے یہ شخص بالکل پسند نہیں۔ ایک دم گھٹیا سا لگتا ہے۔ پتا نہیں آپ اُسے کیسے منہ لگا لیتے ہیں۔" وہ سعد سے اپنی نفرت کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

"کمال ہے بسعد سے تمہیں ایسی کیا پرخاش ہے جو اس کو اتنا بُرا بھلا کہہ رہی ہو۔ بھئی وہ میرا دوست ہی نہیں رشتے دار بھی ہے اور بڑا نفیس آدمی ہے۔" ریحان نے وال کلاک پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

"ہونہہ بڑا نفیس ہے۔ چھچھورا کہیں کا۔ اسے تو بات تک کرنے کی تمیز نہیں آتی۔" وہ نفرت سے منہ سکیڑ کر بولی۔

"تعجب ہے تمہارا تو اُس سے دوہرا رشتہ ہوتا ہے اور اُس کی تمہارے ہاں آمد و رفت بھی ہے پھر بھی تم اس کے متعلق اتنی بُری رائے رکھتی ہو۔"

ریحان پھر اپنی الماری کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

"لیکن میں ایسے رشتوں کو نہیں مانتی جیسا کہ اس کا ہم سے رشتہ ہے۔ وہ تو بس ہماری امی کو یہ کچھ عادت سی ہے کہ اگر اُنہیں کسی پر رشتے دار ہونے کا شائبہ بھی ہو جاتا ہے تو وہ جانے کہاں کہاں سے رابطے جوڑ کر رشتے داری نکال لیتی ہیں۔" وہ کڑوا سا منہ بنا کر بولی۔

"خیر، رشتے ناتے زبردستی تو کسی سے بھی نہیں جوڑے جاتے۔ رشتہ اگر ہوتا ہے تو کسی نہ کسی واسطے سے رشتہ داری بھی نکل ہی آتی ہے۔ رہا سعد سے رشتے کا سوال تو اُس سے ہمارا اتنی دور کا رشتہ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے پردادا کے سگے بھائی کی اولادیں یعنی دو سگے بھائیوں کی اولادیں، سعد بھی ان ہی کا پوتا ہے۔" ریحان نے اسے رشتہ سمجھانا چاہا تو وہ سخت بیزاری سے بولی۔

"ہوگا بھئی، مگر میں تو اسے رشتے دار مانتی ہی نہیں۔ مجھے تو یہ شخص ایک دم زہر ہی لگتا ہے۔" وہ بدستور اپنی نفرت کا اظہار کرتی رہی۔

"مگر آخر کس وجہ سے وہ تمہیں زہر لگتا ہے۔ اور زہر ہی لگتا ہے تو تم اُسے اپنے گھر میں کیوں آنے دیتی ہو۔ واہ یہ بھی خوب ہے اپنے یہاں آنے سے تو اُسے روک نہیں سکتیں اور اب میرے یہاں اُسے دیکھ لیا تو آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہو۔"

ریحان کو بھی اُس کی باتوں پر غصہ آگیا۔ یوں بھی وہ بڑی عجلت میں تھا اور وہ تھی کہ نہ صرف اس کے تیار ہونے میں رخنہ ڈال رہی تھی بلکہ اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے اُس کے کان بھی کھائے جا رہی تھی۔

"ہر دیگی چمچہ جو ٹھہرا۔ جبھی تو کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔ جہاں بھی ذرا سی لفٹ ملتی ہے گھُس جاتا ہے۔ ادھر امی بھی اس پر بہت مہربان ہیں۔ اصل میں وہ عذیر کو مفت ٹیوشن بھی تو پڑھاتا ہے۔" ریحان کے تنک کر بات کرنے کے باوجود وہ سعد کے خلاف زہر اُگلتی رہی اور ٹیوشن پڑھانے کا سُن کر ریحان نے بڑی بے ساختگی سے ہنس کر پوچھا۔

"ہائیں ٹیوشن بھی پڑھاتا ہے بھئی واہ دوسرے معنوں میں گویا اُس نے خاصے قدم جما لیے ہیں تمہارے گھر میں۔"

"ہیں کیا مطلب ہے آپ کا اس بات سے؟" اس نے تنک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں، مجھے تو اُس کے ٹیوشن پڑھانے کا سُن کر ہنسی آگئی تھی۔ ریحان نے جواب تک الماری کے آگے کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا، بدستور ہنستے ہوئے کہا۔ تو وہ یہی سمجھی کہ چونکہ سعد جاہل ہے اس لیے اُس کے ٹیوشن پڑھانے کا سُن کر ریحان ہنسے جا رہا ہے۔

"ہاں بالکل جاہل ہے وہ، آتا جاتا کچھ نہیں، پھر بھی خود کو بڑا پڑھنت سمجھتا ہے۔ جب کہ انگلش کی تو وہ الف بے سے واقف نہیں۔ جبھی تو عذیر کو اردو، اسلامیات اور معاشرتی علوم وغیرہ ہی پڑھاتا ہے۔"

"اچھا تو اسے انگلش بولنی بھی نہیں آتی۔" (عجلت میں ہونے کے باوجود نہ معلوم کیوں ریحان سعد کے معاملے میں دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا) اس نے متعجب سے انداز میں پوچھا۔

"بولنا تو بڑی بات وہ تو سمجھتا بھی نہیں کہہ تو دیا کہ وہ انگلش کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہے۔" عنبر نے اپنے لہجے میں حقارت شامل کر کے کہا اور پھر ریحان کو YOU ARE VERY SELFISH والی بات بتائی تو ریحان ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

واہ واہ کیا خوب بھئی سعد نے تو تمہارے سامنے اپنی جہالت کا لوہا منوا لیا۔ یعنی سیلفش کے معنی مچھلی بیچنے والا مچھیرا۔ وہ بھی جال سمیت۔"

اور ریحان کو اس بُری طرح ہنستا دیکھ کر وہ چڑ سی گئی۔

"کیا اب آپ کو دیر نہیں ہو رہی جو خواہ مخواہ ایک جاہلانہ بات پر ہنس ہنس کر اپنا وقت گنوا رہے ہیں۔" وہ بگڑے بگڑے انداز میں بولی۔

"نہیں خیر، دیر ہوئی نہیں رہی بلکہ اب تو ہو ہی گئی ہے۔ اچھا خیر۔ میں جلدی سے تیار ہو جاؤں پھر تم دونوں کو ڈراپ کرتا ہوا چلا جاؤں گا۔" ریحان کو بھی اُس کے جتانے پر بہت دیر ہو جانے کا احساس ہوا تو وہ عجلت میں الماری سے اپنے انڈر گارمنٹس نکال کر بولا۔

عنبر کے جی میں تو آیا پوچھے کہ وہ خاص بات تو آپ نے بتائی ہی نہیں مگر ایک تو اچانک ہی اُس پر عجلت سوار ہو گئی تھی دوسرے اُسے ریحان کے ساتھ اس کے کمرے میں ٹھہرنا پہلے ہی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اُس نے ریحان کی لفٹ ڈراپ کرنے کی پیش کش کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ ویسے بھی چھوٹی اب آپ کی کار میں بیٹھنا گوارا نہیں کرے گی۔"

"یہ چھوٹی کچھ زیادہ ہی چڑی ہو گئی ہے ورنہ میں نے تو محض مذاق ہی کیا تھا۔" ریحان نے غسلخانے کا رخ کرتے ہوئے کہا اور پھر ایک دم ہی اُس کی طرف گھوم کر بولا۔

"مگر وہ بات۔ اُسے تو تمہارے ذہن میں بٹھانے کے لیے عرصہ درکار ہوگا۔" مگر عنبر نے اس کی بات سُنی ہی نہیں۔ وہ تو پردہ ہٹا کر باہر نکل چکی تھی۔

وہ لابی میں آئی تو چھوٹی جو وہیں کھڑی تھی بڑی خاموشی سے اس کے ساتھ ہولی۔ اصل مسئلہ سواری کا تھا۔ کلفٹن کے اس علاقے میں جہاں تایا رہتے تھے دور دور تک سواری کا نشان نہیں مل رہا تھا۔ وہ چھوٹی کو تیز قدم اٹھانے کی تلقین کرتی ہوئی مین روڈ پر نکل آئی تھی کیونکہ اُسے یہ گوارا نہیں تھا کہ ریحان اپنی کار لے کر پیچھے سے نکل آئے تو ان دونوں کو پیدل ٹپہ ٹوئیاں کرتے دیکھ لے۔ کیونکہ وہ بہت عجلت میں تھا اور کسی وقت بھی اُس کے آنے کا امکان ہو سکتا تھا۔

یہ بھی غنیمت ہوا کہ مین روڈ پر پہنچتے ہی ایک خالی ٹیکسی جاتی نظر آگئی۔ عنبر نے اُسے ہاتھ دے کر روکا اور دروازہ کھول کر چھوٹی کے ساتھ اندر بیٹھ گئی۔

"کہاں جانا ہے جی؟" ٹیکسی والے نے پوچھا۔

"تین ہٹی۔" عنبر نے بتایا۔

"پچیس روپے ہوں گے تین ہٹی تک کے۔" ڈرائیور نے کہا تو چھوٹی نے ہو کی آواز نکال کر گویا تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا "پچیس روپے! مگر ابھی تو ہم نے وہاں سے یہاں تک کُل پندرہ روپے دیے ہیں۔"

"دیے ہوں گے جی۔ آپ کوئی دوسری سواری دیکھ لو۔ میں تو گھر جا رہا تھا اسی لیے میں نے میٹر بند کر رکھا ہے۔" ٹیکسی والے نے سخت بدلحاظی کا مظاہرہ کیا۔

"اچھا۔ اچھا کوئی بات نہیں۔ چلو پچیس روپے ہی سہی۔" عنبر نے جو بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی یہ کہہ کر گویا کرائے کا قضیہ ہی ختم کر دیا۔ اور ٹیکسی والے نے بھی چپ چاپ ٹیکسی آگے بڑھا لی۔

"آپا! اتنے پیسے بھی ہوں گے آپ کے پاس۔" کچھ آگے پہنچ کر چھوٹی نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔

"کچھ تو ہیں۔ باقی گھر جا کر دے دیں گے۔" عنبر نے لاپروائی سے کہا۔

پھر بڑی دیر تک دونوں بہنوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ چھوٹی منہ پھُلائے بیٹھی تھی اور وہ ـــ اُسے ایک تو چھوٹی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی دوسرے سعد کے اچانک نزول پر اُسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا اور اس بات پر تو وہ سخت پیچ و تاب کھا رہی تھی کہ اُس نے ریحان سے جو گفتگو کی تھی وہ سب نہایت خاموشی سے سعد نے سن لی تھی۔ گویا اس سے بڑھ کر اس کی تذلیل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ آخر اُسے اپنے خیالات کو خود تک محدود رکھنے کا یارا نہ رہا تو اُس نے چھوٹی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا

"پتا نہیں کہاں سے آمرا تھا وہ کم بخت چھچھورا۔"

"کون؟" چھوٹی نے منہ پھلائے پھلائے پوچھا۔

"وہی کمینہ سعد اور کون؟" اُس نے چمک کر کہا اور پھر چھوٹی کو ساری بات بتائی۔

"کمال ہے آپا! میں نے اُنہیں ریحان بھائی کے کمرے میں گھستے ہی دیکھ لیا تھا اور آپ کو وہ نظر ہی نہیں آئے۔ یہ میں کیسے مان لوں۔" چھوٹی نے جلے کٹے انداز میں بے یقینی شامل کر کے کہا۔

"نہیں مانتیں تو نہ مانو اب میں قسم کھانے سے تو رہی۔ مجھے تو یوں بھی اس چھچھورے پر سخت غصہ آ رہا ہے۔" عنبر نے چھوٹی کی بات پر تنک کر کہا۔

"مگر چھچھورپن یا کمین پن کا مظاہرہ تو ریحان بھائی نے کیا ہے۔ سعد بھائی نے تو نہیں۔" چھوٹی نے کہا۔

"او ہو تم خواہ مخواہ ہی بُرا مان گئیں ورنہ ریحان نے تو تم سے مذاق کیا تھا۔ تمہارے روٹھ کر چلے جانے کے بعد وہ ہنس ہنس کر یہی کہہ رہے تھے۔" عنبر نے گویا اپنی طرف سے ریحان کی صفائی پیش کی۔

"چھوڑیں آپا۔ آپ کے مکھن لگانے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ آج یہاں آ کر پہلے ملازمہ کے ہاتھوں اور پھر ریحان بھائی کے ہاتھوں جتنی میری توہین ہوئی ہے تو میں نے بھی اب قسم کھائی ہے کہ خواہ امی کتنا ہی کہیں یا ابا بھی قبر سے نکل کر یہاں آنے کا حکم صادر کریں تب بھی میں اب یہاں قدم نہیں رکھوں گی۔"

"ہاں تو خود میں کب آئندہ یہاں آنے کی روادار ہوں۔ اتنی مصیبت اُٹھا کر آؤ تو یہاں —— کوئی ملتا ہی نہیں۔" عنبر نے محض چھوٹی بہن کی خفگی کو دور کرنے کی غرض سے کہا۔

"خیر، اگر کوئی اور نہیں ملا تو آپ کے لیے یہی کیا کم ہے کہ آپ کو آپ کے وہ تو مل ہی گئے۔ اور سچ پوچھیں آپا تو آپ اُنہی سے ملنے آئی تھیں مگر اب یہ آپ کی قسمت کہ سعد بھائی بھی وہیں بیٹھے مل گئے۔" چھوٹی نے آخری فقرہ تھوڑا سا ہنس کر ادا کیا۔

"ہاں، اس ذلیل شخص کی وجہ سے ہی تو جو کچھ وہ کہنا چاہ رہے تھے نہ کہہ سکے۔ پتا نہیں کہاں سے آمرا تھا کم بخت۔" عنبر نے سعد کی طرف سے دل میں بھرے نفرت کے غبار کو تھوڑا سا خارج کر کے کہا۔

"مگر وہ تو تھوڑی دیر بعد ہی چلے گئے تھے۔ میں تو شرمندگی کی وجہ سے اوٹ میں ہو گئی تھی جب وہ لابی میں سے گزرے تھے۔ لیکن آپ اتنی دیر سے اندر کیا کر رہی تھیں جو اُنہیں کچھ بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔" چھوٹی نے جو بات پوچھی تھی وہ بہت معنی رکھتی تھی۔ وہ تھوڑا سا گڑبڑا کر بولی۔

"مگر میں کون سی اتنی دیر ٹھہری رہی ان کے کمرے میں۔ لو بھلا میں تو بیٹھی تک نہیں، بس کھڑے کھڑے ہی باتیں کرتی رہی اصل میں وہ بہت عجلت میں تھے۔ انہیں پانچ بجے میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی اس لیے جلدی جلدی تیار ہو رہے تھے۔"

"ہائے تو انہوں نے آپ کو بٹھایا نہ ٹھنڈے گرم ہی کو پوچھا۔" چھوٹی نے تمسخرانہ سے استعجاب کے ساتھ پوچھا۔

"وقت ہی کہاں تھا کچھ پوچھنے پچھنے کا۔ سعد کی وجہ سے میرا موڈ آف ہو گیا تھا اسی لیے میں بُری طرح ان کے سر ہو گئی تھی۔ خوب کھری کھری سنا کر آئی ہوں اُنہیں۔" عنبر نے ایک دم ہی جوش میں آ کر کہا۔

"آپ جو بھی کہیں آپا مگر مجھے تو یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔" چھوٹی نے ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بڑی بوڑھیوں کی طرح رائے زنی کی۔

"کون سی بیل؟" وہ ابھی تک جوش میں آئی ہوئی تھی۔ اسی لیے اُس نے بے دھیانی میں پوچھا۔

"وہی جس کی داغ بیل کبھی آپ کے بزرگوں نے ڈالی تھی۔" چھوٹی نے بہت جما جما کر ایک ایک لفظ کہا۔

"بس بس، زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ بڑی آئیں دادی پخمہ کہیں کی۔" عنبر نے اُسے آنکھیں دکھائیں۔

"اب سچ بات کہو تو آپ ڈانٹنے لگتی ہیں ورنہ آپ مجھ سے کہیں زیادہ حساس اور عقلمند ہیں۔ کیا آپ نے کبھی

محسوس نہیں کیا کہ ریحان بھائی آپ کی ذات میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لیتے۔ بلکہ میرے سے آپ کے ساتھ سنیئری نہیں ہیں۔ پھر آپ کیوں ایک سائے کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جب کہ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے اور ہمارے درمیان حیثیتوں کی جو خلیج حائل ہے اُسے آپ پاٹ سکتی ہیں نہ وہ۔ اور جن کے پاس حیثیت ہوتی ہے وہ نیچے تو بڑی بات پیچھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر اب آپ کو یہ سب کون سمجھائے؟"

اپنی بات کہتے کہتے چھوٹی روکھی سی ہو گئی۔ مگر وہ تو بڑی بہن تھی۔ اور اسے اپنی بڑائی کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا چھوٹی کے منہ سے نکلی ہوئی بڑی باتیں دل کو ضرور لگی تھیں مگر وہ یہ کہنے سے تو رہی کہ ہاں چھوٹی تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس نے چھوٹی کو بُری طرح ڈانٹ دیا۔

"تم اپنی چونچ بند ہی رکھو۔ بڑی آئیں مجھے عقل سکھانے والی۔"

"خیر، اگر میں عقل کی کوری ہوں تو بھی یہی کہوں گی کہ ریحان بھائی سے ہزار درجے بہتر تو وہی ہیں نا۔" چھوٹی نے کہا

"ہوں وہی۔"

"وہی ذلیل اور چھچھورے آدمی یعنی سعد بھائی۔"

"جواب دینے کے بعد چھوٹی نے منہ پھیر کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔"

"تم اپنی بکواس بند نہیں کرو گی۔ دیکھو، ڈرائیور بھی ہماری باتیں سن رہا ہے۔" وہ بھناتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"واہ بہت جلد خیال آیا ہے آپ کو جبکہ خود ہی تو زور زور سے بول رہی ہیں۔" چھوٹی نے طنزاً کہا۔ تو وہ دانت پیس کر بولی۔

"ٹھیک ہے ذرا گھر چلو، امی سے جوتے نہ لگوائے تو بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے یہ حسرت بھی پوری کر کے دیکھ لیجیے گا۔" چھوٹی نے اُسی کے انداز میں جواب دیا۔ اور اس کے گستاخانہ جواب اور انداز پر ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی کی وجہ سے اُسے زہر کے سے گھونٹ پینے پڑے اور باقی ماندہ راستہ جو خاصا طویل تھا، دونوں نے نہایت خاموشی سے طے کیا۔ اور جب یہ دونوں گھر پہنچیں تو پچیس روپے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے پر ماں نے عنبر کے ہی لتے لیے۔

"اے یہ تم اپنے تایا زادوں کی جوتی میں پیر ڈالنے کی کوشش کیوں کرتی ہو۔ اُن کے لیے تو یہ پچیس روپے پچیس ٹکوں کے برابر ہی ہوتے ہیں مگر ہمارا تو ڈیڑھ دن کا خرچہ چلتا ہے ان پچیس روپے میں۔ اور اگر یہ تمہاری کمائی کے بھی ہیں تو تم کون سے ہزاروں کما لیتی ہو۔ کل پانچ ٹیوشن تو ہیں وہ بھی ساٹھ ساٹھ روپے کی۔ میں تو کہتی ہوں اگر خدا تمہیں کسی قابل بھی کرے تو کبھی بھول کر بھی ایسا صرفِ بے جا نہ کرنا۔"

"او ہو امی! تو کیا ہم پیدل چل کر آتے یا پوری تین بسیں بدل کر۔" عنبر اُن کے فضیحتوں سے زچ ہو کر بولی۔

"نہیں رکشے میں آ جاتیں۔ آخر گئی کیسے تھیں۔ یہ موئے ٹیکسی والے تو بغیر میٹر کے ٹیکسی چلا کر سواریوں کو لوٹ لیتے ہیں۔" ماں نے کہا تو چھوٹی بیزاری سے بولی۔

"مگر رکشہ والوں کے میٹر کون سے ٹھیک ہوتے ہیں امی۔ اوّل تو اللہ مارے جمبو جیٹ کی طرح رکشہ دوڑاتے ہیں دوسرے ہر جھٹکے میں میٹر تیزی سے گرتا رہتا ہے اور پیسے بڑھتے جاتے ہیں۔"

"ہاں اور آپ نے ہی تو زبردستی ہمیں وہاں بھیجا تھا۔ یہ کہہ کر کہ ایک طرف پڑے پڑے تو تکیہ بھی جل جاتی ہے۔ تم دونوں تو میری طرح گھر میں ہی جم کر رہ گئی ہو۔ مبارکباد کے بہانے ہی اُن لوگوں سے مل آؤ۔ مگر جب وہاں پہنچے تو وہاں سب مالوں کی رسم میں گئے ہوئے تھے کوئی ملا ہی نہیں۔ خواہ مخواہ، وقت بھی برباد ہوا اور پیسے بھی معلوم بھی ہے امی پورے چالیس روپے خرچ ہوئے ہیں آنے اور جانے میں۔" عنبر نے بڑی ترکیب سے کرائے کے چالیس روپوں کا حساب بتایا۔

"جی امی اتفاق سے جاتے وقت ہمیں پندرہ روپے میں گھر کے باہر ہی ٹیکسی مل گئی تھی۔ اس لیے آنے اور جانے کے چالیس بن گئے۔"

"خیر مجھے کیا تم چالیس ہزار خرچ کرو۔ میں تو گھر کے حالات کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔" خورشید جہاں نے اپنا لہجہ نرم کر کے

کہا کیونکہ زبردستی کہہ سن کر تو انہوں نے ہی ان دونوں بلکہ تینوں کو بھیجا تھا۔

اور جیسا کہ عنبر کا خیال تھا کہ وہ چھچھورا اور ذلیل شخص جس نے اس کی اور ریحان کی باتیں سن لی تھیں اور اس کے ساتھ ریحان کا رویّہ بھی دیکھ لیا تھا اسے شرمندہ اور ذلیل کرنے کی غرض سے شام کو ہی آ موجود ہوگا۔ اور باتوں ہی باتوں میں اُس کا خوب مذاق اُڑائے گا تو اس کا یہ خیال خام ہی نکلا۔ سعد اسی شام تو کیا دو تین روز تک وہ آیا ہی نہیں۔ جبکہ خود چھوٹی کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ اور وہ پہلے سے سوچے بیٹھی تھی کہ اگر سعد بھائی نے کچھ کہا تو میں یہ کہوں گی وہ کہوں گی اور ریحان بھائی اور تایا ابو کا تو سارا کچا چٹھا ہی کھول کر رکھ دوں گی بلکہ سعد بھائی کو اعتماد میں لے کر اُن سے معلوم کراؤں گی کہ آخر ریحان بھائی کے خیالات اور ارادے کیا ہیں اور اُن کی نظر میں آپا کی کیا حیثیت ہے۔ مگر چوتھے دن وہ آیا بھی تو اُس وقت جب یہ دونوں بہنیں کالج گئی ہوئی تھیں۔ (اصل میں چھوٹی کی خواہش پر اپنے ساتھ ساتھ عنبر نے چھوٹی کو اپنے پرائیویٹ زنانہ کالج میں داخلہ دلوا دیا تھا۔) پھر دو تین روز بعد دونوں بہنوں کی موجودگی میں آیا بھی تو اس نے اپنے رویّے یا کسی بات سے بھی یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ اس کی اُس روز ریحان کے یہاں دونوں بہنوں سے مڈبھیڑ ہو چکی ہے۔ بلکہ چھوٹی سے ہمیشہ کی طرح اپنے اسی انداز میں ہنستا بولتا رہا جیسے پہلے بولتا تھا۔ جبکہ عنبر اس سے چھپی اس خیال سے اپنے کمرے میں بیٹھی رہی کہ کہیں وہ مذاق ہی مذاق میں اس پر کوئی فقرہ نہ کس دے۔ اور اس کے جانے کے بعد چھوٹی نے اُس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھا آپا! یہ ہوتی ہے اونچے ظرف کی بات۔ زبان سے کچھ کہنا تو کجا۔ سعد بھائی نے اشارتاً بھی یہ نہیں جتایا کہ اس روز تایا ابو کے یہاں وہ ہمیں خوار ہوتا دیکھ چکے ہیں۔"

"نہیں جتایا تو اس میں اونچے ظرف کی کیا بات ہوگئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ریحان نے اُسے منع کر دیا ہو یا اُسے خود ہی یاد نہ رہا ہو۔" عنبر کو چھوٹی کے منہ سے سعد کی تعریف بہت ہی کھلی اس نے اسے بے وقعت کرنے کی کوشش میں کہا۔

"واہ آپا! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اتنے اونچے ظرف اور شرافت کا ثبوت دیا ہے انہوں نے ورنہ جو بے ظرف اور چھچھورے ہوتے ہیں کسی کے منع کرنے سے نہیں مانتے ان کے پیٹوں میں کوئی بات پچتی ہی نہیں۔ اور آپ ہیں کہ ہمیشہ سعد بھائی کی خوبیوں پر مٹی ہی ڈالنے لگتی ہیں۔ مگر دیٹ از نوٹ فیئر آپا۔" چھوٹی نے دیٹ از نوٹ فیئر کہہ کر گویا عنبر کی دانست میں اسے یہی جتانا چاہا کہ وہ بھی انگریزی بول سکتی ہے اس بات پر تو عنبر اور بھی چڑ گئی۔ تیوری چڑھا کر بولی۔

"زیادہ انگریزی جھاڑ کر مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش نہ کرو میں نے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی۔ جو جس قابل ہوتا ہے۔ اُسے اُسی طرح ٹریٹ کیا جاتا ہے۔ اور میری نظروں میں تو وہ چھچھورا شخص منہ لگانے کے بھی قابل نہیں۔"

"خیر، یہ تو نہ کہیے آپا۔ سعد بھائی تو اپنی ذات میں ایک باغ و بہار شخصیت ہیں۔ سیدھی سادی بات بھی کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چٹکلے سے چھوڑ رہے ہوں۔ ہم سے کہیں اچھی پوزیشن میں ہیں وہ پھر بھی ہمارے گھر میں آ کر ذرا سی بھی اکتاہٹ کا اظہار نہیں کرتے۔ بھئی میرے خیال میں تو ریحان بھائی سے تو کہیں زیادہ ڈیسنٹ اور ڈیشنگ ہیں وہ۔" چھوٹی کو بہن کی باتیں سخت ناگوار گزریں تو اس نے بھی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہہ دیا۔

"اگر تمہارے خیال میں وہ ڈیسنٹ اور اسمارٹ بھی ہے تو بھی کسی جوان لڑکی کو کسی غیر مرد کی اتنی تعریف اور توصیف نہیں کرنی چاہیے بلکہ سرے سے جائز ہی نہیں ہے۔" اس سے چھوٹی کے تعریف کرنے کا یہ انداز برداشت نہ ہو سکا تو اس نے بہت غلط انداز میں چھوٹی کو ٹوکا۔

"خیر، سعد بھائی نہ تو غیر ہیں اور نہ ہی آپ کی طرح اتنی غلط سوچ رکھتی ہوں۔ میں تو انہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتی ہوں اور ایک بھائی کی تعریف پر تو کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی نا۔" چھوٹی اُس کی رکیک سی سوچ پر کھول کر بولی۔

"اے یہ کیا آفت ٹوٹ پڑی تم دونوں پر۔ آخر کس بات پر اتنا لڑ رہی ہو۔ کچھ معلوم ہے بیٹھک میں سعد آیا بیٹھا ہے اور وہ تمہاری ساری اوقات سن رہا ہے۔"

خورشید جہاں نے تیزی سے اُن کے کمرے میں داخل ہو کر انہیں پھٹکارا تو دونوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پھر چند

لمحے بعد چھوٹی نے اٹھتے ہوئے ماں سے کہا جو سعد کی وجہ سے دبی دبی آواز میں ان کی فضیحتہ کر رہی تھیں۔

"کمال ہے، یہ سعد بھائی ابھی تو گئے تھے پھر کیسے واپس آ گئے۔ اچھا میں خود جا کر پوچھتی ہوں۔"

پھر محض اُسے جلانے کی خاطر چھوٹی سعد سے باتیں بگھارنے چلی گئی۔

پھر کافی دن بیت گئے۔ سعد نے اب ان کے یہاں آنا بہت کم کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اگر عنبر کے علم میں تھی تو یہی کہ اس نے عندیہ کو پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ بس وہ ہفتے میں ایک بار ہی آتا تھا۔ اور اگر عنبر سے سامنا ہی ہو جاتا تو وہ اس کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کر دیتا تھا۔ جبکہ مشکل یہ تھی کہ اُسے دیکھ کر عنبر کو ریحان یاد آ جاتا۔ کیونکہ اس روز کے بعد سے ریحان سے اس کی ملاقات ہی نہیں ہو سکی تھی۔ کہ ریحان خود آیا تھا اور نہ وہ اس کے یہاں گئی تھی۔ یوں بھی اس روز ہی اس نے قسم کھالی تھی کہ اب کبھی خود سے تایا کے یہاں نہیں جائے گی۔ لیکن اس کے دل میں یہ خیال ایک تجسس سا بن کر اُبھرتا رہتا تھا کہ آخر وہ ایسی کیا خاص بات تھی جو ریحان اس روز اُسے بتانے پر مصر تھا۔ اور جب یہ خیال آتا۔ وہ دل ہی دل میں سعد کو ہی بُرا بھلا کہتی اُسے ہی موردِ الزام ٹھہراتی کہ اس کی وجہ سے ریحان سے بات کرنے کا اتنا اچھا موقع اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کیونکہ یوں تنہا ریحان کے گھر پر ملنے کا کبھی امکان ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی بات کا تو اسے رنج و ملال تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ سعد سے اور بھی بدظن اور متنفر ہو گئی تھی۔

ادھر خورشید جہاں کو ایک فکر سا دامن گیر رہنے لگا تھا۔

وہ خاصی جہاندیدہ اور معاملہ فہم خاتون تھیں۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں کہ شروع شروع میں تو ریحان تھوڑا بہت عنبر کی طرف مائل تھا مگر اب تو وہ اس کی طرف رُخ نہیں دیتا تھا۔ یوں بھی جب سے ان کے شوہر فوت ہوئے تھے جیٹھ جیٹھانی نے کبھی اشارتاً یا کنایتاً بھی ریحان اور عنبر کی نسبت کو جتایا تھا۔ نہ ایسا کوئی تاثر ہی دیا تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ اس پرانے رشتے کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسے ازدواجی شکل دینے کے خواہش مند ہیں۔ اس پر مشکل یہ تھی کہ خواہ کتنا ہی سگا رشتہ کیوں نہ تھا۔ مگر وہ لڑکی کی ماں تھیں وہ بھی کم مائیگی کا شکار۔ خود اپنا منہ پھوڑ کر تو جیٹھ جیٹھانی سے نہیں پوچھ سکتی تھیں کہ بھئی آخر آپ لوگوں کا کیا ارادہ ہے۔ یا آپ لوگ عنبر کے معاملے کو اتنا طول کیوں دے رہے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر دو بول کیوں نہیں پڑھوا دیتے۔ ہاں بھلا اتنا جھلانے سے کیا فائدہ۔ البتہ انہوں نے دو تین بار دبے دبے اور مبہم سے لفظوں میں جتایا ضرور تھا۔ مگر دونوں میاں بیوی ٹال مٹال گئے تھے۔

بیٹی کو جہیز کے نام پر کچھ دینے کے لیے بھی خورشید جہاں کے پاس کچھ نہ تھا۔ لیکن پھر بھی جہیز کی طرف سے انہیں بڑا اطمینان تھا۔ اصل میں انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ ان کے باپ کی جائیداد میں جو حق ان کا بنتا تھا ان کے بھائی نے اس سے انہیں محروم رکھا تھا۔ مگر جونہی عنبر کی شادی کی تاریخ طے ہوگی وہ بھائی سے اپنا حق وصول کر کے اس کا جہیز تیار کر دیں گی اور حد تو یہ تھی کہ اپنے اس ارادے کا اظہار انہوں نے کبھی بھائی پر نہیں کیا تھا۔

انہیں معلوم تھا کہ سعد کا شاہنواز خان کے یہاں بہت آنا جانا ہے اور ریحان سے اس کی دوستی بھی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے یہی سوچا کہ وہ سعد کے ذریعے ان لوگوں کے خیالات معلوم کریں گی۔ یوں بھی وہ سعد پر حد درجے اعتماد کرتی تھیں۔ اور اس کی تعریفوں میں ان کا منہ خشک ہوتا تھا۔ لہٰذا ایک روز انہوں نے سعد کے روبرو اپنا دلی مدعا بیان کر کے اسے تاکید کی۔

"دیکھو بیٹے! تم صرف ریحان کا عندیہ ہی لینا۔ ورنہ اگر بھابی جان کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو وہ یقیناً رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کریں گی۔ کیونکہ وہ شروع سے اس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔ بلکہ ساتھ کے ساتھ تم ریحان میاں کو سمجھا بھی دینا کہ وہ جو بیرونِ ملک جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو عنبر سے اپنی شادی رچا کر ہی جائے یا کم از کم نکاح تو پڑھوا کر ہی جائے۔ اور ہاں دیکھو بیٹے یہ ہرگز نہ بتانا کہ میں نے تم سے معلوم کرایا ہے یا تمہیں پٹی پڑھائی ہے۔"

خورشید جہاں نے تو سعد سے اور بھی بہت سی باتیں کہی تھیں۔ مگر سعد نہایت سعادت مندی سے جی ہاں اور آپ اطمینان رکھیے کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکا تھا۔ جبکہ اندر ہی اندر اتنی سادہ لوح اور نیک نفس پھوپھی کی سادگی پر اس کا دل کٹ رہا تھا۔

سعد کو تو شروع ہی سے اس معاملے کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ اور اسے بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ ریحان کے خیالات یکسر بدل چکے ہیں۔ اور وہ عنبر کے معاملے میں ذرا بھی سنجیدہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک امیر و کبیر گھرانے کی لڑکی فردوس سے اس کا زبردست افیئر چل رہا ہے۔ سعد نے اس بات پر ایک بار اُسے ٹوکا بھی تھا بلکہ عنبر سے اس کے رشتے کی اہمیت کا احساس بھی دلایا تھا۔ مگر اس روز تو ریحان نے اسے گول مول سا جواب دے کر ٹال دیا تھا۔ مگر اس روز جب وہ ریحان کے بہت اصرار پر اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔ اور ابھی جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ملازمہ الوزی نے ان دونوں بہنوں کے آنے کی اطلاع دی تھی تو وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر سخت ناگواری سے بولا تھا۔

"اوہ۔ ڈیم اٹ۔ ان دونوں مصیبتوں کو بھی اسی وقت نازل ہونا رہ گیا تھا۔" تو سعد اسے ٹوکے بنا نہ رہا تھا۔

"ہیں ہیں تم اپنی منگیتر کو مصیبت کہہ رہے ہو کمال ہے یار تمہیں اتنا بھی بے مروت نہیں ہونا چاہیے۔"

"ارے یار کیسی منگیتر۔ اور کس کی منگیتر؟ دادا دادی نے لے کے زبردستی ایک خواہ مخواہ کا رشتہ قائم کر کے اپنی جہالت کا ثبوت دیا تھا۔ مگر میں تو جاہل نہیں ہوں۔ میں تو اس رشتے کو مانتا ہی نہیں ذرا تم ہی سوچو یار کہ پانچ برس کی عمر بھی بھلا ایسی ہوتی ہے کہ اس میں بچوں کی منگنی یا نکاح کر دیا جائے۔" ریحان کا جواب تھا۔

"لیکن پھر بھی یار دوسرے کی بھی کچھ فیلنگس ہوتی ہیں۔ میرا مطلب ہے عنبر بھی تو اتنے عرصے سے تم کو اپنا منگیتر سمجھتی آ رہی ہے۔ تم اس کو ٹھکراؤ گے تو اس بے چاری کے دل پر کیا بیتے گی۔" سعد نے اُسے سمجھانا چاہا تو اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"بس یہی ایک بات تو ہمیشہ مجھے اس منگنی یا رشتے کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے سے روک دیتی ہے۔ میں یہ سوچ کر پریشان جاتا ہوں کہ میرے انکار پر اس کا کیا بنے گا۔"

"ہاں صورت شکل کے اعتبار سے تو تمہارے لیے بالکل فٹ ہے تمہاری کزن البتہ جہیز وہیز کا۔"

سعد نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے سے باہر کھڑے ہو کر عنبر نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ تو وہ خاموش ہو گیا۔ مگر اس نے عنبر سے ریحان کا روکھا پھیکا رویہ۔ اور گفتگو بھی سُن لی تھی۔ اور عنبر نے اس سے جو گلے شکوے کیے تھے وہ بھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ریحان کو عنبر سے ذرا سی بھی دلچسپی نہ تھی۔ اس پر اس سمے اسے میٹنگ میں جانے کی عجلت سوار تھی۔ جبکہ اصل میں تو اس نے فردوس کو وقت دے رکھا تھا۔ اور اس سے ملنے جا رہا تھا۔ گویا دوسرے معنوں میں عنبر کے معاملے میں بالکل سنجیدہ نہ تھا۔

لہٰذا جب خورشید جہاں نے اس سے ریحان کا عندیہ معلوم کرنے کو کہا تو سعد نے ایک دم ہی انہیں اصل بات بتانے سے گریز ہی کیا۔ بلکہ اس نے سوچا کہ ایک بار ریحان سے مل کر عنبر کے بارے میں کھل کر بات کر لے۔ اور اسے یہ سمجھائے کہ سگے رشتے اور بچپن کی مانگ پر اپنی دولت اور حیثیت کو ترجیح نہ دے۔ اور کچھ نہیں تو عنبر کے جذبات اور احساسات کا ہی خیال کر لے جو اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ کیونکہ تم تو اپنی الگ دنیا بسا کر عیش کرو گے مگر وہ اس صدمے کو شاید ہی برداشت کر سکے گی جو تم اپنی بے وفائی کی صورت میں اسے پہنچاؤ گے۔ یوں بھی کسی کا دل توڑنا گناہِ عظیم میں شمار کیا جاتا ہے وہ بھی عنبر کا جس نے تمہیں بچپن سے اپنے دل میں بسایا ہوا ہے۔ لیکن سعد ابھی ریحان سے بات کرنے کا موقع ہی تلاش کر رہا تھا کہ ایک شام جب عنبر محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر فارغ ہوئی تھی اور بچوں کے جانے کے بعد بیٹھک میں پھیلی بے ترتیب چیزوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ کہ دفعتاً بیٹھک کا دروازہ کھول کر ریحان اندر داخل ہوا اور اسے بیٹھک میں تنہا دیکھ کر بولا۔

"ارے لو یہ بھی عجیب ہی اتفاق ہے میں خاص طور پر تم سے ہی بات کرنے آیا تھا۔ اور ڈائریکٹ تم سے ہی ملاقات ہو گئی۔" اپنی بات کہنے کے دوران وہ برابر بیٹھک میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا کہ کہیں کوئی اور تو وہاں موجود نہیں۔

"کیا وہی خاص بات۔" اس کی اچانک آمد سے ایک دم ہی خوشی سے دمک اٹھنے والے چہرے پر ایک شرمگیں سی مسکراہٹ سجا کر اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں وہی۔" وہ قدم بڑھا کر اس کے نزدیک آ گیا۔

"اور سب کہاں ہیں۔" احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے عنبر سے پوچھا۔

"وہ پڑوس میں چھوٹی کی سہیلی روشن رہتی ہے نا وہ بے چاری بس سے اُترتے ہوئے گر گئی تھی چھوٹی عذیر کے ساتھ اُس کی خیریت پوچھنے گئی ہوئی ہے۔" خوشی کے مارے عنبر سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔

"اور چچی جان؟"

"وہ اندر نماز پڑھ رہی ہیں۔" اس نے بتایا۔ اور پھر شریر سے انداز میں پوچھا۔

"کیوں کیا بلاؤں انہیں؟"

"نہیں نہیں بس تم ہی کافی ہو۔" اس نے ایک پھیکی سی مسکان کے ساتھ کہا۔

"اچھا تو آپ بیٹھیں نا، کیا کھڑے کھڑے ہی۔"

"ہاں اس وقت تو کھڑے کھڑے ہی بات کروں گا۔ کیونکہ مجھے ایک ضروری کام ہے۔" اور عنبر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اوہو! آپ تو ہمیشہ ہوائی گھوڑے پر سوار رہتے ہیں اب ایسی بھی جلدی کیا۔ جب آ ہی گئے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ ہی جائیے۔"

"اوہو بھئی، کہہ تو رہا ہوں کہ اس وقت جلدی میں ہوں بس تم سے یہ کہنے آیا تھا کہ تم ممی کے خیالات سے تو اچھی طرح واقف ہو گی۔"

عجلت سے زیادہ بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ریحان نے ایک بے تکا سا سوال کیا تو عنبر نے اپنے دل میں ایک گدگدی سی محسوس کرتے ہوئے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

"کون سے خیالات سے؟"

"بھئی یہی کہ ممی شروع ہی سے میری اور تمہاری نسبت طے ہو جانے کے حق میں نہیں تھیں کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ۔" تو اس نے ریحان کی بات قطع کرتے تیز لہجے میں کہا۔

"ان کا خیال تو جو کچھ بھی تھا مگر آپ اپنی بات بتائیے کہ آپ بھی اس کے حق میں تھے یا نہیں کیونکہ اس معاملے کے تمام تر فیصلے کا انحصار تو صرف اور صرف آپ کی مرضی پر ہے۔"

"ہاں وہ تو ہے مگر۔ مگر جب ماں کی مرضی نہ ہو تو اپنی مرضی چلا کر اولاد دین کی رہتی ہے نہ دنیا کی۔"

"واہ بڑی دیر میں خیال آیا ہے آپ کو اپنی دین و دنیا کا ورنہ یہ دین و دنیا کا خوف آپ کو بہت پہلے لاحق ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ بقول آپ کے آپ کی والدہ ماجدہ شروع ہی سے اس رشتے کے حق میں نہ تھیں۔ ویسے آپ گھر کی بڑی اولاد تھے۔" وہ ریحان کے منہ سے اتنی غیر متوقع اور دل کو آزار پہنچانے والی بات سُن کر بھڑک سی اٹھی۔

"ہاں بڑی اولاد تھا مگر امی نے اس معاملے میں کچھ ایسی خاموشی اختیار کر رکھی تھی کہ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ ان کے خیالات شاید بدل گئے ہیں یوں بھی وہ میری عمر کا تعمیری دور تھا اور میں پڑھائی میں لگا ہوا تھا مگر اب۔"

"مگر اب وہ کھلم کھلا مخالفت پر اُتر آئی ہیں یہی کہنا چاہ رہے ہیں نا آپ۔" اُس نے بڑے برہم انداز میں ریحان کا فقرہ پورا کیا۔

"مخالفت تو عام سا لفظ ہے وہ تو اب جبر پر اُتر آئی ہیں۔ کہتی ہیں کہ میں نے کبھی اس نسبت کو گردانا ہی نہیں۔ بلکہ ہمیشہ مخالفت ہی کی۔ میں تو مر کر بھی یہ گوارا نہ کروں گی تم میری مرضی کے خلاف عنبر جیسی اَن کلچرڈ اور قلاش لڑکی سے شادی کرو۔ میں تو اپنی مرضی سے جہاں چاہوں گی تمہاری شادی کروں گی۔" ریحان نے باتوں ہی باتوں میں جس ترکیب سے اُس کی اوقات اس پر جتائی۔ وہ شرمندہ ہونے کے بجائے۔ تلملا کر بولی۔

"کمال ہے تائی کی نظروں میں اَن کلچرڈ اور قلاش ہوں۔ کیا ایسی اوچھی بات کہتے سمے وہ یہ بھول گئی تھیں کہ وہ بھی ہماری جیسی پوزیشن میں ایک طویل عرصہ گزار چکی ہیں اور کیا آپ خود یہ بھول گئے کہ میں آپ کا سگا

خون ہوں۔"

"اوہو بھئی تم ناحق اتنا بُرا مان رہی ہو۔ ورنہ تم سے زیادہ مجھے بُرا لگا تھا لیکن بڑے جب کوئی بات کہنے پر آتے ہیں تو پھر اُن کی زبان کون پکڑ سکتا ہے وہ بھی ماں کی جبکہ تم ممی کے غصے اور مزاج سے بھی واقف ہو کہ کس قدر ضد اور ہٹ دھرمی ہے ان کے مزاج میں۔" ریحان نے گویا اُسے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بڑی رسانیت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ تائی کی ضد کے آگے بالکل بے بس و مجبور ہو گئے ہیں۔" اس نے طنز بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ اتنا اُتنا نہیں بلکہ سخت بے بس و مجبور ہو گیا ہوں ادھر بہن بھائی بھی مصر ہیں کہ ممی کی منتخب لڑکی سے شادی کروں۔ ادھر دل ہے کہ کسی طور پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔" ریحان نے خود کو سخت بے بس و مجبور ظاہر کرتے ہوئے کہا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"لیکن جب سوچتا ہوں کہ میں نے اگر ماں بہنوں کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا تو تم چین سے نہیں رہ سکو گی کیونکہ اُن لوگوں سے علیحدگی کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور امی کی فطرت اور مزاج سے تو تم بخوبی واقف ہو۔"

"تو پھر آپ چاہتے کیا ہیں؟" ریحان کی باتوں نے اس کی ساری خوشی ملیامیٹ کر کے رکھ دی تھی۔ اس نے بمشکل اپنے دل کو سنبھال کر کہا۔

"ہم آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں وہی جو ایک شاعر نے کہا ہے کہ اس جذبۂ دل کے بارے میں ایک مشورہ تم سے لینا ہے۔" ریحان نے جس انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر اور بہت لہک کر یہ شعر پڑھا۔ تو گرگٹ کی طرح رنگ بدل بدل کر اُس کے بات کرنے پر عنبر جز بز سی ہو کر بولی۔

"ہونہہ آپ کے پاس دل ہی کہاں ہے جو اس میں میرے لیے کوئی جذبہ ہو گا اور پھر مجھ سے مشورہ مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ تو یہ بتائیں کہ آخر آپ نے سوچا کیا ہے؟ آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"میرا ارادہ۔ بھئی میں تو ایک مکس میں پڑ گیا ہوں۔ وہی مثل ہے کہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، سمجھ میں نہیں آتا کہ کروں تو کیا کروں۔ ایک طرف تم ہو میرے بچپن کی مانگ اور میری سگی دوسری طرف ظالم سماج ہے جس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور گرفت اتنی سخت ہے کہ کبھی کبھی تو مجھے ڈر محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں میں اس کے ہاتھوں مارا ہی نہ جاؤں۔"

اُف یہ ریحان کہہ رہا تھا جس کا گھر میں ایسا رعب اور دبدبہ تھا کہ چھوٹے بہن بھائی تو ایک طرف والدین بھی اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے سے ڈرتے تھے۔ گویا تایا تائی کی موجودگی میں بھی اس کا سکہ گھر پر چلتا تھا۔ عنبر کا دل تو چاہا کہ اُسے ایسی بے نقط سنائے کہ وہ تمام عمر یاد رکھے۔ مگر خود پر ضبط کر کے اس نے صرف اتنا کہا۔

"تو گویا آپ اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔"

"بھئی جہاں تک نتیجے کا سوال ہے تو کسی حد تک پہنچ تو گیا ہوں مگر تمہارے مشورے۔" تو عنبر اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"پہنچ ہی گئے ہیں تو پھر مجھ سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ضرورت ہے تبھی تو کہہ رہا ہوں۔ اصل میں میرے پاس تمہارے مسئلے کا حل موجود ہے اور میں اس وقت تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔"

ریحان نے کچھ اتنی معنی خیزی سے مسکرا کر کہا کہ یکبارگی عنبر کے اندھیارے سے دل میں آس کی ایک کرن سی لہرا اُٹھی۔ اس خیال سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ اب کسی بھی لمحے وہ یہ کہے گا کہ میں اپنے اور تمہارے قلبی تعلق سے پیشِ نظر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خواہ کوئی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرے میں ہر حالت میں اور ہر قیمت پر تمہیں اپنا کر رہوں گا۔ وہ پُرامید نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ جو بار بار اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھ

رہا تھا۔

"یاد ہے میں نے اُس روز بھی جب میں تمہیں پاس ہونے کی مبارکباد دینے آیا تھا تم سے کہا تھا کہ میں تمہاری طرف سے غافل نہیں ہوں اور میرے پاس تمہارے مسئلے کا حل بھی موجود ہے تو آج میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں نے تمہارے لیے بھی ایک بر تلاش کر لیا ہے۔ جو بہت ڈیسنٹ اور اسمارٹ سا ہے۔ بلکہ تمہارا بھی دیکھا بھالا ہے اور جانتی ہو وہ کون ہے۔ وہ اپنا سعد ہے سعد۔"

ریحان نے بہت گھما پھرا کر وہ خاص بات آخر اس کے گوش و گزار کر ہی دی جو وہ چھ سات ماہ قبل کہنا چاہ رہا تھا۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی تجویز کا ردِعمل عنبر کی طرف سے کتنی شدت اختیار کرے گا۔ وہ تو اس کی بات سن کر گویا آپے سے ہی باہر ہو گئی۔

"واہ۔ آخر آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے اور آپ کون ہوتے ہیں میرے بارے میں ایسا گھٹیا سجیشن دینے والے۔ میں کوئی بکاؤ مال تو نہیں کہ جس نے جتنے چاہا دام لگا دیے۔ جبکہ دام تو آپ کے لگوائے ہوں گے آپ کی اماں جان نے کسی بہت ہی اونچے گھر لئے ہیں۔ بے حمیت دغاباز انسان۔ جائیے فوراً نکل جائیے یہاں سے میں آپ کی موجودگی کی اب زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی۔" اف۔ عنبر نے نہ صرف اُسے بری طرح پھٹکارا تھا بلکہ ذلیل کر کے بھی رکھ دیا تھا۔ گو ریحان کو اپنی ذلت پر تاؤ تو بہت آیا لیکن یہ غصہ دکھانے کا موقع نہ تھا۔ کیونکہ اسے بھی شدت سے یہ احساس تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہی نہیں بلکہ ظلم ہوا ہے۔ بھلا ایک ایسی لڑکی جو بچپن سے اس کے نام پر بیٹھی رہی ہو۔

ہر لڑکی کی طرح ایک منگیتر کی حیثیت سے اُسے اس نے مدتوں سے اپنے دل میں بسا رکھا تھا۔

اپنی تمام تر امیدوں کا مرکز اُسے ہی بنا رکھا تھا۔

حتیٰ کہ اس کے خواب بھی اسی کی امانت ہوتے تھے۔

وہی لڑکی اپنے اس بُری طرح ٹھکرائے جانے کو بھلا اتنی آسانی اور خاموشی سے کیونکر برداشت کر سکتی تھی۔ یوں بھی یہ نہ صرف کھلی توہین تھی بلکہ اس کی کم مائیگی بے حیثیتی پر ایک زبردست چوٹ تھی جو ریحان نے منہ در منہ انکار کر کے لگائی تھی اسی احساس کے تحت ریحان نے بھڑک اُٹھنے کے بجائے نہایت تحمل سے کام لے کر کہا۔

"تم ہر بات کہنے میں حق بجانب ہو عنبر مگر کاش تم میری مجبوریوں کو سمجھ سکتیں۔ بہرحال جو کچھ بھی سہی۔ اگر میں ممی کی ضد پر مجبور ہو کر ان کی پسند کی لڑکی سے شادی بھی کر رہا ہوں تو اتنا بے حس اور خود غرض نہیں کہ تمہیں یونہی بیچ منجھدار میں چھوڑ دوں گا بلکہ جب تک تمہاری شادی نہیں ہو گی میں بھی چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ میرا عہد ہے اتنا سمجھ لو۔" پوری قطعیت کے ساتھ یہ بات کہہ کر ریحان دروازے کی طرف گھوما تو وہ کچھ زیادہ ہی سلگ کر بولی۔

"آپ بھی اتنا سمجھ لیں کہ میں آپ کے کسی عہد و پیماں کو ذرا سی بھی اہمیت نہیں دیتی۔ اور وہ سگا رشتہ جو بدقسمتی سے قدرت نے ہمارے درمیان قائم رکھا تھا وہ بھی آج اس کھوکھلی نسبت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے۔ آیندہ آپ ہماری شکل دیکھیں گے نہ ہم آپ کی۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔"

تو ریحان جو جاتے جاتے اُس کی بات سننے کی غرض سے رک گیا تھا۔ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش میں ایک زہرخند سے بولا۔

"یہ اتنا تیہا تم سعد کا نام سن کر ہی دکھا رہی ہو نا۔ تو یہ بھی سن لو کہ وہ کوئی گرا پڑا انسان نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت کے آگے تمہاری حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔ وہ تو اپنے خلوص و مروّت میں تمہاری حالت پر ترس کھا کر تمہارے یہاں آ جاتا تھا۔ ورنہ کہاں وہ کہاں تم۔ وہ تو تمہارے سامنے گھاس ڈالنے کا بھی روادار نہیں۔ وہ تو میں نے ہی تمہاری ہمدردی میں اُس کا نام لے دیا تھا۔"

اتنا کہہ کر انتہائی غصے کے عالم میں ریحان زور سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اور وہ غم و غصے کی شدت میں اپنا ہونٹ کاٹ کاٹ کر اُسے زخمی کرنے لگی۔

"اے کیا بات ہے عنبر! یہ ریحان اس وقت یہاں کیوں آیا تھا۔ اور تم کس بات پر اتنا تیہا دکھا رہی تھیں اُسے کہ مجھ سے نماز پڑھنی دوبھر ہو گئی۔" ریحان کے جاتے ہی خورشید جہاں نے جو اس وقت مغرب کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں انہوں نے بیٹھک میں آکر پُر تشویش سے لہجے میں پوچھا۔ تو عنبر جو گُم صم سی کیفیت میں کھڑی تھی خالی خالی نظروں سے اُن کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ جیسے وہ ماں کی بات سُن ہی نہ سکی ہو۔

"ارے یہ ٹکر ٹکر میری صورت کیوں تک رہی ہو۔ بتاتی کیوں نہیں کہ یہ ریحان کیوں آیا تھا۔" ماں نے اس کا بازو پکڑ کر زور سے ہلاتے ہوئے پوچھا تو وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔

"وہ ۔۔ وہ مجھے بے موت مارنے آیا تھا امی لالچی اور حریص انسان۔ مگر میں بھی اتنی بودی اور بے عقل نہیں ہوں۔ جو ۔ جو ۔ سچ مچ مر ہی جاتی۔" ماں کے سوال کا جواب دیتے دیتے وہ اُن کے شانے پر سر ٹکا کر رونے لگی۔

خورشید جہاں کا ماتھا تو اس قدر غیر متوقع اور بے وقت ریحان کی آواز سُن کر اور عنبر کے زور زور سے بولنے پر پہلے ہی ٹھنکا تھا اب جو عنبر نے یہ کہا کہ میں اتنی بودی اور بے عقل نہیں ہوں۔ جو۔ جو سچ مچ ہی مرجاتی تو وہ نہ معلوم کیا سمجھیں۔ انہوں نے عنبر کو پیچھے ہٹاتے ہوئے غصّے سے کہا۔

"ہے ہے تو وہ ناس پیٹا تم سے کوئی ناجائز مطالبہ کر رہا تھا۔ اس پر خدا کی مار ہو۔ اس کی ہمّت کیسے ہوئی تم سے ایسی غلط بات کرنے کی۔ ٹھہرو تو۔ میں ابھی جا کر بھائی جان کے سامنے۔" تو ماں کو اپنی بات کا بہت غلط مطلب لیتا دیکھ کر عنبر نے اُن کی بات کاٹی۔ "نہیں امی آپ سمجھی نہیں۔ اگر خدانخواستہ وہ کوئی غلط مطالبہ کرتا تو کیا میں اسے اتنی آسانی سے جانے دیتی میں تو اُسے یہاں سے مردہ حالت میں نہ سہی لیکن نیم مردہ کر کے ضرور نکالتی۔ وہ۔ وہ تو یہ بتانے آیا تھا کہ وہ کہیں اور شادی کر رہا ہے۔" عنبر نے سسکیاں لیتے ہوئے ماں کو اصل بات بتائی تو کچھ دیر کے لیے تو وہ سناٹے میں آگئیں۔

"ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے نسبت بھی توڑ دی۔" قدرے توقف کے بعد انہوں نے اس طرح پوچھا جیسے اُنہیں یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں امی! نسبت توڑنے ہی تو آیا تھا وہ۔ ظاہر ہے دوسری جگہ شادی کرنے کا مطلب ہی یہی ہوا کہ وہ نسبت توڑنے آیا تھا۔"

عنبر نے گلوگیر آواز میں کہا تو خورشید جہاں کے دل پہ ایک گھونسہ سا پڑا۔ حالانکہ اس بات کا احساس انہیں بہت پہلے ہی ہو گیا تھا۔ لیکن اور کسی پر نہیں تو انہیں ریحان پہ بڑا مان تھا۔ اور وہ بھی بیٹی کی طرح اُس سے آس لگائے بیٹھی تھیں اور پھر وہ ماں تھیں۔ وہ بھی ایک نادار ماں۔

اصل بات انہیں بتاتے بتاتے عنبر کی آنکھوں سے پھر اشک جاری ہو گئے تھے۔ اُن کا دل بیٹی کے لیے کٹا جا رہا تھا مگر ہمت والی خاتون تھیں۔ دل بھر بھر آرہا تھا۔ لیکن بڑے ضبط سے کام لے رہی تھیں۔

"اے تم کیوں رو رو کر خود کو ہلکان کر رہی ہو۔ وہی مثل ہے کہ ایک در بند تو ستر کھلے اور پھر ہر بات میں خدا کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے کیا معلوم خدا نے تمہاری تقدیر میں ریحان سے بھی اچھا بر لکھ رکھا ہو۔" انہوں نے بیٹی کو گویا دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں امی اب میں کسی اچھے یا بُرے پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھوں گی میں تو خود اپنی تقدیر بناؤں گی اور اِن لالچی اور حریص لوگوں کو یہ ثابت کر کے دکھاؤں گی کہ میں بھی کسی معاملے میں ان سے کم نہیں ہوں۔ بس ذرا اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جاؤں۔"

وہ رونا دھونا بھول کر کچھ ایسے عزم اور قطعیت کے ساتھ بولی کہ ماں ڈبڈباتی آنکھوں سے اُس کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ ریحان کی بے وفائی نے عنبر کے دل کو ایسے چرکے لگائے تھے کہ اس کی پوری ہستی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کہ ایک تو وہ بچپن سے ہی اس کے نام پر بیٹھی تھی دوسرے ایک منگیتر اور مستقبل میں زندگی کا

رفیق ہونے کی حیثیت سے اس نے ریحان کو اپنی تمناؤں کا مرکز بنا لیا تھا۔ دوسرے معنوں میں وہ اس کا حاصل زیست تھا اور اپنے اس المیے پر وہ جتنا بھی غم کرتی کم ہی ہوتا۔ لیکن عنبر اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود سخت انا پرست اور خود دار تھی۔ اور بڑی مضبوط طبیعت کی مالک تھی۔ دوسرے کے منہ سے اسے یہ سُننا بالکل گوارا نہ تھا کہ ریحان نے اسے ٹھکرا دیا ہے۔ اور ٹھکرایا بھی ہے تو محض اس کی بے مائیگی کی پاداش میں۔ بلکہ اُس نے اپنے اِس المیے کو اپنی انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے ایک چیلنج کی طرح قبول کیا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ریحان نے صرف دولت کے لالچ میں آکر اسے ٹھکرا دیا ہے۔ ورنہ ایک گوشت پوست ایک ہی خون۔

اگر ریحان دولت مند ہے تو میں بھی کسی سے کم نہیں۔ عزت۔ غیرت۔ خودداری اور خوبصورتی سبھی تو ہیں میرے پاس۔ ایک صرف پیسہ ہی تو نہیں ہے تو بقول امی پیسہ تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے کیا پتا وقت کی گرد میرے ہاتھ میں بھی یہ میل بھر دے اور میں بھی کسی قابل ہو جاؤں بس ان ہی عزائم کے ساتھ عنبر نے اپنی پوری توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کر لی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح گریجویشن کر کے کوئی ملازمت سنبھال لے۔ کیونکہ ٹیوشنز کی آمدنی تو اتنی قلیل تھی کہ اس کے تعلیمی اخراجات بھی مشکل سے ہی پورے ہوتے تھے ادھر خورشید جہاں کو بھی گھر کے کرائے سمیت پنشن کی قلیل سی رقم ہونٹوں سے اُٹھا کر دانتوں سے پکڑنی پڑتی تھی کہ مہنگائی بھی تو دن بدن بڑھتی جا رہی تھی ہر چیز پر آگ سی برس رہی تھی۔ اور ادھر کھانے اور خرچ کرنے والے سب بڑے ہی تھے۔ بچہ تو کوئی نہیں تھا۔

اس پر بھی عنبر کے عزائم کچھ ضرورت سے زیادہ ہی حوصلہ مندانہ تھے۔ وہ حیثیت میں خود کو ریحان کے لیول پر لانا چاہتی تھی۔ جو بظاہر تو ایک طفلانہ بلکہ مضحکہ خیز بات ہی تھی۔ شاید اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بے ثبات دنیا میں ایک نادار کی حالت ادبار کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے انسان کی سی ہوتی ہے۔ جیسے قسمت سے کوئی طوفانی تھپیڑا اگر اُچھال کر ساحل سمندر پر ڈال دے تو ڈال دے ورنہ وہ حسرت و یاس سے ساحل کو دیکھتا سمندر کی عمیق تر سی گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ یا اگر نہیں بھی اُترتا تو حوادث زمانہ کے تھپیڑے کھا کھا کر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابھی اس المیے کو گزرے جو عنبر کے لیے کسی سانحے سے کم ثابت نہیں ہوا تھا بلکہ خورشید جہاں کے لیے بھی کسی افتاد سے کم نہ تھا دو ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا کہ ایک روز جب عذیر جو سیکنڈ شفٹ میں اسکول جاتا تھا۔ جلد جلد تیار ہو رہا تھا اور خورشید جہاں باورچی خانے میں اس کے لیے توے پر روٹیاں ڈال رہی تھیں مدتوں بعد شہباز خان اپنی بڑی اور شادی شدہ بیٹی شمسہ کے ساتھ بہت بولتے اور چہکتے ہوئے ان کے گھر میں داخل ہوئے اور بیٹھک کے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے ہو کر ہانک لگائی۔

"ارے بھئی کہاں چھپی بیٹھی ہو بھر جائی ذرا ادھر تو آؤ۔" اُن کے لہجے میں بڑی بشاشت تھی۔ خورشید جہاں نے جو اُن کی اچانک آمد پر متعجب ہونے سے زیادہ دل گرفتہ سی ہو رہی تھیں اُن کی آواز سُن کر جلدی سے چولہا ٹھنڈا کیا۔ آٹے کے کونڈے کو پرات سے ڈھانپ کر جلد جلد ہاتھ دھوئے اور دوپٹے کے آنچل سے اپنی پیشانی اور چہرے پر جمع شدہ پسینے کے قطروں کو پونچھتی باورچی خانے سے باہر آگئیں۔ بیٹھک میں آتے ہی انہوں نے جیٹھ کو سلام کیا تو انہوں نے آگ کی تپش میں تمتماُ اٹھنے والے ان کے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"اتنی عمر آگئی خورشید اس پر بھی تم چولہے ہانڈی کے چکر میں پڑی ہوئی ہو۔ تمہاری تو دو جوان جوان بیٹیاں ہیں ان سے یہ سارے کام کیوں نہیں کراتیں۔" گو یہ بات شاہنواز خان نے ان کی ہمدردی میں کہی تھی مگر ان کا یوں منہ بھر کر جوان جوان لڑکیاں کہنا انہیں بہت ناگوار گزرا۔ شمسہ جو انہیں دیکھتے ہی آکر ان سے لپٹ گئی تھی اسے گلے سے لگا کر علیحدہ ہوتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"مگر میری دونوں جوان بیٹیاں تو خیر سے اس وقت پڑھنے گئی ہوئی ہیں۔ ورنہ سارے کام وہی کرتی ہیں میں تو بس عذیر کے لیے دو تین روٹیاں ڈال لیتی ہوں کیونکہ یہ دوسری شفٹ میں پڑھنے جاتا ہے۔" خورشید جہاں چھوٹے صوفے پر ٹک کر بولیں۔

"ہاں سُنا ہے، تمہاری دونوں بیٹیاں کالج میں پڑھ رہی ہیں۔ اور عنبر نے تو مردانہ کالج میں داخلہ لیا ہے مگر کیا ضرورت تھی اسے اتنا پڑھانے کی۔ کیا انٹر تک پڑھ لینا کافی نہیں تھا۔" شاہنواز نے جو بیٹھک کے

واحد صوفے، بڑے صوفے پر بہت پھیل کر بیٹھے ہوئے تھے عنبر کو مزید پڑھانے پر نکتہ چینی کی۔

"جی ہاں بھائی جان خیال تو میرا بھی یہی تھا کہ انٹر تک پڑھ لینا ہی کافی ہے لیکن ادھر عنبر کو آگے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور ادھر ریحان نے بھی میرے اس خیال کی سخت مخالفت کی اور اسی کے کہنے اور زور دینے پر عنبر نے مردانہ کالج میں داخلہ لیا ہے مگر وہاں لڑکیاں بھی تو پڑھتی ہیں، مخلوط تعلیم ہے نا۔" شمسہ باپ کے قریب ہی بیٹھی تھی اسے باپ کی نکتہ چینی اچھی نہ لگی تو اس نے بھی زبان کھولی۔

"لیکن پاپا عنبر نے اگر کو ایجوکیشن کالج میں داخلہ بھی لے لیا ہے تو ایسی کونسی بُری بات ہے آخر اپنی قمرہ بھی تو کو ایجوکیشن کالج میں ہی پڑھ رہی ہے۔ اور میں تو سمجھتی ہوں کہ عنبر نے بی۔ اے میں داخلہ لے کر اچھا ہی کیا ہے۔ میرا مطلب ہے یہاں گھر میں بیٹھ کر مکھیاں مارنے سے تو یہی بہتر ہے۔"

اور شاہنواز جواب میں کچھ کہنا ہی چاہ رہے تھے کہ خورشید جہاں نے ان پیکٹوں کی طرف اشارہ کر کے جو ان کے ڈرائیور نے دو پھیروں میں لا کر بیٹھک کے ایک کونے میں رکھی چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل پر رکھے تھے شمسہ سے پوچھا۔

"یہ تھیلیاں کیسی ہیں کیا تم شاپنگ کر کے آ رہی ہو۔" تو شمسہ نے عجیب سے انداز میں مُسکرا کر کہا۔

"نہیں، میں تو سیدھی گھر سے ہی آ رہی ہوں۔ پرسوں ہی تو کراچی آئی ہوں نا۔ آپ سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا اس لیے پاپا کے ساتھ میں بھی چلی آئی۔"

"چلو یہ تم نے اچھا ہی کیا۔ میں نے بھی تمہارے یہاں بیٹا ہونے کی مبارکباد دینے تینوں بچوں کو بھیجا تھا، مگر وہاں سب شادی میں گئے ہوئے تھے کوئی ملا ہی نہیں۔" خورشید جہاں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ جبکہ دل میں تو سینکڑوں شکوے کلبلا رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا سب کچھ اگل دیں۔ وہ ستم جو اُن کی بیٹی پر ڈھایا گیا ہے اس کے بارے میں ایسی بازپرس کریں کہ جیٹھ کی طبیعت جھک ہو جائے، مگر وہی اپنی فطری رواداری اور دنیاداری نبھا رہی تھیں۔

"خیر یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی میں تو اپنے بہت ضروری کام چھوڑ کر اس وقت تمہیں نیوتا دینے آیا ہوں خورشید۔" شاہنواز نے یوں کہا جیسے ان کی باتوں سے اکتا گئے ہوں۔

"کیسا نیوتا بھائی جان؟" بہت کچھ سمجھ کر بھی۔ خورشید جہاں نے انجانے پن سے سوال کیا۔

"بھئی تمہارے بیٹے کی شادی کا۔ ریحان تمہارا بھی تو بیٹا ہے نا۔" شاہنواز نے جس طرح ہنس کر یہ آخری فقرہ کہا خورشید جہاں کے دل پر ایک گھونسا سا پڑا۔ جی چاہا چیخ چیخ کر کہیں کہ ہیں وہ تو آپ کا ہی بیٹا ہے۔ میرا بیٹا تو وہ اس وقت ہوتا جب آپ اُسے میرا داماد بناتے۔ مگر یہ سب کہنا ان کی خودداری کے منافی تھا۔ اس لیے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے کہا۔

"ہاں ہے کیوں نہیں۔" اسی اثنا میں لفافوں کے موٹے سے بنڈل سے جو شاہنواز خان کے ہاتھ میں تھا وہ ایک لفافہ نکال چکے تھے۔ جسے خورشید جہاں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"لو یہ تمہارے بیٹے کی شادی کا کارڈ ہے پرسوں مانجھے کی رسم ہے۔ اس سے اگلے روز رسم حنا ادا کی جائے گی۔ اور پھر بدھ کا دن چھوڑ کر جمعرات کو مغرب و عشاء کے درمیان نکاح ہو گا۔ مانجھے اور مہندی کے کارڈ بھی اسی لفافے کے اندر ہیں اور جس جگہ نکاح ہونا قرار پایا ہے اس کا پتا بھی کارڈ پر ہی درج ہے۔" مگر خورشید جہاں نے ان کے ہاتھ سے وہ لفافہ نہیں لیا بلکہ عذیر کو جو کتابیں لے کر اسکول جانے کی غرض سے بیٹھک میں آیا تھا انہوں نے کہا۔

"عذیر بیٹے، اپنے تایا سے یہ لفافہ لے کر وہاں میز پر رکھ دو۔" ان کی آواز میں ارتعاش تھا۔ جسے دونوں باپ بیٹی نے بھی محسوس کیا اور شمسہ نے کچھ کہتی ہوئی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی پھر شاہنواز خان نے عذیر کو جو ان کے ہاتھ سے کارڈ لے کر میز پر رکھنے کے بعد اسکول جانے کی غرض سے دروازے کا رخ کر رہا تھا روکتے ہوئے کہا۔

"ذرا ٹھہرو عذیر پتر۔ تمہاری ماں نے تو میرے ہاتھ سے شادی کا کارڈ لینا بھی گوارا نہیں کیا مگر تم کم از کم اپنی

چیزیں تو لیتے جاؤ۔"

"اسے اسکول سے دیر ہو جائے گی بھائی جان۔" خورشید جہاں نے کہا۔

"کوئی دیر نہیں ہوگی۔" شاہنواز نے ان کی بات کو رد کرتے ہوئے عذیر کو مخاطب کیا۔

"یہ میز پر جو پیکٹس رکھے ہیں عذیر پتر تم ایسا کرو کہ یہ سارے کے سارے ادھر تپائی پر لا کر رکھ دو۔" انہوں نے عذیر سے بات کرتے کرتے سائیڈ میں پڑی تپائی کو اٹھا کر اپنے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ تو عذیر نے ان کے کہنے کے مطابق چپ چاپ پیکٹ اٹھا کر اس کے سامنے تپائی پر چن دیے۔ وہ پیکٹس اصل میں خوبصورت گفٹ پیپرز میں لپٹے ہوئے تھے۔ شاہنواز نے شمسہ کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کچھ کہا تو اس نے جھک کر ان میں سے ایک پیکٹ چھانٹا اور ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"لو پتر اس میں تمہارے لیے ایک شلوار سوٹ ہے۔ اور ایک پینٹ کوٹ کا پیس ہے۔ ایسا ہی جیسا یہ میں نے پہن رکھا ہے۔ جوتے میں نے اس لیے نہیں خریدے کہ مجھے تمہارے پیر کا سائز معلوم نہیں تھا۔ سوٹوں کے ساتھ ہی پیسے رکھ دیے ہیں تم خود پسند کر کے خرید لینا۔" انہوں نے وہ پیکٹ عذیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ مگر پیکٹ ان کے ہاتھ سے لینے کے بجائے عذیر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ جو ان پیکٹوں کا عقدہ کھل جانے پر بڑی جز بز سی دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی ناگواری سے پوچھا۔

"یہ سب کس خوشی میں ہے بھائی جان؟"

"ارے تو بتایا تو ہے کہ اس کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے جب میں نے رضوان اور عرفان کے لیے بھی ایسے ہی کپڑے بنائے ہیں تو اسے کیوں محروم رکھتا۔ اس کا بھی برابر کا حق ہوتا ہے آخر تو یہ میرے سگے اور اکلوتے بھائی کا بیٹا ہے۔" شاہنواز نے یہ کہہ کر گویا بڑی اپنائیت اور لگاوٹ کا اظہار کیا۔ تو شمسہ نے ہنس کر گویا باپ کو یاد دلایا۔

"مگر بھتیجیوں کو تو آپ بھول ہی گئے پاپا۔"

"ارے نہیں، ان کو کیسے بھول سکتے ہیں ان کا خیال تو سب سے پہلے ہے۔" شاہنواز خان بھی ہنس کر بولے۔

"ہاں ہونا بھی چاہیے۔ کیوں چچی جان آخر ان دونوں کا بھی تو حق بنتا ہے نا۔ پاپا نے تو عنبر اور چھوٹی کے لیے چار دن دونوں کے لیے چار چار بھاری جوڑے بنوائے ہیں اور دو آپ کے لیے بھی ہیں۔ مگر پسند میری ہے اور آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میری پسند کتنی اعلیٰ ہوتی ہے۔" شمسہ نے بہت اٹھلا کر آخری فقرہ کہا۔

تو خورشید جہاں جو اتنی دیر سے بلکہ اتنے دنوں سے اپنے غم و غصے کو قابو میں کیے بیٹھی تھیں۔ انہیں یوں لگا جیسے دونوں باپ بیٹی اُن کی غریبی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کپڑوں، جوتیوں اور مٹھائی وغیرہ کی صورت میں ان کی بے بسی اور مجبوری کا منہ چڑا رہے ہوں۔"

اپنی حیثیت اور دولت کا مظاہرہ کر کے ان کی غیرت اور حمیت کو مٹی میں ملا رہے ہوں۔ انہیں پھر ضبط کا یارا نہ رہا تو وہ بڑے سخت اور کرخت لہجے میں بولیں۔

"سنو بچی۔ یہ سارے تحفے تحائف تمہیں ہی مبارک ہوں۔ میں غریب اور بے حیثیت ضرور ہوں مگر بے حمیت ہرگز نہیں ہوں۔ اور نہ میں لالچی اور حریص ہی ہوں جو تمہاری لائی ہوئی ان قیمتی چیزوں کو دیکھ کر پھسل جاؤں میں تو انہیں مر کر بھی قبول نہ کروں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی یہ بھیک واپس لے جاؤ۔"

"استغفراللہ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو بھر جائی۔ خدانخواستہ یہ بھیک کیوں ہونے لگی۔ کیا کوئی سگا تایا ایسا بے غیرت بھی ہو سکتا ہے جو اپنے اکلوتے مرحوم بھائی کے بچوں کو تحفے کے بجائے بھیک دے گا۔" شاہنواز خان جو خورشید جہاں کے ایک دم ہی پینترا بدل کر بات کرنے پر بوکھلا سے گئے تھے ان کی ایک غلط سوچ پر انہیں سمجھانے کی کوشش میں بولے۔

"جی ہاں چچی جان۔ خدا نہ کرے یہ بھیک کیوں ہونے لگی۔ یہ تو ہمارے ان بہن بھائیوں کا نیگ ہے۔ اور ابھی تو پہناؤنیاں بھی باقی ہیں جو جہیز میں آئیں گی ہم کو بھی یہی ساری چیزیں ملی ہیں چچی جان تو کوئی بھیک میں تو نہیں دی گئیں۔" شمسہ نے بھی ایک طرح انہیں سمجھانا چاہا۔

"تمہیں کیا ملا اور کیا نہیں ملا مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو اپنی اور اپنے بچوں کی بات کر رہی ہوں۔ خونی رشتوں اور بزرگوں کی خواہش کا جب تم نے احترام نہیں کیا۔ اور آن کی آن میں سب کو ختم کر ڈالا تو پھر اب رشتے اور کنبے داری کیسی۔ مجھے تو اگر غم ہے تو صرف اس بات کا کہ اگر رشتے داری کو توڑنا ہی تھا تو اس وقت توڑا ہوتا جب ابا جان کی آنکھ بند ہوئی تھی کیونکہ اماں جان کو تو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے تمہارے ابا اور اماں۔ جبھی تو اُن کے علیحدہ ہونے کا غم انہیں لے بیٹھا تھا۔" خورشید جہاں نے گویا دونوں باپ بیٹی کو کھری کھری سنائی تو شاہنواز اُن کے آخری فقرے پر تلملا سے اُٹھے۔

"خورشید پرانی باتوں کو دہرانے سے تلخی پیدا کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تمہارا یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ میں نے اپنے مرحوم باپ کی خواہش کا احترام نہیں کیا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ریحان سے عنبر کا رشتہ اتنی طوالت اختیار نہ کرتا۔ بلکہ بقول تمہارے ابا جان کے انتقال کے فوراً ہی بعد میں یہ رشتہ توڑ دیتا۔ لیکن میں نے اسے قائم ہی رکھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ آجکل کے لڑکے بہت خود سر اور اپنی من مانی کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ادھر زمانہ بھی بہت بدل گیا ہے آج کل کے نوجوان آزاد اور روشن خیال لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس پر اسے اپنی ماں کی شہ بھی ملی ہوئی تھی جو شروع ہی سے اس رشتے کے خلاف تھی۔ ہم کسی قابل تو بعد میں ہی بنے ہیں نا۔ مگر یقین جانو بھر جائی! میں اس بات پر اس سے سخت خفا ہوں۔ کیونکہ اس نے ماں کا ساتھ دے کر وہ مان توڑ دیا جو اپنی بڑی اولاد ہونے کی حیثیت سے مجھے اس پر تھا اور تمہیں کیا معلوم کہ مجھے عنبر کتنی عزیز ہے۔ اور جب میں یہ سوچتا ہوں کہ ریحان اور خالدہ کے اس ظالمانہ اقدام سے اس غریب بچی کے دل پر کیا گزری ہوگی تو تڑپ کر رہ جاتا ہوں۔

"لیکن آپ بھائی جان کی زیادتی کا الزام ممی کے سر کیوں تھوپ رہے ہیں پاپا! میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر بھائی جان عنبر سے شادی کرنے کی ضد پکڑ بیٹھتے تو پھر ممی کسی صورت میں بھی بھائی جان کو ان کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تھیں۔"

شمسہ کو باپ کا اپنی ماں کے خلاف بولنا ناگوار گزرا تو اس نے تھوڑا سا چمک کر کہا۔

"ہاں، یہ تو تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ لیکن بھائی جان کا کہنا بھی کچھ غلط نہیں۔ جب شروع ہی سے کسی لڑکے کے اس کی منگیتر کے خلاف کان بھرے جائیں گے اور بدقسمتی سے منگیتر بھی جو نامساعد حالات کا شکار رہی ہو یقینی طور پر اپنی منگیتر کے لیے لڑکے کے خیالات بھی بدل ہی جائیں گے۔"

خورشید میاں نے جیٹھ کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ تو شاہنواز خان اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھ کر بولے۔

"ہاں اور کیا۔ مگر اب یہ چیزیں تو قبول کر لو۔ دیکھو میں کتنی محبت سے لایا ہوں۔ اور پھر ان بچوں کا حق بھی بنتا ہے۔ ویسے بھی میں حشر کے دن ابا جان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جن کی دلی خواہش تھی کہ ہم دونوں بھائی اور ہمارے بیوی بچے متحد ہو کر رہیں اور ہمارا شیرازہ کبھی نہ بکھرے۔" شاہنواز خان نے اپنے لہجے کو مؤثر بنانے کی کوشش میں کہا۔

"مگر شیرازہ تو آپ نے بکھیرا ہے بلکہ شیرازہ بکھیرنے کے آپ ہی ذمہ دار ہیں کیونکہ آپ نے نہ معلوم کس کس طرح سے پیسہ کما کر اپنی حیثیت بنائی اور پھر ہم بے حیثیتوں کو بھول بھال کر اپنی دنیا میں مگن رہنے لگے۔ ہمارا تو خدا گواہ ہے کہ ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں۔" خورشید جہاں بولیں۔

"ہاں ہاں بالکل قصوروار واقعی میں خود ہوں۔ مگر اب میں تم سب کی طرف سے غافل نہیں رہوں گا میں عنبر کی شادی اتنی اچھی جگہ اور ایسی دھوم دھام سے کراؤں گا کہ کسی رئیس زادی کی بھی کیا ہوئی ہوگی۔ میں نے اس کے لیے ایک بہت ہی نیک سیرت اور پیسے والا لڑکا بھی دیکھ لیا ہے۔"

شاہنواز خان آہستہ آہستہ خورشید جہاں کو گویا لاسے پر لگا رہے تھے کم از کم خورشید جہاں کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

"نہیں بھائی صاحب! آپ کی محبت اور خیال رکھنے کا بہت بہت شکریہ۔ عنبر کے معاملے میں آپ بالکل فکرمند

نہ ہوں۔ کیونکہ میں تو تقدیر کی قائل ہوں۔ جب اس کی قسمت میں پھول کھلنے ہوں گے، خدا خود ہی کوئی راہ نکال دے گا فی الحال تو اس کی شادی کرنے کا میرا کوئی ارادہ ہی نہیں۔"

خورشید نے بھی انہی کی طرح ٹھنڈے ٹھنڈے لہجے میں گویا منہ توڑ جواب دیا کہ شاہنواز کو چپ سی لگ گئی۔ بیٹھک میں گرمی بہت ہو رہی تھی۔ شمسہ دعوتی کارڈ کے لفافے سے بار بار پنکھا جھل رہی تھی۔ شمسہ دعوتی کارڈ کے لفافے سے بار بار پنکھا جھل رہی تھی۔ اصل میں بیٹھک میں لگے گھر کے واحد چھت کے پنکھے میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی اس لیے وہ فل اسپیڈ میں ہونے کے باوجود بڑی ہلکی رفتار سے چل رہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو خورشید جہاں شمسہ کے یوں گرمی لگنے کا اظہار کرنے پر پنکھے کی خامی کے بارے میں ضرور بتاتیں لیکن اس وقت تو ان کا دل جلا ہوا تھا اس لیے خاموش ہی رہیں۔ شاہنواز نے خود ہی اُٹھ کر کھڑے ہوتے اور شمسہ سے کہا۔

"چلو شمی! وہ لوگ تو آج میرا انتظار کرتے کرتے سُوکھ گئے ہوں گے۔" تو شمسہ جو اُن کی بات پوری ہونے سے قبل ہی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے بڑی اکتاہٹ کے ساتھ خورشید جہاں کو مخاطب کر کے کہا۔

"اچھا چچی! اب ہم چلتے ہیں۔ یہ انویٹیشن کارڈ تو آپ کو دے ہی دیا ہے۔ اب آپ غیر تو نہیں کہ آپ سے یہ کہوں کہ ضرور آئیے گا۔

"ارے کیا باتیں کرتی ہو شمی! یہ ہمارے اپنے ہیں۔ ان کے لانے اور لے جانے کے لیے میں اپنی ایک گاڑی ریزرو کر دوں گا۔" شاہنواز نے کہا۔

"نہیں بھائی جان! میں بڑا دل ضرور رکھتی ہوں مگر اتنا فراخ بھی نہیں کہ اپنی بیٹی کی تمناؤں کا خون ہوتے دیکھ سکوں، اس لیے ہمیں تو معاف ہی رکھیے۔" خورشید جہاں نے صاف گوئی سے کام لینا ہی بہتر سمجھا۔

"اچھا اچھا! ہاں، یہ بھی تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ خیر خدا تم سب کو سکھی رکھے۔ خدا حافظ۔" شاہنواز نے گویا ان کی بات پر قائل ہو کر کہا۔ شمسہ نے بھی انہیں رخصتی سلام کیا اور پھر دونوں باپ بیٹی باہر جانے لگے تو خورشید جہاں نے کہا۔

"یہ سامان بھی اپنے ساتھ لیتی جاؤ شمی! اسے یہاں چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو۔"

"بھئی، اب اتنا بھی نہیں ہونا چاہیے خورشید! کیا اتنا کافی نہیں کہ تم شادی میں بھی شرکت نہیں کر رہیں۔ اب یہ تو بچوں کا حق ہے اسے تو رکھ ہی لو۔" شمسہ کے بجائے شاہنواز نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔

"نہیں بھائی جان! بہتر یہی ہوگا کہ آپ یہ ساری چیزیں واپس لے جائیں۔ ورنہ بچیاں کالج سے واپس آکر یقیناً ان ساری چیزوں کو باہر سڑک پہ پھینک دیں گی۔ کم از کم آپ عنبر کے مزاج اور طبیعت سے تو واقف ہی ہوں گے۔"

خورشید جہاں نے جواب میں کہا تو شاہنواز خان نے دروازے پہ کھڑے ہو کر اتنی زور سے ڈرائیور کو آواز دی کہ خورشید جہاں ڈر کر اچھل سی پڑیں اور پھر جونہی ڈرائیور دروازے تک آیا، اسے ساری چیزیں اٹھانے کی ہدایت کر کے شاہنواز خان بیٹی کے ساتھ کار کی طرف بڑھ گئے۔

ان دونوں کے جانے کے بعد داخلی دروازے کا اندر سے کھٹکا لگا کر خورشید جہاں مغموم اور ملول سی برآمدے میں جانے لگیں تو ان کی نظر رائٹنگ ٹیبل پہ پڑے انویٹیشن کارڈ پہ پڑی۔

"اے کاش اس کارڈ میں ریحان کے نام کے ساتھ میری عنبر کا نام ہوتا تو میں کتنی سُرخرو اور ہلکی پھلکی ہو جاتی۔"

کارڈ کو دیکھ کر ایک دم ہی ان کے دل میں یہ حسرت بھرا سا خیال آیا تو اُن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ذہن میں تو پہلے ہی آندھیاں سی چل رہی تھیں کہ جیٹھ نے اچانک آکر گویا سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دیا تھا۔ ورنہ وہ تو بیٹی کے المیے کو بُھلا دینے کی کوشش میں خاصی کامیاب ہو چکی تھیں۔ اور انہوں نے بڑی حد تک اس لیے بھی خود کو سنبھال رکھا تھا کہ ان کے مغموم اور ملول رہنے کا بیٹی کوئی اثر نہ لے لے۔ شروع میں تو وہ ان لوگوں کا ذکر بھی کرتیں تو بیٹی کو صبر کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بدھائی بھی دیتی تھیں۔ اور دم دلاسا بھی۔ اور اس کی دل دہی بھی کرتی تھیں۔

مگر بعد میں تو اُنہوں نے ان لوگوں کا ذکر کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ چھوٹی اگر کوئی ذکر بھی نکالتی تو وہ اسے ایسا گھور کر دیکھتیں کہ اس کے ہونٹوں پر مہر سی لگ جاتی۔

دو ماہ کا عرصہ گو اتنا طویل نہیں ہوتا مگر آج کل تو لوگ اتنے قلیل عرصے میں ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والے اپنے پیاروں کو بھی بھول جاتے ہیں اور اگر نہیں بھی بھولتے تو غم تو بُھلا ہی دیتے ہیں۔ کہ وہی مثل ہوتی ہے آج مرنے کل دوسرا دن۔ اصل میں ساری کارستانی وقت کی ہوتی ہے۔ کہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے پیچھے رہ جانے والی چیزوں کو اپنی گرد سے ڈھانپتا چلا جاتا ہے۔ اور خورشید جہاں نے بھی اس المیے پر مٹی ڈالنے کی کوشش ہی کی تھی مگر شاہنواز خان نے اچانک وارد ہو کر اور ستم بالائے ستم تحائف ساتھ لا کر ان کی ساری کوشش پر پانی پھیر دیا تھا۔

دل تو پہلے ہی بھرا چلا آ رہا تھا اب آنکھیں ڈبڈبا آئیں تو اشکوں کا سیلاب ضبط کے بند توڑ کر آنکھوں سے جاری ہو گیا۔ نہ معلوم کیا کیا یاد آ گیا۔ مگر خوشگوار اور خوش کُن احساس کے ساتھ نہیں یاد آیا۔ بلکہ اپنی شادی سے پہلے اور شادی کے بعد سے اب تک کی مصائب بھری زندگی سے ساتھ ہی یاد آیا۔

میری تقدیر تو گویا مصائب اور مشکلات سے ہی رقم کی گئی ہے تو پھر یہ رونا دھونا کس بات کا۔ انسان قدرت سے لڑ تو نہیں سکتا۔ بلکہ جو کچھ خدائی منشاء ہوتی ہے اسی کے تحت زندگی گزارتا ہے تو پھر یہ رونا دھونا کیوں۔ اور میرا دل تو آج مطمئن ہے۔ بھائی جان کی لائی ہوئی چیزیں ٹھکرا کر۔ انہوں نے ہمیں بے حیثیت، نادار اور بے وقعت سمجھ کر اور ہم پر ترس کھا کر یہ کپڑوں وغیرہ کی جو بھیک دینی چاہی تھی میں نے اسے ٹھکرا کر کم از کم ان پر یہ ثابت تو کر دیا کہ میں اتنی ندیدی، لالچی اور حریص ہوں نہ گری پڑی جو ان کی لائی ہوئی قیمتی چیزوں کو دیکھ کر میری رال ہی ٹپک پڑتی اور میں ان کی زیادتیوں کو بھلا بیٹھتی۔ ہاں یہ میں نے بہت ہی اچھا کیا۔

اس طرح بہت بڑا جوتا لگایا ہے ہماری غریبی نے اُن کی امیری کے منہ پہ۔ یہی سب سوچ کر انہوں نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

اس کے باوجود بھی دل کو اطمینان نہیں ہوا۔ اصل میں اُن جیسی نیک نفس خاتون کو ان ساری باتوں کے علاوہ یہ احساس بڑا پریشان کر رہا تھا کہ ایک تو انہوں نے خدا کی بھیجی ہوئی نعمت کو ٹھکرایا دوسرے گھر میں آئے ہوئے کسی اپنے کی دل آزاری بھی کی۔ چونکہ وہ خدا سے بہت ڈرتی تھیں اسی لیے کوئی بدلحاظی کی بات کرنے سے قبل یہ ضرور جاننے کی کوشش کرتی تھیں کہ یہ بات اللہ کو بُری تو نہیں لگے گی۔ گویا دوسرے معنوں میں وہ اللہ کے خوف اور خوشنودی کو مقدم رکھتی تھیں۔

پھر ڈھائی بجے کے قریب پہلے چھوٹی کالج سے آئی (دونوں بہنیں پبلک بس سے کالج جاتی اور آتی تھیں) چھوٹی تو ہمیشہ سے ہی بھوک کی بہت کچی تھی وہ آتے ہی باورچی خانے میں گھس گئی۔ پھر معمول کے مطابق اس کے آنے کے دس منٹ بعد عنبر بھی کالج سے آ گئی۔ ایک تو دروازہ کھلتے ہی سینٹ کا بھبکا جو شمسہ بیٹھک میں بسا کر گئی تھی اس کے نتھنوں کے اندر دور تک اُترتا چلا گیا۔ دوسرے سلمے کے ذرات جو اس کی کامدار ساڑھی میں سے جھڑے تھے۔ بڑے نمایاں طور پر صوفے پہ چمکتے نظر آئے تو اس نے ماں سے پوچھا۔

"امی! کیا آج کوئی آیا تھا؟" اور ماں جو آتے ہی اسے بتانا نہیں چاہ رہی تھیں بلکہ انہوں نے سوچا کہ اس کے دل کو صدمہ نہ پہنچے۔ وہ دعوتی کارڈ بھی چھپا دیا تھا۔ اب جو آتے ہی اُس نے ان سے پوچھا تو وہ ٹالنے کی غرض سے بولیں۔

"ہاں۔ مگر پہلے تم جا کر منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو بلکہ نہا ہی لو تو بہتر ہے اتنی تیز گرمی سے آئی ہو۔ نہانے سے جی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس چھوٹی کو تو آتے ہی کھانا کھانے کی پڑ جاتی ہے، یہ نہیں کہ پہلے نہا دھو کر ٹھنڈی ہو لیا کرے۔"

"اے امی، یہ آپ ہم دونوں کو آج ٹھنڈا کرنے پہ کیوں تُلی ہوئی ہیں، ٹھنڈا تو انسان مرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اور یوں تو آپ ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ باہر سے گرمی سے آتی ہو تو تھوڑا سا دم لے کر پانی پیا کرو اور آتے ہی نہایا نہ کرو کیونکہ

پسیجے ہوئے بدن پر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پڑنے سے کبھی کبھی بدن اکڑ بھی جاتا ہے۔ دماغ پر گرمی چڑھ جاتی ہے۔" عنبر نے ہنس کر کہا۔

"ارے ارے یہ تم نے آتے ہی اپنی بارہ ہاتھ کی تلو کیوں چلانی شروع کر دی۔ جاؤ جا کر کھانا کھالو، چھوٹی نے ابھی ابھی گرم کر کے رکھا ہے۔" ماں نے پھر کہا تو عنبر نے غور سے ان کی صورت دیکھ کر کہا۔

"کیا بات ہے امی پہلے تو کبھی آپ نے میرے نہانے اور کھانا کھانے پر اتنا زور نہیں دیا تھا پھر۔" تو ماں نے اس کی بات کاٹ کر بیزاری سے کہا۔

"ارے بات کیا ہوگی۔ آج صبح سے میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ ابھی کھانا پکا کر اور نماز پڑھ کر لیٹی ہی تھی کہ پہلے چھوٹی اور پھر تم آگئیں اور مجھے اٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا۔"

"او اچھا۔ مگر یہ چھوٹی آخر کہاں ہے جو آپ کو اٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا۔" عنبر نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

"باورچی خانے میں ہوگی اور کہاں ہو سکتی ہے۔" خورشید جہاں نے کچھ زیادہ ہی بیزار لہجے میں کہا اور دوسرے کمرے کی طرف جہاں دونوں بیٹیوں کے پلنگوں کے ساتھ ان کا بھی پلنگ پڑا تھا بڑھ گئیں۔

خورشید جہاں نے تو عنبر سے ریحان کی شادی کا کارڈ چھپایا تھا مگر چھوٹی نے اس بدنما بدرنگ اور کھٹ پٹیں پڑی چھوٹی سی الماری سے جس میں اس نے اپنی کتابیں، کاپیاں اور بہت سی الم غلم چیزیں بھر رکھی تھیں اپنی کوئی کاپی ڈھونڈنے کی کوشش میں وہ کارڈ برآمد کر لیا۔ موٹا اور بڑا سا لفافہ وہ بھی نیا نیا سا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اس کی کتابوں میں یہ کارڈ کیسے آ گیا۔ اور کس نے رکھا ہے۔ جلدی سے کھول کر پڑھا تو پھلکی کی طرح ناچ اٹھی۔

"امی! یہ ریحان بھائی کی شادی کا کارڈ یہاں میری کتابوں میں کیسے آیا۔ کون دے گیا ہے یہ، اور کس نے رکھا ہے یہاں؟" اور جب بھانڈا پھوٹ ہی گیا تو۔ چھوٹی کو اس قدر تلملاتا ہوا دیکھ کر بتانا ہی پڑا۔

"ارے میں نے رکھا ہے میں نے۔ اور کوئی فرشتے تو نہیں رکھنے آ سکتے تھے نا۔"

"مگر۔ مگر امی یہ لایا کون تھا۔ اور آپ نے لے کر رکھ کیسے لیا۔ آپ کو یا تو اسے پھاڑ دینا چاہیے تھا یا پھر لانے والے کے منہ پر کھینچ کر مار دینا چاہیے تھا۔ ہاں بھلا جرأت کیسے ہوئی ان لوگوں کو ہمیں یہ نحس کارڈ بھیجنے کی۔ یہ تو ہمیں جلانا اور ستانا ہی ہوا کیوں آپا؟"

چھوٹی تو کارڈ کو دیکھ کر جیسے آپے سے باہر ہوگئی تھی۔ اُس نے عنبر سے اپنی بات کی تائید چاہی۔ تو وہ جو اس کے زور زور سے بولنے پر باورچی خانے سے بھاگی بھاگی آئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"ہاں مگر ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

"نہیں کیا کریں گی دیکھ کر سوائے جلنے اور کڑھنے کے۔ ایمان سے حالات نے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال رکھا ہے ورنہ اس وقت میرے پاس کار ہوتی تو میں ایسی بے بھاؤ کی سُنا کر آتی ان سب کو ساری عمر یاد رکھتے۔"

"بس خاموش ہو جاؤ چھوٹی! تم کیا اور تمہاری بساط کیا، جو تم جا کر بے بھاؤ کی سُناؤ گی ان لوگوں کو، اس قدر بڑھ بڑھ کر بولو گی تو لوگ مجھے اور تمہارے مرے ہوئے باپ کو الہانے دیں گے کہ خورشید اور شہباز خان کی چھوٹی بیٹی بڑی زبان دراز اور لڑاکا ہے۔ ارے تم تو وہاں جا کر ان کو بے بھاؤ کی سُنانے کو کہہ رہی ہو اور میں نے یہاں گھر میں بیٹھے بیٹھے ایسی بے نقط سُنا دیں کہ اگر وہ لوگ غیرت مند ہوں گے تو اب کبھی میرے گھر میں قدم رکھیں گے نہ کوئی تعلق ہی۔" خورشید جہاں نے زبان زوری پر اسے بڑی سختی سے ٹوک کر کہا۔

"اچھا تو وہ لوگ آئے تھے امی! اسی لیے آپ بتانا نہیں چاہ رہی تھیں۔" عنبر نے جو آنکھوں میں آنسو بھرے مغموم سی کھڑی تھی گلوگیر سے لہجے میں ماں سے کہا تو انہوں نے شاہنواز اور شمسہ کی آمد اور ان سے جو باتیں ہوئی تھیں اس کا سارا احوال ان دونوں کے گوش گزار کر دیا۔

"واہ امی واہ۔ یہ تو آپ نے بہت ہی اچھا کیا۔ لیکن شکر کیجیے کہ میں موجود نہیں تھی ورنہ میں ہوتی تو۔" چھوٹی نے جوش میں آ کر کہنا چاہا۔

"پھر وہی بے تکی بات۔ اپنی عمر سے بڑھ کر بات نہیں کیا کرو بچی! کہنے کو تو میں بھی بہت کچھ کہہ سکتی تھی کہ میرا جی جلا ہوا تھا مگر وہ کوئی انیا خنیا نہیں تمہارے سگے تایا تھے۔ اور ایسے قریبی عزیزوں سے مروت اور رواداری کو

ملحوظ رکھ کر ہی بات کی جاتی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ دو شالے میں لپیٹ کر مارو تو بظاہر چوٹ اتنی گہری نہیں لگتی جتنا کہ اس کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ اور پھر چھوٹی اپنے بڑوں سے یوں منہ پھاڑ کر بات نہیں کیا کرتے۔ بات بھی کرو تو ایسی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی حد ادب میں رہ کر بڑی سے بڑی بات بھی کہہ دی جائے تو گراں نہیں گزرتی۔" خورشید جہاں نے چھوٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اور پھر عنبر کی طرف دیکھ کر جو اپنے پلنگ پہ پیر لٹکائے ملول سی بیٹھی تھی۔ انہوں نے اندر ہی اندر ایک سرد سی آہ بھر کر کہا۔

"ہاں دیکھو، بڑے آئے تھے ہمدردی جتانے کہہ رہے تھے کہ تم غم نہ کرو۔ میں نے عنبر کے لیے ایک بہت ہی نیک اور پیسے والا لڑکا تلاش کر لیا ہے۔ عنبر کی شادی اس سے ایسی دھوم دھام سے کروں گا کہ دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔ ہونہہ بڑے آئے تھے شادی کرانے والے۔ میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کو عنبر کی فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں عنبر کی قسمت میں ہوگا تو آپ کے بیٹے سے بھی اچھا بر مل جائے گا۔"

ماں نے یہ بات خاص طور پر کہی تھی۔ عنبر ایک مخمصے میں پڑ گئی کہ کہیں تایا نے سعد کا نام تو نہیں لے دیا جو امی اب بعد میں یہ بات جتا رہی ہیں۔ کیونکہ اس نے اس ڈر سے ماں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ریحان نے اسے سعد سے شادی کرنے کا مشورہ دیا تھا کہ کہیں ماں اس معاملے میں سیریس نہ ہو جائیں کیونکہ وہ سعد کو بہت پسند کرتی تھیں۔ عنبر کا بہت جی چاہا کہ ان سے پوچھے مگر حجاب مانع ہونے کی وجہ سے ہوا ٹو ہی نہیں پڑا۔

"چھوڑیں امی! ہماری آپا ماشاءاللہ خاندان کی سب سے حسین لڑکی ہیں۔ اس پر تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ گو ہمارے خاندان اور برادری میں ریحان بھائی کے پائے کا رئیس کوئی نہیں ہے لیکن خاندان سے باہر تو آپا کو اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔" چھوٹی نے محض بہن کی دلدہی کے طور پر کہا تو عنبر نے دلار بھرے انداز میں اسے جھڑکا۔

"امی ٹھیک ہی کہتی ہیں چھوٹی! تم تو بہت ہی منہ زور ہوگئی ہو۔ بھلا تمہارا ان معاملات میں دخل دینے سے کیا تعلق۔ تم چُپ ہی رہا کرو تو بہتر ہے۔"

"اور معاملات میں تو چُپ رہ سکتی ہوں آپا! مگر آپ کے اس معاملے میں ہرگز نہیں۔ میرا بس چلے تو میں اپنے دولہا بھائی کی تلاش میں ساری دنیا کے کھوجیوں کو لگوا دوں۔"

چھوٹی نے شرارت سے اسے چھیڑا تو اس نے حسبِ عادت ماں سے اس کی شکایت کی۔

"امی دیکھیے، اس چھوٹی کو، یہ بہت بیہودہ ہوتی جا رہی ہے۔" تو ماں نے جواب میں ہنکارا بھرا اور چھوٹی ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

وقت کسی کو تیز رفتاری سے گزرتا محسوس ہوتا ہے۔ اور کسی کو بہت سست رفتاری سے کہ تیز رفتار سے گزرنے کا احساس تو پیٹ بھروں اور فارغ البالوں کو ہی ہوتا ہے۔ جن کو کوئی غم ہوتا ہے نہ غم روزگار۔ آہستہ خرامی سے اور سِسک سِسک کر وقت گزرنے کا احساس تو حالات کی چکی میں پسنے والے پریشان حالوں کو ہی ہوتا ہے جن کے غم کم ہوتے ہیں۔ نہ غم روزگار کا مسئلہ۔

چنانچہ یوں تو وقت اپنے معمول کی رفتار سے تیزی سے ہی گزر رہا تھا مگر وہ چند ماہ جو عنبر پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ واقعی سِسک سِسک ہی گزر رہے تھے۔ بے چینی۔ اضطراب۔ اضمحلال۔ اور تڑپ۔

پورے تین چار ماہ تک وہ ایک ذہنی اور قلبی انتشار میں مبتلا رہی۔ مناجب سے ریحان کی شادی کا کارڈ آیا تھا۔ وہ ایک خلجان میں مبتلا ہوگئی تھی کہ یوں تو اپنے سے اچھی حالت میں دوسرے کو دیکھ کر ہر بندہ بشر کی یہی خواہش ہوتی ہے وہ بھی اچھی اور بہتر حالت میں زندگی گزارے۔

آسودہ حال اور فارغ البال ہو جائے۔

اسے بھی آسائشیں اور آرام میسر ہو۔

وہ پیٹ بھر کے کھائے اور سُکھ کی نیند سوئے۔

مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ اپنے مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اُلٹا نئی نئی مشکلات میں پھنس جاتا ہے اور یوں آسودہ ہونے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔

تو کچھ یہی حال عنبر کا بھی تھا۔ مگر قدرے مختلف۔

کہ اسے تو بچپن ہی میں جب وہ منگیتر کا مفہوم جانتی تھی نہ شادی بیاہ کا، اسے ریحان سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ نسبت طے پا جانے کے تقریباً دو برس بعد تک تو ریحان اور وہ ایک ساتھ ہی رہے پھر تایا نے علیحدہ گھر لے لیا۔ اور ریحان اس سے جدا ہو کر دوسرے گھر میں چلا گیا۔ اس کے باوجود بھی وہ نسبت وہ تعلق قائم رہا۔ جوان دونوں کا ایک دوسرے سے تھا۔ اس طرح ہوتے ہوتے تایا نے اتنی دولت کمائی کہ نواب رئیسوں کی طرح اپنے عالی شان بنگلے میں رہنے لگے۔ تب بھی دونوں کے قلبی تعلق میں فرق نہیں آیا تھا۔

تائی اور ان کے دوسرے بچوں کا رویہ گو تکلیف دہ حد تک مغایرانہ ہوتا تھا۔ پھر بھی محض تایا کی شفقت اور ریحان کا التفات اسے کشاں کشاں تایا کے یہاں لے جاتا۔

وہاں جاتی تو وہاں کے ماحول سے اس کی ایک چیز بھی میل نہ کھاتی۔

لباس۔ نئی تہذیب کے ایٹی کیٹس۔

مزاج۔ ذہنیت اور بات کرنے کا اسٹائلش سا انداز وہ بھی انگلش میں۔

اور پھر سب سے بڑھ کر حیثیت۔ کمپلکسڈ تو بہت ہوتی تھی۔ مگر اس کی رگوں میں انہی لوگوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ مزاج میں طنطنہ بھی بہت تھا۔ اور پھر یہ احساس کہ وہ اس گھر کی بڑی بہو بننے والی ہے۔ تایا اور ریحان کے سوا وہ بھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ یوں بھی قدٔیت کے لحاظ سے ان لوگوں سے ممتاز تھی۔

وہ جب تایا کے یہاں سے ہو کر گھر آتی تو اپنے پرانے سے نواڑی پلنگ پر لیٹ کر پہروں سوچا کرتی جب وہ بیاہ کر تایا کے گھر جائے گی تو اسے بھی یہی ساری آسائشیں مہیا کی جائیں گی جو تایازادوں کا مقدر بنی ہوئی ہیں۔ تایا کے یہاں ہوتی تو اس کا دل چاہتا کہ اس کا گھر بھی ایسا ہی ہو۔

قیمتی فرنیچر۔ فرج۔ ٹی وی، وی سی آر۔ ڈیک۔ اے سی۔ بیرونی ممالک سے لائے گئے قیمتی اور نفیس برتنوں کے ڈھیر۔ قالین۔ پردے کچن میں رکھی جدید طرز کی مسالہ پیسنے۔ آٹا گوندھنے۔ سبزی کاٹنے کی برقی مشینیں۔ کوکنگ رینج اور کار وغیرہ۔

یہ حرص و ہوس۔ یہ دوسروں کی ریس اور خوب سے خوب تر کی خواہش آج کل کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے مشینی دور کا ایک حصہ ایک تقاضہ بن کر رہ گئی ہے۔

اس خوب سے خوب تر کی خواہش میں کم حیثیت اور نادار لوگ غلط ذریعوں سے دولت کمانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کوشش میں وہ غیر قانونی اور مجرمانہ اقدام کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

مگر عنبر کا معاملہ بلکہ سوچ مختلف ہی تھی۔

وہ تو ایک رئیس لڑکے کی منگیتر تھی۔ اور اس کے دل میں خواہشات کا جو ہجوم تھا وہ کچھ بے جا نہ تھا۔ وہ اپنے نواڑی پلنگ پر لیٹتی اور چونے کی قلعی سے لپی ہوئی دیواروں اور کمرے میں رکھی ہوئی پرانی اور ٹوٹی پھوٹی بدنما چیزوں کو دیکھتی تو چشم تصور میں ریحان کا آراستہ و پیراستہ کمرہ گھوم جاتا اور وہ تصور ہی تصور میں خود کو اس کے اندر مقید کر لیتی۔

یوں جیسے اسی میں رہ رہی ہو۔ اسی میں بیٹھی ہو۔ اسی میں لیٹی ہو۔ یا وہ ریحان کا نہیں اس کا اپنا کمرہ ہو۔ روز تو نہیں مگر کبھی کبھی۔ جب وہ تایا کے یہاں سے ہو کر آتی۔ اور اپنے گھر کی بدحالی سے اسے وحشت سی ہونے لگتی تو وہ جاگتے میں ایسے ہی خواب دیکھا کرتی تھی۔

مگر اب تو یہ سارے سنہرے روپہلے اور خوبصورت خواب بکھر کر رہ گئے تھے۔ اور اگر کسی انسان کے خواب اچانک بکھر جائیں۔

ایسے خواب جنہیں وہ سچائی سے تعبیر کرتا ہو۔ تو وہ خود بھی بکھرتا ہی نہیں بلکہ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی ہے۔

پس یہی کچھ عالم عنبر کا بھی ہو گیا تھا۔ بلکہ چند ماہ سے لگ رہا تھا۔ مگر اس نے اپنی ذات کی بکھری ہوئی کرچیوں کو بہت قلیل عرصے میں سمیٹ لیا تھا یا سمیٹنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ کچھ عرصے سے

ریحان کی بے رخی اور بدلے بدلے رویے کو وہ خود ہی اچھی طرح محسوس کر چکی تھی۔ اس پہ چھوٹی بہن نے چھوٹی ہو کر بھی ان ساری باتوں کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا جو وہ ریحان کی محبت میں محسوس نہیں کر سکی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی ان ساری باتوں پر اچھی طرح سوچ و بچار کر کے ایک طرح اپنے المیے پر صبر ہی کر لیا تھا۔ اسے تو بس ایک ہی دھن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح بی اے کر لے تاکہ اسے کسی اچھی ملازمت ملنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ کیونکہ اس نے اپنے المیے کو اپنی انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے ایک چیلنج کی طرح قبول کیا تھا۔ اور وہ ملازمت کر کے اور کسی قابل بن کے اپنے تایازادوں پہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ اتنی بے حیثیت اور بے وقعت نہیں جتنا کہ وہ اسے سمجھ رہے تھے۔

اتنی زیادہ کہ سعد جیسے ٹچے شخص کو ریحان نے میرے لیے پسند کیا۔ کتنی عجیب بات تھی اسے جب بھی اس واسطے سے ریحان کا خیال آیا تو اس پر غصہ آنے کے بجائے اسے سعد پہ ہی غصہ آتا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ سعد کا نام اس کے ساتھ کیوں آیا۔ بہت تاثر تار رہتا تھا مجھے چپکے چپکے یقیناً اسی نے ریحان کے آگے ہاتھ پیر جوڑے ہوں گے کہ تم نے تو اپنی پسند کا پاٹنر چن لیا ہے اب تم عنبر کی شادی مجھ سے کرا دو اور ریحان کے فردوس سے شادی کرنے کا علم اسے بہت پہلے ہو گیا ہوگا تبھی تو اس دن جب میں آخری بار چھوٹی کے ساتھ شمسہ باجی کے یہاں بیٹا ہونے کی مبارکباد دینے گئی تھی تو ریحان نے نہ صرف سعد کی کمرے میں موجودگی کو مجھ سے چھپایا تھا بلکہ اس کے جانے کے بعد بات بات میں اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ جو خاص بات کہہ کر مجھے روکا تھا تو وہ بھی یقیناً یہی بات ہو گی۔

بہرحال جو کچھ بھی تھا۔ ریحان کے اسے سعد سے شادی کر لینے کا مشورہ دینے کے بعد تو اسے کچھ زیادہ ہی سعد سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس قدر کہ وہ اس کے اپنے گھر میں آنے کی بھی روادار نہیں رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی ماں سے صاف صاف نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ وہ ماں کے کان میں اس بات کی بھنک بھی پڑوانا نہیں چاہتی تھی کہ ریحان نے اسے سعد سے شادی کر لینے کا مشورہ دیا ہے۔ یوں بھی وہ گھر میں سعد کی آمد و رفت بند کروانے کے سلسلے میں بارہا اپنی ماں سے احتجاج کر چکی تھی۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہا تھا۔ ماں نے اس کے برملا اعتراض و احتجاج کرنے کے باوجود بھی سعد کو اپنے گھر میں آنے کی ممانعت نہیں کی تھی۔

مگر اب معاملہ دوسری نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ اب تو وہ اس کے سامنے پڑنا بھی اپنی توہین سمجھتی تھی۔ لیکن یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ وہ ایسا کہیں غائب ہوا تھا کہ پورے دو ماہ گزرنے کے باوجود آیا ہی نہیں تھا۔ اور اپنی دانست میں وہ یہی سمجھتی رہی کہ چونکہ میں نے بہت حقارت سے ______ ریحان کے سامنے اس کے رشتے کو ٹھکرایا ہے اور اس روز بھی ریحان کے سامنے اس کی پوری پوری اوقات جتا دی تھی اس لیے اس کا منہ ہی کہاں تھا میرا سامنا کرنے کا۔

مگر ایک روز جب وہ کالج واپس لوٹی تو دیکھا ماں اور چھوٹی بیٹھک میں اپنے سامنے بہت ساری چیزیں پھیلائے بیٹھی ہیں۔ جن میں ایک آموں کی پیٹی۔ ایک بڑا سا ٹوکرا جس پہ ایک ڈھکن سا لگا تھا تین چار بڑے بڑے پیکٹ اور ایک مٹھائی کا بڑا سا ڈبہ۔ استفسار کرنے پر چھوٹی نے بڑے ناز سے بتایا۔

"آپا! یہ سب سعد بھائی ہمارے لیے ملتان سے لائے ہیں۔ یہ آموں کی پیٹی ہے۔ اور اس ٹوکرے میں آڑو ہیں یہ پڑے بڑے اور یہ حبشی حلوہ ہے وہاں کی مشہور سوغات اور پتا ہے ان پیکٹس میں، ہم چاروں کے لیے وہاں کا مخصوص کام بنے ہوئے کرتے اور دوپٹے ہیں۔ یہ دیکھیں یہ امی کا دوپٹہ۔ ایسا نفیس کام تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

چھوٹی نے خوشی میں جذباتی سی ہو کر ماں کا دوپٹہ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ مگر اس کا تو منہ بن گیا تھا۔ اس نے کچھ دیکھا نہ سنا اور سر جھٹک کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ وہ تو بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ چونکہ کراچی میں سیٹل ہو گیا ہے اس لیے اپنی والدہ اور بھائی کو لینے ملتان گیا ہوا تھا۔ جہاں اسے وہاں کے

کاموں سے نمٹتے نمٹتے دو ماہ لگ گئے تھے۔ اور یہ بھی کہ اس نے بھی اپنا کوئی نجی کاروبار شروع کر دیا ہے۔ وہ اس کے بارے میں کوئی بات ڈھنگ سے سنتی ہی کب تھی۔ وہ تو بس ماں اور بہن کی آپس کی گفتگو کا کوئی حصہ اس کے کان میں پڑ جاتا تھا۔ تو اسے تھوڑی بہت بات معلوم ہو جاتی تھی۔ جبکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ چھوٹی بات بے بات اس کے سامنے سعد کا ذکر چھیڑ دیتی تھی اور عذیر اگر اُس وقت موجود ہوتا تو خواہ مخواہ ہی سعد کی تعریفیں کر کر کے اپنا منہ خشک کرتا۔ اور اختتام اس بات پر ہوتا کہ وہ ان دونوں کو بُری طرح ڈانٹ دیتی تھی۔

"یہ تم دونوں خالتو باتوں میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ جاؤ جاکر اپنا کوئی کام کرو۔" یا پھر ایسی ہی کوئی بات جس پر وہ دونوں شرارت سے ہنستے تو اس کا دل اور بھی جل جاتا۔

وقت کو گزرتے دیر نہیں لگتی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ عنبر تھرڈ ایر سے فائنل ایر میں آگئی تھی۔ ان دنوں اس نے عالیہ سے اپنے مراسم کچھ زیادہ ہی بڑھا لیے تھے۔ اب تو وہ ہر تیسرے چوتھے روز عالیہ کے گھر بھی جانے لگی تھی۔ حالانکہ اس نے عالیہ کو کبھی اپنے گھر بلایا تھا نہ عالیہ نے خود آنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بس اس کی عنبر سے دوستی کالج کی حد تک ہی محدود تھی۔ اور وہ خود بھی اتنی گئی گزری نہیں تھی کہ عالیہ کے ہاں بھاگ بھاگ کر جاتی۔ وہ تو عالیہ کے یہاں جانے کا آغاز شروع میں ایک دو بار کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔

ایک مرتبہ کچھ ایسا اتفاق ہوا تھا کہ اس علاقے میں جہاں ان دونوں کا کالج تھا کچھ دنگا فساد ہو گیا تھا۔ بلوائیوں یا شرپسندوں نے اس علاقے کی مارکیٹ کی دکانیں لوٹ لی تھیں۔ اور کالج پر بھی دھاوا بولنے کا امکان تھا اس لیے کالج میں چھٹی کر دی گئی تھی۔ عنبر چونکہ پبلک بس سے آتی اور جاتی تھی اس لیے بس اسٹینڈ تک جانے کے خیال سے ہی اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ جبکہ ادھر عالیہ نے فون کر کے اپنی گاڑی منگوالی تھی۔ پہلے تو عالیہ نے اس سے کہا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ جائے وہ اسے بس اسٹینڈ پہ ڈراپ کر دے گی مگر جب وہ بس اسٹینڈ پر پہنچی تو اس نے عنبر سے کہا کہ یہاں اس وقت تمہارا اترنا ٹھیک نہیں ہے۔ خود دیکھو کہ کتنا رش ہو رہا ہے۔ بسیں اول تو آ ہی نہیں رہیں، جو آ بھی رہی ہیں تو کھچا کھچ بھری ہوئی۔ اس بھیڑ کی دھکم پیل میں کہیں تم گر کر زخمی نہ ہو جاؤ اور نہ معلوم کب گھر پہنچو۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ میرے گھر چلو۔ میں وہاں سے تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کروا دوں گی۔"

اور یوں عنبر اس کے گھر چلی گئی تھی۔ بلکہ اس وقت سے عالیہ کے گھر میں اُس کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مگر وہ کم ہی اس کے یہاں جاتی تھی۔

عالیہ کی والدہ حیات نہیں تھیں۔

والد کا ذاتی بزنس تھا۔ دو تین فیکٹریاں تھیں جن میں اونکس اور ماربل اسٹون کو تراش کر آرائشی چیزیں بنائی جاتی تھیں۔ والد صبح نو بجے کے گئے رات آٹھ بجے گھر واپس آتے تھے۔

بڑا بھائی امریکہ کی ایک مشہور زمانہ یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا۔ اور چھوٹا بھائی ریٹارڈ تھا۔ جس کی پیدائش پر خون میں زہر پھیل جانے کی وجہ سے اس کی والدہ کی موت واقع ہوئی تھی۔ چھوٹے بھائی جمشید کا کمرہ بالکل الگ تھلگ تھا اور وہ ایک ملازم کی نگرانی میں اس کمرے میں زیادہ تر بند ہی رہتا تھا۔ اور وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ ایسے خاموش اور سنسان سے ماحول میں عالیہ سخت بوریت کا شکار رہتی ہوگی۔ تو عالیہ نے یہ کہہ کر اس کے اس خیال کی تردید کر دی تھی۔

"نہیں بھئی، بھلا اپنے گھر میں بوریت کا کیا سوال، وہ بھی ایسے پُر آسائش گھر میں جہاں رہ کر سکون اور اطمینان قلب ہی نصیب ہوتا ہے۔ کوئی کافر ہی ہوگا جو بوریت کا شکوہ کرے گا۔ ویسے اگر کبھی تھوڑی سی بوریت کا احساس بھی ہوتا ہے تو میں وی سی آر پر کوئی مووی لگا دیتی ہوں اور اگر مووی دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تو کار لے کر گھومنے پھرنے نکل جاتی ہوں مگر تنہا تو گھومنا پھرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ اور تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ کسی میل کمپنی

کا ساتھ اپنے کو گوارا ہی نہیں ہے۔" عالیہ بہت ہنس کر یہ آخری فقرہ کہتی۔

اُف۔ گھوم پھر کر پھر وہی آسائشوں کا تذکرہ۔

جو اس کے پاس آتے آتے کسی اور کی جھولی میں جا گری تھیں۔

اور جھولی میں بھی اُس کے گری تھیں جسے خدا نے پہلے سے ہی ہر نعمت سے نواز رکھا تھا۔ وہی مثل صادق آتی تھی کہ خدا بھرے کو ہی بھرتا ہے۔ جبکہ اس کے خیال میں بھرنا تو اسے چاہیے تھا جو تقریباً ہر آسائش سے محروم تھی۔ اور سب سے زیادہ مستحق تھی۔

بہرحال۔ وہ عالیہ سے اس لیے بھی متاثر تھی کہ وہ بہت پختہ کردار تھی۔ اور اس کی گفتگو میں جو بڑی دلچسپ ہوتی تھی، بناوٹ نہیں سادگی ہوتی تھی۔ اور پھر وہ اُسے بڑے اچھے اچھے مشورے بھی دیا کرتی تھی۔ اور ان ساری باتوں میں سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ عالیہ نے اسے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ حیثیت میں اس سے بہت اُونچی ہے یا عنبر اس کے اسٹینڈرڈ کی نہیں ہے۔ اور بس یہی ایک بات تو وجہ تعلق بنی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ معلوم کس بات پر عنبر نے جھینپ کر عالیہ سے کہا تھا۔

"میں تو تمہیں سو بار اپنے گھر میں بلاتی مگر یہ میرا گھر۔" تو عالیہ نے اس کی پوری بات بھی نہیں سُنی تھی اور بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"ارے چھوڑو، یہ گھر ور بلانے کی بات۔ میں خود ہی کہیں جانے کی عادی نہیں ہوں سوائے کالج اور شاپنگ وغیرہ کے، اصل میں جب ممی کا انتقال ہوا تھا میری عمر دس سال کی تھی۔ اور بھیا پندرہ سال کے۔ مگر وہ تو ہمیشہ سے خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ تھے۔ پپا نے بھی ممی کے انتقال کے چار ماہ بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ تب میں نے جمی جیسے ننھے معصوم اور معذور بچے کی ذمہ داری اپنے ذمے لے لی جسے ممی دنیا کے رحم و کرم پہ چھوڑ گئی تھیں۔ اور معلوم بھی ہے پپا کوئی یہاں ہمارے ساتھ تھوڑی رہتے ہیں۔ وہ تو ڈیفنس میں اپنی —— دوسری بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں تو بس وہ دوسرے تیسرے دن بھی کھڑے کھڑے ہی آتے ہیں۔ انہوں نے تو جمی کو Handicap معذور بچوں کے اسکول میں داخل کرا دیا تھا مگر میں رو دھو کر اسے پھر گھر میں لے آئی۔ کیونکہ ذہنی طور پر تو وہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے صرف دونوں پیر پیدائشی طور پر مڑے ہوئے ہیں۔"

عالیہ نے پہلی بار اسے اپنے نجی اور گھریلو حالات بتائے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور اس نے بڑے افسوس کے ساتھ دل میں سوچا کہ دنیا میں کوئی بھی غم سے خالی نہیں۔ اب عالیہ کو اتنی آسائشیں اور آرام میسر ہے تو اندر سے وہ کتنی فگار اور اُداس ہے۔ بے چاری کتنا نرم اور دُکھی دل رکھتی ہے لیکن تایا اور اُن کے کنبے کو تو کوئی غم نہیں۔ وہ تو خوب مزے سے ہیں۔ میری امّی کے ارمانوں کا خون کرنے اور میرا دل توڑنے کے باوجود بھی۔

مگر عنبر کا یہ خیال کہ چونکہ عالیہ بہت کھلے ذہن اور فراخ دل کی مالک ہے اور بہت دُکھی ہے اور اس کے دل میں دوسروں کا درد بھی ہے اس لیے اتنے خلوص سے اسے ملتی ہے، کچھ صحیح نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ ماں کی ناوقت موت نے چھوٹی سی عمر میں، معذور چھوٹے بھائی کی ذمہ داری لینے بڑے بھائی کی بے ثباتی اور باپ کے عقد ثانی کر لینے کی وجہ سے عالیہ اکیلے پن اور احساس تنہائی کا شکار ہو گئی تھی اور اس تنہائی کے خول میں اس نے خود کو اس طرح مقید کر لیا تھا کہ اپنے باہر کی دنیا سے وہ کٹ کر رہ گئی تھی۔ ماں نے موت کے ہاتھوں بے بس ہو کر باپ نے جیتے جی اپنا الگ گھر بسا کر اور بھائی نے اس کی طرف سے غافل ہو کر اسے اپنی ہستی کی شناخت سے بھی محروم کر دیا تھا۔

یعنی وہ طنطنہ۔ وہ فخر۔ وہ اپنے کچھ ہونے کا احساس۔ وہ ایک بھی بات اس میں نہیں تھی جو اتنی اونچی حیثیت رکھنے والی لڑکیوں میں عموماً ہوتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ علیک سلیک کے یا ہیلو ہائے کے سوا عالیہ کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں تھی۔ اور عنبر سے جو تعلق تھا کہ وہ اسی لیے تھا کہ عنبر کے سوا کسی لڑکی نے بھی اس کی طرف اتنے خلوص سے دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ اور پھر دوسری ویل آف لڑکیوں کی طرح عنبر نہ تو بڑی بڑی ڈینگیں مارتی تھی نہ جوڑ توڑ کرنے میں مصروف رہتی تھی۔ اور نہ خود کو اس سے اُونچا دکھانے کی کوشش کرتی تھی۔ یوں بھی عالیہ عنبر کے نہیں بلکہ عنبر زیادہ تر عالیہ کے ساتھ ساتھ

رہتی تھی کچھ اس لیے بھی ان کی دوستی گہری ہوگئی تھی۔

عالیہ اتنی ذہین اور فطین لڑکی تھی زیادہ تر ڈسٹنکشن ہی لاتی تھی۔ چاہتی تو سائنس یا کامرس لے سکتی تھی مگر اپنے اندر چھائے ہوئے جمود کی وجہ سے اس نے آرٹس ہی لینے پر اکتفا کیا تھا۔

جب سے عنبر بی۔اے فائنل میں آئی تھی۔ کالج میں عالیہ کے ساتھ اور گھر میں بیٹھ کر ہمہ وقت اپنے مستقبل کے منصوبے بناتی اور بگاڑتی رہتی تھی۔ عالیہ ہمیشہ اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں محض آرٹس میں گریجویشن کر لینا کسی خاص اہمیت یا قابلیت کا حامل نہ ہوتا۔ اور نہ اسے کوئی اچھی ملازمت مل ہی مل سکتی تھی۔ اصل میں تو عنبر نے عالیہ کو اپنے حالات سے آگاہ بھی کیا تو صرف اس حد تک کہ والد حیات نہیں ہیں اور وہ گھر کی بڑی لڑکی ہے اور اپنے تایازاد سے منسوب ہے جو بہت متمول ہیں اور کلفٹن میں رہتے ہیں لیکن چونکہ جس مکان میں وہ رہتی ہے اس میں اس کی والدہ وداع ہو کر آئی تھیں اور والد کا انتقال بھی اسی میں ہوا تھا۔ اس لیے وہ اس مکان کی رہائش کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

حد تو یہ ہے کہ وہ اسے تڑوا کر نئے سرے سے بنوانے کی بھی اجازت نہیں دیتیں۔ یہ بھی اس نے جھوٹ ہی بولا تھا کہ وہ پیر الٰہی بخش کالونی میں رہتی ہے۔ جبکہ اصل میں تو وہ پیر الٰہی بخش اور تین ہٹی کے درمیانی علاقے میں رہتی تھی۔ اور عالیہ کا ڈرائیور کئی بار اسے ڈراپ کرنے کی وجہ سے اس کا گھر دیکھ چکا تھا۔ جبکہ وہ تو گلی کے نکڑ پر ہی اُترتی تھی۔ پھر بعد میں جب ریحان نے اس سے بے وفائی کر کے ایک امیر و کبیر لڑکی سے شادی کر لی تو اس نے کہا تھا۔

"تبھی تو میں ایسے کسی چنجنٹ میں نہیں پڑی کہ یہ مرد کی فطرت بے وفائی سے رقم ہوتی ہے۔ تم تو اب اسے بھول کر اپنا کیریر بناؤ۔ اور بس۔" اس کے بعد کبھی بھولے سے بھی عالیہ اس کے المیے کا ذکر زبان پر نہیں لائی تھی۔

بہرحال اسے بھی اپنا مستقبل سنوارنا تھا۔ نہ صرف اپنا بلکہ اپنی بہن اور بھائی کا بھی۔ اس لیے اس نے اپنی تمام تر توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کر لی تھی۔ عذیر نویں کلاس میں آگیا تھا اور چھوٹی سیکنڈ ایئر میں۔ چھوٹی نے تو یہ کیا تھا کہ اپنی سہیلی روشن کی چھوٹی بہن کو جو دوسری جماعت میں پڑھتی تھی ساٹھ روپے میں ٹیوشن پڑھانے لگی تھی۔ جو وہ ماں کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتی تھی۔ اور عذیر چونکہ نویں جماعت میں آگیا تھا اس لیے شروع ہی سے بڑی محنت کر رہا تھا۔

سعد اپنی مصروفیت کی وجہ سے پہلے کی طرح ایک دن بیچ تو نہیں آتا تھا مگر ہفتے میں دو مرتبہ ضرور آتا تھا۔ اور نوٹس بنانے اور ٹیسٹ تیار کرانے میں عذیر کی مدد کر دیتا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ پہلے کی طرح اس کی غیر موجودگی میں نہیں بلکہ موجودگی میں بھی آتا تھا اور کبھی چھٹی کے دن آجاتا تھا تو وہ بڑی جز بز ہوتی کہ ایک ہی دن تو ملتا تھا چھٹی کا۔ اس میں بھی۔ وہ اپنے گھر میں کھل کر کام نہیں کر سکتی تھی بلکہ جب تک وہ بیٹھا رہتا تھا وہ اپنے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔ اس بات پر اُس نے ماں سے نہیں بلکہ چھوٹی سے اس توقع پر کہا کہ بہت سی باتوں میں اس کی طرف داری کر کے ماں کو قائل یا کسی بات کے لیے آمادہ کر لیتی تھی۔

"بھئی، یہ چھٹی کے دن کسی کے آنے کی کیا تک ہے بھلا۔؟ میں تو کمرے میں بیٹھے بیٹھے تنگ آجاتی ہوں۔ چھوٹی تم باتوں باتوں میں خوبصورتی سے سعد سے کہہ دینا کہ وہ کم از کم چھٹی کے دن نہ آیا کریں۔ کیونکہ تمہیں تو باتیں کرنے کا ٹیکٹ آتا ہے نا۔" تو چھوٹی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مگر آپ کمرے میں کیوں بیٹھی رہتی ہیں آپا! کیا آپ نے سعد بھائی سے پردہ کرنا شروع کر دیا ہے؟"

"نہیں، خیر، پردہ کرنا تو شروع نہیں کیا بلکہ۔ بلکہ مجھے شرم آتی ہے ان کے سامنے پڑتے ہوئے۔ اور یہ تو تم کو بھی معلوم ہوگا کہ کس وجہ سے آتی ہے۔ خدا ہی سمجھے ریحان سے انہوں نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا۔"

اس نے کچھ ایسے گلوگیر لہجے میں کہا کہ محبت کرنے والی چھوٹی بہن کا دل کٹ کر رہ گیا اور وہ ریحان کو کوسنے لگی۔

"خدا سمجھے ہی نہیں خدا کی مار پڑے ریحان بھائی پر۔ کتنا بڑا دھوکا دیا ہے ہمیں معلوم بھی ہے سعد بھائی کو اس بات سے اتنا صدمہ پہنچا ہے کہ انہوں نے ریحان بھائی سے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا ہے اسی وجہ سے شادی میں بھی شرکت نہیں کی۔ حالانکہ ریحان بھائی نے نکاح کے موقع پر ان کا انتظار کر کے رضوان کے ہاتھ انہیں بلوایا بھی تھا۔ مگر وہ گئے ہی نہیں۔" چھوٹی نے بتایا تو اس نے بڑے عجیب انداز میں پوچھا۔

"یہ ساری باتیں تمہیں سعد نے ہی بتائی ہیں نا؟"

"ہاں تو پھر ریحان بھائی بتانے آئے تھے کیا؟ ظاہر ہے انہوں نے ہی بتائی ہیں۔" اس کے سوال کرنے کے انداز پر چھوٹی چمک کر بولی۔ تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چُپ چاپ اپنے کسی کام میں لگ گئی۔

اس روز بیٹھے بٹھائے اچانک نہ معلوم کیا مصیبت آئی تھی کہ شہر میں بسوں کی ہڑتال ہوگئی تھی۔ کالج ختم ہونے کے بعد وہ بس پکڑنے باہر نکلی تو بس اسٹینڈ پر ایک بھیڑ جمع تھی اور بس کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ اس روز گرمی بھی اس قیامت کی پڑ رہی تھی کہ اُسے یہ خدشہ لاحق ہونے لگا کہیں جس چادر کے اندر وہ لپٹی تھی پسینہ پسینہ ہو کر قطرہ بن کر نہ بہہ جائے۔ عالیہ اس روز آئی ہی نہیں تھی۔ اور اگر آئی بھی ہوتی تو روز روز اس کا یہ احسان لینا کہ وہ ڈرائیور کے ہاتھ اپنی کار میں اسے اس کے گھر پہنچوائے اسے بالکل گوارا نہ ہوتا۔ آخر اس کے کالج کی ایک طالبہ کے مشورے پر کہ اسے راستے میں ہی اُترنا تھا ایک موٹر رکشا روکی۔ اور اس میں بیٹھ کر اس طالبہ کو اس کے گھر اتارتی ہوئی وہ اپنے گھر پہنچی۔

گھر پہنچی تو خلاف معمول ایک تو بیٹھک کے دروازے کو کھلا پایا۔ دوسرے اندر قدم رکھتے ہی سعد کو صوفے پر بیٹھا دیکھ کر اس کی جان ہی تو جل گئی۔ وہ جو اسے دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ پہلے تو وہ تھوڑا سا ٹھٹکی پھر اندر جانے لگی تو سعد کراری سی آواز میں السلام علیکم کہہ کر بولا۔

"وہ نکڑ والے چوہدری رحمت کے یہاں کسی کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ پھوپھو جان چھوٹی کے ساتھ ابھی کچھ دیر قبل ہی وہاں گئی ہیں۔"

اوہ تو گویا یہ بالکل تنہا ہے اس وقت۔ پتا نہیں امی کو ایسی کیا جلدی پڑی تھی چوہدری رحمت کے یہاں جانے کی کوئی مرنے والے کو زندہ تو کرنے سے رہی تھیں وہ۔ اِدھر یہ عالم ہے کہ گرمی کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔ کیوں نہ میں خود بھی وہیں چلی جاؤں۔ اس مصیبت کی موجودگی میں تو میں ہرگز بھی یہاں نہیں ٹھہروں گی۔" اس نے سعد سے بیزاری اور ناگواری کے ملے جلے خیال سے سوچا۔ اور پھر اپنی اوڑھنی نما چادر کو ٹھیک کر کے باہر جانے کے لیے پلٹی تو سعد نے کہا۔

"سُنیے، آپ بھی اگر وہیں جا رہی ہیں تو پھر گھر میں تالا لگا کر جائیے۔ کیونکہ پھوپھو جان مجھے اس لیے بٹھا کر گئی تھیں کہ واپسی میں گھر میں تالا پڑا دیکھ کر آپ پریشان نہ ہوں۔"

اور پھر سعد اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل گیا۔ اور اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ موڈ تو بڑی بات چوہدری رحمت کے یہاں جانے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی — وہ تو سعد کی وجہ سے اپنے دم پر بنا کر زبردستی جا رہی تھی تاکہ چھوٹی کو بلا کر لے آئے

سعد کے باہر نکل جانے کے بعد وہ اطمینان کا سانس لے کر سوچتی رہی۔ پھر بیٹھک کا داخلی دروازہ بند کر کے پلٹی تو اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ سعد کے اندر کچھ تبدیلی آگئی ہے۔ یعنی۔ وہ پہلے کی نسبت کچھ صحت مند بھی ہوگیا ہے اور اس نے ڈریسنگ بھی بہت عمدہ کر رکھی تھی۔ اور جس کی وجہ سے کی تھی اپنی دانست میں وہ وجہ جاننے میں اسے دیر نہ لگی کہ وہ اسی کو پرچانے کی غرض سے اتنی ٹیپ ٹاپ کر کے آیا تھا۔ یوں بھی کئی ماہ بعد اس کا بہت اتفاقاً سعد سے سامنا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اُسے اتنا بدلا بدلا سا لگا ہوگا۔

بہرحال جب ماں اور بہن کی چوہدری رحمت کے یہاں سے واپسی ہوئی اس وقت مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ آتے ہی ماں کے سر ہوگئی۔

"امی! چوہدری صاحب کے یہاں جانے کی ایسی کیا جلدی تھی آخر۔؟ کیا تھوڑی دیر آپ میرا انتظار نہیں کر سکتی تھیں جو خوامخواہ ہی گھر کو تنہا چھوڑ کر کسی کا احسان لیا۔"

"اے احسان لینا کیسا وہ چوہدری رحمت کی والدہ فوت ہوگئی تھیں۔ ساری پڑوسنیں دوڑی دوڑی ان کے گھر گئی تھیں۔ میں بھی چھوٹی کو لے کر چلی گئی۔ عذیر اسکول جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ گھر کی چابی اسکول جاتے وقت مجھے دیتا جائے مگر نہ اُسے خیال رہا نہ مجھے ہی یاد رہا۔ مگر وہ ہے کہاں؟"

"اس وقت تو وہ اپنے اسکول میں ہوتا ہے اور کہاں ہوگا۔" اس نے تڑا کر کہا۔

"تو پھر تم نے کیسے تالا کھولا گھر کا؟" ماں نے پوچھا تو اس کا دل چاہا سعد کا ذکر گول کر کے کہہ دے کہ دوسری چابی سے جو میرے پاس ہے۔ مگر پھر خیال آیا کہ عذیر جب اسکول سے آ کر صحیح بات بتائے گا تو نا معلوم امی کیا سوچیں گی۔ اس لیے اسے اصل بات بتانی ہی پڑی۔

"وہ۔ آپ کے بھتیجے صاحب ہی گھر کی رکھوالی کر رہے تھے جب میں کالج سے آئی تھی۔"

"اچھا تو کیا سعد آیا تھا؟" انہوں نے چھوٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آئے ہوں گے، جبھی تو آپا کہہ رہی ہیں۔" چھوٹی بولی۔ اور پھر عنبر کی طرف شوخ سی نظروں سے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"انہوں نے تو ہمارا کافی انتظار کیا ہو گا آپا؟"

"نہیں، وہ تو میرے بیٹھک میں داخل ہوتے ہی چلے گئے تھے۔" بہن کی آنکھوں سے عیاں شوخی کو محسوس کر کے بھی وہ ذرا بھی نہیں بھڑکی۔ کیونکہ چڑ کر یا بھڑک کر وہ یہ ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس نے سعد کے آنے کو اہمیت دی ہے۔

"چچ چچ۔ آج تو پردہ ٹوٹ گیا آپ کا ان سے۔" چھوٹی نے گویا پھر چھیڑ کی۔

"فضول باتیں نہ کرو چھوٹی! میں بڑی دیر سے تمہاری بے ہودگی برداشت کر رہی ہوں۔" عنبر نے اسے جھڑکا تو ماں نے کہا۔

"اے یہ تم پھر آپس میں دو دو چونچیں کرنے بیٹھ گئیں۔ چلو چھوٹی جا کر کپڑے بدلو۔ آج تو تمہاری ٹیوشن کا بھی ناغہ ہو گیا۔" تب چھوٹی نے چپ چاپ برآمدے کا رخ کیا۔ تو ماں کپڑے بدلے بغیر ہی اسے چوہدری رحمت کے یہاں کا رتی رتی حال بتانے بیٹھ گئیں۔

اس کا اگر سعد سے سامنا ہوا تھا تو بہت اتفاقاً ہی ہوا تھا۔ مگر آئندہ وہ اس کے سامنے نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ جبکہ سعد نے اب اس کے یہاں آنا بہت کم کر دیا تھا وہ بس ہفتے عشرے میں ہی آتا تھا۔ اصل میں اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے اس نے عذیر کو گھر پر آ کر پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ اب تو عذیر نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ دن کے گیارہ ساڑھے گیارہ کے درمیان اسکول جانے کے بجائے وہ پونے دس بجے گھر سے نکل جاتا تھا اور سیدھا سعد کے آفس پہنچتا تھا۔ وہاں اس سے پورے ایک گھنٹے پڑھنے کے بعد اسکول جاتا تھا۔ عنبر کو یہ طریقہ بہت پسند آیا تھا کیونکہ اس طرح کم از کم سعد کی آمد و رفت تو نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی تو وہ بھی اسے گوارا نہ تھی کہ آخر یہ کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔

یہ ریحان کا اسے ٹھکرانا۔

جبکہ وہ اس روز ریحان سے اس کی گفتگو بھی سُن چکا تھا۔

اور اب اسے احساس ہوتا کہ اس گفتگو میں سارے گلے شکوے اسی کی طرف سے ہوئے تھے ریحان تو اس کے شکووں کو خاطر میں بھی نہیں لایا تھا۔ اور جب وہ یہ تصور کرتی کہ وہ کس طرح۔ اپنے کمپلکس اور افلاس سے زیر ہو کر ریحان سے گلے کر رہی تھی۔ سعد کی موجودگی میں تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ کہ ٹھکرائے جانے پر اس کی ساری اوقات کھل کر سعد کے سامنے آ گئی ہو گی۔ اسی سعد کے سامنے جسے گھاس ڈالنا بھی وہ اپنی توہین سمجھتی تھی۔ پتا نہیں کیا باپ مارے کا بیر پڑ گیا تھا اسے سعد سے کہ بے وفائی تو ریحان نے کی تھی اور وہ دشمن سعد کی ہو گئی تھی۔ اس بات کو چھوٹی نے بہت ڈھکے ڈھکے انداز میں بارہا سمجھانا چاہا تھا مگر سمجھنے کی بجائے ہر بار وہ بگڑ بگڑ اٹھی تھی۔ بلکہ اب تو وہ چھوٹی سے بھی کبیدہ اور مشکوک سی رہنے لگی تھی کیونکہ اس کے خیال میں چھوٹی سعد کی بڑی ہمدرد اور بہی خواہ تھی۔ اور سگی بہن ہو کر اس کے خلاف سعد سے چپکے چپکے۔ نا معلوم کیا باتیں کرتی تھی۔ شروع شروع میں تو اس بات پر اس چھوٹی کو ٹوکا بھی تھا اور ڈانٹا بھی۔ مگر چھوٹی کے تڑخ کر جواب دینے پر کہ سعد کی وجہ سے نتیجے میں ہمیشہ ماں سے اسے ہی ڈانٹ کھانی پڑتی تھی اس نے کچھ کہنا سُننا ہی چھوڑ دیا اور پھر اس کے پاس اتنا فالتو وقت ہی کہاں ہوتا تھا۔ صبح اُٹھ کر کالج جانا اور بھری دوپہر میں واپس آنا۔ آتے ہی کھانا کھا کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ آرام کرنا۔ اس کے بعد تو شام تک ٹیوشن لینے والے بچوں کی لانگا ٹیڑھ ہی شروع ہو جاتی تھی۔ رات

کا کھانا پکانا ایک دن اس کے ذمے ہوتا تھا ایک دن چھوٹی کے۔ مگر کبھی کبھی وہ الکساہٹ محسوس کرتی تو چھوٹی ہی چپ چاپ کھانا تیار کر دیتی۔

پھر وہ روزانہ ہی کم و بیش تین گھنٹے تک مطالعہ کرتی تھی۔ کیونکہ دن میں تو وقت ملتا ہی نہ تھا۔ سچ بات تو یہ تھی کہ وہ محنت بھی بہت کر رہی تھی۔ کیونکہ اپنے حالات کی وجہ سے وہ کسی سے ٹیوشن لے سکتی تھی نہ مدد بس کسی سبجکٹ میں کوئی سبق مشکل نظر آتا تو وہ وہیں کالج میں ہی کسی استاد سے یا پھر عالیہ یا کسی اور ذہین لڑکی سے پوچھ لیتی۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی بھی اسے اتنی محنت کرتے دیکھ کر چپ چاپ گھر کے سارے کام کر دیا کرتی تھی ورنہ ان جیسے حالات میں گرفتار لڑکیوں کے اندر گھر کے کاموں کی تقسیم پر بڑی بحث و تکرار ہوتی ہے۔ خاص طور پر اوپر تلے کی بہنوں میں۔ ایک کام دوسری کر بھی لیتی ہے تو کسی مجبوری کے تحت کبھی کبھار ہی کرتی ہے۔ وہ بھی لڑ جھگڑ کے تو چھوٹی یوں تو چپ چاپ اس کے حصے کا کام کر دیتی تھی۔ لیکن جب لگاتار کئی بار یوں پر کرنا پڑتا تھا وہ جل کر اُسے سُنانے کو یہ ضرور کہتی۔

"آپ نے لڑکے لڑکیوں کے ڈانس کرنے پر جو اعتراض کیا تھا نا تو نانی اماں نے ٹھیک ہی کہا تھا آپ سے کہ تم گھروں میں بیٹھ کر چولہا ہانڈی اور برتن بھانڈا کرنے والی لڑکیوں کو کیا معلوم کہ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے۔

ارے اب تو انسان چاند تک بھی ہو آیا ہے۔" یا پھر ایسی ہی کوئی دل کو جلا دینے والی تانی یا فقرہ کی کہی ہوئی بات جسے کا وہ بھی مصلحتاً اسے چھوٹی سے آئندہ بھی کام لینا ہوتا تھا وہ کوئی جواب ہی نہیں دیتی تھی۔ اور چھوٹی بھی ایک چالاک تھی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ یہ بھی وقت پر گدھے کو باپ بنانے کا ایک حربہ ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتی تھی بہن کی محبت اور ہمدردی میں ہی کرتی تھی کیونکہ اسے احساس تھا کہ اس کی بہن پر ظلم ہوا ہے اور وہ اپنا مستقبل سنوارنے کی غرض سے اتنی محنت اور لگن سے پڑھ رہی ہے۔

اس کی خواہش تھی کہ اس کی آپا سعد کے ساتھ اپنے رویّے میں نرمی اور رواداری پیدا کرے۔ کیونکہ سعد اسے دل سے پسند تھا۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سعد اس کی آپا کو کتنا پسند کرتا ہے۔ اور اسی قدر اس کا احترام بھی کرتا ہے۔ مگر بہت غور کرنے اور کریدنے کے باوجود اب تک چھوٹی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ سعد کو ناپسند کرنے کے اصل اسباب کیا ہیں۔ ماسوا اس کے کہ سعد ہو یا کوئی اور ریحان کی ٹکر کا مرد، اب کوئی بہن کی نظروں میں جچنے کا ہی نہیں۔ جبکہ چھوٹی کی نظر میں سعد ریحان سے ہر لحاظ سے کہیں بہتر تھا۔

گو سعد نے عنبر کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کبھی اپنی زبان سے نہیں کیا تھا۔ مگر جب ریحان نے عنبر سے منگنی توڑی تھی۔ اور عنبر کی غیر حاضری میں سعد خورشید جہاں کو یہ بتانے آیا تھا کہ وہ چونکہ کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے اپنی فیملی کو لینے ملتان جانے والا ہے۔ تب خورشید جہاں نے بڑے رنج و ملال کے ساتھ اسے عنبر کی نسبت ٹوٹنے کی خبر سنائی تھی۔ تو اس نے بڑی افسردگی سے کہا تھا۔

"یہ ریحان کی بدقسمتی ہے کہ اس نے عنبر جیسی حور شمائل لڑکی کو ٹھکرا دیا۔ آپ لوگوں کو جتنا افسوس ہوا ہو گا اس کا مجھے اندازہ ہے مگر پھوپھو جان! آپ عنبر کو صبر کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھائیے کہ خدا جو کچھ کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ جبکہ بظاہر بندہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" اور پھر اس نے چلتے وقت چھوٹی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا۔

"تم اس معاملے کا زیادہ اثر نہ لو۔ رنج و ملال ہونا ایک قدرتی بات ضرور ہے لیکن اسے اپنے حواسوں پر نہیں طاری کرنا چاہیے۔ تمہاری آپا ماشاء اللہ ہر معاملے میں پورے خاندان میں یکتا ہیں۔ انہیں ریحان سے بھی کہیں اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔ تم تو بس اپنی آپا کی دلجوئی کیا کرو۔ انہیں یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کرو کہ ان کے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہوئی ہے۔" ویسے بھی وہ چھوٹی کو بہت سی باتوں پر ٹوک دیتا۔

"نہ۔ نہ۔ عنبر کو اگر یہ بات پسند نہیں تو تم نہ کیا کرو۔ یوں بھی وہ تمہاری بڑی بہن ہیں، تمہیں ان کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔"

کبھی وہ کہتا۔

"ان کی ناراضگی کا اگر ایسا ہی خیال رہتا ہے تو پھر تم ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرتی ہی کیوں ہو؟"

غرضیکہ ایسی ہی بہت سی باتیں تھیں۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ عنبر کو بہت پسند کرتا ہے۔

اس کی پسندیدگی کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی تھا کہ وہ بن بلائے اس کے یہاں ہر دوسرے تیسرے دن چلا آتا تھا۔ جبکہ وہ ہمیشہ اس سے بے رخی، بے اعتنائی اور غیریت ہی برتتی تھی۔ چھوٹی کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح عنبر کے دل کو سعد کی طرف مائل کر دے۔ مگر اپنی طرف سے وہ جتنی بھی کوشش کرتی تھی۔ ہمیشہ عنبر سے منہ ہی کی کھاتی تھی۔ خورشید جہاں تو شروع ہی سے سعد پر مہربان تھیں۔ اور اب تو چونکہ اس نے ان کا ساتھ دیا تھا وہ کچھ زیادہ ہی اس پہ مہربان ہوگئی تھیں۔ عذیر نے جب سے نیا معمول اپنایا تھا۔ وہ گھر سے نکلتا تو ساڑھے نو پونے دس کے قریب ہی تھا۔ لیکن آتا اپنے وقت سے ہی تھا۔ لیکن چند روز سے وہ اسکول سے بھی دیر سے آرہا تھا۔ کبھی ایک گھنٹے کی تاخیر سے کبھی ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر سے اور اس روز تو حد ہی ہوگئی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے مگر وہ نہیں آیا۔ تینوں ماں بیٹیاں ہی پریشان ہوگئیں۔ خورشید جہاں کو تو ہول اٹھنے لگے۔ وہ تو لوٹا لے کر بار بار بیت الخلا کا رخ کرنے لگیں۔ جتنی قرآنی سورتیں یاد تھیں بمعہ آیۃ الکرسی دم کر کر کے درود شریف پڑھ کے دعائیں اور منتیں مانگنے کے بعد آخر نو بجے کے قریب عذیر گھر میں داخل ہوا۔ تو ماں نے تو لپک کر اسے چمٹا ہی لیا۔

"ہے ہے کہاں رہ گیا تھا میرا لعل۔ اتنی دیر کہاں ہوگئی۔ تمہاری پریشانی میں تو میرا سارا خون ہی خشک ہو گیا۔ آج کل زمانہ بھی تو بہت خراب ہے۔ بس اتنی دیر میں میرے دل میں تو"

"افوہ امی پہلے اسے بتانے تو دیجیے کہ اسے اتنی دیر کہاں ہوگئی تھی" عنبر نے جسے اس کے اتنی دیر میں آنے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آرہا تھا۔ ماں کی گفتگو سے اکتا کر کہا۔

"ہاں ویسے بھی تم کئی دن سے دیر سے آرہے ہو، مگر آج تو تم نے حد ہی کر دی" چھوٹی نے کہا۔

"دیر تو اب روز ہی ہوا کرے گی آپا۔ البتہ اتنی دیر نہیں جتنی آج ہوگئی ہے۔ اصل میں آج نامعلوم کیا بات تھی۔ دونوں بسیں ہی دیر سے ملیں۔ میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گیا" عذیر نے یوں بے پروائی سے کہا جیسے ماں بہنوں کی پریشانی کا اسے کوئی احساس ہی نہ ہو۔

"ہیں، مگر دو بسیں کہاں بدلنی پڑیں — تمہیں۔ تم تو اسکول سے سیدھے گھر آتے ہو" کسی کے پوچھنے سے پہلے چھوٹی نے تنک کر پوچھا۔

"نہیں، اب میں اسکول سے سیدھا گھر نہیں آتا کیونکہ میں بھی ایک کام پر لگ گیا ہوں" عذیر نے بتایا۔

"ہائیں کس کام پر لگ گیا ہے تو؟ بچے! کیا کہیں نوکری ووکری کر لی ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"کہیں نوکری کرے گا، وہ بھی بغیر آپ سے پوچھے، یہ کیسے ممکن ہے امی" عنبر نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"لیکن امی سے پوچھ کر کرنے کا کام نہیں وہ۔ بلکہ سعد بھائی نے مجھے اس کام پر لگوایا ہے اور میں اسکول سے وہیں جاتا ہوں" عذیر نے بتایا تو عنبر یہ جان کر کہ سعد نے اسے کسی کام پر لگایا ہے جیسے آپے سے باہر ہوگئی۔ عذیر کی پیٹھ پر دو ہتھڑ مار کر بولی۔

"کام پر کیا لگایا ہے کسی ورک شاپ میں مزدوری کرنے پر لگا دیا ہوگا تجھے اس بھیچو آدمی نے۔ بے غیرت کہیں کا۔ ابھی زمین سے اگا نہیں اور چلا ہے کام کرنے۔ وہ بھی ذلیل اور گیا گزرا کام۔ بتا کیا ہم مر گئے تھے جو تو نے ہم سے پوچھا تک نہیں بے غیرت" آخری فقرہ کہتے ہوئے عنبر نے اس کے منہ پر دو تین تھپڑ مار دیے۔

"اے لبس خبردار جواب اسے ہاتھ لگایا۔ یہ کہیں اور جاتا تو میں خود مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیتی۔ اسے سعد نے کسی کام پر لگایا ہے۔ تو اس سے یہ تو پوچھو کہ ایسا کونسا کام ہے۔ یہ ایک دم ہی باولی کیوں بن گئیں جو اسے مارنا شروع کر دیا ہے۔" ماں نے عنبر کو بُری طرح ڈانٹ کر کہا۔

"لیکن یہ تو اسے خود آتے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔ پہیلیاں کیوں بُجھوانے کھڑا ہو گیا یہ۔" چھوٹے بھائی اور بہن کے سامنے ماں کے ڈانٹنے پر یہ کہہ کر گویا عنبر نے اپنی جھینپ مٹائی۔

"موقع تو دیا نہیں آپ نے اور آتے رہی فری اسٹائل لوکسنگ کے داؤں لگانے کھڑی ہو گئیں ورنہ سعد بھائی نے مجھے کسی گِرے پڑے کام پر نہیں بلکہ اپنے ایک دوست کے چھوٹے بھائی کو ٹیوشن پڑھانے پر لگا دیا ہے جو دوسری جماعت میں پڑھتا ہے۔ اور معلوم بھی ہے۔ صرف تین سبجکٹس (subjects) پڑھتے ہیں اسے۔ اردو، اسلامیات اور میتھس۔ اور ڈھائی سو روپے ماہوار ملیں گے مجھے۔"

"اچھا ڈھائی سو روپے ماہوار ملیں گے تمہیں۔ اسے خدا خوش رکھے۔ بڑی عمر دے سعد بیٹے کو، وہ تو اپنے سگوں سے زیادہ ہمارا خیال رکھتا ہے۔"

"کیا خاک خیال رکھتا ہے۔ اس نے تو ہماری غریبی کا مذاق اُڑایا ہے امی! عذیر کو ٹیوشن دلوا کر۔ بھلا یہ بھی کوئی عمر ہے اس کی ٹیوشن پڑھانے کی کل پندرہ برس کا تو ہے۔" عنبر نے ماں کے سعد کو دعائیں دینے اور اظہار ممنونیت پر جل کر کہا۔

"اے تمہاری آنکھ میں تو موئے جنگل والے کا بال ہے۔ جبھی تو اس قدر احسان فراموش ہو۔ ورنہ سعد نے تو ہماری بھلائی کے لیے ہی کیا ہے یہ جو کچھ بھی کیا ہے ______۔ اور تم تو پانچ پانچ ٹیوشن کر کے صرف ساڑھے تین سو ہی کما لیتی ہو۔ اسے تو ڈھائی سو ملا کریں گے، ڈھائی سو۔ کیا یہ شکر کا مقام نہیں ہے۔ ورنہ ہمیں تو کوئی فالتو دس روپے بھی دینے والا نہیں ہے۔" ماں نے لتاڑا تو عنبر بُرا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

"ہاں آپا یہ تو امی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ اور میں اسے نیک شگون ہی سمجھوں گی۔ کیونکہ انشاءاللہ بڑا ہو کر میرا بھائی لاکھوں کمائے گا۔ ویسے عذیر ان لوگوں نے تمہیں پیشگی پیسے تو دیے ہوں گے۔" چھوٹی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ابھی تو نہیں دیے کہہ رہے تھے ایک دو روز میں دیں گے۔" عذیر نے بتایا۔

"چلو خیر، دو دن بعد ہی سہی مگر عذیر! وہ پیسے میرے ہوں گے میرے۔" چھوٹی نے مذاقاً کہا۔

"ہاں ہاں ضرور، مگر یہ پیسے تو میں امی کے ہاتھ پر لا کر رکھنا چاہ رہا تھا۔ چھوٹی آپا! تم اگلی دفعہ لے لینا۔" عذیر خوش دلی سے بولا۔

"ہاں بھئی، میرے بیٹے کی پہلی کمائی ہو گی جو یہ میرے ہاتھ پر لا کر رکھے گا۔ ویسے تو یہ چھوٹی بھی اپنی ساری کمائی میرے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتی ہے اب تو ان لوگوں نے اس کے بیس روپے بڑھا دیے ہیں۔ اسّی روپے ملنے لگے ہیں اسے۔" خورشید جہاں نے عذیر سے مخاطب ہو کر کہا۔ عنبر تو اسی وقت جب ماں نے اسے ڈانٹا تھا برآمدے میں چلی گئی تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے، میں بھی اس کی پہلی تنخواہ کے روپے آپ ہی کے ہاتھ پر رکھتی بلکہ آپ کو زبردستی بازار لے جا کر کپڑے وغیرہ دلواتی۔ سالوں سے آپ نے اپنے لیے کپڑے ہی نہیں بنائے۔" چھوٹی نے کہا۔

"لیکن مجھے کپڑوں کی ضرورت بھی تو نہیں ہے۔ جو پُرانے دھرانے میرے پاس پڑے ہیں وہی کافی ہیں۔ کپڑے لتے تو اس عذیر کو بنوانے چاہئیں۔ جوتیاں بھی ٹوٹ گئی ہیں اس کی۔ بے چارا ایک ایک چیز کو ترستا ہے۔" ماں نے کہا تو عذیر بولا۔

"امی اگر میرے پاس کچھ نہیں ہے تو بھی میری عادت ترسنے کی نہیں ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ جب تایا ابّو یہاں رہتے تھے تو اُن کے بھی ایسے ہی حالات تھے اور یہی گھر تھا جس میں رہتے تھے لیکن اب وہ محل نما کوٹھی میں رہتے اور کاروں میں گھومتے ہیں۔ امی وقت کا پہیہ گھومتا ہی رہتا ہے۔ وہ کبھی اُوپر جاتا ہے اور کبھی نیچے آتا ہے۔ اور پھر

نیچے سے اُوپر۔ تو ہم بھی تو کبھی اس پہیے کی گردش کے ساتھ نیچے سے اُوپر جا سکتے ہیں نا۔" عذیر نے جس طرح اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر کہا چھوٹی زور زور سے ہنسنے لگی۔

"واہ! یہ اُوپر سے نیچے، نیچے سے اُوپر کی کیا گردان کی ہے تم نے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں، اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے چھوٹی! بڑی سمجھداری کی بات کہہ رہا ہے یہ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے بچے کو کسی چیز کی ہوس نہیں ہے۔" خورشید جہاں نے عذیر کی فلسفیانہ بات کا مفہوم سمجھ کر فخریہ سے انداز میں کہا۔

عنبر کو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ تینوں ماں بیٹیوں نے عذیر کی پریشانی میں کچھ کھایا نہ تھا۔ جبکہ وہ آٹھ بجے رات کا کھانا کھانے کی عادی تھیں اور اس وقت پونے گیارہ بج رہے تھے۔ عنبر نے بیٹھک کی دہلیز پر کھڑے ہو کر نہایت بے زاری سے کہا۔

"اب کھانا بھی کھایا جائے گا یا محض تعریفوں سے پیٹ بھرنے کا ارادہ ہے۔"

"ارے نہیں نہیں آپا! میرے پیٹ میں تو بھوک کے مارے یہ بڑے بڑے چوہے دوڑ رہے ہیں۔ میں بس ہاتھ دھو کر ابھی آیا۔" عذیر نے اُٹھتے ہوئے عنبر سے کہا۔ اور پھر ماں سے بولا۔

"آپ بھی تو چلیے، مجھے معلوم ہے میری پریشانی میں آج کسی نے اب تک کھانا نہیں کھایا ہو گا۔" تو ماں چُپ چاپ اُٹھ کر برآمدے میں چل دیں۔ کہ تخت پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا جاتا تھا۔ تب عذیر نے آہستہ سے چھوٹی سے کہا۔

"یہ آپا نے محض سعد بھائی کی وجہ سے مجھ پر اپنا غصہ اتارا ہے۔"

"ہاں تو کیا میں سمجھتی نہیں۔" چھوٹی نے قدرے چہک کر کہا۔

"شکر ہے، اب تھوڑی بہت سمجھ تو آتی جا رہی ہے۔" عذیر نے شرارت سے کہا تو چھوٹی اسے مارنے دوڑی۔ تو بے خیالی میں دہلیز کے آگے برآمدے میں کھڑی عنبر سے ٹکرا گئی۔

"کیا مصیبت ہے بھئی۔ کیا صرف ڈھائی سو روپے کی ہی اوقات ہے تمہاری جو یوں جامے سے باہر ہوئی جا رہی ہو۔" عنبر نے بڑے طنز بھرے انداز میں کہا تو چھوٹی بُرا ماننے کے بجائے اٹھلا کر بولی۔

"اوقات تو جیسی سب کی ہے ویسی ہی میری بھی ہے۔ مگر لالچ سے نہیں بلکہ اس بات سے خوشی ہو رہی ہے کہ میرے چھوٹے سے بھائی کو بھی خدا نے اس قابل کر دیا کہ وہ تھوڑا بہت پیسہ کما کر لا سکے۔"

"چلو چھوڑو یہ ہر وقت کی بک بک جھک جھک اور آ کر کھانا کھاؤ۔" خورشید جہاں نے گھُرکنے کے سے انداز میں کہا تو دونوں نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور دسترخوان کے گرد بیٹھ گئیں۔

عذیر کے ٹیوشن پڑھانے پر چھوٹی خوش تھی ماں خوش تھیں، مگر نہیں خوش تھی تو عنبر۔ کیونکہ اسے یہ بات سخت ناگوار گزری تھی کہ سعد نے اسے ابھی سے کام پر لگا دیا تھا کہ اس کے خیال میں ٹیوشن پڑھانا بھی ایک کام ہی ہوتا تھا۔ اور اس بات پر وہ کئی مرتبہ اعتراض ہی نہیں بلکہ ماں سے تکرار بھی کر چکی تھی۔ مگر چونکہ وہ خود ہی عذیر کے ٹیوشن پڑھانے کے حق میں تھیں اس لیے کبھی اسے جھڑک دیتیں اور کبھی سمجھانے لگتیں۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ ان کے جیسے حالات میں، پرورش پانے والے بچّوں کو ہوشیار ہوتے ہی یعنی سن بلوغت میں قدم رکھتے ہی کسی نہ کسی کام پر لگا دینا چاہیے تاکہ ان میں ذمّہ داری کا احساس پیدا ہو سکے۔ اور رہا عذیر کی تعلیم کا سوال تو ٹیوشن کے ساتھ وہ بھی جاری ہے۔ ماں کی طرف سے ایسے جوابات ملتے تو دل ہی دل میں سعد کو ہی بُرا بھلا کہتی ______ اور کوستی تھی۔ اس نے تو اس غصّے میں اس سے بات کرنے کی ہی ٹھانی تھی۔ بلکہ دوسرے معنوں میں برملا اسے بے بھاؤ سُنانے کی ٹھانی تھی مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا تھا کہ کافی دنوں سے وہ اس کے یہاں آیا ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس سے بات کرنے کی حسرت ہی دل میں لیے رہ گئی تھی۔

اس روز بھی اچانک ہی اس کے علاقے میں کوئی ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے دکانوں اور گاڑیوں پر پتھراؤ ہوا تھا اور کہیں کہیں گولیاں بھی چلی تھیں۔ دکانیں بھی لُوٹ لی گئی تھیں اور اس خدشے کے پیش نظر کہیں

ہنگامہ کنندگان کا رخ کالج کی طرف نہ ہو جائے کالج کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ عالیہ نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ اس کے ساتھ گھر چلے پھر وہاں سے وہ اُسے اس کے گھر بھجوا دے گی لیکن بار بار اس کا احسان لینا اسے گوارا نہ ہوا اور اس نے خوبصورتی سے انکار کر دیا۔ اصل میں عالیہ باپ سے اجازت لیے بغیر کہیں بھی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ تو عنبر کو اپنے گھر لا کر فون پر باپ سے پوچھتی تھی۔

"پاپا میری فرینڈ آئی ہوئی ہے، کیا میں آپ کی کار میں اسے اس کے گھر ڈراپ کرا دوں"۔ تب جا کر اجازت ملتی تھی اور کبھی کبھی فضیحتوں کے بعد ہی ملتی تھی۔

وہ بس اسٹاپ پر پہنچی تو اتنا زیادہ رش نہیں تھا جتنا ہنگامے کی خبر سُن کر ہمیشہ کی طرح ہوتا تھا۔ پھر بھی اسے بس کا بڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ اور وہ گھر پہنچی تو دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اس کو ایسے ان آئے دن کی ہنگامہ آرائی کرنے والوں شرپسندوں پر سخت غصہ آ رہا تھا جو اگر کسی سے کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ اور کسی کی قیمتی جان چلی جائے تو ہنگامہ اور بلوہ کر کے کئی قیمتی جانوں کو ضائع کر دیتے ہیں۔ توڑتے پھوڑتے۔ جلاتے۔ مارتے اور لوٹتے الگ ہیں۔ اور اس طرح خود گورنمنٹ کا جو نقصان ہوتا ہے سو ہوتا ہے خود اپنی جان اور مال کا بھی نقصان کرتے ہیں۔ اور شہر کا امن و امان الگ غارت ہو کر رہ جاتا ہے۔ الٹا یہ جو کچھ کرتے ہیں شرپسند اور معاشرے کے بھٹکے ہوئے لوگ ہی کرتے ہیں اور معصوم شہریوں کو اکسا اور بھڑکا کر اپنے ساتھ لگا لیتے ہیں۔ اور جانیں ان ناکردہ گناہوں کی ہی تلف ہوتی ہیں اور الزام حکومت کو دیتے ہیں کہ حکومت ایسا کر رہی ہے، ویسا کر رہی ہے یا پھر چشم پوشی سے کام لے رہی ہے۔ جبکہ حکومت پر الزام دھرنے والے یہ نہیں جانتے کہ وہ اسی ملک کے باسی ہیں۔ یہ ان کا اپنا وطن ہے۔ اور اپنے وطن کی حفاظت، تزئین اور ترقی ہمارے باہمی اتحاد اور بھائی چارے سے ہی ہو سکتی ہے۔ گلے کاٹنے اور گولیوں سے داغ دینے سے نہیں۔

اس کی یہ بھی ایک عادت تھی کہ کسی بات پر غور کرتی یا کچھ سوچتی تو خیالات کے گورکھ دھندے میں ایسا اُلجھتی کہ اسے احساس ہی نہ ہوتا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ اصل میں ذہن تو پہلے ہی اپنی پریشانیوں میں اُلجھا رہتا تھا۔ اس پر کوئی دوسری پریشانی ذہن پر بار ڈالتی تھی تو اس کا یہی عالم ہو جاتا۔ یہ احساس کچھ دیر ہی باقی رہا کہ وہ بس میں بیٹھ گئی ہے خیر۔ اپنی سوچ میں گُم ہو کر یہ خیال آیا کہ وہ بس میں بیٹھی ہے تو اس وقت ہی آیا جب بس اس بس اسٹاپ پر رُک کر آگے نکل گئی تھی جہاں وہ اُترتی تھی۔ خیال آیا تو وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

زنانہ سیٹ کے آگے ہی بس کا ڈرائیور بیٹھا تھا۔ اُس نے اس سے کہا کہ میرا اسٹاپ پیچھے رہ گیا ہے اس لیے تھوڑی دیر کے لیے بس روک دو تاکہ میں یہیں اُتر جاؤں۔ پہلے تو بس ڈرائیور نے اسے گھور کر دیکھا پھر چونکہ وہ کئی مرتبہ پہلے بھی اس بس پر بیٹھ چکی تھی اس لیے ڈرائیور نے کچھ آگے جا کر بس روک دی۔ تب اسے وہاں سے گھر تک کوئی میل پون میل کا فاصلہ بلا کی گرمی اور دھوپ میں پیدل طے کرنا پڑا۔ کیونکہ اتنے کم فاصلے پر تو ٹیکسی والے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کوئی موٹر رکشا والا بھی جانے پر آمادہ نہ ہوتا اور اس لمحے اس بے بسی کے عالم میں ایک دم ہی اُسے ریحان یاد آ گیا تو اپنی بدقسمتی پر اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

کاش میں ایسی بدحال اور قلاش نہ ہوتی تو آج فردوس کی جگہ میں ریحان کے ساتھ کار میں گھومتی پھرتی اس نے سوچا۔

دھوپ میں جلتی بھُنتی گھر پہنچی تو خلافِ توقع سعد کو بیٹھک میں بیٹھا دیکھ کر مارے کوفت کے اُس کا بُرا حال ہو گیا۔

"یہ مصیبت اس وقت کیسے یہاں آ گیا؟ اس وقت تو عذیر بھی اسکول چلا جاتا ہے"۔

اس نے سخت ناگواری سے سوچا۔ اس اثنا میں سعد جو اخبار پڑھ رہا تھا اس کے تیور بھانپ چکا تھا۔ یوں بھی اسے وقت سے پہلے آتے دیکھ کر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ اور چونکہ وہ دروازے پر ہی ٹھٹک گئی تھی اس لیے اس نے بیٹھے بیٹھے ہی کہا۔

"وہ پھوپھو جان پڑوس میں کسی کی عیادت کو گئی ہیں"۔ تو اُس نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بڑے طنز سے کہا۔

"اور آپ کو گھر کی رکھوالی کے لیے چھوڑ گئی ہیں"۔

"نہیں، میں تو عذیر کے کام سے آیا تھا۔ مگر آج تو چھوٹی بھی گھر میں موجود ہے"۔ اور یہ جان کر کہ چھوٹی بھی گھر میں موجود ہے وہ بھی تنہا۔ وہ پوری کی پوری سلگ اُٹھی۔

"اچھا کہاں ہے چھوٹی؟" اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ تو سعد جو پھر اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا تھا عبارت پر نظریں جمائے جمائے سرسری سے انداز میں بولا۔

"شاید کچن میں ہے"۔ اور جواب میں عنبر نے اس بُری طرح گلا پھاڑ کر چھوٹی کو آواز دی کہ نہ صرف سعد اخبار پڑھتے پڑھتے اُچھل سا گیا بلکہ چھوٹی بھی اس کی دھاڑ پر پیٹ پکڑے پکڑے بھاگی ہوئی بیٹھک میں آ گئی۔

"کیوں خیر تو ہے آپا؟ آخر کیا بات ہو گئی آپ نے اتنا چلّا کر کیوں بلایا ہے مجھے"۔

"کو۔ کچھ نہیں، میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تم آج کالج کیوں نہیں گئیں"۔ اس نے عذیر کو چھوٹی کے پیچھے آتے دیکھ لیا تھا اس لیے وہ یک لخت ہی ٹھنڈی پڑ کر کنکھیوں سے سعد کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مگر اتنی زور سے پوچھ رہی ہیں آپ میرا مطلب ہے ذرا آہستہ بھی پوچھا جا سکتا تھا۔ سچ میں تو سمجھی آپ کو بیٹھک میں آتے ہی شاید کوئی بھوت نظر آ گیا"۔ چھوٹی نے شرارت سے بھوت نظر آ گیا سعد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اخبار کا مطالعہ کرتے کرتے مسکرانے لگا۔

"لیکن آج آپ کالج سے اتنے سویرے کیسے آ گئیں آپا؟" عذیر کے لیے اس کی بے وقت آمد تعجب کا باعث بنی ہوئی تھی اس لیے اس نے پوچھا۔

"وہ نامعلوم لوگوں کو آج کل مرنے بھرنے اور مرنے مارنے کا کیا مرض ہو گیا ہے۔ ہمارے کالج کے علاقے میں ایک دم ہی کچھ شرپسند فسادی لوگ پتھراؤ کرنے لگے تو پرنسپل نے کالج ہی بند کر دیا"۔ عنبر نے سعد کی موجودگی میں نہ چاہتے ہوئے بھی بتایا۔

"مگر تم آج گھر میں کیسے نظر آ رہے ہو۔ کیا مفت کی بیگار ملنے سے تمہارا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہو گیا"۔ عنبر نے محض سعد کو سُنانے کو بڑے جلے کٹے انداز میں عذیر سے پوچھا۔

"لیں بھلا میں اور پڑھائی سے دل اُچاٹ کروں گا۔ مجھے تو آج اسکول سے مجبوراً چھٹی لینی پڑی کیونکہ یہ سعد بھائی میرے ایگزامینیشن فارم بھروانے مجھے بورڈ آف ایجوکیشن لے گئے تھے۔ ہم ابھی ابھی تو آئے ہیں"۔

عذیر نے بتایا تو شرمندگی کا احساس اسے پانی پانی کر گیا۔ کیونکہ سعد کو تنہا گھر میں بیٹھا دیکھ کر وہ بھی چھوٹی کے ساتھ اس کے ذہن میں شک کے بچھو نے ڈنک مارا تھا۔ یا پھر سفلہ خیالات کے زہریلے سانپ نے پھن اُٹھایا تھا۔ اوہو تو یہ بات ہے اس آوارہ مزاج نے اس لیے عذیر کو ٹیوشن دلوا کر امی کو شیشے میں اتارا ہے کہ اپنی ہمدردی کی آڑ میں چھوٹی سے تعلق پیدا کرے۔ اور اس وقت اس وجہ سے یہاں آیا ہے کہ عذیر تو اسکول میں ہوگا اور۔ بس اس سے زیادہ آگ کے گولے کی طرح پھٹ جانے کی کیفیت میں وہ کچھ سوچ ہی نہ سکی اور گلا پھاڑ کر چھوٹی کو آواز دی۔ مگر عذیر کو چھوٹی کے ساتھ دیکھ کر آدھا غصہ تو صابن کے جھاگ کی طرح اسی دم بیٹھ گیا تھا اور باقی ماندہ اب یہ سُن کر بھک ہو گیا کہ سعد اپنا قیمتی وقت برباد کر کے اس کے یتیم بھائی کو بورڈ آف ایجوکیشن لے گیا تھا۔ نہ صرف لے گیا تھا بلکہ اس کے امتحان کی فیس بمعہ رجسٹریشن فارم بھی بھروا کر آیا تھا۔ اور چونکہ مہینے کا آخری ہفتہ تھا اس لیے ماں تو ان دنوں بالکل ہی تہی دست ہوتی تھیں۔ چنانچہ عذیر کی فیس بھی سعد نے اپنی جیب سے ہی ادا کی ہوگی جبکہ اس کے خیال میں یہ ذمہ داری اس کے تایا کی تھی۔ چھوٹے بھائی کے انتقال کے بعد انہیں یہ سب کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ ان کا فرض بنتا تھا۔ مگر یہ سارے کام سعد کرتا ہے۔

مگر کیوں کرتا ہے سعد ہمارے کام؟

کیا انٹرسٹ ہے اس کا ہم سے۔

میں تو اسے منہ بھی نہیں لگاتی۔ اور میرے روّیے کو ہی نہیں میرے تیور بھی وہ اچھی طرح محسوس کر لیتا ہے۔ کہ میں تو اسے گھاس تک ڈالنے کی روادار نہیں۔

پھر ہم جیسے نادار لوگوں سے وہ کیوں ملتا ہے۔ جبکہ ہمارے اپنے ــــ تو ہمارے افلاس کی وجہ سے ملنا جلنا تو کیا ہمیں اپنا رشتہ دار کہنے میں بھی ہتک محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر میں یہ فرض کر لوں کہ وہ چھوٹی کی ذات میں انٹرسٹڈ ہے تو یہ بھی درست نہ ہوگا۔

کیونکہ وہ بالکل ہی دوسری فطرت اور مزاج کی ہے وہ کسی بات کو زیادہ دیر تک مجھ سے چھپا نہیں سکتی۔ اگر سعد کی آنکھوں میں اپنے لیے ذرا سی بھی پسندیدگی دیکھتی تو یقیناً اب تک مجھے بتا چکی ہوتی۔ یوں بھی اس روز میرے ٹوکنے پر اس نے کہا تھا کہ وہ سعد کو سگے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتی ہے۔

تو پھر کیا بات ہے؟ اس کا دل چاہا اس سوال کا جواب وہ خود سعد سے جا کر پوچھے جو بیٹھک میں بیٹھا عذرا کے امتحان کا کوئی کاغذ کھولے اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ مگر وہ کیسے پوچھتی بھلا۔ وہ تو اسے کسی قابل ہی نہیں سمجھتی تھی۔ چنانچہ نتیجے میں اس کے دل میں نہ سہی مگر ذہن میں ایک بات ہی بیٹھ گئی کہ سعد بھی انہیں لڑکوں کی سی فطرت رکھتا ہے جو اپنی رشتے کی بہنوں (کزنز) کی صحبت میں بیٹھ کر، ہنس بول کر اپنا دل بہلاتے ہیں۔ لیکن اس نتیجے پہ پہنچنے کے باوجود دل میں نہ سہی لیکن اس کے ذہن میں یہ شک سا ضرور بیٹھ گیا تھا کہ وہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر چھوٹی کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ بھاگ بھاگ کر یہاں آتا ہے۔

حالانکہ وہ آنے والا بعد میں تو مہینے میں ایک دو بار ہی آنے لگا تھا۔ دیر سے آنا اب عذریہ کا معمول سا بن گیا تھا۔ حالانکہ عنبر ہی نہیں خود خورشید جہاں بھی اس کے دیر سے آنے کے حق میں نہ تھیں۔ کیونکہ ان کے بقول زمانہ بہت نازک تھا۔ اگر وہ لڑکا بھی تھا تب بھی کوئی اسے اغوا کر کے لے جا سکتا تھا۔ وہ مخالفت ضرور کرتی تھیں مگر ممانعت کبھی کی ہی نہ تھی کہ یوں بھی اب عذریہ کی دو ٹیوشنز ہو گئی تھیں۔ اور اسے چھ سو روپے ماہوار مل رہے تھے۔ اور اس کا کہنا تھا کہ وہ بس میں نہیں آتا بلکہ پہلی ٹیوشن والے لڑکے کی کار اسے باہر مین روڈ پہ چھوڑ کر جاتی ہے۔ اور چاہنے کے باوجود عنبر یہ دیکھنے کی غرض سے کہ آیا وہ کار میں آتا بھی ہے مین روڈ تک نہیں جا سکی تھی۔

محلّے میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ عذریہ بھی ٹیوشن پڑھانے لگا ہے اس لیے بعض پڑوسنوں نے خورشید جہاں کو یہ مشورہ دیا کہ بیٹے کی کمائی میں سے وہ کمیٹی یا نیوتہ ڈالوائیں تاکہ اکھٹی رقم آنے پر کوئی بڑی چیز خرید سکیں۔ عذریہ سارے پیسے ان کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا تھا۔ انہوں نے چودھری رحمت کے یہاں پڑنے والی کمیٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور پانچ سو روپے ماہوار کا نیوتہ وہ بھی ڈالنے لگیں۔ باقی سو روپوں میں سے وہ تیس روپے عذریہ کو دیتیں اور ستّر روپے گھر کے اخراجات میں لگا دیتی تھیں۔

اس طرح پہلے کی نسبت اگر حالات ابھی تک درست نہیں ہوئے تھے تو درست ہونے کی اُمّید ضرور تھی۔ یوں تو عنبر بھی انہیں پچاس روپے ماہوار قلم بند دیا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی ان کے لیے ایک آدھ چیز بھی لے آتی تھی۔ مگر چھوٹی صرف بیس روپے ہی اپنے پاس رکھتی تھی باقی ساٹھ روپے پورے کے پورے ماں کے ہاتھ میں دیتی چلی آ رہی تھی۔ اور ماں تھیں کہ اس کے تمام کے تمام پیسے جمع کرتی جا رہی تھیں انہوں نے اس کے ساٹھ روپے میں سے کبھی ایک پائی بھی خرچ نہیں کی تھی۔ عنبر کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی مگر اس نے کبھی منہ سے کچھ نہ کہا تھا۔

پھر بھی اصل مسئلہ "نا ہوت" کا ہی تھا۔ عنبر۔ عذریہ اور چھوٹی کی ٹیوشنز کا پیسہ تو سوکھے دھانوں پر اوس کے مصداق ہوتا تھا۔ وہ جو گھر کا حلیہ اور نقشہ ہی بدل دینا چاہتی تھی وہ تو کسی جادو کی چھڑی سے ہی ہو سکتا تھا۔ اور یہ جادوئی چھڑی آج کے دور میں اگر معنوی نوعیت سے دیکھا جائے تو وہ کالا دھندا ہوتا ہے جو کسی کو راتوں رات امیر و کبیر تو بنا دیتا ہے مگر اس کی عزّت۔ غیرت ضمیر اور زندگی کو داؤں پہ لگانے کے بعد۔

تو عنبر کے یہاں دور تک ایسا کوئی تصوّر ہی نہ تھا۔

وہ تو حوادث کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار کر پیرنا چاہتی تھی۔

خود کو اپنے تایا کے لیول لا کر دکھانا چاہتی تھی۔ جو ایک ناممکن بات ہی تھی۔

مگر چونکہ اس نے عزم مصمم کر لیا تھا اس لیے اسے کسی بات کی پروا نہ تھی۔

کھیلوں کی طرح امتحانوں کا بھی ایک سیزن ہوتا ہے۔ ان دنوں چونکہ عذریہ کے امتحانات ہو رہے تھے اور چھوٹی کے جلد ہی ہونے والے تھے۔ اس لیے وہ دونوں پڑھائی میں جُتے ہوئے تھے۔ خود وہ بھی کچھ کم محنت نہیں کر رہی تھی کیونکہ اس کے امتحانات بھی بہت نزدیک آ گئے تھے۔ امتحانات کی وجہ سے عذریہ نے ٹیوشنز پڑھانی بھی چھوڑ دی تھیں۔ مگر چھوٹی اپنے اس کام پر ڈٹی ہوئی تھی۔ اصل میں روشن کا گھر اس کے گھر سے لگا ہوا تھا۔ اس لیے اسے روشن کے یہاں جانے اور اس کی بہن کو ٹیوشن پڑھانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ مگر عنبر کے لیے تو اس کی ٹیوشنز سانپ کے گلے میں چھچھوندر بن گئی تھیں کہ اُگلتے بنتی تھی نہ نگلتے۔ یعنی پڑھانے کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا اور چھوڑ دینے سے ہاتھ تنگ ہوتا تھا۔ البتہ اس نے اتنا ضرور کیا تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے پڑھانے کے بجائے سارے بچّوں کو ایک گھنٹے میں ہی فارغ کر دیتی تھی۔

چھوٹی کے اور اس کے امتحانات آگے پیچھے ہی چند ہفتوں کے وقفے سے ہوئے تھے۔ محنت تو چھوٹی نے بھی بہت کی تھی۔ مگر اس نے تو جان توڑ کر محنت کی تھی۔ اس لیے سارے پرچے ہی اچھے ہوئے تھے۔ وہ اگر کسی سبجیکٹ میں کمزور تھی تو وہ انگلش کا سبجیکٹ ہی تھا۔ مگر اب تو اسے نہ صرف انگریزی پر خاصی دسترس حاصل ہو گئی تھی بلکہ وہ بڑی رمانی سے انگلش بولنے لگی تھی۔ اصل میں تو عالیہ سے اس کی دوستی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے انگلش کے اعلا اسکول یعنی انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم پائی تھی اس لیے وہ بڑی عمدگی، اسٹائل اور روانی سے انگلش بولتی تھی۔ اور انگلش سیکھنے کے شوق میں ہی تو اس نے کیا کیا جتن نہیں کر لیے تھے۔ پہلے انگریزی بول چال کے قاعدے خریدے تھے۔

پھر کتابیں مول لی تھیں۔

حتیٰ کہ جس کالج سے اس نے انٹر کیا تھا وہاں کی ایک لڑکی سے جو ہیلپر کے طور پہ وائس پرنسپل کے آفس میں بیٹھی تھی اور بہت ہی خوش اخلاق اور ملنسار تھی بلکہ عنبر پر بہت مہربان۔ حالانکہ عنبر سے اس کا کوئی تعلق بھی نہ تھا۔ مگر شاید اس کے حالات بھی عنبر کے حالات سے ملتے جلتے تھے۔ وہ ہمیشہ اسی بس سے گھر جاتی تھی جس میں عنبر سوار ہوتی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ راستے میں ہی اُتر جاتی تھی۔ مگر جتنی دیر بھی دونوں کا ساتھ رہتا وہ آپس میں باتیں کرتی رہتیں۔ اور یوں یہ بات چیت کا سلسلہ ایک طرح دوستی میں بدل گیا۔ جبکہ عنبر اسے "مس" ہی کہتی تھی۔ عنبر پر ان دنوں انگلش سیکھنے کی دُھن سوار تھی اور فائزہ گریجویٹ تھی اور اسے انگلش پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ عنبر کی انگریزی میں اتنی دلچسپی دیکھ کر عنبر کو خالی پیریڈ میں وہ انگریزی پڑھا دیا کرتی تھی۔ مگر یہ سلسلہ تو انٹر تک ہی قائم رہا تھا انٹر کے بعد تو عالیہ کے کہنے پر ماں سے ضد کر کے اس نے کو ایجوکیشن کالج میں داخلہ لے لیا تھا، اور اب تو اسے بڑی اچھی انگلش بولنی آ گئی تھی۔ مگر جس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی غرض سے اور جس کی خاطر سیکھی تھی وہ تو اب اس کے لیے حکایتِ پارینہ بن چکا تھا۔

بہرحال اگر سیکھ بھی لی تھی تو یہ اس کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا کیونکہ عالیہ کے بقول اچھی انگلش جاننے کی وجہ سے تمہیں اچھی ملازمت ملنے میں آسانی ہو گی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے ملک میں ایک طرف تو انگلش کا بائیکاٹ کرنے کو کہا جاتا ہے اور یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اپنی قومی زبان اردو پر ہی زور دیا جائے حتیٰ کہ ہر شعبے میں اردو کو ہی برتری دی جائے۔ اور رائج کیا جائے لیکن دوسری طرف انگریزی کو نہ صرف نیم سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے بلکہ ہر شعبے اور ہر جگہ خواہ اعلا ملازمت ہو یا ادنیٰ انگریزی میں ہی درخواست دینا لازمی قرار دیا جاتا ہے اور اردو میں لکھی ہوئی درخواست ردّی کی ٹوکری کی نذر کر دی جاتی ہے اور یہ تضاد یا دوہری حکمت عملی کم از کم اردو اسپیکنگ حضرات کے لیے بڑا حوصلہ شکن ثابت ہوتی ہے۔

بہرکیف! امتحان کے بعد اب اسے فرصت ہی فرصت تھی۔ کیونکہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ اب تو اس پہ ایک ہی دھن سوار تھی کہ رزلٹ آتے ہی کسی اچھی ملازمت کے لیے اپلائی کرے مگر یہ بھی کوئی

آسان بات نہیں تھی۔ کہ اوّل تو ماں سے اجازت ملنی ہی دشوار تھی دوسرے جس قسم کی اعلا مشاہرے کی ملازمت اسے درکار تھی اس کا ملنا مشکل ہی نہیں محال تھا۔

امتحان ختم ہونے کے بعد کالج جانے کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ اور ایک طرح وہ گھر کی ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی بہانے ہفتے عشرے میں عالیہ سے مل آتی تھی۔ عالیہ کو بھی اس کے ارادوں کا علم تھا۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔ عالیہ کو تو شروع ہی سے اس سے ہمدردی تھی اور اسی ہمدردی کی بنا پر اس نے کئی مرتبہ اسے بڑے قیمتی گفٹس (تحفے) بھی دیے تھے۔ عنبر بھی بڑی نکیلی تھی اور اس نے اپنی بساط سے زیادہ ہی جوابی کارروائی کی تھی۔ گویا وہ کسی معاملے میں بھی اس پر یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ ایک دم قلاّش ہے۔

عالیہ کو اس کے ارادوں کا اچھی طرح علم تھا۔ مگر وہ شروع ہی سے اس کے سروس کرنے کے خلاف تھی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھے اور گریجویشن کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے۔

”بھئی، گریجویشن کے بعد عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ والدین لڑکی کی شادی کر دیتے ہیں۔ مگر تمہارے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ کچھ ضروری تو نہیں کہ گریجویشن کے بعد تمہاری بھی شادی ہو۔ تم تو ابھی بہت ینگ ہو، اس پر خوبصورت بھی ہو۔ اگر دس سال مزید تمہاری شادی نہ کی جائے تو کوئی فرق نہیں کرے گا۔ تم تو اپنی پڑھائی جاری رکھو اور میرے ساتھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لو۔“ تو وہ ہنس کر بولی۔

”لو کیا آسان ہے یونیورسٹی میں داخلہ لینا۔ ویسے جہاں تک شادی کا سوال ہے تو میں نے تو بہت پہلے سے ہی تہیہ کر رکھا ہے کہ میں کبھی شادی ہی نہیں کروں گی۔“

”وہ ٹھیک ہے مگر تم پڑھائی کے نام سے اتنا بدکنے کیوں لگتی ہو۔ شاید تم کو معلوم نہیں کہ کیمپس میں کتنے ٹھاٹھ ہوتے ہیں یعنی وہ کالج کا سا تھوڑا تھوڑا گھٹا ہوا اور محتاط سا ماحول نہیں ہوتا ہے۔ وہاں تو موج ہی موج ہوتی ہے۔ ایمان سے بھول جاؤ گی سارے غم وہاں جا کر۔“ عالیہ نے یہ کہہ کر گویا اسے یونیورسٹی جوائن کرنے کا لالچ دیا۔

”ہاں اس کا تھوڑا بہت اندازہ تو مجھے بھی ہے مگر کیا کروں عالیہ میں اس معاملے میں سخت بے بس و مجبور ہوں۔ کیونکہ تم کو معلوم ہے کہ میرے والد حیات نہیں ہیں، بھائی مجھ سے کئی سال چھوٹا ہے اور چھوٹی بہن بھی ابھی پڑھ رہی ہے لہٰذا اپنی فیملی کو سپورٹ کرنے کی ذمہ داری مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میں گریجویشن کے بعد—سروس کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے اپنی مجبوری بیان کی تو عالیہ نے مزید مشورہ دیا۔

”اچھا اگر سروس بھی کرنا چاہتی ہو تب بھی۔ اتنا وقت تو نکال سکو گی کہ پرائیویٹ اسٹڈی کرتی رہو۔ میرا مطلب ہے تم تعلیم جاری رکھو گی تو تمہیں کوئی اعلا ڈگری تو حاصل ہو جائے گی ورنہ گریجویشن وہ بھی آرٹس میں تو کوئی ویلیو ہی نہیں رکھتی۔“

”اچھا کوشش کروں گی کہ تمہارے مشورے پر عمل کر سکوں۔“ اس نے محض عالیہ کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔ ورنہ پرائیویٹ پڑھ کر وہ بھی ایم اے کرنا اس کے بس سے باہر ہی تھا۔

”اچھا چھوڑو۔ اگر پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتیں تو ایسا کرو کہ کوئی فضائی کمپنی جوائن کر لو۔ یعنی ایئر ہوسٹس بن جاؤ۔“ عالیہ نے ایک نیا مشورہ دیا تو اسے یوں لگا جیسے عالیہ نے اسے بُری سی گالی دے دی ہو۔

”ہائے نہیں بھئی، خدا نہ کرے تم مجھے ایسے غلط مشورے تو نہ دو۔“ وہ بگڑے بگڑے سے انداز میں بولی

”لو بھلا، میں نے کونسا غلط مشورہ دے دیا جو تم اتنا بُرا مان رہی ہو۔ ایئر ہوسٹس کی جاب اتنی بُری بھی نہیں ہوتی۔ جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ میرے نزدیک تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے سچ بڑی ہینڈسم سیلری ملے گی تمہیں۔ اور پھر آج یہاں، کل وہاں پوری نہیں تو آدھی دنیا تو گھوم ہی لو گی اسی بہانے۔ پھر سب سے بڑھ کر سارا گھر بھر جائے گا تمہارا قیمتی اور اعلا چیزوں سے۔ سچ میرا بس چلتا تو میں ایئر ہوسٹس کی جاب پکڑ کر کم از کم آدھی دنیا کا چکر تو لگا ہی لیتی کیونکہ اور سب کچھ ہے میرے پاس۔“ عالیہ نے اسے ایئر ہوسٹس بننے کے فوائد سے آگاہ کیا۔

”ہاں بس چلنے کی ہی تو بات ہے۔ میری امی تو شاید مجھے جان سے ہی مار ڈالیں اگر انہیں پتا بھی چل جائے کہ میں ایئر ہوسٹس بننا چاہتی ہوں وہ تو مجھے سروس کرنے کی اجازت بھی شاید ہی دیں۔“

”او ہو بھئی، یہ دقیانوسی باتیں چھوڑو اور اپنے اندر کچھ گٹس پیدا کرو۔ اپنی امی کو سمجھاؤ کہ ایئر ہوسٹس بننے سے تمہیں کتنا فائدہ پہنچے گا۔ عمدہ عمدہ چیزوں سے تمہارا سارا گھر بھر جائے گا۔ رہ گئی لوگوں کے اعتراضات اور انگشت نمائی کی بات تو تمہارے آڑے وقت میں کسی نے تمہاری مدد کی ہے نہ کوئی تمہیں کھانے کو دیتا ہے۔ تم یہ ساری فکریں چھوڑ دو۔ اور ٹھاٹھ سے اپنا مستقبل بناؤ۔“ عالیہ نے یہ کہہ کر گویا اس کی ہمت بندھائی۔

”ارے واہ تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے ایئر ہوسٹس کی جاب بازاروں میں بکتی ہو کہ بس دام چکائے اور اپنی ہو گئی جبکہ یہاں تو کسی اچھی جاب کا ملنا بھی آسان نہیں کجا کہ ایئر ہوسٹس کی جاب۔“ اس نے محض اس موضوع کو ٹالنے کی غرض سے کہا کیونکہ وہ خود ایئر ہوسٹس کی جاب کرنے کے حق میں نہ تھی۔

”ارے تمہیں اور ایئر ہوسٹس کی جاب ملنی مشکل ہو گی۔ اگر خوبصورتی کے مقابلے کے لیے کھڑی ہو جاؤ تو آئی کین سویر تم مس یونیورس بن سکتی ہو۔ اتنی اٹریکٹو اور سلم ہو کر—تمہیں دیکھ کر کوئی بھی فضائی کمپنی طشتری میں یہ جاب رکھ کر تمہیں پیش کر سکتی ہے۔“

عالیہ نے کہا تو وہ ہنستی چلی گئی۔ کہ ہنسنے کے سوا اس کی باتوں کا کوئی جواب ہی نہیں بن سکتا تھا۔ یہ بھی بڑے تعجب کی بات تھی کہ عالیہ کے اور اس کے خیالات میں ذرا سی بھی ہم آہنگی نہ تھی پھر بھی ان دونوں کی آپس میں بہت بنتی تھی۔

بہر حال عالیہ کے دوسرے مشوروں میں اسے ایک ہی مشورہ مناسب اور صائب لگا تھا۔ یہ واقعی درست ہی تھا کہ وہ اگر چند سال تک اور شادی نہ کرتی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا نتیجے کا انتظار اس کے لیے صبر آزما بن گیا تھا۔

یوں تو وہ اس وقت سے اخبارات میں ملازمتوں کے اشتہارات دیکھتی آ رہی تھی مگر اب تو روزانہ بڑی پابندی سے اخبار کا مطالعہ کرتی تھی۔ گو اخبارات میں زیادہ تر ٹیچرز۔ گورنس۔ اور ورکر نہ خواتین کے لیے ہی اشتہارات ہوتے تھے لیکن کبھی کبھی اس کے مطلب کا بھی کوئی اشتہار نظر پڑ جاتا تھا لیکن وہ ہمیشہ فوری ضرورت کے تحت ہی ہوتا تھا۔ اس لیے وہ دل مسوس کر رہ جاتی تھی کہ رزلٹ کے انتظار میں اتنے اچھے اچھے چانسز ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

آخر تین ماہ بعد ایک دن اس کا رزلٹ بھی آ گیا۔ اور وہ فرسٹ ڈویژن سے پاس بھی ہو گئی۔ اس دن کا تو اسے انتظار تھا۔

وہ اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔

سعد اس روز خلافِ معمول صبح ہی صبح آ گیا تھا۔ وہی اپنے ساتھ وہ اخبار لایا تھا جس میں اس کا رزلٹ شائع ہوا تھا۔ شاید اس نے عذیر یا چھوٹی سے عنبر کا رول نمبر لے رکھا تھا جبھی تو اپنے ساتھ ڈھیر ساری مٹھائی بھی لایا تھا۔ پھل اور خورشید جہاں کی مرغوب ترین ربڑی تو وہ ان کے لیے اکثر و بیشتر لاتا ہی رہتا تھا۔

چھوٹی اور عذیر کے ریزلٹس تو بہت پہلے ہی آؤٹ ہو چکے تھے۔ اور دونوں کی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی۔ اس موقع پر بھی وہ مٹھائی اور پھل لایا تھا اور دونوں کو پاس ہونے کی خوشی میں تحفے بھی دیے تھے۔ اس نے تو جب چھوٹی دسویں میں اور عذیر آٹھویں کلاس میں پاس ہوا تھا اس وقت بھی بہت کچھ دیا تھا اور عذیر کو نویں جماعت کا پورا کورس بھی خرید کر دیا تھا۔ وہ ڈھکے چھپے اس طرح کہ ان لوگوں کو احساس نہ ہو، بہانے بہانے ان کی مدد کرتا رہتا تھا اور اسی بات پر خورشید جہاں اسے دعائیں دے کر کہتی تھیں کہ رشتے داروں میں ایک وہی تو ہے جو ان کا اتنا خیال رکھتا ہے۔

بہر کیف۔ اب تو عنبر اتنے شاندار طریقے سے پاس ہوئی تھی۔ گو اس کے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اگر یہ سب نہ ہوا ہوتا تو ریحان بھاگا بھاگا اسے مبارکباد دینے آتا۔ اور یہ خیال یا خواہش اس کے دل کو بڑا دکھ پہنچا رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی اس روز وہ بہت خوش تھی۔

یوں بھی اسے اُمید نہ تھی کہ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ عالیہ نے کہا تھا کہ اگر تمہاری فرسٹ ڈویژن آ گئی تو پھر تمہیں بڑی آسانی سے کوئی اچھی جاب مل جائے گی تو اس نے دل میں سوچا تھا کہ اے کاش

ایسا ہی ہو۔ کیونکہ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ سیکنڈ ڈویژن میں بھی پاس ہو جائے تو یہی بہت غنیمت ہوگا۔ اور اب چونکہ بہت غیر متوقع طور پر اس کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی تو وہ اندر ہی اندر کسی جشن کی طرح بڑی خوشی منا رہی تھی۔ اور یہ خوش کن اور جانفزا خبر لایا بھی کون تھا اور لایا بھی تھا تو مٹھائی اور پھلوں کے ساتھ۔ اس کی لائی ہوئی مٹھائی کو دیکھ کر سب سے پہلے ماں کا یہی فقرہ اس کے کانوں میں گونجا تھا کہ ___

"خدا سلامت رکھے سعد کو، یہ ہماری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے۔ یہاں تو ایک سگا بھائی تو وہ بھی ____ بیوی کی وجہ سے کیسا پرایا پرایا سا لگتا ہے۔ اور ایک یہ سعد ہے کہ ہماری ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا ہے۔" ماں تو اس کی تعریف میں ہمیشہ ہی رطب اللسان رہتی تھیں۔ مگر اس روز پہلی بار ماں کی باتوں کی بازگشت میں اس نے بھی سوچا کہ واقعی امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ سعد واقعی ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔ ورنہ بھلا کس کو پڑی ہے کہ ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں قدم بھی رکھے۔ دینا دلانا تو دُور کی بات۔

بس اسی خیال کے تحت، اس نے واقعی بہت صدق دلی سے بہت مُسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اور اُس کے سامنے خوب ہنس بول بھی رہی تھی۔ کہ چھوٹی نے باتوں ہی باتوں یا پھر مذاق ہی مذاق میں سعد سے پوچھا۔

"پاس ہونے کی خوشی میں مجھے تو آپ نے رسٹ واچ گفٹ کی تھی۔ اب آپا کو کیا دیں گے آپ؟" تو سعد کے جواب دینے سے پہلے عنبر بولی۔

"نہیں، مجھے کیا دے سکتا ہے کوئی۔ تم فضول باتیں نہ کیا کرو چھوٹی۔"

"لیجیے اس میں فضول باتیں کرنے کی کیا بات ہو گئی۔ آپ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی ہیں یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے نا۔ اور ہماری خوشیوں میں سعد بھائی کے سوا شریک ہونے والا اور رہ بھی کون گیا ہے۔ میں نے تو اس لیے ان سے پوچھ لیا تھا کہ انہوں نے مجھے اور عذیر کو بھی پاس ہونے کی خوشی میں بڑے اچھے اچھے گفٹس دیے تھے۔"

اس کے کاٹ کھانے والے انداز میں بات کرنے پر سعد کی وجہ سے چھوٹی کو اتنی وضاحت کر کے اپنی جھینپ مٹانی پڑی۔

"لیکن۔ تمہاری طرح میں گفٹس کی بھوکی نہیں ہوں۔ ان کا یہی احسان بہت ہے کہ یہ مٹھائی وٹھائی لے کر آگئے ہیں۔" عنبر نے بڑی درشتی سے کہا اور پھر اُٹھ کر اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مگر چھوٹی سعد کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کرتی رہی۔ پھر جونہی سعد گیا خورشید جہاں جو بڑی دیر سے باورچی خانے میں بیٹھی سعد کے لیے کوفتوں کا سالن پکانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ انہوں نے چھوٹی سے پوچھا کہ سعد اچانک کیوں چلا گیا۔ تو چھوٹی جو تھوڑا تھوڑا منہ بنائے بیٹھی تھی اس نے شاتوں کو جھٹک کر جلے کٹے انداز میں کہا۔

"اچھا ہی ہوا جو چلے گئے۔ یہاں ان کی قدر ہی کب ہوتی ہے۔ بے چارے ہماری خوشیوں میں شریک ہونے کیسے بھاگ بھاگ کر آتے ہیں مگر۔"

"مگر میں ان کو لات مار کر باہر پھینک دیتی ہوں۔ یہی کہہ کر اپنی کسر کے کان بھرنا چاہ رہی ہو نا تم میرے خلاف۔"

عنبر نے اندر سے اچانک وارد ہو کر چھوٹی کا باقی فقرہ پورا کیا تو اس نے شکایتی انداز میں ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھیے، سُن رہی ہیں آپ امی یہ آپا کیا کہہ رہی ہیں۔"

"اے اپنے ہوش میں بھی ہو عنبر! کیا لڑکوں کے ساتھ پڑھ کر تمہاری زبان اتنی بے لگام ہو گئی ہے کہ چھوٹے کو دیکھتی ہو نہ بڑے کو بس جو منہ میں آتا ہے، بک دیتی ہو۔ اسے لات مار کر باہر پھینکنے والی احسان فراموش کہیں کی۔ وہ بے چارا تو تمہاری خوشی میں شرکت کرنے بھاگا بھاگا مٹھائی لے کر آیا تھا تمہارے اس سگے کی طرح کسی کے یہاں سے آئی ہوئی چھپٹا تک بھر باسی مٹھائی تو نہیں لایا تھا۔"

یہ کہہ کر تو گویا ماں نے اس کے دُکھی سے دل میں نشتر سا چبھو دیا۔ کوئی جواب دینے کے بجائے وہ منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ خورشید جہاں خود بھی نہیں چاہ رہی تھیں کہ اس کی خوشی میں رخنہ پڑے۔ کیونکہ برسوں بعد آج اس کی دلی مراد پوری ہوئی تھی کہ وہ بی۔ اے میں پاس ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے اسے ایسا کچھ سخت سست نہیں کہا تھا۔ مگر اب اس نے رونا شروع کر دیا تو ان کا بھی دل دُکھ کر رہ گیا۔ اس پر انہیں عنبر پر غصہ بھی بہت آ رہا تھا۔ اس پر مستزاد اس کے رونے پر چھوٹی نے ہراساں ہو کر کہا۔

"امی! آپ بھی کمال کرتی ہیں بھلا یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے عرصے بعد آج تو آپا کو ایک خوشی نصیب ہوئی تھی اور آپ نے لے کر انہیں رلا دیا۔"

تو خورشید جہاں جو خود بھی گڑبڑا سی گئی تھیں۔ نبے کٹے سے انداز میں بولیں۔

"تو بھلا میں نے اسے ایسا کیا کہہ دیا۔ جو حقیقت تھی وہی تو بتلائی ہے۔ چلو جاؤ منہ دھو کر آؤ اپنا اور کوفتے بگھار دو۔ کتنے شوق سے بنا رہی تھی نگوڑے سعد کے لیے۔ اب تم ہی پکاؤ جا کر۔"

خورشید جہاں نے لتاڑنے کے ساتھ ساتھ کوفتے پکانے کا حکم بھی صادر کر دیا۔ مگر چھوٹی نے اس حکم کی بجاآوری فوراً اپنے سر لے لی۔

"نہیں، نہیں۔ آج تو میں اپنی آپا کو باورچی خانے کے نزدیک جانے دوں گی نہ کسی کام کو ہاتھ لگانے دوں گی۔ جائیے آپا آپ تو منہ دھو کر ٹھاٹھ سے آرام کیجیے۔ ہو سکتا ہے آپ کی کوئی سہیلی آپ کو مبارک باد دینے آجائے۔"

چھوٹی نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر خوشامدانہ سے لہجے میں کہا۔ تو وہ آنسو پونچھتی غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

خورشید جہاں کے بقول اس کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا۔ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ۔ منہ دھونے کے بعد تھوڑی دیر تک تو وہ منہ پھلائے رہی پھر خود بخود ہی نارمل ہو گئی۔ اور چھوٹی سے یوں گھل مل کر باتیں کرنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وہ کئی روز سے عالیہ کے یہاں جانا چاہ رہی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ عذیر صبح کا گیا شام کو واپس آتا تھا۔ وہ ٹیوشنز جو سعد نے اسے دلائی تھیں وہ تو سالانہ امتحان کی وجہ سے کب کی چھوٹ گئی تھیں۔ مگر اب چونکہ وہ دسویں جماعت میں آگیا تھا اور اس نے سائنس کا مضمون لیا تھا اس لیے اس نے ایک کوچنگ سینٹر میں داخلہ لے لیا تھا۔ اور اسکول کے بعد وہ سیدھا وہیں جاتا تھا۔ کوچنگ سینٹر کی فیس کون ادا کرتا تھا یہ گھر میں کسی سے بھی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ مگر سب ہی نے اس معاملے میں رو گردانی شروع کر رکھی تھی۔ کیونکہ اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی طرح اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے پھر پائی پائی کا حساب کر کے ساری رقم اسے واپس لوٹا دے گی۔ گو اس نے اس سلسلے میں ماں سے بہت احتجاج کیا تھا۔ سخت مخالفت کی تھی کہ سعد کو اس حد تک زیر بار نہ کریں مگر وہ بھی اپنے حالات سے سخت مجبور تھیں۔ اس پر وہ جو ٹیوشنز کے پیسوں کی کمیٹی ڈالی تھی وہ بھی ٹیوشنز چھوٹنے سے ادھوری رہ گئی تھی۔ ادھر انہیں عذیر کا مستقبل بھی بہت عزیز تھا۔ اس لیے انہوں نے یہ کہہ کر عنبر کی تشفی کرا دی۔

"عذیر خود بھی باپ کی طرح بہت نکیلا اور خوددار ہے۔ وہ مجھ سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہے کہ خواہ مجھے کچھ بننے میں دس برس ہی کیوں نہ لگیں میں سعد بھائی کی پائی پائی چکا کر رہوں گا۔ بس تم یہ دعا کرو کہ خدا تمہارے اکلوتے بھائی کو لمبی عمر دے اور کسی قابل کر دے۔"

تب اس نے بھی دل میں ہنس کر یہی سوچا تھا کہ خیر عذیر کے کچھ بننے میں تو ابھی بہت عرصہ لگے گا اس سے پہلے میں خود ملازمت سنبھالتے ہی سعد کی پائی پائی چکا دوں گی۔

نمعلوم اس نے اپنی ملازمت کے سلسلے میں کیا لائحہ عمل تیار کر رکھا تھا۔ اور کیا سمجھتی تھی وہ ملازمت کو شاید یہی کہ کسی لاٹ گورنر کے عہدے پر فائز کر دی جائے گی۔

بہرحال عذیر کو اس کے ساتھ جانے کا وقت نہیں ملتا تھا اور چھوٹی کو وہ اس لیے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں وہ اپنی پٹر پٹر باتیں مٹھارنے کی عادت میں اس نے جو عالیہ کی نظروں میں اپنی ایک حیثیت بنائی تھی اس کا بھانڈا ہی نہ پھوڑ دے۔ جبکہ چھوٹی نے ہی اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ اپنی سہیلیوں کو گھر تو بلا نہیں سکتیں ایسا کریں کہ کسی ریسٹورنٹ میں انہیں چائے کی ٹریٹ ہی دے دیں۔ اور یہ مشورہ اسے صائب تو لگا تھا مگر اس نے چائے کی دعوت وہ بھی کسی ریسٹورنٹ میں دینے کا حساب لگایا تو اس کی جیب نے اجازت ہی نہیں دی۔ اور اگر ماں سے کہتی تو وہ ایسی عیاشی کی اجازت دینے کی کبھی روادار نہ ہوتیں۔ اس لیے دل مار کر بیٹھ رہی۔

یوں بھی اسے معلوم تھا کہ اس کی کوئی سہیلی مبارکباد دینے کے لیے اس کے گھر آ ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ کسی کو اس کے گھر کا پتا معلوم ہی نہ تھا اور پھر کس کو ضرورت پڑی تھی اس کے گھر آنے کی اس نے کوئی فرسٹ کلاس فرسٹ

پوزیشن تو نہیں لی تھی۔ اور پھر اپنی کلاس فیلوز سے اس کی صرف صاحب سلامت ہی تھی اور پھر خواہ وہ کتنا ہی چھپاتی اس کی حیثیت کسی نہ کسی طرح دوسروں پر عیاں ہی ہو جاتی تھی۔ اور یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی۔

اس کا رزلٹ آئے بارہ روز ہو گئے تھے اور اس نے عذیر سے پہلے سے کہہ دیا تھا کہ اگلے دن عام تعطیل ہو گی اس لیے وہ اُسے ساتھ لے کر عالیہ سے ملنے جائے گی۔ لہٰذا وہ گھر پر ہی رہے جبکہ اسے معلوم تھا کہ عذیر چھٹی کے دن کہیں نہیں جاتا تھا۔

عذیر کی ٹیوشنز چھُوٹ جانے کی وجہ سے ایک تو حالات گھُوم پھر کر اپنی پرانی ڈگر پر آ گئے تھے، دوسرے خود عنبر کی دو ٹیوشنز چھوٹ گئی تھیں۔ اب کالج کے اخراجات تو اٹھانے نہیں پڑتے تھے پھر بھی دو ٹیوشنز کے چھوٹ جانے سے اس کا ہاتھ تنگ ہو گیا تھا۔ کہ آج کل تو یوں بھی قدم قدم پر پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہاں یہ عالم تھا کہ ایک ایک پیسے کے لیے ترسنا پڑتا تھا۔ پیسہ بھی آتا تھا تو اتنا ناکافی، اتنا قلیل کہ پیٹ بھرنے کی سوچتے تو بدن کھلتا اور بدن ڈھانپنے کی کوشش کرتے تو پیٹ خالی رہتا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ مکان ذاتی تھا۔ مگر بجلی، پانی کا بل تو دینا ہی پڑتا تھا۔ گیس ان کے یہاں لگی ہی نہ تھی۔ تو تیل کا خرچ بھی کم نہ تھا۔

مہینے کا اخیر تھا۔ اور یوں تو گھر کا لگا بندھا حساب تھا۔ مگر مہینے کے آخری دنوں میں ہاتھ اتنا تنگ ہو جاتا تھا کہ خورشید جہاں کو گلی کے نکڑ پر واقع پرچون کی دکان سے کچھ سامان اُدھار بھی منگوانا پڑ جاتا تھا۔ مگر وہ بس اسی حد تک ہی منگواتی تھیں جسے بعد میں آسانی سے ادا کر سکیں۔ اور اس مہینے تو ایسا اتفاق ہوا تھا کہ عنبر کے پاس ہونے کی وجہ سے خورشید جہاں کو محلّے میں مٹھائی بھی بانٹنی پڑی تھی۔ کچھ اس لیے بھی وہ بالکل ہی خالی ہو گئی تھیں۔ بس گھر میں گھی کے چند خالی ڈبے اور تھوڑی سی اخباروں کی ردّی پڑی ہوئی تھی۔ یا پھر سلور کے پرانے ٹوٹے پھوٹے دو برتن تھے۔ کوئی گیارہ بجے دن کا عمل تھا۔

عذیر اسکول جا چکا تھا۔ اور اس کے محلّے کے مرد بھی اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے تھے اس لیے گلی میں سناٹا ہوتا تھا۔ اس لیے خورشید جہاں نے یہ موقع بہتر جانا۔ اور ساری ردّی۔ ٹین، بوتلیں اور پرانے برتن بیٹھک کے بیرونی دروازے پر رکھ کر ردّی پیپر والے کو بلا لیا۔ اور ابھی وہ ناپ تول اور پیسوں پر جھک جھک میں لگی ہوئی تھیں کہ تبھی دروازے کے عین سامنے ایک لمبی سی چمچماتی ہوئی کار آ کر رُکی اور عالیہ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور سیدھی ان کی طرف بڑھتی چلی آئی۔

خورشید جہاں اپنی ردّی کے مول تول میں ایسی مصروف تھیں کہ انہوں نے اُسے کار سے اُترتے اور اپنی طرف آتے دیکھا بھی نہیں۔ چونکیں تو وہ اس وقت جب عالیہ نے عین ان کے سر پر آ کر پوچھا۔

"سنیں جی کیا عنبرین خان اس گھر میں رہتی ہے" تو انتہائی شرمندگی محسوس کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے میٹھے سے لہجے میں کہا۔

"ہاں بیٹی! یہی اس کا گھر ہے۔ آؤ اندر آ جاؤ" اور وہ جو حلیہ سے بے حلیہ کہ گھر کے معمولی کپڑوں میں ملبوس گھر کی جھاڑ پونچھ میں لگی تھی۔ بغیر ڈوپٹے بیٹھک میں ہی کھڑی تھی۔ اس نے عالیہ کو ماں سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اور وہ عالیہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے وہاں سے بھاگ کر چھُپ جانے کی کوشش کر رہی تھی کہ عالیہ قدم بڑھا کر سیدھی اس کے پاس آ گئی اور اس سے لپٹ کر بولی۔

"ارے کہاں ہو عنبرین تم اتنے دن سے۔ میں تو تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک گئی"

مگر اس کی اچانک اور غیر متوقع آمد پر اور کچھ اپنے شدید قسم کے کمپلکس میں جیسے اس کی گویائی سلب ہو گئی تھی۔ وہ ایک دم ہی کوئی جواب نہ دے سکی۔

"دیکھ لو، اب مجھے خود ہی آنا پڑا ہے تمہیں مبارکباد دینے ورنہ تم نے مجھے کبھی اپنے گھر بلایا ہی نہ تھا" عالیہ نے اسے خاموش دیکھ کر خود ہی کہا تو وہ ذرا ہوش میں آئی۔

"میں نے تو کل جمعے کو تمہارے یہاں آنے کا پروگرام بنایا تھا. لیکن اب تو تم خود ہی آ گئیں"

عالیہ جب سے آئی تھی برابر بیٹھک میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اس بات پر تو عنبر اور بھی گڑی جا رہی تھی۔ چھوٹی کو بالکل خبر نہ تھی کہ عالیہ آئی کھڑی ہے ۔ اصل میں تو وہ باورچی خانے میں تھی۔ اور خورشید جہاں سے کچھ پوچھنے آئی تھی کہ عالیہ

کو عین بیٹھک کے بیچوں بیچ بہن کے پاس کھڑا دیکھ کر دہلیز پر ہی ٹھٹک گئی۔ عالیہ کی اس پر نظر پڑی تو اس نے کہا۔

"یہ تمہاری بہن ہے نا عنبرین!"

تو عنبر کے جواب دینے کے بجائے چھوٹی نے شوخ سے انداز میں اپنا تعارف کرایا۔

"جی ہاں۔ میرا نام فرحین ہے اور میں ان کی چھوٹی بہن ہوں مگر آپ کی تعریف؟"

"او نڈر فل! ابھی یہ تمہاری چھوٹی بہن تو بڑی آفت شے ہے" عالیہ نے اس کی برجستگی پر ہنس کر عنبر سے کہا۔ مگر جواب چھوٹی نے دیا۔

"تھینکس اے لاٹ دبے حد شکریہ، مگر آپ تشریف تو رکھیں" تو عالیہ نے عنبر کی طرف دیکھا کہ اصولاً تو اسے عالیہ کو بٹھانا چاہیے تھا۔ اور پھر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"میں تم سے ملنے آئی ہوں عنبرین! تمہارے گھر سے نہیں لہٰذا تم وہی پہلے والی عنبرین بن جاؤ۔ اور آرام سے میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرو۔ اور عالیہ کی اس بات پر وہ اور بھی پانی پانی ہو گئی۔ پھر بھی شرمندہ اور شرمسار سی کیفیت میں

اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ گو شرمندہ تو چھوٹی بھی ہو رہی تھی مگر اس کی طرح نہیں۔

"آپ ٹھنڈا پینا پسند کریں گی یا گرم میرا مطلب ہے چائے" اس نے عالیہ سے پوچھا۔

"ارے ٹھنڈا اس وقت کہاں سے منگواؤ گی، عذیر بھی خیر سے گیا ہوا ہے۔ بس چائے ہی پلوا دو اس بچی کو اور ہاں وہ مٹھائی وغیرہ بھی لے آؤ۔ یہ عنبر کو پاس ہونے کی مبارکباد دینے آئی ہیں نا"

خورشید جہاں نے جو اس اثنا میں ردّی پیپر والے سے اپنا حساب چکتا کر چکی تھیں پیسے مٹھی میں دبائے عالیہ کے نزدیک آتے ہوئے کہا تو عنبر کا تو غصے کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ بھلا یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ٹھنڈا کس سے منگواؤ گی۔ اس نے کلس کر دل میں سوچا۔

عالیہ نے ایک غائر نظر خورشید جہاں پر ڈالی۔ جن کے چہرے مہرے سے عامیانہ پن نہیں شرافت ہی عیاں تھی۔ گو لباس ان کا بھی مسلا دسلا سا تھا۔ مگر اس میں بھی وہ بڑی خوش رو نظر آ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ عنبر کی والدہ ہیں۔ اس نے کہا۔

"جی ہاں، آنٹی میں اسے مبارکباد دینے ہی آئی تھی۔ لیکن آپ بالکل تکلف نہ کریں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں اس وقت کچھ بھی کھانے اور پینے کی عادی نہیں ہوں۔"

ہاں فرحین کیا تم بھی کہیں پڑھتی ہو؟" تو عالیہ کی اس بات کا جواب خورشید جہاں نے دیا جو ردّی سے حاصل شدہ پیسے اندر کمرے میں رکھ کر لوٹ آئی تھیں۔

"ہاں! اس نے بھی اس سال انٹر پاس کیا ہے"

"او گڈ۔ یہ تو بڑی اچھی بات سنائی آپ نے آنٹی" عالیہ نے ستائشی انداز میں کہا اور پھر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"اچھا اب چلتی ہوں عنبرین"

"ارے ابھی سے جا رہی ہیں آپ تھوڑی دیر تو ٹھہر جائیں بس میں ابھی چائے لا رہی ہوں" چھوٹی نے کہا تو عنبر کو بھی کہنا پڑا۔

"ہاں بھئی، کچھ دیر تو اور رُکو" مگر عالیہ نے جواب فرحین کو ہی دیا۔

"نہیں فرحین! بس تمہارا کہنا بھی بہت ہے، یہ سمجھو کہ میں نے چائے پی لی۔ اصل میں میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ کافی دن سے اس کی خیر خبر نہیں ملی تھی تو اس سے ملنے چلی آئی۔ اچھا خدا حافظ" عالیہ نے بہت عجلت میں یہ سب کہا اور پھر خورشید جہاں کو سلام کر کے جانے لگی تو دروازے پر رُک کر عنبر سے بولی جو قدم بڑھا کر چھوٹی کے ساتھ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔

"اگر میرے گھر آؤ تو اپنے ساتھ فرحین کو ضرور لانا" اور عنبر کو جبراً کہنا پڑا۔

"اچھا لے آؤں گی"

وہ عالیہ کو رخصت کرتے وقت اس خیال سے دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی تھی کہ کار میں بیٹھا ڈرائیور اسے دیکھ نہ لے۔ کیونکہ وہ تو ہمیشہ اسے گلی کے نکڑ پر اُتار کر چلا جاتا تھا۔ اب اس نے اپنی آنکھوں سے نہ صرف اس

کا گھٹیا سا گھر بلکہ ماں کو ردی پیپر بیچتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ اور اس کی غیرت نے یہ بالکل گوارا نہ کیا کہ وہ اس کے سامنے آتی۔ اور پھر اِدھر کار آگے بڑھی اور اُدھر اُس نے دروازہ بند کر کے ہچکیوں اور سسکیوں رونا شروع کر دیا۔

خورشید جہاں خود بھی دل ہی دل میں بہت کُڑھ رہی تھیں۔

کہ ماں کا دل اس قدر نرم اور رقیق ہوتا ہے کہ اولاد کے آنسوؤں کو دیکھ کر پگھلتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور انہیں بھی اس بات پہ بہت قلق تھا کہ آج ہی اس موئے ردی پیپر والے کے ہاتھ کاٹھ کباڑ فروخت کرنا رہ گیا تھا وہ بھی ایسے وقت کہ عالیہ اچانک آ وارد ہوئی تھی۔

انہوں نے عزبی میں وہ بھی مجبوری کے تحت آنکھ ضرور کھولی تھی مگر ان کا باپ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔

انسان حالات سے بے بس ہو کر خواہ کتنا ہی پستی میں چلا جائے مگر اس کی وہ خو بو نہیں جاتی جو اس کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔

چھوٹی کو بہن سے الگ تو نہ تھی افسوس تو اسے بھی بہت ہو رہا تھا بلکہ سچ پوچھا جائے تو عالیہ کو دیکھ کر شرمندہ تو وہ بھی بہت ہوئی تھی۔ اور بہن کے احساسات اور جذبات کا اسے بھی احساس تھا۔ پھر بھی وہ بہن کو شرمندگی سے نکالنے کی غرض سے بولی۔

"آپا آپ بلاوجہ کیوں خود کو اتنا آزار پہنچا رہی ہیں۔ عالیہ آپا تو خود کہہ رہی تھیں کہ میں تم سے ملنے آئی ہوں تمہارے گھر سے نہیں۔ اور پھر دوست ہمیشہ اُس کو بنانا چاہیے جو ہر حالت میں دوستی نبھائے اور حیثیت کو درمیان میں نہ لائے۔ اور میرے خیال میں تو عالیہ آپا حیثیت کی پروا کیے بغیر آپ سے ملتی ہیں پھر بھلا اس میں اس قدر رونے کی کیا بات ہے۔؟"

"روؤں نہیں تو اور کیا کروں۔ میں نے تو کبھی اسے اپنے حالات کی ہوا تک نہیں دی۔ کبھی اپنی حیثیت اور اوقات کو اس پر آشکارا نہیں کیا تھا۔

میں جب اس کے یہاں جاتی تھی۔ جاتے ہی مجھے کولڈ ڈرنک پیش کی جاتی تھی۔ جس کے ساتھ سنیکس بھی ہوتے تھے۔ بڑے گھروں کا یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ گھر آئے مہمان سے پوچھتے نہیں بلکہ فوراً ہی اسے کولڈ ڈرنک پیش کر دیتے ہیں۔ بڑے ٹرینڈ نوکر ہوتے ہیں ان کے جن سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ یہ لاؤ، وہ لاؤ۔ اور ادھر امی نے تو بالکل ہی ناک کٹوا کر رکھ دی۔ ایک تو اس کے سامنے ردی بیچی اس پر پیسے ہاتھ میں لیے یہ کہہ رہی ہیں کہ ٹھنڈا کس سے منگواؤ گی۔ بھلا کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی، سیدھا سادہ چائے کے لیے ہی پوچھ لیا ہوتا۔ کہ وہاں تو فرج اور فریزر ہوتے ہیں۔ جن میں ہر چیز ٹھنڈی اور یخ رکھی موجود ہوتی ہے۔ کتنا کہا تھا امی سے کہ عذیر کی بیسی کے سات مہینے کے جو پیسے جمع ہوئے ہیں ان سے ایک فریزا اور ایک چھت کا پنکھا ہی خرید لیں۔ بھلا یہ بھی کوئی پنکھا ہے شاید ایجاد کرنے والے کی سب سے پہلی ایجاد ہوگی۔ ایک تو اس کی پھونک نکل گئی ہے۔ کمبخت ہوا ہی نہیں دیتا اس پر گھوں گھوں کی آواز نکال کر۔ اس بُری طرح چلتا ہے کہ اس کے نیچے بیٹھنے والے کو یہ خدشہ لاحق ہونے لگتا ہے کہ اسی کے سر پہ اب گرا اور جب گرا۔ مگر امی کو تو بس ایسی ہی پرانی دھراتی اور سڑی لبساندی چیزیں رکھنے کا شوق ہے۔"

اس نے روتے روتے جس طرح پنکھے کا نقشہ کھینچا تو اس کے بقول کہ چھوٹی کو تو بس ہنسنے کا موقع چاہیے چھوٹی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مگر خورشید جہاں کو ہنسی آنے کے بجائے اُس کی باتوں پر تاؤ آ گیا

"اے بس بہت ہو لیا اب زیادہ میرے سر چڑھنے کی کوشش نہ کرو۔ اپنے آپ تو کسی قابل نہیں ہو اور بھائی کے ساڑھے تین ہزار روپوں کو جتاتی ہو۔ جن میں سے ایک ہزار روپے تو اس کے جوتے، کپڑوں اور گھر پر خرچ ہو چکے ہیں۔ اے پیسہ تو انگلیوں کی جھریوں میں سے نکلنے والے پانی کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے بہہ جاتا ہے۔

میرے پاس اگر عذیر کے کچھ روپے بھی جمع ہیں تو اس کی امانت ہیں۔ کیونکہ اب وہ دسویں جماعت میں آ گیا ہے۔ اور مجھے یہ بالکل گوارا نہیں کہ پیسے کی ضرورت پڑنے پر پھر سعد کا احسان اپنے سر لوں۔ یہ تمہارا موا فرج ورج تو اسی وقت آ سکتا ہے جب کہیں سے الہ دین کا چراغ ہاتھ میں آئے گا۔"

"خیر فی زمانہ الہ دین کا چراغ ہاتھ آنا تو ممکن ہی نہیں امی۔ آج کل تو محنت مشقت بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ آج کل تو اوپری کاموں سے ہی ہُن برستا ہے۔ اور آپا ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ ہمارے یہاں اگر فریزر ہی ہوتا تو ہم آپا کی سہیلی کو کولڈ ڈرنک ہی دے دیتے کہ وہ پہلی بار ان سے ملنے آئی تھیں۔"

چھوٹی نے کہا تو خورشید جہاں بیزاری سے بولیں۔

"ارے کہاں سے دے دیتے بھلا۔ وہی مثل ہوئی کہ سوت نہ کپاس کولہو سے لٹھم لٹھا۔ ٹھنڈا کرنے کی مشین گھر میں ہوتی تبھی تو دیتے نا۔ تو وہ اپنے نصیب میں ہی نہیں ہے اور میں نے تو تم دونوں کو بھی کتنی بار سمجھایا ہے کہ اگر دوستی بھی کرو تو اپنے برابر والے سے کرو۔ نہ نیچے اگر کرو، نہ اوپر چڑھ کے کیونکہ پھر یہی مثل ہو جاتی ہے کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ اور واقعی یہ حقیقت بھی ہے۔ اپنے سے نچلے انسان سے دوستی کرو گی تو پچھتاؤ گی اور اپنے سے اُونچے سے کرو گی تو منہ کی کھاؤ گی۔ اصل میں دوست وہ ہوتا ہے جو ہر قسم کے حالات میں انسان کا ساتھ دے۔ ایسا نہیں کہ جس کے آنے سے انسان کو رونا پڑے جیسے کہ تم رو رہی ہو۔" خورشید جہاں نے سمجھایا بھی اور نصیحت بھی کی۔ اور پھر اُٹھ کر باہر برآمدے میں چلی گئیں تو چھوٹی نے بھی اسے سمجھایا۔

"چھوڑیں آپا اب تو جو کچھ ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب تو یہ آپ کی سہیلی کے ظرف پر منحصر ہے کہ وہ آپ کو ان حالات میں دیکھنے کے باوجود بھی دوستی قائم رکھیں۔ ورنہ اگر حیثیت کو درمیان میں لائیں بھی تو اسی حیثیت کی وجہ سے ہم تو پہلے ہی اپنے سگوں کے ڈسے بیٹھے ہیں۔ پھر آپ غیروں کی کیوں پروا کریں۔" چھوٹی نے کہا اور پھر معاً اسے یاد آیا کہ وہ چولہے پر کچھ پکتا چھوڑ آئی تھی تو اس نے کہا۔

"ہے ہے وہ کھچڑی تو میں چولہے پر پکتی چھوڑ آئی تھی۔" اور پھر اُٹھ کر بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔

عالیہ تو اسے بُلا کر گئی تھی مگر اس کے اچانک وارد ہو جانے سے اسے جو ذلت اور شرمندگی اُٹھانی پڑی تھی اس کے پیشِ نظر عنبر کی عالیہ کے یہاں جانے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ کئی روز تک تو وہ اس صدمے سے دوچار رہی پھر رفتہ رفتہ اس کی طبیعت معمول پر آئی تو اس پر پھر سروس کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ سب سے بڑا مسئلہ تو ماں سے اجازت لینے کا تھا۔ جبکہ اسے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ ماں اسے مشکل سے ہی اجازت دیں گی۔ پھر بھی چونکہ وہ ملازمت کرنے کا تہیہ کر چکی تھی اس لیے ـــ اس سلسلے میں اسے ماں سے کہنا ہی پڑا۔

"امی! مہنگائی کتنی بڑھ چکی ہے اور ہماری آمدنی اتنی قلیل ہے کہ ہم پیٹ بھرنے کے سوا اور کسی چیز کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ مشکل تو یہ ہے کہ عذیر بھی ابھی پڑھ رہا ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ اس کے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ نہ پڑے یعنی اتنی چھوٹی عمر میں وہ ٹیوشن نہ پڑھائے بلکہ پڑھتا ہی رہے۔ یوں بھی اس نے سائنس کا مضمون لیا ہے جو بہت مشکل اور کسی حد تک مہنگا ہوتا ہے۔ ایف ایس سی میں جا کر اسے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ پانچ سال یہ اور چار سال وہ۔ گویا نو برس بعد وہ ڈاکٹر بنے گا۔"

"خدا وہ دن تو لائے۔"

"جی ہاں وہ دن ضرور آئے گا امی! ماشاء اللہ اپنا عذیر بہت ذہین بچہ ہے۔ تبھی تو میں نے سائنس پڑھنے پر اتنا زور دیا تھا۔" عنبر بولی۔

"ہاں لیکن سعد نے بھی ہر معاملے میں بڑی مدد کی ہے اس کی۔ خدا اسے خوش رکھے اس نے تو ایک طرح عذیر کی پڑھائی کا ذمہ ہی اپنے سر لے رکھا ہے۔" خورشید جہاں احساسِ ممنونیت میں غرق ہو کر بولیں۔

"جی ہاں، یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن امی یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہوتی کسی سے اتنی زیادہ مدد لینی۔ وہ بھی مالی امداد۔ اور جیسا کہ آپ کہتی ہیں کہ عذیر جب کسی قابل بنے گا تو سعد کی پائی پائی چکا دے گا تب بھی احسان کا بوجھ تو ہمارے

سروں پر ہی رہے گا نا۔"

"ہاں مگر تم اسے سعد کیوں کہتی ہو، وہ تو تم سے کئی برس بڑا ہے۔ اسے بھائی کہا کرو۔" ماں نے فوراً اسے ایک غلط بات پر ٹوکا۔

"جی اچھا امی بھائی بھی کہہ دیا کروں گی۔ مگر بقول آپ کے ہم نے فاقے بھی کیے مگر کسی کا ایک پیسے کا احسان نہیں لیا۔ مگر۔" مگر ماں نے اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا۔

"اے آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔ کیا میں عنبر کی پڑھائی چھڑوا کر اسے گھر بٹھا لوں۔ یا پھر۔" تو اس کو بھی ماں کی بات قطع کرنی پڑی۔

"نہیں، میرا یہ مطلب تو ہرگز نہیں امی! بلکہ میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ بی۔ اے میں میری فرسٹ ڈویژن آئی ہے اور مجھے کسی دشواری کے بغیر اچھی سے اچھی ملازمت مل سکتی ہے۔" اور خورشید جہاں کو یوں لگا جیسے اس نے ملازمت کی نہیں کسی ڈانسنگ اسکول میں داخلہ لینے کی بات کی ہو۔ وہ تو اچھل ہی پڑیں۔

"اے نوج کیسی ملازمت اور کس کی ملازمت۔ اے میری مرضی کے خلاف لڑکوں کے ساتھ رہ کر پڑھ لکھ لیا کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں ہے جو اب ملازمت کرنے کا شوق چرایا ہے تم کو۔ نہیں نہیں اتنے نامساعد حالات میں تم نے اتنا پڑھ لیا یہی بہت ہے بس اب آرام سے گھر بیٹھو۔" اجازت دینے کے بجائے ماں نے اچھی خاصی اس کی خبر لے ڈالی۔ تو وہ بھی ان کی باتوں سے چڑ کر صاف گوئی پر اُتر آئی۔

"مگر امی آپ مجھے گھر میں بٹھا کر آخر کیا کریں گی۔ اگر میری شادی کرنے کا ارادہ ہے تو یہ بھی سُن لیجیے کہ میں شادی نہ کرنے کا تہیہ کر چکی ہوں۔ اس لیے کسی قیمت پر بھی شادی نہیں کروں گی۔ ہاں اگر آپ مجھے گھر میں رکھ کر سڑانا چاہتی ہیں جیسے کہ اب تک سڑاتی رہی ہیں تو اور بات ہے۔"

وہ شروع ہی سے ضدی اور ہٹ دھرم تھی۔ اور اپنی من مانی کرنے کی تو اس کی پرانی عادت تھی۔ اس کی باتوں سے ماں کو احساس ہوا کہ وہ خود سری پر بھی اُتر آئی ہے تو ایک دم ہی ان کا پارہ چڑھ گیا۔

"اے تم کیا اور تمہاری اوقات کیا اس گمان میں نہ رہنا کہ پڑھ لکھ گئی ہو تو جوتیوں سمیت میری آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کرو گی۔ اس روز بھی میں تمہاری گستاخانہ باتوں پر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی تھی کہ تمہارے دل پر اچانک ہی نسبت ٹوٹ جانے کا صدمہ پڑا ہے مگر اب اگر تم نے بدتمیزی سے بات کی تو میں تمہارے سارے دانت جھاڑ کر رکھ دوں گی۔"

"لیکن امی! میں نے آخر ایسا کیا کہا ہے جو آپ میری باتوں کو گستاخی پر محمول کر رہی ہیں۔" وہ ماں کے اس بُری طرح ڈانٹنے پر روانکھی سی ہو کر بولی۔

"اے لو یعنی کچھ کہا ہی نہیں تم نے۔ لو بھلا غضب خدا کا کنواری لڑکی اور خود اپنے منہ سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ سُنائے۔ یہ سب اسی موئے کالج میں پڑھنے کا نتیجہ ہے جو تمہاری آنکھوں میں اتنی ہوا بھر گئی ہے۔ مگر تمہاری تو آنکھوں کا پانی بھی ڈھل گیا ہے۔ جو اتنی بڑی بات کہتے تمہیں ذرا بھی لاج نہیں آئی۔"

"افوہ امی! اس میں بے حیائی کی بات ہے میں آپ سے اپنے دل کی بات نہ کہوں گی تو کس سے کہوں گی۔" ماں کی ملامت آمیز باتوں پر وہ سچ مچ منہ بسور کر بولی۔ تو اس کی یہ بات کہ میں آپ سے اپنے دل کی بات نہیں کہوں گی تو کس سے کہوں گی خورشید جہاں کے دل کو لگی۔ انہوں نے قدرے نرم پڑ کر کہا۔

"دل کی کیا بات جتانا چاہتی ہو مجھے، یہی نا کہ ریحان نے تم سے بے وفائی کی۔ اور تم اب تک غم پالے بیٹھی ہو۔ اے میں پوچھتی ہوں کہ کیا تم اس نامراد ریحان کا جوگ دے کر بیٹھنا چاہتی ہو جس نے تمہاری پروا کی نہ پُرانے رشتے کو ہی گردانا۔ اور اپنی دنیا الگ بسا کر بیٹھ گیا۔ کمبخت۔ دغاباز نہ لاج کہیں کا۔"

"امی ریحان نے یہ جو کچھ کیا ہے آج کے تقاضوں اور ضرورت کے تحت کیا ہے اس میں ان کا اتنا قصور نہیں۔ بلکہ سارا قصور ہمارے حالات کا ہے جس نے ہمیں کسی قابل ہی نہیں رکھا۔"

"اے لو اس نے تم پر اتنا ظلم توڑا اور تم ہو کہ اب بھی اسی کے گُن گا رہی ہو۔ گویا کہ تمہاری نظر میں یا تو میں قصوروار ہوں یا پھر وہ منوں مٹی تلے دبا تمہارا باپ۔" اس کی اس الزام تراشی پر تو خورشید جہاں کا دل جل کر رہ گیا۔

"نہیں امی! میں آپ کو اور ابا کو بھلا کیوں دوش دینے لگی۔ آپ دونوں تو خود بھی حالات کے ہاتھوں بے بس و مجبور کر رہے ہیں۔" غلط مفہوم لینے پر اس نے ماں کے سامنے فوراً صفائی پیش کی۔

"اے بس رہنے بھی دو۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے، وہ میں خوب جانتی ہوں۔" ماں نے خفگی سے کہا۔

"افوہ امی آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ریحان نے جو کچھ کیا ایک طرح ٹھیک ہی کیا ہے۔ دیکھیے نا۔ وہ حیثیت والے لوگ ہیں ظاہر ہے انہیں اپنی ہی ٹکر کا رشتہ درکار ہو گا۔ یعنی وہ اپنی ہی ٹکر کی لڑکی لائے ہیں۔ ہم اگر ان کی ٹکر کے ہوتے تو وہ ہرگز ہرگز اتنا پُرانا رشتہ توڑنے کی جرأت نہ کرتے۔ آپ بھول گئیں کیا آپ نے ہی تو اس روز عالیہ کے آنے پر کہا تھا کہ ہمیشہ اپنے برابر والوں سے دوستی کرنا چاہیے کیونکہ نچلے لوگوں سے دوستی کر کے انسان پچھتاتا ہے اور اونچے لوگوں سے دوستی کر کے منہ کی کھاتا ہے تو اصل میں تو سارا مسئلہ حیثیت کا ہی ہوتا ہے جس کے سامنے سگے اور خونی رشتوں کا بھی پاس نہیں کیا جاتا۔ اور آپ یہ جس قسم کی باتیں کرتی ہیں نا یہ آج کل محض جذباتی باتیں کہلاتی ہیں جن کا اُلٹا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔" عنبر نے ماں کی باتوں سے زچ ہو کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بیزاری سے بولیں۔

"کیا پتا بچی! مجھے تو میرے بزرگوں نے یہی سکھایا تھا کہ سگے رشتوں کا احترام کروں۔ جبکہ میں تو دور کے رشتوں کو بھی اہمیت دیتی ہوں۔ کہ دم ہی کتنے رہ گئے ہیں اب اور جو چلے گئے ہیں وہ رشتے توڑ کر تو نہیں گئے نا۔ یوں بھی رشتے داری جسم کے اندر پھیلے ہوئے رگوں کے جال کی طرح ہوتی ہے جو دل تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ مگر آج کل تو واقعی خون سفید ہو گئے ہیں۔ جو اپنے ہی بیگانے نظر آتے ہیں۔" خورشید جہاں نے آخری فقرہ بڑی آزردگی سے کہا۔

"امی خون سفید نہیں ہوئے بلکہ حیثیت نے آپس کی محبت کو زنگ آلود کر کے رکھ دیا ہے۔ کیا اپنے کیا پرائے بلکہ پوری دنیا ہی مادہ پرستی کی علت میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اب ماموں جان کو ہی لے لیجیے۔ وہ خود کب ہمارے گھر آتے ہیں ہماری حیثیت کی وجہ سے ہی ہمیشہ مصروفیت کا عذر پیش کر دیتے ہیں جبکہ آپ ان کی اکلوتی بہن ہیں۔" عنبر نے ماں کو قائل کرنے کی غرض سے ماموں کا حوالہ دیا۔

"مگر میں بھی کیا کروں بچی۔ کس طرح اپنی حیثیت بناؤں۔ اپنے حالات سنواروں میں تو گھر میں بیٹھنے والی ایک سیدھی سادی عورت ہوں۔ جسے گھر گرہستی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ ہاں اگر تم کہو تو کسی قابل بننے کے لیے ماماگیری کرنے کسی بڑے گھر میں چلی جایا کروں گی۔" خورشید جہاں نے بیٹی کی باتوں سے زچ ہو کر کہا۔

"ماماگیری کرنے سے عزت بڑھے گی نہ حیثیت بلکہ جتنی باقی رہ گئی ہے وہ بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ پہلے ہی آپ کی سلائی پرائی کے کام کی وجہ سے محلے میں ہماری سبکی ہو رہی ہے آپ سمجھتی ہیں کہ آپ سب سے چوری چھپے یہ کام کرتی ہیں مگر وہاں ایک دنیا اس بات سے واقف ہے اور ہمیں سلائی والی کی اولاد کہا جانے لگا ہے۔ امی اگر ہمارے حالات خراب ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہماری ذہنیتیں بھی خراب ہو جائیں۔ عزت اور غیرت ہی دو چیزیں تو انسان کے پاس اس کا ذاتی اثاثہ ہوتی ہیں اور ہم جیسے مفلسوں کا سرمایہ حیات۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ کہاں سے اتنی ساری دولت سمیٹ کر لاؤں کہ تمہیں کسی بڑے گھرانے میں بیاہنے کے قابل بن سکوں۔" بیٹی کے قائل معقول کرنے سے وہ سچ مچ عاجز آ گئی تھیں۔

"لیکن آپ کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر یہ میری بی۔ اے کی تعلیم کس کام آئے گی اور میں نے بہت پہلے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ گریجویشن کرنے کے بعد ملازمت کروں گی۔" وہ بھی تنگ آ گئی تھی ماں کو سمجھاتے سمجھاتے اس لیے پھر صاف گوئی پر اُتر آئی۔

"ہیں کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کے ارادے سے آگاہ ہو کر وہ ایک دم بگڑ ہی اُٹھیں۔

"مطلب یہی ہے کہ اب میں سروس یعنی ملازمت کروں گی۔" اس نے ان کے بگڑ اُٹھنے کا نوٹس لیے بغیر کہا۔

"اے تو تم اب نوکری کرو گی۔ تم گھر سے باہر نکل کر مردوں کے ساتھ کام کرو گی۔ اے کیا اب یہی کسر رہ گئی ہے۔"

"ہاں تو اس میں کیا مضائقہ ہے امی! جب انسان کام کرنے کی غرض سے گھر سے باہر قدم نکالتا ہے تو اسے باہر کے ماحول سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"ارے بھاڑ میں جائے سمجھوتا وجھوتہ تمہاری آنکھوں میں تو بہت ہی ہوا بھر گئی ہے۔ اے کیا مرے ہوئے باپ کو اب قبر میں بھی چین سے نہیں رہنے دو گی' اس بے چارے نے تو اپنی زندگی میں ایک دن بھی سکھ کا سانس نہیں لیا تھا۔ نہیں، نہیں میں ہرگز ہرگز تمہیں نوکری کرنے کی اجازت نہیں دوں گی' اسے ہاں جو تھوڑی بہت رہ گئی ہے' اسے بھی ختم کر کے رہو گی اور یہ رشتے دار اور ملنے جلنے والے کیا سوچیں گے بھلا۔ کیا اب تمہاری ناک نہیں کٹے گی۔"

"او ہو امی! رشتے داروں کی بھلی پروا کی آپ نے۔ اُنھوں نے اس وقت کیوں کچھ نہ کیا جب ریحان نے اتنی پرانی نسبت چند جملوں میں توڑ کر رکھ دی تھی۔ وہاں تو کوئی پلٹ کر آیا نہ ہمدردی کے دو بول ہی کہے۔ اور ہم کسی کا دیا تو نہیں کھاتے جو یہ ڈر ہو کہ ہمارا دانا پانی بند کر دیا جائے گا۔" عنبر بھی اپنی بات منوانے کی عادی تھی وہ بھی ماں کی ہزار مخالفت کے باوجود اپنے مؤقف پر ڈٹی رہی۔

"خیر، جو کچھ بھی سہی۔ میں تو مر کر بھی تمہیں مردوں کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔" خورشید جہاں نے یہ کہہ کر گویا اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ مگر اس کے باوجود بھی عنبر نے ہمت نہیں ہاری۔

"امی مردوں کے ساتھ کام کرنا کچھ ایسا معیوب تو نہیں آج کل تو سیکڑوں شریف لڑکیاں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ اصل میں تو یہ لڑکی کے اپنے کردار پر منحصر ہوتا ہے۔ اور میں نے تو کالج میں لڑکوں کے ساتھ ہی پڑھا ہے کیا کبھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے میں نے۔ یا آپ کو کسی شکایت کا موقع دیا ہے۔"

"نہیں تم پر تو مجھے پورا اعتماد ہے۔ لیکن دفتروں میں کام کرنے کی بات اور ہی ہوتی ہے تم ابھی زمانے کی اُونچ نیچ سے واقف نہیں ہو۔ لیکن میں تو اچھی طرح واقف ہوں۔"

"اگر واقف نہیں بھی ہوں امی تو کم از کم اپنے بھلے بُرے میں تمیز کرنے کی صلاحیت تو رکھتی ہوں۔ آپ ان خدشات کو دل سے نکال دیجیے۔"

ماں کو سمجھاتے سمجھاتے وہ تھک گئی تھی۔ اس لیے عاجزانہ سے انداز میں بولی۔

اسی اثنا میں چھوٹی جو پڑوس میں ٹیوشن پڑھانے گئی ہوئی تھی واپس آ گئی تھی۔ اس نے ماں کے مسلسل انکار پر بہن کو اس قدر جھنجنا دیکھ کر کہا۔

"لیکن امی! کوئی ضروری تو نہیں کہ آپا کسی دفتر میں مردوں کے ساتھ ہی کام کریں۔ یہ کسی اسکول میں بھی ملازمت کر سکتی ہیں معلم کا پیشہ تو بہت معزز ہوتا ہے۔ اور آج کل تو یوں بھی پرائیویٹ اسکولوں میں فیس کے بہانے دونوں دونوں ہاتھوں سے والدین کو لُوٹا جا رہا ہے۔ پرائیویٹ اسکولوں کی استانیوں کو تنخواہیں بھی معقول ہی دی جاتی ہیں۔ کم از کم بارہ پندرہ سو تو مل ہی جایا کریں گے آپا کو۔"

"ہونہہ! بارہ پندرہ سو۔ مصیبت کہیں کی ہمیشہ پھنسوانے کے چکر میں ہی رہتی ہے۔" عنبر چھوٹی کی اسکول میں ملازمت کی تجویز پیش کرنے پر جزبز سی ہو کر دل ہی دل میں اسے بُرا بھلا کہنے لگی کیونکہ وہ تو چار پانچ ہزار کی ملازمت کے خواب دیکھ رہی تھی۔

"ٹھیک اٹ ایزی آپا۔" چھوٹی نے اس کے تیور بھانپ کر کہا۔ تو اس نے بھی سوچا کہ چلو اسی طریقے سے کسی طرح ملازمت کرنے کی اجازت تو مل جائے پھر بعد میں دیکھا جائے گا۔

"خیر دیکھا جائے گا۔ ابھی ایسی کیا جلدی ہے۔" خورشید جہاں خود بھی اس موضوع سے اُکتا گئی تھیں اس لیے انہوں نے اس موضوع کو ٹالنا چاہا۔

"لیجیے، جلدی کیسے نہیں ہے۔ کوئی معلمہ کی ملازمت اسکول کے گیٹ پر تو نہیں بکتی امی جو آپا اسے کھڑے کھڑے خرید لیں گی بلکہ پہلے درخواست دینی ہو گی۔ پھر کافی دن تک جواب کا انتظار کرنا ہو گا اس کے بعد انٹرویو لیٹر آئے گا جس دن کے لیے ہو گا اب اس میں خواہ پندرہ روز ہی کیوں نہ لگیں۔ انٹرویو دینے انہیں پندرہ روز بعد ہی جانا پڑے گا۔ پھر اگر اس انٹرویو میں کامیاب ہو گئیں تب کہیں جا کر انہیں ملازمت مل سکے گی۔ اور آج کل تو اس کے بھی چانسز کم ہوتے ہیں کیونکہ ایک سے ایک قابل لڑکی درخواست دہندگان میں شامل ہوتی ہے۔" چھوٹی نے درخواست گزاری کے سلسلے

میں اُٹھائی جانے والی دشواریوں کا نقشہ کھینچا۔

"ارے تو کیا لاٹری کے ٹکٹ کا نمبر ہوتا ہے جو قسمت سے ہی نکلتا ہے۔" خورشید جہاں نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں کچھ ایسا ہی حساب کتاب ہوتا ہے امی۔ اور اسی حساب کتاب میں ملازمت ملنے میں دو تین مہینے لگ جاتے ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں کہ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" چھوٹی نے سمجھا کر کہا تو خورشید جہاں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔

"اچھا خیر، درخواست دینے میں تو کوئی حرج نہیں جب جی چاہے دے سکتی ہو۔" تو چھوٹی نے اس مبہم سے جواب پر بھی خوش ہو کر بہن سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"ہرّاہ آپا آپ جیت گئیں۔"

مگر اجازت ملنے کے باوجود بھی عنبر کے چہرے پر رونق نہیں آئی تھی۔ کیونکہ وہ شروع ہی سے اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ گریجویشن کی ڈگری پر اسے کوئی بہت ہی بڑی پوسٹ مل سکتی ہے۔ اور ٹیچنگ کا تو اس نے کبھی بھول کر بھی نہ سوچا تھا۔ اب چھوٹی نے ماں کے سامنے اسکول میں معلمہ کی ملازمت کرنے کا کہہ کر اسے خوامخواہ ہی پھنسوا دیا تھا۔ مگر چھوٹی کا کہنا تھا کہ آپ ان باتوں کی پروا نہ کیجیے بس ایک مرتبہ اجازت ملنی شرط تھی سو وہ مل گئی ہے خواہ ٹیچنگ کے لیے ہی ملی ہے' یوں بھی امی کو دکھانے کے لیے آپ کچھ عرصے یہ پڑھانے کا کام ہی کر لیں۔ اس کے بعد آپ جو ملازمت بھی چاہیں کر لیجیے گا۔"

جب سے عنبر کے امتحانات ختم ہوئے تھے سعد نے آنا جانا تو کم کر دیا تھا مگر جس دن اس کا رزلٹ آیا تھا اور باتوں ہی باتوں میں بدمزگی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے تو سعد صرف ایک دو مرتبہ ہی آیا تھا وہ بھی کھڑے کھڑے کہ اسے خبر تک نہیں ہوئی تھی وہ کب آیا اور کب گیا تھا۔ اصل میں اس قدر جلد واپسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں مرتبہ خورشید جہاں محلے میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھیں اس لیے اس کی ملاقات ان سے نہ ہو سکی تھی۔

نامعلوم سچّی انسیت تھی یا جھوٹی۔ لیکن وہ انہیں پسند ہی نہیں کرتا تھا بلکہ انہیں حد درجے عزیز رکھتا تھا۔ اور اس روز کافی دن بعد ان کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ اور یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ اس روز بھی خورشید جہاں بھائی کی عیادت کو گئی ہوئی تھیں جو شہید ملت روڈ پر رہتے تھے۔

اس سمے وہ برآمدے میں تخت پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ عذیرا اسکول گیا ہوا تھا۔ اور چھوٹی باہر صحن میں رکھی بالٹی میں دھونے کی غرض سے اپنے کپڑے بھگو رہی تھی کہ اچانک وہ آوارد ہوا۔ اور تخت کے پاس ہی پڑے مونڈھے پر بیٹھ گیا تھا اور بیٹھا بھی تھا تو دروازے کے آگے کہ وہ اُٹھ کر اندر بھی نہ جا سکی تھی۔ بس چہرہ جھکائے ہر بات سے لاتعلق سی سبزی کاٹنے میں مصروف رہی تھی۔ ادھر چھوٹی تھی کپڑے وپڑے چھوڑ چھاڑ اس کے پاس آ بیٹھی تھی اور اس سے باتیں مٹھارے جا رہی تھی۔ وہ بھی چٹکلے چھوڑ چھوڑ کر اسے ہنسا رہا تھا چھوٹی چاہ رہی تھی کہ وہ بھی اس کی اور سعد کی باتوں میں حصہ لے، ہنسے بولے مگر وہ بہری اور گونگی سی بنی سبزی کترنے میں مصروف تھی۔ چھوٹی کو اس کا یوں منہ پھُلا کر بیٹھنا ذرا نہ بھایا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ وہ سعد کو سخت ناپسند کرتی ہے اور اس سے سخت خار کھاتی ہے۔ اور اسے سعد کا اپنے یہاں آنا۔ ذرا اچھا نہیں لگتا۔ اور بہن کی اس ناپسندیدگی کو وہ للّٰہی بغض سے ہی تعبیر کرتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ بڑی بہن کے غیر اخلاقانہ رویّے سے چڑ سی گئی۔ چنانچہ اس نے دانستہ موضوعِ سخن اس کی طرف پھیرا۔

"کچھ معلوم بھی ہے سعد بھائی! یہ ہماری آپا صاحبہ ملازمت کرنے کے لیے پر تول رہی ہیں۔" اس نے عنبر کو چڑانے کی غرض سے سعد کو مخاطب کر کے بتایا تو اس کی اس حرکت پر اس نے چھوٹی کو دل ہی دل میں کوسا اور تنک کر بولی۔

"ہاں اگر پر بھی تول رہی ہوں تو تجھے کسی کا ڈر پڑا ہے کیا جو تم یوں ہر کسی کو بتا کر ڈھنڈورا پیٹ رہی ہو۔"

"ارے نہیں۔ ڈھنڈورا پیٹنا کیسا، مجھے تو اُلٹی خوشی ہوئی ہے یہ سُن کر کہ آپ سروس کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔" سعد خوش دلی سے بولا۔

"یہ پھوپھو جان آخر کب تک آئیں گی؟" اس نے چھوٹی سے پوچھا۔

"کہہ کر تو یہی گئی تھیں کہ دو تین گھنٹے تک آجاؤں گی مگر اب تو سارا دن ہی گزر گیا میرے خیال میں تو اب آتی ہی ہوں گی۔ کیونکہ اتنی دیر تک وہ ہمیں اکیلا چھوڑتی ہی نہیں۔ ویسے آپ کے لیے چائے لاؤں یا ٹھنڈا" چھوٹی نے اس کے سوال کا جواب دے کر پوچھا۔

"ارے نہیں! ابھی چائے پی کر ہی آ رہا ہوں۔ بس اب چلوں گا۔" وہ سچ مچ جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے آپ تو کھڑے بھی ہو گئے۔ آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ امی بھی بس آتی ہی ہوں گی، ان سے مل کر ہی جائیے گا بڑا یاد کر رہی تھیں آپ کو۔" چھوٹی نے اُسے جانے کے لیے پر تولتا دیکھ کر جلدی سے کہا۔

"ان سے پھر کسی دن مل لوں گا اس وقت تو ایک بہت ضروری کام سے بندر روڈ جانا ہے۔" اس نے عجلت دکھاتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے، یہ آپ لوگوں کو اتنی جلدی کس بات کی ہوتی ہے، جسے دیکھو یہی کہتا ہے کہ بس ایک ضروری کام سے جانا ہے، اس لیے خدا حافظ۔" چھوٹی نے ہنس کر ذومعنی سی بات کہی۔

"بھئی، اوروں کی تو بات دوسری ہی ہے مگر مجھے تو واقعی ایک ضروری کام ہے، اصل میں وہ میں نے موٹر بائیک خریدی ہے نا۔"

"اچھا آپ نے موٹر بائیک خریدی ہے چلیں کم از کم اس طرح جمبو جیٹ سے تو نجات ملی جو سارے محلّے کو ہلا کر رکھ دیتی تھی۔" چھوٹی نے بائیک خریدنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی، ہم تو سادہ منش آدمی ہیں۔ بس جو بھی مل جائے اس پر شکر کر کے گزارہ کر لیتے ہیں۔" سعد بولا تو چھوٹی نے نہایت بے ساختگی سے ہنس کر کہا۔

"واہ یہ سادہ منش آدمی کیا ہوتا ہے؟"

"بھئی جیسے آزاد منش۔ ویسے ہی سادہ منش۔ بھلا اس میں اس قدر ہنسنے کی کیا بات ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"ہاں ہر بات میں ایک نئی اصطلاح کرنا تو آپ کا خاصہ ہے۔ وہ ریحان بھائی کو ریحان شاہنواز کہنے کے بجائے آپ ریحان الدین حسن بھی تو کہا کرتے تھے نا۔"

"ہاں بھئی، اپنی تو یہ کچھ عادت ہی ہے۔ ہر بات میں ندرت پیدا کرنا۔ اچھا اب باقی آیندہ اور خدا حافظ۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"او۔کے سولانگ۔" چھوٹی بولی تو اس کے سولانگ کہنے پر سعد نے مسکرا کر عنبر کی طرف دیکھا مگر وہ نگاہیں جھکائے ——— ترکاری کو مزید باریک کرتی رہی۔ تب وہ خود ہی اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سنیں عنبر۔ اگر آپ کسی فرم وغیرہ میں سروس کرنا چاہتی ہیں تو پہلے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ ضرور سیکھ لیں، کیونکہ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھے بغیر اگر کسی فرم میں ملازمت ملتی ہے تو وہ کلریکل جاب سے بھی کم تر ہوتی ہے۔ اچھا ——— خدا حافظ۔" اور پھر وہ اس کا جواب سنے بغیر صحن پار کر کے عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔

عنبر کو اس کے بار بار مشورہ دینے سے زیادہ اس کی ڈھٹائی پر غصّہ آیا کہ وہ اس کے جھڑک دینے کے باوجود بھی اس کے معاملے میں ٹانگ اڑائے جا رہا تھا۔ لیکن ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ سیکھنے کا مشورہ اسے عالیہ نے بھی دیا تھا اس لیے وہ اپنے غصّے کو پی گئی، جب کہ یہ سوچ سوچ کر اسے افسوس سا ہونے لگا کہ اسے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کا مشورہ دینے پر اس نے سعد سے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ آپ اب کہہ رہے ہیں، میں تو بہت پہلے سے ہی سیکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ کیونکہ اب میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپ سیکھوں گی تو وہ یہی سمجھے گا کہ میں نے اس کے مشورے کے مطابق عمل کیا ہے۔ اصل میں تو وہ سعد کے کسی مشورے پر عمل کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی تھی۔ اس پر اسے رہ رہ کر چھوٹی پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اس نے اس کے سروس کرنے کے ارادے کو سعد پر کیوں ظاہر کیا۔ حتیٰ کہ یہ تک بتا دیا کہ امی اسے مردوں کے ساتھ کام کرنے کی اجازت کیوں نہیں دے رہیں۔

وہ اس معاملے میں چھوٹی سے بازپرس کرنا ہی چاہ رہی تھی کہ چھوٹی نے جو سعد کے ساتھ اس کے توہین آمیز رویّے پر اندر ہی اندر ہی پیچ و تاب کھا رہی تھی ملامت بھرے انداز میں کہا۔

"ہاں اور معلوم بھی ہے، امی تو کسی طرح اجازت ہی نہیں دے رہی تھیں آپا کو سروس کرنے کی، وہ تو میں نے ہی بہت کہہ سُن کر امی کو راضی کیا تب کہیں جا کر انہوں نے اجازت دی۔" چھوٹی اپنی کارکردگی کا سکّہ جمانے کی غرض سے بولی۔

"مگر کیوں آخر کس وجہ سے پھوپھو جان اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ جبکہ آج کل تو ہر خاص و عام اپنی تعلیم کا مصرف ملازمت کر کے ہی نکال رہا ہے۔" سعد نے اس کے لمحہ لمحہ بگڑتے تیور دیکھ کر پوچھا۔

"اس لیے کہ انہیں یہ بالکل گوارا نہیں کہ آپا گھر سے نکل کر مردوں کے ساتھ کام کریں۔" چھوٹی نے بتایا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ مگر کیا ضروری ہے کہ مردوں کے ساتھ ہی کام کیا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ اسکول میں بھی تو ملازمت کی جا سکتی ہے ٹیچنگ کا پیشہ بہت شریفانہ اور ریسپیکٹ ایبل ہوتا ہے۔" سعد نے گویا اپنی رائے پیش کی۔

"جی ہاں بہت ریسپیکٹ ایبل ہوتا ہے کہ پڑھاتے پڑھاتے کمر جھک جائے، بالوں میں سفیدی آجائے مگر تنخواہ وہی بارہ پندرہ سو سے آگے نہیں بڑھتی۔ میں تو اس پیشے کو کلرکی سے بھی بدتر سمجھتی ہوں۔" وہ تنک کر بولی۔

"خیر یہ تو اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے ورنہ اس پیشے میں تو انسان عزّت کا تحفظ ملنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی نگاہوں میں محترم بھی ہو جاتا ہے۔" سعد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"آپ کے قیمتی مشورے کا بے حد شکریہ لیکن میں اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی خود ہی مجاز ہوں۔ اس لیے جو بھی کروں گی اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق ہی کروں گی۔"

اس روز اتنے عرصے میں پہلی بار یعنی جب سے وہ اس سے ملا تھا عنبر نے اس سے کچھ کھل کر گفتگو کی تھی جس پر اسے حیرت آمیز مسرت سی ہوئی۔ یوں بھی اس روز وہ اسے دیکھ کر بھاگی نہیں تھی بلکہ اپنی جگہ پر بیٹھی چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی تھی۔ ورنہ جب سے ریحان کی زبانی اس نے اپنے بارے میں اس کے خیالات سُنے تھے وہ اس سے قدرے بددل سا ہو گیا تھا۔ اور اس کے یہاں آمد و رفت بھی کم کر دی تھی۔

"کمال ہے آپا! یوں تو آپ بات بات میں بڑے مینرز اور ایٹی کیٹس کے ڈوز پلاتی ہیں لیکن اس وقت تو سعد بھائی کے ساتھ آپ نے کچھ ایسا مظاہرہ کیا ہے جیسے یہ ساری چیزیں آپ کو چھو کر نہ گزری ہوں۔ پتا نہیں آپ کو سعد بھائی سے ایسی کیا پرخاش ہے۔ کیا بگاڑا ہے ان بے چارے نے آپ کا۔ کچھ پتا بھی ہے آپ کی وجہ سے وہ کتنا لڑے ہیں ریحان بھائی سے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس چھچھورے اور لالچی انسان سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا ہے۔" چھوٹی کے طرزِ تخاطب نے تو عنبر کو کھولا کر رکھ دیا تھا۔ پھر بھی وہ انتہائی ضبط سے کام لے کر بولی۔

"کیوں بھئی، کیوں لڑا یہ شخص ریحان سے اور کیوں ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ بھلا کیا انٹرسٹ تھا اسے میرے اور ریحان کے معاملے سے؟ یہی نا کہ وہ اپنے نمبر بڑھوانا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ ایسی خوشامدانہ باتیں کر کے میری نظروں میں آجائے یعنی دل پر چڑھ جائے۔ مگر یو نو ہاؤ مچ آئی ہیٹ ہم (مگر تم جانتی ہو میں اس سے کتنی نفرت کرتی ہوں) میں تو کبھی اسے منہ بھی نہیں لگاؤں گی۔"

"واہ واہ آپا، کس قدر اعلیٰ اور ارفع خیالات ہیں آپ کے سعد بھائی کے بارے میں لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ آپ خود کیا ہیں یا آپ کے اندر چند خوبیاں بھی موجود ہیں تو ہماری مفلسی نے تو ہماری خوبیوں کو بھی زنگ آلود کر دیا ہے آپا۔ پھر بھلا سعد بھائی کو ایسا کیا انٹرسٹ یا لالچ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ان کی شرافت اور خلوص کا ایک ثبوت ہے کہ ریحان بھائی کے ایک انتہائی غلط اقدام پر وہ ان سے جھگڑا کر بیٹھے۔" چھوٹی بہن کے سفلہ سے خیالات پر چمک کر بولی۔

"خیر اگر جھگڑا بھی کر بیٹھے ہیں تو میں نے تو ان کے آگے ہاتھ پیر نہیں جوڑے تھے کہ جاؤ ریحان سے دست بہ گریبان ہو جاؤ۔ بس اب زیادہ میرے کان نہ کھاؤ۔ تم کو تو امی کی طرح نہ معلوم اس نے کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ ہر وقت اس کی تعریفوں میں رطب اللسان رہتی ہو۔ مگر — مگر میں تو اس کا ذکر بھی سننا پسند نہیں کرتی۔" اس نے تخت سے اٹھتے ہوئے نہایت ناگواری سے کہا۔

"ٹھیک ہے آپا! آپ پسند نہیں کرتیں تو مجھے کیا پڑی ہے کچھ کہنے کی۔ میں تو سعد بھائی کے ساتھ آپ کا غیر روادارانہ رویہ دیکھ کر آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آخر آپ کو ان سے ایسی کیا پرخاش ہے۔ کیا انہوں نے آپ کی فیلنگس کو ہرٹ کیا ہے یا آپ کو کوئی آزار پہنچایا ہے۔" چھوٹی نے خود بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا تعلق ہے تمہارا اس سے؟ کوئی وہ تمہاری سگی کوکھ کا تو نہیں ہے جو تم اس کے لیے مری جا رہی ہو۔ بے غیرت کہیں کی۔" عنبر نے جس معنی خیزی سے یہ آخری فقرہ کہا تو اس کے سفلہ سے خیالات پر ایک لمحے کو تو چھوٹی ششدر سی رہ گئی۔ پھر اس نے بڑے طیش کے عالم میں اس سے کہا۔

"آپا! بڑے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ بلا سوچے سمجھے جو منہ میں آیا چھوٹے کو کہہ دیا۔ اب آپ نے منہ کھولنے پر مجھے مجبور کر دیا ہے تو میں یہی کہوں گی کہ بے غیرت میں نہیں بلکہ آپ کی سوچ ہے۔ آپ کے اندر رشتوں کی پہچان کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ جب کہ ایک مرتبہ پہلے بھی آپ کو —" مگر چھوٹی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکی۔ کیونکہ عنبر کی سوچ کو بے غیرت کہنے کے نتیجے میں عنبر نے سخت غصے کے عالم میں ٹرے میں رکھی پیاز کی گٹھی اسے کھینچ ماری جو پوری قوت سے اس کی ہنسلی پر جا کر لگی اور ساتھ ہی غصے میں اسے گالیاں دیتے ہوئے اس نے سعد کے ساتھ تعلق کا الزام اس پر لگا دیا۔ عنبر کی غصے میں پھینکی ہوئی پیاز سے اتنی چوٹ نہیں لگی جتنی کہ ان رکیک باتوں سے جو ترکش سے نکلے ہوئے تیر کی طرح عین اس کے دل میں جا کر پیوست ہو گئیں۔ اتنے گھناؤنے الزام نے اسے بھی غصے سے بے قابو کر دیا۔ اپنی تکلیف بھول کر اس نے فرش پر گری ہوئی پیاز کی وہی گٹھی اٹھائی اور اسے عنبر پر کھینچ مارنے کی پوزیشن لے کر بڑے غضبناک لہجے میں بولی۔

"آپا۔ یہ آپ کی پھینکی ہوئی پیاز کی گٹھی اگر میرے دل میں سوراخ بھی ڈال دیتی تو میں اس اذیت کو بھی چپ چاپ سہہ لیتی مگر اس کے ساتھ آپ نے جو غلیظ اور بے ہودہ باتیں کی ہیں میں ان کے جواب میں آپ کے سارے دانت حلق میں گھسا سکتی ہوں۔" اور ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ خورشید جہاں جو بیٹھک کا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے اندر آگئی تھیں انہوں نے نہ صرف اس کا آخری فقرہ سن لیا بلکہ اسے پیاز کی گٹھی سمیت ہاتھ اٹھائے بھی دیکھ لیا۔ پھر انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ صرف اس جرم میں کہ چھوٹی خورد ہو کر بڑی بہن سے اتنے گستاخانہ لہجے میں بات کر رہی ہے اس پر پیاز کی گٹھی سے اس کا نشانہ بھی کھڑی ہے

انہوں نے برقع ایک طرف پھینک کر چھوٹی کے نازک سے رخساروں پر تڑاخ تڑاخ کئی تھپڑ جڑ دیے۔ اور اس کے ساتھ درمیانے درجے کی گالیوں سے بھی اسے نوازتی رہیں۔

"یہ تو نے بڑی بہن پہ ہاتھ کیسے اٹھایا۔ تیری جرأت کیسے ہوئی۔ لے تو اس کے دانت حلق میں گھسا دے گی اور اس سے پہلے میں یہ تیرا سارا جبڑا توڑ کر باہر نکال پھینکوں گی۔ آخر تو سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔" آخری لفظ کے ساتھ انہوں نے اپنا ہاتھ روکا تو چھوٹی جو چپ چاپ اور ساکت سی کھڑی مار کھا رہی تھی تکلیف کا اظہار کرنے یا رونے کے بجائے اس نے تن کر کہا

"ہاں ہاں مار لیں امی مجھے جتنا دل چاہیں مار لیں مگر اپنی ان لاڈلی بیٹی کو منع کر دیں کہ یہ مجھ پر اتنے گھناؤنے الزامات نہ لگائیں ورنہ میں کسی کا بھی لحاظ نہیں کروں گی۔"

چھوٹی نے نہ صرف تن کر یہ بات کہی تھی بلکہ اس کی آواز اتنی اونچی ہو گئی تھی کہ پڑوس میں بھی آسانی سے سنی جا سکتی تھی۔ خورشید جہاں بھی اس کی اس بات اور انداز پر چونک سی اٹھی تھیں کیونکہ وہ انہی کی اولاد تھی اور وہ اس کے رگ و ریشے سے واقف تھیں۔ یوں بھی چھوٹی نے اپنی پوری زندگی میں ان تیوروں اور اس انداز کے ساتھ ان سے بات نہیں کی تھی اور اسی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ عنبر نے دیکھا کہ صورتِ حال نازک ہو چلی ہے اور اب چھوٹی ماں کو اصل بات سے آگاہ کر دے گی تو اس نے جلدی سے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"چھوڑیں امی آپ اپنا دل نہ جلائیں، یہ تو یونہی بکتی رہتی ہے۔ سارے دن کے بعد آئی ہیں تو۔" مگر خورشید جہاں پر ابھی تک غصہ سوار تھا۔ وہ عنبر کا ہاتھ جھٹک کر بولیں۔

"اے کیا بکتی رہتی ہے یہ اور تم نے اسے ایسا کیا کہہ دیا جو مرنے مارنے پر تیار ہو گئی۔"

"کچھ نہیں امی! یہ ہم دونوں کی آپس کی بات ہے۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" عنبر نے اس ڈر سے کہ اصل بات سے آگاہ ہو کر کہیں ماں اپنا بقایا غصہ اس پر منتقل نہ کر دیں چھوٹی کی طرف بڑی لگانگت سے دیکھ کر کہا۔ تو چھوٹی غصے میں نتھنے پھڑکا کر بولی۔

"نہیں، یہ ہماری آپس کی بات نہیں ہے امی! آپ ہی بتلایئے میں نے کون سا ایسا کام کیا ہے۔ آپا کو جرأت کیسے ہوئی ایسی رکیک باتیں کرنے کی۔ اس پر میرے سینے پر پیاز کی ڈلی بھی کھینچ ماری۔ آپ نے تو کبھی مجھے انگلی بھی نہیں چھوائی امی مگر یہ نہ معلوم خود کو کیا سمجھتی ہیں۔ میں ان کی اتنی غلیظ باتوں پر ہی تو غصے سے بے قابو ہو گئی تھی۔"

یہ کہتے کہتے چھوٹی کا گلا رندھ گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی اور ماں جو چھوٹی کی فطرت اور مزاج سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے پہلے ہی تاڑ گئی تھیں کہ معاملے کی نوعیت کچھ اور رہی ہے ان کا دل بلاقصور تھپڑ مارنے پر کٹ کر رہ گیا۔

"دیکھا امی اس کی چالاکی۔ اب یہ ٹسوے بہا کر آپ کو ڈرائے گی۔" عنبر اپنی خیر منانے کی غرض سے بولی۔

"ڈرائے گی کی بچی۔ تو یہ بتا کہ تو نے آخر ایسا کیا کہا تھا۔ کون سا الزام لگایا تھا اس پر اور پیاز کی گٹھی اس کے سینے پر کیوں ماری تھی۔ اگر بڑی ہے تو اپنی اوقات میں رہا کر۔ چھوٹوں کا لحاظ نہیں کرے گی تو یہ بھی جوتی لے کر چڑھا کریں گے تیرے سر پر۔"

انہوں نے غصے میں اس کی چوٹی کھینچ کر کہا۔ تو عنبر بھیں بھیں کر کے رونے لگی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لیکن خورشید جہاں نے اس کی گریہ وزاری کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ انہیں افسوس ہی نہیں چھوٹی کو بلاقصور مار کر اور گالیاں دے کر سخت پچھتاوا ہو رہا تھا۔ کم حیثیت ضرور تھیں مگر ان کے گھر میں گالی گلوچ کرنے کا رواج نہ تھا اور پھر انہوں نے چھوٹی ہی کیا اپنی کسی اولاد کو بھی آج تک انگلی نہیں چھوائی تھی۔ ان کا دل بھرا چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے رندھی رندھی آواز میں چھوٹی سے کہا۔

"چلو جاؤ، منہ دھو کر آؤ۔ ارے میں تو پہلے ہی حالات کی ستائی مصیبت کی ماری عورت ہوں کیسے کیسے جتن کر کے مجھ بیوہ عورت نے تم بچوں کو پالا ہے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ میں نے اپنا پیٹ کاٹ کر تمہیں کھلایا پلایا ہے اور تم ہو کہ آپس میں لڑے مرتے ہو۔ اے تم بہنوں سے تو بہتر میرا عذیر ہی ہے جو میرے دکھ درد کا کتنا خیال رکھتا ہے۔" انہوں نے اپنی زیادتی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے وہی جذباتی سی گفتگو شروع کر دی جو بعض مائیں خود کو بے بس اور حالات سے متاثر ظاہر کرنے کی غرض سے اپنی سرکش اولاد کے سامنے کرتی ہیں۔ مگر چھوٹی پر ان کی باتوں کا ذرّہ برابر اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی اکڑے اکڑے انداز میں بولی۔

"نہیں امی۔ میری کسی سے لڑنے مرنے کی عادت نہیں ہے اور آپ بات کو گھمانے کی کوشش نہ کیجیے۔ میں آج آپ سے اس بات کا فیصلہ کرا کے رہوں گی، ورنہ آپا نے آج تو محض زبانی یہ تہمتیں لگائی ہیں، کل سچ مچ ہی کوئی ثبوت فراہم کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیں گی۔ میں ان کی خصلت سے اب اچھی طرح واقف ہو گئی ہوں۔"

"ارے تو اتنی دیر سے میں اور کیا پوچھ رہی ہوں۔ آخر اس نے ایسا کیا کہہ دیا تجھے؟" خورشید جہاں نے غصے میں چیخ کر پوچھا۔

"کیا نہیں کہہ دیا انہوں نے مجھے۔ اس روز کہا تھا کہ میں راہ چلتوں سے دوستی گانٹھ لیتی ہوں۔ پھر کہا کہ سعد کی اتنی تعریفیں کیوں کرتی ہو۔ کیا تمہارا دل تو نہیں آگیا اس پہ۔ اور آج یہ کہا کہ وہ میرے ---- ہیں۔ میں آپ کی نظروں میں دھول جھونک کے ان سے پینگیں بڑھا رہی ہوں۔ جب کہ خدا گواہ ہے امی میں سعد بھائی کو اپنا سگا بھائی سمجھتی ہوں اور ایسی گمراہ کن باتوں کا مجھ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ مگر آپا نے تو آج مجھے خوب گالیاں بھی دیں اور غصے میں پیاز کی گٹھی بھی دے ماری۔ امی وہ گٹھی مار دیتیں تو بھی کوئی بات نہ ہوتی مگر۔ مگر" چھوٹی پھر رونے لگی۔

"مگر سعد کا ذکر کیسے نکلا۔ کیا وہ آج یہاں آیا تھا؟" ماں نے چھوٹی کے رونے پر دل ہی دل میں کڑھ کر پوچھا۔

"ہاں وہی تو آئے تھے آپ سے ملنے۔" پھر چھوٹی نے انہیں سسکیوں کے درمیان ساری بات بتائی۔

"ہوں تو یہ بات تھی۔ اصل میں میں اس وقت آئی تھی جب تو ہاتھ میں پیاز کی گٹھی لیے اسے دھمکا رہی تھی اس لیے میں کچھ اور ہی سمجھی اور میں نے بلاقصور ہی تجھے طمانچے مار دیے۔ خیر میری بچی تو یتیم ہے اور میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے۔" اپنی بات کہتے کہتے خورشید جہاں کا دل بھر آیا۔

"نہیں نہیں امی۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ خدارا مجھے گناہگار تو نہ کیجیے۔ میری بھلا کیا اوقات جو میں آپ کو معاف کروں۔ آپ تو میری ماں ہیں۔ آپ تو بلاقصور بھی میری کھال اتار سکتی ہیں۔ سچ امی میں تو بالکل برا نہیں مانی بالکل بھی نہیں۔"

اتنا کہہ کر چھوٹی ان سے لپٹ گئی۔ کچھ دیر دونوں ماں بیٹیاں اشکوں کے ذریعے اپنا اپنا غم ہلکا کرتی رہیں۔ پھر ان سے الگ ہو کر چھوٹی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"امی اب آپ آپا کو کچھ نہ کہیے گا کیونکہ میرے (آپ کو) یہ کہیں میں نے اور آپ نے یہ جتنا کہہ لیا ہے وہی ان کے لیے بہت ہے۔ پلیز میری اچھی امی۔" مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑی آنسو پونچھتی رہیں۔

"آپ ہی سوچیں امی آپا کس قدر ذہنی اور قلبی اذیت میں مبتلا ہیں۔ جو ظلم ان پر توڑا گیا ہے اسے برداشت کر لینا کوئی اتنا آسان تو نہیں امی۔ اور پھر وہ بڑی بیٹی ہیں آپ کی اور وہ بہت خوددار بھی ہیں۔ پلیز امی۔" چھوٹی نے پھر ملتجی سے لہجے میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس لڑکی کو سعد سے کیوں اتنا بیر ہے۔ مجھ سے بھی ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ اسے گھر میں نہ آنے دیا کروں۔ حالانکہ وہ اپنے سگوں سے بھی کہیں اچھا ہے۔" خورشید جہاں نے چھوٹی کی بات مانتے ہوئے سوچنے کے سے انداز میں کہا۔

"امی۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ریحان بھائی نے جب نسبت توڑی تھی تو آپا کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ سعد بھائی سے شادی کر لیں۔" چھوٹی نے آہستہ سے ماں کے کان کے قریب منہ لے جا کر بتایا۔

"اچھا۔" چھوٹی کی بات سن کر اچانک ہی ان کی آنکھوں کے سامنے ایک جھماکا سا ہوا اور وہ کسی خیال میں کھوئی کھوئی سی بولیں۔

"مگر یہ تو اب کی بات ہے۔ عنبر تو شروع ہی سے سعد کو ناپسند کرتی ہے۔ اسے تو میرا اس سے ملنا اور گھر بلانا بھی بہت کھلا تھا۔ وہ تو باقاعدہ مجھ سے لڑی تھی اس بات پر۔"

"امی وہ کمپلیکسڈ یعنی احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی تھیں ایک دم کیونکہ سعد بھائی سے آپ کا تعارف تایا ابو کے ہاں ہوا تھا۔ اور ظاہر تھا کہ تایا ابو کے گھر اور حیثیت اور ہمارے گھر اور حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جبکہ آپا اس گھر کی ہونے والی بڑی بہو تصور کی جاتی تھیں، اسی لیے وہ سعد بھائی سے خار کھانے لگی تھیں کہ وہ ہماری غربت کا تماشہ دیکھنے ہمارے گھر کیوں آئے ہیں۔" چھوٹی نے وہ گتھی جسے وہ سلجھانے میں کوشاں تھیں اصل بات بتا کر بڑی آسانی سے سلجھا دی۔

"اچھا تمہیں کیسے معلوم ہوا یہ ---؟" انہوں نے قدرے تحیّر سے پوچھا۔

"امی یہ آپ کی چھوٹی ہے نا، یہ مس فرحین شہباز اسے اس کے کالج میں ٹیلنٹڈ (TALENTED) کہا جاتا ہے میرا مطلب ہے غیر معمولی صلاحیت کی مالک۔ تو میں نے اپنی معاملہ فہمی کی فطری صلاحیت سے کام لے کر یہ سب معلوم کیا ہے۔" چھوٹی نے سینہ پھلا کر اتنے شوخی آمیز فخر سے کہا کہ سخت غصے اور کوفت میں ہونے کے باوجود خورشید جہاں کو ہنسی آگئی۔

"ہاں ماشاء اللہ ماشاء اللہ خدا تمہاری صلاحیتوں میں مزید اضافہ کرے اور تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ چلو اب تو منہ دھو لو اور ہاں بیٹھک میں بڑا ناشتے دان رکھا ہے۔ تمہارے ماموں جان کے نواسے کی سالگرہ تھی آج۔ وہاں سے حصہ آیا تھا تمہاری مامی نے تم بچوں کا حصہ بھی بھیج دیا۔"

"واہ یہ تو بڑا اچھا ہوا امی ورنہ آج رات کے کھانے پر تو مونگ کی پھریری دال ہی کھانی پڑتی۔" ان کے بتانے پر چھوٹی نے خوش ہو کر کہا اور پھر غسلخانے کا رخ کرنے کے بجائے بھاگ کر بیٹھک میں چلی گئی۔

پھر کئی روز تک دونوں بہنوں کے درمیان بات چیت بند رہی۔ خود خورشید جہاں بھی عنبر سے سخت کبیدہ تھیں اور اس سے کم ہی بات کرتی تھیں۔ چھوٹی کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے عنبر کو سخت سست تو نہیں سنائی تھی البتہ برا بھلا ضرور کہا تھا۔ عنبر خود بھی مجرم ضمیر سی ہو گئی تھی اور چپ چپ سی رہتی تھی۔

اس نے چھوٹی کے کہنے پر پہلے بھی کئی بار سوچا تھا کہ سعد اسے اتنا برا کیوں لگتا ہے تو بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ ریحان سے منسوب ہے سعد اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگا تھا اور اسی وجہ سے اس کے گھر آتا تھا۔ جب کہ کسی معاملے میں ریحان کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ یعنی حیثیت، قابلیت اور ڈیسنسی کوئی ایک وصف بھی اس کے اندر نہیں تھا۔ پھر یہ کہ بسوں میں دھکے اور جھٹکے کھاتا ہوا آتا تھا۔ یا ایک پرانی کھڑ کھڑاتی ہوئی موٹر سائیکل پر جب کہ ریحان کی شان ہی کچھ اور تھی۔ وہ گاڑی کے سوا زمین پر قدم ہی نہ رکھتا تھا۔ اور جب سے ریحان نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ اس کے لیے سعد کا انتخاب کر چکا ہے اس وقت سے تو سعد اسے زہر لگنے لگا تھا۔ اور وہ ریحان سے اس وجہ سے بھی سخت بدظن ہو گئی تھی کہ اس نے ایسی غلط بات سوچی کیسے؟ کیونکہ حیثیت کے لحاظ سے وہ خواہ کچھ بھی نہ تھی پھر بھی اس کی اپنی ایک ڈگنٹی تھی یا پھر حیثیت کے علاوہ اور باتوں میں تو وہ ریحان کے ہم پلہ تھی۔ اور پھر اس کا خیال ہی نہیں بلکہ اسے یقین تھا کہ چونکہ ریحان کو وہ اپنا دوست کہتا ہے اس لیے یہ جان کر کہ ریحان کسی دوسری لڑکی سے شادی کر رہا ہے اس نے ریحان کی خوشامد درامد کی ہو گی کہ ریحان اس کی شادی مجھ سے کرا دے۔ جبھی تو ریحان کو میرے ساتھ اس کا نام لینے کی جرأت ہوئی اور یہ جو چھوٹی کہہ رہی تھی کہ میری وجہ سے وہ ریحان سے لڑ بیٹھا ہے اور اس سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا ہے تو یہ محض بکواس ہی ہے۔ اس نے صرف میرے دل پر چڑھنے کے لیے قصّہ گھڑا ہے۔ اور میرے منہ نہ لگانے کے باوجود اسی امید میں میرے گھر آتا ہے۔ وہ اس روز کی آپس کی تکا فضیحتی کے بعد یہی سوچتی رہتی۔

چھوٹی کا انٹر کا نتیجہ کب کا آچکا تھا اور وہ کالج کھلنے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ تاکہ کالج کھلتے ہی بی۔ اے کے فارم داخل کر کے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے۔ مگر تعلیم جاری رکھنے کے سلسلے میں اس کے سامنے دو مسئلے درپیش تھے۔ ایک ماں سے مزید پڑھنے کی اجازت لینا اور دوسرا کالج کے اخراجات پورے کرنا۔ کہ گھر کے کرائے اور پنشن کی آمدنی تو اتنی قلیل ہوتی تھی کہ کھاتے پینے کا خرچ پورا کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ اسی میں سے کھینچ تان کر ماں اب تک چھوٹی کی تعلیم کا تھوڑا بہت خرچ پورا کرتی رہی تھیں۔ باقی تو اس کی ٹیوشن کے پیسے ہی خرچ ہوتے رہے تھے مگر اب تعلیم کا مزید بار اٹھانا مشکل ہو چلا تھا کیونکہ عذیر کی تعلیم پر کافی پیسہ اٹھ رہا تھا۔ اور یوں بھی ماں تو عنبر کو مزید تعلیم دلوا کر پچھتا رہی تھیں۔ ہوا تو نہیں پڑ رہا تھا ماں سے کہنے کا لیکن جذبۂ شوق نے کہلوا کر ہی چھوڑا۔

"امی! میری اچھی امی! آپ مجھے بھی کسی اسکول میں پڑھانے کی اجازت دے دیجیے۔ دیکھیں نا، آخر میں یہاں بھی تو ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ اسکول کی تو بات ہی اور ہو گی۔ ہر ماہ مجھے ہزار روپے کے اندر تو مل ہی جایا کریں گے۔ اس طرح کچھ ہاتھ بھی کھلے گا ہمارا۔"

چھوٹی نے حسب عادت ماں سے لپٹ کر کہا۔ اور خورشید جہاں کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اپنی بات منوانے کو خوشامد کی جا رہی ہے۔ انہوں نے بیزاری سے کہا۔

”بیچھے ہٹو چھوٹی! مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ تم بھی وہی کہو گی جو تمہاری بڑی بہن کہتی آ رہی ہے۔ وہی مثل ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے مگر اب میں بھر پائی۔ میں تمہیں نہ پڑھنے کی اجازت دوں گی نہ پڑھانے کی۔ سمجھیں۔ عنبر کو اپنی طبیعت پر چھوڑ کے اجازت دے دی یہی بہت ہے۔“

”لیکن امی! اس میں حرج ہی کیا ہو گا۔ آخر میں کالج بھی تو جایا کرتی تھی۔ اسی طرح پڑھانے بھی چلی جایا کروں گی۔ آج کل اسکولوں میں بہت سی آسامیاں خالی ہیں استانیوں کی۔ اور چونکہ مجھے پڑھانے کا اتنا تجربہ نہیں ہے تو مجھے ہیلپر (HELPER) کے طور پر لگایا جائے گا اس کے ساتھ ساتھ میں پڑھائی بھی جاری رکھوں گی۔“ ماں کے صاف صاف انکار کے باوجود چھوٹی نے کہا

”واہ یک نہ شد دو شد۔ یعنی اب کالج میں بھی پڑھنے کا ارادہ ہے۔ تو بھئی لو۔ تمہارے باوا مجھے چونچے پر تو نہیں بٹھا کر گئے تھے جو میں تمہاری پڑھائیوں پر پانی کی طرح پیسہ بہاؤں۔ مجھے تو گھر کا خرچ چلانا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ اچھا اب میں سمجھی کہ مجھے یہ اسکول میں پڑھانے کا جھانسہ کیوں دیا جا رہا تھا۔“ خورشید جہاں نے سر ہلا کر آخری فقرہ کہا۔

”نہیں امی! میں نے تو سچی ایک ترکیب سوچی تھی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کی، کیونکہ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ ہمارے حالات مجھے کالج میں پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔“ چھوٹی نے انہیں اپنی بات کا مقصد سمجھایا۔

”لیکن تم پڑھو گی یا پڑھاؤ گی، کیونکہ جو تمہارے کالج جانے کا وقت ہو گا وہی اسکول جانے کا بھی ہو گا۔ میں ان پڑھ ضرور ہوں مگر بے عقل ہرگز نہیں ہوں جو اتنا بھی نہ سمجھ سکوں۔“

”چھوڑیں امی اب یہ کیا اسکول میں نوکری کرے گی، آپ تو اسے پڑھنے کی اجازت دے دیجیے۔ میں تو اب پڑھائی سے فارغ ہو چکی ہوں، اس لیے اس کے تعلیمی اخراجات اب میں اٹھاؤں گی۔“ عنبر نے اندر آ کر ماں کی بات قطع کر کے کہا تو ایک لمحے کو تو انہوں نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ پھر انہوں نے کہا۔

”کیوں تمہارے ہاتھ کیا کوئی خزانہ وزانہ لگ گیا ہے۔ یا ــ“

”نہیں امی خزانہ کیسا۔ وہ جو میں ٹیوشن پڑھاتی ہوں انہی کا پیسہ میں چھوٹی کو دے دیا کروں گی۔ باقی جو آپ اسے دیتی ہیں وہ دے دیا کیجیے گا۔“ عنبر نے سمجھایا۔

”اسے کیا چاہتی ہو آخر کیا تمہاری طرح اس کی آنکھوں میں بھی ہوا بھر جائے۔ اس موئے آگے پڑھنے کے شوق میں۔ نہیں نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ میں تمہاری طرح اسے ہوائی دیدہ نہیں ہونے دوں گی۔“ اپنی بات کہتے کہتے خورشید جہاں ایک دم بھڑک ہی اٹھیں۔

”لو بھلا وہی مثل ہو گئی۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ خود تو نوکری کرنے کو تلی بیٹھی ہو اسے بھی لالچ پر لگا دیا تاکہ جو کچھ خود کماؤ وہ اپنی انٹی میں باندھ کر رکھو اور یہ کما کما کر گھر کا خرچ چلائے۔“

”نہیں امی میں نے یہ کب کہا کہ میں کما کما کر گھر کو بھروں گی۔ میں تو یونہی تمہید باندھی تاکہ کسی طرح آپ سے پڑھنے کی اجازت لے سکوں۔ امی تعلیم حاصل کرنے سے دیدہ ہوائی تو نہیں ہوتا بلکہ انسان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذہن کو جلا ملتی ہے۔ خیالات میں عمدگی آتی ہے اور کامیابی سے جینے کا قرینہ آتا ہے۔ امی تعلیم تو بہت اچھی چیز ہے۔ دولت ہے دولت۔“

”جی ہاں امی۔ جبھی تو میں عذیر کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتی ہوں۔ جب وہ عذیر سے ڈاکٹر بنے گا تو انشاء اللہ من کی طرح پیسہ برسے گا اس پر۔ اور یہ تعلیم کی بدولت ہی ہو گا۔“ عنبر نے جو ماں کی باتوں پر جز بز ہو رہی تھی۔ اس نے بھی چھوٹی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے تعلیم حاصل کرنے کے فائدے بتائے۔

”ہاں بالکل تعلیم کی بدولت ہی ہو گا۔ اور ویسے بھی امی گھر میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے سے تو اچھا ہو گا میں کچھ حاصل کر لوں گی۔ امی ہوا نہ آپا کی آنکھوں میں بھری ہے نہ میری آنکھوں میں بھرے گی۔ اور آپا تو ہم سب کے فائدے کے لیے ہی ملازمت کرنے کو کہہ رہی ہیں۔ کیونکہ جب امتحانات نزدیک آئیں گے تو عذیر کو ٹیوشن دلانے کی ضرورت ضرور پڑے گی وہ سائنس پڑھ رہا ہے نا۔ اور یہ کوئی معمولی مضمون نہیں ہوتا۔ اب تو مجھے اجازت دے دیجیے نا۔ بس دو تین روز بعد کالج کھلنے والا ہے۔ میں بھی اپنے فارم داخل کرا دوں گی۔“

دونوں بہنوں نے یکے بعد دیگرے ماں کو بات کرنے کا موقع دیے بغیر کچھ اس طرح انہیں گھیرا کہ انہیں اجازت دینی ہی پڑی

اور یوں نہ صرف چھوٹی کا تعلیم جاری رکھنے کا خواب پورا ہو گیا بلکہ دونوں بہنوں کے درمیان جو کشیدگی ہو گئی تھی وہ صلح کی صورت میں ختم ہو گئی۔

عنبر اس دوران گھر میں بے کار بیٹھی ضرور نظر آ رہی تھی لیکن بیکار بیٹھے بیٹھے بھی وہ کئی جگہ ملازمت کے لیے عرضیاں روانہ کر چکی تھی۔ اسکول میں ملازمت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہاں تنخواہ اس کی منشاء سے بہت کم دی جاتی تھی وہ اپنے کیریئر کا آغاز ہائی اسکیل سے کرنا چاہتی تھی۔ مگر بہت انتظار کے باوجود بھی اب تک کسی درخواست کا جواب نہیں آیا تھا۔ ادھر خالی بیٹھنے سے بہتر اس نے یہی سمجھا کہ وہ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھ لے۔

ادھر عذیر کے اسکول سے آنے کا وقت بہت ٹیڑھا تھا وہ اس وقت واپس لوٹتا تھا جب سہ پہر ڈھلتی ہوتی تھی ــ جبکہ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سینٹر ساڑھے چار بجے سہ پہر تک بند ہو جاتا تھا۔ آخر اس نے ماں کی خوشامد و درآمد کر کے اور یہ کہہ کر کہ آخر وہ اپنے کالج بھی تنہا آتی اور جاتی تھی صرف ماں سے اتنی اجازت لے لی کہ وہ تنہا چلی جایا کرے گی اور واپسی میں عذیر اس کو لینے اسکول سے سیدھا وہیں آ جایا کرے گا۔ عذیر نے بھی بڑی بہن کی بھلائی کے پیش نظر ہامی بھر لی۔ اور یوں اس نے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے تین ماہ کا کورس لیا تھا جو عموماً لینا ہی پڑتا ہے۔ وہ پہلے ایک گھنٹے تک ٹائپنگ اور پھر اس کے بعد سوا گھنٹے تک شارٹ ہینڈ سیکھتی تھی۔ اس کا ٹائپنگ اسکول یا سینٹر۔ طارق روڈ پر تھا۔ پونے تین بجے گھر سے چلتی اور تین بجے تک وہاں پہنچ جاتی۔ اصل میں ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سینٹر۔ برابر برابر ہی بنے ہوئے تھے۔ اور وہ مین روڈ پر ایک فلیٹ میں تھے۔ جہاں بالائی منزل پر اور بھی دفاتر بنے ہوئے تھے۔ وہ پہلے ٹائپنگ سیکھتی پھر شارٹ ہینڈ اور یوں دیکھتے دیکھتے پانچ بج جاتے۔ اور عذیر اسے لینے سوا پانچ اور کبھی کبھی ساڑھے پانچ یا لگ بھگ آتا تھا۔ اور یہ عرصہ اسے نیچے دکانوں کے آگے کھڑے ہو کر گزارنا پڑتا تھا۔

وہ جگہ جہاں وہ کھڑی ہوتی تھی خاصی محفوظ تھی کیونکہ سامنے ہی بس اسٹاپ تھا۔ اور وہاں دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والی اور بھی لڑکیاں آ کر کھڑی ہوتی تھیں۔ اسے تقریباً ایک ماہ ہو گیا تھا شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھتے ہوئے۔ اور اس روز جب وہ حسب معمول نیچے اتری تو اول تو وہاں سناٹا دیکھا۔ دوسرے عذیر کا انتظار کرتے کرتے ساڑھے پانچ بج گئے مگر وہ نہیں آیا۔ وہ چاہتی تو یہیں سے بس پکڑ کر گھر بھی جا سکتی تھی لیکن اس خیال سے کھڑی عذیر کا انتظار کرتی رہی کہ اس کے جانے کے بعد وہ آیا تو اسے وہاں نہ موجود پا کر سخت پریشان ہو گا۔ کیا پتا اس کی جیب میں اتنے پیسے بھی نہ ہوں کہ وہ بس کا کرایہ ادا کر سکے یوں بھی مہینے کی آخری تاریخ تھی اور ہمیشہ عذیر کا کرایہ وہی ادا کرتی تھی۔ پھر پندرہ منٹ مزید گزر گئے لیکن عذیر نہیں آیا تو اسے ہول اٹھنے لگا۔ یوں بھی ٹائپنگ کلاس کی ایک لڑکی سے سنا تھا کہ جمشید روڈ پر بس کا حادثہ ہو جانے کی وجہ سے ہنگامہ ہو گیا تھا۔ جب کہ عذیر کا اسکول جہانگیر روڈ پر تھا۔

ادھر وقت تھا کہ تیزی سے نکلا جا رہا تھا اور شام سر پہ آ گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ امی بھی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ کیوں نہ میں گھر چلی جاؤں۔ بس اسی خیال کے تحت اس نے پلٹ کر اس دوکان دار سے جس کی دوکان ٹائپنگ اسکول کے زینے کے قریب تھی کہا کہ وہ اپنے بھائی کا انتظار کر کے گھر جا رہی ہے۔ اس کا نام عذیر ہے۔ اگر وہ اس کے جانے کے بعد آئے تو اس سے کہہ دیجیے گا کہ تمہاری بہن تمہارا انتظار کر کے گھر چلی گئی ہیں۔ اور پھر اتنا کہہ کر وہ برآمدے سے اتر کر فٹ پاتھ پر آ گئی تاکہ جونہی اس کے روٹ کی بس آ کر رکے وہ اس میں بیٹھ جائے۔ لیکن ابھی اسے فٹ پاتھ پر کھڑے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ سامنے سے آتی میرون کلر کی ایک بڑی سی کار کے جو تیزی سے تھوڑا سا آگے نکل گئی تھی، بریک چرچرائے اور پھر ریورس کر کے اس کے عین سامنے روک دی گئی۔ کار چلانے والا جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ یہ سعد تھا۔

”ارے عنبر آپ اور اس وقت یہاں؟“ اس نے تعجب آمیز بے یقینی کے ساتھ پوچھا۔

اور وہ جو ایک کار کو عین اپنے سامنے رکتا دیکھ کر پوری جان سے لرز اٹھی تھی سعد کو دیکھ کر کچھ ایسی گڑبڑائی کہ ایک دم ہی جواب بھی نہ بن سکا۔

”وہ میں اپنی سہیلی عالیہ کے یہاں آئی تھی۔“ اس نے جواب دینے میں کافی وقت لیا۔

”مگر عالیہ تو ــ خیر چھوڑیں۔ اس وقت کیا پرابلم ہے آپ کا۔“ سعد نے عالیہ کے ذکر کو گول کر کے پوچھا۔

"وہ میں سواری کے انتظار میں کھڑی تھی مگر کوئی رک نہیں رہا۔" اس نے بھی عذیر اور بس کے ذکر کو گول کر کے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"اوہ دیٹس نو پرابلم۔ آئیے۔ آپ کار میں بیٹھیے، میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔" سعد نے اسے ڈراپ کرنے کی پیشکش تو وہ ایک تذبذب میں پڑ گئی کہ بیٹھے یا نہ بیٹھے۔ کیونکہ فرنٹ سیٹ پر عین اس کی نظروں کے سامنے ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ سعد نے اس کے گریز کو محسوس کر کے کہا۔

"اوہ ہاں مجھے تو خیال ہی نہیں رہا اس سے آپ کا تعارف کرانے کا۔ یہ میرا چھوٹا اور اکلوتا بھائی فہد ہے۔" اور پھر اسی نے فہد سے مخاطب ہو کر کہا۔

"فہد ان سے ملو۔ یہ عنبرین ہیں اپنے شہباز چچا کی بیٹی۔" اور فہد جو بھائی کے تعارف کرانے پر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا اس نے عنبر کو اسلام علیکم کہہ کر مسکراتے ہوئے کہا

"آپ پہلے اندر بیٹھیے۔ اس کے بعد میں آپ کے بارے میں اپنے فرسٹ امپریشن کا اظہار کروں گا۔" فہد سعد سے قد میں چھوٹا ضرور تھا مگر اس سے حد درجہ مشابہت رکھتا تھا۔

"اچھا جی۔ گویا کار میں بیٹھنا شرط ہے۔" اسے فہد کے بات کرنے کا شوخ سا انداز بہت بھایا۔ وہ بھی ہنس کر بولی۔

اسی اثنا میں فہد نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ ہنستی ہوئی اندر بیٹھ گئی۔ سعد نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھا لی اور چوراہے سے مڑنے کے بجائے وہ سیدھا نکلتا چلا گیا اور وہ دل ہی دل میں اس کے عمدگی سے کار چلانے پر متعجب ہو کر سوچتی رہی کہ آخر یہ اتنی بڑی گاڑی اس کے پاس کہاں سے آئی، وہ بھی بالکل نئی۔

"ہاں تو اب بتائیے آپ نے میرے بارے میں کیا امپریشن لیا ہے۔ میرا مطلب فرسٹ امپریشن ہے ہے۔" اس نے کار میں طاری خاموشی سے اکتا کر فہد سے پوچھا۔

"دیکھیں میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ کسی کی تعریف یا مذمت اس کے منہ پر کی جائے۔ ویسے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو لکھ کر بھیج دوں گا۔" فہد نے کہا تو اس نے ہنس کر اپنی انگلش جھاڑی۔ "اوہ! یو آر سو کلیور۔"

"او تھینکس فور دا کومپلیمنٹ۔" فہد نے اسی انداز میں اتنی برجستگی سے کہا کہ اسے پھر ہنسی آ گئی۔ جب کہ سعد کے سامنے وہ سوبر بننا چاہ رہی تھی اور جان کر بات کرنا تو کجا اس کی طرف رُخ بھی نہیں دے رہی تھی کہ کہیں لفٹ ملنے پر وہ پھیل نہ جائے۔

"مگر یہ کومپلیمنٹ تو نہیں ہے بلکہ فیکٹ ہے۔" عنبر نے کہا۔

"چلیں تو پھر یہ اور بھی اچھا ہے۔ کیونکہ یہ تو ذاتی وصف ہوا نا میرا۔" فہد بولا۔

"اوہو بھئی، آپ تو بڑے حاضر جواب ہیں۔" اس کے ترکی بہ ترکی جواب دینے پر عنبر کو کہنا ہی پڑا۔

پھر خاموشی چھائی تو کافی دیر تک طاری رہی۔ اس لمحے وہ ذہنی طور پر سخت پریشان تھی۔ ادھر عذیر کی طرف دھیان لگا ہوا تھا کہ پتا نہیں وہ اب تک لینے بھی آیا ہو گا یا نہیں۔ اور اسے اتنی دیر کہاں ہو گئی۔ وہ کہیں اور تو جا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں فٹ پاتھ پر کھڑی ہو کر اس کا انتظار کرتی ہوں۔ تو پھر خدا خیر کرے۔ نہ معلوم کہاں گیا وہ۔ ادھر دیر ہو جانے کی وجہ سے ماں اور بہن جو پریشانی اٹھا رہی ہوں گی اس کا بھی احساس تھا اور سب سے بڑھ کر یہ خیال کہ اب سعد مجھے گھر ڈراپ کرے گا تو اس کا بھائی بھی ہماری ٹوٹی پھوٹی حیثیت سے آگاہ ہو جائے گا۔ یوں بھی امی سوالات کی بارش کر دیں گی کہ کہاں رہ گئی تھیں۔

"عذیر کو کہاں چھوڑ آئیں؟"

"سعد کے ساتھ کیسے آ گئیں جب کہ تم تو ٹائپنگ سیکھنے گئی تھیں۔؟"

کتنی آکورڈ ہو جائے گی میری پوزیشن۔

اف پتا نہیں یہ سعد کیسے آ ٹپکا تھا وہاں۔

کیا سوچ رہا ہو گا اس کا بھائی کہ شہباز چچا کی بیٹی اکیلی فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔

بس یہی خیالات تھے جو اسے پریشان کیے جا رہے تھے۔ سعد نے کار میں بیٹھ کر ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا تھا۔ اسے اس قدر خاموش دیکھ کر اس نے آخر مہر خاموشی کو توڑا۔

"آج عجیب ہی اتفاق ہوا۔" اس نے کہا تو وہ اس کی آواز پر ذرا بھی نہ چونکی۔

"آج میں پہلی بار اپنے سیٹھ صاحب کی یہ ہونڈا کار لے کر نکلا تو پہلے یہ فہد راستے میں مل گیا۔ پھر آپ مل گئیں۔" سعد نے خود ہی اپنے فقرے کو واضح کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ میں بھی تو کہوں کہ کہاں تم اور کہاں یہ قیمتی گاڑی۔" اس نے سعد کے بتانے پر طنزاً ہنس کر دل میں سوچا۔ اور پھر اسے شرمندہ کرنے کی غرض سے بولی۔

"اچھا تو یہ آپ کے باس کی گاڑی ہے۔"

"جی ہاں ظاہر ہے یہ سیٹھ صاحب کی کار ہی ہے ورنہ میری کیا حیثیت کیا اوقات۔" سعد بولا۔ تو فہد ہنسنے لگا۔

"بھئی، ہنسنے کی بات نہیں، بس تم دعا کرو کہ خیریت سے گھر پہنچ جاؤ۔ ویسے بھی زندگی میں پہلی بار کار چلانے کا اتفاق ہوا ہے میرے پاس تو لائسنس بھی نہیں ہے۔" اس نے فہد سے کہا تو وہ اندر ہی اندر سہم کر رہ گئی۔

"لیکن آپ ڈرائیونگ تو اچھی کر رہے ہیں۔" فہد نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

"یہاں رش کم ہے اس لیے کر رہا ہوں ورنہ زیادہ ٹریفک ہوتا تو یقیناً میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔" سعد نے کہا تو وہ کچھ زیادہ ہی سہم کر تیکھے سے لہجے میں بولی۔

"مگر آپ کے سیٹھ نے آپ کو اجازت کیسے دے دی بغیر لائسنس کے کار ڈرائیو کرنے کی۔؟"

"اصل میں سیٹھ کا پرانا ڈرائیور آج چھٹی پر تھا اور سیٹھ صاحب کوئی میٹنگ اٹینڈ کرنے اپنی مرسیڈیز لے کر گئے ہوئے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور یہ کار لے کر نکل کھڑا ہوا۔ لیکن میرا نکلنا اچھا ہی ثابت ہوا نا کم از کم آپ تو سواری کی زحمت سے بچ گئیں۔" سعد نے جواباً کہا تو اس نے دل میں سوچا۔ ہاں بشرطیکہ بخیر و عافیت گھر پہنچ جاؤں کیونکہ اب وہ کار کو لہریے دار چلا رہا تھا اور عنبر کی جان پر بنی جا رہی تھی۔ اور وہ دل ہی میں اس وقت کو کوس رہی تھی۔

جب بہت مجبوری کے عالم میں اس کے کہنے پر وہ اس کی کار میں بیٹھی تھی۔ اگر کار کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تو گھر پہنچنے کی حسرت دل ہی دل میں رہ جائے گی۔ کیونکہ آجکل ٹریفک کے حادثات اتنے عام ہو گئے ہیں کہ اخبار میں روزانہ ایک نہیں کئی کئی حادثوں کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اف نہ معلوم آج اٹھ کر کس کا منہ دیکھا تھا اور جب اسے یاد آیا کہ منہ دھونے کے بعد اپنی ہی شکل دیکھی تھی تو اس کی توجہ فوراً فہد کی طرف مبذول ہو گئی جو مسلسل ہنسے جا رہا تھا۔ یوں جیسے اس کی پریشانی پر ہنس رہا ہو۔ کم از کم اسے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ کچھ اس لیے بھی کہ اس کی بے موقع ہنسی عنبر کو زہر لگ رہی تھی۔ اور پھر شاہراہ قائدین پر آ کر سعد نے موڑ کاٹتے ہوئے کار کی رفتار ہلکی کر دی اور اس سے پوچھا۔

"آپ کتنے عرصے سے ٹائپنگ سیکھ رہی ہیں؟" تو اس کے اس غیر متوقع سوال پر وہ بری طرح بوکھلا گئی۔ پھر اس نے قدرے توقف کے بعد تھوک نگل کر کہا۔

"پچھلے ماہ سے۔"

"صرف ٹائپنگ ہی۔"

"نہیں، شارٹ ہینڈ بھی۔"

"اوگڈ۔ بلکہ شکریہ۔" سعد نے سراہتے ہوئے انداز میں کہا۔

"کس بات کا؟" عنبر نے اس کے بلا وجہ اظہارِ تشکر پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مشورہ قبول کرنے کا۔" سعد نے بتایا تو عنبر کا دل چاہا کہے کہ جی نہیں آپ کے مشورہ دینے سے بہت پہلے ہی میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ وہ تو ہمارے حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ ہر بات میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے۔ مگر کیسے کہتی بھلا کہ جو کہنے کا موقع تھا وہ تو نکل ہی چکا تھا اور وہ تو اس بات پر سخت حیران تھی کہ سعد کو کیسے پتا کہ میں ٹائپنگ سیکھ رہی ہوں۔

کار اسی اثنا میں اسلامیہ کالج کے قریب پہنچ چکی تھی اور اسے پھر یہ فکر کھانے لگی کہ اب وہ گھر پہنچے گی تو ایک تو مجھے سعد کے ساتھ اس کی کار میں دیکھ کر چھوٹی کے سامنے اس کی کتنی ہیٹی ہو گی۔ دوسرے امی میرے ساتھ عذیر کو نہ دیکھ کر ایک طوفان کھڑا کر دیں گی۔ وہ تو کسی آئے کو دیکھتی ہیں نہ گئے کو۔ سعد کی طرح فہد کو بھی اپنا بچہ سمجھ کر نہ معلوم کیا کیا کہہ ڈالیں گی۔

اب فہد بھی ہمارا وہ تھرڈ کلاس گھر دیکھ لے گا۔ اسے کاش سعد اس وقت تنہا ہی ہوتا یا پھر میں اس کے ساتھ نہ آئی ہوتی۔

"ویسے بائی داوے، کیا آپ تنہا آتی جاتی ہیں؟" سعد نے مزید ایک ٹیڑھا سا سوال داغا۔

"میں۔ نہیں نہیں۔ آتی تو تنہا ہی ہوں کیونکہ دن کا وقت ہوتا ہے۔ البتہ واپسی عذیر کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔"

"چلیں، یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ پھپھو جان کے خیالات کچھ تو بدلے۔" سعد نے کہا۔ اور فہد کو مخاطب کر کے بولا۔

"تم پھپھو جان سے ملو گے تو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے نانی اماں دوبارہ زندہ ہو کر آگئی ہوں۔ بہت مشفق خاتون ہیں یار۔"

"جی ہاں۔ آپ کی اطلاع کو میں ایک بار ان سے مل چکا ہوں۔" فہد بولا۔

"اچھا۔ مگر کہاں ملے تھے تم ان سے؟" سعد نے حد درجے متعجب ہو کر پوچھا۔

"خواب میں۔" فہد نے کچھ اس طرح بتایا کہ اتنی پریشانی میں بھی عنبر کو ہنسی آگئی۔ جسے اس نے سختی سے دبا لیا۔

"تم پھر اتر آئے نا اپنے پھکڑ پن پر۔" سعد نے عنبر کے برا مان جانے کے ڈر سے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں خیر، پھکڑ پن تو نہیں آیا بھائی جان۔" فہد ہنس کر بولا اور پھر گردن گھما کر عنبر کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔

"پتا ہے عنبر آپا! یہ ہمارے بھائی جان اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے پھپھو جان کا ذکر خیر کچھ ایسے پیرایے اور انداز میں کرتے ہیں کہ ایک روز سچ مچ مجھے پھپھو جان خواب میں نظر آگئیں۔ وہ میرا کان پکڑ کر کہہ رہی تھیں کہ نالائق سعد تو دن میں دسیوں بار مجھ سے ملنے آتا ہے تجھے اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ میرے گھر آ کر ایک بار ہی مجھ سے مل لیتا۔" فہد نے اس انداز میں اپنا خواب سنایا کہ عنبر کے سامنے نہایت سنجیدگی اور بردباری کا مظاہرہ کرنے کے باوجود سعد اپنا قہقہہ نہ روک سکا۔ حتیٰ کہ عنبر کو بھی اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔

"اچھا پھر کیا ہوا؟" سعد نے ہنس لینے کے بعد پوچھا۔

"پھر یہ ہوا کہ آنکھ کھل گئی۔" فہد بولا۔

"واہ بہت بے موقع کھلی ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ انہوں نے خوب تمہاری پٹائی کی ہوگی۔" سعد نے کہا۔

"یہ اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ ورنہ انہوں نے تو خواب ہی خواب میں میرا کان چھوڑ کر مجھے گلے سے لگا لیا تھا۔" فہد نے جواب میں کہا تو اس کی حاضر جوابی پر عنبر کو پھر ہنسی آگئی لیکن سعد کی موجودگی میں بار بار دانت نکالنا اسے مناسب نہیں لگا۔ اس نے فوراً ہی اپنی ہنسی کو بریک لگایا اور بولی۔

"لیکن پھپھو جان پردیس میں تو نہیں رہتیں اور نہ ہمارے یہاں آنے پر تم پر کوئی پابندی ہی عائد ہے۔ البتہ ہمارا گھر کچھ ایسا ہے کہ وہاں آ کر خوشی نہیں مایوسی اور کوفت سی ہوگی۔"

عنبر نے گویا پیش بندی کے طور پر کہا تاکہ فہد اگر اس کے گھر جائے تو اس کی خستہ حالی کو دیکھ کر ایک دم ہی بددلی کا شکار نہ ہو جائے۔

"کیوں آپ کا گھر کیا خس و خاشاک کا بنا ہوا ہے جو میں گھستے ہی جھاڑ جھنکاڑ اور مکڑی کے جالوں میں پھنس جاؤں گا۔" فہد نے تیکھے سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں بھئی، اچھا خاصا اینٹوں اور سیمنٹ کا بنا ہوا ہے اور پھر یہ کہ ذاتی گھر ہے۔" سعد نے بیچ میں لقمہ دیا اور جھک کر فہد سے کچھ کہا۔

"اوہو تو اس میں ایسی کیا برائی ہے۔ وہ ہماری ایک خالہ تھیں بے چاری ایک عرصے تک تو ایلومینیم کے کوارٹر میں رہیں پھر وہاں سے گریں تو ایک بیرکس نما کوارٹر میں اٹک گئیں۔ اب کہیں پندرہ بیس سال بعد جا کر انہوں نے سوسائٹی میں ہی ایک چھوٹا سا بنگلہ تعمیر کرایا ہے اور پھر میں تو پھپھو جان سے ملنے جاؤں گا۔ گھر اور گھر کی چیزوں سے تو نہیں۔ میرے خیال میں تو آپ کسی شدید قسم کے کمپلیکس میں مبتلا ہیں گھر کے معاملے میں ورنہ کراچی جیسے کثیر آبادی کے شہر میں کسی کے پاس اپنا ذاتی مکان ہونا معمولی بات نہیں۔" فہد کی باتوں سے عنبر نے اندازہ لگایا کہ وہ بہت منہ پھٹ ہے۔

"ہاں یہ تو ہے۔ لیکن میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ آج کل کی جدید طرز تعمیر کے سامنے ہمارا گھر دیکھنے والے کو کچھ ایسا

نظر آتا ہے جیسے آثار قدیمہ کی کوئی کھنڈر نما عمارت ہو۔" عنبر نے جھینپ کر گویا صفائی پیش کی۔

"خیر اب اتنا بھی اپنے گھر کو بے وقعت نہ کیجیے۔ یہی کیا کم شکر کی بات ہے کہ آپ کے پاس اپنا ذاتی گھر تو موجود ہے۔ ورنہ شاید آپ نے دیکھا نہیں کہ یہاں کتنے بے گھر اور بے آسرا لوگ ہیں۔ میرے خیال میں جن کی تعداد ذاتی گھر رکھنے والوں سے زیادہ ہی ہے۔ رہ گئی قدیم طرز تعمیر کی بات تو آپ اسے جدید طرز پر بھی تعمیر کرا سکتی ہیں۔"

فہد شاید دوسروں پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا عادی تھا جب کہ اس کی بات پر اس نے دل میں ہنس کر سوچا کہ ہاں کیا آسان بات ہے۔ اس گھر کو دوبارہ تعمیر کرانا جنہیں دوسروں کی مجبوریوں کا علم نہیں ہوتا۔ وہ اس طرح بولتے ہیں۔

"ہاں میں نے بھی پھپھو جان کو یہی مشورہ دیا تھا۔ انشاء اللہ ایک روز سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

سعد نے یوں کہا جیسے اس موضوع کو ٹالنا چاہ رہا ہو۔ اور عنبر نے جل کر دل میں سوچا۔ "ہونہہ خاک ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ جگہ ہی ایسی ہے کہ جس کا نام سن کر جو قریب آنے کی کوشش کرتا ہے وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے جیسے کہ عالیہ جو اس روز کے بعد آج تک پلٹی ہی نہیں۔"

"تم کلفٹن تو گئے ہو گے؟" اس نے فہد سے پوچھا۔

"جی ہاں کئی بار گیا ہوں بلکہ سی ویو تو تقریباً ہر دوسرے تیسرے ہی جاتا ہوں۔ اصل میں مجھے پانی کی شوں شوں بالکل پسند نہیں۔ آس پاس کوئی درخت یا ہریالی بھی نہیں پھر بھی نہ معلوم لوگ صرف لہروں کا تموج دیکھ کر کیا لطف اٹھاتے ہیں۔ مجھے تو یہ بھائی جان ہی زبردستی کھینچ کر لے جاتے ہیں۔"

اُف! اتنے سے سوال کا اتنا طویل جواب جبکہ اس نے تو اپنے تایا کے یہاں جانے کے بارے میں پوچھا تھا تاکہ اسے یہ تو معلوم ہو کہ اس کا ایک سگا رشتہ دار کتنی اونچی حیثیت کا مالک ہے۔ وہ سمندر کا ذکر لے بیٹھا۔ اس لیے اسے اپنے سوال کی وضاحت کرنا پڑی۔

"نہیں بھئی، میرا مطلب تھا کہ تم میرے تایا ابو سے بھی کبھی ملے ہو۔"

"نہیں ملا تو نہیں۔ البتہ باہر سے ان کا گھر ضرور دکھایا تھا بھائی جان نے۔ اصل میں یہ بھائی جان ان کی کچھ ناچاقی ہو گئی ان لوگوں سے آپ لوگوں کے معاملے میں۔"

اف تو اس نے فہد کو سب کچھ بتا رکھا تھا۔ پھر تو یہ بھی بتایا ہوگا کہ یہ مجھ سے شادی بھی کرنی چاہتا تھا۔ عنبر نے فہد کی بات پر چونک کر دل میں سوچا اور بولی۔

"ہم لوگوں کے معاملے میں؟" اصل میں اس نے جان بوجھ کر تجاہل سے کام لیا تھا تاکہ فہد یہ نہ سمجھے کہ اسے بھی اس ناچاقی کا علم ہے۔

"جی ہاں، آپ لوگوں کے معاملے میں۔ آخر یہ کوئی انصاف کی بات نہیں ہے کہ وہ لوگ آپ سب کا حق مار کر بیٹھ رہے ہیں۔ انہیں کم از کم یہ احساس تو ہونا چاہیے تھا کہ آپ کے والد آپ کے سر پر موجود نہیں ہیں اور پھر آپ لوگ تو ان کے سگے ہیں۔ مگر یہ نیتوں اور ظرف کی بات ہوتی ہے۔"

"اوہ بھئی۔ یہ تم کیا وعظ دینے بیٹھ گئے۔ ختم کرو اس قصے کو۔" سعد اس کے باتونی پن سے تنگ آ کر بولا اور عنبر نے جو ناچاقی کا سن کر جز بز سی ہو رہی تھی۔ فہد کی بات سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ اور کچھ موضوع بدلنے اور کچھ یہ کہ وہ واقعی عذیر کی طرف سے سخت پریشان تھی۔ اس نے کہا۔

"معلوم نہیں، عذیر وہاں پہنچا بھی ہوگا یوں تو عام طور پر وہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے تک آ جاتا تھا مگر آج تو وہ چھ بجے کے بعد بھی نہیں پہنچا۔"

"ہیں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ بات آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتائی۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ جیسے کہ آپ نے اور کئی باتیں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح یہ بھی کہہ دیا کہ عذیر واپسی میں آپ کو لینے آتا ہے۔ کمال ہے آپ یہاں اتنے اطمینان سے بیٹھی ہیں اور وہ۔"

"ممکن ہے وہ اب تک گھر پہنچ گیا ہو۔" فہد نے بیچ میں لقمہ دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تم چپ رہو۔" سعد نے کچھ اس طرح غرا کر کہا کہ فہد منہ نیچا کر کے سر کھجانے لگا۔ یوں بھی اس نے عنبر سے پہلی بار اتنے تیکھے انداز میں بات کی تھی۔ موقع ایسا تھا کہ عنبر برا بھی نہیں مان سکتی تھی۔

"کار کے سفر اور بس کے سفر میں بہت فرق ہوتا ہے سمجھے۔ اور ہر روٹ کی بس علیحدہ ہوتی ہے جو آسانی سے نہیں ملتی۔" اس نے اِن ڈائریکٹلی فہد کو مخاطب کر کے کہا۔ اس دوران میں وہ جیل کی دیوار کے ساتھ چلتی سڑک کو عبور کر آیا تھا۔ اس نے ایک دم ہی کار کی اسپیڈ بڑھا دی اور چند منٹ بعد ہی کار کو گلی کے نکڑ پر روک کر جلدی سے اترا اور عنبر کی طرف کا دروازہ کھولا۔ عنبر باہر نکلی تو وہ اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔

"میں عذیر کو دیکھنے طارق روڈ جا رہا ہوں۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"لیکن پہلے گھر پر تو معلوم کر لیں۔ ممکن ہے دیر ہو جانے کی وجہ سے وہ طارق روڈ گیا ہی نہ ہو۔ کیونکہ آج ایک لڑکی بتا رہی تھی کہ بس کا حادثہ ہو جانے کی وجہ سے جمشید روڈ پر ہنگامہ ہو گیا تھا۔" بھائی کی پریشانی میں کچھ دیر کو وہ بھول گئی کہ وہ اتنی بے تکلفی سے کس سے بات کر رہی ہے۔

"حیرت ہے آپ پر بھی۔ یعنی کہ وقفے وقفے سے قسطوں میں خبریں دے رہی ہیں۔ ویسے میں نے تو مصلحتاً آپ کو یہاں اتارا تھا۔ خیر آپ فکر نہ کریں میں خود جا کر اسے دیکھ آتا ہوں۔" سعد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"او آپ کا بے حد شکریہ۔ آپ ایسا کریں کہ دیکھ کر آ جائیں اتنے میں فہد کو کمپنی دیتی ہوں۔" اس نے پہلی بار دل سے اظہارِ ممنونیت کے ساتھ ساتھ اس کی کسی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"او۔ کے۔ ایز یو پلیز۔" سعد نے کہا اور پھر پلٹ کر گلی میں داخل ہو گیا۔ جبکہ عنبر دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

"خیریت۔ کیا بھائی جان اجازت لینے گئے ہیں پھپھو جان سے کہ آپ اپنے گھر لے جائیں۔" فہد نے شرارت سے پوچھا تو اس نے اس کے سر پر آہستہ سے ایک چپت لگا کر جھینپے جھینپے انداز میں کہا۔

"چلو بدتمیز کہیں کے تمہارے بھائی جان تو عذیر کو دیکھنے گئے ہیں۔ اور میں تمہیں کمپنی دینے کے خیال سے رک گئی۔"

"نو ایکسپلینیشن پلیز۔ ویسے۔ کمپینین کا مطلب جانتی ہیں آپ۔" فہد نے پھر اسے چھیڑا۔

"ہاں، خوب جانتی ہوں اور اب امی نے تو خواب میں ہی تمہارے کان کھینچے تھے۔ مگر میں سچ مچ تمہارے کان مروڑ کر رکھ دوں گی۔ اگر تم نے زیادہ فری ہونے کی کوشش کی۔" عنبر نے سچ مچ اس کا کان پکڑ لیا۔

"اچھا اچھا بھئی میری توبہ۔ آیندہ آپ سے بہت محتاط ہو کر بات کرنی پڑے گی۔ یعنی سنسر شپ کے ساتھ۔"

"ہاں بالکل آیندہ اس بات کا خیال رکھنا۔" وہ دھمکی دینے کے انداز میں بولی۔

"جی بہت خیال رکھنا۔ آپ نے رکھا ہے ہمارا خیال۔ یہاں بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور آپ ہیں کہ چالاکی سے بھائی جان کو اپنے گھر بھیج کر خود یہاں آ بیٹھیں میرے پاس۔ تاکہ میں آپ کے گھر جا کر کچھ کھا پی نہ لوں۔ اتنی کنجوسی بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

فہد نے کہا تو مذاق میں ہی تھا مگر اسے بُرا دکھ پہنچا۔ یہ سوچ کر وہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ کسی کو اپنے گھر بلا کر کچھ کھلا پلا ہی دے۔ وہاں تو کئی روز سے دالیں کھا کھا کر پیٹ میں مروڑ رہنے لگا ہے۔ اصل میں پچھلے مہینے سے اس کا ہاتھ بہت تنگ ہو گیا تھا۔ کیوں کہ ٹیوشن کی آمدنی تو اس نے چھوٹی کے داخلے میں لگا دی تھی۔ اور وہ اس پر شارٹ ہینڈ ٹائپنگ کی فیس اور روزانہ کا آنے جانے کا کرایہ۔ کبھی کبھی تو اسے ماں سے بھی پیسے لینے پڑتے تھے۔

بہر حال سعد جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ساتھ عذیر بھی تھا۔ جسے دیکھ کر اس نے سکھ کا سانس لیا۔ پھر عذیر کا فہد سے تعارف کرانے کے بعد عذیر کے بہت روکنے کے باوجود وہ آیندہ جلد ہی آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ وہ گھر آئی تو ماں لال بھبوکا صورت لیے اس کے استقبال کو کھڑی تھیں عذیر راستے میں اسے بتا چکا تھا کہ اس کے جانے کے بعد طارق روڈ پہنچا تھا۔ جب وہ نہیں ملی تو پریشانی میں رکشہ پکڑ کر گھر آ گیا تھا۔ اور گھر میں بھی اسے موجود نہ پا کر اسے ماں کو بتانا ہی پڑا تھا۔ اور امی تو ایسی پریشان ہوئیں کہ مجھے لے کر آپ کی دوست عالیہ کے یہاں جانے والی تھیں۔ کیونکہ ٹائپنگ اسکول میں تو میں آپ کو دیکھ آیا تھا۔ وہاں تو تالا پڑا تھا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ آپ سعد بھائی کے ساتھ آ گئیں۔ ورنہ امی کے ساتھ

نہ معلوم کہاں کہاں مارا مارا پھرنا پڑتا۔ خیر، اب تو سعد بھائی نے ساری بات ابھی بتا دی ہے۔ یعنی خطرہ کم ضرور ہو گیا ہے۔ مگر ٹلا نہیں ہے۔" اور اس نے ماں کا سامنا کرنے کی پریشانی میں عذیر کے شوخ سے فقرے پر بھی دھیان نہیں دیا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی ماں نے صلواتوں کی ایک باڑھ اس پر چلائی۔

"اے خیر سے آ گئیں تم بادشاہ زادی۔ اے باپ کو تو قضا نے الٰہی نے اٹھا لیا اور ماں کو جیتے جی تم نے مرا ہوا سمجھ لیا۔ اب بھلا تم کو روک ٹوک کرنے والا رہا ہی کون ہے۔ تم تو خود مختار اور آزاد ہو۔ جدھر منہ اٹھتا ہے چل دیتی ہو۔ اور جب جی چاہا گھر آتی ہو۔ مگر بھئی میں تو یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے پاس تو اگر کچھ رہ گیا ہے تو عزت ہی رہ گئی ہے جسے تمہارے ہاتھوں میں خاک میں ملوانا نہیں چاہتی۔ لہٰذا اب تمہارا باہر نکلنا بند۔ شریف بہو بیٹیوں کی طرح گھر میں بیٹھو۔"

اُف اتنی صلواتیں۔ وہ نڈھال سی ہو گئی۔ یوں بھی اپنی واپسی اور عذیر کے وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے اتنی پریشانی اٹھائی تھی۔ بڑی عاجزی سے بولی۔

"امی! خدارا، مجھے اتنا ذلیل تو نہ کیجیے۔ پہلے میری بھی تو کچھ سن لیجیے۔"

"اے کیا کروں گی تمہاری کچھ سن کر۔ اللہ سعد کو عمر دے وہ مجھے سب کچھ بتا گیا۔ لیکن اگر وہ نہ آتا تو تم کیا کرتیں یہی نا کہ اکیلی گھر آتیں یا پھر عذیر کے انتظار میں رات گئے تک وہاں کھڑی رہتیں۔ بڑی جرأتیں بڑھ گئی ہیں تمہاری۔ تو بھلا جوان جہان لڑکی اور یوں سارے زمانے میں اکیلی پھرے۔ اے ناک کٹوانے میں کوئی کسر باقی چھوڑی ہے تم نے۔" ماں پھر شروع ہو گئیں تو چھوٹی نے زچ ہو کر کہا۔

"امی! اصل میں ساری غلطی تو عذیر کی تھی جب اسے معلوم تھا آپا اس کے ساتھ واپس آتی ہیں۔ اور یہ وقت پر نہ پہنچ سکا۔ تو وہ اس کے انتظار میں کھڑی رہیں گی تو یہ کیوں خواہ مخواہ ہی اسکاؤٹ لڑکوں کی ٹیم کے ساتھ چل دیا۔ آپا! آپ ہی دو چار ہاتھ رسید کیجیے اس کے تاکہ آیندہ یہ ایسی حرکت نہ کرے۔"

"ارے نہیں چھوٹی ابھی امی سے ایسا زبردست دو ہتھڑ پڑوا دیا کہ ایک آدھ پسلی تو چٹخ گئی ہو گی میری۔"

"تو میں نے کب پڑوایا۔ واہ خواہ مخواہ میرا نام لے لیا۔" چھوٹی لڑنے کے سے انداز میں بولی۔

"تم نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ امی کو مارنا پڑا۔"

"لیکن میں نے جان کر تو نہیں کی۔ دوپہر کو ہماری ٹیم کا میچ تھا۔ اسکاؤٹ ٹیم کے سر نے مجھے ریفری بنایا تھا۔ اس لیے مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ اور اسی وجہ سے واپسی میں دیر ہو گئی۔ مجھے خود آپا کی طرف سے فکر لگی ہوئی تھی کہ بے چاری میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ تم نے میری بات بھی نہیں سنی اور امی کو مجھے مارنے پر اکسایا تو انہوں نے مجھے دو ہتھڑ مار دیا۔" عذیر بھی لڑنے کے سے انداز میں بولا تو خورشید جہاں ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"ہائے میرے کھوٹے نصیب۔ لو اب ان دونوں موذیوں نے لڑنا شروع کر دیا۔ ارے کتنی بار کہا ہے کہ اس روز روز کی کِل کِل جھک جھک سے گھر کا رزق اٹھ جاتا ہے۔ ایسی سادہ سی آتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ خود اپنی آنکھوں سے اپنی حالت دیکھ رہے ہو۔ اور پھر بھی باز نہیں آتے۔" پھر وہ عنبر سے مخاطب ہو کر بولیں جو ابھی دروازے کے آگے ہی کھڑی تھی۔

"اب یہاں کھڑی کیا سوچ رہی ہو۔ چلو منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔ میرا تو بھوک کے مارے کلیجہ لق لق کر رہا ہے۔ اور ابھی کسی نے نہیں کھایا۔ بھلا پریشانی میں بھی کچھ کھایا جاتا ہے اور ہاں ٹائپنگ وائپنگ گئی بھاڑ میں۔ اب کل سے تم کہیں نہیں جاؤ گی۔"

تب اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ جلدی سے لباس تبدیل کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھ جائے۔ ورنہ مزید کچھ کہنے پر وہ واقعی گھر میں محصور ہو کر رہ جاتی۔ کیونکہ ماں کی عادت سے بخوبی واقف تھی کہ ان پر بھی کسی بات کی ضد چڑھ جاتی تو پھر خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جاتی ان کی نہ کو ہاں میں نہیں بدلا جا سکتا تھا۔

اس کے مزاج میں طنطنہ تھا۔

یا وہ تنک مزاج تھی۔ نکیلی تھی۔ خودسر تھی۔

لیکن وہ ماں سے بہت ڈرتی تھی۔ اور اسی قدر ان سے محبت بھی کرتی تھی۔

اور جب ماں کا غصہ فرو ہو گیا۔ اور کھا پی لینے کے بعد تینوں بہن بھائی بیٹھک میں آکر بیٹھے تو چھوٹی کے اشارہ کرنے پر عذیر نے عنبر سے پوچھا۔

"ہاں تو اب ذرا اطمینان سے سعد بھائی سے ملاقات اور پھر ان کے ساتھ گھر تک آنے کا آنکھوں دیکھا حال تو سنا دیجیے۔" تو وہ ایک دم ہی بھبھک کر بولی۔

"کیا جوتے کھانے کا ارادہ ہے۔ جو ایسی بے ہودہ باتیں کر رہے ہو۔"

"لیجیے، بھلا اس میں بے ہودگی کی کیا بات ہوئی۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ سعد بھائی آپ کو ملے کیسے مگر آپ کی تو وہی مثل ہو گئی کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔" اتنا کہہ کر عذیر چھلانگ مار کر اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اور چھوٹی کو اپنی ہنسی روکنی مشکل ہو گئی۔

"دیکھا چھوٹی یہ اسکول میں جا کر کس قدر بے ادب اور ڈھیٹ ہو گیا ہے۔" اصل میں تو وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ دسویں میں جا کر۔ مگر غصے میں اس کے منہ سے اسکول نکل گیا۔

"ہاں ہاں، اسکول میں جا کر دیدہ ہوائی ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں ہوا بھر گئی بلکہ آنکھوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ لہٰذا اسے میاں مخنچو کل سے تمہارا اسکول جانا بند۔" اس نے ماں کے سے انداز میں کہا تو چھوٹی منہ پر ہاتھ رکھ کر بری طرح ہنسنے لگی۔

"ہاں ہاں خوب ہنس لو۔ تم کیا اس بدذات سے کم ہو۔ مجھے سب معلوم ہے تم نے اسے ایسی باتیں کرنے پر اکسایا ہوگا۔" چھوٹی کے ہنسنے پر وہ اس کے سر ہو گئی۔

"نہیں نہیں، ایمان سے آپا میں نے تو اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ خود ہی پرلے درجے کا شریر ہو گیا ہے۔ ویسے آپا اس کی تو یوں ہی مذاق کرنے کی عادت ہے ورنہ اس نے کوئی غلط بات تو نہیں پوچھی تھی۔ مجھے بھی بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ سعد بھائی آپ کو کیسے مل گئے اور آپ نے ان کے ساتھ آنا کیسے گوارا کر لیا۔" چھوٹی نے بڑی خوبصورتی سے گھما پھرا کر آخر وہ بات پوچھ ہی لی جو اتنی دیر سے اس کے تجسس کا باعث بنی ہوئی تھی۔

"بھئی سچویشن ہی کچھ ایسی تھی کہ میں عذیر کا انتظار کرتے کرتے جو بس پکڑنے اسٹاپ پر کھڑی ہوئی، سعد نے مجھے دیکھ لیا۔ اور مجھے بیٹھنے کی پیش کش کی تو نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے بیٹھنا ہی پڑا۔ یوں بھی فہد ان کے ساتھ تھا۔" اس نے مختصر پیرائے میں بڑی سنجیدگی سے بتایا۔

"فہد کون آپا؟" چھوٹی نے پوچھا۔

"سعد کا چھوٹا بھائی۔ مگر بڑی آفت شے ہے وہ۔" اس نے بتایا تو عذیر پٹ سے بولا۔

"ہاں چھوٹی آپا ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ سعد بھائی کی ڈیٹو کاپی ہے وہ۔"

"چلو ذلیل کہیں کے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تو نہ تھا۔ میں تو اس کی حاضر جوابی کا ذکر کر رہی تھی۔" عذیر کی بات پر وہ تھوڑا سا جھینپ کر بولی۔

"بھئی آپا آپ ذرا اپنی لینگویج کا۔ خیال رکھا کریں۔ آپ بڑے ہونے کا اتنا بڑا کریڈٹ نہیں لیا کیجیے۔" عذیر نے اس کے ذلیل کہنے پر فوراً ہی اسے ٹوکا۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا آپا؟" چھوٹی کو بس سعد کے بارے میں جاننے کی پڑی تھی۔

"ہوتا کیا۔ میں نے سوچا کہ بس میں تنہا جانے سے تو بہتر ہے کہ سعد کی پیش کش قبول کر لو۔ چنانچہ میں ان کی کار میں بیٹھ گئی۔ البتہ فہد تمام راستے بڑی دلچسپ باتیں کرتا رہا۔" اس نے کہا تو چھوٹی نے قدرے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا تو کیا گاڑی کو سعد بھائی چلا رہے تھے یا ان کا بھائی فہد۔"

"نہیں سعد ہی ڈرائیو کر رہے تھے۔"

"اتنی بڑی اور بالکل نئی چمچماتی ہوئی گاڑی تھی چھوٹی۔ شاید سعد بھائی نے حال ہی میں خریدی ہے۔" عنبر کے مزید کچھ کہنے سے پہلے عذیر متاثر سے انداز میں بولا تو وہ ہنسنے لگی۔

"ارے نہیں بے وقوف۔ وہ بے چارا اتنی قیمتی گاڑی کیسے خرید سکتا ہے۔ اس کی تو اتنی حیثیت ہی نہیں ہے۔ وہ تو اپنے باس کی گاڑی لایا تھا۔ شاید فہد کو گھمانے پھرانے کی غرض سے وہ نیا نیا ابھی تو کراچی آیا ہے۔"

"کمال ہے آپا! آپ سعد بھائی کو کیا ایسا چیپڑ قناتیا سمجھتی ہیں۔ کہ وہ کسی اور کے یہاں ڈرائیوری کریں گے۔ ایمان سے مذاق کیا ہوگا انہوں نے آپ سے۔ کیونکہ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نئی گاڑی خرید رہے ہیں۔ اور معلوم ہے آپا وہ ٹیوشن پڑھانے کے بعد جب مجھے چھوڑنے آتے تھے تو اپنی ٹیوٹا میں آتے تھے۔" عذیر بولا تو اس نے اس کی باتوں کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"چلو چلو، اب سعد کی زیادہ چاپلوسی نہ کرو۔ وہ بڑا کائیاں شخص ہے تمہیں اگر ڈراپ کرنے بھی آتا ہوگا تو اپنے کسی سیٹھ کی کار ہی لاتا ہوگا۔"

"کیا بات ہے آپا! آپ کا امپریشن سعد بھائی کی طرف سے اتنا خراب کیوں ہے۔ شاید اس بات پر سعد بھائی کہتے ہیں۔" عذیر کہتے کہتے ایک دم ہی خاموش ہو گیا۔ تو نہ چاہتے کے باوجود عنبر کے منہ سے نکلا۔

"کیا کہتے ہیں؟" اور چھوٹی تو عذیر کے پیچھے ہی پڑ گئی۔

"ہاں ہاں کیا کہتے ہیں سعد بھائی۔ بتاؤ نا پلیز۔" مگر عذیر بات ٹالنے کی غرض سے بولا۔

"ارے کچھ نہیں کہتے۔ وہ تو میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔"

"نہیں نہیں۔ اب بات کو پلٹنے کی کوشش نہ کرو عذیر۔ جلدی سے بتاؤ کہ کیا کہہ رہے تھے سعد بھائی۔ ہاں ہاں بولو۔ بولو کیا کہتے ہیں سعد بھائی؟"

چھوٹی نے بات اگلوانے کی غرض سے اسے بری طرح گُدگُدا ڈالا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے تو کچھ بتا کر نہیں دیا لیکن اس کے بھونڈے طریقے سے زور زور سے ہنسنے کی وجہ سے خورشید جہاں جو کھانے کے بعد پڑ کر سو جانے کی عادی تھیں ان کی آنکھ سوتے سوتے کھُل گئی اور وہ کلیجہ پکڑے پکڑے بیٹھک میں آگئیں۔

"اے ہے کیا آفت آگئی تجھ پر عذیر! کیوں اس قدر زہرا پھاڑ رہا ہے ملعون۔ موذی!" اور پھر یہی نہیں بلکہ وہ تیزی سے جھپٹ کر عذیر کے نزدیک آئیں جو گدگدی کرنے کی وجہ سے فرش پر اوندھا پڑا اماں کے فضیحتوں کے باوجود چپکے چپکے ہنس رہا تھا۔ انہوں نے ایک کہی نہ دو اور جھک کر اس کی کمر پر دو تین تھپڑ رسید کر دیے اور وہ بدذاتی میں اور بھی زور زور سے چیخنے لگا۔

"آج تو اس کی خیر نہیں۔ امی اس کی پسلیاں توڑ کر رہیں گی۔" چھوٹی نے ہنس کر آہستہ سے عنبر کے کان میں کہا تو عنبر جو اتنی دیر سے اپنی ہنسی روکے بیٹھی تھی اس کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ اور خورشید جہاں ان دونوں کو ہنستا دیکھ کر منہ ہی منہ میں انہیں ہزاروں صلواتیں سناتے ہوئے اندر کمرے میں چلی گئیں۔

"معلوم بھی ہے، وہ مجھ پر اپنی انگلش کا رعب جھاڑ رہا تھا اور ایسے اناڑی پن سے انگلش بول رہا تھا کہ مجھ سے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گئی۔" عنبر نے خوب ہنس لینے کے بعد بتایا۔

"کون بول رہا تھا آپا؟" چھوٹی نے اپنی ہنسی کو بریک لگا کر پوچھا۔

"بھئی وہی سعد اور کون۔" وہ جھلا کر بولی۔

"لیکن ہنسنے کی کیا بات تھی آپا، وہ تو بہت اچھی انگلش جانتے ہیں۔" چھوٹی نے کہا۔

"ہاں بہت اچھی۔ جبھی تو ایک دم جاہلوں کی طرح بات کر رہا تھا۔" عنبر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"اوہو آپا اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ ـــ"

"چھوٹی، گھوڑا گھاس کھاتا ہے نا اور اب دیکھ لینا میں نے بھی تم سے ان چانٹوں کا بدلہ نہ لیا ہو تو میرا بھی نام عذیر نہ ہوگا۔" چھوٹی کی بات درمیان سے کاٹ کر عذیر نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے گویا اپنے پیٹے جانے پر اسے دھمکی دی۔

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو عذیر۔ یہ بدلہ لینے سے پہلے تم نے گھوڑا گھاس کھاتا ہے کیوں کہا تھا؟" عنبر جسے معلوم تھا بات کہنے سے روکنا ہو تو گھوڑا گھاس کھاتا ہے کہا جاتا ہے، دوسرے معنوں میں یہ ایک کوڈ ورڈ ہوتا ہے۔

"ارے نہیں آپا یہ عذیر تو یونہی اوٹنگی بونگی بولتا رہتا ہے۔ ہاں بھلا اس وقت یہ گھوڑا گھاس کھاتا ہے کہنے کی کیا تک تھی۔" چھوٹی نے اپنی بات کہتے کہتے عذیر کو گھور کر کہا۔

"چلو چلو، اب مجھے اتنا بے وقوف بھی نہ سمجھو۔ کوئی بات ہے ضرور جسے تم دونوں مجھ سے چھپانا چاہ رہے ہو۔"

"آپا سچی میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔ اُف میری توبہ ـــ جو اَب میں کبھی اُلٹی سیدھی بات کہوں۔" عذیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور پھر دیوار میں نصب بڑے سے وال کلاک پر جو اس کے دادا کے وقتوں کا تھا اس کی نظر پڑی تو اس نے کہا۔

"باپ رے! سوا دس بج رہے ہیں اور مجھے کل میچ کی وجہ سے صبح سویرے سویرے اسکول جانا ہے۔"

"ہاں بھئی اب سونا چاہیے۔" عنبر نے جمائی لے کر کہا اور پھر عذیر کو بیٹھک میں ہی چھوڑ کر کہ وہ وہیں پلنگ ڈال کر سوتا تھا، دونوں بہنیں شب بخیر کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ان دونوں نے تو بڑی احتیاط برتی تھی کہ کہیں کھٹکا ہونے کی وجہ سے ماں کی آنکھ نہ کھُل جائے ـــ مگر ماں کی نیند ٹوٹ گئی تھی اور وہ جاگ گئی تھیں لیکن آنکھوں پر ہاتھ رکھے یوں لیٹی تھیں جیسے سو رہی ہوں۔ عنبر، چھوٹی اور عذیر کے ہنسنے اور ڈسٹرب کر دینے پر انہیں غصہ نہیں آیا تھا، ان پر رحم آیا تھا۔ کہ بے چارے بچے کب کب ہنستے ہیں، ہمیشہ تو پریشانیوں میں گھرے رہتے ہیں۔ اچھا ہے تھوڑی دیر ہنسی مذاق کر کے دل خوش کر لیں۔ اسی وجہ سے تو وہ ان کا [illegible] رنے کے بجائے لاڈ میں عذیر کی پیٹھ پر ایک تھپڑ مار کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

اصل میں جب سے انھوں نے چھوٹی کی زبانی یہ سنا تھا [illegible] یحان نے عنبر کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ سعد سے شادی کر لے۔ ان کے ذہن میں آس کا ایک شعلہ سا لپکا تھا۔ امید کا ایک چر[illegible]غ سا روشن ہو گیا تھا کہ وہ تو خود بھی سعد کو دل سے پسند کرتی تھیں کیونکہ اس نے حیثیت کے فرق کو بالکل مٹا دیا تھا اور پوری سچائی قلب سے ان سے ملتا تھا۔ اپنے سگوں نے تو انہیں ـــ دھوکا دیا تھا۔ ان کی مفلسی کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا ہی ترک کر دیا تھا۔ جیٹھ تو جیٹھ خود سگے اور اکلوتے بھائی کا بھی یہی حال تھا۔ گویا سگوں میں تو ان کا کوئی پرسانِ حال ہی نہ رہا تھا اور سعد سے اگر دور کا بھی رشتہ تھا وہ بھی سسرالی رشتہ ـــ تو بھی اپنوں سے زیادہ خلوص سے پیش آتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وسیوں باتوں میں ان کے کام آتا تھا۔

حتیٰ کہ عذیر کی پڑھائی کے سلسلے میں جہاں پیسے کی ضرورت پڑتی تھی اس نے اپنی جیب سے اس ضرورت کو پورا کیا تھا۔ گویا عذیر کو پڑھایا بھی تھا اور پڑھوانے کا سامان بھی کر دیا تھا۔ اس کو چند ماہ کے لیے ٹیوشنیں بھی دلوا دی تھیں اور جب بھی ان کے گھر آتا کبھی خالی ہاتھ نہ آتا تھا۔

موقعوں موقعوں سے مٹھائی لانا۔ عید بقر عید پر چھوٹی اور عذیر کو تحفے دینا۔ خود ان کے لیے بھی کبھی کچھ لانا اور کبھی کچھ۔ حالانکہ وہ لاکھ منع کرتیں مگر وہ ان کی کب مانتا تھا۔ بلکہ ان کے انکار کے باوجود ان کے لیے لائی ہوئی چیزیں زبردستی ان کو دے کر رہتا تھا۔

لیکن عنبر ان ساری باتوں سے مستثنیٰ تھی۔ اور اس سے کھنچی کھنچی اور کبیدہ سی رہتی تھی۔ اور اس کی وجہ کیا تھی خورشید جہاں کی سمجھ میں یہ کبھی نہیں آیا تھا۔ مگر سعد کو پہلی مرتبہ دیکھ کر ایک بے نام سی تمنا نے انگڑائی لی تھی۔ اور وہ تمنا کیا تھی یہ اب چھوٹی کی زبانی ساری حقیقت کھلنے پر ہی انہیں معلوم ہوا تھا

کہ ان کے دل نے کیا خواہش کی تھی۔

کیا چاہا تھا ـــ اور جو چونکہ اس وقت ایک ناممکن اور غیر مناسب سی بات تھی، اس لیے وہ اسے اپنے دل کے اندر ہی کہیں گھونٹ کر رہ گئی تھیں۔ مگر اب تو وہ اُبھر کر دندناتی ہوئی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

پھر کتنی ہی بار انہوں نے چاہا تھا کہ وہ سعد سے اس معاملے میں بات کریں لیکن عنبر کی ناپسندیدگی تو بعد کی بات تھی لڑکی کی ماں ہونے کی وجہ سے خود اپنے منہ سے کچھ کہنے کا انہیں حوصلہ نہیں پڑتا تھا کیونکہ غیرت اور خودداری ان میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ غریب تھیں اور گویا یہی ان کی میراث تھی۔ ورنہ ان کے بقول ان کے پاس سوائے غیرت، خودداری اور عزت کے اور تھا ہی کیا۔

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے عنبر کے معاملے میں اپنے جیٹھ جیٹھانی سے کبھی کھل کر بات نہیں کی تھی البتہ یاددہانی کے طور پر موقع موقع سے اتنا ضرور کہہ دیا کرتی تھیں کہ عنبر کی طرف سے انہیں بڑی پریشانی لاحق رہتی ہے۔ایک بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔انہیں اپنے کاندھوں پر اور وہ چاہتی ہیں کہ جلد سے جلد اس کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔کبھی کہتیں۔

"اب تو عنبر گیارہویں جماعت میں آگئی ہے۔اب میں اسے زیادہ نہیں پڑھواؤں گی۔یوں بھی خیر سے بیس برس کی ہو چکی ہے بس اب تو میری دلی تمنا یہ ہے کہ جلد از جلد اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔"

بھلا اتنے واضح اشارے کرتی تھیں وہ اپنی زبان سے، اس کے باوجود بھی جیٹھ کہتے تھے۔

"اوہو بھئی بھوجائی۔تم عنبر کی عمر جتانے کیوں بیٹھ جاتی ہو۔آج کل تو ویسے بھی پچیس چھبیس برس کی عمروں میں لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔تم پریشان مت ہو۔انشاءاللہ عنبر کے فرض سے بھی جلد سبکدوش ہو جاؤ گی۔" اور جیٹھانی بیزاری سے کہتیں۔

"ارے ایسی بھی کیا جلدی ہے خورشید! ابھی تو اس نے انٹر بھی پاس نہیں کیا۔اسے تو ابھی پڑھنے ہی دو۔تاکہ اسے بھی آداب مجلس اور سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا آئے۔اسے تو تم انگریزی سکھواؤ کیونکہ انگریزی جانے بغیر آج کل بڑے سے بڑے پڑھنت کی بھی قدر نہیں ہوتی۔"

اور یہی وجہ تھی کہ میٹرک کے بعد بھی خورشید جہاں نے عنبر کی تعلیم کو جاری رکھا تھا اور دیوانگی کی حد تک اس کے انگریزی پڑھنے کے شوق پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔

بہر حال اتنی پرانی نسبت کا معاملہ تو اب رفت گزشت کے مصداق ختم ہی ہو گیا تھا۔اصل میں جب سے چھوٹی نے انہیں یہ بتایا تھا کہ عنبر سعد سے اس وجہ سے بھی خار کھاتی ہے کہ اس کا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ سعد نے یہ دیکھ کر کہ ریحان کسی اور لڑکی سے شادی کر رہا ہے ریحان کی خوب خوشامد درآمد کی ہو گی کہ ریحان اس کی شادی عنبر سے کروا دے ورنہ ریحان کو عنبر سے کبھی ایسی غلط بات کہنے کی جرأت نہ ہوتی اور اسی بات کو مدنظر رکھ کر انہوں نے سوچا کہ خیر خوشامد درآمد کرنے کے بارے میں تو عنبر نے یوں ہی جل کر سوچا ہو گا۔لیکن کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی، یعنی سعد کی خواہش ہی ہو گی۔تبھی تو ریحان نے اتنے مزے سے اس کا نام لے دیا پھر تو سعد کو ٹٹولنا بہت ضروری ہو گیا۔

انہوں نے سوچا وہ کم از کم سعد سے اتنا تو معلوم کریں گی کہ شادی کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔یا پھر باتوں باتوں میں اس کا خیال اور ارادہ معلوم کریں گی یا پھر باتوں ہی باتوں میں اس سے یہ کہیں گی کہ وہ عنبر کی طرف سے سخت فکرمند ہیں کیونکہ ٹھکرائی ہوئی لڑکی جس کی بلا سبب اور بلا تقصیر منگنی ٹوٹ جاتی ہے اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے تیزی سے پروان چڑھتا سبز پودا اچانک ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے اور جس کی شادابی کو بحال کرنے میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے بڑا عرصہ لگتا ہے۔کیونکہ منگنی ٹوٹ جانے کے بعد پیغامات آنے کا سلسلہ تقریباً بند ہی ہو جاتا ہے اور اگر قسمت سے بھولے بھٹکے کوئی پیغام آتا بھی ہے تو کوئی نہ کوئی نکال کر واپس لوٹ جاتا ہے۔چنانچہ اگر تمہاری نظر میں عنبر کے لیے کوئی مناسب رشتہ ہو تو تم عنبر کی بات وہاں طے کرا دو۔

اس طرح خورشید جہاں کا خیال تھا کہ سعد کو اگر واقعی عنبر سے دلچسپی ہو گی تو وہ خود ہی اپنی زبان سے اس کا اظہار کر دے گا۔ورنہ وہ خود اپنے منہ سے تو مر کر بھی یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ سعد بیٹے تم نے تو ریحان کے ذریعے عنبر پر اپنا پیام بھجوایا تھا پھر اب خاموش کیوں ہو۔ یا یہ کہ تم نے عنبر کو دیکھ رکھا ہے۔تم اس کی عادات، مزاج، کردار حتیٰ کہ حالات سے بھی بخوبی واقف ہو۔تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ریحان سے اس کی نسبت ٹوٹنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔تم اگر اس کا ہاتھ تھامنا چاہو تو میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات شاید ہی کوئی ہو گی۔

بہر حال انہوں نے سعد کا خیال اور ارادہ معلوم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ادھر انہوں نے یہ تہیہ کر لیا تھا اور ادھر عنبر جو شادی نہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی اسی فکر میں رات بھر ڈھنگ سے نہ سو سکی تھی کہ ماں نے اگر واقعی گھر سے نکلنے کی پابندی لگا دی تو پھر پیسوں کا الگ نقصان ہو گا سو ہو گا۔میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھنے سے محروم رہ جاؤں گی۔جب کہ اچھی سروس کے حصول کے لیے ان دونوں چیزوں کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔اس وقت تو چھوٹی سو گئی تھی کہ اس سے اپنے اس مسئلے کا حل تلاش کر لینے کو کہتی۔البتہ صبح ناشتا تیار کرتے ہوئے اس نے چھوٹی سے کہا۔

"اے سنو چھوٹی۔اب تم امی کو کسی نہ کسی طرح راضی تو کرا دو۔"

"کس بات کے لیے؟" چھوٹی نے انتہائی بدتمیزی سے مسکرا کر پوچھا۔تو اسے تاؤ تو بہت آیا مگر چونکہ اسے چھوٹی سے اپنا کام لینا تھا اس لیے اس نے رسانیت سے کہا۔

"ہر بات کو مذاق میں لینا اچھا نہیں ہوتا چھوٹی۔میں تو اسی فکر میں رات کو ڈھنگ سے سو بھی نہیں سکی کہ اگر امی نے سچ مچ میرے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی تو۔"

"ہاں۔یہ خیال تو مجھے بھی پریشان کر رہا ہے۔مگر امی کو کیسے راضی کر سکتی ہوں آپا! جب کہ کل تو غصے میں وہ شاید قسم بھی کھا چکی ہیں کہ آئندہ آپ کو گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالنے دیں گی۔ہاں البتہ۔" چھوٹی کچھ کہتے کہتے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی تو عنبر نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں البتہ کیا؟ کیا کوئی ترکیب ہے تمہارے دماغ میں؟"

"ہوں۔میں سوچ رہی تھی کہ کاش اس وقت سعد بھائی کہیں سے آنکلیں تو پھر۔" چھوٹی کے منہ سے سعد کا نام سن کر عنبر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ کہیں وہ اسے چھیڑنے کی غرض سے تو سعد کا نام نہیں لے رہی۔مگر چھوٹی کے چہرے پر دور تک کوئی ایسا تاثر نظر نہیں آیا تو اس نے منہ بنا کر تلخ سے لہجے میں کہا۔

"چھوڑو چھوٹی! سعد اس وقت آ کر ایسا کیا تیر مارے گا۔تم تو جانے کیوں اس کی اتنی چاپلوسی کرتی ہو۔"

"آپا! اینگو یج پلیز کسی کو اس قدر گرا کر بات کرنا کچھ اچھا نہیں ہوتا اور سعد بھائی تو کیا میں تو کبھی آپ کی بھی چاپلوسی نہ کروں۔ بڑی ناک چوٹی گرفتار ہوں میں۔"

"اوہو تم تو ذرا ذرا سی بات پر برا مان جاتی ہو ورنہ میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اپنے ذاتی معاملات میں کسی اور کو شامل کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔امی کا دل بہت نرم ہے۔اگر ان کی خوشامد درآمد کی جائے تو وہ یقیناً اجازت دے دیں گی۔" چھوٹی بہن کے ٹوکنے پر عنبر اندر ہی اندر خجل ہو کر بولی۔

"اچھا اگر یہی بات ہے تو پھر جائیے خود ہی خوشامد درآمد کر لیجیے ان کی۔"

چھوٹی نے ٹرے میں چائے دانی، دو چینی دان رکھتے ہوئے کہا۔کیونکہ وہ ساتھ کے ساتھ چائے دانی میں دودھ ڈال لیا کرتی تھی۔وہ ٹرے اٹھا کر باہر جانے لگی تو عنبر نے جلدی سے آخری پراٹھا توے سے اتار کر پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ پراٹھوں کی پلیٹ کو بھی ٹرے میں رکھ لو نا۔اتنے میں چولہا ٹھنڈا کر کے اور ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔" تو چھوٹی نے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ چپ چاپ ٹرے اس کے آگے کر دی۔اور عنبر نے پراٹھوں کی پلیٹ ٹرے میں رکھ دی۔اور اس سے کہا۔

"ارے نہیں، میرا مطلب تھا تم ان سے بات کر لیتیں کیونکہ مجھ سے تو وہ سخت خفا ہیں۔"

مگر چھوٹی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ٹرے لے کر باہر نکل گئی۔عنبر کو تو پہلے ہی چھوٹی بہن سے اس انداز میں بات کرنا خوشامد سی لگ رہا تھا اس لیے اس نے بھی پھر کچھ نہیں کہا اور ہاتھ دھو کر وہ بھی برآمدے میں آگئی۔

چھوٹی نے ناشتے کی ٹرے تخت پر بچھے دسترخوان پر رکھ دی تھی۔جب پر چائے کے چھوٹے چھوٹے مگ اور چند پلیٹیں عنبر نے پہلے سے چن رکھی تھیں۔ٹرے دسترخوان پر رکھنے کے بعد چھوٹی ماں کو ناشتا تیار ہو جانے کی اطلاع دینے جو اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کرتی تھیں، اندر چلی گئی اور کچھ دیر بعد واپس آئی تو عذیر اس کے ساتھ تھا۔وہ آتے ہی عنبر کے پاس بیٹھ کر بولا۔

"آپا! آپ فکر نہ کریں۔میں امی سے بات کر لوں گا۔بس آپ اتنا کیجیے گا کہ بالکل خاموش بیٹھی رہیے گا۔"

اور اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ چھوٹی نے اندر جا کر عذیر کو اس کا پرابلم بتا دیا ہے۔وہ خاموش ہی بیٹھی رہی۔کچھ ہی دیر بعد خورشید جہاں بھی آگئیں اور سب نے خاموشی سے بیٹھ کر ناشتا کیا۔یوں بھی کافی دن بعد پراٹھے پکے تھے۔اور پراٹھے چاروں کو ہی مرغوب تھے۔اس لیے بڑی رغبت سے کھائے گئے۔پھر عذیر ناشتا کر کے اٹھا تو عنبر سے مخاطب ہو کر بولا۔

"آپا! آج بھی مجھے ریفری کے فرائض انجام دینے ہوں گے، مگر آپ اطمینان رکھیے۔آج مجھے دیر نہیں ہو گی۔میں زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے تک آپ کے سینٹر پہنچ جاؤں گا۔" وہ اسے جواب دینے کے بجائے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

جھنجھلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں تمہیں کہیں جانے کی۔ یہ عنبر اب وہاں نہیں جائے گی۔" تو عذیر نے بناوٹی استعجاب کے ساتھ پوچھا۔

"کیوں امی! آپا کیوں نہیں جائیں گی؟"

"بس کہہ جو دیا کہ نہیں جائے گی یہ۔ لو بھلا غضب، اندھیر۔ جوان جہان لڑکی اور رات کو گھر آئے۔ اپنی عزت پر ہنسوانے سے زیادہ میں یہی بہتر سمجھتی ہوں، یہ گھر میں بیٹھی رہے۔ اے ہاں نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ گھر سے نکلو گی ہی نہیں تو کس کی مجال ہو گی جو تم پر انگلی اٹھائے گا۔"

ماں کی باتوں سے صاف عیاں تھا کہ اب وہ کسی طور پر بھی سینٹر جانے کی اجازت نہیں دیں گی۔ آخر عنبر سے خاموش نہ رہا گیا تو اس نے کہا۔

"لیکن امی! میں نے بڑی دقتوں سے شارٹ ہینڈ ٹائپنگ سیکھنے کے لیے پیسے جمع کیے تھے اور الگ الگ فیس داخل کر کے داخلہ کرایا تھا۔ اس کا کیا بنے گا؟" مگر خورشید جہاں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرا۔

"اگر ادا بھی کی ہے تو یہ سمجھ لینا تمہارا صدقہ گیا۔ جان کی زکوٰۃ گئی۔"

انہوں نے سخت بیزاری سے کہا تو چھوٹی جو اتنی دیر سے گویا اپنی زبان پر جبر کیے خاموش بیٹھی تھی تنک کر بولی۔

"واہ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی امی! آپا کی محنت کی کمائی کو اس قدر تو ارزاں نہ کیجیے۔ یوں بھی ہمیں دھیلے دھیلے کو ترسنا پڑتا ہے۔ اگر آپا کچھ سیکھ لیں گی تو یہ ہم سب کے لیے ہی اچھا ہو گا کیونکہ ہمارے ماضی اور حال پر تو بدقسمتی کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ مستقبل کی بھی خبر نہیں کہ کس طرح گزرے گا۔ آپا کے ہاتھ میں اگر کوئی ہنر ہو گا تو یہ کم از کم کسی کی محتاج تو نہیں رہیں گی۔"

"جی ہاں امی! یہ تو چھوٹی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ اصل میں تو کل میری وجہ سے آپا کو دیر ہوئی تھی جس کی پاداش میں مجھے آپ سے مار بھی کھانی پڑی۔ آپا کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ پھر بھلا آپ انہیں کس بات کی سزا دے رہی ہیں۔" عذیر نے بھی چھوٹی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ماں کو قائل کرنے کی غرض سے کہا، جسے اسکول جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔

"ہاں واقعی آپا کا اس میں بھلا کیا قصور ہے، بلکہ پریشانی بھی سب سے زیادہ انہوں نے اٹھائی ہو گی۔ مگر دیکھیں خدا نے ہم پر کتنا کرم کیا کہ اس سے زیادہ پریشانی اٹھانے کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ اور سعد بھائی کو فرشتۂ رحمت بنا کر ان کے پاس بھیج دیا۔"

عذیر کے خاموش ہوتے ہی چھوٹی نے بول کر گویا ماں کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور خورشید جہاں یوں خاموش بیٹھی رہیں جیسے کسی تذبذب کا شکار ہوں۔ انہوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ البتہ ناشتا ختم کر کے اٹھیں تو عذیر کو جو اس اثنا میں تیار ہونے اندر چلا گیا تھا، انہوں نے پکار کر کہا۔

"ارے عذیر! اگر سعد تمہیں کہیں مل جائے تو اسے فوراً میرے پاس بھیج دینا۔ ایک ضروری بات کرنی ہے مگر کہیں اسے یہ نہ بتا دینا کہ امی نے ضروری بات کرنے کی غرض سے بلایا ہے۔ سمجھے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ بیٹھک میں داخل ہو گئی تھیں ان کی اس بات پر چھوٹی نے بڑی شوخ سی نظروں سے عنبر کی طرف دیکھا اور پھر اس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ نیچے جھکا لیا۔ عنبر نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا ضرور لیکن کچھ بولی نہیں کہ اس لمحے تو اسے صرف اور صرف اپنے سینٹر جانے کی فکر لاحق تھی ماں اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ گویا اب اس سلسلے میں کچھ کہنے کا امکان ہی نہ رہا تھا۔ اس اثنا میں عذیر جلدی جلدی جوتے پہن کر تیار ہو گیا تھا۔ وہ اسکول جانے لگا تو عنبر نے انگلش میں اس سے کہا۔

"عذیر! ڈونٹ فورگیٹ ٹو پک می فروم دیئر" (مجھے وہاں سے پک کرنا نہ بھولنا) تو عذیر نے ہاں یا نا میں جواب دینے کے بجائے جاتے جاتے رک کر استہزائیہ سے انداز میں کہا۔

"آپا! آپ جو یہ انگریزی بولتی ہیں نا یہ ماڈرن گھرانوں میں ہی چل سکتی ہے ورنہ یہاں اس علاقے میں بولو تو دوسرے مذاق اڑاتے ہیں بلکہ نقلیں اتارتے ہیں۔"

"اگر نقلیں اتارتے ہیں یا مذاق اڑاتے ہیں تو یہ ان کی جہالت کی ہی دلیل ہے۔ کیونکہ انگلش کوئی ایسی ماورائی زبان تو نہیں ہے۔ یہ کہو کہ ہمارے ملک میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اسے جانے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔ اور اس کے آگے اپنی قومی زبان کو بے وقعت کیا جاتا ہے ورنہ انگریزی کے لفظ تو ان پڑھ اور ادنیٰ طبقے کے لوگ بھی اپنی گفتگو میں استعمال کرتے

ہیں۔" عنبر نے کہا تو عذیر نے شرارت سے کہا۔

"اچھا اچھا! باقی لیکچر آ کر سنوں گا۔ اس وقت تو اجازت دیجیے۔ خدا حافظ۔" اتنا کہہ کر عذیر بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ تو چھوٹی نے جو اسی وقت بیٹھک میں آئی تھی، ہنستے ہوئے کہا۔

"آپا! یہ عذیر تو بہت چل نکلا ہے۔ مگر یہ غلط نہیں کہہ رہا۔ روشن کی امی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں گلشن (روشن کی چھوٹی بہن) کو ساتھ ساتھ انگریزی بولنی بھی سکھا دیا کروں۔ اور میں جب بھی اس سے انگریزی میں کوئی جملہ کہتی ہوں۔ مثلاً سٹ ڈاؤن، کیپ کوائٹ۔ اوپن یور بک وغیرہ تو نہ صرف وہ ہنستی ہے بلکہ اس کا بھائی اور خود روشن بھی ہنسنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ان کی اس جہالت پر بڑا غصہ آتا ہے۔ اور کبھی دل چاہتا ہے کہ آئندہ ساری زندگی کے لیے انگلش نہ بولنے کی قسم کھا لوں۔"

"چھوڑو چھوٹی! فورگیٹ اٹ۔ اصل میں جیسی ذہنیت ہوتی ہے ویسی ہی انسان کی سوچ بھی ہوتی ہے۔ اب کسی کی ذہنیت کو بدلا تو نہیں جا سکتا نا۔ عالیہ ٹھیک ہی کہتی ہے کہ ان دنیا والوں اور رشتے داروں کے اعتراضات کی پروا ہی نہ کیا کرو کیونکہ جب تم پر کوئی وقت پڑتا ہے تو کوئی بھی تمہارے کام نہیں آتا۔ اور پھر تم کسی کا دیا نہیں کھاتیں۔"

عنبر کو اپنی ہی پڑی تھی اس لیے وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے آپا! مگر یہ پروا نہ کرنے کی بات بھی بڑے گھروں میں چل سکتی ہے۔ کیونکہ وہاں ایک تو ایک دوسرے کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ لوگ اگر کوئی معیوب بات بھی کرتے ہیں تو ان کے کروفر اور ٹھاٹ باٹ دیکھ کر دوسرا اگر اعتراض بھی کرنا چاہے تو اس کا منہ بند ہی ہو جاتا ہے۔ جب کہ ہماری بات کچھ اور ہی ہے۔ سب سے پہلے تو ہمارے ہاں محلے داری اور حق ہمسائیگی کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ احتیاط بھی لازمی ہوتی ہے کہ محلے کی ریت اور رواج کے خلاف ہم سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے ورنہ محلے والے صرف حقہ پانی ہی نہیں بند کر دیتے بلکہ محلے سے نکلوا پھینکنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔" چھوٹی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ سخت بیزار کن لہجے میں بولی۔

"او ہو بھئی، سب معلوم ہے مجھے بھی۔ مگر یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میں تو اس وقت ایک مصیبت میں گرفتار ہوں۔"

"تو کیا مجھے آپ کی مصیبت کا احساس نہیں آپا مگر آپ فکر نہ کیجیے۔ میں آج کسی نہ کسی طرح امی سے اجازت دلوا کر رہوں گی۔"

مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا کہ جانتی تھی کہ چھوٹی اسے محض دلاسا دینے کی غرض سے کہہ رہی ہے۔ اس نے چپ چاپ باورچی خانے کا رخ کیا تاکہ دوپہر کے کھانے کے لیے جلد جلد کچھ پکا لے۔ مگر پکانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں سوائے چنے کی تھوڑی سی دال کے۔ اس نے اسے ہی سلور کے ایک بھگونے میں بھگو دیا۔ دال بہت تھوڑی سی تھی، یعنی پکنے کے بعد ان چاروں کے لیے ناکافی ہوتی۔ ادھر عذیر بھی اس روز آٹھ بجے ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ لہٰذا بازار سے سودا منگوانے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا۔ دل تو اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ منہ لپیٹ کر بستر میں پڑ جائے۔ مگر کمرے میں ماں بیٹھی اپنی سلائی پرائی کا کام کر رہی تھیں۔ وہ ان کے سامنے جا کر لیٹتی تو پھر ان کا لیکچر شروع ہو جاتا۔ یا پھر وہ یہ ضرور پوچھتیں کہ آج اتنے ناوقت کیوں لیٹ رہی ہو۔ اپنی یہ سستی جھاڑو اور جا کر چھوٹی بہن کا ہاتھ بٹاؤ۔ حالانکہ انہیں بھی معلوم ہوتا کہ گھر میں دال کے سوا کچھ ایسی چیز ہی نہیں ہے جو پکا لی جائے۔ مگر جب ان کا موڈ آف ہوتا تھا تو وہ اسے کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں ہوتی تھیں۔

پھر گھر میں جو دال دلیہ موجود تھا پکایا بھی گیا اور کھایا بھی گیا۔ اور دو چار جملہ کام جو روزمرّہ کے تھے وہ بھی انجام دیے گئے اور یوں نہ معلوم کیسے رینگ رینگ کر دو بج گئے۔ چھوٹی کے کہنے پر اس نے اپنے کپڑے تو استری کر کے رکھ لیے تھے۔ جب سے کوئلہ اور لکڑی کا ایندھن جلنا بند ہوا تھا اور تیل کا ڈبل چولھا آیا تھا کوئلوں کی استری بھی کوٹھری یا بقول عنبر کوٹھری میں کہیں رکھ دی گئی تھی۔ عنبر کچھ ماں سے پیسے لے کر اور کچھ اپنے ملا کر بجلی کی ایک استری خرید لائی تھی۔ جسے بجلی خرچ ہونے اور ایلیمنٹ جل جانے کے ڈر سے اس قدر احتیاط سے استعمال کیا جاتا تھا کہ بس اسکول اور کالج کے یونیفارم ہی استری کیے جاتے تھے یا پھر کہیں جانا ہوتا تو وہی کپڑے جو پہن کر جانے ہوتے تھے۔ باقی روزمرّہ کے ملبوسات تو دھونے کے بعد خوب اچھی طرح جھٹک کر پھیلائے جاتے تھے اور استری کیے بغیر پہنے جاتے تھے۔ اس نے ماں سے چھپ کر کپڑے استری کیے تھے کہ چھوٹی نے خواہ مخواہ ہی اسے استری کرنے کی مشقت کرائی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں اسے جانے کی اجازت تو ملنے سے رہی تھی۔ مگر جب ڈھائی بجے تو چھوٹی نے دادا مرحوم کے انیسویں صدی عیسوی کے بڑے سے وال کلاک پر نظر ڈال کر اونچی آواز میں اس سے کہا۔

"ارے آپا! ڈھائی بج گئے ہیں اور آپ ابھی تیار بھی نہیں ہوئیں۔ کیا آج اپنے سینٹر جانے کا ارادہ نہیں ہے آپ کا؟" تو اس نے جلے کٹے سے انداز میں کہا۔

"نہیں — میں کہیں بھی جا وا نہیں رہی۔"

"مگر کیوں نہیں جا رہیں آپ — جب کہ آپ نے عذیر سے بھی کہہ دیا ہے۔ آج وہ پھر آپ کے انتظار میں کھڑا ہو کر سوکھے گا بے چارہ۔" پھر وہ امی مشترکہ خواب گاہ میں آئی جس میں یہ تینوں ماں بیٹیاں اکٹھی بیٹھتی اور سوتی تھیں۔

"امی! اب تو اجازت دے دیجیے۔ کہہ دیجیے آپا سے کہ وہ ٹائپنگ سیکھنے چلی جائیں۔ ڈھائی بج چکے ہیں اور آپا کو ٹھیک تین بجے وہاں پہنچنا ہوتا ہے۔ اگر نہیں گئیں تو خواہ مخواہ آج ان کا ناغہ ہو جائے گا۔"

اور خورشید جہاں جو ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے لیٹی تھیں، انہوں نے لیٹے لیٹے ہی بیزاری سے کہا۔

"اے چلی جائیں۔ میں کون ہوتی ہوں منع کرنے والی۔ ماشاء اللہ یہ خود مختار ہیں، آزاد ہیں جہاں چاہیں جائیں۔ جو جی چاہے کریں۔"

گو عنبر اور چھوٹی کو معلوم تھا کہ یہ طرز کلام بھی ایک انداز ہے اجازت دینے کا مگر ماں نے عنبر کو اس کی آزادانہ روش، گستاخی اور خودسری کے اس قدر طعنے دیے تھے وہ سخت دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ اور ماں نے ایک طرح گویا اجازت دیتے ہوئے بھی جب یہ کہہ کر کہ جہاں چاہیں جائیں جو جی چاہیں کریں اسے اس کی خودسری کا طعنہ دیا تو پھر خاموش رہنا اس کے بس کی بات نہ رہی۔ وہ ان کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ کر نہایت عاجزانہ لہجے میں بولی۔

"امی! خدارا مجھے اتنا گیا گزرا تو نہ سمجھیے، میں تو آپ کی تابعدار بیٹی ہوں۔ میں بھلا آپ کی اجازت اور مرضی کے بغیر کہیں جا سکتی ہوں۔ امی! میں تو بہت مجبور ہو کر ٹائپنگ وغیرہ سیکھ رہی تھی تاکہ اگر ملازمت ہی کروں تو معقول اور اچھی ہی کروں۔ اب اگر آپ کو یہ سب پسند نہیں ہے تو میں بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر میں ہی بیٹھ جاتی ہوں مگر آپ مجھ سے خفا تو نہ ہوئیے۔"

اتنا کہتے کہتے عنبر کی آنکھیں چھلک اٹھیں اور وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ اور اس کے رونے پر ماں کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اونچ نیچ سمجھانے کے لیے کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھیں مگر انہوں نے صرف اتنا ہی کہا۔

"میں تم سے خفا نہیں ہوں بیٹی۔ میں تو بس اپنی بدنامی سے ڈرتی ہوں۔ تم کو نہیں معلوم آج کل زمانہ کیسا جا رہا ہے۔ تم خیر سے جوان ہو اور اللہ نے تمہیں صورت شکل بھی اچھی دی ہے۔ تمہارا تنہا جانا ٹھیک نہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ پورے چار برس تک تمہارے تنہا کالج آنے جانے کی وجہ سے مجھے کتنی پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔"

"خیر اب ایسا اندھیر بھی نہیں پڑا امی۔ میں ہی کیا اور بھی سینکڑوں لڑکیاں تنہا بسوں میں سفر کرتی ہیں اور میں تو دن کے وقت ہی جاتی ہوں اور واپسی میں اسی لیے عذیر کو بلا لیتی ہوں کہ اگر دیر سویر ہو جائے تو کم از کم بھائی تو ساتھ ہو گا۔" عنبر اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"اچھا خیر جاؤ۔ چلی جاؤ۔ لیکن عذیر کو کبھی وہاں پہنچنے میں دیر ہو جایا کرے تو ایک وقت مقرر کر لو اس کا انتظار کرنے کا۔ اس کے بعد خود ہی چلی آیا کرو تاکہ کل کی طرح نہ تمہیں پریشانی اٹھانی پڑے نہ مجھے۔" اور اجازت ملنے کی خوشی میں عنبر نے ڈھنگ سے ماں کی بات بھی نہ سنی اور ان سے لپٹ کر بولی۔

"او امی یو آر سو گریٹ۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ عنایت۔ مہربانی۔" اور پھر منہ دھونے کی غرض سے بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ جب کہ ماں ہنستی ہی رہ گئیں۔

پھر سہ پہر کو عذیر چند منٹ کا انتظار کرانے کے بعد آیا تو کچھ اس عالم میں کہ سعد بھی اپنے سیٹھ کی کار سمیت اس کے ساتھ تھا۔ سعد کو اپنے ساتھ لے کر آنے پر عنبر کو عذیر پر غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے اپنے چہرے مہرے سے اس پر اپنی ناگواری یا خفگی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ عذیر ذرا منہ پھٹ سا تھا فوراً ہی پوچھ بیٹھتا کہ کیوں آپا آپ کس بات پر اتنی ناراض نظر آ رہی ہیں، اس لیے وہ بلا تامل اور توقف خود ہی دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جب کہ عذیر بھی دروازہ کھولنے کی غرض سے اترا تھا۔

اس مرتبہ گزشتہ روز کی طرح سعد نے لمبا چکر نہیں کاٹا بلکہ شہید ملت روڈ سے ہوتا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا۔ کچھ راستہ خاموشی سے کٹا تھا اور کچھ عذیر کی باتوں میں طے ہوا تھا جو صبح کے میچ کی گویا ریکارڈڈ کمنٹری پیش کرتا آیا تھا۔ وہ تو عنبر سعد سے بات کرنے کی روادار ہی نہیں تھی لیکن خود سعد نے بھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سعد نے گاڑی کو عین اس کے گھر کے دروازے کے آگے لا کر روکا تھا اور اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی اس کے گھر میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پھر بھی اس نے اخلاق نبھانے کی غرض سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے اور عذیر کو باہر ہی چھوڑ کر اندر آ گئی۔ اور وہ جو اس کے پیچھے پیچھے عذیر کے ساتھ اندر آ گیا تھا اور خورشید جہاں کے پاس برآمدے میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ جب تک وہ بیٹھا رہا اس کی وجہ سے وہ کمرے میں ہی مقید ہو کر بیٹھی رہی۔ جب کہ متجسس بھی بہت ہو رہی تھی کہ ماں نے سعد کو کیوں بلایا ہے — اور آخر ایسی کون سی بات کہنے کو بلایا ہے۔

مگر اس لمحے اس کا موڈ سخت آف تھا اور رہ رہ کر عذیر پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ سعد کے پاس پہنچا بھی تھا تو اس کی گاڑی میں طارق روڈ سے پک کرنے کیوں آیا۔ کیوں نہ ٹالا بالا اسے گھر بھیج دیا۔

اصل میں اسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ بار بار اس کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر آئے کیونکہ گزشتہ روز کی بات تو اور ہی تھی۔ یعنی کہ وہ تو محض ایک اتفاق ہی تھا لیکن آج تو عذیر باقاعدہ اسے پکڑ کر لایا تھا۔ تمام راستے وہ خاموش سا رہا تھا اور کسے معلوم تھا کہ اس طرح عذیر کے ساتھ آنا اسے اچھا بھی لگا تھا یا نہیں۔

ایسے حالات میں جن میں کہ وہ گرفتار تھی — یعنی — ایک رخ تو بالکل پستیوں میں اترا ہوا تھا اور دوسرا رخ بلندیوں پر پہنچا ہوا تھا اور جو ہر چند کہ اس کا نہ تھا لیکن اس کے اپنے سگوں کا ضرور تھا۔ گو اس کے لیے ان بلندیوں تک پہنچنا تو ممکن ہی نہیں ہوا تھا لیکن اس نے ان بلندیوں کو چھو کر ضرور دیکھ لیا تھا۔

اپنے تایا کے یہاں کے کروفر۔ ان کے طور طریقے۔ طنطنہ۔ نازک مزاجی۔ نخرہ اور اسٹائل۔ اونچے اور روشن خیالات۔ اور خداوند تعالیٰ نے اسے غیرت، شرم، خودداری اور شرافت جیسے جوہروں سے تو پہلے ہی نواز رکھا تھا۔ اس پر پیدائشی طور پر بھی شاید اس کے مزاج میں طنطنہ اور نزاکت بہت تھی۔ اس نے بھی اپنا ایک اسٹائل بنا رکھا تھا۔

اس کے خیالات بھی بہت روشن اور آدرش بہت اونچا تھا۔

اس پر وہ حساس بھی بہت تھی۔

سرو قد اور صورت شکل میں بھی، لاکھوں میں نہ سہی ہزاروں میں ایک تھی۔ لیکن وہی مثل تھی کہ مور ناچتے ناچتے اپنے پیروں کو دیکھتا ہے تو رو دیتا ہے۔ یا رونے لگتا ہے کیونکہ وہ خود تقریباً تمام پرندوں میں سب سے خوبصورت پرندہ ہوتا ہے لیکن اس کے پیر بڑے بدنما ہوتے ہیں۔

چنانچہ یہی کچھ عالم عنبر کا بھی تھا۔

کہ اور تو ساری نعمتیں اسے میسر تھیں حتیٰ کہ تعلیم جیسی بیش بہا نعمت بھی لیکن اگر نہیں تھا تو پیسہ ہی نہیں تھا — پیسہ جو انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہوتا ہے۔ جس کے بغیر انسان ادھورا اور بے دست و پا ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ پیسے کے بغیر انسان ایسا ہوتا ہے جیسے بغیر تراشا ہوا ہیرا جو عام سا پتھر ہی سمجھا جاتا ہے اور جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

بے مایہ انسان تو غربت کے گہوارے میں پلنے والے ایک معذور بچے کی طرح ہی ہوتا ہے۔

جو اپنے ہاتھ پیروں کے زور پر یا بل بوتے پر کچھ کرنا بھی چاہے یا — کر بھی لے تب بھی اپنے حالات اور افلاس کے ہاتھوں مفلوج ہی رہتا ہے۔

یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور — گو دل بستگی اور دلچسپیوں کا رنگا رنگ دور ہے۔ مگر بے مایہ اور مفلوک الحال لوگوں کے لیے خواہشات اور تمناؤں کا ایک دہکتا ہوا جہنم ہی ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ جو آسائشیں، عیش و آرام جو سائنس اور ٹیکنالوجی نے بنی نوع انسان کے لیے مہیا کی ہیں اور جن کے حصول کی خواہش خواص اور عوام تقریباً سب کے ہی قلوب میں دھڑکن کی طرح کھٹکتی ہے۔

اس خواہش کو ایک مفلوک الحال یا غریب انسان بس حسرت بنا کر ہی دل میں چھپا لینے پر قادر ہوتا ہے۔

لیکن شامت اعمال جو اس خواہش کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں انہیں بڑی بڑی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ بڑی جانفشانی اور محنت کرنی پڑتی ہے۔

تب کہیں جا کر عمر عزیز کا تین چوتھائی حصہ گزار کر وہ کسی قابل بنتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد معدودے چند ہی ہوتی ہے بالکل آٹے میں نمک کی طرح۔ ورنہ جو محنت مشقت کرنے کے عادی نہیں ہوتے وہ خواہشوں کے اس دہکتے ہوئے جہنم کو غلط اور ناجائز راستوں کا انتخاب کر کے ہی پار کرتے ہیں۔

یعنی چوری۔ ڈاکہ زنی۔ اسمگلنگ۔ منشیات کا کاروبار۔ ضمیر فروشی اور — دوسرے بھی غلیظ اور گھناؤنے دھندے کر

کے ہی کسی قابل بنتے ہیں۔

چنانچہ عنبر نے بھی اپنے دل کی بستی کی لجلجی اور زرخیز زمین میں کبھی اپنی خواہشات کا جو بیج بویا تھا اس میں سے نہ صرف پودا نکل آیا تھا بلکہ ہری ہری کونپلیں بھی پھوٹ نکلی تھیں۔ مگر اس کے تناور درخت بننے میں ایک طویل عرصہ درکار تھا۔ بڑی کٹھنائیاں مشقتیں نزاکتیں اور احتیاطیں درپیش تھیں۔ اصل میں علم تو بڑی بات عنبر کو اس بات کا اندازہ تک نہ تھا۔ وہ تو بس اپنے دل میں نہ معلوم کیا ٹھانے بیٹھی تھی۔ اور اس وقت تو اس کا موڈ سخت آف تھا۔

اور جب اس کا موڈ آف ہوتا تھا تو خواہ کسی سے کیسی اہم اور ضروری بات ہوتی وہ اس کی پرواہی نہ کرتی تھی۔ اس کی اس بات پر حالات گزیدہ ماں ہمیشہ اسے یہی نصیحت کرتی تھیں

"دیکھو عنبر! یہ ذرا ذرا سی بات میں اتنا تیہا دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔ یہاں تو میں اور یہ تمہارے دونوں بہن بھائی تمہارے تیہے کو سہہ بھی لیں گے لیکن دوسرے گھر جا کر تم نے یہ ادائیں دکھائیں تو کوئی خاطر میں بھی نہیں لائے گا بلکہ الٹی تلخیاں پیدا ہوں گی۔ یوں بھی غریب گھرانے کی لڑکیوں کو ہر بات اور معاملے میں اپنا پتا مار کر رہنا پڑتا ہے۔ تب ہی جا کر سسرال میں ان کا گزارہ ہوتا ہے۔"

ماں اور بھی بہت کچھ کہتی تھیں مگر اس کے تو خمیر میں جیسے تنک مزاجی ملائی گئی تھی اور پھر بچپن سے ہی لاڈ بہت کیے گئے تھے۔ اس پر غریب تھی یا نادار۔ مگر باپ اور ماں دونوں طرف سے شریف خاندان سے تھی یعنی دادا کے جد سبزی فروش تھے، گوشت بیچتے تھے نہ دودھ کا بیوپار کرتے تھے بلکہ ملازمت پیشہ لوگ تھے۔ کچھ اسے اس بات کا بھی احساس تھا۔ حیثیت جیسی بھی سہی لیکن وہ خود کو اپنے تایازادوں سے کم نہیں سمجھتی تھی۔

بہرحال اس کا موڈ بہت آف تھا اسی لیے وہ کمرے میں جم کر رہ گئی تھی۔ اتنا بھی یاد نہ رہا کہ چھوٹی سے ہی کہلا دیتی کہ ذرا جا کر سنے تو سہی کہ امی نے سعد کو کیا بات کہنے کے لیے بلایا ہے۔ چھوٹی نظر نہیں آئی تو وہ یہی سمجھی کہ وہ باورچی خانے میں کوئی کام کر رہی ہوگی۔ جب کہ اس وقت چھوٹی روشن کی بہن کو ٹیوشن پڑھانے گئی ہوئی تھی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد اسے بیٹھک میں سے ماں کی آواز آئی۔

"خیر، اس وقت تو تم جلدی میں ہو۔ پھر کسی روز ذرا فرصت سے آنا۔ بس تمہاری عادت سی ہوگئی ہے۔ تم تین چار روز نہیں آتے تو میں تمہاری طرف سے پریشان ہونے لگتی ہوں۔"

"نہیں نہیں آپ اطمینان رکھیے میں انشاء اللہ جلد ہی آؤں گا۔ اگر عذیر مجھے وہیں بتا دیتا کہ آپ کو مجھ سے کوئی ضروری کام ہے تو میں بعد میں وقت نکال کر ہی یہاں آتا۔" سعد نے کہا۔

"نہیں نہیں بیٹے! مجھے بھلا تم سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ بس ایک تو تم پانچ چھ روز سے آئے نہیں تھے، دوسرے کل آئے بھی تو ٹکیا دبا کر۔ اس لیے میں نے عذیر سے کہا تھا کہ تم سے ملاقات ہو تو وہ یہی کہہ دے کہ امی نے آپ کو بلایا ہے۔" خورشید جہاں نے مصلحت کوشی سے کام لیتے ہوئے کہا تا کہ بات کھلنے پر وہ یہ نہ سوچے کہ اصل بات کرنے کے بہانے وہ اسے چکمہ دے دے کر بلاتی رہی ہیں۔

"چلیں خیر۔ اگر وہ غلطی سے آج مجھے بلا یا بھی لایا تو اس میں حرج ہی کیا ہو گیا۔ میں پھر کسی دن آ جاؤں گا۔"

اس نے جواب میں تھوڑا سا ہنس کر کہا اور خورشید جہاں کو خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

تب وہ کمرے سے باہر نکلی۔ اس اثناء میں مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے جو دال پکائی تھی وہ چاروں کے لیے ہی ناکافی ہوئی تھی۔ اس پر اپنی پریشانی میں ڈھنگ سے کھایا بھی نہیں گیا تھا۔ منہ ہاتھ دھوتے دھوتے ایک دم ہی بھوک لگی تو اسے یاد آیا کہ رات کے کھانے کے لیے تو کچھ تھا ہی نہیں، پھر چھوٹی نے کیا پکایا ہوگا۔ اسی خیال سے ہراساں ہو کر اس نے منہ بھی نہیں پونچھا اور سیدھی باورچی خانے میں چلی آئی۔ باورچی خانے کی بتی روشن تھی اور سعد پیڑھی پر بیٹھا اپنے سامنے رکھی پولیتھین کی تھیلیوں ——— میں سے سبزی نکال نکال کر آٹے کی پرات اور چائے کی ٹرے میں رکھ رہا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ سبزی کون لایا ہے۔ عذیر نے اسے اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ خوشی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"دیکھا آپا آپ نے کتنی تازہ سبزی ہے۔ یہ ہم نے منڈی سے خریدی ہے۔"

اور عنبر جسے پہلے ہی عذیر پر غصہ آ رہا تھا پہلے سبزی کو دیکھ کر اور پھر عذیر کے اس دانت نکال کر سبزی کی تعریف کرنے پر ایک دم ہی اس پر برس پڑی۔

"بڑے دانت نکال رہے ہو بے شرم! یہ خیرات میں ملی ہوئی چیزیں لے کر۔ ہم نے تو بُرے سے بُرا وقت اپنے اوپر سے گزار دیا فاقے تک کیے مگر کسی سے ایک پیسے کا سوال نہیں کیا۔ خود ابا مرحوم بھی کس قدر غیور تھے کہ مرتے مر گئے لیکن اپنے سگے بھائی سے کبھی ایک دھیلے کی مدد نہیں لی۔ اور ایک تم ہو اس چھچھورے شخص کے مالک کی گاڑی پر بیٹھنا بڑا فخر سمجھتے ہو۔ اس پر تمہاری حالت پر ترس کھا کر جو چیزیں وہ تمہیں دیتا ہے وہ خوشی خوشی لے لیتے ہو۔ چلو پھینکو اٹھا کر ان ساری چیزوں کو اور آئندہ کبھی کسی کا احسان نہ لینا سمجھے۔"

عنبر نے غصے میں جھک کر [illegible]ش پر رکھی ایک تھیلی بھی اٹھا لی جس میں کوئی اور چیز تھی اور اسے باہر صحن میں پھینکنے ہی والی تھی کہ عذیر اس کا ہاتھ پکڑ کر چلایا۔

"آپا! آپا! ایسا غضب نہ کیجیے گا۔ اس تھیلی میں تو دودھ اور انڈے رکھے ہوئے ہیں۔" اور پھر اس نے عنبر کے ہاتھ سے تھیلی لے کر وہ تھیلی سبزی پر رکھ دی اور اس سے بولا

"آپا میں بھی ایسا نک کٹا اور بے غیرت نہیں ہوں اور نہ مجھے مفت خوری کی عادت ہی ہے۔ یہ چیزیں تو سعد بھائی نے میرے سر ہو کر بڑی محبت سے مجھے دلوائی ہیں اور میں نے اس شرط پر لی ہیں کہ جب بھی کسی قابل ہوا ان کی ایک ایک پائی ادا کروں گا۔"

"ارے جاؤ۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ کسی سے یہ کہنا کہ ہم بعد میں آپ کو دے دیں گے۔ کیونکہ تم خواہ کتنی صداقت اور قطعیت سے کہو اور چاہے تم فقیر سے ایک دم بادشاہ ہی کیوں نہ بن جاؤ۔ دینے والا دل میں ہنس کر یہی سوچے گا کہ تم اپنی شرم اور جھینپ مٹانے کو ایسا کہہ رہے ہو۔ ورنہ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ یعنی کیا تم اور کیا تمہاری اوقات۔ تم کب اس قابل ہو گئے جو مجھے ریٹرن کر سکو گے"

"اوہو تو اب مجھے بتانا ہی پڑے گا ورنہ چھوٹی نے تو مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔" عذیر نے بہن کے بار بار غیرت دلانے پر تنگ آ کر اپنا سر کھجاتے ہوئے آہستہ سے کہا پھر بھی اس نے سن لیا۔

"کس بات کو سختی سے منع کر دیا تھا چھوٹی نے؟" چھوٹی کا نام سن کر وہ بے حد متجسس ہو گئی۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"اچھا، آپ اس سے کہیں گی تو نہیں؟" عذیر نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔ کوئی صحیح بات ہوئی تو کیوں کچھ کہنے لگی۔" اس نے اپنی بڑائی کے زعم میں کہا۔

"لیکن آپا! یہ کوئی غلط بات تو نہیں اور نہ یہاں کسی غلط بات کا گزر ہو سکتا ہے۔" عذیر نے اس کے فقرے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے کہا۔

"اوہو بھئی، یہ کون کہہ رہا ہے۔ اچھا تم بتاؤ تو سہی۔" اسے بس ایک ہی بات جاننے کی پڑی تھی۔

"آپا! وہ چھوٹی جو ٹیوشن کے پیسوں میں سے ہر ماہ اپنے پاس کچھ رقم جمع کرتی رہی تھی اس میں سے اس نے آج چلتے وقت مجھے دو سو روپے دیے تھے۔ گھی، چینی، چائے، چاول اور سبزی وغیرہ لانے کو۔ اور مجھے قسم دے دی تھی کہ میں کسی کو بھی نہ بتاؤں، ورنہ سعد بھائی نے تو صرف یہ دو کلو آم ہی لیے تھے امی کے لیے۔"

عذیر نے اصل بات بتائی تو عنبر کو یوں لگا جیسے یہ کہہ کر عذیر نے اس پر ملامت کے ڈونگرے سے برسا دیے ہوں۔ آخر اس کی سوچ اتنی بیمار کیوں ہو گئی ہے۔ اس نے انتہائی ندامت محسوس کرتے ہوئے دل میں سوچا۔ اور اپنی خفت مٹانے کو بڑی پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"واہ تم بھی بڑے چھپے ہوئے نکلے۔ یہ بات پہلے ہی کیوں نہ بتا دی جو خواہ مخواہ ہی مجھ سے اتنے فضیحتے سنے۔"

"اب کسی کی عادت ہی ہو خواہ مخواہ فضیحتے کرنے کی تو سن لینے میں حرج ہی کیا ہوتا ہے۔" عذیر شرارت بھرے انداز میں بولا۔

"اوہو بڑی باتیں بنانی آ گئی ہیں تمہیں۔ لاؤ مجھے دکھاؤ کیا کیا لائے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ الٹی سیدھی چیزیں لا کر دو سو روپے برابر کر دیے ہوں۔" وہ عذیر کو تھوڑا سا پیچھے ہٹاتی ہوئی بولی۔

"جی نہیں، اب اتنے بھی عقل سے پیدل نہیں ہیں مابدولت۔" عذیر نے کہا اور پھر جو چیزیں لایا تھا ان کا بل کھول کر با آواز پڑھنے لگا

"ایک عدد چائے کا پیکٹ، دو کلو چاول، تین قسم کی دالیں پسی ہوئی مرچ اور دھنیا، دو کلو چینی، دیسی صابن۔ اور چونکہ تیل کا ٹن لینے کی گنجائش نہ تھی اس لیے ایک کلو کھلا ہوا گھی لے لیا میں نے آپا اور یہ سبزی کُل چالیس روپے کی ہے اور ہاں میں نے آدھا کلو گائے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کا قیمہ بھی لے لیا ہے ساتھ کے ساتھ۔ چنانچہ آپ سے درخواست ہے کہ ذرا اپنے خم ٹھونک کر سب سے پہلے یہ قیمہ پکا دیجیے۔ سچ بڑے دن ہوگئے ہیں گوشت کھائے۔"

عذیر نے جس روانی سے یہ سب کہا عنبر کو ہنسی آگئی۔ بھائی کی اس بات پر کہ سچ بڑے دن ہوگئے گوشت کھائے ہوئے، اس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اور چونکہ اکلوتے اور چہیتے بھائی نے قیمہ پکانے کی فرمائش کی تھی اس لیے وہ دوپٹہ ایک طرف رکھ کر قیمہ پکانے میں مصروف ہوگئی۔

چھوٹی ٹیوشن پڑھا کر آئی تو اس نے باورچی خانے میں آتے ہی اتنی ساری چیزیں دیکھ کر مسرت آمیز حیرت کا اظہار کیا۔ وہ ایک ایک چیز کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگی۔

"ہائے آپا! یہ سبزی، یہ دالیں، چاول اور چینی۔ ہائے اللہ یہ چائے کا بڑا ڈبہ بھی اور یہ۔ یہ قیمہ۔ ایمان سے آپ نے تو سارے گھر میں خوشبو پھیلا رکھی ہے۔ میرے تو گھر میں قدم رکھتے ہی منہ میں پانی آگیا۔ کہاں سے آیا ہے یہ سب؟"

"بس آ ہی گیا۔ یہ سمجھو کہ آسمان سے نازل کیا گیا ہے۔ وہ بھی خاص طور پر تمہارے لیے۔ بس اب تم اتنا کرم کرو کہ یہ ساری چیزیں اُٹھا کر قرینے سے رکھ دو۔ اور ہاں یہ سبزی اچھی طرح دھو کر اور اسے نمک کے پانی میں ڈبو ڈبو کر پرات اور ٹرے میں پھیلا کر رکھنا اور کسی ململ کے کپڑے کو نم کر کے اس سے ڈھانپ کر باہر نعمت خانے پر رکھ دینا ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس فرج تو ہے نہیں پھر بھی میں نے سنا ہے کہ اس طرح رکھنے سے سبزی کئی روز تک خراب نہیں ہوتی۔" عنبر نے چھوٹی کو ہدایات دیں تو اس نے چاول کی تھیلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا آپا! لیکن کاش ہمارے ہاں ایک فرج ہی ہوتا۔ سچ کتنا آرام رہتا ہے فرج کی وجہ سے۔ جب جی چاہا ٹھنڈا پانی پی لیا۔ جو چیز چاہی ٹھنڈی کرنے کو رکھ دی۔ اور برف الگ جمی جمائی مل جاتی ہے۔"

"ہاں۔ فرج کے کیا کہنے۔ لیکن خیر تم فکر نہ کرو۔ فرج بھی انشاءاللہ ہمارے گھر میں جلد ہی آجائے گا۔" عنبر کو بھی فرج کا بہت شوق تھا۔

"خدا کرے آ ہی جائے آپا۔ ہم تو واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک انیسویں صدی عیسوی میں سانس لے رہے ہیں۔ ورنہ لوگ اتنا ترقی کر گیا ہے کہ وہ جو ہمارے کالج کا چوکیدار تھا نا عبدل۔ اس نے رنگین ٹی وی خریدا ہے۔"

چھوٹی باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ چیزیں بھی سمیٹتی جا رہی تھی۔

"ارے یہ کون سی تعجب کی بات ہے۔ آج کل تو مزدور طبقہ لوگوں کے پاس بھی بہت کچھ آگیا ہے۔" عنبر مسالا بھونتی ہوئی بولی۔

"مگر بڑی محنت کی کمائی کی چیزیں ہوتی ہیں ان کی۔ بے چارے خون پسینہ ایک کر کے پیسہ جوڑتے ہیں اور اپنی من پسند چیزیں خرید لیتے ہیں۔" تو چھوٹی ایک ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

"ہاں آپا۔ ہم تو اس قابل بھی نہیں ہیں۔ ورنہ آج کل تو ان چیزوں کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ اب تو قسطوں پر ہر چیز ملنے لگی ہے۔ مگر قسطیں بھی بھلا کیسے دے سکتے ہیں ہم۔ بندھی ہوئی آمدنی بھی ہے تو اتنی قلیل کہ پیٹ ہی مشکل سے بھرتا ہے۔"

چھوٹی چاول وغیرہ دودھ کے پرانے اور بڑے ڈبوں میں جو خورشید جہاں نے ردی پیپر والے سے کبھی خریدے تھے ڈال ڈال کر دیوار میں لگے بریکٹ پر رکھتی گئی۔

"ہاں اسی لیے تو میں ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کے بعد جلد سے جلد ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ بندھی ہوئی آمدنی آئے گی۔ وہ بھی دو ڈھائی ہزار کے لگ بھگ تو کم از کم فرج اور ٹی وی کی قسطیں تو چلی جایا کریں گی پابندی سے۔" عنبر نے گویا دلاسہ دیا۔

"ہاں آپا مگر قسطوں پر کوئی چیز لی جاتی ہے تو اس کے لیے خاصی بھاری رقم ایڈوانس بھی تو ادا کرنی پڑتی ہے، وہ کہاں سے آئے گی۔"

"اس کا بھی خدا کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گا ورنہ میں پانچ چھ ماہ تک ہزار ڈیڑھ ہزار ماہوار جمع کر کے اتنی رقم مہیا کر لوں گی کہ ایڈوانس فیس آسانی سے ادا کر سکوں۔ ہاں بھلا جہاں اب تک کچھ میسر نہیں ہوا وہاں چند ماہ اور سہی۔ پھر تو فرج اور ٹی وی ہی نہیں اور بہت سی چیزیں بھی گھر میں آجائیں گی۔ اور میں نے تو سوچا ہی کیا تہیہ کر لیا ہے کہ سب سے پہلے گھر میں سوئی گیس لگواؤں گی۔ یہ تیل کا چولہا ایک تو سارے برتن سیاہ کر دیتا ہے۔ دوسرے کبھی کبھی تیل کی باس کھانے میں بھی آنے لگتی ہے اور مصیبت جلتا بھی ہے تو ایسے منن منن (ہلکے ہلکے) کہ اس باورچی خانے کی تپش اور گرمی میں انسان پگھل کر رہ جاتا ہے۔" عنبر نے پتیلی کے ڈھکن سے پنکھا جھلتے ہوئے گویا گرمی لگنے کا اظہار کیا۔

"ہاں آپا اب کسے معلوم کہ ہمیں بھی کبھی ان تکلیفوں سے نجات ملے گی یا ساری عمر حسرتیں کرتے کرتے ہی کٹ جائے گی۔" چھوٹی نے سبزی کو ایک بڑے تھیلے میں ڈالتے ہوئے بڑی یاسیت سے کہا۔

"ارے نہیں چھوٹی! ایک سا وقت تو کبھی رہتا ہی نہیں۔ خدا نے چاہا تو ہمارے دن بھی جلد ہی پھر جائیں گے بس میں ذرا کوئی اچھی سی ملازمت پکڑ لوں۔" عنبر نے پھر اسے دلاسہ دیا۔

"مگر آپا آپ کو کون سی دس بیس ہزار ماہوار کی ملازمت مل سکے گی۔ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی ہزار کی ہی ملے گی۔ اور پھر یہ تو وہی مثل ہوگئی کہ جب دادا مریں گے تو بیل بٹیں گے۔ پتا نہیں کب ملازمت ملے اور کب کچھ آئے۔" چھوٹی کی باتوں سے مایوسی صاف عیاں تھی۔ اس کا دل چھوٹی بہن کے لیے کڑھ کر رہ گیا

"اتنی مایوسانہ باتیں کم از کم تمہیں زیب نہیں دیتیں چھوٹی! تمہارے آگے تو ایک طویل زندگی بکھری ہوئی ہے جس میں تمہارا روشن مستقبل لہریں مار رہا ہے۔ کیونکہ تمہارے ماضی میں تو جو تم پر بیت گئی سو بیت گئی یا حالات کے تھپیڑے کھا کھا کر جیسے تیسے تم نے اپنے ماضی کو گزار لیا۔ اب تم اپنے حال میں سانس لے رہی ہو مگر کتنی تبدیلیوں کے ساتھ۔ کبھی اس بات پر بھی تم نے غور کیا چھوٹی۔ کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم تم تھرڈ ایر میں تو پڑھ رہی ہو اور پھر حال پر بھی تمہاری گرفت صرف اسی صورت میں رہتی ہے کہ تم تیزی سے اپنے لیے کچھ نہ کچھ کر لو۔ کیونکہ تمہارے آج کے کام سے تمہارے اگلے دن کی شمع روشن ہوتی ہے۔ اگلا دن یعنی مستقبل۔ سمجھیں تم۔" عنبر نے اسے سمجھانے کے لیے ایک تقریر کر ڈالی۔ اس کے باوجود بھی چھوٹی نے شانے جھٹک کر کہا۔

"آپا! صاف گوئی معاف۔ ان باتوں کو سمجھنے کی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ تو مجھ میں بھی ہے مگر آپا۔ ہم روایات کی پابند لڑکیاں صرف سوچنے کی حد تک کہ یہ کریں گے، وہ کر لیں گے، اپنا مستقبل سنوار سکتی ہیں ورنہ ہمارا ہر قدم تو مصلحتوں اور نزاکتوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے۔" چھوٹی کی گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بڑی بہن کے خیالات سے ذرا بھی متفق نہیں تھی۔

"نہیں چھوٹی یہ محض وہ اندیشے ہیں جو بچپن ہی سے تمہارے دل میں گھر کر کے بیٹھ گئے ہیں ورنہ آج کی لڑکی پرانے زمانے کی لڑکی سے یکسر مختلف ہے۔ اسے نہ بھیڑ بکریوں کی طرح اب جس کے ساتھ چاہا ہانکا جا سکتا ہے اور نہ اسے روایات اور نزاکتوں کی سنگین چار دیواری میں مقید کر کے سسک سسک کر دم توڑنے پر مجبور ہی کیا جا سکتا ہے بلکہ آج کی لڑکی تو بہت بہادر اور حوصلہ مند ہوتی ہے۔ وہ گھر سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ کام بھی کرتی ہے۔ یہ تم پتا نہیں کس زمانے کے خیالات دل میں لیے بیٹھی ہو۔" عنبر تھی کہ کسی نہ کسی طور پر اسے قائل کرنے پر تلی تھی اور ساتھ کے ساتھ کھانا پکانے میں بھی مصروف تھی۔

"اچھا آپا جو آپ کہہ رہی ہیں یہی ٹھیک ہوگا۔" چھوٹی نے ساری سبزی کو پتیلے میں ڈال کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر اس نے پوچھا۔

"آپا! قیمے میں پالک کا ساگ ڈال دیں تو کیسا رہے گا۔ امی کو بھی بہت پسند ہے اور پھر سب سیر ہو کر کھا بھی لیں گے۔"

"ہاں بڑا اچھا آئیڈیا ہے۔ کیونکہ قیمہ بھی میں نے آدھا لیا ہے۔ عذیر آدھا کلو لایا تھا نا تو میں نے آدھا اب کے لیے پکا لیا اور آدھے میں چنے کی دال ڈال کر ابھی سے پکا کر رکھ دوں گی اور کل اسے پیس کر شامی کباب بنا لوں گی۔ بہت دن ہوگئے کوئی چٹخارے دار چیز کھائے۔"

"اوہ گڈ آپا۔ اور شامی کبابوں کے ساتھ خشکہ (اُبلے ہوئے چاول) اور مسور کی دال۔ پورا دعوت کا اہتمام ہو جائے گا یہ تو۔ اچھا کیا ساگ کاٹ دوں؟" چھوٹی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ضرور۔ اتنے تم ساگ کاٹو اتنے میں آٹا گوندھ لوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے مگر روٹیاں میں پکاؤں گی۔ آپا اگر آپ مناسب سمجھیں تو تھوڑے سے چاول بھی اُبال لیں۔" چھوٹی نے بہت لجلجا کر کہا۔

"اُبالنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر سوال یہ ہے کہ قیمے کے ساتھ بغیر دال کے چاول کس طرح چل سکیں گے۔" عنبر نے آخری فقرہ تھوڑا ہنس کر ادا کیا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر تو رہنے دیجیے۔" چھوٹی بولی۔

"نہیں، اگر تمہارا دل چاہ رہا ہے تو چاول اُبال لینے میں میرا کیا حرج ہے۔ ایسا کرتی ہوں تھوڑی سی دال بھی پکا لیتی ہوں۔"

عنبر نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں آپا! اب ایک ہی وقت میں اتنی ساری چیزیں نہیں، باقی آیندہ کے لیے بھی رکھنی چاہئیں"، چھوٹی نے کہا۔
"واہ! یا تو کہہ رہی تھیں کل کبابوں کے ساتھ مسور کی دال اور خشکہ پکائیے گا اور اب سب چیزوں کو احتیاط سے خرچ کرنے کا خیال آگیا"، عنبر نے ہنس کر کہا۔

وہ تو محض زبانی جمع خرچ میں اپنا شوق پورا کرنے کو کہا تھا۔ ویسے بھی کبابوں کے ساتھ دال ہو گی تو دو وقت آرام سے چل جائے گی"، چھوٹی نے کہا تو وہ چپکی ہو گئی۔ چھوٹی نے جلد جلد ساگ دھو کر کاٹنا شروع کر دیا۔
"یہ امی کہاں چلی گئیں جو اتنی دیر سے نظر ہی نہیں آئیں"، اس نے چھوٹی سے پوچھا۔
"پتا نہیں، جب میں ٹیوشن پڑھا کر آئی تھی تو کمرے میں بیٹھی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ شاید وہیں ہوں گی"، چھوٹی نے جواب میں کہا۔ اور پھر بولی: "آپا شکر ہے امی نے اجازت دے دی ورنہ آپ کا کورس ادھورا رہ جاتا"۔
"ہاں نہ صرف ادھورا رہ جاتا بلکہ مجھے کسی اچھی جگہ ملازمت بھی نہ ملتی"۔
"آج تو آپ کو عذیر کا انتظار نہیں کرنا پڑا؟"، چھوٹی نے پوچھا۔
"نہیں آج تو وہ وقت پر آگیا تھا"، سعد کے ساتھ اس کی کار میں آنے کی بات وہ دانستہ چھپا گئی۔
"اب تو شاید ڈیڑھ مہینے کا کورس اور رہ گیا ہے نا آپ کا"۔
"نہیں بس ایک مہینے اور جانا پڑے گا"۔
"تو پھر آپ کو ملازمت کب تک مل جائے گی؟"، چھوٹی نے پھر ایک سوال جڑ دیا۔
"یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر میرا اپنا خیال یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ ماہ میں۔ ورنہ یوں دینے کو خدا دیتا ہے تو پلک جھپکتے میں سب کچھ ہو جاتا ہے"، بات کے اختتام پر وہ ہنسنے لگی۔
"لیکن آپ عالیہ آپا سے اس معاملے میں کیوں مدد نہیں لیتیں۔ آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ ان کے والد ایک بڑے بزنس مین ہیں"، چھوٹی نے مشورہ دینے کے سے انداز میں کہا۔
"عالیہ سے کیسے مدد لوں۔ اس روز کے بعد سے اسے منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہی ہوں"، عنبر ملول سی ہو کر بولی۔
"ہائے تو اس میں خدانخواستہ منہ نہ دکھانے کی کیا بات ہو گئی۔ سب کے اپنے اپنے حالات ہوتے ہیں۔ انہوں نے اگر ہماری حالت دیکھ بھی لی تو خود بقول ان کے وہ آپ سے ملنے آئی تھیں آپ کے گھر سے نہیں۔ اور وہ تو آپ کو بڑے اصرار سے بلا کر بھی گئی تھیں"، چھوٹی نے گویا اسے کمپلکس سے نکالنے کی غرض سے کہا۔
"ہاں بلا کر تو گئی تھی مگر دیکھ لو اتنے دن ہو گئے وہ پلٹ کر نہیں آئی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے ڈرائیور کے ذریعے ہی میری خیر خبر لے لیتی۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ اسے میرے بغیر چین نہیں پڑتا"، عنبر نے کہا۔
"بہت ممکن ہے آپا! کہ انہیں کوئی مجبوری پیش آگئی ہو۔ وہ بتا رہی تھیں کہ وہ عنقریب اسلام آباد جانے والی ہیں۔ اور پھر جب آپ کو اپنا کام ان سے لینا ہے تو آپ کو کم از کم ان کے پاس جانا تو چاہیے تھا"۔
"کیسے جاتی۔ سب کچھ تو تمہارے سامنے ہی ہے۔ یہاں کہیں جانا تو بڑی بات گھر سے قدم نکالنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ادھر عذیر کو ہی کہاں فرصت ہے کہ اس کے ساتھ کہیں چلی جاؤں"، عنبر ہر طریقے سے خود کو بے بس ثابت کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ آٹا گوندھتی ہوئی بولی۔
"آپا! ایسا کیوں نہ کریں کہ کسی دن ہم دونوں عالیہ آپا کے ہاں چلیں۔ یوں بھی بڑے اصرار سے وہ مجھے بلا کر گئی ہیں"، چھوٹی نے بہت سادگی سے کہا تھا مگر عنبر کو بہت برا لگا۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ بس اتنا بولی۔
"ہاں چلی چلنا مگر پہلے میں یہ کورس تو مکمل کر لوں۔ تاکہ جاؤں تو کسی مقصد سے ہی جاؤں"۔
اس اثنا میں چھوٹی نے پالک کی بڑی گڈی کاٹ کر چولھے کے قریب رکھ دی تھی اور اب توے پر روٹی ڈالنے کی منتظر بیٹھی تھی مگر عنبر نے پالک جس برتن میں کاٹ کر رکھا گیا تھا وہ برتن اسے تھماتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔
"چلو چھوٹی! تم یہ ساگ قیمے میں ڈالو۔ روٹی میں پکاؤں گی۔ چلو شاباش۔ روز تو تم ہی پکاتی ہو نا۔ آج مجھے بھی روٹی پکانے کا موقع دو"۔ اور چھوٹی نے قدرے تعجب سے بہن کی طرف دیکھا اور قیمے کی پتیلی میں ساگ ڈالنے لگی۔

عنبر آج خلافِ معمول بڑی رسانیت اور لگاوٹ سے بات کر رہی تھی۔ دوسرے معنوں میں وہ انسانیت کی جون میں تھی۔ چھوٹی کے دل میں یہ احساس باعث حیرت بنا ہوا تھا کہ آج اس کی بڑی بہن بہت ٹھنڈے اور پُرسکون موڈ میں نظر آرہی ہے۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ بلا حیل و حجت اور بحث و تمحیص اور بلا اعلان کھانا پکانے بھی کھڑی ہو گئی ہے۔

اصل میں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جب بھی وہ کبھی بھی اپنے پیسوں سے گھر کے لیے چیزیں لاتی تھی تو ایک تو ان لائی ہوئی چیزوں کو اپنی گرفت میں رکھتی تھی، دوسرے بہن اور بھائی کو یہ ہدایت ضرور کرتی تھی کہ وہ احتیاط سے ہر چیز استعمال کریں۔ یہ نہ ہو کہ اللوں تللوں میں اُڑا دیں۔ اس پر یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ جو کچھ وہ لاتی ہے، وہ اپنی محنت سے کمائے ہوئے پیسے سے خرید کر لاتی ہے۔ وہ اپنی لائی ہوئی چیزوں پر نازاں بھی بہت رہتی تھی اور خود کو اونچا ظاہر کرنے میں کوشاں بھی۔ جب کہ چھوٹی تو جیسے عذیر کو دو سو روپے دے کر بھول ہی گئی تھی! اور اتنی دیر سے باورچی خانے میں بیٹھی تھی۔ مگر اس نے اشارتاً تو بڑی بات کنایتاً بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ سب اس کی محنت کے پیسوں سے خرید کر لائی گئی اشیا ہیں۔ بلکہ وہ تو ایسا ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ ساری چیزیں عنبر نے منگوائی ہوں۔ نہ اس نے یہ کیا تھا کہ اپنی اہمیت جتانے کو اس سے کہتی کہ آپا، آپ بیٹھیں میں خود اپنی مرضی سے جو جی چاہے گا پکا لوں گی۔ نہ یہ اعتراض ہی کیا تھا کہ آپ نے آدھا قیمہ کیوں بچایا۔ یا کیا ضرورت تھی اس وقت قیمہ پکانے کی۔ کوئی سبزی ترکاری جھونک لی ہوتی۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے عذیر کو بھی قسم دے دی تھی کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ اس نے اپنی پس انداز کی ہوئی دو سو روپے کی رقم سے یہ سودا منگوایا ہے۔ البتہ وہ مگن ضرور تھی اور ایسا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ ان ساری باتوں کو دیکھ اور محسوس کر کے اسے اپنا آپ بہت چھوٹا نظر آرہا تھا اور وہ اندر ہی اندر بڑی خجالت محسوس کر رہی تھی۔
کبھی کبھی ایسے بے حس لوگوں کو جو بڑے ہونے کے سبب احساس برتری میں اس حد تک غرق ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے چھوٹوں کے احساسات کا خیال رہتا ہے نہ جذبات کا۔ انہیں ان کے چھوٹے باتوں ہی باتوں میں یا اپنے کسی عمل سے ایسا سبق دیتے ہیں کہ ان کی آنکھوں پر پڑے بے حسی کے پردے اچانک ہٹ جاتے ہیں۔ سو کچھ یہی حال اس سمے عنبر کا بھی ہو رہا تھا جسے چھوٹی نے اپنی لاعلمی میں اس کے مزاج میں اچانک ہی ایک زبردست تغیر غیر معمول کر کے خواہ مخواہ ہی ورطۂ حیرت میں غوطے کھانے پر خود کو مجبور کیا تھا۔
پھر ایک ڈیڑھ ماہ کا عرصہ یوں گزرا جیسے ہتھیلی پر تھوڑی سی بھربھری ریت رکھ کر اس پر پھونک ماردی جائے تو چشم زدن میں اُڑ کر ادھر ادھر ہواؤں میں رل مل جاتی ہے۔
عنبر نے کچھ روز قبل ہی اپنا ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کورس پورا کر لیا تھا۔ اور شارٹ ہینڈ کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا البتہ ٹائپنگ میں اس کی اسپیڈ اتنی نہیں تھی جتنی کہ ایک تربیت یافتہ ٹائپسٹ کی ہونی چاہیے تھی جس کا اصل سبب یہ تھا کہ اس کے پاس ٹائپ رائٹر نہیں تھا جس پر وہ گھر آکر پریکٹس کرتی رہتی۔
بہرحال یہ کیا کم تھا کہ اس نے ٹائپنگ سیکھ تو لی تھی اور کورس مکمل ہونے سے پہلے کئی جگہ ملازمت کی درخواستیں بھی دے رکھی تھیں اور اس انتظار میں بیٹھی تھی کہ کب مقدر یاوری کرے اور کب کہیں سے انٹرویو لیٹر آجائے۔ اس کا تمام کا تمام وقت اب گھر میں گزرتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح چھین جھپٹ کر ہی ملازمت حاصل کر لے۔ اصل میں تو ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کے چکر میں مالی طور پر وہ بالکل کنگال ہو گئی تھی اور جس بات پر روئی تھی دو تین روز تک منہ پھلائے رہی تھی۔ اور ماں سے اتنی حجت کی تھی وہ مجبور ہو کر اسے بھی کرنی پڑی۔ اصل میں مہینے کے آخری دنوں میں ہاتھ تنگ ہو جاتا تھا کہ اگر دو وقت کی روٹی میسر آجاتی تھی تو وہ بھی آدھا آدھا پیٹ کر کے کھائی جاتی تھی۔ اسی بات پر کبھی کبھی چھوٹی جل کر کہتی تھی کہ۔
"واہ آپا! ہماری وہی مثل ہے کہ رہیں جھونپڑی میں اور خواب دیکھیں محلوں کے۔ بھلا ان حالات میں کبھی کوئی قیمتی چیز ہمیں میسر آسکتی ہے"، یا پھر کہتی۔
"تائی اماں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ دونوں برتن دھونے اور چولھا ہانڈی کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ اس پر بھی اونچے گھروں کے خواب دیکھتی ہیں"۔
اصل میں تو چھوٹی اسے یہی جتانے کو ایسی باتیں کہتی تھی۔ وہ جو اعلیٰ ملازمت حاصل کرنے اور اس کھنڈلے کو محل بنانے کے خواب دیکھ رہی ہے، وہ ایسی خوش فہمیوں میں مبتلا ہونا چھوڑ دے۔

بہرکیف عنبر نے اس روز گھر کے سارے اخبار جمع کیے تھے اور وہ ٹن بھی جو گھی اور تیل وغیرہ کے خالی ہوئے تھے۔ کچھ دراز کی شیشیاں تھیں اور کچھ بوتلیں۔ اس نے دوپہر کے وقت جب گلی میں بالکل سناٹا ہوتا تھا اور کسی کے آنے کا دور دور تک امکان بھی نہیں ہوتا تھا بیٹھک کے دروازے کے آگے ساری چیزیں رکھ کر ردی پیپر والے کو بلالیا اور ابھی ٹن اور بوتلوں کا حساب کر اخباروں کی ردی تلوانا ہی چاہ رہی تھی کہ سعد اپنے سیٹھ کی وہی ہونڈا اکارڈ لیے عین بیٹھک کے دروازے کے سامنے آ رکا۔ اس کے ساتھ فہد بھی تھا۔ اف گویا دن دہاڑے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ دہلیز پر کچھ اس پوزیشن میں اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی کہ چھپنا بھی چاہتی تو نہیں چھپ سکتی تھی۔ اس کی ماں اندر کمرے میں پڑی بے عمل و غش سو رہی تھیں۔

عذیر اسکول گیا ہوا تھا۔

چھوٹی جو کچھ دیر قبل ہی کالج سے آئی تھی اس وقت غسلخانے میں تھی۔ شرمندگی سے زیادہ بوکھلاہٹ نے اس پر کچھ ایسا غلبہ کیا کہ وہ ساری چیزیں وہیں ردی پیپر والے کے پاس چھوڑ کر تیزی سے اندر بھاگی اور غسلخانے کے دروازے کو توڑ دینے کے سے انداز میں پیٹ کر بولی۔

"اے چھوٹی جلدی نکلو۔ وہ دونوں اندر آگئے ہیں۔" اور چھوٹی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے وہ دونوں پر تو زیادہ میں توجہ نہیں دی۔ بس یہی سمجھی کہ وہ ردی پیپر والے کو کہہ رہی ہے جو اسے گھر میں تنہا دیکھ کر اندر گھس آیا ہے۔ وہ بے چاری فق ہوئی رنگت کے ساتھ باہر نکلی اور ادھر ادھر دیکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کون اندر آگیا ہے آپا؟" اور تبھی اس کی نظر بیٹھک سے برآمدے میں آتے سعد اور فہد پر پڑی۔ اس سمے اس کا حلیہ بھی عجیب سا ہو رہا تھا۔ آتے ہی سر کی گرمی نکالنے کی غرض سے اس نے بال دھوئے تھے جو شانوں پر بڑی بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اور کھلے ہونے کی وجہ سے موٹی موٹی لٹوں میں بٹ گئے تھے۔

چہرہ بھی پانی میں بھیگ رہا تھا۔ گیلا گیلا چہرہ لے کر اسے پنکھے کے نیچے کھڑا ہونا بڑا اچھا لگتا تھا۔

قمیص بھی گردن، شانوں اور سینے تک گیلی ہو رہی تھی۔

اس پر مستزاد گیلے چوڑا پائنچے جو اس کے ہزار احتیاط برتنے اور اونچے کرنے کے باوجود گیلے ہو جاتے تھے۔ اور بغیر دوپٹے۔ اسے سعد کا اس وقت آنا بہت کھلا۔ وہ غسلخانے کی طرف گھوم کر سخت ناگواری سے بولی۔

"کمال ہے۔ کسی کے گھر میں گھسنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ یوں منہ اٹھائے اٹھائے تو کوئی بھی اندر نہیں آتا۔"

"لیکن جب کوئی میزبان اپنے کسی مہمان کو دیکھتے ہی اس طرح ڈر کر جیسے بھوت دیکھ لیا ہو سرپٹ بھاگ کھڑا ہو تو مہمان کو اس کی خیریت معلوم کرنے اس کے پیچھے آنا ہی پڑتا ہے۔ جب کہ گھر کا دروازہ بھی چوپٹ کھلا ہو۔" فہد نے سعد کے ساتھ ان دونوں کے قریب ہی رک کر کہا۔ تو چھوٹی ساری احتیاط بھول کر عنبر کی طرف مڑی اور بڑے جلے کٹے لہجے میں بولی

"او ہو تو یہ آپا آپ دونوں کو دیکھ کر بری طرح شرما گئی ہوں گی۔ لیکن یہ کوئی ایسا معیوب کام تو نہیں تھا آپا۔ گھر میں اگر کاٹھ کباڑ زیادہ ہو جاتا ہے تو لال بیگ اور مکڑیاں وغیرہ اپنا ڈیرا جما لیتے ہیں۔ اس لیے یہ ردی و دی تو تقریباً ہر گھر میں ہی بیچ دی جاتی ہے۔"

"ہاں عنبر آپا ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے بلکہ امی تو کئی کئی ماہ کی ردی اکٹھی کر کے بکوا دیتی ہیں۔ ہمارے اپنے گودام کی ردی کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ پھر بھلا اس میں اس قدر شرمانے کی کیا بات ہے۔" فہد نے چھوٹی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ عنبر جو اس اثنا میں اپنی بوکھلاہٹ پہ بڑی حد تک قابو پا چکی تھی اس نے قدرے سنبھل کر کہا۔

"ہاں، یہ تو تقریباً ہر گھر میں ہوتا ہے لیکن میں اسے بالکل پسند نہیں کرتی۔ یہ تو امی ہی بکواتی ہیں۔ ورنہ اس میں مل بھی کیا جاتا ہے۔"

"گیارہ روپے پچیس پیسے۔" فہد نے اتنی برجستگی سے کہہ کر اپنی مٹھی اس کے آگے کھول کر کہا کہ چھوٹی کو سخت جز بز ہونے کے باوجود ہنسی آگئی۔ کیونکہ ردی پیپر والے سے ردی کے سارے پیسے فہد لے آیا تھا جو اس کی مٹھی میں تھے۔ فہد نے مٹھی کھول کر گیارہ روپے پچیس پیسے کی رقم اس کے آگے رکھی تھی۔ مگر عنبر کی غیرت یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ وہ اس کے ہاتھ سے یہ رقم لے لے۔

"میں۔ میں بھلا اس کا کیا کروں گی۔ یہ تم ہی رکھ لو۔" اس نے خجالت سے کہا۔

"واہ کیا میں آپ کے در کا سوالی ہوں یا خیرات خواہ۔ میں بھلا کیوں رکھوں یہ پیسے اپنے پاس۔" فہد کچھ برا مان کر بولا تو چھوٹی نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر وہ پیسے اس کی ہتھیلی سے اٹھا لیے۔

"لیجیے جناب! یہ میں لیے لیتی ہوں۔ اب تو جھگڑا ختم نا۔" اس نے کہا۔

"ہاں بالکل ختم۔ اب آپ اپنا حلیہ درست کر لیجیے۔ اتنے میں پھپھو جان سے نیاز حاصل کرتا ہوں۔" فہد نے کہا تو اسے پھر اپنے بے حلیہ ہونے کا خیال آیا کہ وہ انہی کپڑوں اور اسی حالت میں بغیر دوپٹے اب تک کھڑی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنے گیلے، دراز اور گھنے بال باتیں کرتے کرتے سینے پر پھیلا لیے تھے۔ فہد کے احساس دلانے پر بری طرح جھینپنے کے باوجود اس نے تنک کر کہا

"جناب آپ ہیں کون ذات شریف اور اس قدر بے تکلفی سے کلام کرنے کی آپ کو جرأت کیسے ہوئی؟"

"ارے بھئی اب اسے اس طرح آنکھیں تو نہ دکھاؤ چھوٹی۔ یہ میرا چھوٹا بھائی فہد ہے۔ کوئی غیر نہیں۔" سعد جو اتنی دیر سے خاموش کھڑا مسکرائے جا رہا تھا ہنس کر بولا۔

"جی تعارف کرانے کا شکریہ ایک دم ڈپلی کیٹ ہیں اسی لیے تو پہلی نظر میں پہچان گئی تھی۔" چھوٹی نے چمک کر کہا۔

"یہ پہلی نظر کا محاورہ تو کچھ اور ہوتا ہے نا بھائی جان۔" فہد نے شرارت سے کہا تو چھوٹی اس پر ایک تیکھی نظر ڈال کر غسلخانے میں گھس گئی۔

"بڑے شریر ہو تم۔ چلو تمہیں امی سے ملواؤں۔" عنبر اس کے شرارت آمیز فقرے پر ہنس کر بولی۔ اور پھر ان دونوں کو لے کر ماں کے پاس پہنچی۔

دن کے اجالے میں گھر کی زبوں حالی کچھ زیادہ ہی واضح ہو رہی تھی مگر فہد نے کسی چیز کو بھی نظر بھر کر نہیں دیکھا جب کہ سعد تو گھر کی بدحالی سے اچھی طرح واقف تھا۔ دونوں بھائی بیٹھک میں آکر دروازے پر ہی رک گئے۔ عنبر نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ ماں بدستور بے خبر پڑی سو رہی تھیں۔

"اوہو امی تو بڑی گہری نیند سو رہی ہیں۔ ٹھہریں انہیں جگا دیتی ہوں۔" عنبر نے کہا تو سعد سے پہلے فہد بولا۔

"نہیں، پھپھو جان کے آرام میں خلل نہ ڈالیے۔ میں پھر کبھی ان سے آکر مل لوں گا۔"

"ہاں فہد ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ویسے بھی مجھے ابھی کار واپس کرنی ہے۔ اور۔" سعد نے فہد کی بات کی تائید میں کہا تو فہد اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے بولا۔

"بھائی جان، یہ کار کا کیا چکر چلا رکھا ہے آپ نے۔" اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

"دیٹ از نن آف یور کنسرن (اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں) تم چپ ہی رہو۔" سعد نے تنبیہی سے انداز میں کہا۔

"لیکن تم بیٹھو تو سہی پہلی بار آئے ہو تو کم از کم چائے تو پی کر جاؤ۔" عنبر نے فہد کو مخاطب کر کے گویا تواضع کرنے کے طور پر کہا۔

"نہیں، ہم ابھی کولڈ ڈرنکس لے کر آئے ہیں۔ اب گرم گرم چائے کچھ اچھی نہیں لگے گی۔" فہد نے گویا انکار کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں، اگر چائے اچھی نہیں لگے گی تو میں کولڈ ڈرنکس منگوائے دیتی ہوں۔ ہاں ایسی بھی کیا بات ہے۔" عنبر بولی۔ گیارہ روپے پچیس پیسے اس کے ہاتھ میں تھے، اسی لیے اسے ان دونوں کو کولڈ ڈرنکس پیش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی تھی۔

"ارے نہیں آپ بالکل تکلیف نہ کریں عنبر۔ ہم واقعی کولڈ ڈرنکس لے کر آئے ہیں۔ ورنہ اگر آپ نہ بھی پوچھتیں تو یہ فہد آپ سے مانگ کر پیتا۔"

"واہ بھائی جان، یہ میرے شانے پر رکھ کر بندوق چلانے کی بھی آپ کو اچھی عادت ہو گئی ہے لیکن عنبر آپا اس وقت تو یہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" فہد نے تھوڑا سا تنک کر کہا تو سعد زور زور سے ہنسنے لگا۔ دونوں بھائی اب تک کھڑے ہی تھے۔

"اچھا اس وقت تو اجازت چاہیں گے ہم دونوں۔ پھپھو جان کو ہمارا سلام کہہ دیجیے گا۔" اور خدا حافظ کہہ کر جانے لگا۔ تو فہد نے عنبر سے کہا

"اور اُن کو بھی جو ہماری وجہ سے غسلخانے کی ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔" تو عنبر نے آہستہ سے اس کے شانے پر چپت لگا کر کہا
"تم جتنے حاضر جواب اور لفاظ ہو وہ تم سے دس قدم آگے ہی ہے۔ تم اس سے جیت نہیں سکو گے۔"
"اس سے نہیں جیت سکوں گا مگر اسے جیت تو لوں گا نا۔"

فہد نے کہا اور پھر جلدی سے بیٹھک سے باہر نکل گیا اور عنبر اس کے الفاظ کے اُلٹ پھیر پر غور کرتی رہ گئی۔

پھر بیٹھک کا دروازہ بند کر کے مٹھی میں دبے پیسے رکھنے اپنے کمرے میں جانے لگی تو اسے خیال آیا کہ یہ چھوٹی آخر غسلخانے کی ہی کیوں ہو کر رہ گئی۔ جلدی سے پیسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر باہر آئی تو دیکھا چھوٹی سوچی سوچی آنکھیں لیے اپنے اسی حلیے میں باورچی خانے میں کھڑی ہے۔ اس کے اندر قدم رکھتے ہی وہ ایک دم ہی اس پر برس پڑی۔

"آپا! آخر آپ ایسی بچکانہ حرکتیں کیوں کرتی ہیں کیا ضرورت تھی آپ کو انہیں دیکھتے ہی بھاگ کر اندر آنے کی۔ وہ بھی غسلخانے میں میرے پاس۔ میں بھلا کیا بگاڑ لیتی ان کا۔ ان کو مار کر بھگا دیتی یا دھکے دے کر نکال دیتی۔ آپ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو میرا تماشہ دکھانے کی غرض سے بھاگ کر میرے پاس آئی تھیں۔ اف توبہ یہ بھی کوئی حلیہ تھا میرا۔ یہ سڑیل کپڑے۔ وہ بھی گیلا چوڑا۔ یہ بدتر حلیہ اور بغیر دوپٹے۔ بھلا کیا دیکھا ہو گا اور کیا سوچا ہو گا خصوصاً فہد نے۔"

اتنا کہہ کر چھوٹی رونے لگی تو عنبر جو خود بھی اپنی اس حرکت پر ندامت سی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے گلے میں باہو ڈال کر اسے سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

"کمال ہے مجھے تو اتنے لیکچر دیتی ہو اتنی نصیحتیں کرتی ہو ان ہی باتوں پر اور آج خود ہی اتنی زیادہ کمپلیکسڈ دکھائی دے رہی ہو کر رونے بھی لگیں۔ مجھے تو خود بہت کھلا تھا ان دونوں کا یکدم ہی اندر آ کر تمہارے سامنے کھڑے ہو جانا۔ اصل میں یہ ان کلچرڈ لوگ ہمیشہ ایسی ہی بداخلاقی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ورنہ اگر ان کے اندر تھوڑی سی بھی تہذیب ہوتی تو بقول تمہارے یوں منہ اُٹھا کر دندناتے ہوئے سیدھے اندر نہیں آتے وہ بھی تمہارے سامنے۔"

"چھوڑیں آپا یہ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہوتا ہے قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ کہ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ ہم اپنی اس مفلسی کو چھپائے ایک طرف پڑے رہیں مگر وہاں کوئی نہ کوئی ایسے موقع پر اچانک آوارد ہوتا ہے جب ہم اپنی فاقہ کشی کو کم کرنے کے سامان کرتے ہوتے ہیں جیسے اس روز وہ آپ کی دوست عالیہ اچانک آ گئی تھی۔ اور اسی طرح ایک روز نہ معلوم کیسے کیونکر ممانی جان اپنی بہو سمیت ٹپک پڑیں اور آج یہ دونوں بھائی بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو گئے۔ پتا نہیں کیوں یہ لوگ ہم سے ملنے آجاتے ہیں جبکہ ہم کسی قابل ہی نہیں ہیں۔ کسی سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ہم تو اللہ سے عزت مانگتے ہیں مگر وہاں۔"

چھوٹی کا گلا بُری طرح رُندھ گیا تھا اسی لیے اس سے مزید کچھ بولا نہ گیا۔ لیکن اس کی اس بات پر کہ پتا نہیں کیوں یہ لوگ ہم سے ملنے آجاتے ہیں اسے بھی سعد کے معاملے میں جلے پھپھولے توڑنے کا ایک اچھا موقع مل گیا۔

"خیر کوئی اور تو محض بھولے بھٹکے ہی آجانا ہے مگر یہ سعد۔ یہ نہ معلوم کیوں آتا ہے ہمارے اس تھرڈ کلاس گھر میں۔ کیا مل جاتا ہے اسے یہاں آ کر اور آخر کیا دلچسپی ہے اسے اس گھر سے۔"

"میں سعد بھائی کی بات نہیں کر رہی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اور ہمارے درمیان حیثیت کو دیوار نہیں بنایا۔ البتہ ان پر غصہ ضرور ہے کہ وہ فہد کو کیوں لے کر آئے۔" چھوٹی نے روتے روتے تنک کر کہا۔

"وہ کسی کو لے کر آئے یا نہ آئے اصل سوال تو یہ ہے کہ وہ خود بھی کیوں آتا ہے۔ ایسی کیا غرض پھنسی ہے اس کی ہم سے اور ایسی کیا دلچسپی ہے اسے ہم سے۔" عنبر نے چھوٹی کے تنک کر بات کرنے پر بھبھک کر کہا۔

"یہ تو آپ ہی کو معلوم ہو گا آپا! اور ماشاء اللہ مجھ سے زیادہ سمجھدار اور قیافہ شناس ہیں۔ اور میں اپنے کیے پر تو نہیں رو رہی۔ مجھے تو اس بات پر سخت کوفت ہو رہی ہے کہ میرا ان دونوں سے بغیر دوپٹے اور اس برے حلیے میں سامنا ہی کیوں ہوا۔ کیا بے پردگی کا احساس کوئی اچھی بات ہوتی ہے۔ فہد نے بھلا کیا امپریشن لیا ہو گا میرے۔"

چھوٹی نے آخری فقرہ بڑی آزردگی سے کہا۔ تو عنبر نے دل میں بڑے فخر سے سوچا کہ اس کی بہن کتنی باحیا ہے یوں کہ وہ غلط یا جھوٹ بات کہنے کی عادی نہیں ہے۔ وہ بڑی کھرتل سی ہے۔ خواہ کسی کو بُرا لگے یا بھلا جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف

صاف کہہ دیتی ہے۔ اس نے چھوٹی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"چلو اب جو ہو گیا سو ہو گیا اور اصل میں تو میری وجہ سے ہوا۔ بھئی ایسا ہی ہے تو تم مجھے معاف کر دو۔" تو چھوٹی اس سے لپٹ کر بولی۔

"ارے نہیں آپا کیوں شرمندہ کرتی ہیں۔ میں بھی سمجھتی ہوں کہ یہ جو ہوا اتفاقاً ہی ہوا ہے۔ بس اپنی بے بسی پر افسوس ہوتا ہے کبھی کبھی تو آنسو نکل آتے ہیں۔" پھر چھوٹی نے کھانا گرم کرنے کی غرض سے باورچی خانے کے دروازے کے آگے رکھے نعمت خانے کو کھولا تو عنبر کو یکدم ہی یاد آ گیا کہ آج تو پیسے نہ ہونے کی وجہ سے کچھ پکایا ہی نہیں۔

"ارے ٹھیرو چھوٹی ادھر آؤ میرے پاس۔ اصل میں آج میں نے اور امی نے بھی اب تک کچھ نہیں کھایا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کسی لڑکے یا لڑکی کو بھیج کر چار انڈے منگوا لیتے ہیں۔ وہ ہی تل کر کھائیں گے۔ روٹی تو میں نے گیارہ بجے ہی پکا کر رکھ دی تھی۔" عنبر نے چھوٹی کے ساتھ کمرے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"انہیں گیارہ روپے پچیس پیسوں سے ہی منگوائیں گی نا آپ۔" چھوٹی نے ہنسی روکنے کی کوشش میں پوچھا۔

"ہاں تو اور کیا۔ آج اخبار۔ تن اور بوتلوں کا مرتبہ ہی کھانا پڑے گا۔" عنبر نے ہنس کر کہا تو چھوٹی بھی زور زور سے ہنسنے لگی مگر اس بری طرح کہ ہنسی کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ عنبر کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے مگر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی۔ اپنے ان آنسوؤں کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی۔ بلکہ اپنے اپنے تاثرات کو اپنے اپنے دل میں ہی گھونٹ کر رہ گئیں۔

ناداروں کی بھی کتنی آرزوئیں کتنی تمنائیں ہوتی ہیں بلکہ صحیح معنوں میں اگر دیکھا جائے تو آرزوئیں اور تمنائیں سب سے زیادہ ناداروں کے دلوں میں ہوتی ہیں۔ جو حالات کی ستمگری کی وجہ سے حسرتوں میں تبدیل ہونے کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ لیکن یہ بھی انسان کے اپنے حوصلے ہمت اور محنت ولگن پر منحصر ہوتا ہے کہ اپنی ان آرزوؤں اور تمناؤں کو حسرت بنانے کے بجائے حقیقت میں تبدیل کر کے رکھ دے۔ اور یہی لگن ہمت اور حوصلہ عنبر میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا مگر دشواری صرف یہ تھی کہ وہ لڑکا نہیں لڑکی تھی۔ اسی لیے کھلم کھلا گھر سے باہر نکل کر کسی کام کے لیے تگ و دو نہیں کر سکتی تھی۔ بس درخواستوں کی صورت میں اس کے پاس کاغذی گھوڑے ہی تھے جنہیں وہ ادھر ادھر دوڑاتی رہتی تھی۔ مگر اب تک کہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ادھر گھر کے حالات تھے کہ دن بدن بگڑتے ہی چلے جا رہے تھے۔ ہر وقت فکروں میں گھلنے اور ناقص غذائیں کھانے کی وجہ سے خورشید جہاں کی صحت کافی متاثر ہو گئی تھی۔ اور وہ بیمار سی رہنے لگی تھیں۔ جبکہ اتنی زیادہ عمر بھی نہیں تھی۔ صرف پچاس کے پیٹے میں تھیں۔ ادھر عنبر کا یہ میٹرک کا سال تھا۔ اور چونکہ اس نے سائنس لیا تھا اس لیے اسے ٹیوشن دلانی ضروری تھی کیونکہ وہ میتھس اور سائنس میں کمزور تھا۔ البتہ چھوٹی اپنی صحت میں بالکل ٹھیک چل رہی تھی۔

بہرحال۔ ہر مرحلے میں ہی پیسے کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے چھوٹی کے ساتھ بہت مجبور ہو کر وہ عالیہ سے ملنے گئی تھی۔ تاکہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں اس سے ہی کوئی مدد لے سکے۔ لیکن عالیہ نے اپنے طور پر معذوری ظاہر کر دی تھی۔ کیونکہ عالیہ کے والد بڑے بزنس مین ضرور تھے لیکن دوسری شادی کرنے کے بعد سوتیلے باپ نہ سہی مگر اس کی طرف سے بے نیاز ضرور ہو گئے تھے۔ وہ تو اس کے چھوٹے بھائی جمی کی وجہ سے مہینے میں ایک دو بار ہی گھر آتے تھے وہ بھی بالکل ڈاکٹر وزٹ پر۔ عزیزوں کی طرح اور عالیہ سے رسمی سی چند باتیں کر کے چلے جاتے تھے۔ پھر بھلا عالیہ ان سے کیسے کہہ سکتی تھی کہ وہ اس کی سہیلی کو کوئی اچھی سی ملازمت دلوا دیں۔

عالیہ اس سے کچھ زیادہ ہی خلوص اور محبت سے پیش آئی تھی۔ اور چھوٹی سے بھی بڑی لگاوٹ سے باتیں کرتی رہی

وہ اسلام آباد میں پورا ایک ماہ گزار کر تین چار روز قبل ہی کراچی آئی تھی۔ اور اُس نے عنبر کو بالکل ہی مایوس نہیں کیا تھا بلکہ یہ وعدہ کر کے ہی رخصت کیا تھا کہ ایک سہیلی جو اسلام آباد میں رہتی ہے، اس کے بھائی نے کراچی میں اپنا بزنس سیٹ کیا ہے اور وہ فرزانہ سے اس کے لیے بات کرے گی۔ دونوں نے لاکھ منع کیا مگر عالیہ نے انہیں زبردستی اپنی کار میں ڈراپ کرایا۔ اور جونہی وہ اپنی گلی میں داخل ہوئیں اپنے گھر کے دروازے کے آگے سعد کے سیٹھ کی کار کھڑی دیکھ کر۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عنبر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری اور فوراً ہی غائب ہوگئی۔ دونوں نے عالیہ کی کار کچھ فاصلے پر رکوائی اور کار سے اُتر کر ڈرائیور کا شکریہ ادا کرتی ہوئی اپنے گھر کی طرف بڑھیں تو چھوٹی وہیں رک کر بولی۔

"آج پھر یہ دونوں بھائی آئے ہوئے ہیں آپا میں ان کے سامنے پڑنا نہیں چاہتی میں روشن کے یہاں جا رہی ہوں۔"

"ارے واہ کیا دماغ چل گیا ہے تمہارا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ امی مجھے تنہا گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر ان دونوں کی بھی پروا نہیں کریں گی یہی نہیں بلکہ تمہارے روشن کے گھر میں موجود ہونے کا پروف بھی چاہیں گی۔ چلو سیدھی طرح میرے ساتھ گھر چلو۔ ایسا ہے ـــ تو تم ان دونوں کی طرف دیکھنا ہی نہیں اور سیدھی اندر کمرے میں چلی جانا۔" عنبر اس کا بازو پکڑ کر بڑی درشتی سے بولی تو چھوٹی کو اس کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ لیکن اندر پہنچ کر دیکھا تو صرف سعد ہی تھا جو خورشید جہاں کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا تھا وہ دونوں ہی جلدی سے کمرے میں گھس گئیں اور چونکہ سعد آیا تھا اس لیے عنبر کا تو باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا مگر اس روز چھوٹی بھی اس کے سامنے پڑنے سے کترا رہی تھی۔ دونوں جلدی میں بیٹھک کا دروازہ کھلا چھوڑ آئی تھیں اور اس کھلے دروازے سے کوئی بھی اندر آسکتا تھا۔ اس لیے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد عنبر نے چھوٹی سے دروازہ بند کرنے کو کہا تو اس نے دبے پاؤں جا کر دروازہ بند کر دیا اور دروازہ بند کر کے پلٹ ہی رہی تھی کہ کمرے کی دہلیز پر ہی ٹھٹھک گئی۔

"سعد بیٹے! میں ایک بات عرصے سے تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی مگر ایک تو بچے گھر میں موجود ہوتے ہیں دوسرے تم بھی کھڑے کھڑے ہی آتے تھے۔"

ماں کے یہ فقرے کمرے میں داخل ہوتے ہوتے اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔ اور یہی بات ماہ ڈیڑھ ماہ قبل انہوں نے عذیر

سے بھی کہی تھی اس لیے جذبۂ تجسس نے چھوٹی کے پیر دہلیز پر ہی جکڑ لیے تھے۔ کہ آخر ایسی کیا بات ہے جو امی سعد بھائی سے کہنا چاہ رہی ہیں وہ بھی اتنی رازداری سے کام لے کر۔

"جی ہاں پھپھو جان! مگر آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔؟" سعد بھی متجسس سا ہو گیا تھا۔

"یہی کہ اب تو خیر سے تم یہاں کراچی میں اپنا کاروبار بھی جما لیا ہے۔ ویسے بھی ماشاءاللہ صورت شکل میں، مزاج میں، کردار میں، تعلیم میں سب میں یکتا ہو۔ پھر اپنا گھر کیوں نہیں بسا لیتے۔ اب تو تم اپنی والدہ کو بھی یہیں لے آئے ہو۔" خورشید جہاں نے اپنی دانست میں بڑی خوبصورتی سے سعد کی شادی کا ذکر چھیڑا۔

"لیکن اماں بیگم تو ابھی ملتان ہی میں ہیں یہاں تو نہیں آئیں۔" سعد نے ان کے اصل سوال کو گول کرتے ہوئے بتایا۔

"ہیں۔ بھابھی ابھی تک ملتان میں ہیں۔ مگر تم تو ان کو لینے گئے تھے۔ تو میں تو یہ سمجھتی رہی کہ وہ یہیں کراچی میں آگئی ہیں۔" آخری فقرہ خورشید جہاں نے ہنستے ہوئے انداز میں کہا۔

"آجاتیں تو میں سب سے پہلے آپ کو ہی ان سے ملوانے لے جاتا۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ وہ چل پھر نہیں سکتیں۔" سعد بولا۔

"ہاں معلوم تو ہے مگر وہ ملتان میں کیوں رہ گئیں؟ تمہارے ساتھ کراچی کیوں نہیں آئیں؟" خورشید جہاں نے پوچھا۔

"کوشش تو میں نے بھی بہت کی تھی اور گیا بھی اسی لیے تھا لیکن ایک تو بیس بائیس سال سے چونکہ ملتان میں رہ رہی ہیں اس لیے اماں بیگم کو وہیں رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے، دوسرے ان کی چند مجبوریاں بھی ہیں جن کی وجہ سے وہ اگر چاہیں بھی تو یہاں نہیں آسکتیں۔" سعد نے ماں کے نہ آنے کے سبب کو واضح کر کے بتایا۔

"پھر تو تم دونوں بھائیوں کو بڑی دقت پیش آتی ہو گی تنہا یہاں رہ کر۔ کیونکہ یہ عورت کا ہی کام ہوتا ہے کہ مرد کے کھانے پینے کا خیال رکھے۔ اور گھر کو سجائے، سنوارے۔" خورشید جہاں کو جیسے پھر شادی کے موضوع پر بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

"جی ہاں۔ لیکن جب کسی مجبوری کے سبب انسان کو تنہا ہی رہنا پڑے تو وہ اپنی دیگر جملہ باتوں کا بھی انتظام کر ہی لیتا ہے۔ ہم نے تو ایک ہوسٹل کی منتظمہ سے جو آفس میں کام کرنے والوں کو کھانا سپلائی کرتی ہیں، اپنے دونوں وقت کے کھانے کا بندوبست کرا لیا ہے، باقی کام ہم دونوں مل جل کر کر لیتے ہیں۔" سعد نے اپنی کارکردگی کو جتانے کی غرض سے مسکرا کر کہا۔

"نہیں بیٹے! لو بھلا اس طرح بھی کہیں گزارہ ہو سکتا ہے۔ تم تو اب اللہ کا نام لے کر اپنا گھر بسا لو۔ ہاں خیر سے تمہاری دلہن گھر میں آئے گی تو تمہارے بھائی کو بھی آرام ہو جائے گا۔" خورشید جہاں اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے بولیں۔ تو ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں پھپھو! مگر یہی نہیں کر سکتا۔"

"اے نوج! بھلا کیوں نہیں کر سکتے۔ آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہیں۔ آخر تمہاری والدہ کے بھی تو کچھ ارمان ہوں گے خیر سے بڑے اور کماؤ بیٹے ہو ان کے۔" خورشید جہاں نے نصیحت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، بڑا ضرور ہوں مگر اپنے اس معاملے میں مجھے ذرا سا بھی اختیار حاصل نہیں ہے۔ وہ اصل میں پھپھو جان اماں بیگم نے ہی اپنی ضد کی وجہ سے میرے اس معاملے کو التوا میں ڈال رکھا ہے۔ بس کیا بتاؤں پھپھو جان۔ خیر چھوڑیں اس ذکر کو۔" سعد قدرے اداس ہو کر بولا۔

"واہ کیسے چھوڑ دوں؟ یہی تو سب سے اہم معاملہ ہے۔ آخر بھابی تمہاری ماں ہیں اور ہر ماں کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کا سہرا دیکھ لے۔ پھر بھابھی ایسا کوئی نہیں چاہتیں۔ حیرت ہے۔" خورشید جہاں حد درجے متجسس ـــ ہو کر بولیں۔

"نہیں چاہتی تو وہ بہت ہیں۔ اور ان کا بھی یہ دلی ارمان ہے کہ وہ میرا سہرا دیکھ لیں لیکن وہ جس طریقے سے اپنا یہ ارمان پورا کرنا چاہتی ہیں، وہ مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں ہو سکتا۔" سعد نے ان کے اصرار پر اپنے پُراسرار معاملے کی مزید چند گرہیں کھولیں۔

"مگر کیوں گوارا نہیں جبکہ ماں کی خواہش کو پورا کرنا تو اولاد کا ایمان ہوتا ہے بیٹے۔" خورشید جہاں نے تبصرہ کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"اب میں آپ کو کیسے بتاؤں پھپھو جان کہ اماں بیگم جو کچھ مجھ سے چاہتی ہیں، اسے نبھانا میرے لیے کتنا مشکل ہے۔ بلکہ طور پر ممکن ہی نہیں۔ مگر اماں بیگم کو صرف اپنا مفاد ہی عزیز ہے میرے احساسات کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اب میں آپ سے کیا کہوں کہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔" سعد نے آخری فقرہ جھینپے جھینپے شرمسار سے انداز میں کہا تو وہ اس کی اس بات پر چونک کر بولیں۔

"نہیں نہیں، شرم کی کیا بات ہے تم کہو تو سہی کیا اب بھی مجھے غیر ہی سمجھتے ہو۔"

"نہیں پھپھو جان! اپنے اتنے سارے رشتے داروں میں صرف آپ ہی وہی واحد ہستی ہیں جنہیں میں اپنا سمجھتا ہوں۔ اور یہ سب آپ کے بے لوث اور بے بہا خلوص کے نتیجے میں ہے۔" سعد نے پوری صداقت سے کہا۔

"اے اللہ تمہیں خوش رکھے لمبی عمر دے میں نے تو پہلی ملاقات میں ہی تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے وہ اولاد کا سا احترام دیکھ لیا تھا۔ خیر تم مجھے بتاؤ تو سہی کہ تمہارا کیا مسئلہ ہے؟" خورشید جہاں نے بھی جن کا دل واقعی کھوٹ اور کدورت سے پاک تھا خوش ہو کر اسے دعائیں دیتے ہوئے پوچھا تو سعد نے بتانا شروع کیا۔

"وہ اصل میں پھپھو جان کبھی کبھی انسان کے حالات کچھ ایسا عجیب وغریب رُخ موڑ لیتے ہیں یا حقیقتیں ایسا روپ دھار لیتی ہیں کہ ان پر افسانے کا گمان ہوتا ہے۔ سو یہی کچھ میرے نانا، نانی کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اماں بیگم میرے نانا نانی کی دوسری اولاد تھیں کیونکہ پہلوٹھی کا لڑکا چند برس رہ کر مر گیا تھا۔ اور اماں بیگم ابھی دس سال کی بھی نہیں تھیں، نانی بھی چند روزہ علالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔

ان کی رحلت کے بعد۔ اماں بیگم بالکل تنہا رہ گئی تھیں ادھر نانا کو شروع سے اپنا وارث پیدا کرنے کی شدید تمنا تھی۔ انہوں نے اس سلسلے میں نانی کا بھی بہت علاج معالجہ کرایا تھا لیکن ان کے مزید اولاد پیدا ہونا ممکن ہی نہ رہی تھی تب نانی کے انتقال کے دو برس بعد نانا نے اپنی اس تمنا کو پورا کرنے کی غرض سے عقد ثانی کر لیا تھا۔ دو برس تک انہیں مزید انتظار کرنا پڑا پھر خدا نے انہیں ایک بیٹے سے نواز کر ان کی دیرینہ خواہش کو پورا کر دیا۔ مگر جہاں زندگی کی ایک اتنی بڑی خوشی سے نوازا وہاں ساتھ ساتھ ایک صدمے سے بھی دوچار کر دیا۔ چھوٹی نانی کچھ اندرونی پیچیدگیوں کی وجہ سے زیادہ عرصہ جی نہ سکیں اور بچے کی ولادت کے چار یا پانچ ماہ بعد ہی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

اماں بیگم کی عمر اس وقت بارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ سوتیلی ماں نے صرف شوہر کی خوشی کی خاطر تو ان سے اچھا ہی سلوک روا رکھا تھا۔ کیونکہ اماں بیگم نانا جان کی آنکھ کا تارا تھیں بہرحال۔ چھوٹی نانی کے اچانک کوچ کر جانے کے بعد اس ننھی منی سی معصوم جان کو جو سوتیلا ہی سہی ان کے بھائی کی صورت میں ان کی دنیا میں عرصے بعد وارد ہوا تھا۔ ایک ماں کی طرح کلیجے سے لگا لیا تھا۔

وہ تقریباً نو سال تک اس کی پرورش کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ جب اکیسویں یا بائیسویں برس ان کی شادی ہمارے بابا جان سے ہو گئی تب بھی وہ ماموں جان سے ایک لمحے بھی غافل نہ رہیں۔ قسمت سے بابا جان کی بھی بہت لاڈلی تھیں۔ اس لیے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرا بھائی مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اور چونکہ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد میں ہی اس کی پرورش اور نگہداشت کرتی رہی ہوں، اس لیے اب بھی اپنی اس ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہوں گی۔ چنانچہ اماں بیگم نے جو کہا تھا وہ کر کے دکھایا۔ انو ماموں کو تعلیم دلائی اور اچھی پوسٹ پر لگوا بھی دیا۔ اس دوران اس دنیا میں میرا ورود بھی ہو چکا تھا اور جب میں دس سال کا تھا۔ اور مجھ سے چھوٹی بہن انشین جو بے چاری بہت قلیل عمر لکھوا کر لائی تھی چھ برس کی تھی اور یہ فہد اماں کی گود میں تھا۔ انہوں نے انو ماموں کی شادی بڑی دھوم دھام سے کر دی۔

اصل میں چھوٹی نانی ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور خاصی وسیع جائیداد اور زمینیں چھوڑ کر مری تھیں۔ جو سب کی سب انو ماموں کی ملکیت تھیں۔ اس کے باوجود بھی اماں بیگم نے اس خدشے کے پیش نظر کہ انو ماموں اپنی جائیداد اور زمینوں کے زعم میں عیاش نہ بن جائیں۔ انہیں ملازمت پر لگوا دیا تھا۔"

اتنا کہہ کر شاید مسلسل بولتے رہنے کی وجہ سے سعد سانس لینے کو رکا اور پھر سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے کہا۔

"خیر یہ تو اماں بیگم نے بہت دانشمندانہ اقدام کیا تھا۔ میرا مطلب ہے انو ماموں کو ملازمت پر لگوا کر کیونکہ جب انسان کے ہاتھ میں بہت سارا پیسہ ہوتا ہے تو وہ محنت کرنے سے جی چراتا ہے اور اہدی بن جاتا ہے۔ اور پھر بڑی بے پروائی سے نا حق باتوں پر پانی کی طرح پیسہ بہانے لگتا ہے۔"

وہ پھر بات کہتے کہتے رکا تو خورشید جہاں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر"

"مگر انو ماموں تو حد درجے سعادت مند اور فرمانبردار تھے اماں بیگم کے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کے پاس ماں کی ورثے میں چھوڑی ہوئی جائیداد اور زمینیں ہیں اور وہ چاہیں تو ان ہی کی آمدنی میں ساری عمر عیش کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ اماں بیگم کا حکم تھا اس لیے انہوں نے بلا چوں چراں ملازمت کر لی تھی۔ بلکہ شادی کے بعد بھی کافی عرصے تک وہ ملازمت کرتے رہے تھے۔ اسی اثناء میں ان کے یہاں ایک بیٹی بھی پیدا ہو گئی تھی۔

اور بس یہیں سے ابتدا ہوئی تھی ممانی اور اماں بیگم کے درمیان مخالفت اور ناچاقی کی۔ کیونکہ ممانی کا کہنا تھا کہ جب ان کے شوہر کے پاس اتنی جائیداد اور زمینیں ہیں تو انہیں کیا ضرورت ہے ملازمت کرنے کی۔ اور یہی نہیں بلکہ ان کا مطالبہ بلکہ ضد تھی کہ ماموں ملازمت چھوڑ دیں اور اپنی جائیداد اور زمینوں کی دیکھ بھال کریں۔ کیونکہ اب وہ ایک بیٹی کے باپ ہو گئے تھے اور خدا نے چاہا تو اور بھی بیٹیاں اور بیٹے پیدا ہوں گے لیکن بیٹی کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ وہ ککڑی کی بیل کی طرح دیکھتے دیکھتے بڑھ جاتی ہے۔ اور پرائے گھر کی امانت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ بیٹی کی چھٹی ہی سے اس کا جہیز جمع کرنے کی ابتدا کی جاتی ہے۔ اس لیے ممانی چاہتی تھیں کہ انو ماموں انہیں اپنی زمینوں پر لے جائیں اپنی جائیداد دکھائیں اور ادھر اماں بیگم جو ممانی کے بطن سے بیٹی پیدا ہونے پر ان سے سخت ناراض اور شاکی تھیں۔

ان کی ان باغیانہ اور بے باکانہ باتوں پر ان سے سخت ناراض رہتی تھیں۔ انو ماموں کی شخصیت دو حصوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ یا ان پر وہی مثل صادق آتی تھی کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آیا ماں کے سمان بڑی بہن کا حکم مانیں۔

یا۔

دل و جان سے عزیز شریک حیات کی ولولہ انگیز اور حوصلہ کن باتوں پر عمل کریں۔

جبکہ شریک حیات کا پلڑا جھکاؤ پر تھا۔

آخر ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ انہوں نے یہ قضیہ یوں چکایا کہ اماں بیگم کے سر ہو گئے کہ وہ بھی ان کے ساتھ زمینوں پر چلیں۔ انہوں نے ممانی کو بھی بہت سکھا پڑھا دیا تھا اس لیے ممانی نے بھی بہت اصرار کیا اور یوں اماں بیگم کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔"

اتنا کہہ کر سعد نے ایک سرد آہ بھری اور چند لمحے کچھ سوچنے میں گزار دیے۔ خورشید جہاں جو ہمہ تن گوش بلکہ مجسم شوق بنی بیٹھی تھیں انہوں نے بھی ایک گہرا سانس کھینچا اور تھوڑا سا کسمسا کر اس کی طرف دیکھا۔

"بس پھپھو جان میں تو اسے تقدیر کا لکھا ہی کہوں گا کہ انسان قسمت میں جو لکھوا کر لاتا ہے وہی ہوتا ہے۔ انو ماموں، ممانی فریدہ اور اماں بیگم منیزہ سمیت جو مشکل سے ڈیڑھ سال کی تھی۔ پورا ایک ماہ کا عرصہ زمینوں پر گزار کر ہنسی خوشی گھر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ہی اپنے شہر سے چند میل دوران کی کار ایک تیز رفتار مال بردار ٹرک سے ٹکرا گئی۔ انو ماموں خود کار چلا رہے تھے اور ممانی فریدہ ان کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں تو جائے حادثہ پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ اماں بیگم چونکہ پچھلی سیٹ پر فوزیہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ گو چوٹیں ان کو بھی شدید آئی تھیں اور وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے بچ گئیں۔ البتہ ان کے ٹخنوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں ——— جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئیں اور فوزیہ بڑے معجزانہ طور پر بچ گئی اس کے صرف معمولی خراشیں آئی تھیں۔"

اتنا کہہ کر سعد کچھ افسردہ سا ہو گیا۔ تھوڑی دیر شاید حالات کی کڑیاں جوڑتا رہا۔ اور اسی اثناء میں خورشید جہاں سر ہلا ہلا کر افسوس کا اظہار کرتی رہیں۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لینے کے بعد کہا۔

"اماں بیگم یا تو فوزیہ کو منہ نہیں لگاتی تھیں۔ کبھی گود میں بھی لیتی تھیں تو شاید انو ماموں کا دل رکھنے کو ہی لیتی تھیں لیکن انو ماموں اور ممانی کے انتقال کے بعد وہ فوزیہ کی دالہ اور شیدا ہوگئیں۔ اس کے سامنے انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو بھی بھلا دیا۔ حالانکہ فہد فوزیہ سے چار پانچ سال ہی بڑا تھا۔ فوزیہ پر میں بھی جان چھڑکتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ محبت بٹ جانے کے باوجود فہد بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اور اب مسئلہ یہ ہے کہ" اتنا کہہ کر سعد نے تھوک نگلا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ اماں بیگم چاہتی ہیں کہ میں فوزیہ سے شادی کروں۔ جبکہ فوزیہ کی عمر مشکل سے تیرہ سال کی بھی نہیں اور پھر میں نے اسے شروع ہی سے چھوٹی اور سگی بہن کی نظروں سے دیکھا ہے۔ بلکہ میرے دل میں ہمیشہ یہی احساس رہا کہ خدا نے افشین کی کمی فوزیہ کی شکل میں پوری کر دی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیونکر اس سے شادی کر سکتا ہوں؟"

اس نے اپنی بات کا سوال کی صورت میں اختتام کیا تھا اس لیے خورشید جہاں اس کے جواب میں بولیں۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن تمہاری والدہ اگر اسے اپنی بہو بنانے پر ہی مصر ہیں تو فوزیہ کی شادی فہد سے کیوں نہیں کر دیتیں؟"

"یہی تو میں بھی ان سے کہتا ہوں۔ فہد ابھی زیر تعلیم ہے اور فوزیہ بھی کُل تیرہ برس کی ہے جب تک فہد اپنی تعلیم مکمل کرلے گا، وہ اور بڑی ہو جائے گی۔ مگر اماں بیگم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ وہ کہتی ہیں کہ میں اتنا انتظار نہیں کر سکتی ہوں۔ یوں بھی میرا جی ماندہ رہتا ہے۔ اور فہد کی نسبت تو میں تمہاری خالہ زاد عروسہ سے طے کر چکی ہوں۔ اور پھر فوزیہ کے فرض سے بھی تو سبکدوش ہونا ہے، لڑکی ذات ہے وہ بھی ہوشیار ہوگئی ہے۔ میں جلد سے جلد اس کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ اگر ایسی جلدی ہے تو اس کی شادی شریف گھرانے کے کسی اچھے لڑکے سے کر دی جائے لیکن اماں بیگم میری اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ فوزیہ انو ماموں کی کُل جائیداد اور اراضی کی مالک ہے۔ اور وہ ایک طرح سے سونے کی چڑیا ہے، جسے میں کسی قیمت پر بھی کسی غیر شخص کے حوالے نہیں کروں گی بلکہ میں یہ چاہتی ہوں کہ گھر کی دولت گھر میں رہے۔ اور اماں بیگم کی اس بات نے تو میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ بھلا اماں بیگم کو کس چیز کی کمی ہے۔ ان کے پاس اگر زمینیں نہیں تو جائیداد تو بہت ہے اور پھر پیسہ اور زیور بھی۔ پھر بھی اتنی پست سوچ۔ مجھے اصل میں غصہ تو اسی بات پر آیا اور میں نے بھی صاف صاف انکار کر دیا کہ میں خواہ کنوارا رہتے رہتے بوڑھا بھی ہو جاؤں مگر میں فوزیہ سے مر کر بھی شادی نہیں کروں گا۔"

آخری فقرہ اس نے جذبات میں آکر تخت پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ تو زور کی دھمک ہونے پر خورشید جہاں اُچھل سی پڑیں۔

"او معاف کیجیے گا پھپھو جان۔" اس نے فوراً ہی معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں بیٹے! مجھے تو تمہاری باتیں سُن کر بہت افسوس ہو رہا ہے۔ لیکن اتنا بتا دوں کہ تم آخر کب تک ماں کی ضد کے آگے ٹھہر سکو گے، ایک نہ ایک دن تو تمہیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑیں گے، ماں کا حق تو اتنا ہوتا ہے کہ اولاد ادا بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی۔" خورشید جہاں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پھپھو جان! میں نے ہمیشہ اماں بیگم کا حکم مانا۔ کبھی کسی بات کی ضد نہیں کی۔ میں تو بے داموں کا غلام ہی بنا رہا ان کے سامنے۔ اماں بیگم کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔ اور یہ بھی میں حرص و طمع سے نفرت کرتا ہوں۔ مجھے اپنے زورِ بازو پر بھروسہ ہے اور میں نے یہ سب جواب تک کیا ہے اپنی محنت شاقہ سے ہی کیا ہے۔ اماں بیگم میری ضد سے بھی واقف ہیں۔" سعد نے بڑی قطعیت سے اپنی بات کہی۔

"بہرحال یہ تو حالات پر منحصر ہوگا۔ لیکن میری ناقص رائے میں تو تم کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس سے شادی کر لو۔ اس کے بعد جب خیر سے بال بچہ ہو جائے گا تو اسے لے جا کر ماں کی گود میں ڈال دینا۔ پھر ان کی ساری خفگی دور ہو جائے گی۔

کیونکہ وہ جو کہتے ہیں نا کہ اصل سے سُود زیادہ عزیز ہوتا ہے تو یہی معاملہ اولاد کی اولاد کے ساتھ بھی ہوتا ہے یعنی اپنی اولاد اتنی عزیز نہیں رہتی جتنی کہ اولاد کی اولاد۔" اور بقول خورشید جہاں ان کے ناقص مشورے پر سعد کو بے ساختہ ہنسی آگئی

"واہ پھپھو جان! آپ نے تو نہ صرف شادی کرنے کا مشورہ دیا بلکہ اس سے بھی آگے یعنی مستقبل بعید میں بھی پہنچ گئیں۔ جبکہ میں شادی اس وقت ہی کروں گا جب اماں بیگم مجھے دل سے اجازت دیں گی۔"

"ہاں خدا کرے، وہ تمہیں اپنی مرضی کی شادی کرنے کی اجازت دے دیں۔" خورشید جہاں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"اپنی مرضی کی نہیں بلکہ میری مرضی کی۔" وہ ہنس کر بولا۔ اور پھر ایک دم ہی کھڑا ہو گیا۔

"اچھا اب اجازت پھپھو جان۔" اس نے کہا۔

"ارے نہیں، بس تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔ لو بھلا اتنی دیر سے بیٹھے ہو۔ اور مجھے باتوں میں خیال ہی نہیں آیا کہ کم از کم تمہیں چائے ہی پلا دیتی۔"

خورشید جہاں نے کہا اور پھر اس نے کیا جواب دیا اس کے کھڑے ہو جانے کی وجہ سے چھوٹی نے سُنا ہی نہیں۔ وہ جلدی سے کمرے میں جاتی ہوئی عنبر سے بولی جو اسی کے اشارے سے بُلانے پر اس کے پاس ہی آکھڑی ہوئی تھی اور سعد کی باتیں سُن رہی تھی۔

"آپا، جلدی کریں۔ کہیں وہ بیٹھک میں نہ آجائیں۔" مگر اتنی دیر میں وہ بیٹھک میں آگیا تھا۔

"اوہو تو آپ دونوں خواتین یہاں چھپی بیٹھی ہیں۔" اس نے چھوٹی کو دیکھ کر کہا۔ تو مجبوراً چھوٹی کو اس سے بات کرنی ہی پڑی۔

"نہیں خیر، ہم چھپے تو نہیں بیٹھے بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئے ہیں۔ آپ اپنی باتوں میں کچھ اتنے محو تھے کہ آپ کو پتا ہی نہیں چلا۔" مگر وہ چھوٹی کی بات سُننے سے زیادہ عنبر کی طرف متوجہ تھا جو چھوٹی کے آگے ہی عین اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ اور تعجب کی بات یہ تھی کہ اسے دیکھ کر عنبر کے چہرے سے ایک ناخوشگوار سا تاثر ہویدا ہوتا تھا وہ کیفیت اس وقت بالکل نہ تھی اور وہ چونکہ باہر سے ہو کر آئی تھی اس لیے تھوڑی ٹیپ ٹاپ کے ساتھ اچھی بھی بہت لگ رہی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" سعد نے اس کی مزاج پرسی کی۔

"ٹھیک ہوں۔" جواب ملا۔

"آپ نے شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ کورس تو مکمل کر لیا؟" عنبر چپ رہی۔

"اب کیا آپ نے ملازمت کے لیے کہیں اپلائی بھی کیا؟" اس نے مزید ایک سوال کیا۔

"جی ہاں کیا تو ہے۔ ایک دو جگہ۔" عنبر نے قدرے رکھائی سے کہا۔

"لیکن کس قسم کی ملازمت میں آپ انٹرسٹڈ ہیں؟" سعد نے پھر پوچھا۔

"لیں۔ یہ ملازمت میں بھلا کیسے انٹرسٹڈ ہو سکتی ہیں۔ یہ تو ملازمت دینے والوں پر ڈیپینڈ کرتا ہے کہ وہ انہیں چانس ڈیپینڈ دے دیں۔" چھوٹی سعد کی بات پر ہنس کر بولی۔

"لیکن میرا مطلب یہ نہیں تھا چھوٹی۔ بلکہ میں تو ان سے یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ یہ کس قسم کی ملازمت کرنا چاہتی ہیں۔" سعد نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"قسم وسم تو میں جانتی نہیں۔ بس اچھی ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ہے جس میں سیلری ذرا معقول ہو۔" عنبر نے کہا تو چھوٹی نے فوراً لقمہ دیا۔

"یعنی ڈھائی تین ہزار روپے ماہوار تک۔"

"لیکن یہ تو ایکسپیرینس پر منحصر ہوتا ہے یا پھر کوئی خاص کورس کر رکھا ہو آپ نے۔ یوں بھی ہینڈسم سیلری اکاؤنٹنگ اور ایگزیکٹیوز کے شعبوں میں ہی ملتی ہے یا پھر آپ پرسنل سیکرٹری کی جاب کریں۔ ویسے ٹائپنگ میں آپ کی اسپیڈ کیا ہے؟" سعد نے پوچھا۔

"تھرٹی فائیو اور فورٹی کے درمیان" عنبر نے بتایا۔

"یہ کم و بیش ففٹی ہونی چاہیے تھی" سعد بولا۔

"اصل میں آپا کے پاس ٹائپ رائٹر نہیں ہے نا۔ اور اگر ٹائپنگ کی پریکٹس گھر میں کی جائے تو اسپیڈ بھی بڑھتی ہے اور ہاتھ بھی رواں ہو جاتا ہے" چھوٹی نے پھر دخل در معقولات کی

"ہاں یہ بات تو ہے" سعد نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"ویسے میرے پاس ایک اسپیئر (فالتو) ٹائپ رائٹر پڑا ہوا ہے۔ اصل میں، میں نے چونکہ چند نئے ٹائپ رائٹرز خریدے ہیں اس لیے استعمال میں نہیں آتا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں وہ یہاں لے آؤں؟"

"لیجیے نیکی اور پوچھ پوچھ۔ لے آئیں ضرور لے آئیں" چھوٹی نے پھر بیچ میں دخل دیا تو عنبر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور سعد سے بولی۔

"آپ اگر اسے میرے ہاتھ بیچ سکتے ہیں تو ضرور لے آیئے"

"نہیں، میں اسے آپ کے ہاتھ بیچ نہیں سکتا۔ البتہ چند ماہ کے لیے استعمال کرنے کو ضرور دے سکتا ہوں۔ اور آپ اب اس سلسلے میں کچھ نہیں بولیں گی۔ میں کل ہی وہ ٹائپ رائٹر یہاں لا رہا ہوں۔ اچھا خدا حافظ" اور خدا حافظ کہتے ہی اس نے تیزی سے دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور پھر بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"یہ تمہاری کیا عادت ہو گئی ہے۔ ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑانے کی۔ کوئی بات تمہارے مطلب کی ہو یا نہ ہو تم بیچ میں دخل ضرور دیتی ہو" عنبر نے کھٹکا لگا کر واپس پلٹتی ہوئی چھوٹی کو لتاڑنے کے سے انداز میں کہا۔

"ہیں آپا! میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو آپ خواہ مخواہ میں گرمی دکھا رہی ہیں" چھوٹی نے چمک کر پوچھا۔

"لو بھلا، کہنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے تم نے۔ ملازمت کی بات ہوئی تو فوراً ہی کہہ دیا کہ ان کا انٹرسٹ بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ اور ٹائپ رائٹر کی بات ہوئی تو پٹ سے بولیں کہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ فوراً لے آئیں۔ اور وہاں عالیہ کے یہاں بھی میرے منع کرنے کے باوجود بھی تم نے اس کے سامنے اپنے حالات کا رونا رو ہی دیا۔ اور ایک میں ہوں کہ اتنے دن اس کا ساتھ رہا لیکن میں نے اپنے حالات کی اسے ہوا تک نہیں دی"

"ہوا نہیں دی۔ تبھی تو اس روز عالیہ آپا کی اچانک آمد پر آپ کو کتنی زیادہ شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ آپ دو تین روز تک مسلسل روتی رہی تھیں۔ آپا جب کسی سے اتنی گہری دوستی ہو تو اسے اپنے حالات سے لاعلم رکھنا کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے جیسے کہ آپ اس روز ہوئی تھیں۔ اور رکیا انھوں نے اپنی آنکھوں سے ہماری حالت زار نہیں دیکھ لی تھی۔ جو میرے کہنے سے کوئی فرق پڑ جاتا بلکہ میرے کہنے کی وجہ سے ہی تو انھوں نے آپ سے نوکری دلوانے کا وعدہ کیا ہے" چھوٹی بھی قائل ہونے والوں میں سے نہ تھی۔

"ہونہہ بڑا وعدہ کیا ہے۔ پتا نہیں کب اس کی ملاقات اپنی سہیلی سے ہو گی اور کب وہ میرے لیے اس سے کہے گی۔ اتنی دور اسلام آباد میں تو رہتی ہے وہ" عنبر نے سر کو جھٹک کر کہا۔

"اگر دور بھی رہتی ہے تو عالیہ آپا کے لیے اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ ان کی فون کالز تو امریکا تک دوڑتی ہیں تو اسلام آباد کیا شے۔ یعنی وہ اپنی سہیلی سے فون پر ہی آپ کے لیے بات کر سکتی ہیں" چھوٹی نے کہا۔

"ہاں میں بھی دیکھوں گی کہ عالیہ کتنے پانی میں ہے۔ اصل میں ایک دوست کی سنسیرٹی کا اسی بات سے اندازہ ہوتا ہے جب اس سے کوئی کام پڑتا ہے" عنبر بولی۔

"ہاں لیکن عالیہ آپا نے آپ سے اتنا وعدہ ضرور کیا ہے کہ وہ آپ کے لیے کوشش کریں گی۔ یہ نہیں کہا کہ ملازمت دلوا کر ہی رہیں گی" چھوٹی نے کہا تو وہ جل کر بولی

"اُفوہ بھئی، تم تو ہر بات میں ٹیکے کی طرح بولتی ہو۔ یہ میرا اور عالیہ کا معاملہ ہے۔ تمہیں اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں" عنبر نے بڑی ناگواری سے کہا اور تبھی خورشید جہاں نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا

"اے تم دونوں یہاں کھڑی باتیں مٹھار رہی ہو۔ اتنا بھی نہ ہوا کہ سعد کو ایک پیالی چائے بنا کر دے دیتیں۔ اور کب آئیں تم؟ مجھے تو پتا بھی نہیں چلا"

"امی! ہم بس ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئے ہیں۔ جس وقت سعد بھائی واپس جا رہے تھے" چھوٹی نے بتایا۔

"امی! یہ آپ بیٹھک کا دروازہ کھلا کیوں چھوڑ دیتی ہیں؟ اگر کسی دن کوئی چور اچکا اندر آ گیا تو؟"

"تو یہاں کیا رکھا ہے جو کچھ لے کر جائے گا۔ بلکہ آ کے پچھتائے گا ہی" ماں کے بجائے چھوٹی نے عنبر کی بات کاٹ کر جواب دیا۔

"نہیں خیر، عزت سب سے بڑی متاع ہوتی ہے چھوٹی۔ کسی کا کیا بھروسہ کہ کس نیت سے آ جائے۔ اصل میں مجھے کچھ خیال ہی نہیں رہا" خورشید جہاں نے گویا اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ پھر عنبر سے پوچھا۔

"کیوں، مل آئیں تم اپنی سہیلی سے؟"

"جی ہاں امی! یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ ہم تین چار روز پہلے نہیں گئے ورنہ عالیہ سے ملاقات ہی نہیں ہوتی کیوں کہ وہ پرسوں رات کو اسلام آباد سے واپس آئی ہے" عنبر نے بتایا۔

"اچھا تو کیا نوکری دلا دی اس نے تم کو؟" خورشید جہاں نے انتہائی سادگی سے پوچھا تو چھوٹی ہنس کر بولی۔

"لیجیے آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے عالیہ آپا نے نوکریوں کی دکان کھول رکھی ہو جب کہ ملازمت حاصل کرنے کے لیے تو بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔ وہ بھی ایسی ملازمت جہاں آپ کی خواہش کے مطابق صرف عورتیں ہی کام کرتی ہوں۔ ویسے عالیہ آپا نے وعدہ تو کر لیا ہے کہ آپا کو کسی ایسی ہی جگہ کام دلوا دیں گی" اصل میں اسکول کے علاوہ کسی دوسری جگہ ملازمت کرنے کی اجازت خورشید جہاں نے اسی شرط پر دی تھی کہ جہاں صرف عورتیں ملازمت کرتی ہوں۔ اور مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ ماں کو اس طرف سے اطمینان دلا دیا جائے ورنہ پھر اجازت ملنی مشکل ہی ہوتی۔

"چلو، ٹھیک ہے مگر تم ایسا کرنا عنبر کہ نوکری ملنے کے بعد اپنی ٹیوشنیں اس چھوٹی کو دے دینا تاکہ اس کا بھی کام چلتا رہے" سادہ لوح ماں نے جس سادگی سے مشورہ دیا عنبر نے مسکرا کر چھوٹی کی طرف دیکھا اور بولی۔

"جی اچھا امی۔۔!"

پھر دونوں بہنیں اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں۔

یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ اس روز بسوں کی ہڑتال تھی اور منی بسیں اگر چل بھی رہی تھیں تو اتنی کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں کہ کچھ مسافر تو لٹکے ہوئے تھے اور بہت سے چھتوں پر بیٹھے تھے۔ کوشش کے باوجود اسے جگہ ہی نہ مل سکی تھی۔ اسی لیے اسے گھر واپس آنا پڑا تھا۔

عنبر کے ہاتھ ایک اچھا موقع آ گیا تھا عالیہ کے ہاں جانے کا، کیونکہ وہ تنہا تو نہیں جا سکتی تھی۔ اور چھوٹی روزانہ کالج جاتی تھی۔ اور چھٹی کے دن عالیہ گھر پر نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر کہیں نہ کہیں آؤٹنگ پر ضرور جاتی تھی، اس لیے اس نے موقع غنیمت جانا اور چھوٹی کے ذریعے ماں سے عالیہ کے ہاں جانے کی اجازت بھی لے لی۔

یوں بھی اس روز عنبر کے پاس تھوڑے سے پیسے تھے۔ اسی لیے وہ سویرے کھانا کھا کر عذیر کے ساتھ ہی گھر سے نکل گئی تھی اور رکشہ پکڑ کر عالیہ کے ہاں پہنچی تھی۔

اس سمے دن کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

موسم بھی اس روز بڑا سہانا سا ہو رہا تھا۔

آسمان کی نیلی ردا سرمئی بادلوں سے ڈھکی تھی۔ اس پر ہوائیں بھی اتنی خوشگوار کہ برآمدے میں بیٹھی چھوٹی بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چونکہ اس وقت کرنے کے لیے کوئی کام نہ تھا اس لیے عنبر بھی اس کے قریب ہی آ کر بیٹھ گئی تھی۔ جب کہ ماں ساری دوپہر سعد سے باتیں کرنے کی وجہ سے تھکن سی محسوس کر رہی تھیں اور کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھیں۔ تبھی کوئی دسویں بار چھوٹی نے آکاش پر تیرتے بادلوں کو دیکھ کر کہا۔

"آپا! آج تو موسم بھی کتنا سہانا سا ہو رہا ہے۔ سچ واپسی میں باہر کا منظر اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ میرا دل چاہا کہ میں ساری عمر کار میں بیٹھی ایسے ہی مناظر سے لطف اندوز ہوتی رہوں"

"ہاں، دل تو اور بھی بہت سی باتوں کو چاہتا ہے مگر ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ ہم بس ایسی بہت سی خواہشیں کرکے اپنا دل خوش کرلیں۔" عنبر نے بات کے اختتام پر ایک گہرا سانس کھینچا۔

"ہاں واقعی آپا۔ اصل میں ہم غریب ہوتے ہیں نا تو اور تو کچھ کر نہیں سکتے، بس اپنی تمناؤں اور خواہشات میں اضافہ کرکے اپنی محرومیوں کو تسکین پہنچا لیتے ہیں۔ کبھی تو ہمارے دلوں میں تمناؤں اور خواہشات کا ایک انبار سا لگا ہوتا ہے۔" چھوٹی افسردگی سے بولی۔

"چھوڑو چھوٹی۔ اپنے حالات کا نوحہ کرنے کے بجائے ہمیں اپنی سوچ کو وسعت دینی چاہیے۔ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ساری نہیں تو ہم اپنی چند خواہشوں کی تکمیل ہی کرلیں۔ اب عالیہ تو نہ معلوم کب کچھ کرے۔ کاش اتنا ہی ہوجائے کہ میں نے جو اتنی ساری درخواستیں دے رکھی ہیں ان میں سے کسی ایک کا ہی جواب آجائے۔" عنبر نے اس کی افسردگی دور کرنے کی غرض سے موضوع پلٹا۔

"آپا! ہم بندوں کی فطرت میں ہی کچھ بے صبری اور عجلت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں ورنہ آپا۔ پہلے تو آپ کی بھیجی ہوئی درخواستیں مختلف وقتوں میں ڈاکخانے سے نکل کر مطلوبہ جگہ پر پہنچی ہوں گی۔ پھر آپ کے علاوہ اور جو ڈھیروں درخواستیں آئی ہوں گی ان کو جمع کرکے ون بائی ون پڑھا گیا ہوگا۔ پھر ان میں سے چیدہ درخواستیں ہی سلیکٹ کی گئی ہوں گی اور ان پر بھی غور و خوض کرنے کے بعد ہی کہیں جاکر انٹرویو لیٹر بھیجے گئے ہوں گے، بلکہ بھیجے جائیں گے۔ آپا ایسے کام میں تو دیر ہی لگتی ہے۔ ایک دم تو نہیں ہوجاتا نا۔" چھوٹی نے بڑے مفکرانہ انداز سے اُسے سمجھایا۔

"افوہ چھوٹی! تم تو سچ مچ میری دادی ہی لگنے لگی ہو۔ ورنہ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں مگر کیا کروں۔ حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ میرا بس نہیں چلتا کہ کسی طرح کوئی اچھی سی ملازمت پکڑلوں۔" عنبر اس کی عاقلانہ سی باتوں سے زچ سی ہوکر بولی۔

"ہاں آپا یہ بات تو ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ آپ کو جلدی سے کوئی عمدہ سی ملازمت مل جائے کیونکہ رجب کا مہینہ شروع ہونے والا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اب کے رمضان شریف اچھی طرح گزر جائیں۔ کہیں پہلے کی طرح نہ ہو کہ کبھی سحری غائب اور کبھی افطار ندارد۔ بھوکے پیٹ روزے رکھنے سے میری تو آدھی طاقت سلب ہوجاتی ہے۔ یہ تو عذیر ہی کا بوتہ ہے کہ وہ منع کرنے کے باوجود ماشاء اللہ سارے روزے رکھ لیتا ہے مگر کتنا کمزور اور دبلا ہوجاتا ہے!" چھوٹی نے کہا۔

"ہاں واقعی عذیر بڑی ہمت والا ہے۔ مگر بھئی مجھ سے تو بغیر سحری کے روزے نہیں رکھے جاتے، اسی لیے میں بعد میں پورے کرلیتی ہوں!" عنبر بولی۔

"خیر اب کے انشاء اللہ رمضان المبارک اچھے ہی گزریں گے۔ کم از کم مجھے خدا کی ذات سے یہی امید ہے۔" عنبر بولی۔

"ہاں خدا کرے ایسا ہی ہو۔ بس آپ تو ایسا کریں آپا کہ اگر کل سعد بھائی سچ مچ ٹائپ رائٹر لے آئیں تو اس پر دن رات پریکٹس کرکے اپنی اسپیڈ بڑھالیں تاکہ ملازمت ملنے میں آسانی ہو۔"

"ارے نہیں پگلی مجھے کوئی ٹائپسٹ کی جاب تو نہیں کرنی بلکہ یہ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ تو ایک اضافی چیز ہوتی ہے ایک ایمپلائی کے لیے اور تم نے یوں منہ کھول کر سعد سے ٹائپ رائٹر لانے کو کیوں کہہ دیا۔ اس نے بھی دل میں کیا سوچا ہوگا کہ بس تیار ہی بیٹھی تھیں چیز مانگنے کے لیے۔"

"نہیں آپا وہ اتنی گری ہوئی ذہنیت نہیں رکھتے کہ ایسی چھچھوری باتیں سوچیں گے۔ اور پھر انہوں نے خود ہی ٹائپ رائٹر دینے کی پیشکش کی تھی۔ آپا آپ کی ایک بات سے مجھے بڑا رنج پہنچا ہے۔ کیا آپ کے اندر ذرا سا بھی ہمدردی کا مادہ نہیں ہے۔" چھوٹی نے واقعی بڑے دُکھ سے کہا۔

"کس کی ہمدردی، کیسا مادہ۔ آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔" سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی عنبر نے تجاہل سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ نے ان کی روداد نہیں سنی۔ بے چارے کتنے دکھی ہیں، ماں کی بے جا ضد کی وجہ سے۔" چھوٹی نے ملامت بھرے انداز میں بتایا۔

"مگر اس میں ان کے دکھی ہونے کی کیا بات ہے۔ کوئی ان کی والدہ ان کے کسی پرانے افیئر کو ختم کرنے پر تو انہیں مجبور نہیں کررہیں کہ سمجھ لیا جائے کہ ان کی محبوبہ کو ان سے کٹوا کر زبردستی اپنی بھتیجی کو ان کے سر منڈھنا چاہ رہی ہیں۔ وہ تو اپنی کمسن بھتیجی سے ان کی شادی کرنا چاہتی ہیں تو یہ کوئی اتنی بری بات یا بے انصافی کی بات تو نہیں، بھئی انہوں نے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اتنی محنت کی ہے اس پر تو پھر وہ کیسے یہ چاہیں گی کہ اس کی دولت کسی غیر کے قبضے میں جائے۔ دولت کی قدر و قیمت تو کوئی مجھ سے پوچھے۔ مجھ سے۔"

عنبر نے سعد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"واہ آپا بہت ہی اعلیٰ اور ارفع خیالات ہیں آپ کے۔ اور اسی وجہ سے ہیں کہ یہ سعد بھائی کا معاملہ ہے لیکن اب تو آپ نے خود اپنے کانوں سے سن لیا ہوگا کہ وہ کس حیثیت کے مالک ہیں۔ اس کے باوجود بھی پوری خلوص دلی سے ہم جیسے مفلسوں کو منہ لگا لیتے ہیں۔" چھوٹی عنبر کی باتوں پر جل کر بولی۔

"تم ہی کو منہ لگاتے ہوں گے ورنہ ہم تو ایسے بے وقعت لوگوں کو جوتی کی نوک پہ مارتے ہیں۔ اور اب تم اس منحوس ذکر کو بند ہی کردو ہاں خواہ مخواہ دوسروں کی وجہ سے آپس میں دل بُرے کرنے۔" عنبر اپنی اسی ڈگر پر آگئی جو سعد کے معاملے میں چھوٹی سے اس نے اختیار کررکھی تھی۔ چھوٹی نے بھی سوچا کہ اب کچھ کہنا بے کار ہی ہوگا۔ اس لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر باورچی خانے میں آگئی۔

دن کے گیارہ بجے جلدی میں جو تھوڑا بہت کھایا تھا وہ کب کا ہضم ہوچکا تھا اور اب اسے بری طرح بھوک لگ رہی تھی۔ اس پہ شام کا کھانا پکانے کی بھی فکر سوار تھی کیونکہ آج اس کی باری تھی اور ادھر پلاسٹک کے تسلے میں تھوڑے سے ٹنڈے رکھے تھے۔ ٹنڈے تو اسے گوشت میں بھی پسند نہ تھے کجا کہ سادہ ٹنڈوں کی بھجیا۔ اور وہ بڑے ملال کے ساتھ دل میں سوچ رہی تھی کہ ہم بھی کتنے مجبور اور بے بس ہیں حالات کے سامنے۔ ایسی چیزیں کھانی پڑتی ہیں جنہیں کھانے کو نہ دل چاہتا ہے نہ طبیعت ہی راغب ہوتی ہے۔ کبھی کرم کلہ۔ کبھی بینگن۔ کبھی دالیں اور کبھی ساگ۔ یا پھر آلو۔ کہ سستے ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ (بقول امی اوڑھنا اور بچھونا بن جاتے ہیں) وہی کھائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسے کھانوں کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کھانا کھانا ہی چھوڑ دوں۔ مگر یہ پیٹ کی بھوک جبراً مجھے ایسے ہی کھانے کھانے پر مجبور کردیتی ہے۔

جب بھی اسے کوئی ناپسندیدہ چیز مجبور ہوکر۔ کھانی پڑتی اسے اپنے تایا کے گھر کا کروفر یاد آجاتا۔ ان کے تو نوکر بھی ہم سے اچھے ہیں کہ خوب مرغن کھانے کھاتے ہیں۔ خانساماں اور مالی کے پاس اپنے علیحدہ علیحدہ ٹرانسسٹر بھی ہیں جو تایا نے ہی جاپان سے ان کو لاکر دیے تھے۔ مالی کیاری کے پاس رکھ کر ہلکی آواز میں گانے سنتا رہتا اور خانساماں کچن میں کام کرتے ہوئے ٹرانسمیشن کے آغاز سے اختتام تک مسلسل ٹرانسسٹر سنتا رہتا ہے۔ اور یہاں ہمارے پاس ایک ڈفلی تک نہیں ہے پتا نہیں یہ کیسا انصاف ہے قدرت کا کہ قصے کہانیوں میں بھی علی بابا چالیس چور سے لے کر اب تک ایک سلسلہ سا چلا آرہا ہے کہ ایک بھائی اتنا رئیس کہ سینکڑوں لونڈی غلام خدمت کو موجود پورے شاہانہ کروفر کے ساتھ رہتا ہے اور دوسرا بھائی اتنا غریب کہ دانے دانے کو ترستا ہے۔ ماں جائے ہوکر یہ اتنی زبردست تفریق آخر کیوں ہوتی ہے۔ کس وجہ سے ہوتی ہے۔ میں تو اگر امیر ہوجاؤں تو اپنا سب کچھ اپنے چھوٹے بھائی اور بڑی بہن پہ وار دوں۔ میں تو کبھی یہ برداشت نہ کروں کہ میرے پاس پیسہ ہو اور میرے بھائی بہن دھیلے دھیلے کو محتاج رہیں۔

اصل میں جب بھائیوں کی زندگی میں بیویاں داخل ہوجاتی ہیں تو وہ واقعی دلوں میں بڑے تفرقے ڈال دیتی ہیں۔ اس پر اولاد ہوجاتی ہے تو اس کا جھکاؤ بھی ماں کی طرف ہی ہوتا ہے۔ اور وہ چچا پھوپی کی طرف سے اور بھی باپ کو ورغلا دیتی ہے۔ اصل میں سارا قصور تو اس بھائی کا ہوتا ہے جسے خدا اپنی بیشتر نعمتوں سے نوازتا ہے مگر پیسے کی چمک اور گرمی اس کی آنکھوں پر بے حسی کے پردے ڈال دیتی ہے۔

"اف توبہ میں بھی کیا واہیات باتیں سوچنے لگی۔ میں اب اتنی بھی بے بس نہیں ہوں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم تعلیم تو ہے میرے پاس۔ اگلے برس انشاء اللہ گریجویشن کرلوں گی تو میں بھی ملازمت کرلوں گی اور پھر چند سال کی ہی تو بات ہے اپنا عذیر ڈاکٹر بن جائے گا تو پھر تو سارے ولدّر ہی دور ہوجائیں گے۔ چھ برس ہی کی تو بات ہوگی۔ اتنے میں اور آپا اسی گئی گزری حیثیت کو سنبھالا

دیتے رہیں گے۔ پھر وہ سوچتے سوچتے بہت آگے نکل گئی۔ اپنے خوابوں کے حسین جزیرے میں۔
اپنی تمناؤں کے جگمگاتے شیش محل میں۔

مگر اس کے خوابوں میں اب تک صرف اور صرف اعلیٰ قسم کا فرنشڈ بنگلہ۔ ملازم اور خدمت گار اور انواع و اقسام کے کھانے ہی شامل تھے۔

کیونکہ ٹنڈوں کی بھجیا بنا کر اسے حلق سے اتارنے کے خیال سے بھی اسے غصہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی یہ سوچ کر اب بار جھینک کر بھی زہر مار کرنے پڑیں گے کوئی آسمان سے من سلویٰ تو اترے گا نہیں اس نے ٹنڈوں کے چھلکے اتارنے شروع کر دیے۔

پھر رجب المرجب کا محترم مہینہ بھی اس امید میں گزر گیا کہ شاید کہیں سے اسے نوکری کی آفر آجائے جب کہ اندر ہی اندر عنبر مایوس ہو چکی تھی۔ اور چھوٹی جیسے صرف ماہ رمضان جیین سے گزر جانے ہی کی بڑی بھتی جل جل کر کہتی۔

"آپا! آخر کس قسم کی ملازمت چاہتی ہیں آپ۔ اب گورنری یا منسٹری تو ملنے سے رہی آپ کو۔ یوں خالی بیٹھنے سے تو اچھا تھا کہ کسی اسکول میں ملازمت [illegible]۔ یا پھر وہ لیڈی سپروائزر کی جاب کی جو آفر دی تھی سعد بھائی نے آپ کو وہی کر لیتیں اب تو شعبان کا مہینہ بھی شروع ہو گیا۔ اور اگلا مہینہ رمضان المبارک ہے۔ کیا اس سال بھی عیدیوں ہی ایک ایک کا منہ تکتے گزرے گی۔ پتا ہے ہر سال بقر عید پہ بھی دل چاہتا ہے ہم بھی ایک بکرے کی قربانی کر لیں مگر یہاں تو ایک مرغی کی قربانی کی بھی پوزیشن میں نہیں ہوتے ہم۔ عذیر جب چھوٹا سا تھا تو یاد ہے کیسا مچل مچل کر ضد کرتا تھا امی سے کہ ایک بکرا وہ بھی خرید کر لے آئیں۔ رات کو سونے کے لیے بستر پہ لیٹتا تھا تو بڑی معصومیت سے مجھ سے پوچھتا تھا۔

"چھوٹی! کیا صبح کو جب میں سو کر اٹھوں گا تو بکرا آجائے گا ہمارے گھر میں؟"

اور میں بھی چونکہ چھوٹی تھی اور اس کی محرومی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی، صاف صاف کہہ دیتی تھی۔

"کہاں سے آئے گا ہمارے گھر بکرا عذیر! امی کے پاس تو گائے کا تھوڑا سا گوشت خریدنے کے بھی پیسے نہیں ہوتے ہاں تایا ابو کے یہاں سے اتنا سارا حصہ آئے گا۔" تب آپ اس کی صورت دیکھتیں کہ کیسی اتر جاتی تھی۔ بے چارا چھت کو تکتے تکتے سوجاتا تھا۔ آپا! وہ جو نکڑ پہ کتے والی خالہ (ان خالہ نے کتا پال رکھا تھا) ہیں نا۔ ان کا چھوٹا بیٹا پچھلی بقر عید پر جو دنبہ لیے لیے پھرتا تھا نا وہ جانتی ہیں کس کا تھا؟ وہ اس کے چچا نے اپنے گھر میں قربانی کرنے کے لیے جو بکرے لیے تھے ان میں سے ایک تھا جو چچا نے بھتیجے کو خوش کرنے کی غرض سے اسے بھیج دیا تھا۔ آپا ایسے دل اور خیال رکھنے والے بھی چچا تایا ہوتے ہیں اس دنیا میں۔ آپا! آپ میری مانیے تو کسی اسکول میں ملازمت کر لیجیے بلکہ ہمارے کالج میں آجائیے ریسپشنسٹ کی جگہ خالی ہے آجکل۔ اور آپ تو وہاں کی اولڈ اسٹوڈنٹ بھی ہیں۔" اف توبہ چھوٹی ہر وقت ایسی باتیں کر کے اس کے کان کھاتی رہتی۔

"نہیں بھئی، ٹیچنگ یا ریسپشنسٹ کی جاب کر کے مجھے اپنی پوزیشن نہیں بگاڑنی۔ وہاں زیادہ سے زیادہ بارہ سو نہیں تو پندرہ سو ملا کریں گے اور جب میں کسی بڑی جاب کے لیے کہیں انٹرویو دینے جاؤں گی، کام کے معاملے میں اپنا تھوڑا سا تجربہ انہیں دکھاؤں گی تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ اچھا اس امپلائر کا اسٹینڈرڈ بس اتنا ہی ہے کہ یہ بارہ پندرہ سو کی جاب کر سکتی ہے تو ہم بھی اسے اسی اسٹینڈرڈ کی جاب دیں گے۔ پتا ہے سارا امیج خراب ہو جاتا ہے اس طرح۔ اور وہ جو تمہارے سعد بھائی نے آفر دی تھی گارمنٹ فیکٹری میں لیڈی سپروائزر کی تو وہاں بھی بیسک پے (BASIC PAY) کل نو سو روپے ہے باقی ٹرانسپورٹ، ہاؤس الاؤنس، میڈیکل وغیرہ سب ملا کر سولہ سو بنتی ہے ــــ لیکن اصل چیز بیسک پے ہی ہوتی ہے۔ اور اسی سے انسان کا اسٹینڈرڈ دیکھا جاتا ہے۔" عنبر کی عادت ہی قائل ہونے کی نہیں بلکہ قائل کرنے کی تھی۔ مگر چھوٹی کب آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والی تھی۔

"پھر تو میرے خیال میں آپ ملازمت کا خیال چھوڑ ہی دیجیے۔ کیونکہ اب چاندی کے طشت میں آپ کی ملازمت کا پروانہ رکھ کر تو لانے سے رہا۔ عالیہ آپا ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں کہ آپ کوئی ہنر ہی سیکھ لیجیے۔ اور وہ تو کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے آپ کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ آپ ایئر ہوسٹس کی جاب سنبھال لیں، کیونکہ وہاں آپ کو فوراً سلیکٹ بھی کر لیا جائے گا اور تنخواہ بھی زبردست ملے گی۔"

"اب میں تمہارے منہ پر ایک ایسا ہاتھ رسید کروں گی کہ تمہیں چھٹی کا کھایا یاد آجائے گا۔ ہونہہ ایئر ہوسٹس کی بچی تمہیں معلوم بھی ہے کہ ایئر ہوسٹس کیا ہوتی ہے۔ امی نے سن لیا تو میری شامت ہی آجائے گی۔ اور اگر ایسا ہی شوق ہے ایئر ہوسٹس بننے کا تو گریجویشن کے بعد تم بن جانا۔"

چھوٹی کے منہ سے ایئر ہوسٹس کا ذکر سن کر عنبر فوراً اپنی لڑاکا سی فطرت پر اتر آئی۔

"آپا! میرے تخیل کی پرواز اتنی بلند نہیں ہے کہ آسمان کو چھونے کی تمنا کر بیٹھوں۔ میں تو ایک حد تک ہی اپنے تخیلات کو اڑنے کی اجازت دیتی ہوں۔ اور پھر یہ ایئر ہوسٹس بننے کا مشورہ تو آپ کی جگری سہیلی عالیہ نے دیا تھا۔ میں نے تو ان کی ایک بات آپ تک پہنچائی ہے۔ اصل میں منہ تو آپ کو ان کا نوچنا چاہیے تھا مگر آپ کے دانت تو مجھ پر ہی تیز رہتے ہیں۔" لیکن چھوٹی بھی پیچھے رہنے والوں میں سے نہ تھی۔ اس نے تڑ سے جواب دیا۔

"یہ اتنی بدتمیزی سے بات کرنے کی جرأت تمہیں اسی لیے ہوئی ہے نا کہ امی کی حمایت تمہیں حاصل ہے۔ انہی کی شہہ نے تم کو بگاڑا ہے۔"

عنبر سے کوئی جواب نہ بنتا تو وہ فوراً اماں کو الزام دیتی۔ چھوٹی نے مزید اس کے منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا اور یہ پھر کوئی نئی بات نہیں تھی۔ عنبر کی دکھتی رگ کو جب بھی چھوٹی ہولے سے چھو دیتی تھی وہ یوں ہی آؤٹ ہو جایا کرتی تھی۔ مگر عنبر پہ ہنوز غصہ سوار تھا۔ وہ گویا سلسلۂ کلام کو جوڑتی ہوئی بولی۔

"اور کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اپنا خون پسینہ ایک کر کے جو کچھ کماؤں گی، وہ گھر میں کھانے پینے پر خرچ کر دوں گی۔ نہیں میں اتنی نادان نہیں ہوں۔ میں تو اپنا پیسہ جمع کروں گی۔ البتہ ٹیوشنوں کی آمدنی ضرور امی کو دے دیا کروں گی تاکہ عذیر کے تعلیمی اخراجات پورے ہوتے رہیں۔"

"اچھا آپا! آپ کا جو جی چاہے کیجیے گا۔ مجھے بھی آپ کی ٹیوشنوں کی ضرورت نہیں۔ وہ تو امی نے یوں ہی اپنی سادگی میں کہہ دیا تھا۔ میری تو اللہ میاں سے یہ دعا ہے کہ اس بار تو پچاس روپے والے پرائز بونڈ پر مجھے پہلا انعام دے۔ ورنہ دوسرا انعام ہی دے دے تاکہ میرا بھی ہاتھ کھلے۔ اور میں اپنی مرضی سے اس گھر کو سجا سنوار سکوں۔" چھوٹی نے گویا یہ کہہ کر قصہ کوتاہ کیا۔

"ہونہہ ــ ایک پرائز بونڈ پر بھی بھلا کہیں انعام ملتا سنا ہے۔ وہاں تو لوگ سو سو اور ہزار ہزار خریدتے ہیں پھر بھی اسی تمنا میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کب ان کا پہلا انعام نکلے۔" عنبر نے تمسخرانہ سے انداز میں کہا۔

"آپا! دینے والا تو اللہ ہی ہوتا ہے نا۔ کیا پتا ایک پر ہی دے دے ــ اور پھر میں نے امی سے بھی دعا کرنے کو کہا ہے ماں کی دعا جنت کی ہوا ہوتی ہے نا۔"

"مگر یہ تو جوا ہوتا ہے اور جوئے سے ملنے والی رقم حرام ہوتی ہے۔ پھر بھی امی تمہارے کہنے پر دعا کر رہی ہیں۔" عنبر نے قدرے طنز سے کہا۔

"آپا! یہ جو ہم گیمز میں اور تقریری مقابلوں میں انعام حاصل کرتے ہیں، وہ تو حرام میں شامل نہیں ہوتے نا؟" چھوٹی نے کہا۔

"مگر وہ انعامات تو انسان اپنی محنت کے بل بوتے پر جیتتا ہے۔ یعنی ان کی تو بات ہی دوسری ہوتی ہے۔" عنبر ہر طریقے سے اسے نیچا دکھانے کی فکر میں تھی۔

"تو یہ پچاس روپے بھی میری محنت کی کمائی کے ہیں جن سے میں نے یہ بونڈ خریدا ہے اور کم از کم میں ان سے حاصل ہونے والے انعام کو ناجائز نہیں سمجھتی۔" چھوٹی نے بہن کے ایک ہی موضوع کے پیچھے پڑ جانے پر تنک کر کہا۔

"واہ یہ بھی عجیب منطق ہے۔" عنبر شانے اچکا کر بولی۔

ان کے درمیان آئے دن ایسے ہی بحث مباحثے اور کل کل جھک جھک ہوتی رہتی تھی جو خورشید جہاں کے خیال میں ناہوت اور پریشانیوں کی وجہ سے ہی ہوتی تھی مگر اس بار پیسے کے بارے میں بڑی بہن کے خیالات سن کر چھوٹی نے بھی قسم

کھالی تھی کہ نہ تو وہ بہن کی ٹیوشنز لے گی نہ اس کی کمائی میں سے ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ کرے گی۔ یوں بھی اس نے روشن کی والدہ سے کہہ رکھا تھا کہ اگر ان کے جاننے والوں میں ایسے لوگ ہوں جو اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھوانا چاہتے ہوں تو وہ ان کو اس کے گھر بھیج دے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بعض والدین اپنے بچوں کو گھر پر ٹیوشن پڑھوانا چاہتے تھے۔ اور روشن کا گھر تو خیر اس کے گھر سے بالکل ملا ہوا تھا مگر کہیں اور جاکر ٹیوشن پڑھانا چھوٹی کو بالکل گوارا نہ تھا۔ وہ تو اسی امید میں بیٹھی تھی کہ شاید کوئی ایسا بچہ مل جائے جو اس کے گھر پر آکر اس سے پڑھے۔

بہرکیف۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ مگر حالات جہاں کے تہاں ہی رہتے ہیں۔ سو کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے مرحوم شہباز خان کی فیملی بھی دوچار تھی۔ شعبان کا مہینہ تیزی سے گزر رہا تھا اور یوں تو بقول خورشید جہاں کہ کیا شعبان کیا رمضان اور کیا عید اور بقر عید ہمارے لیے تو سارے مہینے ہی برابر ہیں۔ البتہ رمضان المبارک کا مہینہ ہم روزے رکھ کر ضرور گزار لیتے ہیں جب کہ باقی کے گیارہ ماہ بھی کبھی ایک وقت ہے اور ایک وقت نہیں۔ کبھی آدھا پیٹ اور کبھی پورا پیٹ اور کبھی شروع تاریخوں میں دونوں وقت کا پیٹ بھر کر میسر آجاتا ہے۔ حالات کے ان تھپیڑوں میں رہنے والوں کو اپنے دل میں کوئی تمنا نہیں رکھنی چاہیے مگر خورشید جہاں تو اپنے حالات سے اس حد تک سمجھوتا کر چکی تھیں کہ روکھی سوکھی جو بھی مل جاتی بس اسی پر قناعت کر کے بیٹھ جاتیں۔ شاید یہ معلوم نہ تھا، ایسے ہی پریشان حال لوگوں کے دلوں میں آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک ہجوم سا پنہاں ہوتا ہے۔ چنانچہ عنبر بھی اپنے چھوٹے سے دل میں تمناؤں اور آرزوؤں کی ایک دنیا آباد کیے بیٹھی تھی اس آس پر کہ ایک نہ ایک دن اسے اس کی مطلوبہ ملازمت مل ہی جائے گی۔ اور ہوا بھی کچھ یہی۔

اس روز شب برات کی عام تعطیل تھی اور دن کے تین بجے کا عمل جب بہت ہی غیر متوقع اور اچانک عالیہ کی کار اس کے دروازے کے آگے آکر رکی۔ عذیر گھر میں ہی موجود تھا۔ دستک پر اسی نے دروازہ کھولا۔ اصل میں عالیہ نے ڈرائیور کے ہاتھ عنبر کو ایک ایک رقعہ بھیجا تھا۔ جو ڈرائیور سے لے کر عذیر نے عنبر کو لا کر دے دیا تھا۔ عنبر نے لفافہ چاک کر کے جلدی جلدی وہ رقعہ پڑھا جس پر انگریزی میں بہت مختصر سی عبارت درج تھی۔ لکھا تھا۔

"میں نے تمہاری ملازمت کا بندوبست کر دیا ہے۔ اپنی کار بھیج رہی ہوں۔ فوراً آکر صاحب معاملہ سے مل لو۔"

اور یہ اتنی سی عبارت پڑھ کر عنبر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کہ خوشی اس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ وہ رقعہ ہاتھ میں لیے بھاگی بھاگی ماں کے پاس پہنچی جو غسل خانے کی دہلیز پر پٹڑے پر بیٹھی جھاویں سے اپنی ایڑیاں رگڑ رہی تھیں۔

"امی امی۔ یہ عالیہ نے مجھے خط بھیجا ہے۔ میری ملازمت کی بات طے ہو رہی ہے نا اس لیے مجھے ابھی بلایا ہے۔ امی میں بس زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔" مارے خوشی کے اس سے ڈھنگ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ لیکن ماں بدستور سر جھکائے ایڑی ہی رگڑتی رہیں۔ یوں جیسے تذبذب میں ہوں کہ اسے جانے کی اجازت دے دیں یا روک لیں۔ عذیر بھی بہن کے پیچھے ہی آگیا تھا اور وہیں کھڑا ہو گیا تھا۔ ماں کو خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

"امی! کیا سوچ رہی ہیں آپ؟۔ آپا کو ابھی تیار بھی ہونا ہے۔ نوکری کا معاملہ ہے۔ کہہ دیجیے نا کہ چلی جائیں۔" اور تب خورشید جہاں نے چہرہ اونچا کر کے قدرے استکراہ کے ساتھ کہا۔

"اچھا چلی جاؤ، مگر کس کو ساتھ لے جاؤ گی؟"

"امی! کسی کو ساتھ لے جانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ عالیہ آپا کے گھر پر تو سوائے ان کے کوئی ہوتا ہی نہیں اور پھر وہ بھی کیا سوچیں گی کہ ہمیشہ ان کے ساتھ ایک باڈی گارڈ ضرور آتا ہے۔" چھوٹی نے باورچی خانے سے نکل کر کہا جو شب برات کی نسبت سے حلوہ بنا رہی تھی۔

"جی امی۔ آج تو آپا کو تنہا ہی جانے دیجیے۔ کار میں جا رہی ہیں اور اسی میں بحفاظت واپس بھی آجائیں گی۔" عذیر بولا۔ خورشید جہاں نے ایک گہرا سانس لے کر بڑے متامل سے انداز میں کہا۔

"اچھا تو چلی جاؤ۔" اور ابھی ان کے منہ سے صرف اچھا ہی نکلا تھا کہ عنبر ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی اندر دوڑ گئی جھٹ پٹ تیار ہوئی اور پھر ماں سے اور دونوں بہن اور بھائی سے اپنی کامیابی کی دعا کرنے کا کہہ کر عالیہ کی کار میں جا بیٹھی اور عالیہ کے گھر روانہ ہو گئی۔ اور چونکہ انٹرویو کے لیے جا رہی تھی اس نے گھر سے کچھ فاصلے پر پہنچتے ہی وہ سلکن چادر اتار دی

جسے وہ گھر سے نکلتے وقت اپنے گرد لپیٹے رہتی تھی۔ اور اسے تہہ کر کے سیٹ ہی پر ایک طرف ڈال دیا۔ اور چونکہ پہلی مرتبہ گویا زندگی کا پہلا انٹرویو دینے جا رہی تھی اس لیے دل بھی بری طرح دھڑک رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک جھجک سی بھی لگی تھی کہ نہ معلوم کون ہو اور کس قسم کے سوالات کرے۔ کیا کیا پوچھے۔

خیر اگر فلاں سوال کرے گا تو میں یہ جواب دوں گی۔

اور اگر ایکسپیرینس کے بارے میں پوچھا تو میں صاف صاف کہوں گی کہ جی میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہیں سروس کرنے کا۔ رہ گئی ایکسپیرینس کی بات تو وہ بھی آتے آتے ہی آتا ہے۔

اور شارٹ ہینڈ میں تو کافی ایکسپرٹ ہوں۔ ٹائپنگ اسپیڈ بھی ففٹی ہے۔ خدا بھلا کرے سعد کا، اس نے اپنا ٹائپ رائٹر دے کے کم از کم میری اسپیڈ تو تیز کروا دی۔ پہلی بار سعد کے بارے میں اچھائی سے سوچا تھا۔ وہ بھی بہت انجانے میں ایک دم ہی خیال آیا کہ یہ میں کیا کہہ گئی ہوں تو یہ خیال بھی اپنے لباس کی طرف اس کی توجہ مبذول ہونے میں کہیں رل مل گیا۔ لباس بھی اس نے مناسب ہی پہنا ہوا تھا۔ پھر بھی بار بار ریک ویو مرر میں دیکھ کر اطمینان کر لینا چاہ رہی تھی کہ کیسا لگ رہا ہے۔

بہرحال ایسے خیالات کے ہجوم میں گھر کر اس نے باہر کے منظر پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی کہ عالیہ کی کار کن کن راستوں سے گزر کر اس کی منزلِ مقصود پر پہنچ چکی ہے۔ وہ تو جب عالیہ کے گھر کے دیو قامت آہنی گیٹ سے گزر کر پورچ میں رکی تبھی اسے احساس ہوا کہ وہ عالیہ کے گھر پہنچ چکی ہے۔

عالیہ اس کے استقبال کو باہر تو نہیں آئی تھی لیکن اندر کوریڈور کے آخری سرے پر ضرور کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر اس نے کہا۔

"ہائے عنبر یں۔" تو جواباً اسے بھی "ہائے" کہنا پڑا۔

"چلو شکر ہے تم آگئیں۔" عالیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کیا۔

"لو بھلا تم بلاتیں اور میں نہ آتی۔ یہ کیسے ممکن تھا؟" عنبر نے بھی اسے خوش کرنے کی غرض سے کہہ دیا۔

"نہیں، میرا مطلب ہے کہ شکر ہے۔ آج تمہارا کوئی باڈی گارڈ تمہارے ساتھ نہیں ہے۔" عالیہ نے ہنس کر اپنی بات کا مطلب واضح کیا۔

"واہ جی یہ کیا بات ہوئی۔ جب میں کالج سے تمہارے گھر آتی تھی تب میرے ساتھ کون سا میرا باڈی گارڈ ہوتا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اچھا چلو آؤ۔ لونگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں، وہاں ایک انگلش مووی بھی چل رہی ہے اس وقت۔" عالیہ نے کہا۔ اس نے جس مقصد سے اسے اتنے ہنگامی طریقے سے بلایا تھا اس کا تو دور دور تک کوئی نشان نہیں مل رہا تھا۔

"ارے نہیں، مجھے مووی وووی دیکھنے کا بالکل شوق نہیں وہ بھی انگلش۔ اس قدر روتگر ہوتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ اور تم نے مجھے کسی اور ہی مقصد سے بلایا تھا اس وقت۔" وہ بھی صبر سے کام لینے کی عادی نہیں تھی۔ فوراً ہی عالیہ سے پوچھ لیا۔

"ہاں جس مقصد سے بلایا تھا وہ بھی ابھی کچھ دیر بعد پورا ہو جائے گا۔" عالیہ نے کلائی اونچی کر کے اس میں وقت دیکھا اور پھر بولی۔

"بس آدھے گھنٹے بعد وہ لوگ یہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں نے تمہیں پہلے سے اس لیے بلایا تھا کہ تم ایک دم ہی انہیں دیکھ کر نروس نہ ہو جاؤ۔" اور عالیہ کی اس بات پر اسے بری طرح ہنسی آگئی۔

"کیوں بھئی، کیا بہت زیادہ ڈراؤنی شکلیں ہیں ان کی یا وہ جن بھوت ہیں؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات ہی نہیں۔ اچھے بھلے نہایت ڈیشنگ سے لوگ ہیں، مگر انٹرویو دیتے وقت بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ اور تم تو ہو ہی ہمیشہ کی شائی (SHY) اور ڈرپوک اس لیے کہہ رہی تھی۔" عالیہ نے اس کی ہنسی کا نوٹس لیے بغیر سنجیدگی سے کہا۔

"مگر ڈیر۔ آخر کتنی دیر لگے گی اس انٹرویو کے چکر میں۔؟" اس نے اندر ہی اندر پریشان ہو کر پوچھا کیونکہ ماں سے

تو ایک گھنٹے کی مہلت لے کر آئی تھی۔

"اب آ ہی گئی ہو تو اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ گھر میں ہو، سڑک پر تو نہیں ہو۔ اور پھر انٹرویو کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں۔ اس میں تو گھنٹوں لگتے ہیں۔" اس کی ساری باتوں کا جواب عالیہ نہایت رکھائی سے دے رہی تھی۔ اس کے رویئے میں تبدیلی کو محسوس کر کے عنبر کچھ بجھ سی گئی۔

"نہیں، یہ بات نہیں۔ اصل میں امی سے ایک گھنٹے کی اجازت لے کر آئی ہوں۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ انٹرویو میں دیر لگتی ہے۔" عنبر نے بجھے بجھے سے انداز میں کہا۔

"بس مجھے تمہاری یہی باتیں تو پسند نہیں۔ آخر تم کب تک اپنی امی کی انگلی پکڑ کر چلو گی۔ اس طرح تو تم کہیں ملازمت نہ کر سکو گی۔ میرے خیال میں تو میں نے ناحق تمہیں بلایا۔" عالیہ اس کی کسی توجیہہ کو خاطر میں نہ لائی اور بڑی ناگواری سے بولی۔

"نہیں نہیں، ملازمت کرنے کی بات تو خیر دوسری ہے۔ آخر میں کالج بھی تو جاتی تھی۔ اسی طرح امی کو یہ تو علم رہے گا میں صبح سے سہ پہر تک اپنی ڈیوٹی پر رہوں گی اور وہاں بھی تنہا ہی آؤں اور جاؤں گی۔" عنبر نے اس خیال سے کہ عالیہ بُرا مان کر کہیں ملازمت دلوانے سے ہی انکار نہ کر دے جلدی سے کہا۔

"لیکن صبح سے سہ پہر پر ہی موقوف نہیں۔ ملازمت ملازمت ہی ہوتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں صبح سے شام تک اپنی ڈیوٹی نبھانی پڑ جائے۔ تو کیا پھر تم ملازمت سے استعفٰی دے دو گی؟" عالیہ نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"ن۔ نہیں۔ بھلا اتنی مشکل سے تو ملازمت ملے گی پھر کیا میں اتنی پاگل ہوں کہ ذرا سی ڈیوٹی بڑھ جانے پر استعفٰی دے دوں گی۔ بلکہ میں تو امی سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ یہ میری روزی کا معاملہ ہے اس لیے میرے دیر سے آنے پر اعتراض کرنا چھوڑ دیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے تھوڑی سی جذباتی ہو گئی۔

"اچھا تو کیا تمہاری امی تمہاری بات مان جائیں گی؟" عالیہ نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

"نہیں مانیں گی تب بھی انہیں بہر صورت ماننا ہی پڑے گا۔ ویسے بھی وہ بڑے نرم اور مشفق دل کی مالک ہیں کسی نہ کسی طور پر ان سے اپنی بات منوا کر رہوں گی۔" عنبر نے بڑے وثوق کا اظہار کیا۔

"اچھا فرض کرو اگر وہ نہیں مانیں تو کیا تم اپنے گھر کی رہائش چھوڑ کر کہیں اور رہنے پر تیار ہو جاؤ گی؟" عالیہ نے اس کے اس قدر وثوق سے بات کرنے پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

"نہیں خیر، گھر چھوٹنے کا کیا سوال۔ خواہ لاکھوں کی ملازمت بھی ہو، میں اس کی وجہ سے تو مر کر بھی اپنی امی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں ہی ان کی بڑی اولاد ہوں۔ اور میرا اکلوتا بھائی مجھ سے بہت چھوٹا ہے۔ ابھی تو وہ میٹرک ہی میں پڑھ رہا ہے اور فرحین بھی ابھی زیر تعلیم ہی ہے اور پھر میں تو امی کے جسم کا ایک حصہ ہوں۔ پھر بھلا ان سے کیوں کر علیحدہ ہو سکتی ہوں۔" عنبر نے بلا جھجک اپنی ساری مجبوری بیان کر دی۔

"لیکن فرض کرو تمہیں اپنی ملازمت کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر جانا پڑے کیونکہ تمہارا کام بھی کچھ اسی نوعیت کا ہو گا۔ تو کیا اس صورت میں بھی تم اپنی والدہ کو چھوڑ کر نہیں جاؤ گی؟" عالیہ نے یوں پوچھا جیسے اس کے جواب پر چڑ گئی ہو۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے پٹ سے کھرا کھرا سا جواب دیا۔

"پھر تو مشکل ہی ہے۔" عالیہ نے کچھ سوچنے کے سے انداز میں صرف اتنا ہی کہا۔ وہ بھی بڑی ناک چوٹی گرفتار تھی۔ ایک تو عالیہ کی بے رخی اُسے کھل رہی تھی دوسرے وہ باتیں کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ اپنے آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں تو لے آئی تھی مگر نہ اسے بیٹھنے کو کہا تھا نہ خود ہی بیٹھی تھی بلکہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے آگے کھڑی ہو کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس بات کو بھی اس نے خاص طور پر نوٹ کیا تھا اور اب ملازمت کے سلسلے میں اس سے یوں بات کر رہی تھی جیسے اسے ملازمت نہیں بھیک دلوا رہی ہو۔ یا کم از کم عنبر کو تو ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ اور اس کے پھر تو مشکل ہی ہے کہنے پر تو وہ بھڑک ہی اٹھی تھی۔

"ٹھیک ہے اگر مشکل ہے تو پھر رہنے ہی دو کیونکہ میرے لیے یہ سب مشکل ناممکن ہی ہو گا۔ اچھا، یاد رکھنے اور بلانے کا بے حد شکریہ۔ تم پلیز مجھے اب گھر بھجوا دو۔"

وہ سچ مچ ہی کھونٹے سے اکھڑ گئی تھی۔ عالیہ نے یکایک ایک قہقہہ لگایا اور اس سے لپٹتی ہوئی ہنس کر بولی۔

"ارے بدھو! میں تو تیرا انٹرویو لے رہی تھی اور تو سچ مچ سیریس ہی ہو گئی۔"

"ہونہہ! اپنی باتوں پر مکھن لگانے کی کوشش نہ کرو۔ بھلا تم کیا انٹرویو لو گی میرا۔"

اس نے روٹھے روٹھے انداز میں کہا تو عالیہ نے ایک زور کی تالی بجا کر کہا۔

"بھئی، اب انٹرویو پورا ہو گیا۔ اس لیے آپ سب اپنی اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آئیں۔"

اور تبھی کھانے کے کمرے اور ڈرائنگ روم کے درمیان لگے خوبصورت پارٹیشن کے پیچھے سے میک اپ سے لیس اور اسکن ٹائٹ جدید طرز کے لباس میں ملبوس ایک نازنین ہنستی اور بڑے اسٹائل سے چلتی عین اُس کے قریب آکھڑی ہوئی اور پھر دائیں اور بائیں دونوں جانب بنے دروازوں کے پردوں کے پیچھے سے دو مرد بھی ہنستے ہوئے باہر آ گئے۔ ان میں سے ایک خاصا معمر تھا۔ اس نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور دوسرا سوٹڈ بوٹڈ۔ بہت ہی فریش اور واقعی ڈیشنگ تھا مگر اس کی آنکھوں میں ایک عیارانہ سی چمک تھی جسے عنبر اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے محسوس نہ کر سکی۔

"بھئی دیکھیں، اس کا ایک بار ہی آپ تینوں سے تعارف کراؤں گی۔"

عالیہ نے ان تینوں کو مخاطب کر کے بڑے ہی چونچال لہجے میں کہا۔

"یہ میری بہت ہی پیاری سی فرینڈ عنبرین شاہباز ہے۔" تو دونوں مردوں نے صرف سر ہلا کر مسکرانے پر اکتفا کیا مگر غزل اپنی بھونڈی اور موٹی سی آواز میں ہنس کر بولی۔

"بھئی واہ بڑی اعلا دریافت ہے تیری عالیہ۔" مگر عالیہ نے اس کے فقرے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ جب کہ اپنے لیے دریافت کا لفظ عنبر کو بہت گراں گزرا۔ مگر عالیہ نے اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور ان دونوں مردوں سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ جس فرم میں تم کام کرو گی، اس کے منیجنگ ڈائریکٹر مسٹر تفضل شیخ ہیں۔ یوں تو بڑے حلیم الطبع اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی ہیں لیکن کام میں ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتے۔" اور عنبر ان کی طرف دیکھ کر صرف مسکرا کر رہ گئی۔ مگر جب عالیہ نے اس کا تعارف اس ڈیشنگ سے مرد سے کرایا۔

"اور یہ مسٹر گل شیر خان ہیں غزل کے بڑے بھائی اور فرم کے سیاہ و سپید کے مالک۔ بڑے باذوق۔ بانداق اور جولی سے انسان ہیں۔ ہر وقت ہی نہیں میرے خیال میں تو رات کو سوتے میں بھی چہکتے رہتے ہیں بس ایک حرف حکم عدولی نہیں برداشت کر سکتے۔ نہ صرف یہ کہ غیض میں آ جاتے ہیں بلکہ مرنے مارنے تک کو تیار ہو جاتے ہیں۔" تو وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔

"بھئی واہ تم تو میری طرف سے ان کا امپریشن ہی خراب کر رہی ہو عالیہ۔ لیکن یہ سخت زیادتی ہے۔ ٹیک یور ورڈز بیک۔" پھر وہ عنبر سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مس عنبرین! آپ اس کی باتوں کا بالکل یقین نہ کریں۔ میں بہت لینیئنٹ (LENIENT) اور سنسیر (SINCERE) ہوں اور آپ کو میرے پاس کام کر کے خود اندازہ ہو جائے گا۔

"جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" جواب میں اس نے ایک بے تکا سا جملہ استعمال کیا تو گل شیر خان نے ایک قہقہہ لگایا۔

پھر عالیہ کے کہنے پر سب صوفوں پر بیٹھ گئے اور بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ملازم نے پُرتکلف سی چائے سرو کر دی۔

اس دوران غزل اس سے بالکل دوسری نوعیت کے سوالات کرتی رہی کہ وہ کہاں کہاں گھومی ہے اور اس کے کیا مشاغل ہیں۔ انگلش موویز پسند کرتی ہے یا انڈین؟

انڈور گیمز میں کونسا کھیل پسند ہے؟

کس قسم کا لباس پسند کرتی ہو؟ اور کون سا رنگ؟

اس کی کتنی سہیلیاں ہیں اور وہ ایڈوانس پن پسند کرتی ہے یا روایتی انداز؟

بی۔ اے تک پڑھ کر کیوں چھوڑ دیا۔ آگے کیوں نہیں پڑھا؟ اور ایسے ہی بہت سے ٹیڑھے سوالات۔ جن کے جوابات

تھوڑی سی جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ وہ بہت سنبھل سنبھل کر دیتی رہی۔

گل شیر خان اس کی طرف مسلسل دیکھتا تو رہا مگر اس نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ عالیہ سے ہی آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا۔ پھر چائے کے بعد ایک دم ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا عالیہ، اب میں چلوں گا۔ ایک بہت ہی اہم میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔" اس نے عالیہ سے کہا تو عنبر نے دل میں سوچا کہ ان پیسے والوں کو ہمیشہ یا تو کوئی ارجنٹ کام ہوتا ہے یا پھر کوئی اہم میٹنگ اٹینڈ کرنی ہوتی ہے۔ آخر وہ کون سی میٹنگ ہوتی ہے۔ غزل بھی بھائی کے اٹھ جانے پر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں بھی آپ کے ساتھ ہی چل رہی ہوں بھائی جان۔ نیمی نے بلایا ہے نا۔ مجھے اس کے گھر ڈراپ کر دیجیے گا۔"

عالیہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ہنس کر مسٹر شیخ سے پوچھا۔

"آپ کا بھی کیا کوئی اپائنٹمنٹ ہے اس وقت؟" تو انہوں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

"نہیں اپائنٹمنٹ تو نہیں ہے لیکن میں بھی اب چلتا ہوں۔ آفس کا کچھ ضروری کام نمٹانا ہے۔ پھر وہ تینوں یکے بعد دیگرے ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر چلے گئے تو اس نے بے تابانہ عالیہ سے پوچھا۔

"تمہارے کہنے کے مطابق اگر انٹرویو ہو گیا ہے تو پھر اس کا رزلٹ بھی بتا دو۔"

"لو بھلا رزلٹ کوئی ہاتھ کے ہاتھ مل جاتا ہے۔ ابھی تو وہ تم سے جو انہوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان پر غور کریں گے اس کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچ کر تمہیں اطلاع دیں گے بلکہ میں جلد ہی ان کے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔" عالیہ نے اسے سمجھا کر بتایا۔

"اچھا تو پھر مجھے ڈراپ کرا دو۔"

"کیوں؟ اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرو پھر چلی جانا۔" عالیہ بولی۔

"نہیں اب جانے ہی دو۔ کافی دیر ہو گئی ہے مجھے آئے ہوئے۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔" اس نے کہا۔

"اوہ پھر وہی امی امی کی رٹ لگائی تم نے۔ اچھا ٹھہرو۔ میں ابھی ڈرائیور کو بلاتی ہوں۔" عالیہ نے چڑ کر کہا اور انٹرکام پر گیٹ پر بیٹھے ہوئے دربان سے کہا کہ وہ ڈرائیور سے کہے کہ گاڑی پورچ میں لے آئے۔ پھر عالیہ اس سے بولی۔

"دیکھو عنبر ایک دوست ہونے کے ناتے میں تمہیں یہ ایڈوائز کرتی ہوں کہ تم اپنے خیالات کو وسعت دو۔ براڈ مائنڈڈ بنو اور کم از کم بات ذرا کھل کر کیا کرو۔ اس طرح جھجک کر اور شرما کر بات کرنے سے تو کہیں بھی کام نہیں چلے گا اور تمہاری کمزوری کو غزل نے بھی نوٹ کیا ہے۔"

"اچھا، میں کوشش کروں گی کہ تمہاری مرضی کے مطابق خود کو بدل سکوں۔ لیکن اتنا تو بتا دو کہ یہ تمہارے گل شیر خان صاحب آخر کون سا بزنس کرتے ہیں اور میرے کام کی نوعیت کیا ہو گی؟" وہ سوال جو دماغ میں کلبلا کر اسے پریشان کر رہا تھا اس کی زبان پر آ ہی گیا۔

"بھئی شوبزنس سے تعلق ہے گلشی کا۔" عالیہ نے بتایا۔

"شوبزنس۔ میں سمجھی نہیں۔" کچھ کچھ سمجھتے ہوئے اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"بھئی یہی فلم اور اسٹیج وغیرہ۔ اصل میں یہ گلشی ہے نا یہ پروڈیوسر ہے اور غزل اس کی معاونت کرتی ہے اور شیخ صاحب نہ صرف یہ ان کی فرم کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں بلکہ فلمیں اور اسٹیج ڈرامے بھی ڈائریکٹ کرتے ہیں۔" عالیہ نے اب وضاحت سے بتایا تو معاً عنبر کو تعارف کرانے پر غزل کا کہا ہوا یہ فقرہ یاد آیا جو اس وقت بھی اسے کھلا تھا۔

"واہ، بڑی اعلیٰ دریافت ہے تمہاری۔" اور اب عالیہ نے فلم اور اسٹیج کا نام لیا تو اسے عالیہ پر سخت غصہ آیا کہ اس نے ایسی غلط جگہ اور غلط لوگوں کے یہاں اسے ملازمت دلوانے کی کوشش کیوں کی؟ اس نے گلہ آمیز سی برہمی سے عالیہ سے کہا۔

"عالیہ! ضرورت مند ضرور ہوں مگر اتنی بھی نہیں کہ اب اتنی چیپ ملازمت کروں۔ کم از کم مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم مجھے اتنا گرا پڑا سمجھو گی۔"

"ارے نہیں پاگل کہیں کی۔ وہ تمہیں کوئی ہیروئن یا ایکسٹرا رول تھوڑی دیں گے۔ تمہارا تو اسٹوڈیو سے بھی کوئی تعلق نہیں

ہوگا۔ تم تو صرف آفس ورک سنبھالو گی۔ یعنی آفس کی مینجمنٹ اور کورسپانڈینس وغیرہ یعنی ایڈمنسٹریشن اور پبلک ریلیشن آفیسر جس میں تمہیں فلم اور اسٹیج کے لیے آنے والے نئے چہروں سے بھی ڈیل کرنا پڑے گا اور بس۔" عالیہ نے اسے اس کی ملازمت کی نوعیت سے آگاہ کیا تو وہ گویا بالکل ہی کھونٹے سے اکھڑ گئی۔

"نہیں بھئی، مجھ سے یہ سب نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ نہ تو میرے پاس تجربہ ہے اور نہ میں یہ پسند کروں گی کہ نئے نئے چہروں کو ڈیل کر سکوں۔ وہ بھی فلم اور اسٹیج کے معاملے میں۔ تمہارا بے حد شکریہ عالیہ کہ تم نے میرا اتنا خیال تو رکھا کہ میری ملازمت کے لیے کہیں کوشش کی۔ اچھا تو پھر اجازت دو۔" وہ رنج و کوفت کے عالم میں ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے ارے تم تو برا مان گئیں ورنہ میں نے بقول تمہارے اس ملازمت کے لیے کوشش تمہارے بھلے ہی کو کی تھی۔ کچھ معلوم بھی ہے کہ تمہیں کتنی ہینڈسم سیلری ملے گی۔ پورے پانچ ہزار۔ پک اینڈ ڈراپ کے لیے سواری۔ کھانا، چائے اور ہاؤس رینٹ اس کے علاوہ۔ حتیٰ کہ میڈیکل بھی۔ سمجھیں بے وقوف گھر آئی نعمت کو صرف فلم سے تعلق ہونے کی وجہ سے لات مار رہی ہو۔ میرے خیال میں یہ کوئی عقلمندی تو نہیں۔" عالیہ بھی اس کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑی ہوئی اور اسے سمجھانے لگی۔

"نہیں بھئی، یہ پانچ ہزار تو کیا پانچ لاکھ اور پانچ کروڑ بھی ہوں تو مجھے اپنی عزت ہر شے سے عزیز ہے۔ اور میرے کام کی نوعیت لاکھ فلم اور اسٹیج سے مختلف ہو یعنی اس کا میرے کام سے تعلق نہ بھی ہو تو وہ شاید تم نے سنا نہیں کہ کوئلے کی کوٹھری میں جاؤ تو ہاتھ کالے ہوتے ہی ہیں۔ تو بھئی ایسی ہینڈسم سیلری اور مراعات کو سات سلام۔" عنبر نے کہا تو عالیہ چُپ سی ہو گئی۔

"اگر مائنڈ نہ کرو تو ایک بات پوچھوں عالیہ۔" عنبر نے کچھ سوچ کر عالیہ سے کہا۔

"ہاں ہاں ضرور پوچھو۔ میں کبھی تمہاری باتوں کو مائنڈ کرتی ہوں بھلا۔" عالیہ نے اپنی کسی سوچ سے چونک کر کہا۔

"یہ جو تمہاری دوست غزل ہے اس سے تمہاری کب سے دوستی ہے؟"

"دوستی تو ابھی پچھلے سال ہی ہوئی ہے مگر میں اسے لینے چھٹ پنے سے جانتی ہوں۔ اصل میں یہ مری پریزنٹیشن کانونٹ میں کے جی کے اسٹینڈرڈ فورتھ تک میرے ساتھ پڑھتی رہی تھی۔ پھر یہ اپنے پیرنٹس (والدین) کے ساتھ یو کے چلی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک سال قبل یہ اسلام آباد میں ایک پارٹی میں ملی تو فوراً مجھے پہچان گئی۔ اور جب سے اب تک ہماری دوستی چلی آ رہی ہے۔ مگر غزل بہت ہی محبت سے ملتی ہے اور بڑی اچھی عادت ہے اس کی۔ بس بہت زیادہ ایڈوانس ہے نا۔ اور پھر پیسے والی بھی ہے۔ اس لیے بالکل نئے فیشن کے کپڑے پہنتی ہے۔ ویسے بھی چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔"

"ہو گی۔ مگر مجھے تو یہ کچھ اور ہی لگی۔" عنبر نے دل میں سوچا اور پھر عالیہ سے بولی۔

"اب تو تمہارے ڈرائیور نے پورچ میں گاڑی لگا دی ہو گی۔"

"ہاں ہاں اس نے انٹرکام پر اطلاع تو نہیں دی مگر آ ہی گیا ہو گا۔" عالیہ نے کہا اور پھر انٹرکام اٹھا کر دربان سے معلوم کیا۔

"ہاں وہ بے وقوف کب سے پورچ میں گاڑی لیے کھڑا ہے۔ اچھا تم جا رہی ہو تو ایک مرتبہ ضرور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لینا۔ ویسے بھی ڈیئر فرینڈ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تمہیں جان بوجھ کر کسی غلط جگہ پھنسوانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ بلکہ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے اور کسی کا تو نہیں معلوم۔ میری تو ایک ہی سہیلی ہے جس کے بھائی نے کراچی میں اپنا کوئی بزنس اسٹارٹ کیا ہے۔ ورنہ میرے علم میں اگر کوئی اور جگہ ہوتی تو میں تمہیں وہاں ضرور لگوا دیتی۔"

"نہیں بھئی، تم نے میرا اتنا خیال کر لیا یہی بہت ہے۔ اب میں ایسا کوئی بَرڈن تم پر ڈالنا نہیں چاہتی۔ ہاں بھلا تمہارے اپنے کتنے پرابلمز ہیں۔ اچھا تو خدا حافظ۔" عنبر عالیہ سے بگاڑنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اونو۔ میں بھی تمہاری باتوں سے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہ جگہ تمہارے لیے سوٹ ایبل نہیں۔ ویسے اگر ہو سکا تو میں تمہارے لیے ایک اور جگہ بھی کوشش کروں گی۔ اصل میں وہ ڈیڈی کے ایک پرانے دوست ہیں۔ انکل سردار شاد۔ وہ بھی بڑے ہائی لیول پر بزنس کر رہے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ وہ زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتے ہیں اور سال میں صرف تین چار مرتبہ ہی کراچی آتے ہیں۔ اگر تمہاری قسمت سے وہ جلد ہی آ گئے تو پھر ان کی کسی فرم میں اپنی سروس پکی سمجھو۔"

عالیہ کو اس پر ترس سا آ رہا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر اس کی ڈھارس بندھائی تو۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر عنبر نے اظہارِ ممنونیت کے طور پر کہا۔

"اوہ۔ تم کتنی اچھی ہو عالیہ۔ میرا کتنا خیال رکھتی ہو۔ تم نے مجھے کتنی محبت سے بلایا اور ان لوگوں سے میرا تعارف کرایا۔ مگر مجھے افسوس ہی نہیں بلکہ میں تم سے معذرت خواہ بھی ہوں کہ میں نے تمہاری طرف سے دی گئی اس آفر کو مسترد کر دیا۔" اور پھر وہ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر جانے لگی تو عالیہ اسے کار تک چھوڑنے آئی۔

وہ گھر پہنچی تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ ایک گھنٹے کا کہہ کر گئی تھی اور ڈھائی پونے تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ خورشید بانو کا پریشان ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ وہ تو عذیر کو اس کی خبر لینے کو بھیجنے ہی والی تھیں۔ بیٹی کار سے اتر کر اندر داخل ہوئی تو انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر اس کے لتے لیے۔

"اے اب بھی کیوں آئیں۔ رات بھی وہیں گزار دی ہوتی۔ تم کو تو یوں بھی گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اور تمہارا تو یوں بھی ہمیشہ گھر سے باہر ہی دل لگتا ہے۔ لو بھلا غضب خدا کا، ایک گھنٹے کا کہہ کر گئی تھیں اور تین گھنٹے لگا دیے۔ بھلا جوان جہان لڑکی وہ بھی تنہا اتنی اتنی دیر گھر سے غائب رہے۔ توبہ توبہ واقعی میں قربِ قیامت ہے۔"

"اوہو امی! آپ کی اجازت ہی سے تو گئی تھی میں عالیہ کے یہاں۔ وہاں جا کر تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا کہ کیسے اتنی جلدی گزر گیا کہ دو ڈھائی گھنٹے بھی ہو گئے۔" اس نے ماں کے فضیحتوں سے زچ ہو کر اپنے دیر سے آنے کی وضاحت کرنی چاہی۔

"اے تو کیا بائیسکوپ کے منڈوے میں بیٹھی تھیں تم جو وقت گزرنے کا تمہیں پتا تک نہ چلا۔ لو بھلا یہ سفید ہوتا چونڈہ ہے ہمارا اور یہ ہمیں کو چرانے چلی ہیں۔" ماں نے کچھ زیادہ ہی برہمی سے کہا۔

"نہیں امی! میں سچ کہہ رہی ہوں کہ وقت گزرنے کا وہاں پتا ہی نہیں چلا۔ اصل میں جو صاحبہ میرا انٹرویو لینے آ رہی تھیں، ان کا انتظار کرتے کرتے ہمیں شام ہو گئی مگر وہ نہیں آئیں۔ عالیہ تو اب بھی مجھے روک رہی تھی تھوڑی سی دیر اور ٹھہر جاؤ۔ ان سے بات کر کے ہی جانا مگر آپ کی پریشانی کے خیال سے پھر میں بالکل نہیں رکی۔"

اس نے مزید وضاحت سے کام لے کر اپنے دیر سے آنے کی وجہ بیان کی۔

"ہیں تو کیا اب تک ملازمت کی بات بھی نہیں ہوئی۔ تو پھر فائدہ ہی کیا ہوا تمہارے جانے کا سوائے وقت برباد کرنے کے یا مجھ جیسی حرماں نصیب کو پریشانی میں مبتلا کرنے کے۔ خیر، اب تو تم ہو آئیں۔ لیکن آئندہ کہیں نہیں جاؤ گی۔ بھاڑ میں گئی تمہاری نوکری۔ مجھ سے اب یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔" ماں نے پھر اپنا فیصلہ سنا دیا مگر وہ کچھ بھی نہیں بولی۔

جس جوش و خروش۔ لگن اور شوق کے ساتھ عالیہ کے یہاں گئی تھی اور وہاں سے بے نیل مرام کس قدر شکستہ دل ہو کر آئی تھی۔ اس پر پہلے ہی دل بھرا چلا آ رہا تھا۔ اب جو آتے ہی ماں نے لتے لیے تو دل جو پہلے ہی بھرا چلا آ رہا تھا آنکھوں کی راہ رسنا شروع ہو گیا اور وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

اف گھر ہو یا باہر۔ یا کوئی بات۔ کہیں بھی تو چین و سکون میسر نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک تیز آنچ ہو۔ ایک تپش ہو یا پھر ایک اذیت بھرا احساس جس میں ہم سسک رہے ہوں، پگھل رہے ہوں۔ اف توبہ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔

اے خالقِ کون و مکاں! اے ربِ رحیم! میرے مولا! میرے اللہ! ہم تو تیری مرضی اور حکم سے ہی تیری دنیا میں بھیجے گئے ہیں کوئی اپنی مرضی اور خوشی سے تو نہیں آئے۔ پھر بھی اے میرے معبودِ حقیقی — ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے سنگین جرائم کی سزا کاٹ رہے ہیں کہ جہاں سوئے آفاق سے امید کی کوئی کرن بھی جھلکتی ہے تو ناکامیوں کی سیاہ آندھیاں اسے بھی نگل لیتی ہیں۔

عالیہ نے کیسے جھٹ پٹ کار بھیج کر بلایا تھا اور میں کیسی خوشی خوشی اس کے ہاں گئی تھی۔ مگر وہاں جا کر معلوم بھی ہوا تو کیا۔

کوئی چکر ضرور ہے۔ جبھی تو وہ لوگ اتنی مراعات کے ساتھ بخوشی پانچ ہزار روپے ماہوار دینے کو تیار ہیں۔ اب بھلا میں اپنے فیصلے پر کیا نظرِ ثانی کروں جب کہ جو اس فرم کی کرتا دھرتا خاتون ہیں وہ تو واقعی کسی تھیٹر یا فلم کی ویمپ لگتی ہیں۔ اور وہ ان کے بھائی گل شیر خان — وہ مچھیل — تو بالکل ہی کوئی ولین — معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ مجھ سے تو وہ بڑی شائستگی سے پیش آیا۔ مگر — مگر —

کمرے میں آ کر اپنے گھر میں پہننے کے کپڑے نکالتے ہوئے آنسو بہانے کے درمیان وہ سوچتی رہی۔ اصل میں ماں وضو کر کے برآمدے کے تخت پر ہی مغرب کی نماز پڑھنے بیٹھ گئی تھیں۔ اسی لیے اسے آنسو بہانے کا موقع مل گیا تھا۔

تبھی اچانک ہی دروازے پر دستک ہوئی تو اسے اپنے آنسو پونچھ کر خود ہی دروازہ کھولنے جانا پڑا کیونکہ چھوٹی روشن کے ہاں ٹیوشن پڑھانے گئی ہوئی تھی اور عذیر بھی گھر میں موجود نہ تھا۔ اور وہ تو سمجھ رہی تھی کہ چھوٹی ہو گی یا پھر عذیر مگر دروازہ کھولا تو دہلیز کے آگے سعد کھڑا نظر آیا۔

"کیا اندر آنے کی اجازت مل سکے گی؟" سعد نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں — آ جائیے۔" عنبر نے اسی اپنی مخصوص رکھائی سے جواب دیا۔

اندر آ کر سعد اس کے نزدیک ہی کھڑا ہو گیا۔

"اوہو۔ ماشاء اللہ! کیا کہیں جانے کا ارادہ ہے یا پھر کہیں سے آ رہی ہیں آپ؟" سعد نے سرتاپا اس پر ایک غائر نظر ڈال کر پوچھا۔

"جی ہاں، عالیہ کے یہاں سے آرہی ہوں۔" نامعلوم کیسے اس کے منہ سے نکل گیا جب کہ وہ سعد سے بات کرنے کی بھی روادار نہیں تھی

"اچھا!" اس نے متعجب سے انداز میں کہا اور پھر بولا۔

"اور سب کہاں ہیں؟"

"چھوٹی ٹیوشن پڑھانے گئی ہے اور عذیر شاید بازار گیا ہے۔ امی نماز پڑھ رہی ہیں۔"

"واہ، ماں کھانا پکا رہی ہے۔ باپ چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا ہے اور قادر پُل پر چل رہا ہے۔ یہ تو بالکل ابتدائی قاعدہ کی سی عبارت ہے جو آپ نے بولی ہے۔"

سعد نے ہنس کر گویا مزاح کا رنگ پیدا کیا۔ لیکن بولنا تو کجا وہ مسکرائی تک نہیں۔ البتہ وہ کسی سوچ میں ضرور غرق تھی۔

"کیسے کچھ ٹائپ رائٹر سے بھی کام لیا آپ نے؟" سعد نے مزید سوال کیا۔

"جی۔ جی ہاں۔ تھوڑی سی پریکٹس تو کی ہے۔ لیکن اگر آپ کو ضرورت ہو تو آپ اپنا ٹائپ رائٹر بخوشی واپس لے جائیں۔" اس نے زود رنجی پن سے نہیں بلکہ بڑی رسانیت سے کہا۔

"واہ یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے اگر اس کی ضرورت ہوتی تو لاتا ہی کیوں۔ اور میں نے اس وجہ سے تو نہیں پوچھا تھا۔ آپ بھی ایمان سے کبھی اپنی یہ غیریت برتنے کی عادت چھوڑیں گی ہی نہیں۔"

"لیکن میں نے غیریت تو نہیں برتی بلکہ میں تو یہ سمجھی کہ شاید آپ کو اس کی ضرورت پڑ گئی ہے اس لیے کہہ دیا۔" عنبر نے پہلی بار اس کے سامنے اپنی کسی بات کی وضاحت کی تھی۔ اس کے رویے میں اس تغیر پر وہ دل میں متعجب ہوئے بغیر نہ رہا۔

"آپ بیٹھیے نا۔ امی بھی ابھی نماز ختم کر کے آجائیں گی۔" عنبر نے بیٹھک میں لگے چھت کے پنکھے کا سوئچ دباتے ہوئے گویا اسے بیٹھنے کی پیش کش کی تو سچ مچ سعد پر حیرت کی چٹانیں سی گر پڑیں۔ وہ کسی مسحور انسان کی طرح تعجب سے اس کی طرف دیکھتا صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں عنبر نے بیٹھک کا داخلی دروازہ بند کر دیا تھا۔ پھر وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر دوسرے صوفے پر بیٹھ کر ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی۔

"مجھے آپ سے ایک مشورہ لینا ہے۔ بشرطیکہ آپ اس بات کو صرف اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں۔" اور تعجب کی یلغار میں دب جانے والے سعد کے منہ سے پہلے تو ہائیں نکلا پھر وہ فوراً ہی خود کو سنبھال کر بولا۔

"اس طرف سے تو آپ مطمئن رہیے عنبر! آپ کی طرح آپ کی ہر بات بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں چھپی رہے گی مگر مسئلہ کیا ہے آپ بلا جھجک بتا دیجیے۔"

وہ باتوں کی روانی میں ایک اتنی بڑی بات کہہ گیا تھا مگر عنبر نے اپنی پریشانی میں اس بات کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی بلکہ اس کے اطمینان دلانے پر ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور نیچی اور محتاط آواز میں عالیہ کے ہاں جانا اور وہاں جو باتیں ہوئی تھیں مختصر پیرائے میں اس کے گوش گزار کر دیں۔

"اوہ ویل ڈن۔ یہ تو آپ نے بہت ہی اچھا کیا۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ یہ تو آپ کی خاندانی شرافت اور نجابت اور خود آپ کے اندر جو نیکی ہے اس کی دلیل ہے۔ بلکہ میں تو اس بات پر بڑا فخر محسوس کر رہا ہوں کہ میری ایک کزن کس قدر غیور اور ٹھوس کردار کی مالک ہے۔" سعد نے اس کی ساری سرگزشت سن کر ستائشی انداز میں کہا۔

"لیکن میں نے یہ سب آپ کو اس لیے نہیں بتایا کہ آپ کے منہ سے اپنی تعریفیں سنوں بلکہ انکار کرنے کے باوجود میں بڑی فکر میں پڑ گئی ہوں۔ اصل میں عالیہ نے چلتے وقت کہا تھا کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی ضرور کر لینا۔ اور آپ ہی بتائیں کہ اتنی زبردست سیلری اور اتنی زیادہ مراعات کہاں مل سکیں گی مجھ ناتجربہ کار لڑکی کو۔ کیا اسے ٹھکرا دینا کفرانِ نعمت میں شامل نہ ہوگا اور کیا اللہ میاں یہ نہیں سوچیں گے کہ کس قدر نادان اور ناشکر گزار بندی ہے۔ یا تو ہر وقت حالات اور قسمت کا رونا روتی رہتی ہے اور اب میں اس کی قسمت کھول رہا ہوں تو خود ہی اپنے بے جا اندیشوں میں گھر کر اپنی قسمت پر سیاہی پھیر رہی ہے۔" اور اس کے آخری فقروں پر کوفت کے باوجود سعد کو ہنسی آگئی۔

"نہیں، بلکہ اللہ میاں یہ کہیں گے کہ یہ کتنی پاکباز اور نیک بندی ہے جس نے اتنے ناگفتہ بہ حالات میں بھی پیسے کے لالچ میں اپنی عزت کا سودا نہیں کیا۔ اور بہت ممکن ہے کہ پھر وہ اپنی رحمت وکرم کے دروازے آپ پر کھول دیں۔" عنبر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شاید کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ویسے ابھی پانچ ہزار دینے کے قابل نہیں ہوں لیکن تین ہزار کی سیلری بخوشی دے دوں گا اگر آپ میری گارمنٹ فیکٹری میں لیڈی سپر وائزر کی جاب کرنا پسند کریں۔" اور سعد کی اس پیشکش پر وہ جو اتنی دیر سے اس سے بڑی یگانگت کے ساتھ بات کر رہی تھی اس کے دماغ میں ایک دم ہی اپنی برتری کا خناس جاگ اٹھا۔ وہ بڑی نخوت سے بولی۔

"جی نہیں، شکریہ۔ میں اپنے اسٹینڈرڈ سے گرنا نہیں چاہتی۔ جب میری زندگی میں پہلی بار میری پہلی ملازمت کی آفر پانچ ہزار پلس المتفرقات یعنی آٹھ نو ہزار آئی ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں آپ کی اتنی معمولی سی فیکٹری میں اتنی چیپ جاب سنبھالوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اصل میں تو اس نے سعد کو محض اس وجہ سے اتنا منہ لگایا تھا کہ وہ بہت نخریلی اور اعلا خیالات کی حامل ہے اور اس کے پاس زندگی کی پہلی پیش کش آئی ہے تو اتنی بڑی اور شاندار یعنی پانچ ہزار لیکن وہ اسے بھی ٹھکرانے پر تلی ہے۔ لیکن جب اس نے اسے اس کے مطلب کا مشورہ دینے کے بجائے اس کے کردار کی تعریف کرنی شروع کر دی تو وہ اندر ہی اندر جل بھن کر رہ گئی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اس نے اپنی گارمنٹ فیکٹری میں لیڈی سپر وائزر کی آفر دے دی۔ یہ بات تو وہ نکیلی اور بدماغ دار لڑکی برداشت ہی نہ کر سکی اور ایسا کرارا سا جواب دیا کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا مگر یہ محض اس کا خیال ہی تھا وہ اپنا سا منہ لے کر نہیں رہا تھا بلکہ کچھ دیر کے لیے سناٹے کی زد میں آگیا تھا پھر اس کیفیت سے نکلا تو غصے کی وجہ سے اس کے کانوں کی لویں تک سرخ ہو رہی تھیں۔

"لیکن اگر آپ یہ سمجھیں کہ آپ وہ پانچ ہزار روپے والی آبرو باختہ عورتوں کی جاب کریں گی تو یہ آپ کی خوش فہمی ہی ہوگی کیونکہ میں ہرگز ہرگز آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا اور آپ نے اگر میری بات نہ مانی تو میں پھپھو جان سے سب کچھ کہہ دوں گا۔"

"ہے ہے خیریت تو ہے بچے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس کی کیا بات دیکھ لی ہے تم نے جو تم مجھ سے چھپانا چاہ رہے ہو۔ دیکھو مجھے سچ سچ بتا دو بیٹے۔ اس ناشدنی نے ایسا کیا گل کھلایا ہے۔"

خورشید جہاں جو نماز پڑھنے کے بعد جانماز طے کر کے اطمینان سے اٹھی تھیں ان کے کانوں میں سعد کی جھلّے پن سے بات کرنے کی آواز آئی تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ جب کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ چھوٹی روشن کے ہاں گئی ہوئی ہے اور عذیر اپنے ایک دوست سے نوٹس لینے گیا ہے۔ اور صرف عنبر ہی گھر میں موجود ہے جو کچھ دیر قبل ہی عالیہ کے یہاں سے آئی ہے۔ اس کے باوجود بھی انہیں گمان تک نہ تھا کہ سعد عنبر سے اس لب ولہجے میں بات کر رہا ہوگا اور وہ اسے کسی بات پر ٹوک رہا ہوگا۔ مگر جب انہوں نے بیٹھک کے برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ عنبر سے ہی مخاطب تھا اور بڑے غصے میں نظر آرہا تھا۔

ایک لمحے کو تو ان پر سناٹے سے گزر گئے کیونکہ وہ تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھیں کہ سعد عنبر سے اس لب ولہجے میں بھی بات کر سکتا ہے۔ جب کہ فطرتاً بھی وہ کسی سے اونچی آواز میں بات کرنے کا عادی نہ تھا۔ یوں بھی وہ اس کے آخری فقرے بڑے واضح طور پر سن چکی تھیں۔ غصے سے کانپتی ہوئی قدم بڑھا کر بیٹھک میں آگئیں۔ اور انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے عنبر کو گھورتے ہوئے سعد سے پوچھا تو ایک لمحے کو تو وہ بھی سناٹے میں آگیا مگر پھر عنبر کی طرف دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔

"دیکھا آپ نے عنبر! پھپھو جان نے کتنی جلدی میری آواز سن لی ورنہ اتنی دیر سے یہاں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا مگر یہ کسی طرح آکر ہی نہیں دیتی تھیں۔ چلیں ترکیب کارگر تو رہی۔" سعد نے عنبر کو مخاطب کر کے یہ بات کہی تھی مگر عنبر جس کا رنگ فق سا ہو گیا تھا جواب میں ہنس سکی نہ کچھ بول سکی۔

جہاندیدہ ماں نے پہلے ایک نظر ہنستے ہوئے سعد پر ڈالی پھر ان کی نظر بیٹی کے رنگ اُڑے اُترے چہرے پر جم کر رہ گئیں جو ان کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کچھ زیادہ ہی نروس ہو گئی تھی اور ادھر ادھر سر گھما گھما کر عجیب احمقانہ سی حرکت کر رہی تھی۔ انہیں سعد کے ایک دم ہی پینترا بدل کر بات کرنے پر پہلے ہی یقین نہیں آیا تھا۔ اب بیٹی کی حرکات اور سکنات نے انہیں بالکل ہی مشکوک کر دیا۔ وہ سعد سے کچھ پوچھنے ہی والی تھیں کہ سعد نے صورتِ حال اس حد تک نازک ہوتی دیکھ کر دانت نکال کر بہت کھلکھلا کر کہا۔

"آپ میری بات کا اتنا بُرا نہ مانیں عنبر۔! میں نے تو صرف مذاق کیا تھا۔ پھپھو جان کو اپنی آمد سے باخبر کرنے کے لیے۔ سچ بڑا شرمندہ ہوں آپ سے کہ میری خاطر آپ کو پھپھو جان سے صلواتیں سننی پڑیں۔ میں واقعی آپ سے معذرت خواہ ہوں۔" عنبر جس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے کچا چبا جائے وقت اور موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بڑے بھناتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میرا آپ سے کوئی مذاق ہے نہ تعلق۔ آپ آئندہ میرے کسی معاملے میں دخل دیں گے نہ ایسا چھچھورا مذاق کریں گے۔ ورنہ میں آپ کی اماں بیگم سے کہہ دوں گی کہ آپ کو باندھ کر رکھیں اور آپ کا نکاح آپ کی ماموں زاد فوزیہ سے جلد کر دیں۔"

"ہیں ہیں کیا بک رہی ہو تم۔ بے مروّت بدلحاظ کہیں کی۔ چلو دفعان ہو اپنے کمرے میں۔" ماں نے اسے بُری طرح ڈانٹا تو وہ جو دل سے یہی چاہ رہی تھی کہ ان کی نظروں سے دور ہو جائے، بھاگنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔ سعد کے سامنے گویا خورشید جہاں کے شرمندہ ہونے کی باری تھی کہ انہوں نے تو سعد سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی ایک بہت ہی نجی بات کسی کو بھی نہیں بتائیں گی۔ جب کہ ان کے سامنے عنبر نے وہی اتنی پرائیویٹ بات کہہ کر سعد کی نظروں میں انہیں ذلیل کر کے رکھ دیا تھا اور موقع ہی ایسا تھا کہ اگر وہ اس کے سامنے اپنی صفائی بھی پیش کرتیں تو خود ان کی بات ہی ہلکی ہوتی۔ پھر بھی انہوں نے خجالت بھرے لہجے میں کہا۔

"اے ہاں ذرا دیکھو تو یہ آج کل کے بچوں کے کان کتنے تیز ہوتے ہیں ورنہ یہ بات تو صرف میرے اور تمہارے درمیان ہی ہوئی تھی۔ پھر بھی انہوں نے سن لی۔ ورنہ میرا خدا گواہ ہے بچے! میں نے ان سے تو کیا کسی کو بھی ہوا تک نہیں دی۔ اس معاملے کی۔"

"کوئی بات نہیں پھپھو جان۔ ساری غلطی میری ہی تھی۔ اصل میں کوئی شخص جب اپنا کوئی راز کسی کو بتاتا ہے تو پھر وہ راز نہیں رہتا' ایک عام سی بات بن جاتا ہے۔ اچھا۔ اب میں چلوں گا پھپھو جان۔ فہد کالج کے باہر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔" اور پھر وہ خدا حافظ کہہ کر بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اور خورشید جہاں سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اسے روک لیتیں۔ اصل میں عنبر نے فوزیہ والی بات کہہ کر ان کی پوزیشن اتنی خراب کر دی تھی کہ کچھ کہنے کو ان کا منہ ہی نہ رہا تھا۔ بس غصہ تھا جو چولہے پر رکھے دودھ کی طرح آہستہ آہستہ جوش کھا رہا تھا اور کسی دم بھی اُبل جانے کو تیار تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ کمرے میں پہنچیں تو دیکھا عنبر ہچکیوں اور ہچکیوں رو رہی ہے۔ دل تو چاہا کہ روئی کی طرح اسے دُھنک کر رکھ دیں۔ گو انہوں نے ساری زندگی اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ مگر اُس وقت انتہائی غصّے اور کوفت کے عالم میں انہوں نے اس کی پیٹھ پر دو تین دھپ جمانے کو اپنا ہاتھ بھی اُٹھا لیا تھا لیکن عنبر نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور جلدی سے اٹھ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور روتی ہوئی بولی۔

"امی! خدا کی قسم، غصّے میں میرے منہ سے نکل گیا۔ انہوں نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ آپ بھی نا معلوم کیا سمجھیں۔ ورنہ میں تو کبھی مر کر بھی فوزیہ کا نام نہیں لیتی۔ امی پلیز مجھے معاف کر دیجیے۔ میری امی۔" وہ ان کی ٹانگوں سے چمٹ کر روتی رہی اور وہ اسی طرح ہاتھ اُٹھائے ساکت سی کھڑی رہ گئیں۔ پھر کچھ ہی دیر بعد انہوں نے اسے اپنے ہاتھوں سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بڑی ناگواری سے کہا۔

"چلو ہٹو۔ چھوڑو۔ میری ٹانگیں۔ لے ہاں، یہ تو وہی مثل ہو گئی کہ بے مارے کی توبہ۔ میں نے تمہیں کچھ کہا نہیں اور تم نے اور ہاتھ پیر جوڑنے بھی بیٹھ گئیں۔ لو بھلا یہ بھی خوب ہوئی کہ غصّے میں منہ سے نکل گیا۔ منہ نہ ہوا موا کیتلی کا ڈھکن ہو گیا کہ بھک بھاپ نکلے چلی جاتی ہے۔ ارے خواہ جان پر بن جائے۔ قتل اور خون بھی ہو جائے تب بھی کسی سے وعدہ کی ہوئی بات کو زبان پر نہیں لاتے۔ مگر تم نے تو مجھے آج سعد کی نظروں میں ذلیل و خوار ہی کر کے رکھ دیا۔ آج تک کبھی اس نے مجھ سے ایسی بے زاری سے بات نہیں کی جیسی آج کر کے گیا ہے۔ میں نے لاکھ یقین بھی دلانا چاہا کہ میں نے عنبر کو کچھ بھی نہیں بتایا مگر مانا ہی نہیں۔ اُلٹا دوشالے میں لپیٹ کر یہ کہہ گیا کہ غلطی سراسر اس کی تھی کہ اس نے اپنی ایک نجی بات مجھے کیوں بتائی۔ تمہاری جگہ اگر چھوٹی یہ حرکت کرتی تو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیتی۔ مگر خدا کا شکر ہے' وہ تمہاری طرح پیٹ کی ہلکی ہے نہ بلا سوچے سمجھے جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے۔"

خورشید جہاں تو ابھی اور بھی بہت سی صلواتیں سُنانے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر دروازے پر کچھ دیر سے دستک ہو رہی تھی اس لیے وہ منہ ہی منہ میں اسے بُرا بھلا کہتیں دروازہ کھولنے چل دیں۔

ان کے باہر نکلتے ہی عنبر نے اس خیال سے جلد جلد آنسو پونچھے کہ کہیں چھوٹی اسے روتا نہ دیکھ لے۔ بلکہ وہ اٹھ کر کھڑی بھی ہو گئی تھی اور اپنے وہ کپڑے پلنگ سے اٹھائے جو پہننے والی تھی۔ اس نے چشم زدن میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے انٹرویو کے بارے میں چھوٹی اور عذیر کو بھی وہی بات بتائے گی جو ماں کو بتا چکی ہے تاکہ بعد میں اس کی بات جھوٹی نہ پڑے۔ چھوٹی بھی دروازہ کھلتے ہی اسے ہی پوچھتی ہوئی آئی۔

"امی! کیا آپا آ گئیں؟" اور ماں نے صرف ہوں کہنے پر اکتفا کیا تھا۔ مگر چھوٹی نے یہ جاننے کے شوق میں کہ انٹرویو کیسا رہا ماں کے صرف ہوں کہنے پر دھیان بھی نہ دیا۔ اور بھاگ کر کمرے میں چلی آئی۔

"کہیے آپا! کوئی خوشخبری۔ آپ کا انٹرویو کیسا رہا؟" اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی پوچھا تو عنبر نے اپنے حزن بھرے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ سجانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے وہی بات بتا دی جو ماں کو بتائی تھی۔

"ہائے تو آپ اس بات پر رونے بھی لگیں آپا۔ جب کہ آپ تو بڑی بہادر ہیں۔ اور پھر آپ کو وہاں سے جواب تو نہیں ملا۔ امید تو ابھی قائم ہے نا ممکن ہے دو ایک دن بعد آپ سے انٹرویو کریں۔" چھوٹی نے سب کچھ سُننے کے بعد گویا اسے دلاسا دیا۔

"ہاں، مگر میں تو اسی امید میں گئی تھی کہ آج ہی انٹرویو ہو گا۔ بلکہ عالیہ نے بلایا بھی اسی لیے تھا۔ لیکن ہماری قسمت میں تو ہر بات میں دیر ہی دیر لکھی ہے۔ اب خدا ہی جانے کہ کب ملازمت ملے۔" عنبر نے کہا اور پھر اپنے کپڑے لے کر غسل خانے چل دی۔

پھر رات کو بھی بستر پر لیٹنے کے بعد عنبر کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ کیونکہ عالیہ کے سامنے تو گویا وہ اس ملازمت کو ٹھکرا ہی چکی تھی جس کے لیے عالیہ نے اسے بلوایا تھا۔ اس کے باوجود بھی عالیہ نے چلتے چلتے اس سے کہا تھا کہ وہ ایک بار ضرور اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ تب بھی اس نے دل میں سوچا تھا کہ جب ایک بار کوئی فیصلہ کر ہی لیا جاتا ہے تو اس میں نظر ثانی کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ نظر ثانی کرنے کا اس کا دور دور تک ارادہ نہ تھا لیکن ایک تو اس کی غیور طبیعت پر سعد کی یہ دھمکی۔

"میں ہرگز ہرگز آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا" اتنی گراں گزری تھی کہ اس نے اس کی بات کو اپنے لیے ایک چیلنج ہی سمجھا تھا۔ دوسرے ماں نے اس کی تھوڑی سی بھی نہیں رکھی تھی اور سعد کے سامنے گو صحیح بات بھی سُنی تھی تب بھی۔ اتنا خوار کیا تھا کہ اسے اپنی محکومیت کا احساس کسی قید و بند کی طرح ہی لگا تھا۔ اور عالیہ کی یہ بات بار بار اس کے کانوں میں گونج رہی تھی کہ تم کب تک اپنی امی کی انگلی پکڑ کر چلو گی۔ تھوڑی سی خود کو بھی تو کوئی امپورٹینس دو۔ تو اپنا آپ منوانے اور خود کو اہمیت دلانے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ وہ یہ اتنی اونچی آفر قبول کر لے۔

یوں بھی عالیہ نے اسے ہر طرح کا اطمینان دلا دیا تھا۔ یہ تک کہہ دیا تھا کہ تمہارا فلم، اسٹیج اور اسٹوڈیو سے دور تک کا بھی تعلق نہ ہو گا اور تم سے زیادہ کام بھی نہیں لیا جائے گا۔ گھر سے تمہیں پک اور ڈراپ کرنے کا بھی بندوبست کر دیا گیا ہے۔ کھانا اور چائے بھی گویا مفت میں تمہیں دی جائے گی۔ حتیٰ کہ ہاؤس الاؤنس بھی ملے گا اور میڈیکل فری ہو گا۔ اس کے باوجود بھی اس نے عالیہ کی اتنی اعلا پیش کش مسترد کر دی تھی۔ اصل میں اسے غزل بالکل پسند نہیں آئی تھی۔

کیونکہ عالیہ کے کہنے کے مطابق وہ لاکھ اعلا طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ گو رئیس بنت رئیس تھی لیکن نہ صرف اس کے طور طریقے۔ عامیانہ اور بازاری سے تھے بلکہ اس کے چہرے مہرے سے بھی کچھ ایسا ہی تاثر ہویدا ہوتا تھا۔ اس پر اسے دیکھ کر غزل نے جو ریمارک پاس کیا تھا۔

"واہ بھئی واہ، بڑی اعلا دریافت ہے تمہاری عالیہ۔"

اس نے رہا سہا امپریشن بھی خراب کر کے رکھ دیا تھا جو اس نے غزل کو دیکھ کر لیا تھا۔ اسے تو اس بات پر سخت حیرت تھی کہ عالیہ کی اس سے دوستی ہی کیسے ہو گئی ہے۔ وہ بھی اتنی گہری جب کہ کالج کے زمانے میں وہ ایسی تیز و طرار اور شارپ قسم کی لڑکیوں

کو منہ تک نہیں لگاتی تھی۔ دوستی گانٹھنا تو دور کی بات تھی۔ اس پر ایک تو اس نے قابل اعتراض حد تک اسکن ٹائٹ کپڑے پہن رکھے تھے دوسرے گہری سانولی رنگت پر بینگنی رنگ کا پرنٹڈ سوٹ، چنا ہوا دوپٹہ ڈوری کی طرح گلے میں پڑا تھا اور اس پر ستم بالائے ستم میچنگ کا یہ عالم کہ لپ اسٹک سے لے کر نیل پالش، سینڈلز اور پرس تک اسی گہرے موو کلر کا تھا حتیٰ کہ پیروں کی انگلیوں کے بڑھائے ہوئے بڑے بڑے ناخنوں پر بھی ہم رنگ نیل پالش لگا رکھی تھی۔ اور ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن تو بلا مبالغہ دو دو انچ لمبے تھے اس لیے انگلیاں بھی غیر معمولی طور پر بہت لمبی لگ رہی تھیں جن کے اندر وہ سگریٹ اڑائے بڑے اسٹائل سے کش لگاتی رہی تھی۔ سب سے بڑی حیرت کی بات تھی کہ بھائی کی رنگت سرخ و سفید تھی اور بہن اتنی سانولی تھی۔ سگے بھائی بہن کے درمیان یہ اتنا تضاد اس کی سمجھ سے بالاتر ہی تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ ایک دوسرے میں خاصی مشابہت تھی۔

بہر حال عنبر کو اگر گھر سے باہر نکل کر کہیں جانے کا اتفاق ہوا تو وہ اس کے تایا کا گھر ہی تھا۔ جہاں اسے بہت سی ایڈوانس اور فیشن ایبل لڑکیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا مگر وہ بھی اتنی آزاد اور ایڈوانس نہیں تھیں جتنی غزل ثابت ہوئی تھی کہ بڑے بھائی سے سب کے سامنے بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اب عنبر کو کیا معلوم تھا کہ اعلا طبقے سے تعلق رکھنے والی بعض ایسی لڑکیاں جنہوں نے اپنی تہذیب، روایات اور نسوانیت کو پس پشت ڈال کر مور کے پنکھ اپنے گرد جما رکھے ہیں، اور بھی بہت سی اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کرنے کے ساتھ ساتھ بڑے دھڑلے سے بڑوں کے سامنے بیٹھ کر سگریٹ پیتی ہیں۔ ڈانس کرتی ہیں۔ ڈیٹنگ کرتی ہیں۔

عنبر کو تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ اس پر طرفہ تماشا یہ تھا کہ وہ جو ایڈوانس بننے کی خواہاں تھی۔ آزادی اور ماڈ بننے کا سودا جس کے سر میں سمایا ہوا تھا اس نے بھی غزل جیسی بیباک لڑکی کو ایک ہی نظر میں ریجیکٹ کر دیا تھا جب کہ غزل نہ تو کردار کی بُری تھی نہ دل کی۔

چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ گو کالی کلوٹی تھی۔ اس کی ماں کا کہنا تھا کہ اس کے سب سے چھوٹے بھائی کی آیا چونکہ حبشن تھی اور پھر نیروبی میں رہنے کی وجہ سے ان کا واسطہ زیادہ تر حبشیوں سے ہی پڑا تھا۔ اور اس زمانے میں غزل ان کے پیٹ میں تھی اس لیے اس کی رنگت اتنی کم تھی۔ بہر حال غزل والدین، چاروں بھائیوں حتیٰ کہ خالہ ماموؤں اور چچاؤں کی آنکھوں کا تارا تھی۔ ایک تو بھائیوں سے یعنی سب سے چھوٹی تھی دوسرے دولت بھی خدا نے بے اندازہ دی تھی۔ اس لیے بہت زیادہ نازونعم میں پلی بڑھی تھی اور ہمیشہ نخروں ہی میں تلتی رہی تھی۔

دوسرے نمبر پر اس کا بھائی گلشیر خان تھا۔ جو اپنی اداؤں سے تھوڑا تھوڑا خر دماغ سا معلوم ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں جو ایک عیارانہ چمک تھی عنبر اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اسے کوئی نام تو نہیں دے سکی تھی لیکن آنکھوں سے ہویدا تاثر یا چمک کو عنبر نے بالکل پسند نہیں کیا تھا۔

پھر وہ سوچنے لگی کہ اگر وہ یہ ملازمت قبول کر لے تو اس میں حرج ہی کیا ہو گا، بلکہ اُلٹے سب کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ پانچ ہزار کی رقم ہر ماہ ہاتھ میں آئے گی۔ بھلا یہ کوئی آسان اور معمولی بات ہو گی جب کہ بائیس تیئیس سالہ زندگی میں تو اس نے کبھی خواب میں بھی اتنی رقم نہیں دیکھی۔ ہاتھ میں لینا تو کجا اور وہ امی نے عذیر کے ٹیوشن کے پیسوں کی کمیٹی ڈال کر جو رقم جمع کی تھی وہ بھی کل ساڑھے تین ہزار ہی تھی۔

سوچ لو عنبر— ! پانچ ہزار کی رقم اور تم — تم جو بچپن سے اتنی مصیبتیں اُٹھاتی آ رہی ہو۔ یہ ہر ماہ پانچ ہزار کی رقم تمہاری تقدیر ہی بدل کر رکھ دے گی۔ تم کیا سے کیا ہو جاؤ گی مگر پھر اسے انجانے سے اندیشوں نے آ گھیرا۔

اف نہ معلوم وہ مجھ سے کیا کام لیں۔ عالیہ کہہ رہی تھی کہ فلم اور اسٹیج کے لیے آنے والے نئے چہروں سے تم کو ڈیل کرنا ہو گا اور عالیہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی کھل کر تو نہیں کہہ رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اسے یہ ڈر ہو کہ کہیں میں بدک نہ جاؤں کیونکہ اس نے دبے دبے لفظوں میں یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں لباس بھی ان کی مرضی کے مطابق پہننا ہو گا۔ اور نہ معلوم وہ لوگ میرے ساتھ کس طرح پیش آئیں اور مجھے ایسی باتوں کے لیے یا کاموں کے لیے مجبور نہ کریں جو مجھے گوارا نہ ہوں۔

اف خدایا میں کیا کروں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اتنی سوچ بچار کے باوجود عنبر کسی نتیجے پر نہیں پہنچی کیونکہ نیند نے اس کی پلکوں کو بری طرح آپس میں چپکا دیا تھا اور وہ سو گئی تھی۔ یوں بھی جب بہت غور و خوض کرنے کے باوجود انسان کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا تو تھک ہار کر سو ہی جاتا ہے یا پھر اپنے کسی کام کی انجام دہی میں مصروف ہو جاتا ہے۔

ادھر عنبر کار میں بیٹھ کر اپنے گھر روانہ ہوئی اور ادھر عالیہ نے فون پر غزل سے رابطہ قائم کیا۔

"ہیلو غزل! کیا پہنچ گئیں؟"

"ہاں۔ کب کی۔ بلکہ تمہارا فون آنے کے انتظار میں سوکھ رہی تھی۔ اچھا۔ کیا رزلٹ رہا؟" غزل کے آخری فقرے سے بے تابی سی جھلک رہی تھی۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ اس نے صاف انکار کر دیا۔"

"مگر کیوں۔ ؟"

"بس وہ فلم اور اسٹیج کا نام سن کر ہی بدک اٹھی تھی۔"

"لیکن تم نے اسے سمجھایا تو ہوتا کہ اس کا فلم یا اسٹیج سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہے گا۔"

"بہت سمجھایا تھا مگر اس کے اخروٹی ذہن میں یہ بات کسی طرح فٹ ہی نہیں بیٹھی۔"

"تو پھر اب کیا ہو گا؟"

"ہونا کیا ہے۔ تم کوئی اور در دیکھو۔"

"واہ میں کوئی بھکاری ہوں۔ اسٹوپڈ کہیں کی۔ دیکھو ایک مرتبہ سمجھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم اسے بلا کر پھر سمجھاؤ۔ ممکن ہے کہ مان ہی جائے۔"

"نہیں غزل! یہ ممکن ہی نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس کا خیال چھوڑ ہی دو۔ ویسے اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اتنی زیادہ حسین بھی نہیں ہے۔"

"ارے نہیں، یہ تو نہ کہو اور اگر اتنی زیادہ حسین نہیں ہے تو چند ماہ بعد ہو جائے گی۔ اس میں جو اسٹائل اور بانکپن ہے اسے میں ہی سمجھ سکتی ہوں تم نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آئی ایم سوری۔ اس معاملے میں میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

"ہائے اتنی مین تو نہ بنو عالی۔ پلیز کچھ تو کرو۔"

"اوہ بھئی میں تو تم سے کہہ کر پچھتائی۔ اصل میں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ڈیڈی سے کہہ کر اسے کسی اچھی ملازمت پر لگوا دوں تبھی مجھے تمہارا خیال آیا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ گلشی اور گل خان بھائی نے مل کر یہاں کراچی میں اپنا بزنس اسٹارٹ کیا ہے۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ تم لوگوں کی لائن ہی بالکل دوسری ہے۔" عالیہ زچ ہونے کے انداز میں بولی۔

"مگر تم میری بھی تو سنو۔"

"اچھا سناؤ۔"

"دیکھو عالی اپنی یہ ضد چھوڑ دو اور میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ دیکھو میں نے ہی نہیں بلکہ گلشی نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے۔ اور جس چیز کو گلشی پسند کرے اس کے ساتھ نہیں اور سوری نہیں چل سکتا۔ تمہیں عنبر ین کے ہاں مجھے لے کر جانا ہی ہو گا۔" آخری فقرہ غزل نے بڑی دھونس کے ساتھ انگریزی میں کہا۔

"تو پھر تم بھی سن لو گجی میں تمہیں اس کے ہاں ہرگز ہرگز نہیں لے جاؤں گی۔ یوں بھی تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا مجھ پر رعب جمانے کا۔ تم بے شک یہ بات اپنے گلشی کو بھی بتا دینا۔ میں اس سے بالکل نہیں ڈرتی۔" عالیہ کو غزل کے دھونس سے بات کرنے پر سچ مچ غصہ ہی آ گیا۔

"ارے نہیں نہیں عالی ڈیر۔ تم اس کا دیا کھاتی ہو جو اس سے ڈرو گی۔ یوں بھی یہ بات صرف میرے اور

تمہارے درمیان ہی ہو رہی ہے۔ میں نے تو تمہیں صرف اس لیے بتایا کہ تم تو جانتی ہو گلشی کتنا ضدی ہے اور آئی کین ہو عالی۔ گلشی کا ارادہ اسے کسی فلم کی ہیروئن بنانے کا نہیں ہے بلکہ پبلک ریلیشنز میں عام طور پر جو ڈیلنگ ہوتی ہے اس کے لیے بھی حسین چہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ جو بھی کسٹمرز آتے ہیں اگر ان کا سابقہ بدنما چہروں سے پڑتا ہے وہ پھر ایک کنسرن ہستی سے تو پھر وہ لوٹ کر نہیں آتے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ عورت کے بغیر کائنات کی تکمیل ممکن نہیں تو صحیح ہی کہتے ہیں عورت نہ ہو تو انسانی نسل کیسے چلے اور عورت کے بغیر کاروبارِ حیات بھی ٹھپ ہو کر رہ جائے۔"

"اچھا اچھا اب ایک اتنی سی بات کے لیے اتنا بڑا لیکچر نہ دو۔ اور عنبرین کو بھول ہی جاؤ۔ یوں بھی اس سے کہیں خوبصورت اور اسٹائلش لڑکیاں بھری پڑی ہیں ہمارے ملک میں۔ پانچ ہزار تو بڑی چیز ہے وہ تو تین ہزار کی آفر پر بھی آسانی سے تمہیں مل جائیں گی۔" عالیہ نے گویا قصہ کو تاہ کرتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ لڑکیاں سے تمہاری کیا مراد ہے۔ ہمیں کسی فلم یونٹ بنانے کی تیاری تو نہیں کرنی جو لڑکیاں درکار ہوں گی ہمیں تو صرف ایک لڑکی کی ضرورت ہے جو خوبصورت، تعلیم یافتہ، ذہین اور مستعد ہو۔ وہ بھی اپنے آفس میں اور مینجمنٹ کیڈر میں۔"

"لیکن جہاں تک میری معلومات کو دخل ہے خوبصورت تعلیم یافتہ ذہین اور مستعد ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ کار بھی ہونا ضروری ہے اور عنبرین کو کسی بات کا بھی تجربہ نہیں ہے۔ لہٰذا مائی ڈیر گجی اب میری اور اس کی خطائیں معاف کر دو۔ ویسے بھی ممی کے لیے کھانا تیار کروانا ہے۔ اوکے بائی۔" پھر عالیہ نے جواب میں غزل جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی وہ بھی سننے کی ضرورت نہیں سمجھی اور فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہونہہ پیچھے ہی پڑ گئی مصیبت کہیں کی۔ ورنہ میں نے تو اس خیال سے کہا تھا کہ کوئی ڈھنگ کی جاب دلوا دے گی عنبر کو۔ اصل میں عالیہ جواب سے پہلے عنبر کو حالات کا شکار (وہ بھی اس کے گھر جانے کے بعد سے) ایک شریف لڑکی ہی سمجھتی تھی۔ جس سے اس کی خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی بلکہ ایک طرح دوستی ہی تھی۔ اور چونکہ عنبر نے کبھی اس کے نجی حالات کو کریدنے کی کوشش کی تھی نہ کسی غرض سے ہی ملتی تھی اس لیے بھی عالیہ نے اس سے اپنی دوستی کو قائم رکھا تھا اور عنبر کے ساتھ اسے تھوڑی بہت ہمدردی بھی تھی۔ اور اسی ہمدردی کی بنا پر اس نے غزل سے اسے ملازمت دلانے کے لیے کہا تھا۔ اور غزل نے جو آفر دی تھی اس کے پیشِ نظر عالیہ یہی سمجھ رہی تھی کہ جب عنبر کو معلوم ہو گا کہ اسے اتنی زبردست جاب مل رہی ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا اور وہ بلا تامل اور خوشی خوشی اس جاب کے لیے رضامند ہو جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اور غزل نے مل کر پہلے سے یہ پلان بنایا تھا کہ عالیہ اس کا انٹرویو اس طرح لے گی جیسے آپس میں باتیں کی جاتی ہیں اور غزل گل شیر خان اور شیخ وہاب چھپ کر ان کی گفتگو سنیں گے اور جب بات مکمل ہو جائے گی تو عالیہ انہیں باہر آنے کے لیے کہے گی۔

اصل میں عالیہ نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ عنبر کے اندر جھجک اور شرم بہت ہے اور چونکہ اس کی زندگی کا پہلا انٹرویو ہو گا اس لیے نروس ہو جانے کی وجہ سے وہ سب کے سامنے ڈھنگ سے جواب نہ دے سکے گی بلکہ عالیہ نے انٹرویو کو انٹرویو کروانا ہی نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ چونکہ یہ گھر کا سا ہی معاملہ ہے اس لیے وہ خود ہی عنبر سے سوال جواب کر لے گی لیکن یہ سوال و جواب وہ ان تینوں کے سامنے نہیں کرے گی۔ البتہ وہ چھپ کر اس کی گفتگو سن سکتے ہیں۔

اور اس وقت تو نہیں لیکن غزل ہلکشی اور شیخ کے جانے کے بعد اس کی عنبرین سے جو گفتگو ہوئی تھی اس نے عالیہ کو نہ صرف متاثر کیا تھا بلکہ اس کی نظروں میں عنبر کی قدر و منزلت کچھ اور بڑھا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عالیہ اس کے معاملے میں غزل سے اتنی سیریس ہو گئی تھی۔ عالیہ خود بھی بہت اچھے کردار کی لڑکی تھی لیکن چونکہ پیسے والی تھی اس لیے بہت آزاد اور روشن خیال تھی۔ اس کے خیال میں غزل کی آفر کی ہوئی جاب اتنی بری نہیں تھی مگر جب عنبر کو بہت قائل معقول کرنے کے باوجود بھی عنبر اس جاب کے لیے راضی نہ ہوئی تو تب اسے بھی احساس ہوا کہ واقعی بری چیز بری ہوتی ہے۔ اور چونکہ وہ عنبر کی ہم خیال ہو گئی تھی اس لیے غزل کو اپنی دال گلتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

تین چار روز تو امید و بیم کی سی کیفیت میں گزارے۔ کہ عنبر نے سوچا تھا کہ جیسے اللہ نے ایک یہ راہ نکالی تھی بہت ممکن ہے مزید کوئی دوسری راہ بھی نکال دے۔ اور کہیں سے اس کے لیے انٹرویو لیٹر آ جائے۔ مگر سوچنے سے ضروری نہیں ہوتا کہ ہر کام امید کے مطابق ہی ہو جائے۔ یہ تو اللہ پاک کی مرضی اور خوشی پر ہوتا ہے کہ جو فیصلہ وہ کرتا ہے یا جیسا اس نے انسان کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ہو کر رہتا ہے۔

رمضان المبارک شروع ہونے میں ایک ہی ہفتہ رہ گیا تھا۔ گو خورشید جہاں اور چھوٹی بھی اپنی اپنی جگہ بڑی فکرمند تھیں مگر اس کا تو فکر کے مارے برا حال تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی اس کی اکٹھی دو ٹیوشنیں چھوٹ گئی تھیں۔ وہ دونوں بچے محلے میں ہی رہتے تھے اور آپس میں سگے رشتے دار تھے۔ ان کے والدین نے ناظم آباد میں اپنا ذاتی بنگلہ تعمیر کرا لیا تھا اور اسی میں منتقل ہو گئے تھے۔ ایک ٹیوشن تو بہت پہلے چھوٹ گئی تھی۔ اب اس کے پاس دو ٹیوشنز رہ گئی تھیں یعنی کل دو سو روپے ماہوار۔ اور دو سو روپے ماہوار میں بھلا اس کا کیا گزارا ہو سکتا تھا اور کیا وہ ماں کو دے سکتی تھی۔ اور گھر میں تو وہ کم ہی دیتی تھی۔ البتہ عذیر کے تعلیمی اخراجات میں ضرور تھوڑی رقم سے مدد کر دیا کرتی تھی۔

بہرحال اس روز وہ بڑی پریشان تھی۔ کتنی بار اس کا دل چاہا تھا کہ جا کر عالیہ کی آفر کی ہوئی جاب سنبھال لے۔ مگر اس جاب میں جو خدشات پوشیدہ تھے ان کے تصور سے ہی اس کا نازک سا دل ہول اٹھتا تھا۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ عذیر اسکول جانے کی غرض سے تیار ہو کر باہر نکلا ہی تھا کہ چند ہی منٹ میں ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ لیے واپس آ گیا۔

"آپا۔ آپا یہ آپ کا خط آیا ہے۔" اس نے بیٹھک ہی سے ہانک لگائی۔ اور پھر دوڑ کر وہ خط بہن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تجسس، شوق اور خوشی کی ملی جلی سی کیفیت نے عنبر کی دھڑکنوں کو بے ترتیب سا کر دیا۔ اس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اور بڑا سا ٹائپ شدہ خط کھول کر پڑھنے لگی۔

خط انگریزی میں ہی لکھا ہوا تھا۔ اور یہ پاکستانی ہینڈی کرافٹس (دستکاری) کے ایک بڑے ادارے کی طرف سے قائم شدہ ایک شاخ کی طرف سے جو خواتین کے لیے مختص کی گئی تھی۔ بھیجا گیا تھا۔ خط کا متن یہ تھا۔

"آپ کی لیڈی اسٹور کیپر کے سلسلے میں فلاں تاریخ کو بھیجی ہوئی درخواست ہمیں موصول ہوئی۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنا انٹرویو دینے کے لیے مع بایوڈیٹا۔ فلاں تاریخ کو دن کے دس بجے ہمارے دفتر تشریف لے آئیں۔" نیچے کسی خاتون آرگنائزر کے دستخط تھے۔

"یہ درخواست اس نے کب بھیجی یہ تو اسے یاد ہی نہ تھا۔ جبکہ خط کے متن میں تاریخ بھی درج کی گئی تھی۔ البتہ اسے اتنا ضرور یاد تھا کہ اس نے ایک درخواست بھیجی ضرور تھی۔ وہ تو اس انٹرویو لیٹر کے آنے سے پہلے جتنی خوش تھی سو تھی لیکن چھوٹی کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ وہ تالی بجا کر بولی۔

"ہائے اللہ! یہ تو غیبی امداد ہوئی۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو آپا۔"

"ارے ابھی سے مبارکباد دے رہی ہو پہلے انٹرویو تو ہو لینے دو۔ کیا پتا میرا انٹرویو کامیاب بھی ہو یا پھر کسی اور جگہ قسمت آزمائی کے انتظار میں مہینوں تک سوکھنا پڑے۔" اس نے تھوڑا سا ہنس کر تھوڑا سا سنجیدہ ہو کر کہا۔

"اے تو جی کیوں پہلے سے ہی بدفالیں منہ سے نکالتی ہو بچی۔ خدا سے ہمیشہ اچھی ہی امید رکھنی چاہیے۔" خورشید جہاں نے اسے ٹوکا۔ عذیر تو خط اس کے ہاتھ میں تھماتے ہی چلا گیا تھا۔ ورنہ وہ موجود ہوتا تو وہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہتا۔

اگلی صبح غیر معمولی طور پر وقت سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے جب تک وضو کیا۔ اذانیں بھی ہونے لگیں۔ نماز پڑھنے کے بعد اس نے جلد جلد ناشتہ تیار کیا۔ انٹرویو پر جانے کے لیے اس نے گزشتہ روز ہی نہ صرف لباس کا انتخاب کر لیا تھا بلکہ اپنے لباس کو استری کر کے بھی رکھ دیا تھا۔ اب تو صرف ناشتہ کر کے تیار ہونا تھا۔ کیونکہ ساڑھے نو بجے اس کا گھر سے روانہ ہونے کا پروگرام تھا۔

ہر کیف وہ وقت سے کچھ دیر قبل ہی ہینڈی کرافٹس کے دفتر پہنچ گئی۔ وہاں جا کر دیکھا تو دفتر کے آگے کرسی ڈالے ایک سوکھا

چمرخ چپراسی بیٹھا ایک بڑی بڑی مونچھوں والے پٹھان سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

"تم ادھر کس کے پاس آیا ہے بی بی؟" تو اس نے اس آرگنائزر کا نام بتایا اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اسے انٹرویو کے لیے بلایا گیا ہے۔ "ٹھیک ہے تم اندر بیٹھو۔ مس صاب ابی آتا ہے۔" مگر وہ اندر بیٹھنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئی کیونکہ اس کے خیال میں دو غیر اور اجنبی مردوں کی موجودگی میں اندر بیٹھنا بہت سے خطرات مول لینے کے مترادف تھا۔ یہی سوچ کر اس نے کہا۔

"نہیں۔ میں یہاں باہر ہی ٹھیک ہوں۔ آپ کی مس صاب کب تک آجائیں گی بابا؟" اس نے چپراسی کو مخاطب کیا تھا لیکن جواب اس مونچھوں والے نے دیا۔

"چہ خدا خبر کب آئے۔ اسی وجہ سے تو تم سے بولا ہے کہ اندر جا کے بیٹھ جاؤ۔" اُف آواز بھی ایسی پاٹ دار تھی کہ توبہ ہی بھلی۔ اور اس نے بھی سوچا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دس منٹ تک اور انتظار کرے گی۔ اگر پھر بھی وہ صاحبہ تشریف نہیں لائیں تو اپنے گھر واپس چلی جائے گی۔ اور جب دس منٹ چھوڑ پندرہ منٹ گزر گئے اور وہ واپسی کے لیے پر تولنے لگی تھی عین اس کے سامنے ایک پرانے ماڈل کی فوکسی آکر رکی جس میں سوتی ساڑھی پہنے ایک صاحبہ وارد ہوئیں اور اپنا پرس جھلاتی ہوئی دفتر کی طرف بڑھیں تو چوکیدار نے عنبر سے کہا۔

"لو بی بی! آگئیں مس زاہدہ۔" مس نے ایک لمحے کو رک کر اس کی طرف دیکھا اور بڑی بے نیازی سے اندر چلی گئیں۔ تو چار و ناچار اسے بھی اندر جانا پڑا۔ پہلے تو کچھ دیر وہ اس مونچھوں والے سے کچھ معلومات حاصل کرتی رہیں۔ کہ رات کو کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی۔

"میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا۔"

"فلاں برانچ سے فلاں مال آنے والا تھا اس کا کیا بنا۔" وغیرہ وغیرہ پھر کہیں جا کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اس کا بایوڈیٹا دیکھا اور پھر کچھ سوالات کیے۔ ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ آپ کو بالکل ناتجربہ کار ہیں۔ آپ کو رجسٹر میں ان چیزوں کا اندراج کرنا ہوگا جو دوسری برانچ سے بھیجی جاتی ہیں اور جو مال یہاں سے جائے گا۔ وہ اپنی نگرانی میں باقاعدہ اس کی لسٹ بنا کر حاملِ ھٰذا سے دستخط کروا کر دینا ہوگا۔

آپ کے لیے دستکاری کا جاننا بھی ضروری ہوگا۔

خواہ وہ کشیدہ کاری ہو۔ سلائی کڑھائی ہو یا ہاتھ سے بنائی جانے والی کوئی چیز ہو۔

آپ کی ڈیوٹی یہاں صبح دس بجے سے شام کے سات بجے تک لگائی جائے گی۔ چھٹی لینے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی ہمارے یہاں۔ آپ کی سیلری فی الوقت تو دو ہزار روپے ماہوار ہوگی اس کے بعد یہ آپ کی محنت اور کارکردگی پر منحصر ہوگا کہ اس میں تھوڑا بہت اضافہ کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ اپنے ورکرز کے لیے ہمارے یہاں ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی مہیا کی گئی ہے یعنی ہماری کمپنی کی گاڑی آپ کو پیر الٰہی بخش کالونی کے بس ٹرمینل پر چھوڑ دیا کرے گی اور وہیں سے پک بھی کیا کرے گی۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کے لیے یہ جاب سوٹ ایبل ہے تو یہ فارم لے جائیے اور اسے فل کر کے کل صبح اپنے ساتھ لے آئیے گا۔ آپ کی ملازمت پکی ہوجائے گی۔ عنبر نے بھی سوچا کہ فی الوقت مناسب ہی ہوگا کہ اسی جاب پر تکیہ کر لیا جائے۔ کہ ٹرانسپورٹ کی بھی آسانی ہے۔ گھر کے بس اسٹاپ سے اگلا بس اسٹاپ ہی تو ہوگا جہاں تک مجھے آنا پڑے گا۔ پھر تو کمپنی کی گاڑی مجھے یہاں دفتر تک لائے گی۔ اور یہاں تنخواہ میں اضافے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ ادھر ٹیوشنیں بھی چھوٹ گئی ہیں اور سب سے بڑھ کر ماہِ رمضان شروع ہونے والا ہے۔ اس لیے اس نے زاہدہ سے کہا۔

"اگر آپ کہیں تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے یہ فارم بھر دوں۔" تو اس نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی اب اتنی جلدی بھی نہ کریں۔ اس وقت تو آپ گھر چلی جائیں البتہ کل صبح یہ فارم بھر کر اپنے ساتھ لے آئیے گا۔ دراصل ڈائریکٹر صاحبہ حیدرآباد کے دورے پر گئی ہوئی ہیں۔ وہ شام تک واپس آجائیں گی۔ اور کل ہی آپ کا انٹرویو لیں گی۔ اس کے بعد ہی آپ کی ملازمت کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے گا۔"

واہ۔ تو اتنی دیر سے یہ مجھے الو بنا رہی تھی۔ یا تو کہہ رہی تھی کہ کل صبح فارم لے کر آجائیے گا۔ آپ کی ملازمت پکی ہوجائے گی۔ اس پر انٹرویو بھی اس طرح لیا جیسے مختارِ کل یہی ہو۔ اور اب کہہ رہی ہے کہ ڈائریکٹر صاحب جو فیصلہ کریں گے وہی ہوگا۔

یہی سب سوچ کر مارے غصے کے عنبر کا برا حال ہوگیا۔ اس نے فارم وہیں میز پر مس زاہدہ کے آگے رکھا اور اٹھ کر تیر کی طرح باہر نکل آئی۔ یوں بھی اس گودام نما دفتر کا ماحول اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس مونچھوں والے سے مس زاہدہ کا فری ہوکر بات کرنا اور بار بار پرس کھول کر آئینہ نکال کر اپنا منہ دیکھنا۔ اور پھر وہاں کا سناٹا۔ جانے کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑے۔ وہ بس اسٹاپ تک یہی سوچتی آئی تھی۔ اصل میں تو اپنے روٹ کی بس ایمپریس مارکیٹ میں ملتی تھی۔ اور ایمپریس مارکیٹ وہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس لیے اس نے راستے میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ بس اسٹاپ تک پیدل چل کر جانا تو بہت مشکل ہوگا اس لیے وہ رکشہ کر لے گی۔ وہ بھی ایک طرف کا کرایہ ہی تو ادا کرنا پڑے گا۔ اس لیے وکٹوریہ روڈ پر محبوب بخش کے سامنے آکر وہ رکشہ کے انتظار میں کھڑی ہوگئی تھی۔ وکٹوریہ روڈ پر تو ون وے ٹریفک تھا۔ مگر جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی اس سڑک کا رخ بوہری بازار کی طرف تھا۔ تبھی سامنے سے ایک خالی رکشہ گزرا۔ ٹریفک اور شور و غل چونکہ بہت زیادہ تھا اس لیے وہ زور زور سے ہاتھ ہلانے لگی تبھی ایک لمبی سی شیورلیٹ نے عین اس کے آگے بریک لگائے۔ تو اس کی جان ہی نکل کر رہ گئی۔

"ارے عنبر! تم۔ تم اس وقت یہاں۔" شیو میں بیٹھے ہوئے نے پوچھا۔ اور یہ ریحان تھا۔ جس کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر شاید اس کی بیوی فردوس بیٹھی تھی۔ جسے دیکھ کر جیسے اس کی باقی ماندہ جان بھی نکل کر رہ گئی۔ کہ ملامت کے ڈونگرے تھے۔

ذلت و خواری کا ڈھیر تھا۔

شرم اور شرمندگی کا لاوا تھا جو ریحان اور اس سے زیادہ اس کی نو بیاہتا بیوی کو دیکھ کر ایک دم ہی اس پر برس پڑا تھا۔ اور وہ یوں کھڑی تھی جیسے پہچان لینے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی ہو۔

"بھئی اتنی جلدی بھول گئیں کیا۔ کمال ہے۔ معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ خفا ہو۔" ریحان نے اس کے خالی خالی نظروں سے اپنی طرف دیکھنے پر ہنس کر کہا۔ اور پھر اپنی بیوی سے بولا۔

"دوسی۔ شی از عنبر۔ مائی فرسٹ کزن۔"

"اچھا تو یہ عنبر ہیں۔ آئی سی۔" فردوس نے بڑے جتانے والے انداز میں کہا اور پھر ریحان سے آہستہ سے کچھ کہہ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"بھئی، کیا گھر سے آرہی ہو یا گھر جا رہی ہو۔ خیر جہاں بھی جانا چاہ رہی ہو آؤ کار میں بیٹھو میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔" ریحان نے پھر کہا۔ بلکہ اسے ڈراپ کرنے کی پیش کش کی۔ تب ایک دم ہی جیسے اسے ہوش آگیا۔

"نہیں نہیں تھینکس اے لوٹ۔ میں عذیر کے سلیبس کے سلسلے میں آئی ہوں وہ وہاں سامنے گیا ہے۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" اس نے جان کر انگریزی میں کہا۔

"اوہ اب چلو بھی ڈارلنگ۔ ابھی مجھے شبی کے لیے گفٹ بھی لینا ہے۔" ریحان کے کچھ کہنے سے پہلے فردوس بڑی بیزاری سے بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اور تو سب خیریت ہے نا۔" ریحان نے چلنے کے لیے پر تولتے ہوئے کہا۔

"ہاں سب ٹھیک ٹھاک ہی ہیں۔" اس نے بھی نہایت بیزاری سے جواب دیا۔ تو ریحان نے اوکے بائی کہہ کر گاڑی آگے بڑھا لی۔

اور وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ کر وکٹوریہ روڈ والے چوراہے پر آکھڑی ہوئی جہاں سے کچھ ہی دیر بعد اسے رکشہ مل گئی۔ مگر رکشہ میں بیٹھ کر وہ بھی رکشہ والے کے استفسار پر کہ کہاں چلنا ہے اس نے تین ہٹی کہہ دیا تھا لیکن یہ نہیں دیکھا تھا کہ میٹر گرا ہوا بھی ہے یا نہیں۔ یا وہ کون سے راستے سے اسے تین ہٹی لے جا رہا ہے۔ اور کس قدر تیز رفتاری میں رکشہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھنگا رہا ہے۔ اے گزر گیا ہے۔ کون سی سڑک آئی ہے۔ کتنا ٹریفک چل رہا ہے۔ اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کسی بات کا بھی احساس نہیں تھا۔ کہ اس کے دل پر تو ایک قیامت سی گزر رہی تھی۔ کہ ایک تو ریحان کی بیوی کے سامنے وہ پھٹے پرانے جوتوں کی طرح سواری کے انتظار میں کھڑا ہونا۔ وہ بھی چادر میں لپٹی۔ پسینوں میں عرق۔ گویا حلیہ سے لے کر لباس بھی معمولی سا ہی تھا۔ اور سیل میں سے خریدی ہوئی چپلیں۔

اف ندامت سی ندامت تھی۔

جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس پر سب سے بڑھ کر ریحان سے یوں آمنا سامنا مڈبھیڑ ہو جانا۔ اور اس کے برابر اگلی سیٹ پر اس کی بیوی کا موجود ہونا۔ (کہ اس کے خیال میں وہ جگہ تو اس کے لیے مختص تھی)۔ اس کے لیے ناقابل برداشت ہی تھا۔ اف یوں لگ رہا تھا جیسے مندمل ہوتے زخم ایک دم سے کھل گئے ہوں۔ اور ان سے اس کی ناتمام خواہشوں کا لہو بڑی تیزی سے بہہ نکلا ہو۔ اف ریحان۔ اس کا ریحان۔ جو آج بھی اسے اتنا ہی عزیز تھا۔ اپنی تمام تر جفاؤں اور بے وفائی کے باوجود آج بھی اس کا ہی تھا۔ یہ حقیقت آج اس پر واشگاف ہوئی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روئے مگر آنسو جیسے دل سے بہتے لہو میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ دل میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اور جلن سی آنکھوں میں سوزش سی ہو رہی تھی۔ تین ہٹی کے پل پر پہنچ کر جب رکشہ والے نے اس سے پوچھا کہ کہاں اترنا ہے تب ہی وہ اپنی اس کرب زدہ کیفیت سے باہر نکلی۔ اور اسے اپنی گلی کا پتا بتایا۔ اور جب وہ گھر پہنچی تو پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اور چہرہ ایسا دھواں دھواں۔ جیسے انٹرویو دے کر نہیں بلکہ اپنی کسی عزیز ہستی کی آخری رسومات میں شرکت کر کے آئی ہو۔

دروازہ چھوٹی نے کھولا تھا۔ جو پہلے سے دانت نکالے کھڑی تھی۔ مگر بہن کی اتری اتری اور بے رونق سی شکل دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی اور اس سے پوچھا۔

"آپا! خیریت تو ہے یہ آپ کو کیا ہوا آپا" بس اس کا اتنا کہنا تھا کہ وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اسے اس بری طرح روتے دیکھ کر خورشید جہاں کی تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک دم ہی ہزاروں وسوسے ان کے دل میں کلبلانے لگے۔ خدشات کی یلغار نے انہیں بے اوسان سا کر دیا۔

"اے ہے خدا خیر کرے۔ ارے کیا ہو گیا تجھے عنبر۔ کیا کہیں چوٹ ووٹ لگ گئی۔ یا" اور اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکیں کہ زبان نے نہیں بلکہ غیرت نے اجازت ہی نہیں دی۔ اسی اثنا میں عنبر کو بھی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹی کو چھوڑ کر ماں سے لپٹ گئی اور رو رو کر کہنے لگی۔

"امی، میں بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جبھی پتا نہیں کہاں سے ریحان آ گئے۔ ان کی بیوی بھی ان کے ساتھ کار میں بیٹھی تھی امی۔ امی ریحان سے اتنی شرم آئی کہ جی چاہا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔"

اور خورشید جہاں کو یوں لگا جیسے انہیں تپتی ہوئی انگارے اگلتی دھوپ میں سے نکال کر کسی نے ٹھنڈک میں پہنچا دیا ہو۔

"اوہ آپا آپ نے تو میری جان ہی نکال دی ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ" چھوٹی نے بھی اطمینان کا سانس لے کر کہنا چاہا تو ماں نے اسے گھور کر دیکھا۔ اور وہ ڈر کر چپ ہو گئی۔

"اے نوج تم نے ریحان کی کوئی گدھی چرائی ہے۔ جو اللہ نہ کرے زمین میں سما جانا چاہ رہی تھیں۔ تم تو واقعی باؤلی ہو پوری۔"

"نہیں امی۔! آپ کو نہیں معلوم کتنی شرمندہ ہوئی تھی میں اور وہ۔ وہ۔ اس کی بیوی کو اس کے پاس بیٹھے دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے قدرت نے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ امی کیا وہ جگہ میری نہیں تھی۔ میرے لیے نہیں تھی۔ امی خدا نے ہمیں اتنا غریب کیوں پیدا کیا تھا۔ کیا ضرورت تھی ہمیں پیدا کرنے کی۔ ہم تو زمین کے لیے ایک بوجھ ہی ثابت ہوئے ہیں امی۔ امی سچ اب مجھے کچھ اور ہی کرنا پڑے گا" عنبر کے آنسو اور بھی شدت سے بہنے لگے۔

"اے اور کیا کر لو گی تم۔ کوئی قسمت سے لڑا جا سکتا ہے بچی۔ البتہ خدا سے امید رکھو تو اچھی ہی رکھو۔ وہ بڑا دیالو ہے، نوازنے پر آئے گا تو یہ برا وقت تم کو بھول کر بھی یاد نہیں آئے گا۔" ماں نے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

"چھوڑیں امی! یہ ساری طفل تسلیاں امی۔ خدا کو اگر نوازنا ہوتا تو وہ ایسے برے حالات میں کیوں پیدا کرتا۔" عنبر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"مایوسی گناہ ہے عنبر۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہاری اپنی باتوں کو خدا ناپسند کرتا ہو۔ اور اپنی ہی باتوں کی گرفت ہو جاتی ہو۔ خیر چلو جا کر منہ دھو لو۔ بلکہ نہا لو۔ یوں بھی پسینوں میں شرابور ہو رہی ہو۔" ماں نے یوں کہا جیسے اسے بہلانا چاہ رہی ہوں۔

بہن کے المیے پر چھوٹی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ اور صورت حال بھی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ دونوں ماں بیٹیاں یہ بھول ہی گئیں کہ وہ اس وقت انٹرویو دینے گئی تھی۔ مگر بعد میں عنبر نے خود ہی بتا دیا کہ چونکہ وہ لوگ صبح نو بجے سے رات کے آٹھ بجے تک اس سے کام لیں گے اس لیے اس نے وہاں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ تو ماں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا کیونکہ آٹھ بجے وہاں سے چھوٹتیں تو نو ساڑھے نو بجے رات کو ہی واپس لوٹتیں۔ وہ بھی تنہا۔ اے ہاں پھٹ پڑے وہ سونا کہ جس سے ٹوٹے کان۔ اچھا ہی ہوا جو ان لوگوں کے منہ پر مار آئیں ان کی نوکری۔"

"خیر آپا یہاں کام نہ بنا تو کہیں اور بن جائے گا۔ اب آخر بیٹھے بٹھائے یہ انٹرویو لیٹر بھی تو آ گیا تھا نا آپ کا اس طرح کسی اور جگہ سے بھی آ جائے گا۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر تو نہیں۔" چھوٹی نے بھی اسے تسلی دی۔

پھر دو تین روز تو اسے خود کو سنبھالنے میں لگے کہ ریحان نے یکایک نازل ہو کر بڑی گہری چوٹ دی تھی اسے۔ حالات اگر ٹھیک ٹھاک ہوتے تو شاید اسے خود کو سنبھالنے میں لمبا عرصہ لگتا مگر حالات تو دن بدن بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ عذیر کے سالانہ امتحانات قریب آ گئے تھے۔ اور بورڈ آف ایجوکیشن میں رجسٹریشن کے ساتھ ساتھ سالانہ امتحانوں کی فیس بھی بھروانی تھی۔ اور سعد کا احسان لینا اسے بالکل گوارا نہ تھا۔ اس نے عذیر کو سختی سے ممانعت کر دی تھی کہ کبھی بھول کر بھی سعد کو اس مسئلے سے آگاہ نہ کرے نہ اس کے پاس جائے۔ سعد بھی اس روز کے بعد سے نہیں آیا تھا۔ یہ دوسرا ہفتہ چل رہا تھا۔ اور خورشید جہاں کا دھیان برابر اس کی طرف لگا ہوا تھا۔ بیٹی کو اس معاملے میں جتنا کہنا چاہیے تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ کہہ چکی تھیں۔ بات ہی کچھ اس بری طرح بگڑ گئی تھی کہ انہوں نے اسے بلانے کے لیے عذیر کو بھی نہیں بھیجا تھا۔ کہ وہ تو اس سے کوئی اور ہی امید لگائے بیٹھی تھیں۔ گو اتنی پر امید بھی نہیں تھیں۔ کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ سعد کی والدہ اپنی ضد سے باز آ جائیں گی۔ یا اپنی بھتیجی فوزیہ کی شادی سعد سے نہیں کریں گی۔ اس کے باوجود بھی سعد کی بڑے وثوق اور دعوے سے کہی اس بات نے کہ وہ کسی قیمت پر بھی فوزیہ سے شادی نہیں کرے گا خواہ ساری عمر اسے کنوارا ہی رہنا پڑے اور اگر کبھی شادی بھی کرے گا تو اپنی پسند سے کرے گا اور ماں کی اجازت سے ہی کرے گا۔ انہیں تھوڑی آس دلا رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب عنبر نے رو رو کر یہ بتایا کہ اسے ریحان ملا تھا۔ اور یہ بھی احساس دلایا کہ اسے ریحان سے اب بھی محبت ہے تو انہوں نے بھی ریحان کی بے وفائی اور خود غرضی کو جتا کر عنبر کو احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ

وہ تو اپنی بیوی کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔ یاد رکھنا تو کجا کبھی بھول کر بھی اس نے تمہاری بات نہیں پوچھی بلکہ تمہیں کتنی بے رحمی سے ٹھکرا دیا۔ پرانی نسبت تو کیا سگے اور خونی رشتے کا بھی خیال نہیں کیا۔ لہٰذا تم بھی اسے بھول جاؤ۔ تمہارے آگے بھی ایک وسیع دنیا بکھری پڑی ہے۔ ایک طویل مستقبل ہے اور تمہاری قسمت بھی منٹوں میں بدل سکتی ہے۔ اے ہاں اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ تمہیں ریحان سے بھی کہیں اچھا بر مل سکتا ہے۔ اس لیے تم

اپنی دنیا میں مگن رہا کرو۔ ماں گھر میں بیٹھنے والی۔ قدامت پرست۔ روایات کی پابند اور ان پڑھ خاتون تھیں (انہوں نے کل پانچ جماعتوں تک ہی پڑھا تھا) پھر بھی دنیا کے سرد و گرم نے انہیں نہایت دانا بنا دیا تھا۔ وہ جو کچھ کہتیں اس بات میں وزن ہوتا تھا۔ نصیحت ہوتی تھی۔

ان کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات بول رہے ہوتے تھے۔

یہی وجہ تھی ماں کی بعض باتیں عنبر کے دل کو ضرور لگتی تھیں اور کبھی کبھی وہ ان کی باتوں سے متاثر بھی ہو جاتی تھی۔ اس نے بھی سوچا امی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ ریحان اپنی دنیا میں مگن ہے۔ وہ واقعی اپنی بیوی کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔ کیسی عزا رہی تھی اس کی بیوی اس پر جب وہ مجھ سے بات کر رہا تھا۔ اور کیسا ڈرا ڈرا سا بیٹھا تھا اس سے کہ دروازہ کھول کر باہر اترنے کی جرأت بھی نہیں ہوئی اس کے سامنے اور میرے انکار پر بیوی نے کہا تو فوراً ہی اپنی گاڑی آگے بڑھا لی۔ مجھے واقعی اسے بھلا دینا چاہیے۔ مگر۔ مگر میں اپنے دل کا کیا کروں جو کسی طرح اس کے خیال سے باز نہیں آتا۔ بس یہی سب سوچ کر تو اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ اپنے دل کی بات کبھی نہیں ملنے گی اور ریحان کے ہر خیال کو اپنے دل سے نکال پھینکے گی کہ یوں بھی اس کے حالات کچھ ایسے ہی دگرگوں ہو گئے تھے ریحان کا خیال اسے کم ہی آتا تھا۔ اصل میں تو یہ عشق، محبت، جذبات وغیرہ یہ سب پیٹ بھروں کے ہی حصے میں آتے ہیں۔ خالی پیٹ اور نادار لوگ جن کے لیے اپنا پیٹ بھرنا اور عزت سے رہنا جہاد زندگانی سے کم نہیں ہوتا صرف احساسات ہی رقم کیے جاتے ہیں۔ باقی تو نام اللہ کا ہی ہوتا ہے۔

اس روز شعبان کی ستائیس تاریخ تھی اور عیسوی مہینے کا ادھواڑہ۔ اور تینوں ہی ماں بیٹیاں اپنے اپنے تئیں فکر مند ہو رہی تھیں۔ کیونکہ اگر عیسوی مہینے کی شروع تاریخیں بھی ہوتیں تو رمضان المبارک کے لیے کچھ تو تیاری کر ہی لی جاتی مگر تو تینوں کا ہی ہاتھ خالی تھا۔ اس مرتبہ کچھ ایسی ساڑھ ستی آئی تھی کہ کوشش کے باوجود گزشتہ چند ماہ سے چھوٹی بھی کچھ نہیں بچا سکی تھی یعنی وہ جو چند ماہ بیشتر اس نے تھوڑے پیسے جمع کر کے دو سو روپے کا راشن منگوایا تھا اس کے بعد بھی اس نے کوشش تو کی تھی کہ وہ پھر کچھ رقم پس انداز کر سکے لیکن اس کے جمع شدہ سارے پیسے اس کے تعلیمی اخراجات میں صرف ہو گئے تھے اور پھر اس بے چاری کی کمائی ہی کتنی تھی۔

اس کے بہت کہنے سننے پر روشن کی ماں نے ٹیوشن کے سو روپے کر دیے تھے جن میں سے ساٹھ روپے وہ ماں کو دینے لگی تھی اور چالیس روپے خود رکھتی تھی۔ کیونکہ وہ کالج آنے اور جانے کا کرایہ پہلے کی طرح ماں کے ذمے نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس کے کالج کی فیس تو عنبر نے شروع ہی سے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اور جب سے اس نے کالج آنے اور جانے کا کرایہ اپنے پاس سے دینا شروع کیا تھا اس کے پاس ایک پیسہ نہیں بچتا تھا۔

ادھر خورشید جہاں کے ہاتھ میں گھر کے کرائے سمیت پنشن کی جو رقم آتی تھی وہ کل ملا کر پانچ سو بنتی تھی جس میں سے سو روپے وہ عذیر کی فیس اور بس کے کرائے کے لیے رکھتی تھیں باقی رقم سے وہ گھر کے اخراجات پورے کرتی تھیں جن میں بجلی کا بل بھی شامل ہوتا تھا۔ پانی کا بل تو ہر چھٹے مہینے اکٹھا ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور اب کی مرتبہ پرچون کی دکان سے جو سودا ادھار لیا تھا اس کا بل سو سے اوپر ہو گیا تھا جو انہوں نے پانچ سو کی رقم ہاتھ میں آتے ہی ادا کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ چھوٹی کے دیے ہوئے ساٹھ روپے ماہوار میں سے جو تھوڑی سی رقم جمع کی تھی وہ بھی سب کی سب گھریلو اخراجات میں صرف ہو گئی تھی۔ اب تو اتنے پیسے بھی نہیں رہے تھے کہ گھر کے لیے کچھ سودا سلف ہی منگوا لیتیں۔ اس پر رمضان المبارک شروع ہونے میں دو تین روز ہی رہ گئے تھے۔ پرچون کی دکان سے پہلے ہی پچھلے ہفتے کافی سودا ادھار لے چکی تھیں۔ اور اب مزید کچھ لینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اور ایک بار پھر عنبر سوچ رہی تھی کہ اس نے چونکہ گھر آئی نعمت کو ٹھکرایا ہے یعنی پانچ ہزار کی نوکری کو لات مار کر خدا کی ناشکری کی ہے اس لیے ادھر تو اکٹھی دو ٹیوشنیں چھوٹ گئیں اور ادھر یہ فاقوں کی نوبت آ گئی ہے۔ مگر وہ پانچ ہزار کی ملازمت کم از کم اس کے نزدیک تو ایسی تھی جیسے کوئی مدفون خزانہ جس پر ہاتھ ڈالو تو فوراً ہی سانپ ڈس لیں۔ ہزار ناتجربہ کار سہی لیکن پڑھی لکھی ہوشمند اور نزاکتوں کو سمجھنے والی لڑکی تھی۔ یوں بھی تعلیم یافتہ تھی اور پھر اس کے حالات نے اور سب سے بڑھ کر ماں کی ہر وقت کی روک ٹوک اور ناصحانہ گفتگو نے اسے محتاط ہی نہیں بنا دیا تھا بلکہ بہت سی ایسی باتوں کو سمجھنے کا شعور دے دیا تھا جن سے کبھی اس کا پالا تو نہیں پڑا تھا مگر

ضرور آتی تھیں۔

خورشید جہاں بڑی صابر اور شاکر خاتون تھیں۔ وہ کبھی قسمت یا حالات کا گلہ نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ ہر تکلیف اور پریشانی کو اپنا مقدر سمجھ کر سہہ لیتی تھیں۔ دوسرے معنوں میں انہوں نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر رکھا تھا۔ لیکن ہزار ضبط اور منع کرنے کے باوجود دونوں بیٹیاں ناشکری کی مرتکب ہو ہی جاتی تھیں۔

کہ وہ جوان تھیں۔ وقت کی راہ رو تھیں۔ ان کا نفس آرام اور آسائش مانگتا تھا۔ پیٹ بھر کے کھانے اور موج اڑانے کا خواہاں تھا۔ زندگی کی دوڑ میں انہیں سب سے آگے دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر حالات کی ستمگری انہیں پیچھے دھکیلنے پر تلی ہوئی تھی۔ جس قدر وہ خوب سے خوب تر کی خواہش کرتیں حالات اسی قدر تنزل پذیر ہوتے چلے جاتے۔

پھر بھلا۔ عنبر جیسی پاکباز اور روایات کی پابند لڑکی تن تنہا اپنے بے داغ دامن کو آلودہ کیے بغیر کس طرح اور کیوں کر اپنا اسٹینس اونچا کر سکتی تھی کہ عالیہ اور رابعہ تایا زاد بہنوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ مگر عنبر پر تو گویا جنون کی طرح یہ دھن سوار تھی کہ وہ سب کو کچھ بن کر دکھائے۔ چنانچہ ریحان سے اچانک اور بہت غیر متوقع مڈبھیڑ ہو جانے کے بعد کئی بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ غزل کی دبی ہوئی آفر کو قبول کر لے۔ لیکن ہر ایسی سوچ کے ساتھ ہی انجانے سے اندیشے اندر ہی اندر لرزا کر رکھ دیتے تھے۔

اس روز جب شعبان کی انتیسویں تاریخ تھی اور کیا عوام اور کیا خواص سب ہی قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ اگر آج چاند دکھائی دے گیا تو کل سے رمضان المبارک شروع ہو جائیں گے یا کل کا پہلا روزہ ہو گا۔ اور اگر نہ دکھائی دے سکا یا دکھائی دیا تو پرسوں کا پہلا روزہ تو یقینی ہو گا ہی۔ یوں بھی کراچی میں رمضان المبارک اور عید کا چاند قسمت ہی سے نظر آتا ہے۔ کیونکہ جس روز چاند رات ہوتی ہے اس روز مغربی افق پر سرمئی اور کالے بادل دن ڈوبنے سے قبل ہی کچھ ایسے ڈیرے جما لیتے ہیں کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود انتیس کا چاند کہیں نظر نہیں آتا۔ اور پھر رویت ہلال والوں کو شہادتیں جمع کرنے کی زحمت اٹھا کر چاند کے دکھائی دینے یا نہ دینے کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی یہ اعلان اتنی تاخیر سے کیا جاتا ہے کہ نماز کے پابند لوگوں کو نشتم پشتم بلا کر تراویح کے لیے صفیں جمانی پڑتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی سحری کی تیاری بھی کرنی پڑتی ہے۔

تو اس روز بھی شعبان المکرم کی انتیس تاریخ تھی اور عذیر کو اسکول جانے کا کرایہ دینے کے لیے تینوں ماں بیٹیوں نے اپنے بچے کھچے پیسے جمع کر دیے تھے اور برآمدے میں بیٹھی آپس میں یہی باتیں کر رہی تھیں کہ اگر کل کا پہلا روزہ ہوا تو پھر سحری کا کیا بنے گا جب کہ گھر میں کسی کے پاس ایک دھیلا بھی نہیں تھا۔

”اللہ مالک ہے بیٹی وہی کوئی بندوبست کرے گا۔ کیونکہ بھوکا تو وہ کسی کو رکھتا ہی نہیں ہے۔“ خورشید جہاں نے اندر ہی اندر اس بات پر فکر مند ہونے کے باوجود گویا یہ کہہ کر انہیں دلاسا دیا تھا۔

”جی ہاں امی۔ کل رات بھی فاقہ تھا اور صبح سے ناشتا تک نصیب نہیں ہوا۔ امی وہ کوئی اور ہی بندے ہوتے ہوں گے جنہیں وہ بھوکا نہیں رکھتا۔ یہاں تو دو پہر کے کھانے کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں۔“ چھوٹی ماں کی بات پر تنک کر بولی۔

”خبردار چھوٹی۔ اپنی زبان کو روک کر بات کیا کرو۔ یہ کفر کے کلمے بکنے اچھے نہیں ہوتے۔ نہ معلوم کس بات کی گرفت ہو جائے۔“ انہوں نے فوراً ہی چھوٹی کو جھڑکا۔

”امی! کیا اس سے بھی زیادہ گرفت ہو سکتی ہے جتنی اب تک ہوتی آئی ہے؟“ عنبر نے مسکرا کر کہا۔

”دیکھو بچی میں تو یہ جانتی ہوں کہ جس کی قسمت میں جتنا کچھ لکھا ہوتا ہے وہی اسے ملتا بھی ہے۔ اور تم خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہو۔ ورنہ اگر کسی اسکول میں معلمہ کی ملازمت کر لیتیں تو آج تمہیں قسمت کا گلہ نہ کرنا پڑتا۔“ ماں نے بات تو باون تولے پاؤ رتی کی کہی تھی یعنی سولہ آنے درست۔ لیکن اب اس کو کیا کیا جاتا کہ عنبر کی سمجھ میں یہ بات آتی تو نہیں تھی۔ البتہ چھوٹی جو شروع ہی سے اسے یہ مشورہ دیتی چلی آ رہی تھی کہ وہ جب تک کوئی اچھی ملازمت نہ ملے تو کسی اسکول میں ملازمت کر لے۔ بلکہ اس نے تو اپنے کالج میں بھی آفس ورک کے لیے جو اسامی خالی ہوئی تھی اور اٹھارہ سو تھی اس کے لیے بھی عنبر سے کتنا اصرار کیا تھا۔ لیکن عنبر نے الٹا اسے ہی دس سنا دی تھیں۔ اب جو ماں نے ایک درست بات کہی تو اس نے بھی ان کی بات کی تائید میں کہا۔

"جی ہاں امی! یہ آپ نے گویا میرے دل کی بات کہہ دی۔ کیونکہ میں نے تو آپا کو اس وقت ہی یہ مشورہ دیا تھا جب یہ نتیجہ آنے کے بعد اخباروں میں اشتہار دیکھ دیکھ کر جگہ جگہ درخواستیں بھیج رہی تھیں کہ یہ کسی اسکول میں کر لیں بلکہ کم از کم اس وقت ہی کر لیں جب تک انہیں کسی جگہ کوئی اچھی سروس نہ مل جائے۔ مگر۔"

"بس تم چپ ہی رہو چھوٹی۔ تم تو اپنے آپ کو امی سے بھی بڑا سمجھنے لگی ہو۔ جب کہ دماغ تمہارا چٹیا سے بھی چھوٹا ہے۔ امی۔ میں بتاتی ہوں آپ کو ساری بات۔ دیکھیں امی۔ اگر میں کہیں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کروں گی تو چونکہ یہ بڑی ملازمت ہو گی نا اس لیے اگر میرے پاس کسی بڑی ملازمت کی آفر آئی تو وہاں مجھے یہ بتانا ضروری ہو گا کہ میں کہاں کام کر رہی ہوں اور جب انہیں پتا چلے گا کہ میں بہت قلیل سے مشاہرے پر فلاں اسکول میں پڑھاتی رہی ہوں تو وہ لوگ بھی مجھے کم مشاہرہ دیں گے۔"

"مگر کیا ضروری ہے عنبر کہ تم کوئی بڑی نوکری ہی کرو۔ جو آسانی سے مل جائے بس اسی پر قناعت کر لو۔" ماں نے اس کی بات سن کر کہا۔

"جی ہاں۔ اور ویسے بھی آپا۔ آپ کو آخر کتنی تنخواہ کی ملازمت مطلوب ہے۔" چھوٹی نے ماں کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ تو نہیں مگر کم از کم ڈھائی ہزار تک کی ملازمت تو ہو۔" عنبر نے خلافِ توقع جھکے بغیر جواب دیا۔

"مگر بیٹی اتنی تنخواہ بھلا کون دے گا تمہیں۔ وہ بھی بلا کسی تجربے کے۔ یہ تمہارے ماموں جان ہیں نا یہ تو سولہ جماعتیں پڑھے ہوئے ہیں مگر ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے انہیں بھی کہیں جگہ سے جواب مل گیا تھا۔ میری مانو تو کسی چھوٹی ملازمت کر لو۔" ماں نے مشورہ دینے کے سے انداز میں کہا۔

"لیکن امی اتنی جلد تو اسکول میں بھی آپا کو ملازمت نہیں مل سکتی۔ کیونکہ اب ششماہی امتحان شروع ہونے والے ہیں اسکولوں میں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اتفاقاً کسی استانی کی جگہ خالی ہو جائے تو پھر۔" چھوٹی نے پھر دخل در معقولات کیا تو خورشید جہاں نے اس خیال سے کہ کہیں پھر دونوں بہنیں آپس میں الجھ نہ پڑیں چھوٹی سے پوچھا۔

"چھوٹی تم کہہ رہی تھیں کہ خشکی کا آٹا آدھی پیالی سے زیادہ بچا ہے اور تھوڑا سا گھی بھی موجود ہے۔ آدھا سیر چینی تو نے پرسوں منگائی ہے۔ جا کر تھوڑا سا آٹے کا حلوہ تو بنا لو۔"

"اے ہے امی۔ آٹے کا حلوہ بھی کوئی کھانے کے قابل ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے میٹھی لپسی کھا رہے ہوں۔" عنبر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"نہیں خیر، اب ایسا بھی بدمزہ نہیں ہوتا۔ اصل میں تو پکانے والے کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ کیسا پکاتا ہے۔ اچھا میں بنا کر کھلاتی ہوں تمہیں۔"

خورشید جہاں نے کہا اور جوتی پیر میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جب کہ عنبر چاہ رہی تھی کہ وہ انہیں باورچی خانے جانے ہی نہ دے تا کہ اتنی سخت گرمی میں چولہے کے آگے کھڑے ہو کر وہ حلوہ پکانے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر کہ ماں کو یقیناً بھوک لگ رہی ہو گی۔ ہماری وجہ سے وہ آدھا پیٹ بھی کھانا نہیں کھاتیں اور گزشتہ رات تو چکھنے کی حد تک ہی سب نے کھایا تھا۔ اس پر صبح کا ناشتا بھی میسر نہیں آیا تھا۔ یوں بھی گرتی ہوئی عمر میں انسان کو بھوک زیادہ لگتی ہے۔ کیونکہ طاقت پہنچانے کا ذریعہ صرف کھانا پینا ہی رہ جاتا ہے۔ جب کہ وہاں وہ بھی نصیب نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے باورچی خانے جانے سے ماں کو روکا نہیں۔ اور ابھی چھوٹی اور خورشید جہاں کو باورچی خانے میں گئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ بیٹھک کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازے سے کھٹکا نہیں لگا ہوا تھا۔ عذیر کچھ دیر پہلے اسکول گیا تھا تو اسے بھیڑ گیا تھا۔ اور عنبر ابھی اندر ہی سے کہتی کہ کھلا ہے، دروازے کو آہستہ سے کھول کر عالیہ اندر آ گئی اور اسے پکار کر کہا۔

"ارے عنبرین کہاں ہو بھئی، ذرا دیکھو تو کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔" اس کی آواز سنتے ہی عنبر کی نظر سب سے پہلے اپنے کپڑوں پر پڑی جو ملگجے سے ہو رہے تھے۔ چھوٹی بھی اس سمے باورچی خانے میں تھی کہ اسی کو بیٹھک میں بھیج دیتی۔ بیٹھک

بھی کپڑے تبدیل کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا کیونکہ وہ اگر تبدیل کرنے کی کوشش کرتی تو اسے بیٹھک سے گزر کر اپنے کمرے میں جانا پڑتا۔ مگر اس کے ساتھ غزل کو دیکھ کر کہ عالیہ کی آواز نے ہی اس کے اوسان خطا کر دیے تھے اسی لیے اس نے ڈھنگ سے اس کی بات بھی نہیں سُنی تھی کہ ذرا دیکھو تو کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔ اس کی وہی حالت ہو گئی جیسی عالیہ کے پہلی بار اور اچانک آنے پر ہوئی تھی۔ بلکہ کچھ اس سے بھی سوا۔ اور وہ ایسی حواس باختہ سی ہوئی کہ ان دونوں کی طرف دیکھنے کے بجائے بیٹھک کی حالت زار کو دیکھنے لگی جو عذیر اسکول جانے کی جلدی میں بنا کر گیا تھا۔ عالیہ تو فوراً سمجھ گئی کہ وہ احساس کمتری میں سرتاپا غرق ہو گئی ہے مگر غزل نے اس کی اس کیفیت کو اس کی بے رخی پر محمول کیا۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچی اور اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔

"کیوں بھئی عنبرین مجھے بھول گئیں کیا یا پھر مجھ سے بہت خفا ہیں؟" غزل کے لہجے میں لگاوٹ بھی تھی اور اپنائیت بھی۔ جب کہ عنبر کو عالیہ کا اس کو لے کر آنا سخت کھل رہا تھا بلکہ عالیہ کی اس حرکت پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ پھر بھی وہ غزل سے الگ ہو کر بولی۔

"نہیں خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ اصل میں یہ گھر چونکہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کو کہاں بٹھاؤں۔"

"اوہو بھئی، یہ تم ذرا ذرا سی بات میں اتنی کمپلیکسڈ کیوں ہو جاتی ہو۔ ورنہ ہم کوئی آسمان سے تو نہیں اترے ہیں۔ تمہاری طرح انسان ہی ہیں۔ اگر زمین پر بھی بٹھاؤ گی تو بلا تامل بیٹھ جائیں گے۔" عالیہ اس کے اس قدر کمپلیکسڈ ہو جانے پر چڑ کر بولی۔

"بھئی، اگر ہمارا آنا اتنا ہی ناگوار گزر رہا ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔" عالیہ نے یہ کہہ کر گویا اسے اس کی خاموشی پر ٹوکا۔ یوں بھی وہ اب تک کھڑی ہی تھی۔ عالیہ کے ٹوکنے پر اس نے فوراً خود کو سنبھال کر کہا۔

"ارے نہیں۔ تمہارا آنا مجھے کیوں ناگوار گزرنے لگا۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی تمہاری کیا خاطر کروں؟"

"بس یہ خاطر کرو کہ یہاں ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔" عالیہ کے بجائے غزل نے کہا اور پھر بڑی محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا تو وہ کھسیانی ہنسی ہنستی ہوئی دونوں کے بیچ میں اسی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آنٹی کہاں ہیں عنبرین اور وہ تمہاری چھوٹی بہن کیا کالج گئی ہوئی ہے؟" عالیہ نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں، وہ تو امی کے ساتھ کچن میں کچھ کام کر رہی ہے۔ ویسے چائے تو چل جائے گی نا؟" عنبر نے عالیہ کے سوال کا جواب دے کر پوچھا۔

"اونو تھینکس۔ چائے تو میں بالکل پیتی نہیں اور کولڈ ڈرنک بھی نہیں لوں گی۔ کیونکہ ابھی یہاں آنے سے پہلے ہم دونوں کافی پی کر آئے ہیں۔"

گفتگو کرنے کے دوران میں بھی وہ بار بار غزل کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ کیونکہ غزل آج روز والی حد درجے موڈ اور بیباک سی غزل سے یکسر مختلف نظر آ رہی تھی۔ اس نے بڑے قیمتی کپڑے کا سوٹ تو اسی طرح اسکن ٹائٹ فٹنگ کا پہن رکھا تھا مگر اس سوٹ پر سوٹ کے ہم رنگ بڑی ہی نفیس پیازی سلکن چادر پہن رکھی تھی۔ پہن ہی نہیں بلکہ اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی حتیٰ کہ اس نے اپنا سر بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ شاید فیشل کرا کے آئی تھی اس لیے چہرہ بھی بہت نکھرا نکھرا اور تر و تازہ سا لگ رہا تھا۔ اس پر ناک میں دمکتی ست رنگی ہیروں کی کیل، ہیرے کے ہی نازک سے آویزے اور نیکلس اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں بہت ساری ہیرے کی انگوٹھیاں اور ہر ایک ایک انگلی میں دو دو اور تین تین اس نے ٹھنسا رکھی تھیں۔ اور انہی سارے اہتمامات کے ساتھ جن میں سادگی بھی تھی اور شان بھی وہ بڑی پرکشش لگ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عنبر اسے اچانک اور غیر متوقع اپنے گھر میں دیکھ کر ایک دم ہی اسے پہچان نہیں سکی تھی اور اب اس سے تھوڑی مرعوب بھی ہو رہی تھی۔ اور اس کی آمد سے متجسس بھی۔

"اوہو بھئی، کہاں کھوئی ہوئی ہو عنبرین۔ سچ میں آج تمہارے گھر آ کر بڑی پچھتا رہی ہوں۔" عالیہ نے اس کی آنکھوں

کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے گویا اس کی محویت کو توڑا۔

"سنیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو میرا آنا ناگوار گزر رہا ہو۔" غزل نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ا...

"ارے نہیں غزل! مجھے آپ کا آنا بھلا کیسے ناگوار گزر سکتا ہے۔ اصل میں مجھے اس بات پر افسوس ہو رہا ہے... میں اب تک آپ کی کچھ خاطر بھی نہ کر سکی۔" یوں ہی عنبر نے ایک دم ہی خود کو شگفتہ بنانے کی کوشش میں کہا۔

"او۔ فار گاڈ سیک عنبرین۔ اب ان فضول باتوں پر افسوس کر کے ہمیں بور کرنے کی کوشش تو نہ کرو۔ جب ... دیا کہ ہم اس وقت کچھ کھانے یا پینے کے موڈ میں نہیں ہیں تو پھر یہ خواہ مخواہ کی فارملیٹی کیوں برت رہی ہو۔" عالیہ ... بیزاری سے بولی۔

"ہاں واقعی عنبرین! آپ نے خیال کر لیا، پوچھ لیا ہمارے لیے یہی بہت ہے۔ ویسے بھی ہم صرف آپ سے ... آئے ہیں۔ ہمیں کچھ کھانے سے مطلب ہے اور نہ کسی چیز سے۔" غزل بھی اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اگر گھر کی کسی چیز سے آپ کو کوئی مطلب نہیں بھی ہے تب بھی گھر کی ایک فرد آپ سے تعارف حاصل کرنے کی ... ہے۔" چھوٹی جس نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے غزل کی گفتگو سن لی تھی صوفے کے نزدیک آ کر بڑے شوخ ... شگفتہ انداز میں بولی تو غزل نے اس کے اچانک آ جانے پر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اونچی سی اٹھان۔ پیاری پیاری شکل۔ آنکھوں میں ایک شوخ سی چمک اور شگفتہ سا انداز۔ غزل یہ جانے پوچھے ... وہ کون ہے جلدی سے اٹھی اور بلا سوچے سمجھے اس سے لپٹ گئی۔

"لو بھئی، یہاں جان پہچان ہونے کے باوجود یونہی بیٹھے منہ تکتے رہ گئے اور تم ہو کہ تمہاری وہی مثل ہو گئی کہ جان ... بڑی خالہ سلام۔"

عالیہ نے ایک طرح غزل کے چھوٹی سے اس قدر بے دھڑک طریقے سے لپٹنے چمٹنے پر چوٹ کی تو چھوٹی اور عنبر دونوں ... کے مثال دینے پر ہنسنے لگیں۔ مگر غزل نے جو چھوٹی سے علیحدہ ہو کر اس کا بازو پکڑے سر تا پا اسے دیکھے جا رہی تھی بڑی ... سے کہا۔

"خیر، بڑی خالہ کو بھی بلا جانے بوجھے بہت پہلے سلام کر چکی ہوں۔ اور اگر ان کیوٹ سی محترمہ کو بھی بلا جانے ... سلام کر لیا ہے تو یہ ہیں ہی ایسی پیاری سے۔ ویسے بائی دا وے کیا نام ہے آپ کا؟"

"او مو بائی دا وے۔" چھوٹی نے شوخی سے آنکھیں گھما کر کہا۔

"خیر اگر بائی دا وے ہی پوچھنا چاہتی ہیں تو بقول آپ کے اس کیوٹ سی لڑکی کو فرحین کہتے ہیں۔ فرحین ...

"عرف چھوٹی۔" عالیہ نے برجستہ کہا تو عنبر ہنسنے لگی۔

"جی ہاں لیکن چھوٹی صرف عرفیت ہی نہیں دیٹ از مائی پیٹ نیم (یہ میرا پیار کا نام ہے) اور گھر میں بلکہ محلے ... میں اسی سے پہچانی جاتی ہوں۔" چھوٹی بھی پیچھے رہنے والوں میں سے نہ تھی پٹ سے بولی تو غزل زور زور سے ... لگی۔

"بھئی واہ ویری انٹرسٹنگ۔" اس نے ہنس لینے کے بعد کہا۔

عالیہ، عنبر اور غزل ایک ہی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ دیکھ کر کہ غزل چھوٹی کو بھی اسی صوفے پر بٹھانا چاہ ... ہے۔ عالیہ وہاں سے اٹھ کر سامنے رکھے صوفے پر جا بیٹھی اور عنبر کو بھی اشارے سے اپنے پاس بلا لیا تو عنبر بھی ... اس کے قریب ہی پڑے دوسرے صوفے پر جا بیٹھی اور جب غزل چھوٹی سے بات کرنے میں مصروف ہو گئی تو عالیہ ...

"تم نے برا تو مانا ہو گا کہ میں اس مصیبت کو اپنے ساتھ لاد کر کیوں لے آئی جب کہ میں خود بھی اسے یہاں لا... کے حق میں نہ تھی مگر یہ تو میری جان کو آ گئی تھی۔ اصل میں جب سے اس نے تمہیں دیکھا ہے تمہاری دیوانی ہو گئی ہے... کہ ہمیں ایسی ہی نیک، باحیا اور باکردار لڑکی کی تلاش تھی جو تمہاری صورت میں اسے مل گئی ہے۔ ویسے یاد ... میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی ضرور کر لینا۔ تو پھر کیا تم نے میری اس بات پر اب تک عمل بھی کیا ...

...نے غزل کو ساتھ لانے پر اس سے معذرت کر کے اسے اپنے آنے کا سبب بھی بتا دیا اور ساتھ کے ساتھ بڑی ترکیب سے ... کے فیصلے کے بارے میں استفسار بھی کر لیا۔ جب کہ حقیقت تو یہ تھی کہ عنبر کسی نتیجے پر پہنچی ہی نہیں تھی کہ ایک دل کہتا تھا کہ غزل کی پیش کش قبول کر لے کہ وہ بھی اپنی زبوں حالی کے پیش نظر، اور ایک دل کہتا تھا کہ ہرگز نہ کرے۔ کہ نہ کرنے میں ہی اس کی بہتری ہو گی کیونکہ اس پیش کش کو قبول کرنے کے بعد بہت سے خدشات بہت سی نزاکتیں اور دشواریاں اسے درپیش ہو سکتی تھیں۔

کہ سب سے پہلے تو اپنی عزت و آبرو پر بن جانے کا خطرہ لاحق تھا کیونکہ اس نے سنا تھا کہ فلم انڈسٹری میں کام کرنے والی کوئی بھی عورت اپنا دامن آلودہ ہونے سے نہیں بچا سکتی۔

دوسرے اپنی خاندانی شرافت اور حسب نسب کا بھی اسے بہت پاس تھا۔ اور تیسری اور سب سے اہم بات محلے داری کا معاملہ تھا کہ ان دونوں بہنوں کو محلے والے بہت نیک چلن اور ٹھوس کردار سمجھتے تھے اور غزل کی پیش کش کو قبول کرنے کے بعد جب روزانہ اسے اس کی قیمتی اور لمبی سی کار گھر سے لے جانے اور گھر تک چھوڑ دینے کے لیے آتی تو ایک دو روز کا معاملہ ہوتا تو کوئی توجہ بھی نہیں دیتا مگر روز روز ایک لگے بندھے معمول کے ساتھ جب یہی ہونے لگتا تو پہلے چہ میگوئیاں شروع ہوتیں۔ پھر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگتی اور اس کے بعد لعن طعن اور ملامتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ کہ آخر یہ روزانہ کس کی کار آتی ہے۔

جس میں بیٹھ کر یہ جوان جہان لڑکی تن تنہا ایک ڈرائیور کے ساتھ کہاں جاتی ہے۔ سارا دن کہاں گزارتی ہے جو شام واپس آتی ہے۔ اور اگر نوکری بھی کر رہی ہے تو ایسی کون سی نرالی نوکری ہے جس میں پیسہ مینہ کی طرح برس رہا ہے کہ یا تو پائی پائی کی محتاج تھی یا

یا یہ عالم کہ آج کچھ، کل کچھ اور پرسوں کچھ۔

اور سب سے بڑھ کر جس گھر میں جوان لڑکیاں ہوتی ہیں بالخصوص کنواری لڑکیاں تو ان کی تو حرکات و سکنات بلکہ ہر فعل پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اور جن کے سروں پر کوئی کمانے والا نہیں ہوتا ان کی تو گویا مصیبت ہی آجاتی ہے۔ وہ تو کچھ کریں یا نہ کریں لیکن محلے والوں کی نظروں میں مشتبہ ہی ہوتی ہیں۔

پہلے جب ریحان اپنی گاڑی میں آیا کرتا تھا تو یہی سوال ہوتا تھا کہ کون آیا تھا۔ ماں بتا دیتیں کہ جیٹھ کا لڑکا تھا جو عنبر کا منگیتر بھی ہے تو مشورہ دیا جاتا کہ بس اب جلدی سے بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دو۔ یوں بٹھائے رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ تایا ملنے آئے تو روشن کی اماں نے چھوٹی سے پوچھا۔

"آج تو تمہارے تایا آئے تھے نا؟"

"ہاں۔" چھوٹی نے کہا۔

"اے تو کیا عنبر کی شادی کی تاریخ پکی کرنے آئے تھے؟" اور اس سوال پر چھوٹی ٹسٹ پٹا سی گئی۔ کیونکہ نسبت تو کب کی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ تو گویا خیرات دینے آئے تھے۔

"پتا نہیں۔ میں تو اسکول گئی ہوئی تھی۔ یہ تو امی کو ہی معلوم ہوگا۔" چھوٹی نے بات بنائی کیونکہ ماں نے سختی سے ممانعت کر دی تھی کہ محلے والوں کے کان میں اس بات کی بھنک بھی نہ پڑنی چاہیے کہ عنبر کی نسبت توڑ دی گئی ہے۔ پھر جب گھر میں سعد کی آمد و رفت شروع ہوئی تھی تب بھی تو ان کو ایک ایک کے سامنے وضاحت کرنی پڑی تھی کہ وہ بھی ان کے جیٹھ کا لڑکا ہے اور دور کے رشتے سے ان کا بھی بھتیجا ہوتا ہے۔ اس کے گھر والے چونکہ ملتان میں اقامت پذیر ہیں اور اس نے کراچی میں اپنا کوئی کاروبار شروع کیا ہے۔ عذیر پڑھائی میں کمزور ہے اس لیے اسے پڑھانے کی غرض سے آتا ہے مگر اس اتنی وضاحت کے باوجود بھی محلے والے ان کے گھر اس کی آمد کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور اس بات پر خورشید جہاں ببانگِ دہل کہا کرتی تھیں۔

"بھئی اب میں محلے والوں کی وجہ سے اپنے رشتے داروں سے ناتا توڑ کر تو نہیں بیٹھ سکتی۔ جسے اس کا آنا برا لگتا ہے دو روٹیاں زیادہ کھا لیا کرے۔" پھر اس روز عالیہ آئی تو تب بھی سلیم کی اماں نے جو اپنے بیشتر کپڑے خورشید جہاں

سے سلواتی تھیں اور ہمیشہ سلائی کے کپڑے سلیم کے ہاتھ یا اپنے یہاں برتن دھونے والی اور صفائی ستھرائی کرنے والی ماسی کے ذریعے ان کے پاس بھجواتی تھیں بہ نفسِ نفیس خود ہی آموجود ہوئیں اور تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے خورشید جہاں سے پوچھا۔

"اے چھوٹی سی اماں، یہ آج تمہارے یہاں کون لڑکی آئی تھی۔ یہ وہی موٹر تھی نا جس میں عنبر کبھی کبھی کالج سے آیا کرتی تھی؟" اور خورشید جہاں ان کے اس قدر غیر معقول سوال پر جز بز ہو کر بولیں۔

"شکر اللہ کا کہ لڑکی ہی آئی تھی ورنہ کوئی اور آتا تو نہ معلوم تم کیا پوچھتیں سلیم کی اماں۔ یہ ایک ہی تو سہیلی تھی پورے کالج میں اس کی جو ہنگامے ہونے کی وجہ سے کبھی بس نہیں ملتی تھی تو بحفاظت اپنی کار میں بھجوا دیا کرتی تھی۔"

"اے تم تو برا مان گئیں چھوٹی کی اماں۔ ورنہ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ اے ہاں ایک ہی محلے میں رہتے ہیں نا۔ ایک دوسرے کی خبر گیری تو رکھنی ہی پڑتی ہے۔" سلیم کی ماں نے قدرے جھینپ کر کہا۔

"اے ایسی خبر گیری کو بھی سات سلام۔ کہ یوں محسوس ہوتا ہے موئے سی آئی ڈی والے ذرا ذرا سی بات پکڑنے کے لیے بٹھائے گئے ہوں میں بھی اس محلے میں رہتی ہوں تو کبھی کسی کی گھریلو باتوں پر نظر نہیں رکھتی۔" خورشید جہاں نے ترخ کر کہا۔

"اے تو ہم کون سی رکھتے ہیں۔ تمہاری جوان بیٹی نے اچھا خاصا لڑکیوں کا کالج چھوڑ کر لڑکوں کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ تب ہم نے کون سا اسے کچھ کہہ دیا کہ بھئی سب کا اپنا اپنا معاملہ ہوتا ہے اور وہ تو ہے ہی تھوڑی سی خود سر۔ شاید اس کے انہی گنوں کی وجہ سے تمہارے جیٹھ کے بیٹے نے کہیں اور بیاہ رچا لیا ہے۔" سلیم کی ماں کے منہ سے یہ آخری فقرہ سن کر خورشید جہاں دم بخود رہ گئیں۔

"مگر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ریحان نے کہیں اور بیاہ رچا لیا ہے۔" بڑے غیر ارادی طور پر ان کے منہ سے نکلا۔

"اے وہی مثل ہے کہ چاند چڑھتا ہے تو کل عالم دیکھتا ہے۔ اے ایسی باتیں کہیں چھپی رہ سکتی ہیں۔ اور مجھے تو تمہاری اس حلال خوری —— (بھنگن) شانتی نے بتایا تھا جو تمہارے گھر کا کوڑا اٹھانے آتی ہے۔"

اور سلیم کی ماں کی اس بات پر تو خورشید جہاں کو اس محاورے کی سچائی پر یقین کر لینا پڑا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

"اوہ بھئی، ایک ذرا سی بات پوچھی تھی اور تم ہو کہ پھر کسی غوطے میں چلی گئیں۔ کیا فیصلہ کرنا بہت دشوار ہو رہا ہے؟" عالیہ نے جو اس کے جواب کی بے چینی سے منتظر تھی اسے کسی گہری سوچ میں مستغرق دیکھ کر جھنجلا کر پوچھا۔ تو عنبر نے محلے داری کے چکر سے نکل کر قدرے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"فیصلہ کرنا تو بڑی بات میں نے تو ابھی کچھ سوچا بھی نہیں۔"

"دیکھو ٹالنے کی بات نہ کرو۔ ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ تم تو یوں بھی کھڑے کھڑے ڈیسیشن لینے کی عادی ہو۔ اور یہ بات میں عالیہ انعام تم سے پوچھ رہی ہے۔" "کوئی ہماشما نہیں۔" عالیہ یہی سمجھی کہ وہ اسے ٹالنا چاہ رہی ہے، اس لیے برا مان کر بولی۔

اصل میں اس سروس کے سلسلے میں، میں ایک فکس (مخمصے) میں پڑ گئی ہوں عالیہ۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے قبول کروں یا پھر انکار کر دوں۔ تم ہی مجھے کوئی اچھا سا مشورہ دے دو اس سلسلے میں۔" وہ سخت عاجز ہو کر بولی۔

"نہیں بھئی میں کوئی مشورہ دے کر ساری زندگی اپنے سر کوئی الزام نہیں لینا چاہتی۔ کیونکہ مجھے کیا معلوم کہ یہ سروس تمہیں سوٹ بھی کرے گی یا نہیں۔" عالیہ نے گویا کانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے مشورہ دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اپنا خیال تو ظاہر کر سکتی ہو نا۔ میرا مطلب ہے یہ تو کہہ سکتی ہو کہ تمہارے نزدیک میری اس سروس کی کیا حیثیت ہوگی یعنی یہ سروس میرے لیے کیسی رہے گی۔ آخر تو میری دوست ہو نا تم۔ اور تم نے ہی میرے لیے اس سروس کا بندوبست کیا ہے۔ پھر کیا اپنا خیال بھی ظاہر نہیں کر سکتیں؟" وہ واقعی سخت تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ اس نے اس معاملے میں اپنی عالیہ سے مدد چاہی۔

"لیکن جس چیز کے بارے میں مجھے کچھ معلوم ہی نہیں اس پر میں کیوں کر اظہارِ خیال کر سکتی ہوں۔ ویسے غزل تو یہ کہتی ہے کہ اس کا تعلق صرف شو بزنس سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کے بھائیوں نے دوسرے بھی کئی بزنس لگا رکھے ہیں۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ فلم ڈسٹری بیوٹر ہونے کے ساتھ یہ لوگ کار ڈیلرز بھی ہیں۔ انہوں نے کلفٹن میں ایک بڑا سا کار شو روم کھولا ہے

ان کی ایک ڈ واؤں کی فرم بھی ہے۔ بھئی کروڑپتی لوگ ہیں آخر۔ ایک بھائی اسٹیٹس میں ہے دوسرا کینیڈا میں اور دو بھائی ہیں اپنے وطن میں۔ ان دونوں نے یہاں ایک ساتھ کئی بزنس چلا رکھے ہیں مگر گل ریز خان جو سب سے بڑا بھائی ہے بہت ہی اسٹرکٹ قسم کا بندہ ہے۔ اس سے ان سارے بہن بھائیوں کی جان نکلتی ہے اور جس آفس میں تمہیں جگہ ملے گی اسے وہی سنبھالتا ہے۔ باقی اور کیا ہے یہ مجھے بالکل نہیں معلوم۔"

عالیہ نے بڑی تفصیل سے جو کچھ اسے معلوم تھا سب کا سب اس کے گوش گزار کر دیا۔ گو وہ بہت نیچی اور محتاط آواز میں عنبر سے بات کر رہی تھی مگر غزل کے کان اس کی باتوں پر ہی لگے ہوئے تھے۔ عالیہ خاموش ہوئی تو غزل نے شکایتی سے انداز میں چھوٹی سے کہا۔

"ذرا دیکھو تو فرحین یہ تمہاری آپا کتنی کٹھور ہیں۔ میں نے اپنی فرم میں کام کرنے کے لیے سارے الاؤنسز ملا کر تقریباً آٹھ ہزار کی آفر دی تھی مگر انہوں نے بڑی بے رحمی سے اسے بھی مسترد کر دیا۔ اب ذرا تم ہی سمجھاؤ نا انہیں۔" تو چھوٹی جیسے آٹھ ہزار کی آفر کا سن کر ایک دم ہی زمین و آسمان گھومتے نظر آئے تھے کچھ لمحے تو دم بخود سی بیٹھی رہی۔ پھر اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"لے۔ لیکن میں آپا کو کیسے کچھ سمجھا سکتی ہوں۔ کیونکہ وہ خود اپنا اچھا برا خوب سمجھ سکتی ہیں۔ میرے خیال میں تو انہوں نے مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ ویسے میں آپ کو کیا کہوں۔ میرا مطلب ہے آپ کا نام تو مجھے معلوم ہی نہیں۔" اصل میں کسی نے چھوٹی سے غزل کو متعارف نہیں کرایا تھا۔

"اب یہ تکلفات تو چھوڑو اور کام کی بات کرو۔ مجھے ابھی جا کر جمی کو لنچ بھی دینا ہے۔" عالیہ نے رسٹ واچ میں وقت دیکھتے ہوئے نہایت بیزاری سے غزل سے کہا۔

"اب میں کیا بات کروں۔ تم عنبرین کی سہیلی ہو۔ تم ہی ان سے بات کر لو۔ پلیز عالیہ یہ تمہاری بات سمجھ بھی جائیں گی۔"

غزل نے جواب میں کہا۔ عنبر سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ وہ عالیہ کے کچھ کہنے سے پہلے بولی۔

"اگر وہی سروس کی بات ہے تو میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ ـــ" تو عالیہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"بھئی، اس دن کی بات اس دن کے ساتھ گئی۔ اب تو یہ غزل تمہارے پاس اس لیے آئی ہے کہ تم سے کھل کر بات کر سکے۔"

"اچھا تو اب یہ کوئی نئی بات کہنا چاہ رہی ہیں۔" عنبر نے مسکرا کر پوچھا۔ اسی گفتگو کے دوران میں اپنا پرس کھول کر غزل نے سو سو کے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر اپنی گود میں رکھ لی تھی۔ عنبر کے استفسار پر اس نے جواب میں کہا۔

"دیکھیں عنبرین یہ نئی بات ہی ہے جو میں آپ سے کہنا چاہ رہی ہوں۔ آپ نے میری آفر کو ٹھکرا تو دیا ہے۔ پھر بھی میں آپ سے یہ کہوں گی کہ آپ صرف ایک ماہ ہماری فرم میں کام کر کے دیکھ لیں۔ اس کے بعد اگر کام آپ کو پسند آئے تو کرتی رہیں ورنہ چھوڑ دیں۔ ہمیں بالکل کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اس کے لیے میں یہ ایڈوانس رقم بھی لائی ہوں ـــ" غزل اپنی بات ختم کر کے کھڑی ہو گئی پھر نوٹوں کی گڈیاں ہاتھ میں لے کر عنبر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"لیجیے، یہ آٹھ ہزار کی رقم ہے جو میں آپ کو ایڈوانس دے رہی ہوں۔ اس کا آپ سے کوئی حساب لیا جائے گا نہ اس کے سلسلے میں کوئی لکھا پڑھی ہوگی۔ ہاں البتہ جب ہمارے یہاں کام کرنے پر راضی ہو جائیں گی تو آپ کی تنخواہ میں سے تھوڑا تھوڑا کر کے منہائی کر لی جائے گی۔ لیکن یہ بھی آپ کے کام پر منحصر ہوگا کہ اگر بہت اچھا ہوا تو یہ پوری رقم آپ کو گفٹ کر دی جائے گی۔" اتنا کہہ کر غزل نے نوٹوں کی وہ گڈی عنبر کی گود میں رکھ دی اور عنبر نے نوٹوں کی گڈی کو اس طرح گھبرا کر اپنی گود سے اٹھا کر عالیہ کی گود میں ڈالا جیسے وہ کوئی زہریلی شے ہو جو اسے ڈنک مار دے گی۔

"نہیں نہیں، میں اتنی ساری رقم کا کیا کروں گی۔ اور ـــ اور جب مجھے کام ہی نہیں کرنا تو پھر ایڈوانس کا کیا سوال؟" عنبر نے کہا۔

"نہیں نہیں عنبرین آپ یہ تو نہ کہیں بلکہ پلیز میری بات مان لیں۔ دیکھیں میں آپ کو مجبور تو نہیں کر رہی۔ میں تو آپ سے ریکویسٹ (درخواست) کر رہی ہوں کہ آپ ہماری کمپنی میں ٹمپریری طور پر ایک دو ماہ کام کر کے دیکھ لیں، تاکہ آپ کو اتنا اندازہ ہو جائے کہ کام کی نوعیت کیا ہے۔ اور یہ ایڈوانس کی رقم میں اس لیے دے رہی ہوں، کہ آپ کو

اپنا بھی کچھ خرچ چلانا ہوگا۔ پلیز عنبرین اس رقم کو میری طرف سے گفٹ سمجھ کر قبول کر لیں۔" غزل نے بڑے ملتجیانہ سے لہجے میں کہا۔

"بھئی رکھ لو نا عنبرین! اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تم نے کہا ہے کہ تم کچھ دن بعد سوچ کر جواب دو گی۔ تو اگر تمہارا فیصلہ منفی ہو تو یہ رقم اسے واپس لوٹا دینا۔" عالیہ نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دو تین روز بعد جب فیصلہ کروں اس وقت یہ پیسے لے لوں۔" عنبر نے مسکرا کر کہا۔ اصل میں اسے غزل کی یہ بھاری سی پیش کش (کہ اس کے نزدیک تو یہ آٹھ ہزار روپے کی رقم بھاری ہی تھی) کچھ عجیب سی لگ رہی تھی یا پھر دوسرے معنوں میں اس رقم کو اس کی غیور طبیعت قبول نہیں کر رہی تھی، اس لیے محض عالیہ کی بات رکھنے کو اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ ورنہ فیصلہ کرنے کی کوئی گنجائش دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کمال ہے عالی تم تو کہہ رہی تھیں کہ کراچی میں یہ عنبرین تمہاری واحد دوست ہیں اور تمہاری بات بہت مانتی ہیں مگر اس وقت تو یہ الٹا تمہیں شرمندہ کرنے پہ تلی ہوئی ہیں۔" اس کے انکار پر غزل برا مان کر بولی اور پھر چھوٹی سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔

"پلیز فرحین۔ تم ہی انہیں سمجھا دو۔ پتا نہیں یہ اتنا ڈر کیوں رہی ہیں جب کہ میں نے ـــ" تو چھوٹی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں خیر آپا ڈر تو نہیں رہیں البتہ ان کی مرضی نہیں ہوگی۔ پھر بھلا میں انہیں کیسے سمجھا سکتی ہوں۔"

"واہ تم ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ خیر، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ کیوں عالی کیا ارادہ ہے۔ کیا جمی کو آج لنچ نہیں دینا؟" غزل بگڑے بگڑے سے انداز میں بولی۔

"اوہو۔ ہاں واقعی اب تو بارہ بھی بج گئے۔ اس وقت تو کھانے سے پندرہ منٹ پہلے جمی کو دوا بھی دینی ہوتی ہے چلو جی بک اپ۔" عالیہ نے غزل کے احساس دلانے پر گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ اور کھڑے ہوتے میں نوٹوں کی گڈی پھر عنبر کی گود میں ڈال دی۔

"ارے نہیں عالیہ میرے خیال میں تو یہ رقم ان کی امانت سمجھ کر تم ہی اپنے پاس رکھ لو۔ مجھے اگر واقعی اس کی ضرورت پڑی تو میں تم سے لے لوں گی۔" عنبر نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے وہ گڈی عالیہ کو لوٹاتے ہوئے کہا۔

"توبہ عنبرین تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تم نے کبھی اتنی رقم دیکھی ہی نہ ہو۔ یا پھر ہم کہیں سے ڈاکہ ڈال کر لائے ہوں۔ ارے یہ آٹھ ہزار کی رقم تو اس کے لیے اسی روپوں کے برابر ہے۔ یہ تو ایک دن میں کھڑے کھڑے لینے اور خرچ کر دیتی ہے۔ تم بلا خوف و خطر اسے اپنے پاس رکھ لو۔ چاہو تو خرچ بھی کر لینا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" عالیہ نے بات کی ابتدا تو بڑے تیز لہجے میں کی تھی مگر اختتام ہنس کر کیا۔ اور عنبر پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اپنے گھر کی بدحالی دیکھ کر ایک بار پھر وہ بحر خجالت میں ڈبکیاں کھانے لگی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے سوچا کہ واقعی اس نے اس رقم کو اپنے لیے ایک مسئلہ بنا لیا ہے مگر بولی کچھ نہیں۔ اس وقت بھی نہیں جب عالیہ نے جھک کر نوٹوں کی گڈی کو صوفے پر رکھا۔

"اب چلو نا عالی۔ اب دیر ہو جانے پر مجھے دوش نہ دینا۔ تم خود ہی باتوں میں لگی ہوئی ہو۔" غزل نے پھولے ہوئے منہ کے ساتھ کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ برا مان گئی تھی۔ اس کی خفگی کو دور کرنے کی غرض سے آخر چھوٹی کو منانا ہی پڑا۔

"خیر، آپ جا رہی ہیں اور اب نہ معلوم کب ملاقات ہو یا نہ بھی ہو لیکن آپ کے لیے میں اپنی رائے محفوظ نہیں رکھوں گی بلکہ یہ کہوں گی کہ آپ سے مل کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اور آپ بہت ہی اچھی ہیں۔ ویری کیوٹ۔" اور غزل کو اس کی اس بات پر ہنسی آ گئی۔

"ارے نہیں۔ اب تو ہم ملتے رہیں گے۔ مائی سویٹ گرل۔ لیکن تم نے مجھے پسند کیا اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔"

"کیا بہت زیادہ کسر نفسی سے کام نہیں لے رہیں آپ۔ میری نظروں کو تو آپ اچھی لگ رہی ہیں، بلکہ بہت ہی اچھی۔" عنبر نے بھی اس خیال سے کہہ دیا کہ وہ اس کے گھر سے برا مان کر یا اس سے بددل ہو کر نہ جائے۔

"لو بھئی یہ بھی اچھی رہی یعنی اب تمہارے سامنے ہماری تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔ اچھا خیر اس وقت تو جلدی میں

ہوں، بعد میں تم دونوں سے نمٹ لوں گی۔"

عالیہ نے بھی ماحول کو خوشگوار بنانے کی غرض سے کہا تو چھوٹی اور عنبرین دونوں ہنسنے لگیں۔ پھر چلتے وقت بھی غزل نے دونوں بہنوں کو بڑی محبت سے گلے لگا لیا اور ان کی پیشانیاں چومیں۔ حتیٰ کہ خورشید جہاں کو سلام بھی کہلوایا اور ایک بار پھر عنبر سے ملازمت قبول کرنے کی درخواست کی اور ہنستی مسکراتی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔

"یہ تم نے خواہ مخواہ آٹھ ہزار کی رقم اس کے پاس کیوں چھوڑ دی۔ جب کہ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ ایک دو دن بعد وہ تمہیں یہ رقم واپس کر دے گی۔" عنبر کی گلی سے نکلتے ہی عالیہ نے کار ڈرائیو کرتی ہوئی غزل سے پوچھا تو غزل جو اپنی نئے ماڈل کی مرسیڈیز میں آئی تھی اور جس کے چہرے سے عجیب سے تاثرات ہویدا تھے، اپنے انہی تاثرات میں ایک گہری آبنوسی مسکراہٹ شامل کر کے اس نے کہا۔

"تم ان غریب لوگوں کی نیچر (فطرت) سے واقف نہیں ہو شاید۔ ان کی ویکنیس (کمزوری) صرف پیسہ ہی ہوتا ہے، جب کہ تم نے ان بہنوں کی حیثیت اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لی ہے۔ کہ کس قدر تباہ حال ہے۔ اور تم جو یہ کہتی ہو کہ یہ ان کا ذاتی مکان ہے تب بھی ان کی جیب بالکل خالی ہے۔ اتنی حیثیت بھی نہیں کہ گھر آئے مہمان کو کچھ کھلا پلا ہی سکیں۔ شاید تم نے نوٹ نہیں کیا کہ جب عنبرین کی والدہ نے اس سے کہا کہ تمہاری سہیلیاں تم سے ملنے آئی ہیں، ان کی کچھ خاطر کرو۔ تو عنبرین کا منہ کیسا اتر گیا تھا۔ اور پھر ماں بھی شرمندگی سے اندر جا کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس لیے نوٹوں کی یہ گڈی جو ان کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں، جب تک ان سب کی آنکھوں کے سامنے رہے گی عنبرین کو میری مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے میں زیادہ سوچ بچار سے کام نہیں لینا پڑے گا۔"

ادھر یہ دونوں یعنی عالیہ اور غزل کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں اور ادھر بیٹھک کا دروازہ بند کر کے چھوٹی اس صوفے کے پاس آ کھڑی ہوئی جس پر نوٹوں کی گڈی رکھی ہوئی تھی۔ اصل میں عنبر کو بڑی دیر سے غسل خانے جانے کی حاجت ہو رہی تھی جو نہی عالیہ اور غزل نے گھر سے باہر قدم نکالے وہ جلدی سے غسل خانے کی طرف دوڑ پڑی تھی اور نوٹوں کی گڈی صوفے پر ہی چھوڑ گئی تھی اس لیے چھوٹی کو تنہائی میں نوٹ گننے کا موقع مل گیا تھا۔ یوں بھی اس نے اتنے سارے نوٹ اپنی زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی اٹھائی اور جلدی جلدی نوٹ گننے لگی۔ تبھی عنبر بھی غسلخانے سے آ گئی اور اسے دیکھ کر چھوٹی نے قدرے سٹ پٹا کر کہا۔

"آپا۔ نوٹوں کی یہ گڈی تو سنبھال کر رکھیے۔ آپ تو اسے یہیں چھوڑ کر چلی گئیں۔"

"ہاں۔ چھوڑ گئی تھی تو اسے یہیں پڑا رہنے دو۔" عنبر نے بڑی بے دلی سے کہا۔

"یعنی آپ اس گڈی کو یہیں پڑا رہنے دیں گی۔ آخر کیا بات ہے آپا۔ آپ اتنے سارے پیسے اچانک مل جانے پر خوش ہونے کے بجائے اداس سی ہو رہی ہیں۔" چھوٹی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ تو اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے عنبر نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"اچھا لاؤ۔ یہ مجھے دے دو۔ خواہ مخواہ کی ذمہ داری ڈال گئی ہے یہ غزل مجھ پر ورنہ میں تو یہ پیسے لینے کی بالکل روادار نہیں تھی۔"

"مگر کیوں آپا۔ آخر کس وجہ سے۔" چھوٹی نے وہ رقم عنبر کو تھماتے ہوئے پوچھا

"بس میری مرضی۔ تم کون ہوتی ہو بار بار الٹے سیدھے سوال کرنے والی۔" عنبر نے بھبک کر کہا تو چھوٹی آزردہ، نادم سی باہر برآمدے میں چلی آئی۔ جہاں خورشید جہاں تخت پر بیٹھی جلدی جلدی سلائی کے لیے آیا ہوا ایک ڈیڑھ درجن کا کرتا ترپ رہی تھیں۔

اصل میں گزشتہ روز سے گھر میں کسی کے پاس ایک پیسہ نہیں رہا تھا اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر جو چونیاں اور اٹھنیاں جمع کی تھیں وہ عذیر کو کرائے کے لیے دے دی تھیں حالانکہ عذیر نے بس کا پاس بھی بنوا رکھا تھا مگر آدھا کرایہ تو دینا ہی ہوتا تھا۔ صرف دو تین پیڑوں کا آٹا بچا تھا اور تھوڑا سا گھی جسے جلدی جلدی گوندھ کر عنبر نے عذیر کے لیے دو پراٹھے ڈال دیے تھے۔ صبح کا ناشتا تو تھا ہی نہیں صرف دو تین چمچے چائے کی پتی کے پڑے تھے جن سے چائے بنا لی گئی تھی اور اسی میں سے ایک کپ عذیر کے لیے بچا لیا گیا تھا۔ صبح ہی سے نہیں گزشتہ روز سے سب کے پیٹ خالی تھے اور اب تو بھوک کے مارے

کلیجہ بیٹھا جا رہا تھا۔ تبھی تو وہ چھوٹی کے یہ پوچھنے پر کہ تھوڑا سا خشکی کا آٹا بچ گیا ہے کیا وہ اس کا حلوہ بنا لے۔ خود ہی حلوہ بنانے اٹھی تھیں۔ ان کی روایات میں یہ شامل نہ تھا کہ کوئی مہمان گھر پر آئے اور وہ اسے کھلائے پلائے بغیر خالی خولی رخصت کر دیں۔ مگر اس وقت اپنے حالات کے ہاتھوں وہ اتنی مجبور ہو گئی تھیں کہ عالیہ اور غزل کی تھوڑی سی بھی خاطر نہیں کر سکی تھیں۔ ادھر دن کے بارہ بھی بج چکے تھے اور اب بھوک برداشت سے باہر ہوتی لگ رہی تھی۔ اور اسی لیے وہ جلدی جلدی کرتا سینے بیٹھ گئی تھیں کہ اسے مکمل کر کے ڈیڑھ درجن سے سلائی کے پیسے منگوا لیں تاکہ پورا نہیں تو آدھا پیٹ بھرنے کے لیے بازار سے کچھ منگوا لیں کہ چھوٹی نے اندر سے برآمد ہو کر پوچھا۔

"امی اس وقت آپ سلائی لے کر بیٹھی ہیں۔ کیا آپ نے حلوہ بھی کھایا۔"

"ہاں کھایا ہے۔ تبھی تو ہاتھ پیروں میں تھوڑا سا دم آیا ہے۔ باقی تم دونوں کے لیے نعمت خانے میں رکھ دیا ہے کیا کروں بچی۔ اگر یہی ڈھنگ سے پکایا ہوتا تو دونوں مہمانوں کو بھی پیش کر دیتی۔ مجھے تو یوں ان کے سوکھے منہ چلے جانے پر بڑا ملال ہو رہا ہے۔" ماں نے اپنے کھانے سے زیادہ مہمانوں کے نہ کھانے پر رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں امی۔ جب ہم کسی قابل نہیں ہیں تو پتا نہیں لوگ ہم سے ملنے کیوں آ جاتے ہیں۔ ہمیں تو سوائے شرمندگی کے ان کے آنے سے کچھ حاصل ہی نہیں ہوتا۔" چھوٹی نے بھی دل ہی دل میں اپنی حالت زار پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ لیکن اب حالات کی وجہ سے سب سے ناتا توڑ کر تو نہیں بیٹھ سکتے نا۔ دنیا داری تو بہرحال نبھانی ہی پڑتی ہے۔" خورشید جہاں سر جھکائے جھکائے ترپائی کرتی ہوئی بولیں۔

"لائیے امی! میں ترپائی کر دوں اس کرتے کی۔ آپ تو سر جھکائے جھکائے تھک گئی ہوں گی۔" ماں کو اتنی محنت کرتے دیکھ کر چھوٹی کو بہت ترس آیا۔ یوں بھی بھوک کی شدت سے ان کے ہاتھ ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے۔

"نہیں بیٹی۔ تم نے پہلے کبھی ترپائی کی ہے جو اب کرنے کو کہہ رہی ہو۔ تم دونوں بہنوں کو تو اپنے کالج سے ہی فرصت نہیں ورنہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹاتیں تو بڑے اچھے پیسے بن جایا کرتے۔" ماں نے بدستور ترپائی کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن امی وہ جو دوسرا مردانہ کرتا ہے نا اسے تو میں نے رات کو ہی تیار کر کے رکھ دیا تھا۔ سچ بڑی اچھی ترپائی ہوتی ہے میری۔ آپ خود دیکھ لیں۔" تب چھوٹی کی بات پر چونک اٹھنے کی وجہ سے خورشید جہاں کو سلائی پر سے نظر ہٹانی پڑی۔

"ہائیں تم نے رات کو اس موئے ریوڑی والے کے چراغ (ہلکے پاور کا بلب) کے نیچے بیٹھ کر اور دیدہ ریزی کر کے سلیم کے ابا کا کرتا بھی سی دیا۔ اسے کیا ضرورت تھی بھلا۔ اب اگر اس میں کوئی خامی رہ گئی تو سلیم کی اماں خواہ مخواہ ہی میری جان کو آ جائیں گی۔" بیٹی کی تعریف کرنے کے بجائے تھوڑی سی ہمدردی جتا کر۔۔۔ خورشید جہاں نے کرتا خراب ہو جانے پر سلیم کی ماں کی خفگی کا خدشہ ظاہر کیا تو چھوٹی اٹھ کر وہ کرتا اٹھا لائی۔

"یہ دیکھیے امی، یہ رہا وہ کرتا۔ اب آپ خود ہی دیکھ کر بتائیں کہ میں نے اس میں کیا خامی پیدا کر دی ہے۔" تو ماں نے کرتے کو ہاتھ میں لے کر اس کی ایک ایک سیون کو غور سے دیکھا اور بولیں۔

"ہاں سیا تو بالکل ٹھیک ہے خدا تمہیں عمر دے۔ چلو اب تیس روپے تو بن ہی جائیں گے کیونکہ میں نے سلیم کے ابا کا کرتا پاجامہ بھی سی دیا ہے۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں اسے بھی تیار کر دیتی ہوں پھر یہ تینوں کپڑے بھیج کر پیسے منگوا لوں گی۔"

"لیکن امی جہاں تک پیسوں کی بات ہے تو آپا کے پاس تو اس وقت ہزاروں روپے موجود ہیں ہزاروں۔ یہ موٹی گڈی ہے سو سو کے نوٹوں کی۔" چھوٹی نے جو اتنی دیر سے سخت بے چین تھی کہ ماں کو جلد سے جلد یہ بتا دے کہ غزل اسے آٹھ ہزار روپے دے کر گئی ہے۔ آٹھ ہزار روپے جو اس کے لیے کسی دولت سے کم نہ تھے۔

"مگر امی آپ آپا کو یہ نہ بتائیے گا کہ یہ بات میں نے آپ کو بتائی ہے ورنہ وہ یہی کہیں گی کہ میں اول درجے کی لتری اور پیٹ کی ہلکی ہوں۔" چھوٹی نے یہ ساری بات ماں کے پاس منہ لے جا کر کھسر پھسر کرنے کے سے انداز میں ماں کو بتائی تھی۔ انہوں نے سوچتے ہوئے متعجب سے انداز میں سر ہلا کر گویا

اسے یہ اطمینان دلایا کہ وہ عنبر سے کچھ نہیں پوچھیں گی جبکہ اس معاملے میں زیادہ دیر ضبط سے کام لینا انہیں مشکل ہی لگ رہا تھا۔ وہ ہاتھ جو ترپائی کے لیے بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔ ان میں بھی ہلکی ہلکی سستی آ گئی۔ اور وہ انہماک بھی کہ سر جھکائے جھکائے نہ صرف گردن اکڑ سی گئی تھی بلکہ دیدہ ریزی کرنے کی وجہ سے آنکھیں بھی درد کرتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ اور ادھر عنبر تھی کہ جیسے کمرے میں ہی جم کر رہ گئی تھی کیونکہ دونوں لڑکیوں کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ آخر خورشید جہاں سے برداشت نہ ہو سکا تو انہوں نے اسے آواز دی۔

"اے عنبر، تم کمرے میں کیا کر رہی ہو۔ ذرا باہر آ کر تھوڑا سا کام ہی کر لو۔" حالانکہ اس وقت کرنے کے لیے کوئی کام ہی نہیں تھا۔ برتن تو رات کے ہی دھلے رکھے تھے۔ اور نا ہونے کی وجہ سے چولہا بھی ٹھنڈا پڑا تھا یعنی کھانے پکانے کو کچھ تھا ہی نہیں پھر بھلا چولہا کیا روشن ہوتا۔ اس کے باوجود بھی ماں کے آواز دینے پہ عنبر کچھ ہی دیر بعد باہر چلی آئی۔ چھوٹی اس کے آنے سے پہلے ہی نعمت خانے سے حلوہ نکالنے چلی گئی تھی۔

"جی امی کونسا کام کرانا چاہ رہی تھیں آپ؟" عنبر نے سامنے کھڑی نعمت خانے سے حلوے کی پلیٹ نکالتی ہوئی چھوٹی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ چھوٹی نے ضرور ماں سے رقم کی بات کہہ دی ہو گی۔

"اے کام کیا ہوگا بیٹی، میں نے سوچا کہ تمہارا پیٹ بالکل خالی ہے اور حلوہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا اس لیے بلا لیا۔ کاش کچھ زیادہ ہوتا تو ان دونوں کے سامنے بھی تھوڑا سا رکھ دیتی۔" خورشید جہاں نے دانستہ چہرا جھکائے رکھا اور کرتے کی ترپائی کرتی رہیں۔

"نہیں امی۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ تھوڑا سا بنا تھا۔ ورنہ وہ بھی کوئی کسی کے سامنے رکھنے کے قابل تھا۔" عنبر نے حلوے کا ذکر سن کر منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اے یہ تم پانی سے پہلے پاڑ کیوں باندھنے لگتی ہو۔ پہلے ذرا کھا کر تو دیکھو۔ پھر ایسے کڑوے کسیلے منہ بنانا۔" خورشید جہاں نے کہا۔

"لیکن آپ نے بھی کھایا یا ہمیشہ کی طرح ہم تینوں کے لیے رکھ دیا۔" عنبر نے پوچھا۔ اصل میں وہ حلوہ کھانے کے بالکل موڈ میں نہ تھی وہ بھی آٹے کا حلوہ کھانے کے۔

"ہاں تھوڑا سا میں نے بھی کھایا ہے۔ مگر مجھے تو یہ کام ختم کرنے کی جلدی تھی۔ میں نے سوچا اتنے تم دونوں اپنی سہیلیوں سے باتیں کرو۔ اتنے میں سلیم کی اماں کا ریشمی کرتا سی لوں گی۔ چھوٹی نے تو رات کو ہی دوسرا کرتا سی سلا کر رکھ دیا تھا۔ پاجامہ بھی تیار ہے بس تینوں چیزیں بھیج کر سلیم کی اماں سے سلائی کے پیسے منگوا لوں گی ورنہ وہ نگوڑا عاذر یہ قلقلاتا ہوا شام کو آئے گا تو اسے کیا کھلاؤں گی۔ اے ہاں اور تو کہیں سے پیسے کی کوئی سبیل ہی نہیں رہی ہے۔" پیسوں کا موضوع بھی خورشید جہاں نے دانستہ چھیڑا تھا۔ عنبر تھوڑی دیر خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔

"امی کیا بتاؤں میں اس وقت کتنی مشکل میں پھنس گئی ہوں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ بھی کوئی کڑی آزمائش ہو۔"

"اے ہے خیریت ایسی کیا بات ہو گئی ہے۔" ماں نے پرتشویش سے لہجے میں پوچھا حالانکہ وہ سمجھ تو گئی تھیں کہ عنبر کس آزمائش میں مبتلا ہے۔ اور تب عنبر نے انہیں ساری بات بتا دی ماسوا اس کے کہ اسے مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑے گا اور فلم اور اسٹیج کا ذکر بھی گول کر گئی۔

"مگر ایسا کیا کام کرنا ہو گا تمہیں، تم نے یہ بھی پوچھا اس لڑکی غزل سے۔" ماں نے سب کچھ سن کر کسی خیال کے تحت بیٹی سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے اچھی طرح معلوم نہیں لیکن عالیہ کہہ رہی تھی کہ وہ شاید مجھے اپنے دفتر کا انچارج بنائے گی۔" عنبر نے گول مول سا جواب دیا۔

"لیکن اس لڑکی کا شوہر کیا کام کرتا ہے جو عالیہ کے ساتھ آئی تھی ـــــ" خورشید جہاں نے سوئی گریبان میں لگا کر کرتا ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

"لیجیے غزل شادی شدہ تھوڑی ہے امی۔ وہ تو خود اپنا بزنس کرتی ہے۔" عنبر تھوڑا سا ہنس کر بولی۔

"ہائیں شادی شدہ نہیں ہے پھر بھی اتنی بنی ٹھنی آئی تھی کہ میں تو یہی سمجھی کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ مگر ایک اکیلی عورت ذات بھلا اتنا بڑا بزنس کیسے چلا سکتی ہے۔" خورشید جہاں نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا۔

"خیر بزنس تو اس کے بھائی چلا رہے ہیں، وہ تو ایک نگراں کی حیثیت سے ان کے کاروبار پہ نظر رکھتی ہے۔ اور کوئی ایک بزنس تھوڑا ہی ہے ان کا۔ کاروں کا، دواؤں کا اور پتا نہیں کس کس چیز کا کاروبار کرتے ہیں یہ لوگ۔" عنبر نے غزل کے بارے میں مزید بتایا۔ اور چھوٹی جو حلوے کی پلیٹ لے کر ان دونوں کے قریب ہی آ کھڑی ہوئی تھی اس نے پھر دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔

"امی! یہ غزل آپا کوئی معمولی ہستی نہیں ہیں۔ کروڑ پتی ہیں کروڑ پتی۔ مگر ذرا سا بھی غرور یا تکبر نہیں ہے ان کی طبیعت میں۔ نہ تو انہوں نے گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی طرف توجہ دی نہ ہمارے حلیوں پر۔ بلکہ اتنے خلوص اور محبت سے ملیں کہ مجھے تو یوں لگا جیسے کوئی اپنا مجھ سے ملنے آ گیا ہو۔" چھوٹی کے منہ سے غزل کی اتنی تعریف عنبر کو ذرا نہ بھائی۔ وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

"تم تو بس اوپری اور سطحی باتوں کو دیکھتی اور محسوس کرتی ہو چھوٹی۔ ورنہ ساری بات یہ تھی کہ وہ مجھ سے کام لینا چاہ رہی تھی۔ یعنی اس کی مجھ سے ایک غرض اڑی تھی اسی لیے اس قدر جھک جھک کر مل رہی تھی۔ جبکہ پہلے روز جب میں انٹرویو دینے گئی تھی اس نے سیدھے منہ مجھ سے بات تک نہیں کی تھی۔"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ پھر تو کام بھی کسی خاص نوعیت کا ہی ہوگا۔ جو وہ تمہارا پیچھا کرتی یہاں تک چلی آئی اور پیشگی رقم بھی تمہارے حوالے کر گئی۔" خورشید جہاں نے عنبر کی بات کی تائید میں کہا۔

"جی ہاں امی۔ یوں بھی تقریباً ہر کام ہی خاص نوعیت کا ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے ایسا کام جس میں تنخواہ زیادہ ملے۔ اور اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ اس کام کے اوقات کافی طویل ہوں گے۔ دن کے نو بجے سے رات کے آٹھ یا نو بجے تک۔ اور اسی بات پہ میرا دل نہیں ٹھک رہا امی۔"

"خیر وہ تو ہوتے بھی چاہئیں کیونکہ تنخواہ بھی تو پورے پانچ ہزار ہو گی۔" اور امی آپا کو کپڑے لتے کھانا وغیرہ وہیں سے ملا کرے گا حتیٰ کہ علاج معالجے کا خرچ اور جانے اور آنے کا ذمہ بھی وہی لوگ اٹھائیں گے اور گھر کے کرائے سمیت گویا پانچ اوپر سے ہو جائیں گے۔" چھوٹی نے جو آٹھ ہزار کی جھلک دیکھ کر گویا جذباتی سی ہو رہی تھی ماں کو عنبر کی سروس کی خوبیاں گنواتے ہوئے بتایا۔ تو ماں نے غور سے عنبر کی شکل دیکھی جس سے خوشی نہیں تردد سا عیاں تھا۔

"تنخواہ بہت تگڑی ضرور ہے لیکن سوچ سمجھ کر ہی کوئی فیصلہ کرنا بیٹی۔ کیونکہ اتنی زیادہ تنخواہ تو شاید لاٹ گورنر کو بھی نہیں ملتی۔ کہیں کوئی اور گھپلا نہ ہو۔" ماں نے ناصحانہ سے انداز میں عنبر کو مشورہ دیا۔

"جی ہاں امی اسی بات پر تو میں بھی کھٹک رہی ہوں کہ ایک تو اتنی زیادہ تنخواہ اس پہ غزل کا میرے تعاقب میں یہاں تک آ جانا اور مجھے سروس کے لیے مجبور کرنا۔ آخر کچھ تو وجہ ہو گی۔ جبکہ اس جیسی کروڑ پتی لڑکیاں ہم بے حیثیت لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا تک پسند نہیں کرتیں۔" عنبر متفکر سے انداز میں بولی۔

"ہاں بجا کہ ہمارے اس چھوٹے سے کھنڈلے میں آ کر بیٹھنا۔ میرا تو اسی وقت ماتھا ٹھنکا تھا جب اس نے ہیرے کی انگوٹھیاں چمکاتے ہوئے مجھے جھک کر سلام کیا تھا۔ اے ہاں۔ اگر وہ تمہاری صورت پر بھی مر مٹی ہے تب بھی دنیا میں خوبصورت لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہے۔ اسے تم سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ پھر آخر وہ پنجے جھاڑ کر تمہارے پیچھے ہی کیوں پڑ گئی ہے۔ تم نے یہ بات کم از کم عالیہ سے ہی پوچھ لی ہوتی۔" خورشید جہاں نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا جو عالیہ کے تھے اور خود عنبر کے بھی تھے۔

"امی! عالیہ سے میں نے سب سے پہلے ہی سوال کیا تھا۔ تو اس نے بتایا تھا کہ غزل کو تم ہی جیسی خوبصورت

باحیا، باکردار اور شریف لڑکی کی تلاش تھی جو عرصے بعد تمہاری صورت میں اسے اب جاکر ملی ہے۔ ورنہ جہاں تک خوبصورتی کا سوال ہے تو وہ تقریباً ہر جگہ ہی مل جاتی ہے۔" عنبر نے ماں کے جواب میں کہا تو چھوٹی بہت لہک کر بولی۔

"اصل میں چونکہ وہ خود شریف اور با اخلاق ہیں اس لیے آپا انہیں بہت زیادہ پسند آئی ہوں گی۔ اور ہماری آپا کا کردار تو اتنا پختہ ہے کہ کیا کسی کا ہوگا۔ اور آپا کی تو یہی خواہش تھی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ تنخواہ کی سروس ملے۔"

"چھوٹی تم جس بات کو سمجھ نہیں سکتیں اس میں اپنی ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ آپ اسے منع کریں امی یہ ان کے سامنے بھی الٹی سیدھی ہانکنے بیٹھ گئی تھی۔" عنبر نے اپنی تعریف پر خوش ہونے کے بجائے چھوٹی کی باتوں کا بُرا مانتے ہوئے کہا۔

ہاں نو میں تو بھول ہی گئی اس کتا چھتی میں کہ یہ کُرتا بھی کب کا تیار کر کے رکھ دیا میں نے۔ جا بیٹی تو ہی لے جا یہ تینوں کپڑے مگر پیسے پورے لانا۔ کہہ دینا سلیم کی اماں سے۔ کہ امی کو پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ جاؤ شاباش جلدی کرو اب یہ موئی بھوک میری برداشت سے باہر ہو رہی ہے۔" خورشید جہاں نے تینوں تہہ کیے ہوئے کپڑوں کو بہت قرینے سے اوپر تلے رکھ کر چھوٹی کی طرف بڑھایا

"ہاں اس وقت تو تم ہی چلی جاؤ چھوٹی امی کو واقعی سخت بھوک لگ رہی ہو گی بھلا یہ بھی کوئی عمر ہے ان کے بھوکے رہنے کی۔" تو چھوٹی نے جواب دینے کے بجائے منہ پھلائے پھلائے وہ تینوں کپڑے ماں کے ہاتھ سے لیے اور چپ چاپ بیٹھک کا رخ کیا۔

"جب بہن بھائی ماشاءاللہ برابر کے ہو جاتے ہیں تو ان سے اتنا منہ لگنا چاہیے نہ ان پر ہاتھ اٹھانا چاہیے کیونکہ وہ جو کہتے ہیں نا کہ بڑوں کا ادب کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹوں کا لحاظ بھی کرنا چاہیے تو اسی لیے کہتے ہیں کہ اگر بڑے چھوٹوں کا لحاظ نہیں کرتے تو ان کے دل سے بھی بڑوں کا ادب اٹھ جاتا ہے۔ اس وقت تو وہ میری وجہ سے خاموش ہو گئی مگر اس روز جب تم نے پیاز کی ڈلی اس کے سینے پر کھینچ کر ماری تھی تو وہ کتنی بے ادب ہو گئی تھی۔ حالانکہ بلاوجہ تو نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی مگر تم تو غصے میں بالکل پاگل ہی ہو جاتی ہو۔ کچھ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتیں۔ اور عنبر جس کا دماغ اس وقت بُری طرح الجھا ہوا تھا اور جو سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی مجبور اور کم نصیب ہے کہ اتنی بڑی رقم اس کے پاس موجود ہے پھر بھی وہ ایک پائی بھی اس میں سے خرچ نہیں کر سکتی۔

اگر پانچ سو روپے بھی اس رقم میں سے نکال لے تو بڑے آرام سے پورے مہینے کا راشن آسکتا ہے۔ مگر کیسے نکالے بھلا۔ وہ ماں کی نصیحتوں کے اتنے لمبے اور کڑوے ڈوز کو برداشت نہیں کر سکی اور جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"امی اس وقت تو میں واقعی پاگل سی ہو رہی ہوں۔ بڑی کٹھن آزمائش میں مبتلا ہوں امی۔ آپ ہی بتائیے اتنی ساری رقم میرے پاس موجود ہے پھر بھی آپ کی محنت اور دیدہ ریزی سے تیار کیے ہوئے کپڑوں کی اجرت پر تکیہ کیے بیٹھی ہوں۔ اس پر اگر کل چاند دکھائی دے گیا تو پرسوں کا روزہ ہو جائے گا۔ ذرا ادھر گھر میں ایک بھورا اناج کا ہے نہ کوئی اور چیز۔ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ یہ ملازمت قبول کر لوں بعد میں جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"ہیں بعد میں خدا نہ کرے کیا ہو گا؟" خورشید جہاں نے پرتشویش انداز میں پوچھا۔

"میرا مطلب ہے اگر ان لوگوں کی شرائط کڑی ہوئیں۔ یعنی انہوں نے لمبی ڈیوٹی لگا دی اور شہر سے باہر جانے پر بھی مجبور کیا تو؟"

"اے ہے نہیں نہیں کہیں باہر جانے کا تو کبھی خیال بھی نہ کرنا۔ ایسا ہی مشکل کام ہے تو بھئی ان کے پیسے واپس کر دو۔ عزت سے بڑھ کر تو کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔" ماں نے اس کی بات کاٹ کر گویا کانوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے مشورہ دیا۔

امی مجھے اور کسی چیز کی بالکل پروا نہیں ایک بس اپنی عزت کا خیال ہے مجھے یہ کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کہ یہ لوگ میرے کردار پر کیچڑ اچھالیں اور بلاوجہ ہی مجھے رسوا کریں۔" عنبر نے ماں کے مشورے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"ہاں اس بات کا تو مجھے بھی دھڑکا ہے۔ اصل میں ہمارے سروں پر کوئی مرد نہیں ہے۔ ورنہ ان محلے والوں کو ہمارے ذاتی معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کبھی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ کیا کروں سعد کو بھی تم نے مجھ سے ایسا بدظن کیا ہے کہ وہ دن اور آج کا دن اس نے پلٹ کر کبھی جھانکا تک نہیں یہاں۔ ورنہ وہ آتا رہتا تو میں اس سے ہی مشورہ لے لیتی۔" ماں نے اس کے خیالات سن کر دل ہی دل میں اس کے کردار کی پختگی کو سراہتے ہوئے کہا اتنے دنوں بعد ماں کی زبان پر سعد کا نام آیا تو اس نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو وہ نہیں آیا ورنہ مخالفت کرنے میں سب سے اول تو وہ ہی تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی برقی رو کی طرح تیزی سے ایک خیال سا اس کے ذہن میں آکر تیزی سے گزر گیا کہ سعد کے سختی سے منع کرنے کی وجہ سے ہی تو اور بھی وہ یہ ملازمت کرتے ہوئے ڈر رہی ہے۔ گو وہ کسی سے بھی مرعوب ہونے یا ڈرنے یا پھر کسی نئی دھمکی میں آجانے والی لڑکی نہیں تھی۔ پھر بھی جس انداز میں ایک دم ہی برہم ہو کر اسے یہ نوکری کرنے کی مخالفت کی تھی۔ اس کے دل میں ایک سہم سا بیٹھ گیا تھا۔ پتا نہیں یہ سعد کی طرف سے تھا یا اس ملازمت کی طرف سے یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ بہرحال سعد کا ذکر ماں کی زبان پر آیا تھا تو اس نے بھی سوچا کہ موقع اچھا ہے۔ کیوں نہ امی کو یہ بتا دوں کہ میں اس معاملے میں سعد سے مشورہ لے چکی ہوں اور وہ بھی اس ملازمت کے حق میں نہیں ہیں۔ یہی سوچ کر اس نے دبی زبان سے کہا۔

"امی سعد سے تو میں بہت پہلے مشورہ لے چکی ہوں۔"

"اچھا!" اماں نے تعجب سے آنکھیں پھیلائیں۔

"مگر کب مہینہ بھر سے تو اس نے اس گھر میں آکر جھانکا تک نہیں۔" ماں کی بات سے بے یقینی بڑے واضح طور پر جھلک رہی تھی۔

"ہاں لیکن اتفاق سے اس روز وہ بھی آئے تھے جب عالیہ نے رقعہ بھیج کر مجھے انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔" عنبر نے گویا انہیں یقین دلانے کی غرض سے وہ مخصوص دن یاد دلایا۔

"اے یہ چھوٹی کہاں رہ گئی۔ خاصی دیر ہو گئی اسے گئے ہوئے۔ ذرا جا کر دیکھ تو عنبر کہیں وہ بیٹھک کا دروازہ کھلا نہ چھوڑ گئی ہو۔ خدا بُری گھڑی سے بچائے سناٹے کا وقت ہے کوئی اندر آ گیا تو۔"

"دروازہ تو خیر وہ بند کر کے ہی گئی ہو گی لیکن اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔ امی آپ کو اسے نہیں بھیجنا چاہیے تھا وہ اب بچی تو نہیں رہی۔" عنبر نے اُٹھ کر بیٹھک میں جاتے ہوئے کہا۔ بیٹھک میں داخل ہوئی تو سامنے ہی داخلی دروازے پر چھوٹی کو کھڑا دیکھ کر وہیں سے بولی۔

"لیجیے یہ چھوٹی تو ابھی دروازے پہ ہی کھڑی ہے امی اور آپ ہیں کہ اس کی طرف سے پریشان ہو رہی ہیں۔"

"لیکن میں کسی خوش وقتی میں تو یہاں نہیں کھڑی آپا۔ وہ جوتے والوں کا ظفر ہے نا۔ یہاں سے گزر رہا تھا میں نے اس کے ہاتھ سلیم کی اماں کو کپڑے بھیج دیے ہیں۔ اب اس بھری دوپہر میں خود جانا مجھے اچھا نہیں لگا۔" چھوٹی نے دروازے سے ہٹتے ہوئے بیٹھک کے وسط میں آکر کہا۔ خورشید جہاں جو عنبر کے یہ کہنے پر کہ چھوٹی ابھی تک دروازے پہ ہی کھڑی ہے اٹھ کر بیٹھک میں آ گئی تھیں انہوں نے کہا۔

"ہاں یہ تم نے اچھا ہی کیا کہ خود نہیں گئیں مگر یہ ظفر آخر کہاں رہ گیا کیا تمہارے سامنے سلیم کے گھر گیا بھی تھا؟"

"گیا تو وہیں تھا مگر اب تک وہاں سے باہر نہیں نکلا۔" چھوٹی بولی۔

"اے ہے ایک اچھال چھکا ہے وہ تو۔ کپڑے لے کر کہیں چمپت نہ ہو گیا ہو۔ لاؤ میرا برقعہ لا کر دو میں

خود ہی جا کر دیکھتی ہوں۔ اسے ہاں کہیں وہی مثل نہ ہو جائے کہ گدھا بھی گیا رستی بھی گئی۔" خورشید جہاں نے کہا تو چھوٹی بھاگ کر ان کا برقعہ اٹھا لائی۔ جسے جلدی سے پہن کر خورشید جہاں باہر نکل گئیں۔ دونوں بیٹیاں بیٹھک کے دروازے پر کھڑی ہو کر انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔ اور ابھی خورشید جہاں نے سلیم کے دروازے کے سامنے قدم رکھا ہی تھا کہ ظفر دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ تینوں کپڑے اس کے ہاتھ میں ہی تھے جنہیں اس نے گٹھڑی سی بنا کر سینے سے لگا رکھا تھا۔ عنبر اور چھوٹی کی نگاہوں کے سامنے ہی وہ تینوں کپڑے اس نے خورشید جہاں کے حوالے کرتے ہوئے کچھ کہا اور پھر اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ خورشید جہاں گئی تو بڑی تیزی میں تھیں مگر واپس پلٹیں تو بھوک۔ تھکن۔ کمزوری سارے احساسات ایک ساتھ ہی ان پر ٹوٹ پڑے۔

"اسے لو وہی مثل ہے کہ جہاں جائے بھوکا وہیں پڑے سوکھا۔ وہ سلیم کی ماں اور باپ دونوں اپنے کسی رشتے دار کی تعزیت کو گئے ہوئے ہیں، رات سے پہلے نہیں لوٹیں گے۔ خیر میرے مولا۔ کتنا آزمائے گا تو۔ میں تو خیر ہر تکلیف کو چپ چاپ سہہ لیتی ہوں مگر یہ بچے ان کے تو دن ہیں کھانے پینے اور پہننے کے۔ ان کے نصیب تو تو کھول دے۔" یہ آخری فقرے ماں نے کچھ اتنی آزردگی سے کہے کہ دونوں بیٹیاں آبدیدہ سی ہو گئیں۔ خورشید جہاں تو اپنا برقعہ تہہ کرتی ہوئی اندر چلی گئیں اور دونوں بہنیں اپنی اپنی سوچ میں گھری وہیں کھڑی رہ گئیں۔

"یہ تو امی سچ ہی کہہ رہی ہیں آپا۔ ہم تو واقعی ایک آزمائش میں مبتلا ہیں۔ جو کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ امی لاکھ صابر اور شاکر سہی لیکن اس عمر میں ان کا اتنی دیر دیر تک بھوکا رہنا انہیں کا کام ہے۔ ورنہ ان کی جگہ اگر میں ہوتی تو کب کی گزر جاتی۔" چھوٹی نے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو اپنی ہتھیلی میں جذب کر کے ماں کی ہمدردی میں چور ہو کر کہا تو عنبر جو یہ سوچ رہی تھی کہ واقعی ہیں بڑی سخت آزمائش میں مبتلا ہوں کہ اتنی بڑی رقم میرے پاس موجود ہے اور میں اس وقت پائی پائی کو ترس رہی ہوں، یہ رقم تو میرے لیے شجر ممنوعہ بن گئی ہے۔ اب اور تو کہیں سے اس وقت پیسہ آنے کی کوئی سبیل ہی نہیں تو پھر میں کیا کروں؟ کیا کرنا چاہیے مجھے؟

اس فاقے کی مصیبت سے تو کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کرنی ہی ہے۔ یہی سب سوچ کر اس نے چھوٹی سے کہا۔

"اب تو مجھے یہی کرنا پڑے گا کہ ان نوٹوں میں سے ایک سو کا نوٹ نکال لوں۔ تاکہ گھر کا کچھ سودا سلف تو آ سکے۔ تم ایسا کرو۔ جلدی سے ضروری چیزوں کی لسٹ بنا لو تاکہ اسٹور والے سے منگوا لی جائیں۔" اور اس کے منہ سے یہ بات سن کر چھوٹی کی آنکھیں چمک سی اٹھیں۔ لیکن اس نے تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپا! گڈی میں سے سو روپے کم ہو گئے تو پھر آپ کہاں سے پورے کریں گی۔ حالانکہ وہ پوچھنا یہ چاہ رہی تھی کہ آپا کیا آپ نے یہ ملازمت قبول کر لی ہے جو پیسے نکال رہی ہیں مگر ایک دم ہی بہن سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی کہ پتا نہیں وہ کیا سمجھے۔

"اتنے پیسے تو میں عالیہ سے بھی لے سکتی ہوں۔ تم اس کی فکر نہ کرو اور جلدی سے لسٹ تیار کرو۔"

"لیکن آپا کیا آپ کا وہاں کام کرنے کا بالکل بھی ارادہ نہیں۔" چھوٹی نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"نہیں ابھی تو بالکل نہیں ہے۔ بلکہ آئندہ بھی نہیں ہوگا۔ خیر تم نے کچھ لکھا۔" عنبر نے اس کی بات کا جواب دے کر پوچھا۔

"ہاں لکھا تو ہے۔ مگر انتہائی ضروری اشیاء۔ گھی، چینی، چائے، آٹا، دال مسور اور دال چنا۔ اور آپا پرسوں اگر پہلا روزہ ہو گیا تو افطار کے لیے تھوڑے سے چھولے بنا لیں گے۔ اس لیے چنے اور بیسن

بھی لکھ دیا ہے میں نے اور ہاں نمک پسی ہوئی مرچ اور دھنیا۔ اور تھوڑا سا سفید زیرہ۔ اور آپا آلو پالک، پیاز، ہری مرچ بھی منگوانی پڑے گی۔" چھوٹی نے جھجکتے ہوئے سبزی کے بارے میں بتایا۔

"مگر ان سو روپوں میں یہ ساری چیزیں آ جائیں گی کیا؟" عنبر نے پوچھا۔

"ہاں آ تو جائیں گی مگر سبزی شاید ہی آ سکے کیونکہ گھی کا ٹن تقریباً پچیس روپے میں آئے گا۔ آپا ایسا کیوں نہ کریں کہ کھلا ہوا گھی خرید لیں۔ اٹھارہ روپے کا ایک کلو آئے گا۔ اس طرح انہی پیسوں میں سبزی بھی آ جائے گی اور آدھا یا پاؤ کلو گائے کا گوشت بھی۔" برداشت سے باہر ہوتی بھوک میں غلے اور سبزیوں کا ذکر چھوٹی کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ارے تو بھئی جس طرح چاہو اور جو چاہو لکھ لو۔ میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا۔" عنبر چھوٹی کو خوش ہوتا دیکھ کر بولی۔

اس نے لسٹ بھی بنائی تھی تو اتنی کم کم چیزوں کی جو پانچ چھ روز سے زیادہ نہیں چل سکتی تھیں اور ترکاری کا تو اس میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ جتنی ترکاری اس نے لسٹ میں لکھی تھی وہ زیادہ سے زیادہ تین دن ہی چل سکتی تھی۔ پھر بھی دونوں بہنیں اس کو بہت غنیمت سمجھ رہی تھیں۔ اور عنبر نے تو گڈی میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر گویا اپنے لیے ایک نئی پریشانی مول لی تھی۔ کیونکہ عالیہ کا اور اس کا تقریباً پانچ برس کا ساتھ رہا تھا مگر اس عرصے میں کبھی بھولے سے بھی اس نے عالیہ سے ایک پائی بھی قرض نہیں لی تھی اپنی فاقہ کشی سے تنگ آ کر اور بالخصوص ماں کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر کہ وہ جب سے سلیم کے گھر سے ہو کر آئی تھیں نڈھال اور نیم جان سی اپنے پلنگ پر پڑی تھیں اور وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی مگر ماں کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اور بڑی دیر سے اس کش و پنچ میں تھی کہ کرے تو کیا کرے آخر اس نے سو روپے نکالنے کا فیصلہ ہی کر لیا۔ مگر اب بھی یعنی سو روپے گڈی سے نکالنے کے بعد بار بار اس کا دل چاہا تھا کہ ابھی تو یہ سو روپے خرچ نہیں ہوئے، کیوں نہ انہیں واپس گڈی میں رکھ دے۔

عجیب سی دھکڑ پکڑ میں مبتلا تھی وہ۔

حتیٰ کہ چھوٹی سے ساری چیزوں کی لسٹ لیتے وقت بھی اس کا ہاتھ کانپا تھا۔ مگر اس لمحے وہ کتنی مجبور ہو گئی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا گھر میں کوئی مرد تو تھا نہیں جس سے سودا منگایا جاتا۔ عذیر بھی اسکول گیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ خود ہی سودا لینے جا رہی تھی۔ اور ابھی وہ چادر لینے جسے اوڑھ کر وہ باہر نکلتی تھی وہ کمرے میں گئی تو دیکھا ماں بڑے بے ترتیب سے انداز میں بے ہوش پڑی ہیں۔ ان کا سر بھی ٹیڑھے ترچھے انداز میں پٹی پر پڑا تھا۔ ماں کو اس دگرگوں حالت میں دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے بھاگ کر ان کا سر اونچا کر کے اس کے نیچے تکیہ رکھا اور پھر انہیں زور زور سے ہلاتے ہوئے چیخنے لگی۔

"امی۔ امی۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا امی۔ ہوش میں آئیے امی۔ امی۔" اور پھر وہ رونے لگی۔ چھوٹی بھی اس کی آواز سن کر بدحواس دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ اور ماں کو بے ہوش دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ زور زور سے رونے لگی تو عنبر نے اپنے آنسو پونچھ کر اس سے کہا۔

"اپنا دل سنبھالو چھوٹی! امی صرف بے ہوش ہوئی ہیں۔ جاؤ جلدی سے ان کے لیے صراحی میں سے ٹھنڈا پانی لے کر آؤ۔" تو چھوٹی با آواز بلند روتی ہوئی پانی لانے کے لیے دوڑی۔ اور عنبر ماں کی طرف سے طرح طرح کے وسوسوں میں گھری انہیں ہلا ہلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی۔ ماں کے ہاتھ پاؤں بھی ڈھیلے پڑے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد چھوٹی پانی لے کر آئی تو اس نے ماں کے منہ میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور ان کے چہرے پر پانی کے چھینٹے بھی دیے۔ مگر وہ کسی طرح ہوش میں نہ آئیں۔ تو خود عنبر کے ہاتھ پاؤں چھوٹ گئے۔ اس نے چھوٹی سے کہا۔

"سنو چھوٹی! گھبرانے کی بات نہیں۔ دھوپ کی شدت، کمزوری اور سب سے بڑھ کر اس چلچلاتی دھوپ میں سلیم کے گھر تک جانے اور آنے کی وجہ سے امی بے ہوش ہوئی ہیں۔ تم ان کے پاس بیٹھو۔ میں جاکر ڈاکٹر صاحب کو دیکھتی ہوں ممکن ہے کہ اس وقت وہ مطب میں مل جائیں۔"

"نہیں آپا بے کار ہی ہوگا آپ کا وہاں جانا کیونکہ ڈاکٹر صاحب ڈیڑھ بجے اپنا مطب بند کر دیتے ہیں۔ اس وقت تو ڈھائی بج رہے ہیں آپا۔ اور پھر گھر پر آکر دیکھنے کی فیس بھی ساٹھ روپے ہوتی ہے ان کی" چھوٹی نے کہا تو وہ بڑی لاپرواہی سے بولی۔

"خیر، فیس کی تو مجھے فکر نہیں، بس امی کو کسی طرح ہوش آجائے۔ پتا نہیں یہ ایک دم ہی کیا ہوگیا ہے ان کو میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔" عنبر واقعی سخت ہراساں تھی۔

"آپا اگر آپ کے خیال میں بھوک اور کمزوری کی وجہ سے یہ حالت ہے امی کی تو اس وقت انہیں موسمی کا جوس یا گلوکوز پلانا چاہیے تاکہ کوئی طاقت کی چیز تو ان کے پیٹ میں جائے۔ صرف پانی پلانے سے تو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔" چھوٹی نے ہلکے ہاتھ سے ماں کا سر دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اچھا میں ابھی جاکر امی کے لیے پھل لے آتی ہوں ساتھ کے ساتھ کھانے کی بھی کوئی چیز لیتی آؤں گی۔ مگر تم ان کے پاس سے ہٹنا نہیں اور اگر انہیں ہوش آجائے تو الٹے سیدھے سوالات نہ کرنا بس تھوڑا سا پانی پلا دینا۔"

عنبر نے اپنے پرانے دھرانے ٹیبل فین کو تپائی سمیت کھسکا کر مزید ماں کے نزدیک کرتے ہوئے بڑی عجلت میں کہا اور پھر چادر نکال کر اسے اپنے گرد لپیٹا اور سو کا وہی نوٹ جو اس نے گھر کا سودا لانے کی غرض سے گڈی میں سے نکالا تھا مٹھی میں دبائے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد چھوٹی سخت پریشانی کے عالم میں کبھی ماں کا سر دباتی اور کبھی ہاتھ پیر اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کو ہلا جلا کر دیکھتی اور آوازیں بھی دیتی۔ مگر ماں کی بیہوشی ٹوٹنے میں نہ آتی۔ خدا خدا کر کے کوئی آدھے گھنٹے بعد عنبر واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں پھلوں اور کھانے کی چیزوں کے کئی پیکٹ تھے جنہیں وہ اپنے پلنگ پر ڈال کر بڑی عجلت میں بولی۔

"چھوٹی۔ جلدی سے اس کاٹھ کباڑ پر کوئی چادر پھیلا دو۔ ڈاکٹر صاحب تو ملے نہیں مگر ان کا کمپونڈر ضرور مل گیا۔ میں اسے ہی ساتھ لائی ہوں۔ شاباش جلدی کرو۔"

اتنا کہہ کر وہ اسی سرعت سے واپس پلٹ گئی۔ چھوٹی نے اٹھ کر اپنے رات میں اوڑھنے کی چادر جلدی سے ان بکسوں اور چیزوں پر پھیلا دی جو اس کے اور عنبر کے پلنگوں کے سرہانے رکھی ہوئی تھیں۔ اور تبھی عنبر کمپونڈر کو لیے کمرے میں آگئی۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے کمرے کا ایک بھرپور جائزہ لیا اور خورشید جہاں کا معاینہ کرنے لگا۔ اور پھر عنبر سے بولا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے انہیں سن اسٹروک ہو گیا ہے یعنی لُو لگ گئی ہے آپ ایسا کریں میں ایک دوا لکھ کر دیتا ہوں آپ انہیں فوراً پلا دیں۔ اور اگر وہ دوا ان پر اثر نہ کرے تو انہیں اسپتال میں داخل کرا دیں۔ کیونکہ ان کا کیس خاصا سیریس معلوم ہوتا ہے۔"

اور اسپتال میں داخل کرانے کا سُن کر دونوں بہنوں کے حواسوں پر بجلی سی گر پڑی۔ چھوٹی تو بدحواس سی ہو کر رونے لگی۔

"مگر میں کس طرح اور کیونکر انہیں اسپتال لے جاؤں کمپونڈر صاحب۔ جبکہ مجھے تو یہ تک معلوم نہیں کہ کونسا اسپتال کہاں ہے۔" عنبر نے زچ ہو جانے کے سے انداز میں کہا۔

"مگر یہ تو کوئی مشکل بات نہیں اسپتال کا نام میں بتائے دیتا ہوں۔ آپ ٹیکسی یا رکشا والے کو اس کا نام بتا دیں وہ خود آپ کو وہاں پہنچا دے گا۔ مگر وہ پرائیویٹ اسپتال ہے جو آپ کو مہنگا پڑے گا۔ ایسا کریں آپ جناح اسپتال چلی جائیں۔ وہاں علاج بھی مفت میں ہوتا ہے کیونکہ وہاں ایک خیراتی شفا خانہ بھی

کمپونڈر نے یہ کہا تو عنبر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اس کی غریبی اور بدحالی بلکہ غیرت پر ایک نازیبانہ سا لگا دیا ہو۔ اور چونکہ سوال غریبی اور غیرت کا ہی نہیں بلکہ ماں کی جان بچانے کا تھا۔ اس لیے اس نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا کہ میں جو اس وقت آٹھ ہزار کی رقم لیے بیٹھی ہوں۔ حالات کے ہاتھوں اتنی بے بس اور مجبور کیوں ہو گئی ہوں۔ اور یہی سوچ کر اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی زندگی کا سب سے اہم، سب سے سنگین اور نازک ترین فیصلہ کر ڈالا کہ وہ غزل کی پیش کش کو قبول کر لے گی۔ اور یہ فیصلہ کرتے ہی اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر توانائی سی آگئی ہو۔ کہ آٹھ ہزار کی رقم پورے اختیار کے ساتھ اس کے ہاتھ میں آگئی تھی۔

"نہیں کمپونڈر صاحب! میں امی کو قریب ہی پرائیویٹ اسپتال میں لے جاتی ہوں۔ آپ کا بے حد شکریہ۔" اور پھر اس نے بیس روپے مٹھی میں دبے نوٹوں میں سے نکال کر بطور فیس اس کی طرف بڑھا دیے۔

"ارے نہیں بی بی آپ تو خواہ مخواہ شرمندہ کر رہی ہیں۔ بھلا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" کمپونڈر نے یہ کہنے کے باوجود وہ روپے اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ اور خدا حافظ کہہ کر جانے لگا تو عنبر نے کہا۔

"آپ کو ایک زحمت اور دوں گی کمپونڈر صاحب۔ آپ ذرا ہمیں ایک ٹیکسی پکڑ دیں۔"

کمپونڈر ٹیکسی لے کر آگیا تھا۔ دونوں بہنوں نے ماں کو ایک چادر میں لپیٹ دیا تھا اور خود بھی اپنی اپنی اجرکیں اوڑھ کر تیار ہو گئی تھیں۔ کمپونڈر سے ہی سہارا دلوا کر انہوں نے ماں کو ٹیکسی میں لٹوایا عنبر آگے بیٹھی اور چھوٹی ماں کا سر اپنی گود میں رکھ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور چھوٹی تمام راستے یہ سوچ سوچ کر ہراساں ہوتی رہی کہ اب ماں کے علاج میں جو پیسہ صرف ہوگا وہ کہاں سے آئے گا۔ ادھر جب سے اس نے کمپونڈر کی زبانی یہ سنا تھا کہ ماں کا کیس سیریس ہو گیا ہے اس کی جان پر الگ بنی جا رہی تھی۔

عنبر اتر کر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچی اور وہاں بیٹھے ایک آدمی کو اس نے بات بتائی تو اس نے ایک نرس اور دو وارڈ بوائے۔ اسٹریچر سمیت اس کے ساتھ کر دیے خورشید جہاں کو ٹیکسی سے اتار کر ایک دوسرے وارڈ میں لے جایا گیا۔ حد درجے پریشانی کے باعث دونوں بہنوں نے آپس میں کوئی بات بھی نہیں کی۔ اور بس درود شریف اور جو قرآنی آیات یاد تھیں ان کا ورد کرتی رہیں۔ اور ماں کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہیں۔

آخر۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈاکٹر صاحب ایک نرس سمیت اس کمرے سے باہر نکلے۔ تو دونوں جھپٹنے کے سے انداز میں اُن کی طرف بڑھیں۔

"امی کیسی ہیں ڈاکٹر صاحب کیا وہ ٹھیک ہو جائیں گی؟" عنبر سے پہلے چھوٹی نے بے تابانہ پوچھا۔ تو ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کی امی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں بی بی آپ بالکل فکر نہ کریں۔" اور پھر عنبر سے مخاطب ہو کر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی امی بہت کم خوراک ہیں۔ اس پر ان کا بلڈ پریشر بھی بہت لو ہے۔ ہمارے فوری ٹریٹمنٹ کی وجہ سے وہ ہوش میں تو آگئی ہیں مگر بہت کمزور ہیں آپ جلدی سے ان کے لیے کوئی جوس یا چکن کارن سوپ منگوا لیں۔ کیونکہ سولڈ (ٹھوس) غذاؤں کے بجائے انہیں اس وقت لکوڈ غذا دینا زیادہ بہتر ہوگی۔"

اور عنبر ماں کے ہوش میں آجانے کا سُن کر خوشی سے بے قابو ہو رہی تھی اس نے مسرور اور مطمئن لہجے میں کہا۔

"جی اچھا۔ ڈاکٹر صاحب میں جوس اور سوپ ابھی منگواتی ہوں۔ ڈاکٹر آپ کا بے حد شکریہ۔" "لیکن ڈاکٹر صاحب کیا والدہ اس کنڈیشن میں ہیں کہ ہم انہیں اسی وقت گھر لے جاسکیں۔" چھوٹی نے پوچھا تو ڈاکٹر نے سر تا پا اس پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔

"اگر ابھی لے جانا چاہتی ہیں لے جائیں۔ ڈیٹ ڈونٹ میک اینی ڈفرنس (اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا)" ڈاکٹر نے کہا۔ تو عنبر نے جو اپنے پرس سے دو سو روپے نکال چکی تھی۔ بہت مؤدبانہ انداز میں ڈاکٹر کو

مخاطب کر کے بولی۔

"لیجیے ڈاکٹر صاحب یہ دو سو روپے اپنی فیس۔"

"تھینک یو۔" ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ سے وہ روپے لے کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی آگے بڑھ گیا۔

"اچھا تم ایسا کرو چھوٹی کہ امی کے پاس جا کر بیٹھو، اتنے میں باہر جا کر ٹیکسی روکتی ہوں۔ امی کو ابھی لے جانا مناسب رہے گا۔ ورنہ یہ لوگ نامعلوم کیا چارج کریں رہائش اور علاج کا۔" عنبر نے آہستہ سے چھوٹی سے کہا۔

"مگر اسپتال والوں کا بل بھی تو چکانا ہوگا آپا! آپ نرس سے کہہ کر پہلے بل تو بنوا لیں۔ ورنہ ٹیکسی رکوانے کے بعد بل بنوایا تو نامعلوم یہ لوگ کتنی دیر لگا دیں بل بنانے میں۔ اور آپا ڈاکٹر صاحب تو کہہ رہے تھے کہ امی کو فوراً جوس یا سوپ دینا چاہیے۔ وہ کہاں سے آئے گا۔" چھوٹی نے اس کی بات سن کر کہا تو اس نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ یہاں جوس یا سوپ کہاں ملتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہے طارق روڈ پر کہیں ملتا ہے۔ ہم ایسا کریں گے کہ واپسی میں طارق روڈ سے لیتے ہوئے چلے جائیں گے وہ بھی سوپ۔ خیر تم امی کے پاس جاؤ میں پہلے بل بنوا تو لوں پھر اس کے بعد ٹیکسی روک کر تمہیں بلا لوں گی۔"

عنبر نے بعجلت کہا اور پھر بل بنوانے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ اور جب بل بنوا کر اور ٹیکسی روک کر واپس پلٹی تو اس وقت شام ہو رہی تھی۔ ادھر اس پریشانی میں بھوک تو بالکل اڑ گئی تھی مگر سر بری طرح چکرا رہا تھا اور ہاتھ پیروں میں سنسنیاں سی دوڑ رہی تھیں۔ اور یوں گھر پہنچتے پہنچتے رات ہی پڑ گئی تھی۔ اور اس پر طرہ یہ ہوا تھا کہ اسی ہولا جولی میں طارق روڈ سے سوپ لینا بھی بھول گئی تھی۔ ادھر جو ہی ٹیکسی اس کے گھر کے دروازے پہ آئی۔ گلی میں ادھر اور ادھر دونوں اطراف میں بنے تقریباً دس گھروں کے دروازے کھل گئے اور بڑوں سے پہلے بچے اور پھر خواتین اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی ہو کر جھانک جھانک کر ٹیکسی کی طرف دیکھنے لگیں۔ روشن کا بھائی بھاگ کر ان کے نزدیک آیا اور بولا۔

"چھوٹی استانی جی (چھوٹی)، کہاں چلی گئی تھیں آپ؟ عذیر بھائی آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک کر کہیں چلے گئے ہیں۔"

"ارے جاتے کہاں ببلو! یہ امی بے ہوش ہو گئی تھیں انہیں اسپتال لے کر گئے تھے۔ تم لوگ تو پڑوسی ہو کر کسی کی خبر ہی نہیں لیتے بس اسی ٹوہ میں لگے رہتے ہو کہ فلاں میں کیا عیب ہے اور کس کے یہاں کون آیا ہے اور کون گیا ہے۔ ویسے عذیر کچھ بتا کر بھی گیا ہے کہ کہاں جا رہا ہے۔"

عنبر جو دروازہ کھول کر سب سے پہلے باہر اتر آئی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی کہ اسے ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر اتنے سارے لوگ اپنے اپنے دروازوں پر ۔ کھڑے ہو گئے ہیں ورنہ جب گئی تھی تو کسی نے پلٹ کر دیکھا تک نہ تھا حالانکہ پڑوسیوں کے بچے اس وقت گلی میں موجود تھے۔ اور اب تو اس نے تہیہ کچھ اور کر لیا تھا۔ اس وجہ سے بھی وہ اس قدر ڈٹ کر بات کر رہی تھی۔ ببلو جس طرح بھاگتا ہوا چھوٹی کی خبر لینے آیا تھا عنبر کی بات سن کر اسی طرح بھاگتا ہوا ماں کے پاس واپس چلا گیا جو روشن کے ساتھ ہی اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی تھی۔ عنبر نے سب سے پہلے تالا کھول کر بیٹھک کے دروازے کے دونوں پٹ کھولے اور پھر ٹیکسی کی طرف لوٹ کر چھوٹی کی مدد سے ماں کو اتروانے لگی۔ اور تبھی روشن کی اماں اپنی صفائی پیش کرتے ان کے نزدیک آ گئیں۔

"اے تم نے ہمیں بتایا تو ہوتا کہ چٹی خالہ (خورشید جہاں کو گوری ہونے کی وجہ سے سب چٹی خالہ کہتے تھے) کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ مگر تم تو چپکے سے انہیں لے کر یہ جا اور وہ جا۔ اب ہمیں الہام تو نہیں ہوا تھا۔ وہ تو نہ تمہارا بھائی اسکول سے واپس آتا اور نہ ہمیں پتا چلتا کہ تم تینوں ماں بیٹیاں گھر سے غائب ہو۔"

"مگر خالہ میں تو آپ لوگوں سے کوئی شکوہ نہیں کر رہی۔ اصل میں وہ موقع ہی ایسا تھا۔ امی ایک دم ہی بیہوش ہو گئی تھیں اور ہم پورے ایک گھنٹے تک انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ آخر میں پچھلی گلی میں جو ڈاکٹر ہے اس کے کمپونڈر کو لے کر آئی تو اس نے یہی مشورہ دیا کہ انہیں فوراً ہی اسپتال لے جاؤ سو میں لے گئی۔"

عنبر نے کہا اور پھر بیٹھک میں داخل ہو کر جلدی سے بیٹھک کا دروازہ بند کر کے کھٹکا لگا دیا اور پڑوسنیں جو اس کے پیچھے اندر آنا۔ چاہ رہی تھیں اس کے اس رویے سے نہایت بددل اور بدظن ہو کر اسے برا بھلا کہتی اپنے اپنے گھروں میں گھس گئیں۔

چھوٹی ماں کو امرود کھلا رہی تھی۔ عنبر نے اعتراض کیا تو چھوٹی نے کہا۔ کہ امی نے کہا تھا ——

امرود کاٹ کرلے آؤ۔ میں بس امرود ہی کھاؤں گی تو میں نے ایک نرم سا امرود چھانٹ کر انہیں دے دیا۔"

"ہے تو امی نے تم سے بات بھی کرلی۔ کیا یہ بولنے کے قابل ہوگئیں!" عنبر نے تعجب اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا

"لو، تو کیا میں گونگی ہو جاتی۔ ایک ذرا سا بے ہوش ہونے پر" ماں نے کھوکھلی سی ہنسی ہنس کر خفیف سی آواز میں کہا۔

"امی آپ ذرا سا بے ہوش ہوئی تھیں بھلا۔ آپ تو ایسی بے ہوش ہوئی تھیں کہ ہمارے تو ہوش ہی اُڑ گئے تھے۔ سچ امی میری تو جان پر بن گئی تھی بالکل۔" عنبر نے ماں کی بات پر گلوگیر سے لہجے میں کہا اور پھر ان کے پاس بیٹھ کر ان کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ چھوٹی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور ماں خود بھی آبدیدہ ہوگئیں۔ مگر پھر جلد ہی انہوں نے اپنے دل کو سنبھال کر اس کے سر کو آہستہ سے تھپکتے ہوئے پوچھا۔

"تم دونوں نے بھی اب تک کچھ کھایا یا بس میری فکر سے ہی پیٹ بھرتی رہی ہو" ان کی دھیمی آواز میں ارتعاش سا تھا۔

"نہیں، بس ہم بھی ابھی کھا لیتے ہیں۔ چھوٹی ذرا وہ تھیلی لے آؤ جس میں، میں سموسے چٹنی اور پکوڑے وغیرہ لائی تھی تمہیں تو بھوک کی وجہ سے ہسپتال میں بھی چکر آرہے تھے۔ جاؤ شاباش کچن میں سے ایک پلیٹ بھی لیتی آؤ۔"

عنبر نے بڑے دلار سے چھوٹی سے کہا ——— کہا۔ تو پیکٹ جو اس چادر کے نیچے بکس پر رکھا ہوا تھا جو کمپونڈر کے آنے کی وجہ سے اس نے چیزوں پر پھیلائی تھی، چھوٹی نے نکال کر فوراً ہی اس کے آگے رکھ دیا اور پھر پلیٹ لینے باورچی خانے میں چلی گئی۔ تو ماں نے عنبر سے پوچھا کہ اتنے پیسے کہاں سے آئے؟

"بس کہیں سے آگئے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ تو آرام کریں" عنبر نے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا۔

چھوٹی پلیٹ اور چمچہ لے آئی تو عنبر نے تھیلی کو پلیٹ میں الٹ دیا اور پھر ساری چیزوں کو پلیٹ میں رکھ کر چٹنی کی چھوٹی سی تھیلی کو کھول کر اسے بھی پلیٹ میں الٹ لیا اور پھر اٹھتی ہوئی بولی۔

"تم بسم اللہ کرو چھوٹی تب تک میں ہاتھ دھو آؤں۔ اگر عذیر آجاتا تو وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتا ان چیزوں میں۔

تو بھوک برداشت سے باہر ہو رہی ہے۔ تم عذیر کا حصہ نکال کر تھیلی میں ڈال دو چھوٹی۔"

اتنا کہہ کر وہ ہاتھ دھونے غسلخانے میں چلی گئی تو ماں نے چھوٹی سے کہا کہ یہ اچانک اتنے سارے پیسے کہاں سے آگئے۔

"پتا نہیں امی یہ تو آپا ہی کو معلوم ہوگا۔ مجھے تو وہ کچھ بتاتی ہی نہیں" چھوٹی نے اس خیال سے بات بنائی کہ کہیں عنبر اس کے بتانے پر برا نہ مان جائے۔

جب امرود کے قتلے کر کے دیے تھے انہیں کھانے کے بعد پلیٹ کو گود سے ہٹا کر ماں نے چھوٹی کی طرف دیکھا جس نے پلیٹ میں رکھے سموسوں اور پکوڑوں میں سے ایک بھورا بھی نہیں چکھا تھا اور نہ معلوم کن خیالوں میں گم تھی۔

"ارے یہ عنبر کہاں رہ گئی۔ ہاتھ منہ دھونے گئی تھی یا نہانے دھونے" انہوں نے تھوڑا سا نیچے کھسک کر تکیے پر سر ٹکاتے ہوئے کہا تو جواب — چھوٹی کے بجائے عنبر نے دیا جو ہاتھ میں جست کا بڑا سا گلاس لیے اسی سمے اندر آئی تھی۔

"نہیں امی ہاتھ منہ دھونے ہی گئی تھی مگر میں نے سوچا ساتھ کے ساتھ آپ کے لیے موسمبیوں کا جوس نکال کر لیتی چلوں۔"

عنبر نے ان کے پاس بیٹھ کر ان کا سر اونچا کیا اور جوس کا گلاس ان کے منہ سے لگا دیا۔ حالانکہ وہ نہیں نہیں کرتی رہیں۔ مگر عنبر نے سنا ہی نہیں۔

ماں کو جوس پلانے کے بعد وہ چھوٹی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ارے چھوٹی! تم نے ابھی تک کچھ کھایا ہی نہیں۔ بھئی میں تو یہ چیزیں کھانے کے لیے لائی تھی، آگے رکھ کر سجانے کے لیے نہیں۔"

"آپا! میں نے سوچا آپ منہ ہاتھ دھو کر آجائیں تو پھر ساتھ ہی کھا لیں گے" چھوٹی تھوڑا سا مسکرا کر بولی۔

"اچھا چلو، پھر کھاؤ جلدی سے۔ بے وقوف کہیں کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتی تو اب تک ساری پلیٹ چٹ کر جاتی" عنبر اس سمے بڑے خوشگوار موڈ میں نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک سموسہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپا! بے فکر ہو کر کھائیے، عذیر کا حصہ میں نے الگ کر کے رکھ دیا ہے۔" چھوٹی نے بتایا۔

"تھوڑا سا پکوڑا تو مجھے بھی چکھاؤ چھوٹی! اب میں کوئی ایسی بیمار تو نہیں ہوں کہ پرہیز کی علت پالوں" خورشید جہاں کو پکوڑوں کی خوشبو نے کھانے کی طرف راغب کر دیا" چھوٹی نے سوالیہ نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔ تو وہ خود ہی ایک پکوڑا اٹھا کر ماں کو کھلانے لگی۔

"آپا! اب رات کے لیے تو کچھ پکانے کی ضرورت نہیں ہے نا۔ یہی کافی ہوگا نا؟" چھوٹی نے نوالہ نگل کر پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ تمہارا اگر چڑیا کا سا پیٹ ہے تو میرا بھائی تو خیر سے جوان ہو رہا ہے۔ سارے دن کا بھوکا ہوگا وہ۔ پتا نہیں بے چارہ کہاں چلا گیا۔ اس کی تو پڑھائی بھی گئی آج کی۔"

عنبر نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دینے کی آواز آئی۔ چھوٹی نے جا کر دروازہ کھولا۔

"کہاں چلی گئی تھیں ایک دم ہی آپ تینوں مسماۃ۔ میں تو سمجھا مجھے چھوڑ کر کراچی سے ہی کوچ کر گئی ہیں۔" بیٹھک کا دروازہ کھلتے ہی عذیر سیدھا کمرے کا رخ کرتا ہوا اپنی بھاری آواز میں بولا۔ اور ماں کے پلنگ پر سموسوں اور پکوڑوں کی پلیٹ دیکھ کر بولا

"ارے واہ یہ خوانِ نعمت۔ کیا اب آسمان سے آپ لوگوں کے لیے یہ سموسے اور پکوڑے نازل ہونے لگے ہیں" پھر اس کی نظر ماں کے ستے چہرے پر پڑی۔ کمزوری کی وجہ سے جو آنکھیں بند کیے خاموش پڑی تھیں۔

"ارے یہ امی کو کیا ہو گیا۔ کیسی طبیعت ہے ان کی۔؟" اس نے پوچھا تو عنبر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔

"شش۔ آہستہ بولو۔ امی فاقہ کرنے کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھیں۔ میں اور چھوٹی انہیں بڑی دیر تک ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر جب کسی طرح انہیں ہوش نہیں آیا تو انہیں ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال لے گئے تھے۔"

"اچھا۔ کیا واقعی آپا۔ ایمان سے آپ نے بھی حد کر دی۔ پڑوس ہی میں کسی سے کہہ گئی ہوتیں تو مجھے یوں ایک ایک کے گھر جا کر خوار نہ ہونا پڑتا۔ ایمان سے آپا۔ ان تین روپوں میں کہاں نہیں گیا جو میں نے کل کے لیے بچا رکھے تھے پہلے عالیہ آپا کے ہاں گیا۔ پھر وہاں سے سعد بھائی کے ہاں اور وہاں سے تایا ابو کے ہاں" عذیر دوسرے پلنگ پر بیٹھتا ہوا اپنی روانی میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

بولتا چلا گیا۔

"اچھا چلو! باہر برآمدے میں چل کر بات کرو۔ یہاں امی تمہاری وجہ سے ڈسٹرب ہو رہی ہیں۔ شاید ان کی آنکھ لگ گئی" تو عذیر اُٹھ کر اس کے ساتھ بیٹھک میں چلا آیا۔ مگر بیٹھک میں داخل ہوتے ہی اسے سعد چھوٹی سے باتیں کرتا دکھائی دیا۔ معلوم کیوں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ اس کا دل چاہا کہ کمرے میں واپس پلٹ جائے لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا۔ اس پر چھوٹی جو ابھی تک کھڑے کھڑے اس سے باتیں کر رہی تھی ہمیشہ کی طرح دانت نکال کر بولی۔

"دیکھیے آپا آج یہ سعد بھائی نہ معلوم کیسے راستہ بھول پڑے جو اس وقت یہاں نظر آ رہے ہیں۔"

"السلام علیکم!" سعد نے عنبر سے مخاطب ہو کر کہا۔ تب اس نے السلام علیکم کہنے کے بجائے صرف ہیلو کہنے پر اکتفا کیا۔ جواب میں سعد نے وعلیکم السلام ہی کہا۔ اور یوں عرصے بعد بلکہ پہلی بار دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو ایک عجیب سا احساس اس کے دل میں سنسناہٹیں سی بکھیر گیا۔ یوں بھی وہ بالکل بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ ایک دم آسودہ اور فریش (تر و تازہ) سا۔ بہت ہی اعلیٰ قسم کی ڈریسنگ کیے۔ بہت ہی اسمارٹ، اٹریکٹو اور ڈیسنٹ سا لگ رہا تھا۔ وہ نظر بھر کر اسے دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر اسے اپنے اس بے ساختہ پن سے دیکھنے پر بُری طرح جھینپ کر اس نے اپنے جھینپے چہرے پر جو اس سمے بھوک کی تکلیف اور پریشانی اٹھانے کی وجہ سے اُترا اُترا سا لگ رہا تھا ایک رودارانہ سی مسکراہٹ سجا کر دھیمے سے لہجے میں اس سے کہا

ویسے آج امی کی وجہ سے ہم نے بڑی پریشانی اٹھائی ہے۔ پتا نہیں کس وجہ سے۔" تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"جی ہاں، میں چھوٹی کی زبانی ساری تفصیل سن چکا ہوں۔ اور باقی پریشانی جو عذیر کے حصے میں آئی تھی اس کا بھی دیکھا سارا حال مجھے معلوم ہے۔" اس نے اپنی فطری ظرافت سے کام لے کر کہا۔ تو چھوٹی ہنسنے لگی اور عنبر اٹھ کر ماں کے کمرے میں آ گئی۔ ان پر تھوڑا سا جھک کر بولی۔

"امی۔ امی سنیں۔ وہ آئے ہیں وہ سعد بھا آئی۔" اصل میں سعد کے ساتھ بھائی کی پخ لگانا اسے عجیب سا لگتا اس لیے بھائی کا لفظ اس نے قدرے ہکلا کر ادا کیا تھا۔

"نہیں صرف سعد ہی کہیں۔ یہ بھائی وائی کا تکلف آپ کے منہ سے کچھ اچھا نہیں لگتا" سعد نے اس کے بھائی اور ہچکچاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ خورشید جہاں کے قریب ہی ان کے پلنگ کی پٹی پر ٹکتا ہوا بولا۔ اس کے شوخ لہجے میں معنی خیزی تھی۔ وہ اس حد تک اسے چھوٹ دینے کی روادار نہیں تھی۔ اس کی بات کو ان سنی کر کے وہ چھوٹی کو بلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔ اس کے پکارنے پر "جی آپا" کہتی ہوئی چھوٹی باورچی خانے سے نکلی تو بہت ہی سلیقے سے سجائے ہوئے چائے کے لوازمات کی ٹرے اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی۔ ایک پلیٹ میں سلیقے سے کاٹی گئی موسمبیاں تھیں۔ دوسری پلیٹ میں کٹے ہوئے امرود۔ تیسری پلیٹ میں وہ آدھا درجن جو وہ امرود اور موسمبی کے کچالو بنانے کی غرض سے خاص طور پر خرید کر لائی تھی اور ان تینوں پلیٹوں پر رکھی عذیر کے حصے کے سموسوں اور پکوڑوں کی پلیٹ۔ اس کے ساتھ چائے دانی، دودھ دان اور شکر دان اور اس کے ساتھ دو عدد پیالیاں چھ پیالیوں کے پرانے سیٹ کی یادگار یہی دو پیالیاں رہ گئی تھیں۔ بڑے اہتمام سے بلکہ کوزے میں دریا بھرنے کے مصداق ٹرے میں ٹھنسا رکھی تھیں۔ چھوٹی نے کچھ کہنے کے بجائے چائے کے لوازمات لاتنے اہتمام سے لے کر بڑے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس نے ٹرے پر بالکل توجہ نہیں دی۔ بس اتنا کہا۔

"یہ عذیر کہاں غائب ہو گیا اسے بھی تو کچھ کھلاؤ پلاؤ۔"

"وہ بھی ابھی آ رہا ہے۔ ذرا ہاتھ دھونے گیا ہے آپا۔" چھوٹی نے جواب میں کہا اور پھر ٹرے کو مضبوطی سے تھامے اندر ماں کے پاس چلی آئی۔ اس نے سُنا وہ اس کی والدہ کی کسی بات کے جواب میں کہہ رہا تھا۔

"نہیں پھپھو جان! انہیں تو اسی روز وہ رقم اس عورت کے منہ پر مار دینی چاہیے تھی۔ اصل میں وہ اچھی شہرت کے حامل نہیں ہیں بلکہ دوسرے معنوں میں بدنام زمانہ لوگ ہیں۔ اور یہ بات میں اس روز بھی عنبر کو بتا چکا ہوں۔ مگر" چھوٹی کو چائے کی ٹرے ہاتھ میں اٹھائے دیکھ کر "مگر" کے آگے بریک سا لگ گیا۔

سعد نے جلدی سے اٹھ کر چھوٹی کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور اس پر ایک نظر ڈال کر بولا۔

"بھئی واہ اتنی خاطریں ہو رہی ہیں میری۔ پھر تو آیندہ میں پانچ چھ ماہ بعد ہی آؤں گا تا کہ چائے کے بجائے رات کے کھانے سے میری تواضع کی جائے۔"

"چینی کتنی لیتے ہیں آپ؟" چھوٹی نے چائے دانی سے پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی ہمارے ہاں تو ملازم لاتا ہے چینی۔ شاید پندرہ کلو آتی ہے ہر ماہ۔" اس نے روتھی سی صورت بنا کر کہا اور پھر ہنس کر بولا۔

"بس ڈیڑھ چمچہ۔ ویسے بڑے ایٹی کیٹس آ گئے ہیں تم کو۔"

"جی ہاں۔ یہ آپ کی فیض صحبت کا نتیجہ ہے ورنہ بے چارے اَن کلچرڈ لوگ بھلا ایٹی کیٹس سے کہاں واقفیت رکھ سکتے ہیں۔" چھوٹی تھوڑا سا منہ بنا کر بولی اور پھر پیالی میں چینی ڈال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"بھئی اصل میں تم لوگوں کو کمپلکس ٹیریا ہو گیا ہے ورنہ میری عادت تو تم جانتی ہی ہو کہ مذاق کرنے کی ہے۔ مگر پھپھو جان کو بھی چائے بنا کر دو۔" اس نے پیالی چھوٹی کے ہاتھ سے لے کر کہا۔

"اس کومپلیمنٹ کا شکریہ۔ اصل میں امی کا پیٹ بالکل خالی ہے اس لیے انہیں گرم گرم چائے پلانی مناسب نہیں ہوگی۔" چھوٹی نے پھٹ سے جواب دیا تو خورشید جہاں جو سعد سے کچھ کہنا چاہ رہی تھیں چھوٹی کی باتوں سے زچ سی ہو کر بولیں

"اب تم یہاں بیٹھے بیٹھے بھائی کے کان ہی کھائے جاؤ گی۔ جاؤ ذرا اندر جا کر دیکھو یہ عذیر کہاں رہ گیا۔ اس نے تو کچھ کھایا ہی نہیں اب تک۔"

تو چھوٹی اُٹھ کر باہر آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد سعد باہر آیا تو چھوٹی اور عذیر تخت پر بیٹھے کسی بات پر الجھ رہے تھے۔ عنبر بھی اس اثنا میں باورچی خانے سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ ان دونوں کو آپس میں الجھتا چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

"کہیے آپ کی سروس کا کیا بنا؟" اس نے عنبر کے قریب رک کر پوچھا۔

"ابھی تو وہی معاملہ زیر غور ہے۔"

"کون سا معاملہ۔؟" سعد نے پوچھا۔

"وہی جس کی آپ نے سختی سے مخالفت کی تھی۔" عنبر نے دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور سعد کے تیور اس جواب پر بدل سے گئے

"آپ وہ رقم اپنے استعمال میں تو نہیں لائیں جو اُدھر سے آپ کو گفٹ کی گئی تھی۔" یہ سوال کرتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے پر سختی سی آ گئی۔ جب کہ عنبر کو بلاواسطہ اپنے ذاتی معاملے میں اس کا دخل دینا سخت ناگوار گزرا۔ وہ مروت اور لحاظ کو ایک طرف رکھ کر تڑختے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں اس رقم کو استعمال میں لاؤں یا نہ لاؤں میری مرضی۔ آپ یہ سب پوچھنے والے کون ہوتے ہیں۔؟" اور اس جواب پر سعد کی اجلی اجلی سی رنگت غصے کے باعث سرخ سی پڑ گئی۔ پھر بھی وہ بڑے تحمل سے کام لے کر بولا۔

"یہ تو آپ کو بعد میں بتاؤں گا کہ میں آپ کا کون ہوتا ہوں۔ لیکن میں آپ سے جو کچھ کہنا چاہ رہا ہوں ایک ہمدرد اور بہی خواہ کی حیثیت سے کہوں گا۔"

"لیکن مجھے آپ کی ہمدردی کی بالکل ضرورت نہیں سعد صاحب اور نہ آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق پہنچتا ہے۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں اور میرا جو دل چاہے گا وہی کروں گی۔" اس نے بھی گویا دوبدو کہا اور پھر پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔ سعد بھی پھر ٹھہرا نہیں فوراً چلا گیا۔

عنبر کو تو اسی وقت سے عذیر پر سخت غصہ آ رہا تھا جب آتے ہی اس نے بتایا تھا کہ وہ ان تینوں کو ڈھونڈتا عالیہ کے ہاں پہنچا تھا۔ اور اب تو سچ مچ عالیہ اس کے یہاں صبح ہوتے ہی آ دھمکے گی اور بہت ممکن ہے کہ وہ غزل کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ تو پھر وہ ان دونوں کو کیا جواب دے گی؟ اصل میں اس نے تو یہی سوچا تھا کہ ابھی وہ تین چار روز تک خاموش

رہے گی۔ کیونکہ اسے یہ بالکل مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ جس سروس کو قبول کرنے کے لیے اتنی سختی سے انکار کرتی رہی ہے اسے ایک دم ہی قبول کرلے اور عالیہ اور غزل یہی سمجھیں کہ پیسے کے لالچ میں آکر اس نے اتنی جلدی آمادگی کا اظہار کردیا ہے۔ سچ بات تو یہ تھی کہ ابھی تک اس سروس کو قبول کرنے سے ڈر رہی تھی۔ اس نے جو چھ سو روپے ماں کی بیماری وغیرہ پر خرچ کردیے تھے ان کے بارے میں بھی کبھی کبھی تاسف اور تفکر سے سوچتی کہ کیوں خرچ کیے۔ اتنی رقم میں کسی سے قرض لے سکوں گی نہ خود کہیں سے کما کر اتنے قلیل عرصے میں پوری کرسکوں گی۔ تو پھر میں کیا کروں گی اگر عالیہ اور غزل نے واپس مانگ لیے تو۔

ادھر چھوٹی کو بہن کے خیالات اور ارادوں کا کچھ علم ہی نہ تھا بلکہ وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ چونکہ اس کی آپا نے اس آفر کو قبول کرلیا ہے، اسی لیے اس نے ایک دم ہی اتنے سارے روپے خرچ کر ڈالے ہیں۔

"آپا! آپ تو یہ بتائیں کہ کچھ کھانے کو بھی مل سکے گا یا انہی پھلوں پر ٹرخانا چاہتی ہیں آپ۔" چھوٹی کی بھوک تو تھوڑے سے پکوڑے اور سموسے کھا کر اور بھی چمک اٹھی تھی اس لیے بھی اسے اس وقت صرف کھانے کی پڑی تھی۔ اس کے جتانے پر عنبر کو بھی بھوک کا احساس ہوا۔ تو اس نے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ مگر اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں۔ روٹی سالن تو شاید ہی ملے۔ کیونکہ ہمارے محلے کے باہر جو ہوٹل ہیں ان میں مزدور لوگ سرِشام ہی کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں۔ اب تو تندور بھی ٹھنڈے پڑے ہوں گے۔ ایسا کرتی ہوں کہ عذیر کو بھیج کر انڈے اور ڈبل روٹی منگا لیتی ہوں۔ بس وہی مل جل کر کھالیں گے ہم تینوں۔"

"واہ اس سے اچھی کیا بات ہے آپا۔ جو کچھ بھی مل جائے ہمیں تو کھانے سے مطلب ہے۔" چھوٹی خوش ہو کر بولی۔ اور پھر عذیر کو آواز دی جو اندر ماں کے پاس ہی بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔

"اس وقت تو تم مجھے کچھ کھانے کو لادو۔ گھر کے مرد ہو۔ خود تو حلق تک پیٹ بھر آئے مگر ہم سے یہ تک نہ پوچھا کہ آپ تینوں نے کچھ کھایا بھی۔ اتنی غیر ذمہ داری اچھی نہیں ہوتی۔" وہ اسے سودا لانے کا کہہ کر اسے جھاڑ بھی پلاتی رہی۔

"ان ساری باتوں کے جواب میں عرض ہے کہ پیسے نکال دیں تاکہ میں آپ کے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کرسکوں۔"

عذیر ساری چیزیں لے آیا تو چھوٹی انڈے تلنے کی غرض سے ساری چیزیں اٹھا کر باورچی خانے میں جانے لگی تو اس نے عنبر سے پوچھا۔

"آپا! آملیٹ تلوں یا ستارہ؟"

"نہیں صرف تین انڈوں کا آملیٹ بنالو اور ایک انڈا صبح کے لیے رہنے دو۔ یہ عذیر بھی کچھ کھائے گا ہمارے ساتھ؟"

"نہیں، میرا پیٹ بھرا ہوا ہے اچھی طرح۔ البتہ تین انڈوں کا آملیٹ ہی بنانا کیونکہ امی کو تھوڑی بہت غذا ملنی چاہیے اس وقت۔ وہ بھی آملیٹ کھالیں گی۔" عذیر بولا۔

"آپا! اگر گھر میں ٹماٹر موجود ہوتے تو آج آپ کو انڈا گھوٹالا بنا کر کھلاتی۔ وہی جو تایا ابو کا خانساماں بناتا ہے۔" چھوٹی نے کہا۔

"بھئی اب ٹماٹر نہیں ہیں تو تم آملیٹ ہی بنالو۔ دس بج کر چالیس ہوگئے ہیں۔ اور ابھی دور دور تک سونے کے آثار نظر نہیں آرہے۔"

"آپا! معلوم بھی ہے اس چھوٹی کے تین نام ہیں۔ تین۔ چھوٹی۔ فرحین اور دیوار گیری۔ مگر دیوار گیری اس کے لیے سب سے موزوں نام ہے۔ ایمان سے چپک ہی جاتی ہے یہ چھپکلی کی طرح ہر جگہ۔ اب دیکھیں آپ آملیٹ بنانے کہہ رہی ہیں اور یہ انڈا گھوٹالا بنانے کا خیالی پلاؤ پکا رہی ہے کیونکہ چپک کر جو رہ گئی ہے اس جگہ۔"

"تم میٹرک میں ہو۔ تم نے قرآن شریف بھی دو تین مرتبہ ختم کیا ہے۔ لیکن شاید تم نے قرآن شریف کے معنی نہیں پڑھے۔ معلوم بھی ہے مذاق میں بھی کسی کا کوئی نام رکھنے اور پھر اس نام سے اسے پکارنے کی سختی سے مخالفت کی گئی ہے۔ اور چھوٹی عمر میں تم سے بڑی ہے۔ اور تمہاری بہن ہے۔ بہن کا احترام یوں بھی لازم ہوتا ہے۔ اور تم اس کے بارے میں کوئی بات کرتے ہو یہ چھوٹی یہ کہہ رہی ہے۔ اس کا نام یہ ہے وہ ہے۔ کیا کہہ رہی ہیں کہنے سے تمہاری زبان نہیں دکھتی ہے۔ کتنی بار

میں نے منع کیا ہے تمہیں مگر تم مانتے ہی نہیں لیکن آیندہ میں تمہیں اس سے بات کرتے نہ سنوں۔ سمجھے۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں خوب سمجھ گیا۔ اچھی طرح سمجھ گیا۔ اور اب مجھے سخت نیند آرہی ہے لہٰذا باقی آیندہ اور خدا حافظ۔"

عذیر اتنا شریر نہیں تھا جتنا کہ اب ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے اپنی بات کہہ کر چلا گیا تو وہ مسکراتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

پھر تینوں ماں بیٹیوں نے اپنے اسی واحد اور رہائشی کمرے میں بیٹھ کر توسوں کے ساتھ آملیٹ کھایا۔ جب کہ خورشید جہاں کھانے سے انکار ہی کرتی رہیں۔ لیکن عنبر اور چھوٹی نے انہیں زبردستی دو توس ضرور کھلا دیے۔ اور پھر کھانے سے فارغ ہو کر جب دونوں بہنیں نزدیک نزدیک بچھے اپنے پلنگوں پر لیٹیں تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ جب کہ وہ زیادہ سے زیادہ دس بجے تک سو جانے کی عادی تھیں۔ ماں تو کھانا کھاتے ہی سو گئی تھیں لیکن تھکن سے چور چور ہونے کے باوجود دونوں بہنوں کو ایک دم لیٹتے ہی نیند نہیں آئی۔ چھوٹی اصرار کر رہی تھی کہ عنبر غزل کی آفر قبول کرلے۔

اگلی صبح۔ تینوں ماں بیٹیوں کی ہی نہیں بلکہ عذیر کی آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی۔ وہ بھی کسی کے زور زور سے دستک دینے پہ۔ خلاف توقع عالیہ کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر عذیر چونکا اور بنیان پہنے ہوئے تھا الٹے پیروں اندر بھاگا اور جا کر بہن کو عالیہ کے آنے کی اطلاع دی تو اس کے تو دم پر بن گئی۔ کیونکہ اس نے میلے اور پرانے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ نہ انہیں بدل سکتی تھی نہ کمرے کا حلیہ ہی درست کرنے کا وقت تھا۔ وہ جیسی بھی تھی اور جس حال میں بھی تھی جلدی سے اپنی سلکن چادر لپیٹ کر بیٹھک میں آگئی۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ صرف عالیہ ہی آئی تھی جو اسے دیکھ کر چھوٹتے ہی بولی۔ "کمال ہے اتنا دن چڑھ آیا اور تم ابھی تک سو رہی تھیں۔ معلوم ہے دس بج رہے ہیں اس وقت۔"

"ہاں وہ اصل میں کل امی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ اصل میں ان کا بلڈ پریشر بہت لو ہے۔ اس پر انہوں نے کل روزہ بھی رکھ لیا تھا۔ اور اتفاق سے کل گرمی بھی کچھ زیادہ پڑی تھی اس لیے امی بے ہوش ہوگئی تھیں اس لیے انہیں ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ وہاں امی کو ٹریٹمنٹ دلاتے دلاتے شام ہوگئی۔ ادھر عذیر اسکول سے آیا تو ہمیں گھر پر نہ پاکر تمہارے پاس پہنچ گیا۔" عنبر نے ساتھ کے ساتھ عذیر کے اس کے ہاں جانے کی وضاحت بھی کردی۔

"ہائے میری تو جان ہی نکال دی تھی تمہارے بھائی نے پہلی مرتبہ آیا تو میں یہی سمجھی کہ تم اپنی والدہ کے ساتھ اپنے کسی رشتے دار کے ہاں چلی گئی ہوگی۔ اور تمہیں وہاں سے واپسی میں دیر ہوگئی ہوگی۔ اور جب یہ آیا تو تمہیں نہ پاکر ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ مگر جب یہ رات کو اپنے کزن کے ساتھ میرے پاس آیا تو میرا تو پریشانی کے مارے برا حال ہوگیا۔ اسی لیے صبح اٹھتے ہی بھاگی چلی آئی۔"

"تمہیں امی کی کیا پریشانی ہوتی۔ تم آئی ہو یہ دیکھنے کہ کہیں میں تمہاری سہیلی کی دی ہوئی رقم لے کر کہیں فرار تو نہیں ہوگئی۔"

"ہائے ہاؤ مین یو آر — میں اگر اس مقصد سے آتی تو تم میری عادت جانتی ہی ہو صاف صاف اپنا مقصد تمہارے سامنے واضح کردیتی۔ میرے خیال میں تو یہ ذرا ذرا سی بات پر اس قدر کمپلیکسڈ ہو جانے کی عادت بھی تمہارے حالات نے تمہارے اندر ڈالی ہے۔ لیکن یہ کوئی اچھی عادت نہیں عنبرین۔ پلیز عنبرین دیکھو، تم میری باتوں کا برا نہ ماننا۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں ایک ہمدرد اور دوست ہونے کے ناتے سے تمہارے بھلے کو ہی کہہ رہی ہوں۔" عالیہ نے کہا تو نہ معلوم کیوں عنبر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

وہ خاموش بیٹھی اپنے اشکوں کو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

"اتنی خوبصورت ہو اتنی پیاری ہو مگر دماغ تمہارا عرش پر ہی چڑھا رہتا ہے۔ بہت ہی نخرے کرتی ہو تم عنبرین۔ اب کسی طرح بتا بھی چکو کہ تم نے آخر کیا فیصلہ کیا ہے۔" عالیہ نے بڑی یگانگت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے عالیہ کہنا تو یہ چاہ رہی تھی کہ اتنی غریب ہو۔ پیسے پیسے کو محتاج ہو مگر دماغ تمہارا آسمان پر چڑھا رہتا ہے۔ نہ جانے کس بات پر اتنا نخرہ کرتی ہو۔ مگر کہہ یہ دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"اچھا اچھا بس۔ اب بہت جتالی ہمدردی۔ اور اب میں بھی تمہیں یہ خوشخبری سنانا چاہتی ہوں کہ میں نے غزل کی آفر کو قبول کرلیا ہے۔" عنبر اپنی اتنی پیاری دوست کی باتوں سے متاثر ہو کر بولی۔

"کیا سچ۔" عالیہ خوشی میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"ہاں بھئی، تو کیا مذاق کر رہی ہوں۔ وہ بھی تم سے۔" عنبر نے ہنس کر کہا تو عالیہ اس سے لپٹ گئی۔

"سچ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ تم اتنی شریف، خاندانی اور خوبصورت ہو۔ تمہاری زندگی کا کیا بنے گا۔ میں ہمیشہ تمہاری معترف رہی ہوں کہ تم نے کتنے بُرے حالات میں بھی ہمیشہ اپنی عزت اور وقار کو قائم رکھا۔ تم نے کسی معاملے میں بھی خود کو گرنے نہیں دیا۔ حتیٰ کہ اس معاملے میں بھی نہیں جب کہ ان حالات میں یہ آٹھ ہزار کی رقم تمہارے لیے کسی آزمائش سے کم ثابت نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کے باوجود تم اپنے مؤقف پر اڑی رہیں۔ اچھا۔ اب میں چلوں گی۔ اور جاتے ہی غزل کو فون پر یہ خوشخبری سناؤں گی۔ سچ اس کا تو شاید دم ہی نکل جائے گا — یعنی وہی شادیٔ مرگ کی سی کیفیت ہوگی کیونکہ اس نے تو میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔ دن میں دس مرتبہ فون کر کے پوچھا کرتی تھی۔" عالیہ اپنے آنسو پونچھ کر خوشی میں بولتی چلی گئی۔

عالیہ کے جاتے ہی وہ ماں کے پاس پہنچی۔ جو اب بلا ٹیک لگائے یا کسی چیز کا سہارا لیے چائے پی رہی تھیں۔

"امی امی! ایک تازہ خبر ایک اچھی خبر آج کی صبح کے نام۔" وہ خوشی میں ایک کھلنڈری سی لڑکی بن گئی اور ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اچھا اچھا عالیہ نے سنائی ہوگی تمہیں کوئی اچھی خبر۔" ماں نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتار کر پوچھا۔

"نہیں اس نے نہیں سنائی بلکہ میں آپ کو سنا رہی ہوں۔ امی! میں نے وہ عالیہ والی ملازمت قبول کر لی ہے۔ اب یہ سارے پیسے آپ کے۔ جس طرح جی چاہے خرچ کریں۔"

عنبر نے اپنی بات کہتے کہتے نوٹوں کی گڈی ماں کی گود میں ڈال دی۔ مگر ماں ذرا بھی خوش نہیں ہوئیں اور بلا کوئی تاثر دیے خاموشی سے چائے پیتی رہیں۔

"کیوں امی۔ آپ خوش نہیں ہوئیں۔ میں نے تو اتنی بھاری ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔" عنبر نے تھوڑا سا بجھ کر پوچھا۔

"تم نے اگر بھاری ذمہ داری اپنے سر بھی لی ہے تو تم سدا سے ہی خود مختار اور خود سر ہو ورنہ میں نے تو تم سے یہی کہا تھا کہ پیسے پر ہرگز نہ ریجھنا۔ یہ دھوکے کی ملازمت ہے اور سعد بھی یہی کہہ رہا تھا بلکہ وہ تو سخت مخالفت کر رہا تھا اس نوکری کی۔ وہ تو یہی کہہ کر گیا ہے۔ آپ ہرگز ہرگز اجازت نہ دیجیے گا — مگر — مجھ بے کس اور بے سہارا کی بھلا کیا حیثیت اور کیا اوقات جو تمہیں مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت پڑتی۔ تم تو اپنے فیصلے خود کرنے کی عادی ہو۔ پھر میرے خوش اور ناخوش ہونے سے بھلا تمہیں کیا سروکار۔"

ماں نے یہ کہہ کر گویا اس کی ساری خوشی ملیامیٹ کر دی۔ اور وہ جو عالیہ کو اپنا فیصلہ سنانے کے بعد خود کو ہوا کے دوش پر اڑتا محسوس کر رہی تھی ماں کی باتوں سے آزردہ سی ہو کر بولی۔

"امی! میں بھی کیا کرتی۔ مجھے بہت مجبور ہو کر یہ ملازمت قبول کرنی پڑی ہے۔ کیونکہ ساڑھے چھ سو کے قریب تو مجھ سے کل خرچ ہو گئے۔ امی آپ پر تو میں اپنی جان بھی وار دوں — یہ ساڑھے چھ سو کیا۔" بیٹی نے بڑی خوبصورتی سے ساڑھے چھ سو روپے خرچ ہونے کا ذکر کیا تو خورشید جہاں کے ممتا بھرے سینے میں دھمک سی ہونے لگی۔ انہوں نے پیالی پلنگ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے میرے اوپر اتنے سارے پیسے کیوں خرچ کیے عنبر۔ جب زندہ رہنا ہی تھا تو میں بغیر علاج کے بھی رہ جاتی۔ اب بیکار میں یہ چھ سو روپے خرچ کر کے تم پھنس گئیں ناں۔ تو یہ کنجیاں لو اور میرا بکس کھول کر میرا سونے کا لاکٹ نکال لو۔ آٹھ سو تک تو بک ہی جائے گا۔ کیونکہ اب سونا بہت مہنگا ہو گیا ہے۔"

"نہیں امی! اس لاکٹ کو تو آپ بھول ہی جائیے۔ وہ آپ کے پاس ابا کی ایک ہی نشانی ہے اور آپ کو یاد ہوگا ابا مرحوم نے ایک مرتبہ آپ کو نصیحت کی تھی کہ ایک آدھ دن کا فاقہ کر لینا مگر اپنا زیور کبھی نہ بیچنا۔"

عنبر نے ماں کے کنجی والے ہاتھ کو پیچھے ہٹا کر اپنی طرف سے انہیں اطمینان دلایا تو ماں تھوڑی دیر کچھ سوچتی رہیں پھر انہوں نے بسم اللہ کہہ کر وہ گڈی گود سے اٹھائی اور اسے دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھ کر دعائیہ انداز میں ہاتھ اونچے کرتے ہوئے اسے دعا دی۔

"خدا تجھے عمر دے۔ عزت و آبرو کے ساتھ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اللہ تجھے اتنا دے اتنا دے کہ تو رکھ رکھ کر بھول جائے۔ اللہ تیرا نصیب کھولے اور تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔"

"ہیں ہیں امی، آپ تو دعا کرتے کرتے بہک ہی گئیں۔" عنبر ان کی دعا کے اختتامیہ الفاظ پر گھبرا کر بولی۔ اور چھوٹی جو ناشتے ... اسی دم کمرے میں داخل ہوئی تھی ماں کی دعا کے آخری الفاظ سن کر حسبِ عادت ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی ... عنبر اپنی مسکراہٹ دبائے نیچے فرش کو تکتی رہی۔ پھر بہن اور ماں کے ساتھ ناشتا کرنے کے بعد عنبر جلدی سے اٹھی اور ... گڈی میں سے پانچ نوٹ نکال کر بقیہ رقم کو اپنے بکس میں رکھ کر مقفل کر دیا اور پھر عذیر کو پکارا۔

"ارے عذیر کہاں غائب ہو تم اتنی دیر سے۔ ذرا ادھر تو آؤ۔" تو عذیر جو پہلے ہی لیٹ ہو چکا تھا اور بیٹھک میں جلد جلد ... جانے کی تیاری کر رہا تھا وہیں سے بولا۔

"آپا! ابھی آتا ہوں۔ ذرا موزے پہن لوں۔"

"آج تمہیں اسکول سے چھٹی کرنی ہوگی کیونکہ آپا کا موڈ آج شاپنگ کرنے کا ہو رہا ہے اس لیے تمہیں ہمارے ساتھ ... چلنا ہوگا۔ سمجھے تم۔" اور جواب میں اف اف کہہ کر اپنا کان کھجاتے ہوئے عذیر نے پہلے چھت کی طرف دیکھا اور پھر فرش ... لگا۔

چھوٹی بڑی ترنگ میں بول رہی تھی کہ وہ بھی بہن کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہی تھی اور اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ... نا جب کہ عنبر کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اس نے چھوٹی کی باتوں سے اکتا کر کہا۔

"او ہو بھئی چھوٹی چھوڑو یہ اپنی لن ترانی اور جلدی سے ایک کاغذ پر پورے مہینے کے راشن کی فہرست لکھ لو۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ پورے مہینے کے لیے کتنا راشن کافی ہوگا اور کتنے کا آئے گا۔"

"آپا! آج تک ہمارے یہاں پورے مہینے کا راشن آیا ہی کب ہے جو یہ اندازہ ہو کہ کتنی تعداد یا مقدار میں فلاں چیز آئے گی ... ساری چیزوں کا کتنا بل بنے گا۔ البتہ یہ عذیر ایک مرتبہ دو سو روپے کا راشن لایا تھا جس میں سبزی اور گوشت بھی شامل تھا ... راشن ہمارے ہاں دس دن تک چلا تھا۔" چھوٹی نے بتایا تو عنبر جو یہ سوچ رہی تھی کہ گھر کے لیے کن کن اشیاء کا آنا ضروری ... چھوٹی کے جواب پر توجہ دیے بغیر بولی

"گوشت تو خیر یہیں سے منگوا لیں گے۔ تم ایسا کرو کہ پانچ کلو چاول، پانچ کلو چینی، ایک بڑا ٹن گھی کا۔ بیسن، چنے، دالیں اور ... مسالے اور ان کے علاوہ جو ضروری چیزیں ہوں انہیں بھی فہرست میں شامل کر دو۔ اور ہاں سبزی بھی آئے گی۔ آلو، پیاز، لہسن، ادرک ... گرم مسالہ اور — اور — وہ منہ دھونے کا صابن، دیسی صابن، ٹوتھ پیسٹ اور تین عدد برش اور وہ جو کٹ آتی ہے نا ... پلیٹ کی وہ بھی لکھ لو۔ رہ گئے کپڑے وغیرہ تو وہ تو میں خود اپنی پسند سے خریدوں گی۔" عنبر سوچ سوچ کر اور یاد کر کر کے ... تا رہی اور عذیر جو آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس نے آگے بڑھ کر پہلے عنبر کی کلائی ... ہو کر دیکھا اور پھر پیشانی کو۔

"آپا پتیلیوں کا مسئلہ تو خیر بعد میں حل ہو جائے گا لیکن ایک تو آپ چھوٹی سی ایک کڑاہی ضرور خرید لیں۔ دوسرے وہ سلور ... پتیلی جس میں چائے دم کی جاتی ہے اب جل جل کر ایسی ہو گئی ہے جیسے کسی نے توے کو توڑ موڑ کر چولھے پر رکھ دیا ہو۔ ایمان سے ... تو بے ہاتھ گھس جاتے ہیں مگر اس کی کالک کسی طرح نہیں اترتی۔ ڈھکنا بھی ٹوٹ کر الگ ہو گیا ہے۔" عذیر کے ... بعد چھوٹی نے کہا تو عنبر بولی۔

"ہاں واقعی عنبر تم کیتلی بھی فہرست میں شامل کر دو اور چھ پیالیاں اور ایک لیمن سیٹ بھی۔"

"آپا لیمن سیٹ — ؟" چھوٹی نے پوچھا۔

"ہاں بھئی چھ گلاسوں کے ساتھ جو جگ ہوتا ہے، اسے لیمن سیٹ ہی کہتے ہیں۔"

چھوٹی ایک کاپی پر جھکی عنبر سے پوچھ پوچھ کر چیزوں کی لسٹ بنا رہی تھی۔ کاپی کے تین صفحے مطلوبہ اشیاء سے بھر چکے ... کو دیکھ دیکھ کر خوشی کے مارے چھوٹی کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

"اچھا۔ اب تم تو یہاں سے اٹھو چھوٹی۔ پہلے اپنے کپڑے نکال کر استری کر لو۔ پھر۔ ارے ہاں ابھی تو دوپہر کے کھانے کا ... بھی تو کرنا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جو جلدی سے پکا کر کھا لی جائے۔ کیونکہ عذیر کے آتے ہی یہاں ... جانا ہے۔" عنبر بولی تو چھوٹی نے سوچ کر کہا۔

"آپا! مشکل تو یہ ہے کہ گھر میں کوئی چیز موجود نہیں۔ ایسا کیوں نہ کریں کہ ایک انڈا اور تین توس باقی بچے ہیں وہ کھالیں اور ہم دونوں باہر کسی چاٹ شاپ پر کچھ کھالیں گے۔"

"ارے واہ اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ لیکن کیا تین توس اس کے لیے کافی ہوں گے۔ میرا مطلب ہے اس سے تمہیں بھرے گا ان سے۔"

"نہیں نہیں، مجھے تین توس بہت ہوں گے۔ اور ابھی تو میں نے ناشتا کیا ہے۔ تم انڈا تل کر رکھ جاؤ چھوٹی۔ مجھے بھوک لگے گی تو کھالوں گی۔"

اور پھر چھوٹی نے یہی کیا مگر ماں کے لیے انڈا تلنے سے پہلے چھوٹی نے اپنے اور عنبر کے کپڑے نکال کر استری کیے اور پھر انڈا تل کر توسوں سمیت نعمت خانے میں ڈھانپ کر رکھ دیا۔ پھر نہا دھو کر اور لباس تبدیل کر کے دونوں بہنیں عذیر کا انتظار کرنے لگیں۔ عذیر ٹیکسی لے کر آیا تو دونوں بہنیں اس کے ساتھ بازار روانہ ہوگئیں۔

کم کم کہنے اور احتیاط کرنے کے باوجود بھی انہوں نے واقعی ڈھیر ساری چیزیں خرید لی تھیں اور خریداری میں اتنی دیر لگ گئی تھی کہ گھر آتے آتے شام ہوگئی تھی۔ سارا سودا لیاقت مارکیٹ (سپر مارکیٹ) سے خرید اگیا تھا۔ احتیاط کے طور پر ... ہزار روپے ساتھ لے کر گئی تھی جو سب کے سب ختم ہو گئے تھے۔ صرف ٹیکسی کا کرایہ ہی بچا تھا۔ وہ تینوں لدے پھندے خوشی خوشی گھر آئے تو غزل کی گاڑی کو بیٹھک کے آگے کھڑا دیکھ کر عنبر کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔ جی چاہا ٹیکسی مڑوا کر کہیں چلی جائے کیونکہ یہ سارا سامان جو وہ لے کر آئی تھی غزل اسے دیکھتے ہی سمجھ جاتی کہ یہ اسی کے دیے ہوئے پیسوں سے خریدا گیا ہے اور عنبر کی غیرت اس بات کو گوارا نہیں کر رہی تھی۔ ڈرائیور تو پہلے ہی ڈگی کھول چکا تھا۔ اس نے ڈگی میں رکھا ہوا سامان اس سے نکال نکال کر زمین پر رکھنا شروع کر دیا۔ دو تین پیکٹ جو نسبتاً ہلکے تھے چھوٹی نے اٹھا لیے اور باقی محلے کے ایک لڑکے کی مدد سے عذیر نے جلدی جلدی اندر رکھوائے۔ تب کرایہ ادا کر کے عنبر بڑے استکراہ کے ساتھ اندر آگئی۔ غزل سامنے صوفے پر بیٹھی خورشید جہاں سے نہ معلوم کیا باتیں کر رہی تھی۔ وہ شرمندگی اور شرم کے احساس میں سرتاپا غرق عنبر کو دیکھتے ہی ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور مسکرا کر بولی۔

"اوہو یہ ٹھاٹھ ہیں۔ شاپنگ کر کے آرہی ہو تم۔" چلو یہ اچھا ہی کیا تم نے۔ گھر میں ہر چیز موجود ہوتی ہے تو سارا مہینہ آرام سے گزرتا ہے۔" اور غزل کے ان الفاظ نے عنبر کو پانی پانی کر کے رکھ دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ کہ اور تو میرے دیے ہوئے پیسوں سے یہ اتنی ڈھیر ساری چیزیں لائی ہو ورنہ بھلا تمہاری اتنی حیثیت اور اوقات ہی کہاں تھی کہ تم اپنے لیے وقت کی روٹی بھی چین سے مہیا کر سکتیں۔ اس کی صورت بالکل ہی اتر کر رہ گئی۔

"وہ دراصل ہمارے گھر کا راشن تو ہمیشہ پہلی یا دوسری تاریخ کو ہی آتا ہے لیکن چونکہ کل یا پرسوں سے ماہ رمضان شروع ہونے والا ہے اس لیے ہمیں مزید شاپنگ کرنی پڑی کیونکہ روزے میں تو گھر سے باہر نکلنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔" چھوٹی نے بہن کو جواب دینے کی زحمت سے بچاتے ہوئے کہا۔ اور غزل نے بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عنبر کو گلے سے لگا کر کہا۔

"ہماری کمپنی میں تمہاری آمد تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔ سچ مجھے اتنی خوشی ہوئی عالیہ سے یہ سن کر کہ تم نے میری آفر قبول کر لیا ہے کہ میں بس مرتے مرتے بچی۔ دل چاہا کہ اسی وقت گاڑی لے کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں مگر وہ جو گلشن ہے آج چار بجے کے پلین سے لاہور جا رہا تھا اس لیے اسے ایئر پورٹ پر سی آف کرنے کے بعد ہی تمہارے پاس آنے کا موقع مل سکا۔ اور یہاں آئی تو تم کو غائب پایا۔ مگر میں نے بھی سوچا کہ خواہ تم کو واپسی میں رات ہی کیوں نہ ہو جائے میں آج تم سے مل کر ہی جاؤں گی۔" غزل نے یہ پوری بات کہنے کے بعد ہی اسے اپنی بانہوں کے حلقے سے آزاد کیا۔ تب کہیں جا کر عنبر کی جان میں جان آئی۔ غزل نے ایک بڑا سا تہہ کیا ہوا کاغذ پرس سے نکال کر عنبر کو دیتے ہوئے جس کی تمام تر توجہ غزل کی طرف تھی کہا۔

"غور سے کھول کر پڑھو۔"

اس نے انگلش میں درج کاغذ کی عبارت پڑھی اور پھر ایک دم ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے بگڑے بگڑے انداز میں کہا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ اس رقم کا کوئی اندراج ہوگا اور نہ اس کے سلسلے میں کوئی لکھا پڑھی ہوگی مگر یہاں تو کچھ اور ہی لکھا ہے۔ یہ ہیں نے اپنی ضرورت کے تحت تم سے ایڈوانس میں یہ رقم وصول کی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے تم مجھ سے اسی کاغذ پر سائن کرانے آئی ہو۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں غزل۔"

"ارے نہیں عنبر! تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہمیں چونکہ انکم ٹیکس والوں کو اپنا سارا حساب دکھانا پڑتا ہے۔ ورنہ وہ ہم پر بہت زیادہ ٹیکس ٹھونک دیتے ہیں بس اسی وجہ سے تم سے سائن کروانا پڑ رہا ہے ورنہ کوئی ایسی بات نہیں۔" غزل نے اسے اطمینان دلانے کی غرض سے بڑے شیریں لہجے میں کہا مگر وہ تو جیسے ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔

"لیکن میں تمہاری کسی مصلحت کو نہیں گردانتی کیونکہ میں نے تم سے آٹھ ہزار روپوں کی بھیک مانگی تھی نہ قرض کے طور پر ہی تم سے لیے تھے۔ پھر بھلا میں پاگل تو نہیں ہوں کہ اس کاغذ پر دستخط کروں گی جب کہ تم نے تو عالیہ کے سامنے بھی اس رقم کے معاملے میں کوئی لکھا پڑھی نہیں کی تھی۔ بلکہ یہی کہا تھا کہ اسے ہماری طرف سے ایک گفٹ سمجھو۔" آخری فقرہ عنبر نے چبھتے لہجے میں کہا۔ غزل کو اس کی صاف گوئی پر تاؤ تو بہت آیا پھر بھی وہ بڑے تحمل سے کام لے کر بولی۔

"اوہو تو میں کب مکر رہی ہوں اس بات سے۔ یہ رقم ہماری طرف سے ایک گفٹ ہی تھی بلکہ ہے۔ اب رہی دستخط کرنے کی بات تو یہ چونکہ ہمارے بزنس کے اصولوں میں ایک لازمی اصول ہے اس لیے یہ اتنی سی فارمیلٹی برتنی پڑ رہی ہے مگر اس سے تمہارے لیے کوئی فرق تو نہیں پڑے گا۔"

"واہ کیسے نہیں پڑے گا۔ اب میں اتنی بدھو بھی نہیں ہوں کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکوں کہ یہ جو تم نے فارم میں قرض کا لفظ ٹھونسا ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ میرے دستخط کرا کے میری گردن پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں بھی غزل میں بزنس کی چالوں سے ناواقف ضرور ہوں مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ بزنس کی ساکھ زبان کی سچائی سے ہی قائم ہوتی ہے ویسے بھی یہ ایک عام اصولی سی بات ہے کہ انسان کی زبان ایک ہونی چاہیے یعنی زبان سے ایک مرتبہ جو کہا جائے بس اسی پر قائم ہونا چاہیے۔"

عنبر بگڑے بگڑے سے لہجے میں بولی تو غزل نے جس کے تیور بگڑ سے گئے تھے پیشانی پر شکنیں ڈال کر پوچھا۔

"تو پھر گویا تم نے تہیہ ہی کر لیا ہے کہ اس کاغذ پر دستخط نہیں کرو گی۔؟"

"ہاں تہیہ ہی نہیں یہ میرا قطعی فیصلہ بھی ہے۔" عنبر متانت سے بولی۔

"ٹھیک ہے پھر تم میری رقم واپس کردو۔" غزل نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"ہاں ہاں ضرور۔ ابھی لاتی ہوں۔" عنبر تیزی سے اٹھی مگر اس لمحے اسے خیال آیا کہ سولہ سو روپے تو اس نے خرچ کر لیے ہیں تو اس نے جاتے جاتے رک کر کہا۔

"رقم تو لائے دیتی ہوں مگر..." مگر غزل نے اس کی بات کاٹ کر درشت لہجے میں کہا۔

"میرے پاس تمہاری اگر مگر سننے کا بالکل وقت نہیں۔ بس تم جلدی سے میری رقم لے آؤ۔" تو عنبر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی آئی اور پھر بڑی عجلت میں اپنا بکس کھول کر رقم نکالی اور جلدی جلدی سے گنا۔ چھ ہزار چار سو روپے ہی باقی رہ گئے تھے۔ اور یہی بات وہ غزل کو بتانا چاہ رہی تھی مگر اس نے کچھ سننا گوارا ہی نہیں کیا تھا اس لیے عنبر سولہ سو روپے خرچ کر دینے پر سخت متاسف بھی ہو رہی تھی اور معاملہ بگڑ جانے پر ملول بھی۔ بارے وہ رقم مٹھی میں دبا کر بیٹھک میں آگئی۔

"لو بھئی سنبھالو یہ اپنی رقم۔" اس نے وہ رقم غزل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا لاؤ۔ مگر پورے آٹھ ہزار ہیں نا؟" غزل نے رقم ہاتھ میں لینے سے پہلے پوچھا۔ تو جواب میں قدرے تامل کے بعد عنبر بولی۔

"یہی تو میں ابھی ابھی تم کو بتانا چاہ رہی تھی کہ سولہ سو روپے مجھ سے خرچ ہوگئے۔ مگر یہ چھ ہزار چار سو تو ہیں۔ باقی رقم میں بعد میں..." مگر عنبر کی یہ بات تو ایسا لگا جیسے جلتی پر تیل چھڑک دیا گیا ہو۔ غزل سچ مچ کچھ اس طرح بھڑک اٹھی اور چیخ کر بولی۔

"نہیں بعد کا وعدہ کیسا مجھے تو ابھی اور اسی وقت اپنی پوری رقم چاہیے۔ میں ایک پائی بھی کم نہیں لوں گی پورے

اکٹھے ہزار دو۔ ورنہ تمہاری ایسی درگت بناؤں گی کہ تم...“

”ارے ارے غزل آپا یہ آپ اتنا چیخ کیوں رہی ہیں۔ پلیز ذرا آہستہ تو بولیے۔“ چھوٹی جو غزل کی پاٹ دار آواز سن کر بیٹھک میں آ گئی اور اس کے اس قدر زہر اچھال کر بولنے کی وجہ سے لاعلم تھی اس نے اسے چیخنے سے باز رکھتے ہوئے کہا۔

”ارے جا غزل آپا کی بچی! میں کوئی تیری آپا وا پا نہیں ہوں۔ ہاں تو بھلا۔ اتنے نیچ اور فقطے لوگ اور مجھ سے ناتا جوڑنے بیٹھے ہیں۔“ غزل اپنی بات کہتے کہتے کھڑی ہو گئی۔ تو عنبر جس کی سمجھ میں ایک دم ہی نہ آتا تھا کہ کیسے اور کیونکر غزل کی رقم پوری کر کے دے، اس کے ذہن میں معًا ایک خیال آیا تو اس نے بڑے لجاجت بھرے انداز میں غزل سے کہا۔

”اچھا ٹھہرو غزل میں ابھی تمہاری رقم پوری کیے دیتی ہوں۔“ اور پھر وہ غزل کا جواب سنے بغیر بھاگ کر کمرے میں چلی آئی۔

”امی۔ وہ آپ کی سونے کی چین کتنی قیمت کی ہو گی؟“ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ماں سے پوچھا جو کمزوری کی وجہ سے آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھیں۔

”کیوں میری چین کا اس وقت کیسے خیال آ گیا تمہیں۔“ انہوں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بس امی ایسے ہی۔ ذرا دیکھنا چاہ رہی تھی اس چین کو۔“ اس نے گول مول سا جواب دیا۔

”دیکھنا چاہ رہی تھیں یا اس چین کی صورت میں سولہ سو پورے کرنا چاہ رہی تھیں۔ اسی لیے کہہ رہی تھی کہ ذرا دیکھ داکھ کر پیسہ خرچ کرو مگر تمہارے ہاتھ تو پہلی بار اتنی بڑی رقم آئی تھی تم کچھ سنتیں بھلا۔“

”اوہو امی! یہ نصیحت کرنے کا وقت نہیں ہے بلکہ اس وقت بڑی نازک پوزیشن ہو رہی ہے ہماری۔ آپ جلدی سے مجھے وہ چین دیجیے تاکہ اسے غزل کو دکھا کر یہ اطمینان تو دلا دوں کہ میں بالکل ہی کنگلی اور قلاش نہیں ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں امی۔ میں ابھی ابھی وہ چین آپ کو لوٹا دوں گی۔“ اسے ماں کی نصیحت بہت بے موقع لگی تو وہ جھنجلا کر بولی۔

”نہیں اگر نہ بھی لوٹاؤ گی تو مجھے ذرا ملال نہ ہو گا۔ کیونکہ عزت سے بڑھ کر کوئی شے بھی عزیز نہیں ہوتی۔ یہ تو پھر بھی ایک طلائی زنجیر ہی ہے۔“ خورشید جہاں نے کہا اور پھر چین نکالنے کی غرض سے اٹھنے لگیں تو عنبر نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اٹھنے سے باز رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں آپ کیوں اٹھ رہی ہیں۔ لائیے مجھے اپنے بکس کی چابی دے دیں۔ میں خود نکال لیتی ہوں۔“ تو جواب میں نہایت خاموشی سے انہوں نے بیٹی کے ہاتھ میں اپنے بکس کی چابی تھما دی۔

”وہ بکس کی تہہ میں دائیں طرف جو پیلا ریشم کا کرتا رکھا ہوا ہے میں نے اسی میں چھپا کر رکھی ہے وہ زنجیر۔ جس روز تمہارے باوا اس دنیا سے سدھارے تھے اسی روز میں نے اسے اتار کر رکھ دیا تھا۔“ گو انہوں نے یہ بات کہی تو سیدھے سادے انداز میں تھی مگر ان کے لہجے سے جو کرب سا جھانک رہا تھا اس نے عنبر کو بے کل سا کر کے رکھ دیا۔ مگر یہ احساسات یا جذبات کو انگیز کرنے کا وقت نہ تھا کہ واقعی عزت کا معاملہ تھا۔ اس نے جلدی جلدی اوپر کے کپڑے ہٹائے اور نیچے تہہ میں رکھا زرد ریشمی کرتا آخر ڈھونڈ ہی نکالا اور پھر اٹھ کر کرتے کو جھاڑا تو طلائی زنجیر اس کے پیروں میں آ گری جسے اٹھا کر وہ چند ثانیے تکتی رہی۔ زنجیر میں ایک چھوٹا سا لاکٹ بھی پڑا ہوا تھا جس پر مینا کاری سے ایس۔ ایچ۔ کے کے حروف کندہ تھے۔

”پورے تین تولے کی ہے تعویز سمیت۔“ خورشید جہاں نے کہا۔ انہوں نے لاکٹ کو تعویز کہا تھا۔ لیکن عنبر نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور لاکٹ کو ہاتھ میں لیے سیدھی غزل کے پاس آ گئی۔

”لو فی الوقت تو اسے اپنے پاس رکھ لو پورے تین تولے کی ہے یہ اور سولہ سو سے زیادہ میں ہی بکے گی کیونکہ آج کل دس گرام سونے کا بھاؤ ڈھائی ہزار روپے ہے نا۔ لیکن مجھے تم پر پورا بھروسا ہے کہ جب میں تمہاری بقایا رقم تمہیں پہنچا دوں گی تو تم مجھے یہ چین واپس لوٹا دو گی۔“ اس نے یوں کہا جیسے کہہ رہی ہو کہ لو دیکھو۔ تم تو صرف سولہ سو روپے کے لیے مری

جا رہی تھیں اور ایک میں ہوں کہ بلا لکھا پڑھی کیے تمہیں یہ اتنی قیمتی زنجیر سونپ رہی ہوں۔ مگر اس کی بات کا ردعمل یکسر الٹا ہی ہوا۔ غزل نے وہ زنجیر اپنی گود سے جھٹک کر یوں دور پھینکی جیسے وہ طلائی زنجیر نہیں کوئی انتہائی زہریلا سانپ ہو۔ وہ جو عنبر کے یہ کہنے پر کہ ”اچھا ٹھہرو غزل میں ابھی تمہاری رقم پوری کیے دیتی ہوں“ اس کے انتظار میں بیٹھ گئی تھی زنجیر کو دور اچھال کر ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھنکارنے کے انداز میں بولی۔

”ہے دُرفٹے۔ میں نے تم سے اپنے پیسے مانگے ہیں۔ سولہ سو روپے نقد۔ سمجھیں تم۔ یہ دو پیسے کی پیتل کی زنجیر نہیں۔ دیکھو تم سیدھی طرح سے میرے پیسے مجھے واپس کر دو۔ ورنہ...“

”لیکن یہ پیتل کی نہیں اصلی سونے کی زنجیر ہے غزل۔ تم چاہو تو کسی سنار کو دکھا کر بھی معلوم کر سکتی ہو کہ یہ اصلی ہے یا نقلی۔“ عنبر زچ ہو کر بولی۔

”اچھا۔ اگر تم نہیں لیتیں تو تم اپنی کار میں مجھے مارکیٹ تک لے چلو۔ میں یہ زنجیر بیچ کر وہیں تمہیں پیسے دے دوں گی۔ تم وہیں سے چلی جانا۔ میں بعد میں خود آ جاؤں گی۔“ عنبر نے اسے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بڑی لجاجت سے کہا۔

”واہ واہ اب میں چلوں تمہارے ساتھ۔ فقطی کہیں کی۔ جب تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ دس روپے بھی ادا کر سکے تو پھر تو نے میرے سولہ سو روپے کیوں خرچ کر دیے۔“ عنبر کے ملتجیانہ لہجے نے غزل کو اور بھی شیر کر دیا۔ وہ گلا پھاڑ کر بولی تو چھوٹی کو پھر اسے ٹوکنا پڑا۔

”اوہو پلیز ذرا آہستہ بولیے۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ ہمارے پڑوسی سنیں گے تو کیا کہیں گے۔“ اور چھوٹی کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غزل بیٹھک کے داخلی دروازے پر جا کھڑی ہوئی اور گلا پھاڑ کر بولی۔

”نہیں، یہ ہمارا آپس کا معاملہ نہیں بلکہ فراڈ کیس ہے یہ۔ تم لوگوں نے میرے دو ہزار روپے ہضم کر لیے۔ اب مانگ رہی ہوں تو آنکھیں دکھا رہے ہو۔ میں تو تمہارے سارے پڑوسیوں کو جمع کر کے تمہاری ایسی کرکری کروں گی کہ تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ میرے سولہ سو روپے دو ورنہ میں چیخ چیخ کر سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی اور سب کے سامنے تمہیں ذلیل کروں گی۔“

غزل نے تو صرف سارا محلہ اکٹھا کر کے ذلیل کرنے کی دھمکی ہی دی تھی اور وہاں چونکہ گلی ایک عام گزرگاہ تھی اور اس میں محلے والوں اور راہ گیروں کی ہر وقت ہی آمدورفت رہتی تھی۔ چنانچہ غزل کے گلا پھاڑ کر بات کرنے پر چند افراد کار کے پاس ہی رک گئے تھے جو بیٹھک کے دروازے کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ اس صورتِ حال نے نہ صرف خورشید جہاں کے دم پر بنا دی بلکہ عنبر اور چھوٹی کو بھی بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا کہ ایک صرف عزت ہی تو بچی تھی ان کے پاس اور اب وہ بھی غزل کے ہاتھوں محلے والوں کے سامنے خاک میں مل جائے گی۔ جب یہ ذلیل اور عزت اتار عورت سب کو یہ بتائے گی کہ ہم نے اس کے سولہ سو روپے ہڑپ کر لیے ہیں تو اس کے جواب میں ہم کس کس سے وضاحت کرتے پھریں گے۔ اف ہم تو کسی منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے۔ یہ خدشہ تینوں ماں بیٹیوں کو لرزا کر رکھ گیا۔ چھوٹی کی آنکھوں سے تو باقاعدہ آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے گلوگیر سے لہجے میں بہن سے کہا۔

”آپا! یہ ذلیل عورت اس طرح نہیں مانے گی۔ یہ پھڈا کرنے کے موڈ میں ہے۔ آپ یہ زنجیر مجھے دے دیں میں روشن کی ماں کے پاس گروی رکھوا کر ان سے پیسے لے لوں گی۔“ مگر عنبر آن کی آن میں کچھ اور ہی فیصلہ کر چکی تھی۔

”نہیں نہیں، تمہیں جانے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے غزل کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بڑی عجلت میں کہا اور غزل کے قریب جا کر بولی۔

”یہ سارا قضیہ اس وجہ سے ہے نا کہ میں نے تمہارے لائے ہوئے پیپر پر سائن نہیں کیے۔؟“ تو غزل کچھ دیر تک تو بڑے بپھرے ہوئے سے انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر نہایت درشت لہجے میں بولی۔

”ہاں اور کس وجہ سے ہے۔ لیکن یہ قضیہ میں نے نہیں خود تم نے کھڑا کیا ہے۔“

”چلو یہی سہی۔ اچھا لاؤ وہ پیپر نکال کر مجھے دے دو تاکہ میں اس پر سائن کر دوں۔“ عنبر سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

”مگر کیا تم واقعی سیریس ہو۔“ شاید غزل کو یقین نہیں آیا کہ عنبر واقعی سائن کرنے کے لیے تیار ہے۔

"میرا تم سے کوئی مذاق ہے نہ مذاق کرنے کا یہ کوئی موقع ہی ہے۔" عنبر نے تڑخے ہوئے لہجے میں کہا۔ تو غزل ــ پرس سے کاغذ نکالنے کے بجائے کچھ دیر تک اس کی صورت دیکھنے کے بعد سر کو استعجابیہ سے انداز میں جھٹک کر بولی۔

"کمال ہے تمہارے پاس پیسہ ہے نہ حیثیت۔ پھر بھلا کس بات پر اتنا گھمنڈ کرتی ہو۔"

"بات گھمنڈ کی نہیں اصول کی تھی۔ لیکن آج کے تلخ تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ مجبوریاں سنگین تر اصولوں کو بھی پاش پاش کر دیتی ہیں۔ خیر چھوڑو۔ یہ محض جذباتی باتیں ہیں۔ لاؤ تم مجھے وہ پیپر دے دو۔" عنبر نے شکست خوردہ لہجے میں یہ بات کہہ کر غزل سے وہ کاغذ مانگا۔

"او ہو اب اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ وہ پیپر بھی تمہیں دے دوں گی۔ پہلے ذرا مجھے بیٹھ تو لینے دو۔" غزل کے لہجے میں یکا یک شگفتگی سی در آئی۔ اس نے مسکرانے کے سے انداز میں کہا۔ مگر عنبر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن خورشید جہاں جواب تک دم بخود سی کھڑی غصے میں تپ سی رہی تھیں۔ غزل کے ایک دم ہی پینترا بدل کر آنے پر ان کے تن بدن میں جیسے آگ سی بھڑک اٹھی۔ وہ دروازے کے آگے ہی غزل کو روک کر بولیں۔

"ٹھہرو۔ بیٹھنے ویٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اب تمہارے اس گندے وجود کو ایک منٹ بھی اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔ تم اگر یہ سمجھ رہی ہو کہ تمہارے چیخنے چلّانے سے ہم ڈر گئے ہیں تو اتنا سن لو کہ ہم اس محلے کے سب سے پرانے رہنے والے ہیں۔ ہمارے محلے والے ہماری فطرتوں، عادتوں اور کردار سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر دروازے پر کھڑی ہو کر ذرا سی بھی آواز نکال دوں کہ یہ دھوکے باز عورت ایک جھوٹے کاغذ پر زبردستی میری بچی سے دستخط کرانا چاہ رہی ہے تو پھر وہ یہ سننا بھی گوارا نہیں کریں گے کہ تم نے ہمیں کچھ رقم دی تھی بلکہ جوتے مار مار کر تمہیں اس محلے سے نکال دیں گے سمجھیں تم۔" مگر غزل جیسی مرد مار عورت ان کی دھمکی آمیز باتوں پر کچھ زیادہ ہی شیر ہو گئی۔

"ہاں ہاں چلو آؤ۔ اپنی یہ حسرت بھی نکال لو۔ چلو دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے محلے والوں کو پکارو۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ کس میں اتنا دم خم ہے جو میرے مقابلے پر آئے۔" غزل گلا پھاڑ کر چیختی ہوئی پھر بیٹھک کی دہلیز پر جا کھڑی ہوئی اور عنبر جو پہلے ماں کو امی امی کہہ کر جھگڑا بڑھانے سے باز رکھنا چاہ رہی تھی۔ غزل سنو تو۔ غزل سنو تو ہی کہتی رہ گئی۔ مگر غزل جیسی عزت اتار عورت بھلا کچھ سنتی۔ وہ تو اور بھی زور زور سے چیخنے لگی۔ تبھی نہ معلوم کیسے اور کب۔ کہ ان میں سے تو کسی نے اسے بیٹھک کے سامنے گاڑی روک کر اترتے دیکھا ہی نہ تھا۔ حتیٰ کہ غزل نے بھی نہیں اچانک ہی سعد غزل کے قریب سے اپنا راستہ بناتا ہوا اندر داخل ہوا اور بڑی سراسیمگی کے عالم میں اس نے خورشید جہاں سے پوچھا۔

"کیوں خیر تو ہے پھپھو جان۔ آخر یہ سب کیا ہے، یہ کیسی چیخ پکار ہو رہی ہے یہاں؟" تو جہاں سعد کو اس قدر غیر متوقع دیکھ کر چھوٹی کے اترے ہوئے پریشان چہرے پر مسرت کی لہر سی دوڑ گئی تھی وہاں خورشید جہاں کو بھی اسے اچانک دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے ذلت اور خواری کی دلدل میں دھنستے دھنستے کسی نے انہیں باہر کھینچ لیا ہو۔ وہ جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھک میں ایک طرف اسے لے جا کر بولیں۔

"یہ سب تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا اس وقت تمہارے پاس سولہ سو روپے بھی ہوں گے۔"

"سولہ سو روپے ــ ٹھہریے میں اپنے بٹوے میں دیکھتا ہوں۔" سعد نے تھوڑا سا متعجب ہو کر کہا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے بٹوہ نکال کر نوٹ گننے لگا۔ پھر خورشید جہاں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"لیجیے پھپھو جان۔ یہ سولہ سو روپے ہیں یہ ان کو دے دیجیے۔ مگر پہلے گنوا لیجیے گا۔" اس نے جیب سے سولہ سو روپے نکال کر خورشید جہاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو عنبر کے ساتھ بیٹھک کے دروازے کے آگے ہی کھڑی تھیں خورشید جہاں نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے سولہ سو روپے لیے تو اس نے گویا اپنا فقرہ پورا کرنے کی غرض سے پھر کہا۔ "ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پھر رقم کم ہونے کی شکایت کرتی ہوئی یہاں آ پہنچیں۔"

"جی نہیں، میں پیسے کی بھوکی ہوں نہ ان لوگوں کی طرح کنگلی ہوں۔ میرے پاس تو اتنا کچھ ہے کہ ـ"

غزل نے تلملا کر کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر ایک زہر خند سے بولا۔

"جی ہاں جی ہاں۔ وہ تو آپ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ کیا ہیں۔" اسی اثنا میں خورشید جہاں عنبر سے تھایا نہ لے چکی تھیں جیسے انہوں نے غزل کو تھماتے ہوئے کہا۔

"لو لڑکی، یہ اپنے آٹھ ہزار روپے سنبھالو۔ بلکہ اچھی طرح گن لو۔ کبھی کوئی کمی بیشی نہ رہ جائے۔" لیکن گننا گنانا تو بڑی بات غزل نے اس رقم کی طرف دیکھا تک نہیں اور ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھ سے وہ رقم لے کر اپنے پرس میں ڈال لی اور پھر عنبر پر ایک غضبناک سی نظر ڈال کر بولی۔

"میں بھی دیکھ لوں گی تمہیں۔ یاد رکھنا تم لوگوں نے آج میری جو بے عزتی کی ہے میں اس کا بدلہ تم سے لے کر رہوں گی۔"

"اچھا اچھا یہ بھی کر کے دیکھ لینا۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتے ہیں۔" سعد کو اس کے دھمکی دینے کی رکیک حرکت پر غصہ آ گیا تھا اس لیے عنبر کے بجائے وہ بھبھک کر بولا۔ انداز بھی کچھ ایسا تھا کہ اگر وہ مزید کچھ کہتی تو وہ بیچ بیچ دست درازی پر اتر آتا۔ شاید اسی بات سے وہ ڈر گئی تھی۔ اسی لیے اسے منہ ہی منہ میں گالیاں دیتی فوراً ہی نیچے اتر کر اپنی کار کی طرف بڑھ گئی تھی۔

سعد ــ جو پہلے تو اتنا نہیں مگر اب غزل کے جانے کے بعد کچھ زیادہ ہی متجسس ہو رہا تھا یہ سوچ سوچ کر کہ آخر یہ کیا ڈراما تھا۔ یہ آٹھ ہزار روپوں کا کیا چکر تھا۔

یہ عورت کون تھی اور کس بات پر اتنی دھونس جما رہی تھی اور دھمکیاں دے رہی تھی۔ یہ سارے سوالات اس کے ذہن میں نوکیلے کانٹوں کی طرح اتنی دیر سے چبھ ہی رہے تھے مگر اس سے بڑھ کر اس کے لیے یہ بات انتہائی تعجب خیز تھی کہ اس کی پھپھو اور ان کی اولاد بھی ایسی فطرت رکھتے تھے نہ خصلت کہ روپے پیسے کے معاملے میں کسی کے ساتھ فراڈ کرتے یا آٹھ ہزار روپے کی رقم جو کم از کم ان کے لیے ایک خطیر رقم ہی تھی کسی سے قرض لے لیتے مگر بات کچھ ایسی ہی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے بلکہ سولہ سو روپے اس سے لے کر پورے آٹھ ہزار کی رقم پھپھو نے اس عورت کو لوٹائی تھی جو کسی لحاظ سے بھی شریف نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ اس کی ہر بات ہر ادا سے عیاں عامیانہ پن اور کالی کلوٹی شکل پہ اتنا گہرا میک اپ اس کے بارے میں بہت ہی غلط تاثر دے رہا تھا۔ اس پہ بیٹھک کے فرش پہ ایک طرف بہت سا سامان بھی پڑا تھا۔ بہت سی کاغذ کی بڑی تھیلیاں گھی کے ٹن اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی پیٹی جس میں سبزیاں بھری ہوئی تھیں گھر کے راشن کی غمازی کر رہا تھا۔ مگر اتنا سارا راشن؟ جب کہ وہ اپنی پھپھو کے حالات سے بھی واقف تھا۔ سمجھ کچھ کام نہیں کر رہی تھی اور دماغ پہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ سب کچھ ایک ساتھ ہی معلوم کرنے کے لیے بے تاب سا ہو رہا تھا۔

ادھر عنبر دم بخود اور گم صم سی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ماں کے سہاگ کی نشانی وہی طلائی زنجیر تھی جس کے پینڈنگ میں کندہ مونوگرام کو وہ بلا مقصد ہی دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اب سعد کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ذہن میں اس سمے کیسی آندھیاں سی چل رہی ہیں۔

غزل کے ہاتھوں اپنی ذلت کا احساس ــ ایک دم ہی اتنے سارے پیسے یعنی سولہ سو روپے خرج کر دینے کا پچھتاوا۔ آٹھ ہزار کی خطیر رقم ہاتھ سے جانے کا دکھ۔ اور سب سے بڑھ کر ایک عین توڑ کے وقت یعنی اس وقت جب غزل ان سب کی ہی عزت اتارنے کے درپے ہو رہی تھی سعد کی اچانک آمد ہی سخت کوفت کا باعث بنی تھی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ ماں نے سعد سے سولہ سو روپے کی مدد بھی لے لی تھی اور جو کچھ بھی ہوا تھا سعد کے سامنے ہی ہوا تھا۔ جس نے اس وقت سولہ سو روپے کی بھیک دے کر اس پر اور اس کی سات پشت پر احسان کیا تھا۔

کچھ ایسے ہی خیالات ہو رہے تھے اس کے اور وہ سخت شرمندہ، شرمسار اور متاسف سی کھڑی تھی۔ سعد نے اس معمے کو حل کرنے کی غرض سے دو تین بار اس کی طرف دیکھا بھی مگر اسے اس قدر بے نیاز اور گم صم سا دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ چونکہ وہ انتہائی خوددار اور غیور ہے اس لیے اس نے ان واقعات کا بہت گہرا اثر لیا ہے جو ابھی کچھ دیر قبل ہی

بیٹھک میں رونما ہوئے تھے۔ اس لیے اس نے عنبر سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ بلکہ خورشید جہاں کی گزشتہ سے پیوستہ گفتگو کا جواب دیتے ہوئے اس نے پوچھا

"پھپھو جان: یہ تو بتائیے کہ آخر یہ معاملہ کیا تھا؟ یہ کون عورت تھی اور یہ آٹھ ہزار کی رقم کا کیا چکر تھا۔ میرا مطلب ہے یہ آٹھ ہزار روپے کہاں سے آئے اور آپ نے اس عورت کو کیوں دیے؟" خورشید چپ رہ گئیں۔ وہ اس وقت انتہائی شرمندگی محسوس کر رہی تھیں۔

"ہاں تو کیا قصہ تھا یہ؟" اس نے پھر پوچھا۔ تو خورشید جہاں کے بجائے عنبر بولی۔

"ایسی خاص بات نہیں تھی۔ وہ اصل میں پیسے عالیہ نے میرے پاس رکھوائے تھے یہ کہہ کر کہ اگر میں چاہوں تو اس رقم میں سے ڈیڑھ دو ہزار خرچ کر سکتی ہوں۔ سو میں نے اپنی ضرورت کے تحت سولہ سو روپے خرچ کر لیے۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ غزل اچانک آن ٹپکے گی اور پیسوں کے لیے مجھ سے جھگڑا کرے گی۔" عنبر نے یہ سب بہت چبا چبا کر اور دل سے گھبرا کر بتایا تھا مگر اس کی یہ بات سعد کے پلے نہیں پڑی۔ وہ تھوڑا سا چمک کر بولا۔

"ہیں۔ میں سمجھا نہیں۔ رقم آپ کو عالیہ نے دی تھی اور وصول کرنے یہ عورت آ گئی۔ جب کہ اس کا کچھ حق بھی نہیں بنتا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ رقم آپ نے اس کے حوالے کر دی۔ یہ تو فراڈ کا کیس ہوا سارا۔ آپ نے مجھے پہلے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟"

"وہ اصل میں غزل میری سہیلی عالیہ کی دوست ہے اور عالیہ نے اس کے سامنے مجھے وہ رقم دی تھی جو ــــ شاید غزل ہی کی تھی۔" جواب میں کچھ دیر بغلیں جھانکنے کے بعد اس نے کہا۔

"کمال ہے آپ تو اتنی زیادہ خوددار اور غیور ہیں پھر بھی آپ نے نہ صرف وہ رقم اپنے پاس رکھ لی بلکہ اس میں سے سولہ سو روپے خرچ بھی کر لیے۔" سعد کے لہجے میں استعجاب ہی نہیں بلکہ طنز سا شامل تھا۔ وہ جواب تک کھڑی تھی جواب میں صرف فرش کو تکتی ہی رہ گئی۔

"پھپھو جان آپ نے بھی بڑی غلطی کی۔ اگر اسی وقت مجھے حقیقت سے آگاہ کر دیا ہوتا تو میں اس عورت کو گدی سے پکڑ کر ان کی سہیلی عالیہ کے پاس لے جاتا اور سولہ سو روپے تو کیا سولہ سو پیسے بھی اسے نہ دیتا بلکہ الٹا اس سے آپ لوگوں کی بے عزتی کی قیمت وصول کر کے رہتا۔" سعد کو بری طرح تاؤ آ گیا۔ وہ جذبے کے عالم میں بولا۔

"مگر ــ مگر عالیہ آج کل کراچی میں نہیں ہے۔ وہ تو اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔" ماں کے کچھ کہنے سے قبل ہی عنبر نے کہا۔ تب خورشید جہاں کو بھی ضبط کا یارا نہ رہا۔ اتنی دیر سے وہ بیٹی کی جھوٹی سچی بڑے صبر و تحمل سے برداشت کر رہی تھیں۔ سیدھی سادی اور کھری خاتون تھیں۔ اور پھر سعد نے بروقت آ کر اور سولہ سو روپے دے کر ان پر جو احسان عظیم کیا تھا اس کے بار میں وہ دبی جا رہی تھیں۔ اس کی ساری مصلحتوں اور پردے داری پر جھاڑو پھیرتی ہوئی بولیں۔

"اے بس اب بہت ہو لیا عنبر۔ کیا اسی سے چھپانا رہ گیا ہے۔ اس نے تو سولہ سو روپے دے کر تمہاری عزت بچائی ہے۔ یہ تو تمہارا محسن ہے محسن ــ اور تم۔"

"ارے ارے یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ پھپھو جان۔ یہ بار بار اتنی حقیر سی رقم کا ذکر کر کے آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔" سعد نے بے حد انکسار سے کام لے کر کہا۔

"نہیں! شرمندہ تو یہ کر رہی ہے مجھے ــــ اس کے دماغ میں تو نہ جانے کیسا فتور پیدا ہو گیا ہے۔ وہی مثل ہے کہ رہیں جھونپڑوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کے۔ بھائی جان کے گھر کے کر و فر دیکھ دیکھ کر اس کے دماغ میں بھی امیر بن جانے کا سودا سما گیا ہے۔ تبھی تو یہ چاہتی ہے کہ بہت اونچی ملازمت کرے۔" ماں کو اس قدر صاف گوئی سے کام لیتے دیکھ کر چھوٹی نے عنبر کی طرف دیکھا جو اتنی زیادہ توہین پر کسی لمحے بھی رو دینے کو تھی۔ وہ ماں کی بات کاٹ کر جلدی سے بولی۔

"نہیں امی اب ایسی بات بھی نہیں۔ آپا کو تو ــ"

"تم چپ رہو چھوٹی اور جا کر اپنا کام کرو۔ یہاں میرے سر پہ کھڑی ہو کر میرا منہ توڑنے کی کوشش مت کرو۔ چلو یہاں سے سامان اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ دو۔ جب سے آیا ہے یونہی بکھرا پڑا ہے۔ ارے اس سامان کی بدولت ہی تو آج ہمیں اتنی خواری اٹھانی پڑی ہے۔" خورشید جہاں نے چھوٹی کو بھی لتاڑ کر رکھ دیا۔

"اف تو یہ امی کھلنے پر آتی ہیں تو سب کچھ کھول کر رکھ دیتی ہیں۔" چھوٹی نے اندر ہی اندر تلملا کر سوچا اور پھر بری طرح منہ بنائے باہر صحن میں چلی گئی۔ لیکن اس کے کان ہی نہیں اس کا دل بھی اندر ماں کی باتوں پر لگا ہوا تھا۔ اس لیے وہ برآمدے میں بچھے تخت پر جا کر بیٹھ گئی۔ جب کہ دل تو عنبر کا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی بیٹھک سے ہی بلکہ گھر سے ہی کہیں بھاگ نکلے۔ مگر وہ تو اپنی جگہ پر جیسے جم کر رہ گئی تھی کہ ماں کی لتاڑ سن کر شرم اور شرمندگی کی جگہ غصے اور کوفت نے لی تھی۔ اور وہاں سے بھاگ جانا اسے اپنی توہین اور بزدلی کے مترادف لگ رہا تھا اور ادھر سعد حقیقت جاننے کے لیے بے چین اور بے کل سا ہو رہا تھا۔ اس نے چھوٹی کے بیٹھک سے چلے جانے کے بعد خورشید جہاں سے کہا۔

"آپ نے ناحق اسے ڈانٹ کر یہاں سے بھگا دیا پھپھو جان۔ ورنہ وہ جو بات بھی کرتی ہے بہت سوچ سمجھ کر اور بے کھوٹ کرتی ہے۔"

"اے چھوڑو بیٹا! میں تو اس بات پر شکر ادا کر رہی ہوں کہ یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا اور یہیں کے یہیں ختم ہو گیا۔ ورنہ نہ معلوم وہ ڈلا میری بچی کا کیا حشر کرتی۔ اے میں تو پہلے دن ہی اس کی صورت اور ادائیں دیکھ کر کھٹک گئی تھی۔" خورشید جہاں نے گویا جلے پھپھولے پھوڑے

"ہائیں کیا مطلب پھپھو جان۔ کیا وہ عورت پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکی تھی۔ ؟" سعد نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"ہاں مگر صرف دو مرتبہ ہی آئی تھی وہ بھی ان کی چہیتی عالیہ کے ساتھ۔ اصل میں اس نے ہی عالیہ سے کہا تھا کہ وہ اپنے باپ سے کہہ کر اسے کوئی تگڑی سی ملازمت دلوا دے۔ عالیہ نے کچھ عرصے بعد اسے اپنے گھر بلوا کر اس کلموہی سے اسے ملوا دیا۔ بس جی وہ تو اس کی صورت دیکھ کر اس پر لٹو ہی ہو گئی۔ دوسرے ہی دن بڑے ٹھسے سے عالیہ کے ساتھ یہاں آ گئی اور خوب چاپلوسی کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اگلی دفعہ آئی تو یہ رقم اس کے سر تھوپ گئی یہ کہہ کر کہ یہ ہماری طرف سے تمہاری پیشگی تنخواہ ہے لہٰذا اس کی لکھا پڑھی بھی نہیں ہو گی۔ مگر ایمان کی بات ہے عنبر کا دل نہیں ٹھک رہا تھا اس نوکری کے لیے یہ آلے بالے ٹالے ہی کرتی رہی۔ وہ تو کچھ قسمت ہی میں خواری لکھی تھی جو بیٹھے بٹھائے اس کے دماغ میں کچھ ایسی سمائی کہ یہ گھر کا سودا لینے بازار چل دی اور سولہ سو کی رقم گنوا آئی ــ ورنہ ــ"

"امی ــ!" عنبر ماں کی باتوں کو مزید برداشت نہ کر سکی تو بڑے احتجاجی مگر خفگی بھرے انداز میں بولی۔

"اگر ان کے سامنے مجھے ذلیل و خوار کرنے کو کچھ اور ابھی باقی رہ گیا تو وہ بھی کہہ ڈالیے۔ ورنہ میں نے یہ جو کچھ بھی کیا بہت مجبور ہو کر کیا ہے۔ آپ نے انہیں یہ کیوں نہیں بتایا کہ آپ دو دن کے فاقے سے تھیں۔ سلائی کے کپڑے تیار کرنے کے باوجود بھی آپ کو ان کی اجرت نہیں مل سکی تھی جس کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اور چونکہ مجھے آپ کی جان سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں تھی اس لیے میں اسی رقم میں سے کچھ پیسے لے کر آپ کو ہسپتال لے گئی تھی۔ اور جب وہاں سے واپسی پر میں نے گھر کی بدحالی دیکھی اور یہ بھی دیکھا کہ کل سے رمضان کا مہینہ شروع ہو رہا ہے تو میں نے اس رقم سے مزید رقم نکال لی اور یہ سب لے آئی۔ امی میں نے تو آپ کے اور بہن بھائی کے خیال سے اس ناپسندیدہ ملازمت کو قبول کیا تھا ورنہ میں تو ــ"

اس سے آگے عنبر سے کچھ بولا نہ گیا۔ کیونکہ غم و غصے اور ذلت اٹھانے کی وجہ سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ بیٹی نے تو صاف گوئی کی انتہا کر دی تھی۔ خورشید جہاں کی زبان کو تو جیسے بریک لگ ہی گئے تھے مگر سعد بھی اس کی باتیں سن کر دم سادھ کر رہ گیا۔ اف تو حالات اس حد تک خراب ہو گئے تھے کہ فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔ جب کہ وہ یہی سمجھتا رہا تھا کہ کچھ تو دکان کا کرایہ آتا ہو گا اور کچھ عنبر ٹیوشنز میں کما لیتی ہو گی اور اسی میں یہ لوگ کھینچ تان کر کے گزر بسر کر لیتے ہوں گے۔

مگر ان کے سر پر کمانے والا ابھی تو کوئی نہیں ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ تبھی تو ان کے حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے ہیں اور انہی حالات کے پیش نظر عنبر کو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ ملازمت قبول کرنی پڑی ہو گی۔ جب کہ خود میں نے بھی اس ملازمت کی سختی سے مخالفت کی تھی۔ وہ کچھ دیر رنج و افسوس کے عالم میں بیٹھا یہی سوچتا رہا۔ پھر بڑے

گلہ آمیز لہجے میں خورشید جہاں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"کمال ہے پھپھو جان! ایک طرف آپ مجھے بیٹا کہتی ہیں اپنا کہتی ہیں اور دوسری طرف غیریت کا یہ عالم ہے کہ اپنے حالات کو مجھ سے چھپاتی ہیں۔ کیا رشتے داری کا تقاضا یہ نہیں ہوتا کہ برے وقت میں ایک دوسرے کی مدد کی جائے۔ پھر آخر رشتے دار کس مرض کی دوا ہوتے ہیں۔"

"جی نہیں۔ ہمیں کسی رشتے دار سے مدد لینے کی ضرورت ہے نہ ہم گوارا ہی کرتے ہیں کہ قرض کے طور پر ہی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں یا آپ کے بقول مدد ہی مانگیں۔ اس سے بہتر تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ بھوکے رہ لیں۔ فی الحال ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہمارے سر پر کوئی کمانے والا نہیں ہے لیکن وقت سدا تو ایک سا نہیں رہتا۔ جب میں خود محنت کروں گی اور پیسہ کماؤں گی تو حالات بھی رفتہ رفتہ سدھر جائیں گے۔" خورشید جہاں کے بجائے عنبر نے بہت ڈٹ کر کہا۔

"او گڈ۔ بڑے اعلیٰ اور ارفع خیالات اور عزائم ہیں آپ کے۔ میں خلوصِ دل سے انہیں اپریشیئیٹ کرتا ہوں۔ واقعی انسان کی خودداری اور غیرت سے بڑھ کر کوئی اور شے ہوتی ہی نہیں لیکن اس سلسلے میں میرا حقیر سا مشورہ ہے کہ آپ جہاں بھی کام کرنے کی ٹھانیں ذرا دیکھ بھال کر ہی ٹھانیں۔ کیونکہ آج کل بعض لوگوں کے پاس بے اندازہ پیسہ آ گیا ہے یعنی کہ بلیک منی۔ جسے وہ نیک مقاصد کے لیے نہیں بلکہ بہت غلط کاموں کے استعمال کرتے ہیں۔" اس نے عنبر کے سراپا پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا تو عنبر نے یہ جاننے کی غرض سے اس کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ اس پر طنز تو نہیں کر رہا۔ مگر وہاں نظروں سے ہی نہیں چہرے سے بھی خلوص ہی خلوص عیاں تھا۔ آنکھیں چار ہوئیں تو خود اپنے خیالات پر جھینپ کر عنبر بیٹھک میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"اے تو تم ہی لگوا دو اسے کسی اچھی جگہ۔ تمہاری تو بہت لوگوں سے واقفیت ہو گی۔" خورشید جہاں بولیں۔

"جی ہاں۔ واقفیت تو بہت ہے اور میں نے ان سے کتنا کہا بھی تھا۔ مگر۔ شاید۔ وہ جگہ ان کے مطلب کی نہیں تھی۔" سعد نے عنبر سے نگاہیں کترا کر بتایا۔

"اے مطلب وطلب کی کیسی۔ یہ باتیں تو انہیں زیب دیتی ہیں جن کے پوٹے تر ہوتے ہیں اور اگر ایمان کی پوچھو تو میں تو اس کے نوکری کرنے کے حق میں ہی نہ تھی مگر جب اس نے ضد ہی پکڑ لی تو میں نے بھی سوچا کہ کیا حرج ہے جو یہ چار پیسے کما لے گی۔ تم تو بس اسے کسی معقول جگہ لگوا دو۔" خورشید جہاں نے کہا تو سعد نے عنبر کی طرف دیکھا جس کے تیور ایک دم ہی بگڑ چکے تھے۔ اس نے جلدی سے بات گھمائی۔

"اوہو۔ ساڑھے آٹھ بج گئے۔ اور ادھر فہد کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دن ڈھلتے ہی اسے بھوک لگنی شروع ہو جاتی ہے وہ تو میرا انتظار کرتے کرتے سوکھ گیا ہو گا۔ اچھا پھپھو! اب اجازت دیجیے۔"

"اچھا بیٹا ٹھیک ہے جاؤ۔ یہاں تو ابھی تک کچھ پکا ہی نہیں ورنہ میں تمہیں کھانا کھلائے بغیر جانے ہی نہیں دیتی۔" خورشید جہاں نے گویا بادل ناخواستہ اسے جانے کی اجازت دی۔ سعد نے دل ہی دل میں اس بات پر کڑھ کر رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے اور ابھی تک ان لوگوں کے یہاں کچھ پکا ہی نہیں، کچھ سوچ کر جیب سے بٹوہ نکالا اور سو سو کے چار نوٹ خورشید جہاں کی طرف بڑھا کر بولا۔

"لیجیے پھپھو جان! یہ روپے اور رکھ لیں۔" تو خورشید جہاں گھبرا کر پیچھے ہٹتی ہوئی بولیں۔

"نہیں نہیں بیٹے۔ اب مجھے زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ تم نے سولہ سو روپے دے دیے یہی بہت ہیں۔ بلکہ ایک بوجھ کی طرح سوار رہے گی میرے کاندھوں پر تمہاری یہ رقم کہ نہ معلوم کب تمہیں لوٹانے کے قابل ہو سکوں گی۔"

"اوہو پھپھو جان! کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں جو آپ مجھ سے ہمیشہ غیریت برتتی ہیں۔ میں تو یہ چار سو روپے اس لیے دے رہا ہوں کہ دو ہزار کی صورت میں راؤنڈ فیگر ہو جائے گا۔ آپ اگر لوٹانے کا ارادہ رکھتی ہیں تو کبھی موقع ملے تو لوٹا بھی دیجیے گا۔ تھوڑے تھوڑے کر کے ہی۔ اب ایسی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔" سعد نے کہا۔ مگر خورشید جہاں اس کے ہاتھ سے وہ چاروں نوٹ لینے پر آمادہ نہ ہوئیں تو اس نے وہ نوٹ چھوٹی کے ہاتھ میں زبردستی تھماتے

ہوئے کہا۔

"لو بھئی انہیں تم ہی اپنے پاس رکھ لو۔ ورنہ سمجھ لو اگر تم نے یہ نہیں لیے تو میں بھی کبھی اِدھر کا رخ نہیں کروں گا۔" اور چھوٹی جو نہیں نہیں کیے جا رہی تھی اس نے اس کی دھمکی پر بے بسی سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"واہ یہ اچھی زبردستی ہے۔" اور پھر وہ نوٹ اپنی مٹھی میں دبا لیے۔ پھر سعد خدا حافظ کہہ کر جانے لگا تو عنبر کے قریب رک کر بولا۔

"جب سے آیا ہوں آپ کو کھڑا ہی دیکھ رہا ہوں۔ کیا آپ نے بیٹھنے کی قسم کھا رکھی ہے یا پھر میری وجہ سے بیٹھنا گوارا نہیں کیا؟" تو عنبر نے ایک پھیکی سی مسکان کے ساتھ کہا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ بس مجھے کچھ خیال ہی نہیں رہا تھا بیٹھنے کا۔" اصل میں وہ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ بڑے صوفے پر تم بیٹھے تھے اور چھوٹے صوفے پر امی اور جو چھوٹا صوفہ خالی تھا وہ عین تمہارے قریب تھا، اس لیے میں اس پر کیسے بیٹھ سکتی تھی۔

"ہاں آپ نے پریشانی بھی تو بہت اٹھائی ہے۔ ویسے آپ کی پریشانی کا ایک حل ہے میرے پاس۔" سعد نے اس کا عذر قبول کرتے ہوئے کچھ سوچ کر کہا۔

"کون سا حل؟" اس نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"میں آپ کو اس لیڈی سپروائزر کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا۔ دیکھیں اگر میری مانیں تو فی الوقت وہی جاب پکڑ لیں۔ تنخواہ ضرور ڈھائی ہزار ہے مگر اس کے ساتھ دوسری سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ مثلاً علاج معالجہ، ہاؤس الاؤنس اور کنوینس سب کچھ فری ہو گا یعنی وہ فرم ادا کرے گی اور ہر چھ ماہ بعد انکریمنٹ بھی ہوتا رہے گا۔ اور چونکہ نئی فرم ہے اس لیے ہر ماہ تو نہیں لیکن سال کے اختتام پر آپ کو بونس ضرور دے گی۔"

سعد نے ساری تفصیل بتا کر جواب طلب نظروں سے عنبر کی طرف دیکھا۔ مگر شاید وہ یہ فیصلہ کرنے میں لگی رہی کہ اس کی پیش کش کو منظور کر لے یا ٹھکرا دے۔ کیونکہ ڈھائی ہزار کی نوکری اسے کرنی ہوتی تو بہت پہلے ہی کر لیتی۔ جب کہ خورشید جہاں اس کی خاموشی پر جز بز سی ہو کر پہلو بدل رہی تھیں۔ آخر انہوں نے جل کر کہا۔

"اے اس میں اس قدر سوچ بچار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب بھائی تمہیں اتنی اچھی نوکری دلا رہا ہے تو تم گم صم کے لڈو منہ میں لیے کھڑی ہو۔ یہ تو ناشکری ہوئی صاف۔ اے میاں تم اس کی خاموشی پر نہ جاؤ۔ بس اللہ کا نام لے کر اسے وہ نوکری دلوا دو۔"

تب عنبر نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ پھر میں کب سے جوائن کروں یہ سروس؟"

"جب دل چاہے، میرا مطلب ہے کل سے ہی جوائن کر لیجیے۔" سعد نے کہا اور جیب سے پاکٹ ڈائری نکال کر اس میں سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

اس کارڈ میں اس فرم کا پتا درج ہے۔ یہ مین آفس کا ایڈریس ہے۔ آپ کل صبح دس بجے یہاں پہنچ جائیے گا۔ ویسے بھی —— آپ کی ڈیوٹی صبح دس بجے سے شام کے سات بجے تک ہوگی اور فرم کی گاڑی آپ کو پک اینڈ ڈراپ کرنے آیا کرے گی دن کا کھانا اور چائے بھی آپ کو فرم کی طرف سے ملا کرے گی، اور تحفظ کی ضمانت الگ ہوگی۔ آر یو سیٹسفائیڈ ناؤ؟"

"اویس تھینکس لے لوٹ" عنبر نے اس سے نظریں ملائے بغیر دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ عذیر اسے کار تک چھوڑنے اس کے پیچھے باہر چلا گیا۔

"میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم کس بات پر اتنا نخرہ کرتی ہو۔ ورنہ بقول تمہارے آج کل تو صرف پیسے کی پوجا ہوتی ہے صورت شکل اور شرافت کوئی نہیں دیکھتا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے نا۔ زر کی الفت الفت ہے، بے زر کی الفت کچھ نہیں۔ تو ریحان نے یہ بھی سچ کر کے دکھا دیا۔ اور یہ سعد بے چارا تو بے لوث ملتا ہے ہم سے اب ہی دیکھو وہ بے چارا کیسا ٹھوڑی میں ہاتھ دے کر تم سے ملازمت کے لیے پوچھ رہا تھا اور تم ایسا ظاہر کر رہی تھیں جیسے تم کوئی بہت ہی بڑی نوابزادی ہو جو تمہیں کچھ بھلا ہی نہیں آ رہا۔" اور عنبر جو سعد کے جاتے ہی صوفے پہ بیٹھ کر اپنی ٹانگوں کو آہستہ آہستہ دبا رہی تھی، ماں کی نتاڑ سن کر بڑا کڑوا منہ بنا کر بولی۔

"امی۔ میری جو حیثیت اور اوقات تھی وہ بھی آج آپ کے بھتیجے پر اچھی طرح عیاں ہو گئی۔ پھر بھلا میں کس بات پر نخرہ کر سکتی تھی۔ ہاں البتہ میری اپنی بھی کچھ مرضی اور کچھ عزائم ہیں اور پھر جب کہ میں بہت پہلے ہی اس ملازمت کے لیے انکار کر چکی تھی تو پھر ایک دم ہی دانت نکال کر ان سے کیسے کہہ دیتی کہ ہاں بسر و چشم میں اس ملازمت کے لیے بالکل تیار ہوں اور کل صبح ہی فی خدمت ہو جاؤں گی۔" اور چھوٹی جو شاپنگ میں —— لائی ہوئی چیزوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوئی جا رہی تھی اس نے ماں اور بہن کی باتوں سے اکتا کر کہا۔

"چھوڑیں امی۔ یہی کیا کم ہے کہ آپا نے سعد بھائی کی آفر قبول۔ کر لی ہے۔ آپ تو یہ دیکھیں کہ یہ آپا کیا کیا چیزیں خرید کر لائی ہیں۔"

پھر چھوٹی نے وہ چار سو روپے جو سعد اسے زبردستی دے کر گیا تھا ماں کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"لیجیے، پہلے یہ پیسے رکھ لیجیے۔ ورنہ مجھ سے کہیں ادھر اُدھر ہو گئے تو پھر میں ڈھونڈتی رہ جاؤں گی۔" تو خورشید جہاں نے چار سو روپے گود سے اٹھا کر کہا۔

"لو بھلا دس ہزار کی رقم بن گئی ان چار سو سمیت —— یہ اتنی بڑی رقم میں کس گھر سے لاؤں گی جو اسے لوٹاؤں گی۔ میرے سر پر اور بہت پریشانیوں کے علاوہ اب اس کا بھی بوجھ سوار ہو گیا۔"

"امی میں ابھی مری تو نہیں زندہ ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اتاروں گی یہ بوجھ۔" عنبر جو اپنی اتنی زیادہ خواری پر رنجیدہ اور دل گرفتہ سی ہو رہی تھی چڑ کر بولی۔

"مگر ضرورت کیا تھی ایک دم ہی اتنے سارے پیسے خرچ کر دینے کی۔ وہی مثل ہے کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ اور تمہارے ہاتھ تو جیسے بندر کے ہاتھ ناریل لگتا ہے ویسے ہی وہ رقم لگی تھی کہ بلا سوچے سمجھے پورے سولہ سو خرچ کر بیٹھیں۔ وہ تو اللہ کو ہی کچھ رحم آ گیا جو اس نے عین وقت پر —— سعد کو بھیج دیا ورنہ اگر وہ نہ آتا تو پھر تم کیا کرتیں۔ کہاں سے پورے کر کے دیتیں سولہ سو۔" خورشید جہاں عنبر کے اطمینان دلانے پر ٹھنڈی ہونے کے بجائے بھڑک سی اٹھیں۔

"او ہو امی۔ اب جانے بھی دیں نا —— ویسے بھی آپا نے آپ کے علاج کے لیے وہ رقم نکالی تھی۔ آپ کو یوں ہی بے ہوش پڑا رہنے دیتیں کیا۔" چھوٹی ان کے فضیحتوں سے تنگ آ کر بولی۔

"اے چولہے بھاڑ میں ڈالا ہوتا مجھے۔ میں کوئی مر تو نہیں رہی تھی۔ لے میں پوچھتی ہوں کیا میرا آبریشم (آپریشن) کروایا تھا جو اتنی بڑی رقم لٹا دی مجھ پہ۔؟"

"نہیں، چھ سو روپے تو نہیں مشکل سے تین سو روپے خرچ ہوئے۔ ٹیکسی کے آنے جانے کے کرائے اور کھانے ناشتے سمیت۔ کیونکہ یہ سارا سامان بارہ سو روپے سے زیادہ میں ہی آیا ہے۔ کیوں آپا۔؟" چھوٹی نے ماں کی جلی کٹی کا جواب دیتے ہوئے عنبر سے پوچھا۔ مگر غزل کے ہاتھوں اٹھائی ذلت اور سعد کے سامنے اٹھائی ہوئی شرمندگی، اس پر مستزاد ماں کی تکا فضیحتی پر پہلے ہی عنبر کا دل بھرا چلا آ رہا تھا۔ اب جو ماں نے برا بھلا کہنا شروع کیا تو اتنی دیر سے رکا ہوا غم و غصے اور شرمندگی کا غبار آنکھوں کی راہ اشکوں کی صورت میں خارج ہونے لگا اور وہ دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

"واہ امی آپ نے آپا کو رلوا ہی دیا۔ بھلا کیا ضرورت تھی اتنے فضیحتے کرنے کی۔ آپا نے اگر یہ رقم خرچ بھی کی تھی تو ہماری بہبود کے خیال سے ہی کی تھی۔ اپنے لیے تو نہیں کی تھی۔" چھوٹی نے ایک پیکٹ کھولتے کھولتے رک کر ماں سے احتجاج کیا۔

"لے تو میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ یہ کہو کہ سچی اور کھری بات لسے بری ہی لگتی ہے۔ ورنہ کیا میں اتنی بے غیرت ہوں۔ کیا میری اپنی کوئی عزت نہیں۔ لے میں نے تو دوہری خواری اٹھائی ہے دوہری۔ ایک تو اس موئی چڑیل کے ہاتھوں اور دوسرے سعد کے آگے ہاتھ پھیلا کر ارے اگر میں ایسے ہی دوسروں سے مانگ مانگ کر گزارہ کرنے والی ہوتی تو آج تم بچوں پر فاقوں کی نوبت نہ آتی۔" خورشید جہاں جو اندر ہی اندر بیٹی کی گریہ زاری پر کڑھ رہی تھیں انہوں نے بظاہر یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے رونے دھونے کو کوئی اہمیت نہیں دے رہیں۔ اس بات پر تو عنبر اور بھی تلملا اٹھی اور اپنے آنسو پونچھ کر روتی ہوئی آواز میں بولی۔

"امی میں بھی اتنی بے حمیت نہیں ہوں۔ میں بھی اسی خواری پر رو رہی ہوں اور اس بات پر بھی کہ اس ساری خواری کا ذمہ دار آپ مجھے ہی ٹھہرا رہی ہیں۔"

"لے چھوڑ رہ۔ قصور تمہارا ہے نہ میرا۔ قسمت میں خواری لکھی تھی سو ہو کر رہی۔ چلو مٹی ڈالو اس بات پر اور اٹھ کر یہ سامان اندر رکھواؤ۔ اور ہاں چھوٹی تم جلدی سے آلو کا بھرتا بنا لو۔ نو تو بج ہی گئے ہیں۔ کھانا دیر سے کھاؤ تو ساری رات سینے پہ دھرا رہتا ہے۔" خورشید جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا تو چھوٹی انہیں روکتی ہوئی بولی۔

"امی بھرتا تو میں منٹوں میں تیار کر لوں گی لیکن پہلے آپ یہ چیزیں تو دیکھتی جائیے۔" آپا آپ کے لیے بھی سوٹ کا کپڑا چپل لائی ہیں۔ عذیر بھیا تم ذرا یہ سبزی اور چاول وغیرہ کچن میں رکھ آؤ۔ میں بھی بس ابھی آتی ہوں۔"

چھوٹی نے ماں سے بات کرتے ہوئے عذیر سے چیزیں رکھ آنے کو کہا جو اسی وقت باہر سے آیا تھا۔ مگر چیزیں دیکھنے کے شوق

میں اچھا کہہ کر عذیر بھی وہیں جم گیا۔ اور چھوٹے پیکٹ کھول کھول کر کپڑے، جوتیاں، کاسمیٹکس کا سامان اور چوڑیاں وغیرہ کو دکھانے لگی۔ جب کہ عنبر ملول و بیزار سی صورت لیے اپنے — کمرے میں آگئی۔ اسے آج زندگی میں پہلی بار دوسری خواری پڑی تھی۔ اسے یہ سوچ سوچ کر سخت کوفت ہو رہی تھی کہ آج ہی سعد کو بھی آنا رہ گیا تھا۔ وہ بھی ایسے موقع پر جب غزل اسے کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس پر اس نے جاب کی آفر دے کر اور غزل کی رقم پوری کر کے گویا پوری زندگی کے لیے اس کے سر پر احسان کا بوجھ رکھ دیا۔ وہ بڑی دیر تک اسی بات پر پیچ و تاب کھاتی رہی۔

ابھی رات کے پونے آٹھ بجے تھے۔ عالیہ جمی کو کھانا کھلانے کے بعد اسے سلا کر اس کے کمرے سے باہر نکلی تو ملازم نے آکر اسے غزل کے آنے کی اطلاع دی۔

"غزل آئی ہے؟" اس نے تعجب سے کہا اور بھاگنے کے سے انداز میں ڈرائنگ روم میں آگئی اور غزل کو دیکھ کر چھوٹتے ہی پوچھا۔

"تم تو شام کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہی تھیں، پھر — ؟"

"جا نہیں رہی تھی بلکہ جا رہی ہوں۔ اور تمہارے پاس اس وقت ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔" غزل نے عجلت میں اس کی بات کاٹ کر کہا اور ایک بڑا سا لفافہ اس کے ہاتھ میں دے کر بولی۔

"اسے تم گلشی کو پہنچا دینا۔ اگر ابھی پہنچا دو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ورنہ ابھی ابھی اسے فون کر کے بتا دینا کہ غزل تمہارے لیے ایک خط دے کر گئی ہے۔ اسے فوراً آ کر لے جاؤ۔"

"مگر اسے تم ہی گلشی کو دیتی چلی جاؤ نا۔ میرے پاس تو اس وقت ایسا کوئی ملازم بھی نہیں ہے جس کے ہاتھ یہ خط گلشی کو بھجوا دوں۔"

عالیہ نے عذر پیش کیا کیونکہ اس کا ڈرائیور ہی جا سکتا تھا مگر اس کے نخرے بہت تھے اور ٹھیک آٹھ بجے وہ ملازم کو کار کی چابی تھما کر اپنے کوارٹر میں چلا جاتا تھا۔ ہاں جب اس کے والد کے کراچی آنے کا اتفاق ہوتا تو وہ ڈے اینڈ نائٹ ڈیوٹی ضرور بھگتاتا تھا اور چونکہ وہ گھر میں تنہا تھی اس لیے اسے یہ گوارا نہ ہوا کہ گلشی رات کے نو دس بجے اس کے گھر آئے۔

"او ہو کہہ تو رہی ہوں کہ اسے فون کر کے بلوا لو۔ دیکھو نا میری فلائٹ کا وقت بہت قریب ہے۔ اب میں یہ لفافہ اسے دینے کلفٹن جاؤں گی تو واپسی میں فلائٹ ہی نکل جائے گی۔ اسی لیے تو تمہارے پاس آگئی ہوں۔" غزل نے کہا تو عجلت دکھانے کی کوشش میں ہی تھا مگر اس کے لہجے سے گھبراہٹ سی مترشح تھی۔

"مگر یہ ایسی کون سی کونفیڈینشل ڈاکومینٹس ہیں۔ میرا مطلب ہے میں یہ لفافہ صبح کو گلشی کو بھجوا دوں گی۔" عالیہ نے اس کے لہجے کی گھبراہٹ کو بھانپ کر کہا۔

"نہیں نہیں۔ ایسا غضب بھی نہ کرنا ورنہ تو وہ مجھے دورانِ پرواز ہی واپس بلا لے گا۔" غزل بری طرح گھبرا کر بولی اور پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا۔

"اصل میں چونکہ میں آج کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہی تھی اس لیے گلشی نے مجھے کمپنی کا فارم دیا تھا کہ اسے آج ہی بھر کر مجھے دیتی جاؤ کیونکہ تم تو دو تین ہفتے بعد آؤ گی اور اس دوران — کام کا حرج ہوگا، سو ہو گا ممکن ہے کہ عنبرین کا ارادہ ہی بدل جائے۔" وہ سانس لینے کو رکی پھر بولی۔

"مجھے آج شاپنگ بھی کرنی تھی اور پیکنگ بھی۔ پانچ بجے فرصت ملی تو بھاگی بھاگی اس کے گھر پہنچی مگر وہ اپنی بہن اور بھاوج کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی ہوئی تھی۔ پورے دو گھنٹے مجھے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ تب کہیں جا کر وہ ملی — اس کے ساتھ شاید اس کا منگیتر بھی تھا۔ کیا نام تھا اس کا۔ ہاں وہ سعد۔"

"نہیں سعد اس کا منگیتر نہیں بلکہ کزن ہے۔ ہاں تو پھر کیا ہوا؟" عالیہ نے اسے سعد کے بارے میں بتا کر پوچھا۔

"بس جی ہوتا کیا۔ وہ تو بڑا انٹوریس آدمی لگا مجھے۔ میں نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ عالیہ سے یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے ہماری آفر قبول کر لی ہے۔ اتنا سننا تھا کہ وہ تو آپے سے باہر ہی ہو گیا۔ مجھے ایسی بے نقط سنائیں کہ تمہیں کیا بتاؤں اور پھر میری دی ہوئی رقم لا کر میرے منہ پہ کھینچ ماری اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے دی کہ میں آئندہ اس گلی میں بھی نظر آئی تو وہ میری ٹانگیں توڑ دے گا۔" غزل ساری کتھا سنا کر خاموش ہوئی تو عالیہ نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے۔ صبح کو تو وہ بالکل راضی تھی۔ اچھا تو اس نے سعد کو کچھ نہیں کہا؟"

"نہیں۔ بلکہ وہ تو مجھے یوں گھور رہی تھی جیسے کچا ہی چبا جائے گی۔ اور تو اور وہ پدی کا شوربا جیسا ہے نا اس کا [...] وہ بھی مجھے دھمکانے اور مارنے پر تل گیا۔ اور وہ فرحین وہ تو باقاعدہ مجھ سے لڑنے لگی۔ حتیٰ کہ اس کی امی نے بھی مجھے خوب صلواتیں سنائیں۔"

"اچھا مگر کہیں فارم میں تو کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جو اس کے کزن کو بری لگی ہو؟" عالیہ نے ورطۂ حیرت میں غوطے کھاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں وہ فارم کسی کو دکھانے کی نوبت ہی کہاں آئی۔ اور پتا ہے ان لوگوں نے تو تمہارے بارے میں بھی کہہ دیا ہے کہ اگر [...] نے ان کے گھر میں قدم رکھا تو وہ مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دیں گے۔ میں نے کہا بھی کہ بھئی عالیہ کا اس میں کیا قصور ہے اور تم [...] اسے کیوں برا بھلا کہہ رہے ہو۔ تو عنبرین نے کہا کہ مجھے پھنسانے والی تو وہی ہے اور میں تو ایسی دوستی پر لعنت [...] بھیجتی ہوں۔ میں تو اب اس کی شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔ اور اس کی ماں نے تو تمہیں کیریکٹر لیس بھی کہہ دیا۔"

غزل نے خوب ہاتھ ہلا ہلا کر اور نمک مرچ لگا کر بتایا۔

"کمال ہے — یہ ایک دم ہی وہ سب میرے خلاف کیوں ہو گئے۔ کیا میں نے ان کی گدھی چرائی تھی جو انہوں نے بلاوجہ میرے بارے میں ایسی رکیک باتیں کہیں۔ خیر میں بھی ان کو اس کا مزا نہ چکھا دوں تو میرا نام بھی عالیہ نہیں ہوگا۔"

"ارے نہیں مٹی ڈالو ان لوگوں پہ۔ یوں بھی وہ تمہارے اسٹینڈرڈ کے نہیں ہیں اور ایسے نیچے لوگوں سے ملنا جلنا [...] اچھا نہیں ہوتا۔ بس تم کسی طرح جلدی سے یہ لفافہ گلشی کو پہنچوا دو۔ بلکہ ابھی ابھی اسے فون کر دو وہ خود آ کر لے جائے [...] یا کسی کو بھیج دے گا۔ پلیز مائی سویٹ فرینڈ۔" غزل نے آخری فقرے بڑی لجاجت سے کہے۔

"اچھا لیکن ایسا کرو کہ تم خود ہی اسے فون کر لو۔ بلکہ باتیں مٹھانے کے بجائے تمہیں تو آتے ہی اسے فون کر لینا چاہیے تھا۔" عالیہ نے کہا۔

"ہائے بڑی بین ہو تم۔ میرا اتنا سا کام نہیں کر سکتیں۔ پتا ہے میں چاہتی تو اسے باہر کہیں سے بھی فون کر سکتی تھی لیکن [...] کی خاصیت تو بالکل — سریش کی ہے اور پھر اس کی اپر اسٹوری میں بھیجہ نہیں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ بس جو بات ایک بار اس کے دماغ میں سما جائے — اسی پر اسٹک ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں اگر یہ بتاتی کہ ان ذلیل لوگوں نے میرے ساتھ کیا [...] کیا ہے اور کتنی حقارت سے وہ رقم مجھے لوٹا دی ہے تو وہ الٹا میری جان کو آ جاتا۔ نا بابا نا۔ اپنی عزت سب کو عزیز [...] ہے۔ میں تو کبھی نہ جاتی دوبارہ عنبرین کے گھر۔ اسی لیے میں نے سب کچھ لکھ کر رکھ دیا ہے اس لفافے میں اور وہ رقم [...]" غزل نے جلدی جلدی کہا اور پھر کچھ بوکھلا کر بولی۔

"اوہو — سوا آٹھ ہو گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے تو فلائٹ جا رہی ہے۔ اگر مس ہو گئی تو میری تو شامت آ جائے گی۔ [...] بائے ہنی۔" اور پھر تیزی سے مڑ کر اس نے باہر کا رخ کیا اور عالیہ نے اسے نہ روکنے کی کوشش کی۔ نہ کچھ کہنے کی۔ وہ لفافہ ہاتھ میں لیے ساکت ہی کھڑی رہ گئی۔

"دیکھو پلیز گلشی کو فون ضرور کر دینا۔" باہر سے غزل کی آواز آئی۔ تب بھی اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ کیونکہ [...] تو غزل کی اچانک آمد بلکہ عین وقت کے وقت آمد جب کہ اس کی فلائٹ کسی وقت بھی جانے والی تھی۔ دوسرے خود [...] کرنے کے بجائے اسے لفافہ دے کر اپنے بھائی کو فون کی تاکید کرنا۔ بلکہ اصرار کرنا۔ اس پر اس قدر گھبرانا اور سراسیمہ ہونا [...] ساری باتوں نے عالیہ کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ گو گلشی کو فون کرنا کچھ ایسا مشکل یا نامناسب تو نہ تھا لیکن نا [...] گلشی کو اس وقت فون کرنے پر اس کی طبیعت آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ غزل کی باتوں پر سرے سے اسے [...] نہیں آیا تھا اور پھر گلشی کو فون کر کے لفافے کے بارے میں اگر بتا دیتی تو وہ فوراً موجود ہوتا جب کہ وہ گھر میں اس [...] بالکل تنہا تھی۔ آیا دو تین روز کی چھٹی پر گئی ہوئی تھی اور گلشی کا رات کے وقت اپنے گھر آنا اسے بالکل مناسب نہیں لگ [...] تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ صبح کو دیکھا جائے گا۔ یوں بھی اسی وقت لفافہ گلشی کو نہ پہنچانے کی وجہ سے — دنیا کا کاروبار

بند تو نہیں ہو جائے گا۔"

عالیہ نے خاصے سوچ بچار کے بعد وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کیا اور پھر ملازم سے ڈرائینگ روم لاک کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی ——— ملازم نے ڈرائینگ روم کو لاک کر کے اس کے کمرے میں آکر پوچھا۔

"بی بی صاحب! اور کوئی حکم۔۔؟" آ کر اس نے کہا۔

"نہیں۔ اب تم جاؤ۔ اور ہاں باہر۔ لاؤنج کی گرل بھی لاک کر دینا۔" اور جب ملازم اسے سلام کر کے جانے لگا تو وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"دیکھو منّا! آپا چھٹی پر ہے اس لیے تم آج بابا کے کمرے میں سو جاؤ گے مگر پہلے گرل لاک کر دو۔ اور ہاں اگر کوئی فون آئے اور مجھے پوچھے تو کہہ دینا کہ بی بی سو گئی ہیں کہیں ایسا نہ کرنا کہ ریسیور رکھ کر مجھے بلانے چلے آؤ۔ سمجھے"

"جی۔ سمجھ گیا۔" ملازم نے مؤدب سے انداز میں کہا۔ اور پھر اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ———

منا اپنے کوارٹر میں جا کر اپنا بستر اٹھا لایا اور گرل کو مقفل کر کے سارے کھڑکیاں دروازے دیکھتا ہوا اپنا بستر اٹھائے جمی کے کمرے کا دروازہ کھول کر جونہی اندر داخل ہوا، باہر پسیج میں رکھے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ منّا نے بستر فرش پر پھینکا اور بھاگ کر فون ریسیو کیا۔ ادھر سے گلشتی کی آواز آئی۔

"کون بول رہا ہے۔۔؟"

"جی میں ہوں منّا۔ بی بی صاب کا ملازم۔"

"اور تیری بی بی صاحب کدھر ہے؟"

"جی۔ وہ تو اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔"

"او ہو سو رہی ہے۔ جا اسے جگا کر لا۔ کہنا گل شیر صاب کا فون آیا ہے۔"

"پر میں کیسے جگاؤں انہیں۔ ان کا کمرہ تو اندر سے بند ہے۔"

"او ہو ابھی لتنے سویرے سو گئی عالیہ۔ اچھا سن کیا غزل بی بی بھی اُس کے ساتھ ہے؟"

"نہیں جی۔ وہ تو اکیلی ہیں۔ غزل بی بی تو شام کے وقت آئی تھیں ان کے پاس پھر اُسی وقت چلی گئی تھیں۔"

"مگر کہاں چلی گئی تھیں۔ تجھے کچھ پتا ہے؟"

"نہیں جی۔ پر بول رہی تھیں کہ انہیں ایئر پورٹ بھی جانا ہے۔"

"او۔ ڈیم اٹ۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ جا کر عالیہ کو جگا دو اور اسے بتا دو کہ میرا فون آیا ہے۔"

"جی جگاتا ہوں۔ پر وہ نہیں جاگیں تو۔۔؟"

"ابے تو تو کے بچے کیا تیری کھال کھجا رہی ہے جو پر پر کر رہا ہے۔ جا جگا اسے فوراً۔" گلشتی نے بڑے غضبناک لہجے میں کہا تو منّا سہم کر بولا۔

"اچھا جی! کوشش کرتا ہوں اگر بی بی صاب جاگ گئیں تو۔"

اتنا کہہ کر اس نے ریسیور اوندھا کر کے فون کے قریب ہی رکھ دیا اور خود جمی کے کمرے میں آکر اپنا بستر بچھایا اور دروازے سے کھڑکا لگا کر اطمینان سے بستر پر لیٹ گیا۔ ادھر عالیہ جو فون کی گھنٹی کی آواز سن کر بڑی دیر تک تو اسی انتظار میں رہی کہ منّا اسے رپورٹ دے گا کہ کس کا فون آیا تھا اور کیا بات ہوئی تھی۔ مگر جب منّا پندرہ بیس منٹ گزر جانے کے باوجود بھی نہیں آیا تو کچھ دیر تک ایک انگریزی ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ بھی پڑ کر سو گئی۔ پھر اگلی صبح حسب معمول ٹھیک سات بجے بیدار ہو کر سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ منّا کو بلا کر رات میں آنے والے فون کے بارے میں اُس سے استفسار کیا۔ اور منّا کی زبانی ساری تفصیل سُن کر اس نے فوراً ہی گیٹ سے چوکیدار کو بلوایا اور اس کے ہاتھ میں وہ لفافہ تھما کر سختی سے ہدایت کی۔

"دیکھو دین محمد۔ وہ جو گل شیر صاب آتے ہیں نا اپنی بہن کے ساتھ۔ وہی جو کل شام اپنی ہونڈا سوک میں آئی تھی وہ جب بھی آئیں انہیں یہ لفافہ پکڑا دینا اور کہنا کہ بی بی چھوٹے بابا کو لے کر اپنی آنٹی سے ملنے گئی ہوئی ہیں اور منّا بھی ان کے ساتھ ہی گیا ہے۔ سمجھ گئے نا۔ اگر پوچھے کہ کب واپس آئیں گی تو کہہ دینا کہ تمہیں کچھ پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ رات وہیں ٹھہر جائیں۔ بو

ان کی آنٹی کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

اور پھر اس نے دربان سے ہی کہہ کر گرل میں باہر سے تالا لگوایا اور جمی کو لے کر گھر کے سب سے آخری کمرے میں آگئی جہاں جمی وغیرہ نہ کھیلنے بیٹھ جاتے اور اندر سے شور سن کر گلشتی یہ نہ سمجھے کہ اس سے جھوٹ بولا گیا ہے۔

گلشتی گیارہ بجے کے قریب آیا اور چوکیدار سے لفافہ لے کر چلا بھی گیا۔ تب بھی وہ سہ پہر کے قریب ہی اندر سے برآمد ہوئی اور وہ بھی پوری تیاری کے ساتھ۔ اسی خیال سے کہ کہیں رات کو یا شام کو گلشتی پھر نہ آموجود ہو۔ وہ جمی کو لے کر اپنی رشتے کی ایک خالہ کے ہاں جا رہی تھی۔ جاتے وقت بھی اس نے دین محمد سے کہا۔

"آنٹی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ابھی ابھی ان کا فون آیا تھا۔ کوئی مجھ سے ملنے آئے تو کہہ دینا کہ اپنی آنٹی کے ہاں گئی ہیں اور رات کو وہیں رہیں گی اور وہاں کسی کو آنٹی کا پتا نہ بتا دینا اور گھر کا خیال رکھنا۔" پھر وہ جمی کے ساتھ کار میں بیٹھی اور ڈرائیور سے اپنی خالہ کے ہاں جانے کو کہا۔

رات سے لے کر اب تک یہ ساری احتیاط عالیہ نے اس لیے نہیں برتی تھی کہ وہ گل شیر سے خوفزدہ تھی بلکہ غزل نے اچانک ہی وارد ہو کر عنبرین کی رقم واپس کرنے کے بارے میں اسے جو کہانی سنائی تھی اور جس طرح گھبرائے گھبرائے اور سراسیمہ سے انداز میں وہ بات کر رہی تھی اس کے پیش نظر اور عالیہ جو گل شیر کی سرکش اور آمرانہ فطرت سے بڑی حد تک واقف تھی اُس نے اس اندیشے کے تحت اس سے بات کرنا یا ملنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ اگر واقعی غزل کی بات سچ نکلی تو گلشتی سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اسے اسی وقت پکڑ کر عنبرین کے ہاں لے جائے اور نہ معلوم وہاں جا کر کیا جھگڑا کرے۔ کیونکہ صرف وہی تو تھی جسے عنبرین کے گھر کا پتا معلوم تھا بلکہ اس کی سفارش اور ملاقات کرانے کا ذریعہ بھی وہی بنی تھی۔ غزل کی زبانی عنبرین اور اس کے گھر والوں کی اپنے بارے میں اتنی رکیک باتیں سُن کر وہ رات سے۔ اب تک غصے میں جلتی رہی تھی اور افسوس بھی کرتی رہی تھی۔ اصل میں تو اسے کسی طرح یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

یعنی عنبرین اور اس کی ماں بہن اور بھائی اس کے لیے ایسے نازیبا کلمات بھی منہ سے نکال سکتے ہیں کیونکہ وہ عنبرین کی فطرت سے اس حد تک نہ سہی لیکن اس کی عادات اور مزاج سے بڑی حد تک واقف تھی۔ اس لیے کبھی وہ سوچتی کہ خود غزل ہی نے کچھ ایسا رویہ اختیار کیا ہو گا جو ان لوگوں نے اس کے ساتھ مجھے بھی لپیٹ لیا ہو گا اور کبھی یہ سوچتی کہ یہ عنبرین لوگ تو بڑے احسان فراموش نکلے۔ میں نے عنبرین کے ساتھ اتنا کیا۔ تحفے تحائف ہی نہیں ویسے بلکہ چپکے چپکے پیسوں سے بھی اس کی مدد کرتی رہی۔ اسے پڑھائی میں بھی کتنی مدد دی اور اس کی بات بات کا خیال بھی رکھا۔ اسی کے گڑ گڑا گڑگڑا کر کہنے پر کہ عالیہ پلیز تم میرے لیے کوئی اچھی سی ملازمت ڈھونڈو۔ مجھے کسی اچھی جگہ رکھوا دو۔

میں نے یہ غزل والی جاب اس کے لیے بڑی مشکل سے ڈھونڈی تھی۔ جب کہ اس جاب کے معاملے میں بھی اس نے کتنا رلایا تھا کتنے نخرے کیے تھے جب کہیں جا کر راضی ہوئی تھی اور میں نے ہی تو غزل سے کہا تھا کہ وہ پیشگی اسے کچھ روپے ادا کر دے تاکہ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لے۔ اور غزل نے تو ایک دم حاتم کی قبر پر لات ہی مار دی تھی کہ اسے اکٹھے آٹھ ہزار روپے ایڈوانس دے دیے تھے تب بھی وہ نخرہ ہی کرتی رہی کہ سوچ کر جواب دوں گی۔

مگر آج صبح تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ میں جب یہ معلوم کرنے کہ اُس کا بھائی اُسے پوچھتا میرے پاس کیوں آیا تھا اور اچانک ہی ماں اور بہن کے ساتھ کہاں غائب ہو گئی تھی اس کے گھر پہنچی تو اس نے کتنی خندہ پیشانی سے میرا سواگت کیا تھا اور گزشتہ روز ماں کی طرف سے اٹھائی ہوئی پریشانی کی بابت ساری تفصیل سنا کر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بہت ہنس کر مجھ سے کہا تھا۔

"تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے عالیہ۔ پتا ہے میں نے غزل کی آفر منظور کر لی ہے۔" اور میں نے بھی خوش ہو کر اسے گلے لگا لیا تھا کہ نا معلوم کیوں وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ تبھی تو میں نے اپنے اور اس کے طبقاتی فرق کو کبھی اپنی دوستی کے درمیان نہیں ہونے دیا تھا اور اس کے ٹوٹے پھوٹے بھٹیچر سے گھر میں بھی ہو آئی تھی۔ اس کے باوجود بھی اس نے میری ذرا بھی لاج نہ رکھی اور غزل کے سامنے میرے بارے میں اتنی غلیظ باتیں کیں۔"

گاڑی میں بیٹھ کر پہلے اس کا دل چاہا کہ ذرا عنبرین کی خبر لیتی چلے اور کچھ نہیں تو کم از کم اسے اتنا ضرور بتا دے کہ تم نے غزل

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے میرے بارے میں جو بکواس کی ہے میں ایسی نہیں ہوں کہ اسے خاموشی سے برداشت کر لوں گی بلکہ میں تو تمہیں ایسا جواب دوں گی کہ تمہارے دانت کھٹے ہو کر رہ جائیں گے بلکہ تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی مگر پھر اسی دم اسے جمی اور ڈرائیور کی موجودگی کا خیال آیا کہ نامعلوم وہاں جا کر کیا سچویشن پیدا ہو جائے اور یہ دونوں میرے بارے میں کیا سوچیں اس لیے وہ سیدھی اپنی خالہ کے ہاں چلی آئی۔

پھر رات کو کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب جمی اور رحنا کو لے کر وہ اپنے گھر روانہ ہوئی۔ گھر چونکہ مقفل کر کے آئی تھی اس لیے چوکیدار سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی آیا تو نہیں تھا۔ گھر پہنچ کر ابھی اس کی کار گیٹ پر ہی ملی ہی ہوئی تھی کہ گل شیر آن وارد ہوا۔ اپنی کار کو پورچ میں رکھوانے کے بجائے اس نے گیٹ کے آگے ہی بیچ گیٹ کے باہر رکوالیا اور باہر اتر آئی۔ جب کہ جمی اور رحنا کار ہی میں بیٹھے رہے۔ اس اثنا میں گل شیر بھی اپنی کار سے باہر اتر آیا تھا اس نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

”کل سے تمہارا نمبر ملاتے ملاتے ڈائل کے نمبر گھس گئے ہیں مگر تم سے کونٹیکٹ ہی نہیں ہو سکا۔ آخر کہاں غائب تھیں“

”رات تو گھر پر ہی تھی مگر جلدی سو گئی تھی اور اب سارا دن آنٹی کے ہاں گزار کر آ رہی ہوں۔“ عالیہ نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

”غزل کس وقت تمہارے پاس آئی تھی؟“ گل شیر نے پوچھا۔

وہ تو شام کو آئی تھی اور بڑی عجلت میں تھی۔ اور ہاں وہ لفافہ مل گیا نا تمہیں جو وہ مجھے دے کر گئی تھی۔“ عالیہ نے غزل کے بارے میں بتا کر پوچھا۔

”ہاں — وہ تو میں صبح کو تمہارے چوکیدار سے لے گیا تھا لیکن جب غزل نے تمہیں وہ لفافہ کل شام کو دیا تھا تو تم نے کل ہی مجھے کیوں نہ بھجوایا۔ اگر میں اتفاق سے آج صبح یہاں نہ آتا تو —“

”نہیں۔ اب ایسی بات بھی نہیں۔ میں نے سوچا اس وقت تو رات ہو گئی ہے، کل صبح تمہیں کسی طرح بھجوا دوں گی۔ مگر ہوا یہ کہ آج صبح ہی صبح آنٹی کا فون آ گیا کہ وہ سخت بیمار ہیں تو میں وہ لفافہ دین محمد کو دے کر چلی گئی کہ اگر کوئی آئے تو اسے دے دینا مگر اس لفافے میں کیا کوئی خاص بات ہے۔ میرا مطلب ہے ایسی کون سی کونفیڈنشل؟“

”ہاں یہی سمجھ لو۔“ گل شیر نے قطع کلام کر کے کہا۔

”اس کا مطلب ہے غزل نے تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا۔“ اس نے بڑے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔ بلکہ میں نے خود اس سے پوچھا تھا کہ یہ لفافہ تم خود گلشی کو دیتی ہوئی کیوں نہیں آئیں؟ تو اس نے کہا کہ اس کی فلائٹ جانے میں بیس پچیس منٹ رہ گئے ہیں۔ اگر وہ گلشی کو اتنی دور یہ خط دینے جاتی تو اس کی فلائٹ مس ہو جاتی۔“ عالیہ نے بتایا اور پھر کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”مگر بات کیا تھی تم ہی بتا دو۔“

”ارے چھوڑو۔ گولی مارو بات وات کو اور یہ بتاؤ کہ کیا۔ تم ابھی — میرے ساتھ عنبرین کے گھر چل سکتی ہو؟“ گل شیر نے سخت اُجڈپن سے اس کے سوال کو رد کر کے پوچھا۔

”ہیں عنبرین کے ہاں! کیوں خیریت تو ہے؟ یہ عنبرین کے یہاں جانے کا خیال تمہیں کیسے آ گیا؟“

”بس ایسے ہی۔ میں اس سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔“ گل شیر بولا۔

”کمال ہے تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو اور تم نے آخر سمجھ کیا رکھا ہے عنبرین کو۔ وہ غریب ضرور ہے مگر نہایت شریف اور روایات کی پابند لڑکی ہے۔ وہ غیر مردوں سے ایسے ناوقت ملنا کبھی گوارا نہ کرے گی۔“ عالیہ ایک دم بگڑ کر بولی۔

”مگر میں تنہا تو اس سے ملنے نہیں جا رہا۔ تم بھی تو میرے ساتھ ہو گی نا۔“ گل شیر اس کی خفگی کی پروا کیے بغیر بولا۔

”اوہ نو آئی ایم سوری سوری گلشی۔ میں جمی کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ یوں بھی اس کا تو آج سارا شیڈول ہی بگڑ گیا ہے نہ تو اس نے کھانا کھایا ہے نہ کپڑے ہی بدلے ہیں اور پھر اسے دوا دے کر سلانا بھی تو ہے۔ یہ تو ڈائیٹ فوڈ کھاتا ہے نا۔ آنٹی نے کتنا کہا بھی تھا کہ میں اپنے کک سے کہہ کر اس کا ڈائیٹ فوڈ تیار کرائے دیتی ہوں مگر میں یہاں آنے کی جلدی میں بھوکا ہی لے کر آ گئی۔“ عالیہ نے گویا یہ کہہ کر اس کے ساتھ جانے سے صاف صاف انکار کر دیا۔

”چلو ٹھیک ہے لیکن اگر تم نہیں جا سکتیں تو تمہارا یہ ڈرائیور تو میرے ساتھ چل سکتا ہے۔ اسے تو عنبرین کے گھر کا پتا ضرور معلوم ہو گا۔“

گل شیر نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا جو کار سے اتر کر کار کے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا تو گھڑی بھر کو عالیہ بوکھلا سی گئی مگر پھر فوراً ہی اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا کر اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

”یہ رفیق کاکا — انہیں عنبرین کے گھر کا پتا بھلا کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ جب کہ انہوں نے تو کبھی عنبرین کو بھی نہیں دیکھا۔“

”اچھا۔ تمہیں تو معلوم ہو گا۔ تم تو جاتی رہتی ہو اس کے یہاں۔“ گل شیر کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑا اجز بز ہو رہا ہے۔

”نہیں، میں تنہا تو کبھی اس کے ہاں نہیں گئی۔ صرف دو مرتبہ جانے کا ہی اتفاق ہوا تھا وہ بھی غزل کے ساتھ۔ غزل ہی مجھے اس کے ہاں لے گئی تھی۔ وہ بھی شام کو۔“ عالیہ نے غلط بیانی سے کام لینا ہی بہتر سمجھا۔

”چلو اس بات کو بھی جہنم میں ڈالو اور اس کا اتا پتا ہی بتا دو کہ وہ کہاں اور کس علاقے میں رہتی ہے۔ کیا نمبر ہے اس کے مکان کا؟“ گل شیر نے جس کے لب و لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑے غصے میں ہے چبھتے سے لہجے میں پوچھا۔

”نمبر ومبر تو مجھے معلوم نہیں، البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ تین ہٹی کے علاقے میں کہیں رہتی ہے۔ اصل میں شام کو گئی تھی نا۔ یہ یاد بھی نہیں ہے کہ کتنے موڑ مڑنے پڑے تھے۔ گلی در گلی کا کچھ چکر تھا۔ رہتی بھی تو بڑے کنجسٹڈ علاقے میں ہے۔ ٹھہرو میں تمہیں تھوڑا سا ہنٹ دیے دیتی ہوں۔ وہ جو تین ہٹی کا پل ہے نا اس سے آگے جو سڑک آتی ہے اس کے سرے پر ایک سفید رنگ کی پلیا بنی ہوئی ہے۔ بس اسی سڑک پر اندر جا کر ایک اور ذیلی سڑک آتی ہے اس سے تھوڑا سا آگے بڑھ کر برابر کئی گلیاں آتی ہیں۔ بس انہی میں سے ایک میں اس کا گھر ہے پیلے کلر کا پرانا سا —“

”بس بس تھینکس لے لوٹ۔ جو پتا تم مجھے بتا رہی ہو اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے بوڑھا بھی ہو جاؤں تو نہیں پہنچ سکوں گا ایسا کرنا کہ تم خود صبح کو میرے ساتھ چلی چلنا۔“

”اوہ نو — ٹو بی ویری فرینک میں کل بھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گی کیونکہ ایک تو رات کی فلائٹ سے پاپا کراچی آ رہے ہیں۔ آج صبح ہی ان کا فون آیا تھا تبھی تو مجھے اس وقت آنٹی کے یہاں سے آنا پڑا۔ ورنہ میں آج کی رات انہی کے یہاں گزارتی۔ دوسری بات یہ کہ اگر پاپا نہ بھی آتے تب بھی میں تمہیں عنبرین کے ہاں لے کر کبھی نہ جاتی۔“ عالیہ نے ساری رواداری ایک طرف رکھ کر گویا ٹکا سا جواب دے دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے تو پھر ہم خود ہی اس کا پتا لگا کر اس سے مل آئیں گے۔“ گل شیر نے کچھ دیر قبل جلائے سگریٹ کو پھینکنا ہی پھینکتے ہوئے کہا۔

”مگر کیوں ملنا چاہتے ہو اس سے جب کہ اس نے نہ صرف تمہاری آفر کو رد کر دیا ہے بلکہ تمہارا آٹھ ہزار روپیہ بھی تم کو واپس دے دیا ہے۔ دیکھو گلشی وہ بے چاری ایک یتیم اور شریف لڑکی ہے۔ اس کے پاس جا کر تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا کیونکہ وہ ایک بار کسی بات سے انکار کر دیتی ہے تو پھر کبھی اس کے لیے راضی نہیں ہوتی ہے۔ اور پھر وہ اپنی ماں کی مرضی کے بغیر —“

”اجی اس کی ماں — اس کی بہن ہم سب کو دیکھ لیں گے۔ یوں بھی ہمارا کام یتیموں اور بے سہاروں کی مدد کرنا ہی ہے۔“ گل شیر نے ماں اور بہن کے الفاظ بڑی خباثت سے ادا کرتے ہوئے کہا اور بات کے اختتام پر ہنسنے لگا۔

”ویسے بھی ڈیر عالیہ! غزل صرف اسلام آباد گئی ہے ملک عدم کو نہیں سدھاری۔ اس سے ایک منٹ میں تمہاری نیک پروین کا پتا چلا لیا جائے گا۔ او کے چیریو بائی۔“

گل شیر نے ہنستے ہنستے یک لخت سنجیدہ ہو کر کہا اور کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور پھر کار کو تیزی سے ریورس کر کے ایک زبردست اسکریچ مارتا ہوا — اُڑن چھو ہو گیا۔ اور عالیہ بالکل ساکت سی کھڑی رہ گئی۔ کہنے کو بیسیوں باتیں تھیں جو وہ اس سے کہہ سکتی تھی مگر اس کی فطرت اور خصلت سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ کہ اس سے کچھ بھی کہنا بے کار ہی ہوتا۔

کیونکہ اس کا غضبناک سا انداز صاف ظاہر کر رہا تھا کہ غزل کے خط نے اسے عنبرین کے خلاف ورغلایا اور بھڑکایا ہے۔ اور اب وہ غزل سے اس کا پتا معلوم کر کے کسی وقت بھی اس کے یہاں جا دھمکے گا۔ معلوم اس سے کیا کہے اور کس طرح پیش آئے۔ عالیہ کا دل چاہا کہ ابھی ابھی عنبرین کے یہاں جا کر اسے پہلے سے خبردار کر دے کہ گلشی تم سے ملنے آ رہا ہے اور پھر عنبرین کے پاس جا کر کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ غزل سے اس کی لڑائی کیوں ہوئی تھی اور اس نے اس کا سارا غصہ مجھ پر کیوں اتار، میرے بارے میں اتنی غلیظ اور رکیک باتیں کیوں کیں۔ مگر وہ اپنے اس ارادے کو فی الفور عملی جامہ نہ پہنا سکی کہ جمی جو جلدی سو جانے کا عادی تھا۔ نیند میں جھونٹے کھا رہا تھا۔ اور پھر ابھی تو اسے اس کا لباس تبدیل کرا کے اسے تھوڑا سا کچھ کھلانا بھی تھا۔ اور چونکہ اسے سخت نیند آ رہی تھی۔ اس لیے اسے اس کا ڈائٹ فوڈ دہ پرہیزی کھانا، کھلانا مشکل ہی تھا کہ یوں بھی وہ بہت آہستہ آہستہ اور سو نخرے کر کے کھانا کھاتا تھا۔ اور کھانے کے بعد اسے سلانے کی ڈیوٹی بھی عالیہ نے ہی اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اور یہ سارا کام انجام دینے کے بعد وقت اتنا آگے بڑھ جاتا کہ عنبرین کے یہاں جانے کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ یہی سب سوچ کر وہ یکلخت کار کی طرف گھومی اور ملازم کو للکارنے کے سے انداز میں بولی۔

"ارے منا! تم اب تک اندر ہی چپکے بیٹھے ہو، چلو نکلو باہر اور بابا کو کار سے اتار کر اندر لے چلو۔" اور پھر اس نے ڈرائیور کو گھر کی چابیاں دیتے ہوئے کہا۔

"رفیق کاکا! آپ جلدی سے گرل کا تالا کھولیں۔ اتنے میں جمی کو سنبھالتی ہوں۔ بے چارہ نیند میں غنی ہو رہا ہے۔" تو رفیق اس کے ہاتھ سے چابیوں کا گچھا لے کر فوراً ہی حکم کی تعمیل کرنے چل دیے۔ اور وہ جمی کو سہارا دے کر منا کے ساتھ اندر لے جانے لگی تو گرل کے آگے رک کر بولی۔

"گاڑی گیراج میں بند کر کے تالا لگا دیں۔ اور دین محمد سے کہتے جائیں کہ کوئی ملنے والا آئے تو اسے باہر سے ہی ٹرخا دیں۔

اور پھر ڈرائیور کے ہاتھ سے چابیاں لے کر جمی اور منا کے ساتھ اندر چلی آئی۔ رات کی فلائٹ سے اپنے والد کے آنے کا اس نے محض بہانہ کیا تھا ورنہ گل شیر اس کے پیچھے بھٹی ہو جاتا کہ چلو خیر۔ جمی کے کاموں سے فارغ ہونے میں خواہ تمہیں کتنی ہی دیر لگے میں انتظار کر لوں گا۔ بس تم مجھے عنبرین کے گھر لے چلو۔

اصل میں اس کے والد اور گل شیر کے بڑے بھائی گل جان خان کے درمیان گہری دوستی نہ سہی گہری واقفیت ضرور تھی کیونکہ اپنے کاروباری معاملات میں تقریباً دونوں کا ہی ایک دوسرے سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ اور گل جان بہت سخت گیر اور تند خو تھا۔ اور اس سے بہن اور بھائیوں کی جان نکلتی تھی اور اسی کی نسبت سے وہ عالیہ کے والد سے بھی دبتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی آمد کی خبر سن کر وہ عالیہ کو ساتھ چلنے پر مجبور کرنے کی جرأت نہیں کر سکا تھا۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ ماں نے تو کہا تھا کہ چھوٹی جلدی سے آلو کا بھرتا بنا لے مگر چھوٹی نے آلو پالک کی بھجیا بنائی تھی۔ کیونکہ پالک کا ساگ گو بہت سستا ملا تھا لیکن گھر میں فرج تو تھا نہیں اور ساگ کے گل جانے کا احتمال تھا اس لیے تھوڑا سا ہی خریدا تھا۔ اس لیے چھوٹی نے اس خیال سے سب سے پہلے وہی پکا لیا تھا کہ یونہی نیگ لگ جائے گا۔ ویسے بھی شعبان المعظم کی انتیس تاریخ تھی مگر چاند دیکھے جانے کی اطلاع کہیں سے بھی نہیں آئی تھی۔ اس لیے آلو پالک کی بھجیا پر ہی گزر بسر کرنے کی ٹھانی گئی تھی جبکہ آلو اور پالک گھر میں کوئی بھی رغبت سے نہیں کھاتا تھا۔ اور ابھی یہ چاروں ماں بیٹا اور بیٹیاں کھا پی کر بیٹھے ہی تھے کہ دفعتاً بیٹھک کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹایا گیا تھا۔ اندر ہی اندر چاروں ہی سہم کر رہ گئے۔

کہیں غزل پھر واپس تو نہیں آ گئی۔ ماں اور دونوں بیٹیوں نے ایک ساتھ ہی دل میں سوچا۔

"اپنے کسی حمایتی کو اپنے ساتھ نہ لائی ہو۔" اسی خیال سے عنبر کا دل دھک سے رہ گیا۔

"آپا! آپا! کہیں غزل تو نہیں آ گئی۔" چھوٹی نے سرگوشیانہ انداز میں اپنے خدشے کو زبان دی۔

"ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی کو اپنے ساتھ لائی ہے۔" عنبر نے بھی اپنے اندیشے کو ابھارا۔

"مگر کس کو آپا؟" چھوٹی نے ہول کر پوچھا۔

"اب مجھے کیا معلوم۔" عنبر سراسیمہ سے انداز میں بولی۔

"یا اللہ۔ خدا خیر کرے۔" خورشید جہاں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ اس دوران ایک تواتر سے دروازہ کھٹکھٹایا جاتا رہا۔

"ارے چھوڑیں اب ایسا بھی کیا ڈر۔ میں جا کر دیکھتا ہوں کہ ایسا کون مائی کا لعل آیا ہے۔" عذیر نے ماں اور بہنوں کو خوفزدہ سا دیکھ کر سینہ تان کر کہا۔

"نہیں نہیں، خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا۔ چل یہاں آ کر ماں نے ڈانٹ کر کہا۔

"ہاں عذیر! تم چپ چاپ یہیں بیٹھے رہو۔ جو کوئی بھی آیا ہے وہ دروازہ نہ کھلنے پر یہی سمجھ کر واپس چلا جائے گا کہ سب گھر والے سو گئے ہیں۔" چھوٹی نے نہایت صائب مشورہ دیا۔

"ہاں عذیر! چھوٹی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے بیٹھک میں تو اندھیرا ہے۔ جو کوئی بھی آیا ہے خود ہی دروازہ کھٹکھٹاتے کھٹکھٹاتے واپس چلا جائے گا۔" عنبر نے بھی چھوٹی کی بات کی تائید میں کہا۔

"ہاں، اب آنے والا کوئی دروازہ توڑنے سے تو رہا۔" خورشید جہاں بھی عنبر کی بات سے متفق ہو کر بولیں۔

"نہیں امی! کس کی مجال ہے۔ جو دروازہ توڑنے کی جرأت کرے گا۔ لیکن ذرا مجھے دیکھ تو لینے دیجیے کہ آخر وہ ہے کون۔ بیٹھک میں تو اندھیرا ہے ہی نا دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھ لوں گا۔" عذیر جو ماں کے ڈانٹنے پر بیٹھا تو نہیں تھا البتہ جاتے جاتے رک ضرور گیا تھا۔ اتنا کہہ کر تیزی سے بیٹھک میں چلا گیا تو دونوں بہنیں بھی ماں کے منع کرنے کے باوجود دبے قدم چلتی بیٹھک میں چلی آئیں۔ اس اثنا میں عذیر جھری سے باہر جھانک چکا تھا۔ اس نے بڑی برہمی اور بیزاری سے لاحول ولا کہہ کر دروازہ کھول دیا۔

"واہ بھئی، یہ کیا شرافت ہے۔ اس بری طرح دروازہ دھڑ دھڑاتے کے بجائے مجھے آواز کیوں نہ دے لی۔" عذیر آنے والے پر آنکھیں نکال کر بولا۔

"لو آوازیں دیتے دیتے تو میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔ تبھی تو دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ مگر کیا تم سو رہے تھے۔" آنے والے نے جواب میں کہا تو اس کی آواز پہچان کر چھوٹی بولی۔

"اے ہے! یہ تو سلیم ہے مگر یہ اس وقت کیوں آیا ہے۔" اور پھر اس نے عذیر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"عذیر! کیا سلیم آیا ہے؟" تو عذیر کے بجائے۔ عذیر کے پہلو سے منہ نکال کر جواب سلیم نے دیا۔

"ہاں آپا! وہ رمضان کا چاند نظر آ گیا تھا۔"

"اچھا! اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے نظر آیا ہے۔ وہ بھی تم کو۔" چھوٹی ہنس کر بولی۔

"نہیں آپا! ٹی وی پر ابھی ابھی اعلان ہوا ہے۔ اماں نے کہا کہ جا کر سلائی والی خالہ کو بتا آ۔ ان کے یہاں تو ریڈیو بھی نہیں ہے۔ اس لیے میں آ گیا۔"

"اچھا بہت شکریہ تمہارا اور۔ تمہاری اماں کا بھی۔" چھوٹی نے آخری الفاظ بہت جما جما کر کہے سلیم فوراً ہی واپس چلا گیا تو عنبر برہم سے انداز میں بولی۔

"دیکھو بھلا، کیسے بد ذات لوگ ہیں۔ امی کو مستقلاً سلائی والی خالہ ہی کہنے لگے۔"

"چھوڑیں آپا۔ وہ لوگ تو کہہ کر چھٹ گئے لیکن اگر ہم کہیں گے تو غیبت جیسے گناہ کبیرہ میں شمار ہو گا۔

یوں بھی آج رمضان شریف کی چاند رات ہے۔"

چھوٹی نے جیسے خود بھی سلیم کا سلائی والی کہنا ناگوار گزرا تھا۔ بہن کو رمضان کے احترام کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب میں امی کو اپنی جان کی قسم دے دوں گی کہ آئندہ انہوں نے محلے والوں کی سلائی کو ہاتھ لگایا تو وہ میرا مرا منہ ہی دیکھیں۔" عنبر نے غصے سے کہا۔

"خدا نہ کرے آپا! آپ بھی کسی بد فالیں منہ سے نکالتی ہیں۔ وہ بھی چاند رات کو۔" چھوٹی سہم کر بولی۔

"چھوڑو چاند رات واند رات کو۔ چاند کو بھی آج ہی ہونا رہ گیا تھا۔" عنبر نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"کیوں آپا! پھر کب ہوتا چاند؟" چھوٹی نے مسکراتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"کل ہو جاتا۔ کم از کم ہم اپنی آنکھوں سے تو دیکھ لیتے چاند کو۔" عنبر بولی۔

"مگر اس سے کیا فرق پڑتا آپا! کراچی کا مطلع تو خاص طور پر رمضان اور عید کے چاند کے موقع پر ہمیشہ ابر آلود ہی رہتا ہے۔"

"ہونہہ! مطلع ہی کیا کراچی کا تو پورا ماحول ہی ہمہ وقت ابر آلود اور کثیف رہتا ہے۔ جھگڑے فساد، چوریاں، ڈاکے اور فائرنگ، کسی کی جان اور عزت محفوظ ہی نہیں ہے یہاں۔" عنبر کڑوا سا منہ بنا کر بولی۔

"آپا! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ یہ بتائیے کہ بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں ہے، ورنہ میں تو اب پڑ کر سوجاتا ہوں۔ صبح سحری کے لیے بھی تو اُٹھنا ہوگا نا۔" عذیر نے ان دونوں کی بے موقع باتوں سے اُکتا کر پوچھا۔

"ارے ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی کہ سحری پر بھی اُٹھنا ہے۔ آپا کچھ منگوانا تو نہیں آپ کو۔" بڑی بہن کا موڈ دیکھ کر چھوٹی کو یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ آپا فلاں فلاں چیز منگوا لیجیے۔

"بھئی، میں کیا بتاؤں، یہ کام تو تمہارا ہے۔ تم جس چیز کی ضرورت سمجھتی ہو وہی منگوا لو۔" عنبر نے یہ کہہ کر گویا کچھ منگوانے کی اجازت دے دی۔

"تو ایسا کرو عذیر! کہ آدھا کلو دودھ اور تین انڈے لے آؤ۔ اور ہاں ایک ڈبل روٹی اور مکھن کی چھوٹی ٹکیاں بھی لے لینا۔" چھوٹی نے فوراً ہی اپنی مطلوبہ چیزوں کی زبانی فہرست عذیر کو بتائی۔

"لیکن ڈبل روٹی اور مکھن منگوانے کی بھلا کیا ضرورت ہے، کیا پراٹھے پکانے کا ارادہ نہیں ہے تمہارا۔" عذیر بولا۔

"نہیں پراٹھے تو سمجھو مست (ضروری) ہیں۔ ڈبل روٹی اس لیے منگوا رہی ہوں کہ کبھی کبھی معدے پر بھاری پن سا ہوتا ہے تو کوئی ٹھوس اور ثقیل غذا کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ مگر پھر بھی مجبوراً کھانی پڑتی ہے۔ مگر آج تو۔ خیر چھوڑو۔ خوامخواہ پیسہ ضائع کرنے سے فائدہ۔" چھوٹی نے آخری فقرہ اس خیال سے کہا کہ عنبر کے پاس تھوڑے سے پیسے ہی رہ گئے تھے۔

"چھوڑو وڑو کیا بلکہ لے کر ہی آؤ۔ ٹھہرو میں ابھی تمہیں پیسے دیتی ہوں۔" عنبر چھوٹی کی ہچکچاہٹ کو محسوس کر کے بولی۔

"مگر چھوٹی! میں پورا ایک بوائلڈ انڈا کھاؤں گا۔ کیونکہ مجھے وہ تمہارا دو انڈوں میں چار آدمیوں کو نمٹا دینا اور چٹنی کی طرح لگا لگا کر آملیٹ کھانا بالکل اچھا نہیں لگتا۔" عذیر نے کہا تو عنبر بولی۔

"اچھا بھئی، تم ایک نہیں دو بوائلڈ انڈے کھا لینا۔ یوں بھی ایک انڈے سے نیت بھرتی ہے نہ طبیعت سیر ہوتی ہے۔ ایسا کرو چھ انڈے لے آؤ۔ کل پانچ روپے کے تو آئیں گے ہی۔"

"واہ میری آپا! آپ کتنی اچھی ہیں۔ بس غم ہے تو اس بات کا کہ میں اپنے اسپائیکس نہیں خرید سکا۔" عذیر بولا۔

"فکر نہ کرو، تمہارے اسپائیکس بھی انشاء اللہ جلد ہی آجائیں گے۔ بس اب جلدی سے جا کر سودا لے آؤ۔" عنبر

نے بھائی کا دل رکھنے کی غرض سے کہا۔

"ہُرّاہ۔ آپا آپ واقعی بڑی دریا دل ہیں۔" عذیر خوش ہو کر بولا۔

"ہونہہ، خاک دریا دل ہیں۔ یہ دریا دلی وریا دلی سب کچھ پیسے سے ہوتی ہے اور یہاں تو۔" عنبر نے سر کو جھٹک کر کہا تو چھوٹی اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"نہیں آپا! دیکھنے میں تو یہی آیا ہے کہ جن کے پاس پیسہ ہوتا ہے، اُن کے دل ہی نہیں ہوتے اور جن کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ دریا دل ہوتے ہیں۔ جیسی کہ آپ ہیں اور میں ہوں آپا۔"

"ہاں جن کے دل بڑے ہوتے ہیں، قدرت انہیں پیسہ نہ دے کر شاید ان کی قوتِ برداشت کا امتحان لیتی ہے۔" عنبر نے یاس بھرے لہجے میں کہا۔

"قدرت تو خیر امتحان لیتی ہو یا نہ لیتی ہو۔ لیکن شاید آپ میری قوتِ برداشت کا امتحان لے رہی ہیں کہ نیند کے مارے بُرا حال ہے اور۔" عذیر نے کہا تو عنبر کو ایک دم ہی سودا منگوانے کا خیال آگیا۔ وہ کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"او ہاں۔ چلو آؤ، میں تمہیں سودے کے لیے پیسے دے دوں۔"

"ہاں آؤ کمرے میں چلو۔ چاند کو اگر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو اُس کے دیکھ لیے جانے کی خبر تو سُن لی ہے۔ آؤ امی کو سلام کر کے اُن کی دعائیں لو۔"

چھوٹی نے کمرے کا رخ کرتے ہوئے عذیر سے کہا۔ چاند دکھائی دینے کی خبر سن کر وہ کھلی پڑ رہی تھی ــــ اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کم از کم پورے مہینے کا راشن تو مہیا کر لیا گیا تھا اور دوسری وہی جو ایک سچے مسلمان کو قلبی اور جذباتی طور پر رمضان کی آمد پر ہوتی ہے۔ اب سے کچھ دیر قبل عزل کی ہاتھوں اُٹھائی ذلت۔ پریشانی اور ندامت کا احساس بھی دل کی اس طمانیت اور خوشی میں مٹ سا گیا تھا۔ وہ عذیر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو ماں کو سلام کرتی ہوئی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی جو غالباً عنبر سے یہ پوچھ رہی تھیں کہ دروازہ کون کھٹکھٹا رہا تھا۔ اور یوں انہیں رمضان المبارک کا چاند دیکھ لیے جانے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اسی اثنا میں عذیر بھی انہیں سلام کر چکا تھا۔ اور وہ دعائیہ انداز میں دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے بچوں کو دعائیں دینے لگیں۔ اتنے میں عنبر اپنے پرس سے پیسے نکال چکی تھی جو اس نے عذیر کو دیتے ہوئے کہا۔

"لو یہ پیسے لو اور جا کر جلدی سے ساری چیزیں لے آؤ۔"

"کچھ یاد بھی ہے کہ آپا نے کیا کیا لانے کو کہا تھا؟" چھوٹی نے عذیر سے پوچھا۔

"ہاں ہاں ایک کلو دودھ۔ چھ انڈے اور مکھن ڈبل روٹی۔" عذیر نے بتایا۔

"مگر یہ چھ انڈے منگوانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ جتنے پیسے تمہارے پاس بچے ہیں، انہیں ذرا دیکھ بھال کر خرچ کرو۔ ورنہ پورا مہینہ کس طرح گزارو گی۔"

خورشید جہاں نے چھ عدد انڈوں پر گویا اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھا جائے گا امی! خدا مسبب الاسباب ہے۔ اب تم کسی طرح جا بھی چکو عذیر۔"

عنبر نے ماں کو جواب دے کر عذیر سے کہا تو وہ فوراً سودا لینے روانہ ہو گیا۔

"اب سحری کے لیے کیا پکانا چاہیے؟ چھوٹی میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا۔" عذیر کے جانے کے بعد عنبر نے چھوٹی سے پوچھا۔

"آپا کوئی بھُنی ہوئی ڈش ہونی چاہیے وہ بھی گوشت کے ساتھ۔ سچ بھجیا وجیا تو سحری پر بالکل چلتی ہی نہیں۔"

چھوٹی نے جواب میں کہا۔

"ہاں یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مجھ سے تو سحری پر انڈے بھی نہیں کھائے جاتے۔" عنبر نے اس کی بات سے

اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"تو فکر کی کیا بات ہے آپا۔ وہ۔ گائے کا قیمہ۔ بازار سے خریدا تھا۔ اسے میں نے خراب ہو جانے کے خیال سے تھوڑے سے گھی میں بھون کر نعمت خانے میں رکھ دیا ہے۔ آلو پالک کی بھجیا بھی خاصی بچ گئی ہے بس تھوڑے سے قیمے میں اسے بھون کر سحری کے لیے تیار کر لوں گی۔ اس طرح بچا ہوا آلو، پالک بھی نپٹ جائے گا اور مزے کی ایک ڈش بھی تیار ہو جائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا آپا؟"

"اے لو پھر وہی آلو پالک۔ تم نے تو آلو پالک کو اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا ہے چھوٹی۔ اس سے تو اچھا ہے دو پیازہ ہی پکا لو۔" خورشید جہاں بولیں۔

"لیکن امی قیمے کے ساتھ مل کر تو پالک کا مزا کچھ اور ہی ہو جاتا ہے اور چھوٹی کے ہاتھ کا تو مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ تم ایسا کرنا چھوٹی پالک کے ساتھ تھوڑی سی سوکھی ہوئی میتھی بھی ڈال دینا۔ کیونکہ میتھی اگر مزا دیتی ہے تو بس قیمہ پالک کے ساتھ ہی دیتی ہے۔" عنبر نے دو پیازے کے مشورے کو رد کرتے ہوئے کہا کیونکہ قیمے کے ساتھ برابر کی پیاز اسے ذرا نہیں بھاتی تھی۔ تبھی عذیر بازار سے سودا لے کر آ گیا۔

"ارے آپ دونوں اب تک یہیں موجود ہیں۔ کیا آج رت جگا کرنے کا ارادہ ہے آپ کا؟" عذیر نے دودھ انڈے اور ڈبل روٹی وغیرہ کی تھیلی چھوٹی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے عنبر سے پوچھا۔

"نہیں بھئی، رتجگا کیسا۔ مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔ تم بھی اب جلدی سے سو جاؤ۔ آخر سحری کو بھی تو اٹھنا ہوگا نا۔" عنبر ایک طویل سی جمائی لینے کے بعد بولی۔

"مگر سحری کے لیے آخر کس وقت اٹھنا ہوگا۔ سحری کے اوقات بھی تو معلوم نہیں ہیں۔ میری آنکھ تو صبح اس وقت ہی کھلتی ہے جب لاؤڈ اسپیکر سے مسجد میں اذان دی جاتی ہے۔" عذیر بولا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو عذیر! میں آج ساری رات جاگوں گی اور جونہی سحری کا سائرن ہوگا میں تم کو جگا دوں گی۔" چھوٹی بولی۔

"اچھا مگر تم کس خوشی میں ساری رات جاگو گی؟" عذیر نے تعجب سے پوچھا۔

"بھئی رمضان المبارک کی خوشی میں۔ جیسے امی ہر سال رمضان المبارک کا جاگ کر استقبال کرتی ہیں۔ اس طرح میں بھی جاگوں گی۔ میرا مطلب ہے امی تو کمزوری کی وجہ سے جاگ نہیں سکیں گی۔ اس لیے میں ان کی جگہ یہ فریضہ ادا کروں گی۔ اور جلدی سے سحری کے لیے ہنڈیا پکا کر عبادت میں مصروف ہو جاؤں گی۔" چھوٹی نے دانستہ یہ بات کہہ کر کن اکھیوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"اے لو، اب میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوں کہ ایک رات جاگنے سے گئی رہ جاؤں گی۔ لو بھلا برس بھر میں ایک ہی مہینہ تو آتا ہے عبادت اور ریاضت کا۔ اس کا میں اب سے نہیں بلکہ جب چھوٹی عمر کی تھی اس وقت سے ہی رات کو جاگ کر سواگت کرتی ہوں اور مرتے دم تک کرتی رہوں گی انشاء اللہ۔" چھوٹی کی بات پر خورشید جہاں بُری طرح چمک کر بولیں۔

"چلیں خیر، اگر پوری رات جاگ کر گزارنا چاہتی ہیں تو گزار لیں لیکن میں آپ کو روزہ رکھنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔" عنبر نے ان کی بات سن کر کہا۔

"اے تم ہوتی کون ہو اجازت نہ دینے والی۔ کوئی میری اماں ہو، دادی ہو، کون ہو آخر۔ لو بھلا وہی بات ہو گئی کہ چھوٹا منہ بڑی بات۔ کیا بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں سیکھی تم نے۔ یا یہ سمجھتی ہو کہ مجھ پہ اپنا پیسہ خرچ کیا ہے تو مجھے پیروں تلے دبا کر رکھو گی۔" عنبر کے اجازت نہ دینے کہنے پر خورشید جہاں ایکدم ہی پھٹ سی پڑیں۔

"اوہو امی! آپ نجانے کیا سمجھ رہی ہیں ورنہ آپا نے تو اس وجہ سے کہا تھا کہ کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کا بلڈ پریشر بھی لو ہے۔ آپ نے اگر روزہ رکھا تو اور بھی لو ہو جائے گا۔ اور۔" چھوٹی نے بہن کی بات کی جلدی سے وضاحت کرنی چاہی تو خورشید جہاں اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

"خیر، یہ موا بلیڈ ولیڈ لو ہو یا ٹو میں روزہ ضرور رکھوں گی۔ لو بھلا اِتی سی عمر میں روزے رکھنے شروع کیے تو آج یہ عمر آ گئی۔ بس زندگی میں ایک ہی رمضان ایسا گزرا تھا وہ بھی یہ عذیر علین رمضان کی چاند رات کو پیدا ہوا تھا اور میں چلے میں تھی اس لیے روزے نہیں رکھ سکتی تھی لیکن بعد میں قضا روزے پورے کر کے رہی تھی۔ اب اس بڑھاپے میں کیسے چھوڑ دوں۔ انسان کا تو کل کا بھی بھروسا نہیں کیا پتا اگلا رمضان دیکھنا بھی نصیب ہوگا مجھے کہ نہیں۔" تو عنبر جس نے اجازت نہ دینے کی بات ماں پہ بڑا مان کر کے کہی تھی۔ مگر جس کے نتیجے میں ماں کی صلواتیں ہی سننی پڑی تھیں جلے کٹے انداز میں بولی۔

"چھوڑیں امی! مذہب کے ارکان پورے کرنے کا سارا ٹھیکہ تو آپ ہی نے لے رکھا ہے نا۔ ورنہ وہاں تو یہ عالم تھا کہ ہمارے کالج کی بعض لڑکیوں کو معلوم تک نہیں ہوتا تھا کہ کب چاند ہوا اور کب روزے شروع ہو گئے۔ ایسے ٹھاٹھ سے کینٹین میں بیٹھ کر سب کے سامنے کھاتی پیتی رہتی تھیں۔ اور جو کوئی اعتراض کرتا الٹا اس کا مذاق اڑاتی تھیں۔"

"ہاں ویسے بھی امی اپنے تایا ابو کے یہاں تائی اماں کے سوا اور کون روزے رکھتا ہے۔ میرا تو جب بھی رمضان میں ان کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا سب کو کھاتے پیتے ہی دیکھا۔ عذر یہ ہوتا تھا کہ فلاں کو یہ تکلیف ہے اور فلاں کو وہ تکلیف ہے۔ اور تائی بھی اگر روزے رکھتی ہیں تو وہ بھی گنڈے دار۔ پورے روزے تو کبھی رکھتی ہی نہیں۔" چھوٹی نے بھی عنبر کی باتوں کی تائید میں کہا۔

"اے کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم بھی ان موئے بے دینوں کی دیکھا دیکھی اس رمضان کے روزے نہیں رکھو گی۔" ماں نے دونوں بیٹیوں کی باتوں پر بگڑ کر پوچھا۔

"نہیں، اللہ نہ کرے امی! میرا یہ مطلب تو ہرگز نہیں۔ مجھے تو کوئی لاکھوں روپے بھی دے دے میں ایک روزہ بھی نہ چھوڑوں۔ بقول آپ کے سال میں یہ ایک ہی ماہ تو آتا ہے عبادت اور ریاضت کرنے کا۔" چھوٹی نے کہا۔

"ہاں اور کیا اور اللہ پاک یہ بھی فرماتا ہے کہ ماہ رمضان میرا مہینہ ہے اور اس ماہ میں تم روزے رکھو۔ تاکہ تمہارے زہد و تقویٰ اور صبر و استقلال کا اندازہ ہو سکے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ کیونکہ اس کی ذات بہت ہی عظیم اور بہت بے نیاز ہے۔ اسے تمہاری عبادت ریاضت کی ضرورت نہیں۔ یہ تو خود بندہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کو اس کے احکامات کی بجا آوری کرتا ہے۔ مگر جن کو خدا چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اُن کی عقلوں پہ پتھر اور آنکھوں پر غفلت اور حرص و طمع کے پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ خدا کو بھول جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ جو کچھ ان کو میسر ہے وہ سب اسی کی جود و عطا ہے اسی کا کرم اور احسان ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے امی! لیکن یہ تو آپ کی کمزوری کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ کل آپ کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ مجھے آپ کو ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ اگر ایسا ہی ہے تو بعد میں قضا روزے رکھ لیجیے گا مگر ابھی تین چار روزے تو قضا ہی کر دیں۔" عنبر زچ ہو کر بولی۔

"ہاں امی۔ یوں بھی ہمارے مذہب میں تقریباً ہر معاملے میں ہی نرمی رکھی گئی ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر بندے کو کوئی مرض یا مجبوری لاحق ہو جائے تو۔" چھوٹی نے کہنا چاہا۔ تو خورشید جہاں نے بڑے غصے سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"مجھے کچھ بھی سمجھانے کی ضرورت نہیں، جو میرا دل چاہے گا وہی کروں گی سمجھیں۔"

اور پھر خورشید جہاں اٹھ کر باہر صحن میں چلی گئیں۔ دونوں بہنوں نے الجھی ہوئی نظروں سے ایک دوسری کو دیکھا۔ مگر کچھ بولیں نہیں۔ چھوٹی نے سودے کی تھیلی اٹھائی اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور جب وہ سحری کے لیے قیمہ تیار کر کے اور کچن کے کاموں سے فارغ ہو کر باہر نکلی تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ کمرے میں آئی تو دیکھا کہ ماں نوافل ادا کر رہی ہیں۔ گو اس کا تھکان کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس پر عنبر اور عذیر بھی بے سُدھ پڑے سو رہے تھے، پھر بھی وہ لیٹی نہیں بلکہ وضو کرنے غسل خانے میں چلی آئی۔

امی نے سحری تک کا تمام وقت نوافل پڑھنے اور تلاوت کلام پاک کرنے میں گزارا تھا۔ اور جب سحری کا ٹائم ہوا تو اس نے باورچی خانے میں جا کر انڈے اُبالے۔ قیمہ گرم کیا۔ اور پھر چائے کیتلی میں دم دی۔ برآمدے کے تخت پر دسترخوان بچھا کر یہ سارے لوازمات اس پر چُن دیے، اس کے بعد ہی بہن اور بھائی کو سحری کھانے کے لیے جگایا، پھر جب سحری کا وقت بھی اختتام کو پہنچا۔ تو فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے بڑے محتاط انداز میں کہ اسے اس بات کا کچھ یقین نہیں تھا کہ عنبر نے سعد کی دی ہوئی لیڈی آرگنائزر کی آفر کو سنجیدگی سے قبول بھی کیا ہے، عنبر کو کریدنے کی غرض سے کہا۔

"آپا آپ آج وہاں جو کپڑے پہن کر جائیں گی۔ وہ نکال کر مجھے دیجیے، تاکہ میں ابھی سے استری کر کے رکھ دوں۔"

"کیوں ابھی سے کیوں؟ ساری رات تو تم جاگتی رہی ہو۔ کیا اب بھی تمہارا سونے کا ارادہ نہیں؟" عنبر نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اب کیا سوؤں گی۔ ساڑھے چھ تو بج ہی چکے ہیں۔ آٹھ بجے کالج بھی جانا ہے اور پھر تیار بھی ہونا ہے۔ وقت ہی کتنا رہ جائے گا۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ آپ اپنے کپڑے نکال کر دے دیں، ساتھ کے ساتھ اسے بھی استری کر دوں گی۔" چھوٹی نے جواب میں قدرے جھلا کر کہا۔

"نہیں، اس وقت میری ہمت نہیں ہو رہی کپڑے وپڑے نکالنے کی، میرا تو نیند کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے اسی وجہ سے ڈھنگ سے کچھ کھایا بھی نہیں گیا سحری پر۔ مجھے اگر جانا ہوگا تو میں بعد میں خود ہی اپنے کپڑوں پر استری کر لوں گی۔" عنبر نے ایک طویل سی جمائی لے کر بڑی اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

"اچھا جیسی آپ کی مرضی۔" اس کے کام پر جانے کی بات تذبذب میں پڑ گئی تھی، اسی لیے چھوٹی نے بجھے بجھے انداز میں کہا۔

"ہاں اچھا ہے۔ کچھ دیر پڑ کر سو لو پھر اطمینان سے اُٹھ کر تیار ہو جانا۔ سعد نے تو تم سے دس بجے آنے کا کہا ہے نا۔" خورشید جہاں تسبیح اور دعا سے اسی وقت فارغ ہوئی تھیں انہوں نے جا نماز تہہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، بُلایا تو ہے مگر میں نے ابھی کچھ فیصلہ نہیں کیا امی! کہ جاؤں یا نہ جاؤں، اور پھر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آج تو یوں بھی پہلا روزہ ہے پھر کسی دن چلی جاؤں گی۔" عنبر نے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اے لو، یہ تو وہی مثل ہوگئی کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ چونکہ سعد نے کام دلانے کو کہا ہے اس لیے تم ایسی ناقدری کر رہی ہو۔ مگر حیثیت کے اعتبار سے تم اس کے مقابلے میں دو کوڑی کی بھی نہیں ہو۔ اور اگر ایسی ہی ناک چوٹی گرفتار ہو تو لاؤ نکالو اس کے چودہ سو روپے۔ بلکہ سارے ہی نکال کر رکھ دو، اس کے سامنے جو وہ اب تک دیتا رہا ہے۔"

ماں کو بھی غصہ آگیا اس کے اکڑ مکڑ دکھانے پر، انہوں نے اسے کھری کھری سُنا دیں۔ اور عنبر جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کیونکہ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ ماں کی بات کا جواب دے سکتی۔ چھوٹی کو بھی بہن کا نخرہ کرنا بہت کھلا۔ وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔

"امی! پیسے کا لین دین تو خیر چلتا ہی رہتا ہے۔ مگر سعد بھائی کے واقعی ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ وہ اگر پڑھائی کے معاملے میں مالی طور پر عذیر کی مدد نہ کرتے تو آج عذیر گھر پر ہی مکھیاں مارتا نظر آتا۔ اور ایمان سے جب وہ مصیبت غزل جب سارے محلے کے سامنے ہماری عزت اُتارنے کے درپے ہو رہی تھی تو سعد بھائی کی آمد مجھے یوں لگی۔ جیسے خدا نے انہیں فرشتہ رحمت بنا کر بھیجا ہو۔ اور ایمان سے امی بڑا اونچا ظرف ہے ان کا کہ وہ کچھ کرتے بھی ہیں تو یہ ظاہر ہونے نہیں دیتے کہ انہوں نے ہمارے لیے کچھ کیا ہے۔"

"اے ہاں، اس کے احسانات تو اتنے ہیں کہ میں ساری زندگی بھی نہ اُتار سکوں۔ لیکن بے حس اور احسان فراموش لوگ کب ایسی باتوں کو گردانتے ہیں۔ اور اس عنبر کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے باپ مارے کا بیر ہے اس غریب بچے سے جو اس کا نام سُنتے ہی بھڑک اٹھتی ہے۔ اب وہ ایک شریفانہ اور عزت کا کام دلا رہا ہے تو یہ اسے بھی جوتی کی نوک پر رکھ کر مارنا چاہ رہی ہیں نکیلی بیگم۔"

اُدھر بہن نے جان بوجھ کر سعد کے احسانوں کا احساس دلایا، اُدھر ماں نے صبح ہی صبح بُری طرح آڑے ہاتھوں لیا۔

عنبر کو غصہ تو بہت آیا۔ جی چاہا چیخ چیخ کر کہے کہ وہ آپ تینوں یا مجھ پر کوئی احسان نہیں کرتا امی، بلکہ میرے دل میں اپنا مقام بنانے کی کوشش میں یہ سب کچھ کرتا ہے۔ یعنی اس نے اب تک ہم سے جو سلوک کیا ہے وہ بے لوث، اور بلا وجہ نہیں کیا بلکہ اس میں بھی اس کی ایک غرض آڑی ہے۔ اور کسی غرض کے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے وہ احسان ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ خود غرضی ہوتی ہے۔ مگر وہ بڑے تحمل سے کام لے کر زِچ ہو جانے کے سے انداز میں بولی۔

"اُفوہ امی! تو میں نے کون سا انکار کیا ہے وہاں جانے سے۔ میں نے تو اس خیال سے کہا تھا کہ آج پہلا روزہ ہے اور پہلا روزہ چونکہ روزہ داروں کے لیے ذرا سخت ہوتا ہے اس لیے اگر ہمت ہوئی تو چلی جاؤں گی۔"

"اے یہ روزے کو تم نے ہوّا کیسے بنا لیا بچی! کیا ان بے دین لڑکیوں کے ساتھ رہ رہ کر تم بھی دہریہ ہو گئی ہو۔ ورنہ روزے کو تو چل پھر کر اور کام میں لگ کر ہی بہلایا جاتا ہے۔ منہ لپیٹ کر پڑنے سے تو روزہ بہت لگتا ہے۔" ماں نے تڑخ کر کہا۔ عنبر نے منہ ہی منہ میں اونہہ کہا اور پھر اپنے پلنگ پر لیٹ کر اپنے اوپر چادر تان لی۔ خورشید جہاں خود بھی ساری رات جاگتی رہی تھیں، وہ بھی نماز کی چوکی سے اٹھ کر اپنے پلنگ پر جا لیٹیں اور جلد ہی سو گئیں۔

مگر عنبر کو کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ اُف امی کو تو کوئی بات بتا دینا غضب ہے، اب ساری عمر ان لڑکیوں کے طعنے ہی ملتے رہیں گے۔ اس نے جل کر سوچا۔ اب امی کو کیا معلوم کہ کتنے ہی مسلمان لڑکے اور لڑکیاں بلکہ بڑے بھی رمضان کے روزے نہیں رکھتے، مجبوری تو علیحدہ بات ہے مگر بعض کو تو یہ کہتے بھی سُنا گیا ہے کہ انسانی ضابطۂ حیات سے مذہب کا کیا تعلق۔ مذہب تو ایک عقیدہ ہوتا ہے، بس خدا کی وحدانیت کو تسلیم کر لیا۔ رسالت مآب کے لائے ہوئے مذہب کو مان لیا یعنی کلمۂ طیبہ پڑھ لیا اور بس۔ مگر امی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ پیٹ بھرے لوگ ہی ایسے مذموم خیالات کے حامل ہوتے ہیں یا پھر ایسے لوگ جن کی زندگی کا کوئی مقصد ہوتا ہے اور نہ منزل۔ یعنی وہ راہ سے بھٹکے ہوئے لوگ ہی ہوتے ہیں، ورنہ ایک مسلمان کا اصل ضابطۂ حیات اس کا مذہب اور عقیدہ ہی ہوتا ہے۔

پھر اس کا دھیان ایک دم ہی سعد کی طرف چلا گیا۔ اس کے ذہن نے ماں اور بہن کی گفتگو پہ دیر تک غور کرنے کے بعد بھی۔ اس کے احسانات کو اس کی غرض پر ہی محمول کیا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ ہماری گردنوں پر احسانات کا بوجھ لاد کر ہمیں شرمندہ کرنے اور نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور پہلے کی بات تو اپنی جگہ آج کے تجربے نے تو یہ بات ثابت کر دی تھی۔ کیونکہ اس کے ایک دم ہی آجانے اور پیسے نکال کر دینے پر عنبر کو خوشی نہیں بلکہ، حد درجے شرمندگی ہوئی تھی۔ اس پر ستم بالائے ستم اس نے ماں بہن اور بھائی کے سامنے اس کے لیے ایک کام بھی ڈھونڈ نکالا تھا۔ گویا وہ شرمندگی کے بار میں اُسے دفنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جو اُس کے خیال میں شکل و صورت اور قد و قامت میں اتنا بُرا نہ تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اسے ایک دم زہر ہی لگتا تھا۔

دن خاصا چڑھ آیا تھا اور چھوٹی کب کی کالج جا چکی تھی۔ ماں اور بڑی بہن سو رہی تھیں۔ اس لیے عذیر سے دروازہ بند کرنے کا کہہ کر چھوٹی خاموشی سے کالج روانہ ہو گئی تھی۔ وہ تو گلا خشک ہو جانے کی وجہ سے خورشید جہاں کو اچانک ہی کھانسی ہونے لگی تو ان کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں دن کا اجالا پھیلا دیکھا تو گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ بیٹھک میں جا کر وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی آکر عنبر کو جگایا۔

"اے عنبر اٹھو ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ کب تیار ہوگی، کب وہاں پہنچو گی۔؟ جاتے جاتے ساڑھے دس تو بج ہی جائیں گے، اور اُدھر وہ بے چارا بچہ وہاں بیٹھا بیٹھا تمہارے انتظار میں سوکھے گا۔" ماں نے اسے ہلاتے ہوئے ایک دم ہی اتنی ساری باتیں کہیں تو گہری نیند میں ایک دم ہی خلل پڑ جانے کی وجہ سے اس کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ البتہ وہ ہڑبڑا کر فوراً اُٹھ بیٹھی۔

"السلام علیکم امی!" اس نے نیم غنودگی کے عالم میں ماں کو سلام کیا تو انہوں نے وعلیکم السلام کہہ کر پھر اپنی بات دہرائی۔ تو عنبر کا دل چاہا کہے اُفوہ امی آپ کو دوسروں کا بہت خیال ہے مگر میرا ذرا سا بھی نہیں۔ ایک تو مجھے اس بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ اس پر یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ مگر یہ سب کہنے کے بجائے اس نے نہایت تابعداری سے کہا۔

"اچھا اچھا امی! بس ابھی دس منٹ میں تیار ہو کر چلی جاتی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ دس بجے تک وہاں پہنچ جاؤں

گی۔ گارڈن روڈ۔۔۔ اتنا دور بھی نہیں ہے۔" ماں بھی اس کے اتنے ٹھنڈے جواب پر خاموش ہوگئیں۔

پھر وہ واقعی جلدی جلدی تیار ہو کر گھر سے نکل گئی۔ عذیر اسے بس اسٹاپ تک چھوڑنے آیا تھا مگر اس نے راستے ہی میں ایک خالی رکشا پکڑ لیا۔ اور دس بجے سے پہلے ہی سعد کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئی۔

وہاں پہنچی تو دیکھا کہ وہ تو باقاعدہ ایک سجا سجایا شوروم ہے۔ جس میں قسم قسم کے ریڈی میڈ گارمنٹس بڑی خوبصورتی سے شوکیسوں اور ہینگرز پر لٹک رہے ہیں۔ چھ عدد سیل گرلز بھی موجود ہیں اور دکان کے آخری سرے پر۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر خاتون بھی بیٹھی ہیں۔ اور میز کے قریب ہی دیوار کے ساتھ ایک بغلی دروازہ بھی تھا، جس کے دونوں پٹ وا تھے۔ اور جس سے اندر کی طرف، یعنی عقبی حصے میں ایک خاصا کشادہ ہال سا نظر آ رہا تھا جس میں بڑے قاعدے سے قطار در قطار سلائی کی پیڈل مشینیں رکھی تھیں۔ جن پر بہت سی خواتین ملبوسات سی رہی تھیں۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی یا دوسرے معنوں میں سعد کو تلاش کرتی شوروم کے وسط میں آئی تو ایک سیل گرل شاید اسے گاہک سمجھ کر اس کی طرف بڑھی۔

"آپ کو کیا چاہیے بی بی؟" اس نے عنبر سے پوچھا۔ تو عنبر نے جواب دینے کے بجائے اپنے پرس سے سعد کا دیا ہوا کارڈ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان صاحب سے ملنا ہے یہ۔۔۔ یہ کوئی تیمور صاحب ہیں نا۔"

سیل گرل نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر آنکھوں کو اوپر نیچے ایک زاویے سے گھما کر ہونٹوں کو سکیڑا اور پھر اس سے بولی۔

"باس تو سال میں دو تین بار ہی یہاں آتے ہیں۔ خیر آیئے میں آپ کو یہ سامنے ٹیبل کے سامنے جو میڈم رقیہ بیٹھی ہیں ان کے پاس لیے چلتی ہوں، یہ اس فیکٹری کی نگراں ہیں۔"

اور وہ چپ چاپ سیل گرل کے ساتھ ٹیبل کی طرف بڑھتی چلی آئی۔ سیل گرل نے میڈم رقیہ کے ہاتھ میں اس کا دیا ہوا کارڈ تھماتے ہوئے آہستہ سے اس سے کچھ کہا۔ جسے عنبر بالکل نہ سن سکی۔ میڈم رقیہ نے سر تا پا اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور کرخت سے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"یہ کارڈ تمہیں کس نے دیا ہے لڑکی؟" اس کا لڑکی کہہ کر مخاطب کرنا عنبر کو بہت ناگوار گزرا۔ لیکن بڑے تحمل سے کام لے کر بولی۔

"جس کا اس پر نام لکھا ہوا ہے یعنی تیمور صاحب نے ہی دیا ہے۔ اور کس نے دیا ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ جسے ایک دم ہی نرم کر کے اس نے پوچھا۔

"آپ کے یہاں لیڈی سپروائزر کی آسامی خالی ہے نا، مجھے اسی کے لیے بلایا گیا ہے۔"

"لو یہ اور سنو، ابھی سنا تم نے شہناز اور فوزیہ۔۔۔ یہ لیڈی سپروائزر کی جاب پر قبضہ کرنے آئی ہے۔ چلو آ کر اسے بتا دو کہ میں اس فیکٹری کی نگراں بھی ہوں، ایڈمنسٹریٹر بھی اور منیجر بھی اور تمہارے ساتھ کسی نے مخول کیا ہوگا لڑکی۔! ورنہ میرے ہوتے ہوئے یہاں اور کسی اہلکار کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کی بات کا رقیہ نے متنفر اتراتے ہوئے کہا، اور اسے رقیہ پر نہیں سعد پر سخت غصہ آیا۔ کہ اس نے۔۔۔ بلا سوچے سمجھے اور جانے بوجھے اسے یہاں کیوں بھیج دیا۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنی بات رکھنے۔۔۔ کی غرض سے بولی۔

"دیکھیں مجھے تو پتا نہیں کہ آپ کیا ہیں اور کیا نہیں۔ مجھے تو ان تیمور آفندی نے اپنا یہ کارڈ دے کر بڑے اصرار سے بلایا تھا۔ اب آپ کہہ رہی ہیں کہ یہاں کسی اہلکار کی ضرورت نہیں تو میں بھی اتنی گری پڑی نہیں۔ میں ان کا یہ کارڈ انہیں واپس کر کے ان سے یہ ضرور پوچھوں گی کہ انہیں میرے ساتھ اتنا بے ہودہ مذاق کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لایئے یہ کارڈ مجھے دے دیجیے۔"

اس نے یونہی اپنی توہین کے احساس کے تحت یہ بات کہی تھی مگر اس کی اس بات کا ردعمل رقیہ پر کچھ اور ہی ہوا۔ اس کی رنگت ایک دم ہی فق ہوگئی۔۔۔ جلدی سے کارڈ والا ہاتھ پیچھے ہٹا کر بولی۔

"نہیں میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ اچھا ٹھہریے میں ابھی ابھی باس کو فون کر کے ان سے پوچھ لیتی ہوں۔ اصل میں انہوں نے مجھے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔"

اور پھر اسی وقت اس نے اپنے آگے میز پر رکھے فون پر باس کا نمبر ملایا۔ اور اس سے عنبرین کی آمد کی غرض و غایت بیان کرنے لگی۔ باس سے بات کرنے کے دوران اس کی رنگت بدلتی رہی۔ پھر اس نے ریسیور کو بڑے زور سے کریڈل پر پٹخ کر عنبر سے کہا۔

"اے سنو لڑکی! باس تو کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے نہ تو کسی کو اپنا کارڈ دیا ہے نہ بلایا ہی ہے۔ شاید کسی نے تم سے واقعی بہت بے ہودہ مذاق کیا ہے، ویسے اگر تم چاہو تو سیلز گرل کی جاب تمہیں آسانی سے مل سکتی ہے۔"

"نہیں شکریہ۔۔۔ میرے ساتھ جس نے بھی یہ بدتمیزی کی ہے اس سے تو میں بعد میں بھگت لوں گی، پہلے آپ مجھے یہ کارڈ دے دیں۔" عنبر جس کا خون احساسِ توہین اور غصے سے جوش کھا رہا تھا ایک جذب کے عالم میں بولی۔

"ہاں ہاں لو۔۔۔ یہ کارڈ بھی لے لو۔ بھلا اس میں ایسی کیا بات ہے۔۔۔ چھپا ہوا موٹے کاغذ کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے۔" مگر عنبر نے غصے میں اس کی پوری بات بھی نہیں سنی اور جھپٹنے کے سے انداز میں اس کے ہاتھ سے وہ کارڈ لے کر تیزی کی

طرح شوروم سے باہر نکل آئی۔

اُف کوفت اور غصّے کے مارے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ سعد نے محض اس کی ماں بہن اور بھائی کی نظروں میں خود کو اُونچا دکھانے کے لیے اُسے اتنی خواری سے دوچار کیا تھا۔ بالکل اجنبی اور انجان کسی عورتوں کے سامنے اُس کی بیہودگی کی وجہ سے اُس کی اتنی زبردست تذلیل ہوئی تھی۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سعد کو کچا ہی چبا جائے، مگر ہوا کچھ یوں کہ جونہی اس نے اس دکان سے باہر قدم نکالا۔ سامنے سے آتے سعد سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ غضب اور غصّے میں تو پہلے ہی بھری تھی بلکہ غصّہ بھی اُسی پہ آ رہا تھا۔ اب جو اتنے اچانک اور غیر متوقع اُسے نظروں کے سامنے دیکھا تو موقع محل کی پرواہ کیے بغیر ایکدم ہی اس پر برس پڑی۔

"آپ انتہائی فریبی اور دوغلی فطرت کے انسان ہیں مسٹر سعد۔ آپ کو اگر مجھ سے انتقام ہی لینا تھا تو گھر پر ہی کسی اور ذریعے سے لے لیتے، مجھے دھوکے سے یہاں بھیجنے اور میری اتنی زیادہ اِنسلٹ کرانے کی کیا ضرورت تھی آپ کو۔ آپ نے ان کی نظروں میں خود کو اُونچا کرنے کی غرض سے ہی تو یہ سارا ناٹک کھیلا تھا نا تو آج سب کے سامنے آپ کی اس پارسائی کا بھانڈا بھی پھوٹ جائے گا سمجھے آپ۔"

وہ سعد کے سامنے کچھ اس طرح ڈپٹ کر اور چیخ کر بولی کہ کچھ دیر کے لیے تو سعد کی بھی سٹی گم ہوگئی۔ یوں بھی معاملے کی اصل نوعیت سے وہ یکسر لاعلم ہی تھا۔ اور پھر جہاں، وہ دونوں کھڑے تھے وہ عام گزرگاہ تھی۔ دو تین راہ گیر فٹ پاتھ پر چلتے چلتے رک بھی گئے تھے۔ چنانچہ اس سے کچھ پوچھنے یا کہنے کے بجائے اس نے مضبوطی سے اس کے نازک سے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے کر بھاری سے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"جو کچھ بھی کہنا چاہ رہی ہیں اندر چل کر کہیے، یہاں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اس انداز میں باتیں کرنا کوئی شرافت نہیں۔"

اور پھر وہ اس کے انکار کے باوجود اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اسے اندر شوروم میں لے آیا۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی اندر کی فضا کچھ ایسی ہوگئی، جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اونچی آوازوں میں باتیں کرتی ہوئی سیلز گرلز اور وہ قہقہے لگاتی موٹی سی رقیہ، جو عنبر کے خیال میں اس کا مذاق اُڑا رہی تھی ایک دم ہی اٹینشن ہوگئی تھیں۔ اور سب نے تقریباً بیک وقت اور ایک ہی ساتھ اسے سلام بھی کیا تھا۔ جس کا جواب اس نے صرف سر ہلا کر دیا۔ اور پھر رقیہ کو اشارے سے میز کے آگے سے ہٹنے کو کہا۔ جس کی اس نے فوری طور پر تعمیل کی۔ رقیہ کے ہٹتے ہی سعد نے عنبر کو جس کا ہاتھ وہ اب تک مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ رقیہ کی کرسی پہ بٹھایا اور پھر خود میز کے کنارے پہ ٹک کر اس نے کہا۔

"یہاں کوئی لاؤڈ سپیکر تو نہیں ہے لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ ماشاءاللہ آپ کی آواز خاصی پاٹ دار ہے۔ اب آپ کو اپنی اس آواز میں مجھ پہ لگائے دھوکا دہی اور دوغلے پن کے الزامات کی وضاحت کرنی ہوگی۔ تو ارشاد۔" اس نے یہ ساری بات حسبِ عادت مذاق میں نہیں کہی تھی بلکہ سخت جذب کے عالم میں کہی تھی۔ اور اس طرح عنبر کو اپنی پوزیشن پہلے سے بھی زیادہ آکورڈ ہوتی لگی۔ مگر اس کا غصّہ ابھی تک فرو نہیں ہوا تھا۔ وہ سب کے سامنے وضاحت طلب کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے بھی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے برہم سے لہجے میں کہا۔

"میں نے آپ پہ کوئی الزام نہیں لگایا بلکہ جو بھی کہا ہے سچ ہی کہا ہے۔ آپ نے ایک ایسے شخص کا کارڈ تھما کر جو مجھے نہیں بلکہ شاید آپ سے بھی ناواقف ہے، مجھے یہاں بھیج دیا وہ بھی یہ کہہ کر کہ آپ کے لیے لیڈی سپروائزر کی جاب تیار رکھی ہے۔ آپ اس پتے پر جا کر اس جاب کو سنبھال لیجیے۔ مگر۔۔۔ مگر میں یہاں آئی تو آپ کی ان میڈم رقیہ کو تو کیا ان کے باپ کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور مجھے یہاں کس غرض سے بھیجا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں یہاں آکر اُلٹی ان خواتین کے طنز و مزاح کا نشانہ بنی۔ لیکن مسٹر سعد آپ بھی کان کھول کر سُن لیں یہ اتنی معمولی بات نہیں ہے کہ میں خاموشی سے اسے پی جاؤں گی۔ بلکہ میں آپ سے اپنی اس توہین کا بدلہ لے کر رہوں گی۔"

وہ یہ سب کہتے کہتے ایک دم ہی آپے سے باہر ہوگئی۔ جبکہ اس کی ان باتوں پہ وہ سب خواتین نہ صرف متعجب نظر آرہی تھیں۔ بلکہ متجسس سے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے ٹھیک۔ آپ کا جو دل چاہے وہ بڑی خوشی سے کر لیجیے گا۔ مجھے آپ کی ہر بات منظور ہوگی، بشرطیکہ جب تک یہ بات اچھی طرح کلیئر نہ ہو جائے۔ یعنی یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس معاملے میں غلطی کس کی تھی۔ میری، تیمور کی یا رقیہ کی۔" اس کی باتوں پر سخت تاؤ کھانے کے باوجود وہ ٹھنڈے۔۔۔ اور مصالحانہ سے لہجے میں بولا۔

"جی نہیں مجھے کسی صفائی ستھرائی کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ان سب کے سامنے میری جو عزت افزائی کروائی ہے میرے لیے وہی بہت ہے۔" عنبر نے بڑے درشت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے مگر ذرا ایک منٹ۔" سعد نے کہا جو عنبر کی بات کے دوران ہی شاید تیمور کا نمبر ڈائل کر چکا تھا۔ اور ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔

"ہاں ہیلو۔ تیمور!"

"کہاں گئے ہیں؟ جاؤ دیکھو باہر جا کر اور انہیں بُلا کر لاؤ۔"

پھر سعد ریسیور کو کان سے لگائے تیمور کے انتظار میں خاموش کھڑا اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھتا رہا۔

"ہاں تیمور۔ بھئی یہ کیا قصہ ہے؟ یہ اتنی معزز خاتون، تمہارا کارڈ لے کر یہاں دکان پر آئی تھیں اور تم نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔"

"ہاں وہی ہیں جن کا میں نے تم سے پرسوں ذکر کیا تھا۔ اور تم نے اپنا وزٹنگ کارڈ دیا تھا کہ میں انہیں دے دوں۔ اب وہ کارڈ لے کر یہاں پہنچیں اور تم سے کارڈ کے بارے میں استفسار کیا گیا تو تم۔۔۔!"

"رقیہ نے اگر ان کا نام نہیں بتایا تھا تو خود تمہیں پوچھ لینا چاہیے تھا۔ کاروباری معاملات میں اپنا حافظہ مضبوط نہیں رکھو گے تو پھر بھلا کس طرح اپنا بزنس چلاؤ گے۔ میرا دل تو اس وقت تمہاری گوشمالی کرنے کو چاہ رہا ہے۔ کیونکہ تمہاری اس بھول کی وجہ سے میری اپنی پوزیشن سخت آکورڈ ہو کر رہ گئی ہے۔"

"اب یہ تو مس عنبر بن شہباز ہی جانیں کہ وہ تمہیں معاف بھی کریں گی اس سلسلے میں فی الوقت تو وہ بڑے خونخوار موڈ میں نظر آرہی ہیں۔" سعد نے آخری فقرہ تھوڑا سا ہنس کر کہا۔ جب کہ وہ ساتوں خواتین اس کے خونخوار موڈ کہنے پہ اپنے چہرے جھکا کر ہنسنے لگیں۔ اور عنبر تلملا کر رہ گئی۔ اِدھر وہ تیمور سے باتیں کرتا رہا۔

"مگر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔۔۔ اس وقت تو۔"

"ہاں ہاں۔ تنخواہ کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔"

"اچھا اچھا تم خود ہی بات کر لو۔" اتنا کہہ کر سعد نے ریسیور کان سے ہٹاتے ہوئے عنبر سے کہا۔

"تیمور آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ بلکہ دوسرے معنوں میں۔۔۔" مگر عنبر نے اس کی بات کاٹ دی۔ اور بڑے نخوت بھرے لہجے میں بولی۔

"جی نہیں، میں اب اس معاملے میں کسی کی بھی کوئی بات نہیں سُنوں گی۔ مجھے ایسی جاب نہیں چاہیے جس کی ابتدا میری توہین سے ہوئی ہو۔" اور پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ تو سعد نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر ریسیور کان سے لگایا، اور تیمور سے بولا۔

"او کے تیمور! باقی معاملات بعد میں طے کر لیں گے۔۔۔ اچھا خدا حافظ۔" اور پھر ریسیور کریڈل پر رکھ کر کچھ دیر خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ جبکہ اس اثنا میں عنبر اپنی سلکن اوڑھنی کو قرینے سے اپنے گرد لپیٹتی ہوئی شوروم سے باہر نکل گئی تھی۔

رقیہ جو اتنی دیر سے خاموش اور سہمی سی کھڑی یہ سارا تماشا دیکھتی رہی تھی مزید اپنے تجسس اور استعجاب پر قابو نہ پاسکی تو اس نے قدرے محتاط انداز میں سعد سے پوچھا۔

"سر! آپ اسے اتنی اہمیت نہ دیتے تو یہ کبھی اتنا سر نہ چڑھتی۔ آخر یہ ہے کون؟"

"یہ جو کچھ بھی ہیں آپ کو اس سے کوئی غرض نہیں رکھنی چاہیے۔ بس آپ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ یہ یہاں لیڈی سپروائزر کی حیثیت سے چارج سنبھالنے والی ہیں اور آپ کو ان کے ساتھ اسی طرح کو آپریٹ کرنا ہوگا جیسے کہ آپ مسٹر تیمور کے ساتھ کرتی ہیں، انڈر اسٹینڈ۔"

سعد نے قدرے تیز لہجے میں کہا اور پھر بڑے بڑے قدم اٹھاتا ہوا شوروم سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ سڑک کراس کر کے وہاں سے کچھ فاصلے پر۔ سواری کے انتظار میں کھڑی نظر آئی۔ ون وے

ٹریفک تھا اور اس کی گاڑی کا رُخ بھی اتفاق سے اُسی سمت تھا جہاں وہ کھڑی تھی۔ وہ جلدی سے کار میں بیٹھا اور چند ہی لمحے بعد اس نے اپنی گاڑی عین اُس کے سامنے جا کر روک دی۔ اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پہلے جھک کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر اسی طرح جھکے جھکے اسے مخاطب کر کے بولا۔

"آئیے عنبر! جلدی سے کار میں بیٹھ جائیے، اور آج میں آپ کا کوئی عذر کوئی معذرت قبول نہیں کروں گا۔" اس کے لہجے میں نرمی نہیں غراہٹ تھی۔ اور اس کی بات میں دھونس کے ساتھ ساتھ دھمکی بھی شامل تھی۔ کیونکہ اس نے بھی ان ورکرز کے سامنے اسے کچھ کم ذلیل نہیں کیا تھا۔ اور جس طرح اس کی تحقیر کر کے شوروم سے باہر نکلی تھی اُسے بھی اُس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ لیکن عنبر کم از کم اس کے معاملے میں بڑی خود پسند تھی۔ ہمیشہ اپنی ہی مرضی چلانا چاہتی تھی۔

اپنا ہی تیہا دکھانا چاہتی تھی۔

کسی بھی معاملے میں اگر اس کا ذرا سا بھی واسطہ یا تعلق ہوتا۔ وہ ہمیشہ اپنے ہی خیالات اور مرضی کو اہمیت دیتی تھی۔ اور سعد کو تو یوں بھی وہ کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

اس پہ اب بھی سخت غصہ سوار تھا۔

اس پر مستزاد سعد نے اتنی دھونس سے بات کی تھی۔ گویا وہی مثل ہوگئی تھی، کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، مارے غصے کے وہ سر تا پا سلگ ہی اٹھی تھی۔ اور چاہ تو یہی رہی تھی کہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائے یا پھر انکار کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ایسی ڈانٹ پلائے کہ وہ بھی تمام عمر یاد رکھے۔ لیکن سعد اپنی بات کہہ کر سیٹ پر سیدھا ہو کر سامنے دیکھنے لگا تھا ـــــ اس کا چہرہ اپنے اندرونی جلتے سلگتے تاثرات سے تپ رہا تھا۔ یعنی وہ غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھا۔

یا پھر ـ وہ اس کے لہجے میں شامل غراہٹ سے کچھ مرعوب ہوگئی تھی۔ اس لیے قدرے تامل کے بعد۔ نہایت خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی سعد نے کار کو اس بُری طرح اسٹارٹ کیا کہ نہ صرف فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگ اُچھل کر پیچھے ہوگئے بلکہ وہ بھی پوری جان سے لرز کر رہ گئی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم ہونے کے باوجود وہ نہایت تیز اور غیر محتاط رفتار میں کار چلاتا رہا۔ وہ اندر ہی اندر اپنا خون خشک کرتی رہی مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ خود وہ بھی اپنے ہونٹوں کو سیے سامنے دیکھتا رہا۔

وہ اس وقت تک خاموش بیٹھی رہی جب تک وہ پُر ہجوم سڑکوں سے خطرناک حد تک تیز رفتاری میں گزرتا رہا مگر پھر اسے اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ اس کے گھر کا رُخ کرنے کے بجائے مخالف سمت کا رُخ کر رہا ہے تو وہ سراسیمہ سی ہو کر بولی۔

"یہ ـ یہ ہمارے گھر کا راستہ تو نہیں ہے۔"

"ظاہر ہے نہیں ہے لیکن اب آپ نے مُہرِ خاموشی کو توڑا ہے۔ بات کرنے کی ابتدا کی ہے تو میں یہ کہوں گا کہ کیا میں آپ کو لوہے یا پتھر سے تخلیق کیا نظر آتا ہوں۔ جو آپ اتنی بے تکلفی کے ساتھ اپنی زبان کے ترکش سے زہریلے تیر اس جانِ ناتواں پر چھوڑ دیتی ہیں۔ اپنی زبان سے سنگ باری کرتی ہیں تو یہ نہیں سوچتیں کہ میں بھی گوشت پوست سے بنا ہوا ایک انسان ہوں۔ میرے بھی کچھ احساسات ہیں، جذبات ہیں، میں بھی کچھ ظرف رکھتا ہوں۔ آخر آپ کو جرأت کیسے ہوئی میرے دوست کے ملازمین کے سامنے میری انسلٹ کرنے کی۔ جب کہ آپ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا، محض لاعلمی کی وجہ سے ہوا تھا۔ بلکہ خود آپ کی غلطی کی وجہ سے ہوا تھا، آپ نے رقیہ کے ہاتھ میں اپنا کارڈ تو تھما دیا لیکن نام نہیں بتایا۔ اب وہ تیمور ایک مصروف ترین شخص ہے، اسے بھلا کیا یاد رہتا۔ کہ میں نے آپ کو اس کا کارڈ دیا تھا۔ لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں معمولی معمولی باتوں پہ اتنا تیہا دکھانا۔ اس طرح تو آپ کسی کے ساتھ بھی گزارہ نہ کر سکیں گی۔"

وہ ایک دم ہی اس پہ برس پڑا تھا۔

پھٹ پڑا تھا۔

وہ دم سادھے اس کی باتیں با تناظر کو سنتی رہی۔

اب یہ نہیں تھا کہ وہ اُس سے ڈر گئی تھی یا مرعوب ہوگئی تھی۔ البتہ خجل ضرور ہوگئی تھی۔ کہ واقعی اُسے سعد پر غصہ کرنے اور تیہا دکھانے کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا تھا۔ وہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ سعد بھی تھوڑا بہت ظرف رکھتا ہے۔

اس کی بھی کچھ فیلنگز ہیں۔

کچھ حیثیت اور اوقات ہے۔

کچھ عزت ہے۔

کچھ مرتبہ ہے۔

مگر ابھی تھوڑی دیر قبل کئی عورتوں کے سامنے اس کو جو شرمندگی اٹھانی پڑی تھی، اس کی جو خواری ہوئی تھی، وہ سعد کی وجہ سے بلکہ سعد کے ہاتھوں ـ ہوئی تھی اور یہ بات وہ بھولی نہیں تھی بلکہ اس پر تو اب بھی غصہ سوار تھا۔ اس پر اُس نے اسے لتاڑا بھی ـــــ تو کچھ اس طرح جیسے بہت محتاط انداز میں ڈر ڈر کر اپنے غصے کا اظہار کر رہا ہو جبکہ وہ تو پہلے ہی اسے خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ کچھ زیادہ ہی اکڑ کر بولی۔

"میں کسی کے ساتھ گزارہ کر سکوں یا نہ کر سکوں یہ اپنی مرضی اور ذات پر منحصر ہے اور جہاں تک توہین کا تعلق ہے۔ تو میں نے آپ کی بالکل توہین نہیں کی۔ بلکہ ایک جعلی کارڈ دے کر توہین تو آپ نے میری کی تھی۔ آپ کو کیا معلوم میں کس قدر

شرمندہ اور خوار ہوئی تھی۔ جب مسٹر تیمور نے میری وہاں آمد کی غرض و غایت کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اس موٹی عورت رقیہ سمیت وہ ساری سیلز گرلز بھی نہ صرف میرا مذاق اڑانے لگیں، بلکہ مجھ پر طنز بھی کرنے لگیں، میں اسی وقت سمجھ گئی کہ آپ نے وہ کارڈ اور جاب کی آفر صرف امی اور چھوٹی پر یہ ظاہر کرنے کی غرض سے دی تھی کہ آپ ہمارے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔ اب اصل بھید تو یہیں آ کر کھلا نا کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔"

اُف اس منہ پھٹ اور کمپلیکسڈ لڑکی نے شرمندہ یا قائل ہونے کے بجائے اُلٹا اسے ہی لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور پھر کتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ کہ رنج اور افسوس کے مارے کچھ دیر تو سعد سے کچھ بولا ہی نہیں گیا، پھر اس نے بمشکل اپنے غم و غصے پر قابو پا کر یا اپنے غصے کو دبانے کی کوشش میں کہا۔

"میرے بارے میں آپ کا یہ امپریشن نہایت غلط اور غیر دانشمندانہ ہے۔ ورنہ آپ ہی سوچیے میری آپ لوگوں سے نہ تو ایسی کوئی غرض ہی اٹکی ہے اور نہ ریحان کی طرح ایسا کوئی نزدیکی رشتہ ہی ہے جو ویسے آج کل تو نزدیکی اور خونی رشتے بھی حیثیتوں کی تفریق میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اور میں اگر آپ سب سے ملتا بھی ہوں تو صرف اور صرف پھوپھو جان کے خلوص اور اپنائیت کی وجہ سے۔"

"خیر، امی کا کیا ہے۔ یہ تو کچھ ان کی ایک کمزوری سی بن گئی ہے کہ کوئی رشتے دار اگر ذرا سا ہنس کر ان سے بات کر لیتا ہے تو وہ اس پر ایمان لے آتی ہیں۔" عنبر نے ریحان کا طعنہ دینے کا بدلہ اس سے یوں لیا کہ وہ تلملا ہی اٹھا مگر جواب میں کچھ بولا نہیں۔ البتہ اس نے بڑے جذب کے عالم میں کار کو ان راستوں کی سمت موڑا جو اس کے گھر کو جاتے تھے۔ اور پھر تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ـ چند ہی منٹ بعد اس کے گھر کے نزدیک پہنچ کر اس نے مین روڈ پہ کار روک لی۔ اور اس کے اچانک مین روڈ پہ کار روک لینے پہ عنبر چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کیونکہ اس کا گھر خاصے فاصلے پہ اندر کئی گلیوں سے گزرنے کے بعد آتا تھا۔

"اس وقت آپ یہیں اُتر جائیں۔ لیکن اُترنے سے پہلے میری ایک بات غور سے سن لیں۔ یہ لیڈی سپر وائزر کی آفر جو میں نے آپ کو دی تھی یہ آپ کی سہیلی عالیہ کی آفر کی طرح گھٹیا اور غیر شریفانہ نہیں ہے۔ اب یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ اگر چاہیں تو کل ہی آ کر جوائن کر لیں، ورنہ بصورتِ دیگر ـ آپ کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے ـ کہ گزشتہ شب میں نے جو بقول آپ کے آپ کی ہمدردی اور خوشامد میں تقریباً دو ہزار کی رقم آپ کو دی تھی ـ تو بحالتِ مجبوری ہمدردی سے زیادہ آپ کی عزت بچانے کی غرض سے ہی دی تھی ـ ورنہ میرے پاس نہ ناجائز پیسہ آتا ہے نہ ہی میں نے حاتم طائی کی سخاوت کا ریکارڈ توڑنے کا کوئی مظاہرہ کیا تھا۔ بلکہ اس خیال سے یہ شریفانہ آفر دی تھی تاکہ آپ دو ماہ کے عرصے میں میری رقم مجھے لوٹانے کے قابل ہو سکیں۔ اور ہاں یہ بھی ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ شریفانہ جابز میں ہمیشہ ریزن ایبل سیلریز ہی ملتی ہیں۔ اور ناجائز میں اس کا اسکیل لاکھ تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اوکے ـ چیئرز۔"

اور وہ جو اس کے بات کرنے کے دوران میں دروازہ کھول کر باہر اُتر آئی تھی ـ اسے سعد نے دروازہ بند کرنے کی بھی مہلت نہ دی اور ـــــ کار سے کر گولی کی طرح آگے بڑھ گیا۔ اور وہ پیچ و تاب کھاتی کچھ دیر تک تو جلتی سلگتی

نظروں سے اس کی کار کو دیکھتی رہی پھر تیزی سے مُڑی اور اپنے گھر کے راستے پر ہولی۔

دل و دماغ تو آتش کدہ سا بنا ہوا تھا۔

ایک تو وہ تکبر — اور وہ خوش فہمی جو اُسے اپنے لیے سعد کی طرف سے تھی، کم از کم وہ تو آج سعد کے رویے اور باتوں سے دور ہو گئی تھی۔

دوسرے اُس نے بڑی صاف گوئی سے کام لے کر اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ بھی کر دیا تھا اور اُسے یہ باور بھی کرا دیا تھا کہ اس کے مقابلے میں وہ بالکل ہی بے حیثیت ہے — اور ملازمت کر کے ہی اس کے قرض کا بوجھ اُتار سکتی ہے۔ اور وہ تو انتہائی نکیلی، غیور اور حساس تھی۔ اسے سب سے زیادہ سعد کی یہ حرکت کھلی تھی کہ اُس نے اس وقت جب دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اور دھوپ کی تمازت اتنی بڑھ گئی تھی کہ چیل بھی انڈا چھوڑنے پر مجبور ہو جائے اور پھر وہ بھی روزے کی حالت میں کہ پہلے اور آخری روزے پر یوں بھی گرمی میں کچھ شدت آ جاتی ہے اسے مین روڈ پر ہی اُتار دیا تھا۔ دوسرے معنوں میں گویا مین روڈ پہ اُتار کر سعد نے اُسے اس کی اوقات جتا کر اس کی توہین کرنے میں جو کسر رہ گئی تھی۔ وہ بھی پوری کر دی تھی۔

لہٰذا وہ گلی در گلی کو پیادہ پا طے کرتی جب گھر پہنچی تو واقعی پیاس اور گرمی کی حدت سے نڈھال سی ہو رہی تھی۔ اس سمے گھر میں صرف ماں ہی موجود تھیں۔ کیونکہ چھوٹی اور عذرا ابھی اپنی درسگاہوں سے نہیں لوٹے تھے۔ ماں نے دروازہ کھولا تو وہ انہیں سلام بھی نہ کر سکی — کہ ماں پر نظر پڑتے ہی گلے پر غم و غصے کی گھٹاؤں نے یلغار کر دی تھی۔ وہ سیدھی جا کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی — ماں بھی سمجھ گئیں کہ اس چلچلاتی دھوپ میں پیدل چل کر آئی ہے — اس پہ روزے سے بھی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس وقت اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ اطمینان سے دروازہ بند کر کے انہوں نے چھت کے پنکھے کا سوئچ آن کیا اور دوسرے صوفے پر آ بیٹھیں۔

”اتنی گرمی سے آئی ہو تو کم از کم یہ چادر تو اُتار دو — گرمی میں تو ریشم بدن کو اور بھی کھانے لگتا ہے۔“ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا، لیکن ادھر خاموشی ہی چھائی رہی۔

”اے روزے سے ہو اس لیے پانی بھی نہیں پی سکتیں، چلو اُٹھ کر منہ ہاتھ ہی دھو لو۔ کچھ تو جی ٹھنڈا ہو ہی جائے گا۔“ انہوں نے اسے خاموش دیکھ کر پھر کہا۔ تو جواب میں اس کی سسکیاں سننے کو ملیں۔

”ہیں خیر تو ہے تم رو کیوں رہی ہو۔ وقت سے بہت پہلے بھی آ گئی ہو — وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے کیا۔“ اس کا رونا دیکھ کر خورشید جہاں گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھیں اور اُس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں امی! یہی سمجھ لیجیے۔“ اُس نے گریہ سے بوجھل آواز میں کہا۔ اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

”چلو نہیں ملی تو نہ سہی، مگر اس میں رونے دھونے کی کیا بات ہے وہی مثل ہے کہ ایک در بند تو سَو کھلے۔ سعد آج کل میں آئے گا۔ تم اُس سے کہہ دینا وہ تمہیں کہیں اور لگوا دے گا۔“ اور سعد کے نام پر تو وہ یوں بھڑکی جیسے ماں نے اس کے کپڑوں میں ماچس کی جلتی ہوئی تیلی لگا دی ہو — وہ رونا دھونا بھول کر چادر ایک طرف پھینکتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میرے سامنے سعد کا نام نہ لیجیے امی! وہ سخت دوغلا اور دھوکے باز ہے۔ آپ کے سامنے جس قدر شریف اور مسکین بننے کی کوشش کرتا تھا نا آج اس کی ساری قلعی میرے سامنے کھل گئی۔ ساری اصلیت معلوم ہو گئی، مجھے آج اس کی معلوم ہے امی — وہ جو اتنا بھیگا بلا بنا آپ کے سامنے بیٹھا رہتا ہے اس کے خیالات کیا ہیں ہمارے لیے۔ وہ ہمیں بے حیثیت اور بے وقعت سمجھتا ہے۔ آج اس نے صاف صاف مجھے بتا دیا کہ وہ ہمارے لیے جو کچھ بھی کرتا ہے نہ رشتے کے تعلق سے کرتا ہے نہ ہمدردی میں، بلکہ ہماری حالت زار پر ترس کھا کر ہی کرتا ہے۔ اور وہ جو اس نے کل دو ہزار کی رقم دی تھی — وہ بخشش کے طور پر نہیں دی تھی بلکہ قرض دی تھی۔ جس کی واپسی کا مطالبہ بھی اس نے کر دیا ہے۔“

وہ ایک دم ہی پھٹ سی پڑی تھی۔

بولے ہی جا رہی تھی۔

غصے کے عالم میں خشک منہ اور پپڑائے ہوئے ہونٹوں سے ایک ساتھ ہی بڑی روانی سے اتنی باتیں کہہ گئی تھی کہ

ماں کے پلے کچھ باتیں پڑیں اور کچھ وہ سمجھ ہی نہ سکیں۔ اور جب وہ خاموش ہوئی تو انہوں نے اپنے مخصوص ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”ارے تو میں نے یہ کب کہا کہ وہ رقم اس نے مجھے بھیک میں دی ہے یا بخشش میں۔ میں تو شروع ہی سے یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ رقم میں نے اُس سے قرض لی ہے۔ جیسے میں انشاء اللہ جلد سے جلد اُتارنے کی کوشش کر دوں گی۔“ اور ماں کے اس ٹھنڈے سے جواب پر تو وہ بالکل ہی جل بھن کر رہ گئی۔

”کمال ہے، یہ رقم اُتارنے کی بات تو بالکل الگ ہی ہے، میں تو آپ پر آپ کے اس چہیتے بھتیجے کی اصلیت آشکارا کر رہی ہوں۔ یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ جس پر آپ اتنی جان چھڑکتی ہیں۔ اتنا اعتماد کرتی ہیں، اور جسے آپ اپنا ہمدرد سمجھتی ہیں، وہ کتنے پانی میں ہے۔ اور آپ کے لیے کیا خیالات اور جذبات رکھتا ہے۔“

”وہ خواہ میرے لیے کیسے ہی خیالات اور جذبات رکھتا ہو۔ کتنے ہی پانی میں ہو — لیکن وہ میرا محسن ہے۔ اس نے ایسے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے، جب میرا سایہ بھی مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ اور یہ جو تم کہہ رہی ہو کہ اس نے یہ کہا وہ کہا، تو اس معاملے میں بھی میں تمہارا اس سے آمنا سامنا کرا کے ہی کسی نتیجے پر پہنچوں گی۔“ خورشید جہاں نے کہا۔

”یعنی دوسرے معنوں میں آپ مجھے جھوٹا سمجھتی ہیں جو آمنا سامنا کرائیں گی۔ امی اپنی اولاد پہ اتنی بے اعتمادی ٹھیک نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ اپنی اولاد پہ ایک ایسے شخص کو ترجیح دے رہی ہیں جس کا آپ سے دور پرے کا بھی رشتہ نہیں ہے۔“ عنبر نے ماں کی بات پہ دل گرفتہ ہو کر گلہ آمیز لہجے میں کہا۔

”نہیں خیر، نہ تو میں تمہیں جھوٹا سمجھ رہی ہوں نہ اُسے تم پر ترجیح دینا چاہ رہی ہوں، بلکہ آمنا سامنا کرانے سے میرا مقصد یہ ہے کہ اس نے جس انداز میں تمہارے منہ در منہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے تمہارے سامنے ہی اس سے بات کر کے اس کے دماغ میں ہماری طرف سے جو خناس بھرا ہوا ہے کم از کم اسے تو صاف کر دوں گی۔“ ماں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

”مگر اس کی بھی کیا ضرورت ہے امی جبکہ نہ کسی کی ذہنیت کو بدلا جا سکتا ہے اور نہ کسی کے دل میں دل ڈالا جا سکتا ہے۔ کم از کم میری غیرت کے لیے تو یہی کافی ہے جو اس نے کہہ دیا۔ بلکہ بک دیا۔ میں تو اب اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔“ وہ ماں کی باتوں پر چمک کر بولی۔

”تو میں کون سی مری جا رہی ہوں اس کی صورت دیکھنے کے لیے۔ میں تو اس لیے تمہارا اس سے سامنا کرانا چاہ رہی ہوں کہ اسے اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تمہارے سامنے اتنا کچھ بک دیا — میرے سامنے یہ سب کیوں نہ کہا — کم از کم میں اسے گھر تک تو پہنچا دوں۔“ وہ جو ماں کے سامنے سعد سے منہ در منہ بات کے لیے کسی طرح تیار رہی نظر نہیں آ رہی تھی، اس نے ماں کو ان کے موقف پر ڈٹا دیکھ کر دل میں سوچا کہ اسے سچ سچ ماں کو وہ ساری باتیں بتا دینی چاہییں جو اس شوروم میں جا کر اسے پیش آئی تھیں۔ ورنہ اگر سعد نے اپنے لفظوں میں انہیں بتایا تو وہ سچ مچ اس کی باتوں پر ایمان لے آئیں گی۔ چنانچہ اس نے اپنے وہاں جانے اور کارڈ کے سلسلے میں شرمندگی اُٹھانے اور پھر وہاں سعد کے پہنچ جانے کی ساری روداد تفصیل سے ان کے گوش گزار کر دی۔

”لو بھلا — پھر اس میں رونے دھونے کی کیا بات تھی — اگر غلط فہمی کی بنا پر ایسا ہوا تھا تو وہ کیا نام ہے اس کا جس کے پاس سعد نے تمہیں بھیجا تھا، اُس بے چارے نے تم سے معذرت تو کر لی — اور اگر اس نے یہ کہہ بھی دیا کہ نوکری کر کے اس کا قرضہ اُتار دو تو تمہارے انکار پر چڑ کر کہا ہو گا —“ ماں نے بڑے غور سے اس کی ساری بات سن کر اظہار خیال کیا تو وہ تنک کر بولی۔

”اوہ امی! اس نے تو نا معلوم آپ کو کیا گھول کر پلایا ہے جو آپ ہمیشہ اس کی حمایت میں بولتی ہیں۔ اب صحیح سہاد کرانے کو بھی تیار ہو گئیں۔ مجھے معلوم ہے اگر وہ آپ کے سامنے جھوٹ بھی بولے گا تو آپ آنکھیں بند کر کے اس کی باتوں پہ ایمان لے آئیں گی۔“

”ہیں کیا کہا، میں اس پہ ایمان لے آؤں گی۔ اب تم اتنی بدتمیز اور بے ادب بھی ہو گئی ہو۔ جو اپنے چھوٹے سے منہ سے اتنی بڑی بات کہہ رہی ہو۔ مگر میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو خاموشی سے اولاد کی گستاخیاں بھی سہہ لیتی ہیں۔ میں تو تمہارے سارے دانت جھاڑ کر رکھ دوں گی اگر اب تم نے ایسی کوئی گستاخانہ بات کہی۔“ ماں کو اس کی بدتمیزی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے بات کرنے پہ غصہ آگیا تو انہوں نے بُری طرح اسے پھٹکارا۔

"نہیں امی! میں بھلا آپ کے ساتھ گستاخی کر سکتی ہوں — میں نے تو آپ کو اس دوغلی فطرت شخص پہ اتنا مہربان دیکھ کر ایک بات کہی تھی۔" ان کے پھٹکارنے پر عنبر روہانسی سی ہو کر بولی۔

"اے یہ کیا اُس نے وُس نے لگا رکھی ہے — کیا وہ تمہارا دیا کھاتا ہے یا تمہارے باپ دادا کا زر خرید ہے جو تم اسے اتنا ذلیل کر کے بات کرتی ہو جبکہ میں نے تمہاری تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، میں نے تو تمہیں بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا لحاظ کرنا بھی سکھایا ہے۔ اور وہ تو تم سے کافی بڑا ہے۔ کیا اُسے بھائی کہتے ہوئے تمہاری زبان دکھتی ہے۔" ماں نے پھر بُری طرح لتاڑا تو وہ کوئی جواب دیے بغیر اٹھی اور اپنی سلکن چادر تہہ کرتی ہوئی۔ اندر کمرے میں چلی گئی۔ جبکہ ماں اس کا فضیحتا ہی کرتی رہیں۔

"لے اتنی لمبی ناک رکھتی ہو تو اس کا قرضہ اُتارنے کے لیے کل سے جا کر وہی نوکری سنبھال لو۔ اے ہاں۔ اب کوئی طشت میں سجا کر تمہیں نوکری پیش کرنے سے تو رہا۔ بڑی تنخواہ کی نوکری کا انجام تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا۔ وہ تو خدا اسے عمر دے اگر عین وقت کے وقت وہ نہیں آتا تو تم آج اندر کوٹھری میں منہ چھپائے بیٹھی ہوتیں۔"

وہ سُن سب رہی تھی مگر ماں کی ٹُکا فضیحتی کا بھلا کیا جواب دیتی۔ اپنے گھر میں پہننے کے کپڑے اٹھائے اور خاموشی سے غسلخانے میں چلی آئی۔ پھر نہا دھو کر ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد سونے کے ارادے سے جونہی بستر پر لیٹی، اسی دم چھوٹی کالج سے آگئی۔ اور وہ اسے بستر پر لیٹا دیکھ کر تعجب سے بولی۔

"ارے آپا آپ مجھ سے پہلے ہی واپس آگئیں! اچھا ہاں آج سے رمضان بھی تو شروع ہو گئے ہیں۔ ٹائمنگز بدل گئے ہوں گے آفسوں کے۔" تو جواب میں اس نے صرف "ہوں" کہنے پر اکتفا کیا

"ویسے کیسا لگا آپ کو وہاں کا ماحول۔ اور کیا سعد بھائی بھی وہاں آئے تھے۔ ؟" چھوٹی نے اپنی کتابیں ریک میں رکھتے ہوئے پھر پوچھا۔

"ہاں آئے تھے مگر پہلے تم منہ ہاتھ دھو لو جا کر۔ ابھی تو ظہر کی نماز کا بھی کافی وقت ہے۔" عنبر نے اسے اپنے سر سے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"ظہر کی نماز تو میں نے کالج میں ہی ڈیڑھ بجے پڑھ لی تھی۔ اصل میں گزشتہ رات اچانک ہی چاند نظر آجانے کی اطلاع ملی تھی نا اس لیے ایک دم ہی آج کا روزہ رکھنا پڑا۔ اس لیے ہمارے کالج کے ٹائمنگز میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی مگر کل سے ہمارا کالج ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے لگا کرے گا اور ڈیڑھ بجے چھٹی ہو جایا کرے گی معلوم بھی ہے آپا یہاں کراچی میں بارہ بجے جب سورج نصف النہار پر پہنچتا ہے، گرمی میں اتنی شدت نہیں آتی جتنی کہ اس وقت یعنی دو ڈھائی بجے آتی ہے۔" اس کے گریز کرنے کے باوجود چھوٹی باتیں کیے گئی۔

"ویسے آپا کیسی عجیب بات ہے۔ ہر سال رمضانوں میں اسی طرح ٹائمنگز چینج ہوتے ہیں یعنی ہمیں تو اس کا عادی ہونا چاہیے لیکن نہ جانے کیوں ہمیشہ یہ اوقات میں تبدیلی نئی نئی سی لگتی ہے۔" چھوٹی نے پھر کہا۔ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنا کام بھی کرتی رہی۔ یعنی چادر تہہ کر کے رکھی، گھر میں پہننے کے کپڑے نکالے اور پھر عنبر پر جو آنکھیں بند کیے لیٹی تھی ایک نظر ڈال کر غسلخانے کا رُخ کیا۔

عنبر کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس پر اس کا روزہ بھی تھا۔ اس لیے ایسی پڑ کر سوئی کہ سہ پہر پانچ بجے چھوٹی کے جگانے پر ہی اٹھی۔

"آپا۔ آپا اٹھیے۔ پانچ بج چکے ہیں عصر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ اٹھیے۔ جلدی کیجیے۔" تب اس نے اٹھ کر عصر کی نماز پڑھی اور پھر کلام پاک کی تلاوت کرنے بیٹھ گئی۔ جب کہ چھوٹی افطاری تیار کرنے میں لگی رہی۔ جب کہ افطاری کے لیے یوں تو کوئی خاص اہتمام نہ ہوتا مگر پہلے روزے کو، چودھویں روزے کو جمعراتوں اور آخری جمعے یعنی جمعۃ الوداع کے روز اتنی ناموت میں بھی خورشید جہاں ایک روزہ دار کو کھانا ضرور کھلاتی تھیں۔ وہ بھی اپنی استطاعت کے مطابق یعنی جتنی بھی ان کی مقدرت ہوتی تھی اور پہلے روزے کو تو وہ اپنے شوہر کے ایصال ثواب کے لیے تھوڑی افطاری

اور کھانا محلے کی مسجد میں بھجوا دیتی تھیں۔ چنانچہ چھوٹی نے تھوڑے سے پکوڑے بھی تلے تھے اور آلو کے شامی کباب بھی بنائے تھے اور ان کے ساتھ گزشتہ شب لایا ہوا قیمہ بھی پکا لیا۔ اور جلدی جلدی چند چپاتیاں ڈال کر ماں کے نیاز دلوانے کے بعد عزیر کے ہاتھ افطار کے وقت سے کچھ پہلے ہی مسجد میں بھجوا دیا تھا۔ پھر افطار کا وقت بھی ہو ہی گیا اور یوں وہ چھوٹی کے الٹے سیدھے سوالات سے بچی رہی تھی۔ مگر جب افطار کے بعد مغرب کی نماز سے فراغت ملی تو چھوٹی جو دوپہر سے یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی کہ نئی جاب کیسی ہے اور وہاں جا کر کیا باتیں ہوئیں، کیا پیش آیا۔ اس نے موقع ملتے ہی پھر وہی استفسارات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"ہاں تو آپا کیا رہا وہاں جا کر۔ ؟"

"کچھ بھی نہیں۔ وہاں تو کم و بیش تیس چالیس عورتیں کام کرتی ہیں۔" اس نے مُبہم سا جواب دیا۔

"اوہ — پھر تو خاصے بڑے پیمانے پر یہ کارخانہ چل رہا ہوگا۔ مگر وہاں کا ماحول کیسا لگا آپ کو؟" چھوٹی نے مزید پوچھا۔

"بس ٹھیک ٹھاک ہی لگا۔" اس نے مختصراً کہا۔

"ویسے یہ لوگ مال ہول سیل میں فروخت کرتے ہیں یا علیحدہ بھی بیچتے ہیں؟"

"ہاں علیحدہ بھی بیچتے ہیں۔ باقاعدہ شوروم ہے ان کا جس کے عقبی حصے سے فیکٹری بھی ملحق ہے۔ لیکن زیادہ بڑا کاروبار بھی نہیں ہے۔ بس اوسط درجے کا سمجھ لو۔" عنبر نے جان کر فیکٹری کے بارے میں قدرے تفصیلی جواب دیا تاکہ چھوٹی بال کی کھال نکالنے نہ بیٹھ جائے۔

"اچھا یہ سعد بھائی کیا پہلے سے موجود تھے وہاں؟" چھوٹی نے ایک اور سوال داغا۔

"نہیں۔ وہ تو بعد میں آئے تھے۔"

"اچھا تو انہوں نے ہی تعارف کرایا ہوگا آپ کا اس فیکٹری کے باس سے۔"

"نہیں۔ باس تو اپنی کسی میٹنگ میں تھے۔ خیر چھوڑو اس بات کو اور یہ بتاؤ کہ آج تمہاری کلاس میں کتنی لڑکیوں کا روزہ تھا۔" وہ جو چھوٹی کے سوالات سے بچنا چاہ رہی تھی، اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے اس نے بات کا رُخ موڑا۔ کیونکہ ماں بھی نزدیک ہی بیٹھی تھیں اور دونوں کی باتیں سُن رہی تھیں اور ان کے سامنے اگر کوئی غلط بات اس کے منہ سے نکل جاتی تو وہ فوراً ہی اس کی گرفت کر لیتیں۔

"بس تین چار لڑکیاں ہی روزے سے تھیں۔ لیکن آپا آپ وہاں گئیں تو اپنی ہی سواری سے ہوں گی مگر واپسی تو کمپنی کی گاڑی سے ہی ہوئی ہوگی۔" چھوٹی کو بس یہی سب جاننے کی پڑی تھی۔ تبھی تو اس کے کترانے کے باوجود وہ سوال پہ سوال کیے جا رہی تھی۔

"نہیں، واپسی تو بس سے ہوئی تھی۔ کیونکہ کمپنی کی گاڑی ورکرز کو چھوڑتی ہوئی مجھے یہاں ڈراپ کرنے آتی تو اس وقت تک شام ہی ہو جاتی۔"

"واہ آپا یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ آپ کمپنی کی گاڑی میں ہی یہاں ڈراپ ہوتیں تو کم از کم گاڑی کے ڈرائیور کو آپ کے گھر کا پتا تو معلوم ہو جاتا۔ اب صبح کو وہ بھلا کس طرح آپ کو پک کرنے آسکے گا؟" چھوٹی نے گویا اس کی ایک فاش غلطی پر اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اب صبح کو ہی دیکھا جائے گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ سحری کے لیے کیا پکاؤں؟" عنبر اس کے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئی بولی۔

"اوہو تو ایسی کیا جلدی ہے آپا۔ کچھ نہ کچھ تو پکے گا ہی۔ وہ میں بعد میں پکا لوں گی ابھی تو صرف ساڑھے سات ہی بجے ہیں۔" چھوٹی نے کہا۔

"نہیں تم کل سے کام میں لگی ہوئی ہو اب آرام کرو۔ آج کی سحری میں خود تیار کروں گی۔" عنبر نے کہا اور پھر اس کے مزید کچھ

کہنے سے پہلے کمرے سے نکل گئی۔ اصل میں یہ ماں بیٹیاں اور بیٹا افطار کے ساتھ ہی کھانا کھا لینے کے عادی تھے۔ اور کھانے پر بیٹھے تھے۔ ماں گو خاموش بیٹھی درود شریف کا ورد کر رہی تھیں مگر سُن سب رہی تھیں۔ جب وہ اٹھ کر باہر چلی گئی تو انہوں نے حضور رسالت مآبؐ کو درود شریف بخشنے کے بعد دبی زبان سے چھوٹی سے کہا۔

"لے تم کیوں اس سے الٹے سیدھے سوال کر رہی ہو، یہ تو اس نوکری کو بھی لات مار آئی ہے۔ آج تو یہ سعد سے بھی لڑ آئی ہے۔ اب سعد آ گیا تو اس سے پوچھوں گی کہ آخر اس نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی؟"

"کون سی بات؟" چھوٹی کو جیسے اُس کے نوکری پر لات مارنے کا سُن کر شاک سا لگا تھا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ اس نے عنبر کو یہ نوکری اس لیے دلوائی ہے کہ وہ اکٹھے نہیں تو دو تین ماہ کے اندر اندر اس کا قرضہ اتار دے۔ لے دیکھو بھلا۔ اگر اس کا کچھ ایسا ہی ارادہ تھا تو اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ عنبر سے کیوں کہا۔ یہی تو میں اس سے پوچھنا چاہ رہی ہوں۔" ماں نے چھوٹی کے سوال کے جواب میں کہا۔

"لیکن امی! میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپا جھوٹی ہیں یا انہوں نے جھوٹ بولا ہے مگر میں یہ بھی نہیں مان سکتی کہ سعد بھائی اتنی گری ہوئی بات بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ خود آپا نے کسی بات پر انہیں جلی کٹی سنا کر ان پیسوں کا طعنہ دیا ہو کہ میں آپ کی پائی پائی جلد ہی آپ کو واپس کر دوں گی تو اس پر انہوں نے ایسی بات کہہ دی ہو۔" چھوٹی جو سعد کی فطرت اور مزاج سے کسی حد تک واقف تھی، اس نے ماں کی زبانی سُنی ہوئی باتوں کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"خیر، جس طرح بھی کہی ایسی بات اُسے کہنی نہیں چاہیے تھی۔ جب کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ عنبر بڑی نکیلی اور بد دماغ ہے۔ اے خاک چاٹ کر کہتی ہوں بچی۔ حیثیت تو میری بھی کچھ نہیں ہے مگر غیرت کو زک پہنچانے والی بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس معاملے میں تو میں بھی بڑی بد دماغ ہوں۔ اور افسوس تو مجھے اس بات پر ہے کہ اگر عنبر نے کوئی کڑوی کسیلی بات کہی بھی تھی تو کم از کم اسے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ کیونکہ میں نے تو اسی وقت اس سے کہہ دیا تھا جب اس نے مجھے وہ پیسے دیے تھے کہ میں اُس کا قرضہ جلد ہی اتار دوں گی۔" خورشید جہاں نے کہا۔

"جی ہاں امی۔ پیسے کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمیشہ ذلیل ہی کرا کے رہتا ہے مگر کیا آپا وہاں نوکری کے لیے صاف انکار کر آئی ہیں؟" چھوٹی نے ان کی باتوں سے اتفاق کر کے پوچھا۔

"انکار کیسا میرے خیال میں تو ٹھکرا ہی آئی ہے۔ گو منہ سے تو نہیں کہا مگر ظاہر ایسا ہی کر رہی تھی۔" ماں نے کہا۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر آپ آپا سے خود کیوں نہیں پوچھ لیتیں۔ دیکھیں نا اتنی مشکل سے تو یہ نوکری ملی ہے جس میں عزت بھی ملے گی اور تحفظ بھی۔ اور تنخواہ بھی بُری نہیں ہے۔ آپا کو ہاؤس رینٹ (گھر کا کرایہ) بھی ملا کرے گا اور سال میں دو مرتبہ بونس بھی۔ پھر آمدورفت بھی مفت ہو گی۔ آپ انہیں اتنا تو سمجھایئے کہ اتنی اچھی ملازمت کو ٹھکرا کر اپنے پیروں پر کلہاڑی نہ ماریں۔" چھوٹی نے کہا۔

"نہیں چھوٹی میں اس سے اب کچھ نہیں پوچھوں گی۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو پھر میری بات بھی جائے گی۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ تبھی تو وہاں سے آ کر خوب روئی تھی۔" خورشید جہاں نے جواب میں کہا اور پھر چھوٹی کو یہ بھی بتا دیا کہ وہاں جا کر اسے کیسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ چھوٹی نے سب کچھ سُننے کے بعد کچھ سوچ کر کہا۔

"امی! آپ آپا کے رونے پر نہ جایئے۔ روزے کی حالت میں وہ اتنی چلچلاتی دھوپ میں پیدل چل کر آئی ہیں اس پر سعد بھائی سے ان کی نوک جھونک ہو گئی تھی اسی لیے دل بھر آیا ہو گا۔ لیکن امی! آپ کو معلوم ہی ہے کہ آپا شروع ہی سے سعد بھائی کو پسند نہیں کرتیں۔ اس پر ریحان بھائی نے رشتہ توڑنے کے موقع پر ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ سعد بھائی سے شادی کر لیں بلکہ شاید یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے آپا کے لیے سعد بھائی کو سلیکٹ کیا ہے۔ بس اس کے بعد سے تو آپا اور بھی سعد بھائی سے خار کھانے لگیں اور اب اس ملازمت کی آفر چونکہ سعد بھائی نے ہی دی ہے، اس لیے آپا کو وہاں کام کرنا گوارا نہیں ہو رہا۔ مگر یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی امی۔ یوں بھی یہ فیکٹری سعد بھائی کی تو نہیں ہے کسی اور کی ہے۔ سعد بھائی کا اس سے کوئی تعلق بھی نہیں ہو گا اور اگر آپا کو پہلے کی طرح کسی غلط سلط جگہ نوکری مل گئی پھر۔۔۔؟"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو چھوٹی۔ بس آیندہ سے یہ نوکری ووکری کا قضیہ ہی ختم۔ میں تو اب عنبر کو گھر سے ایک قدم بھی باہر نکالنے نہیں دوں گی۔"

چھوٹی کی بات پر خورشید جہاں نے دل میں ہول کر قدرے تیز لہجے میں کہا۔ تو عنبر نے جو ہنڈیا بگھار کر اسی وقت بیٹھک میں آئی تھی ماں کی بات سن لی اور وہیں سے قدرے اونچی آواز میں بولی۔

"اب یہ کس وجہ سے مجھ پر عتاب نازل کیا جا رہا ہے امی؟" پھر وہ کمرے میں آ کر بولی۔

"امی! اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں ذلت گوارا کر لوں۔ یہ آپ کے چہیتے بھتیجے کی دلائی ہوئی نوکری کو قبول کر لوں تو میں سر آنکھوں پر کر لوں گی لیکن صرف ایک شرط پر۔"

"ارے کیسی شرط ورط؟" خورشید جہاں نے کڑوا سا منہ بنا کر پوچھا۔

"شرط یہ ہے کہ یہ ملازمت سنبھالنے سے پہلے میں آپ کے بھتیجے کا قرضہ اُتاروں گی۔ لہٰذا وہ طلائی زنجیر جو آپ غزل کو بخوشی دینے پر تیار ہو گئی تھیں مجھے دے دیں میں اسے بیچ کر اس کے خواہ چار ہزار بھی ملے وہ سب کے سب سعد کے ہاتھ میں رکھ دوں گی۔ میرے خیال میں عذیر پر جتنا روپیہ انہوں نے خرچ کیا ہے اس سمیت چار ہزار ہی بنتے ہوں گے۔ کیوں چھوٹی؟" عنبر نے ماں کو اپنی شرط کے بارے میں بتا کر بات کا اختتام چھوٹی کو مخاطب کر کے سوالیہ انداز میں کیا۔ مگر اس کی شرط کا ردِ عمل خورشید جہاں پر کچھ اتنا شدید ہوا کہ وہ غصّے میں ایک دم ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"لے واہ وہی مثل ہے کہ پرائے مال پر یا حسین۔ بڑی آئیں وہ طلائی زنجیر بیچ کر سعد کا قرضہ اتارنے والی۔ ارے میں نے تو یہ دیکھ کر کہ وہ چڑیل ہماری عزت مٹی میں ملا رہی ہے، اپنے دل پر پتھر رکھ کر تمہیں وہ زنجیر دی تھی۔ اب وہ اتنی فالتو نہیں ہے کہ تم اپنی ناک اونچی کرنے کو اسے بھی داؤ پر لگا دو۔ اگر تم وہ نوکری نہیں کرنی چاہ رہیں تو نہ کرو۔ میری بلا سے۔ میں تو شروع ہی سے تمہارے نوکری کرنے کے خلاف ہوں۔"

اور ماں کے اس کھرے اور دل آزار جواب پر عنبر کا منہ لٹک سا گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا ضرور مگر انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پلٹ کر باہر صحن میں چلی گئی۔ وضو کیا۔ عشاء کی نماز پڑھی اور سویرے سے ہی منہ لپیٹ کے پڑ رہی۔ ماں پر بھی غصّہ سوار تھا اس لیے انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ چھوٹی بھی کچھ دیر تک تو اپنے نوٹس کا مطالعہ کرتی رہی پھر کچن میں جا کر برتن دھونے، کچن کی صفائی اور سحری کا پکا یا ہوا سالن نعمت خانے میں رکھ کر وضو کرنے چل دی۔ البتّہ عذیر جو محلّے کی مسجد میں تراویح پڑھنے گیا ہوا تھا۔ واپسی پر ماں سے باتیں کرتا رہا۔

سحری کے وقت سب سے پہلے عنبر کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے اٹھ کر پہلے تہجّد کی نماز پڑھی پھر سالن گرم کر کے اور چائے تیار کر کے دسترخوان پر پہنچا یا۔ اسی اثناء میں چھوٹی اور عذیر بھی اٹھ گئے تھے البتّہ خورشید جہاں سو رہی تھیں۔ تینوں نے ہی انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ ایک ہی روزے نے انہیں نڈھال سا کر دیا تھا۔ لیکن جب سحری ختم ہونے میں چند منٹ رہ گئے تو وہ خود ہی اٹھ کر باہر آ گئیں۔ ان تینوں نے بہت کہا۔ کہ آپ آج کا روزہ نہ رکھیں بلکہ ایک دن بیچ کر کے رکھا کریں لیکن وہ نہیں مانیں اور ان کے ساتھ سحری کھانے بیٹھ گئیں۔

فجر کی نماز کے بعد تلاوت کر کے کالج کا جو کام باقی رہ گیا تھا چھوٹی نے اسے نمٹایا اور اپنے اور عذیر کے یونیفارم پر استری کی۔ پھر بھی اتنا وقت بچ گیا تھا کہ وہ چاہتی تو تھوڑی سی نیند لے سکتی تھی مگر وہ اپنی ایک نصابی کتاب کا مطالعہ کرتی رہی اور پھر ٹھیک سوا سات بجے کالج روانہ ہو گئی۔ کوئی آٹھ بجے کا عمل تھا جب عذیر نے عنبر کو جگا کر بتایا۔

"آپا! آپا اٹھیے، وہ آپ کے دفتر کی گاڑی آپ کو لینے آئی ہے۔"

"مگر کیسے آ گئی؟" اس نے آنکھوں میں بھری نیند کو ہاتھوں سے مسل کر بھگانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"بڑے سے انجن میں لگے چار عدد ٹائروں کے ساتھ چل کر آئی ہے اور کیسے آئی ہے۔" عذیر بولا۔ تو اٹھنے کے بجائے وہ لیٹے لیٹے ہی بولی۔

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں نے پتا تو بتایا نہیں تھا اپنا پھر کیسے آ گئی؟"

"ظاہر ہے سعد بھائی نے پتا بتا دیا ہو گا۔ اب کیا جانے کا ارادہ نہیں آپ کا جو اتنے اطمینان سے بیٹھی ہیں۔" عذیر اس کے تساہل برتنے پر چڑ کر بولا۔ تو اس کے کچھ کہنے سے پہلے خورشید جہاں جو عذیر کی آواز پر ہی جاگ گئی تھیں چیختے ہوئے لہجے میں

بولیں۔

"اے یہ کیا جائے گی یہ تو کل ہی اس نوکری پر لات مار آئی۔ جاؤ تم گاڑی والے سے کہو، واپس چلا جائے۔ خواہ مخواہ کسی کا وقت کھوٹا کرنے سے فائدہ۔؟"

"ہیں امی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ آپا! کیا واقعی آپ۔" عذیر نے ماں سے پوچھتے پوچھتے اسے مخاطب کیا تو اس خیال سے کہ کہیں ماں ساری تفصیل سناتے نہ بیٹھ جائیں وہ جلدی سے اٹھتی ہوئی بولی۔

"نہیں بھئی، ڈرائیور سے کہو کہ تھوڑی دیر ٹھہرے۔ میں بس ابھی پانچ منٹ میں تیار ہوتی ہوں"، ماں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ دل ہی دل میں مطمئن سی ہو کر انہوں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں اور عذیر بھی اچھا اچھا کہتا ہوا بیٹھک کی طرف چل دیا۔

پھر عنبر نے جلدی جلدی۔ اپنے کپڑے نکالے۔ اتنے میں وہ منہ دھونے گئی اتنے میں عذیر نے اس کے کپڑوں پر استری کر دی۔ اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا تاکہ وہ لباس تبدیل کر سکے۔ اور پانچ منٹ تو نہیں مگر سات آٹھ منٹ ضرور لگے اسے تیار ہونے میں۔ چلتے چلتے اس نے ماں سے کہا۔

"امی! اب میرے جانے کے بعد آپ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائیے گا۔ کچھ کام چھوٹی کالج سے واپس آ کر کر لے گی اور میں واپسی میں کچھ تلن اور پھل وغیرہ لیتی ہوئی آؤں گی۔" پھر وہ انہیں الوداعی سلام کر کے باہر آئی تو اس نے عذیر کو بھی یہی تاکید کی کہ جب گھر میں امی کو کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دینا اور پھر وین میں بیٹھ کر اپنی نئی ملازمت پر روانہ ہو گئی۔

تمام راستے وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ سعد یقیناً پہلے سے شوروم میں موجود ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ فیکٹری کا مالک بھی اس کے ساتھ ہو اور اس کے سامنے وہ نہ معلوم مجھ سے کس طرح پیش آئے گا اور اس کا ایٹی ٹیوڈ (رویّہ) کیسا ہو گا۔ اسی خیال نے تمام راستے اسے مضطرب سا رکھا تھا۔

مگر ہوا یوں کہ جب وہ اپنے نئے دفتر پہنچی تو وہاں سوائے ان سات خواتین کے دور دور تک کسی مرد کا پتا نہ تھا۔ رقیہ نے ہی اس کا سواگت کیا تھا۔ اسی نے اس کی نوکری کے کاغذ پر اس کے دستخط کرائے تھے اور اسی نے پوری فیکٹری میں اسے گھما پھرا کر اس کے کام کی نوعیت کی ساری تفصیل بتائی تھی۔ گو اس نے رقیہ کی بعض باتوں اور رویّے سے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ اس کی فیکٹری میں آمد پر خوش نہیں تھی۔ پھر بھی چونکہ خود اس کی روزی کا معاملہ تھا اس لیے گویا فارمیلٹی نبھا رہی تھی۔

بہرحال اس کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی وہ تھوک کے مال کے آرڈر بک کرے اور شوروم میں جو ریڈی میڈ گارمنٹس کی فروخت ہوتی تھی اس کا پورا حساب رکھے۔ فیکٹری کی ورکرز میں نظم و نسق قائم کرے یعنی پنکچوئلیٹی اور ڈسپلن کا پورا پورا خیال رکھے اور کسی بھی قسم کی بے اصولی پر سخت ایکشن لے۔ وقت کی پابندی نہ کرنے والوں کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتے اور پورے دن کی سیل کا حساب جو رقیہ کے ذمے تھا اسے بڑی باقاعدگی سے روزانہ چیک کرے۔ اسے خاص طور پر ایک ایسا کمرہ دیا گیا تھا جو فیکٹری اور شوروم کی درمیانی دیوار کے ساتھ ہی تعمیر کیا گیا تھا جس میں اے سی بھی تھا اور فرنشڈ بھی اور جس میں فیکٹری کی سمت اور شوروم کی سمت دو طرفہ شیشہ لگا ہوا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ دونوں طرف نگاہ رکھ سکتی تھی۔

اول روز ہی رقیہ نے اسے کام دکھانے اور سکھانے کی غرض سے پھرکی کی طرح گھما کر رکھ دیا تھا۔ گویا۔ بہت زیادہ مشکل کام اسے سونپا گیا تھا۔ اس پر وہ نو بجے کی گئی افطار کے وقت سے کچھ دیر قبل ہی گھر لوٹی تھی اور پہلے دن ہی بری طرح تھک گئی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ جاب ہی چھوڑ کر بیٹھ جائے لیکن چونکہ سعد کا قرضہ اتارنے کا تہیہ کر چکی تھی اسی لیے طوعاً و کرہاً اس نے اس ملازمت کو قبول کر لیا۔

یوں تو پہلے روز ہی رقیہ نے اسے بایوڈیٹا اور گریجویشن سرٹیفکیٹ وغیرہ لانے کو کہا تھا مگر اسے وہاں ملازمت کرتے کم و بیش بارہ روز ہو گئے تھے اور ان بارہ دنوں میں فیکٹری کا باس آیا تھا نہ سعد اور نہ ہی اسے اب تک اپائنٹمنٹ لیٹر ہی ملا تھا۔ بس ایک ٹائپ شدہ کاغذ پر اس کے دستخط لینے کی حد تک ہی کارروائی ہوئی تھی۔ ورنہ باقی تو سب زبانی جمع خرچ کی حد تک ہی محدود تھا۔

اسے اول کے چند دنوں تک اپنا کام سنبھالنے میں دشواری ضرور ہوئی تھی مگر پھر اس کی سمجھ میں سارا کام آ گیا تھا اور وہ بطریق احسن اپنی ڈیوٹی نبھا رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی رقیہ تقریباً روز ہی اس کے کام میں۔ مین میخ ضرور نکالتی تھی اور جہاں تک اس نے مشاہدہ کیا تھا وہ فیکٹری کے ورکرز پر ہی نہیں بلکہ پوری فیکٹری پر چھائی ہوئی تھی اور اس کے آنے سے خوش نہیں تھی۔ ساری ورکرز ہی رقیہ کو میڈم کہہ کر پکارتی تھیں اور بعض منہ چڑھی اسے آپا بھی کہتی تھیں اور عنبر کو مس خان۔

اور چونکہ دو چار کو چھوڑ کر سب کی سب رقیہ سے حد درجہ متاثر اور مرعوب تھیں اسی لیے عنبر سے بہت خار کھاتی تھیں آپس میں مل جل کر بیٹھتیں تو اس کا مذاق ہی اڑاتی تھیں۔ یا پھر کچھ اس وجہ سے کہ عنبر نئی نئی آئی تھی اور ان سب میں حسین تھی اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ عہدے میں وہ رقیہ سے بھی سینئر تھی وہ ان سے کوآپریٹ نہیں کر سکی تھی۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی شکایتیں رقیہ سے لگاتیں اور رقیہ بالا ہی بالا ان شکایات کو باس تک پہنچا دیتی اور باس ہمیشہ یہی کہتا کہ آج کل سخت مصروف ہوں۔ جونہی فرصت ملی مس خان کو آ کر خود چیک کروں گا۔ دوسرے معنوں میں گویا اسے ٹال۔ دیتا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا مہینہ بھی گزر گیا۔ باس آیا نہ اسے اپائنٹمنٹ لیٹر ہی ملا اور نہ ہی سعد ہی کہیں نظر پڑا۔ حد تو یہ تھی کہ وہ اس کے گھر بھی نہیں آیا تھا۔ اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت سنجیدگی سے ان سب سے خفا ہو گیا تھا۔ جب کہ وہ چاہ رہی تھی کہ کسی طرح اس کا سعد سے سامنا ہو تو وہ اس کا پورا نہیں تو آدھا قرضہ واپس کر دے۔

اصل میں عید کی وجہ سے یا خوشی میں قاعدے کے مطابق سارے ایمپلائیز کو آدھی تنخواہ پیشگی دینے کے ساتھ ساتھ ایک ایک عدد ریڈی میڈ سوٹ بھی فیکٹری کی طرف سے دیا گیا تھا اور رقیہ کے دبی زبان سے منع کرنے کے باوجود کہ ابھی تو اسے فیکٹری کی سروس جوائن کیے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا بالکل نئی نئی آئی ہے، اس لیے وہ آدھی تنخواہ اور سوٹ کی مستحق نہیں ہے فیکٹری کے باس نے اسے مستحق قرار دے کر گویا بہت مساویانہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ اور چونکہ اس کا عہدہ بڑا تھا اس لیے اسے سوٹ بھی اس کے حسب منصب عطا کیا گیا تھا۔

خیر یہ تو علیحدہ بات تھی مگر تنخواہ کی آدھی رقم اس نے بڑی احتیاط سے اپنے پاس ہی رکھ لی تھی اور کئی بار عذیر سے بھی کہا تھا کہ وہ اسکول کے بعد سعد کے ہاں جا کر اس کی خیر خبر تو لائے بلکہ بہتر یہی ہو گا کہ اسے اپنے ساتھ لے آئے لیکن عذیر ہمیشہ اسے آئے ٹالے ہی کرتا رہا۔ اور اس کے بہت کہنے سننے پر ایک روز اس کے ہاں گیا بھی تو سعد سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ معلوم یہ ہوا کہ سعد شہر سے ہی نہیں ملک سے ہی کہیں باہر گیا ہوا ہے اور اس کی واپسی کا عنقریب کوئی امکان نہیں ہے۔

لہٰذا عنبر نے یہ سوچ کر تنخواہ کے پیسے خرچ کر لیے کہ بقایا آدھی جو پہلی تاریخ کو ملے گی وہ سعد کے لیے سنبھال کر رکھ دوں گی اور پھر اگلے مہینے تو دو ہزار کی رقم پوری ہی ہو جائے گی۔ بلکہ اس نے تو سوچا تھا کہ ادھر سعد کے قرضے کی رقم پوری ہوئی اور ادھر وہ یہ ملازمت چھوڑ دے گی۔ کیونکہ ایک تو وہ اب تک خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکی تھی دوسرے ابھی تک۔ اسے اپائنٹمنٹ لیٹر نہیں ملا تھا۔ گویا اس کام میں پختگی تھی نہ اس کا کوئی بھروسا تھا، ان لوگوں کا جب دل چاہتا اسے کھڑے کھڑے نوکری سے نکال سکتے تھے۔ باس بھی کچھ عجیب ہی فطرت کا انسان تھا کہ اس نے محض سعد کی خوشی کی خاطر اسے بلا دیکھے اور پرکھے۔ ملازمت دے دی تھی۔ ایسی ملازمت کا بھلا کیا بھروسا تھا۔

پھر عید بھی کب کی گزر گئی اور اسے فیکٹری میں کام کرتے دوسرے ماہ کا وسط بھی شروع ہو گیا۔

دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور وہ شوروم میں کھڑی ہینگرز پر لٹکے ان ملبوسات کو جو لٹکے لٹکے میلے سے ہو گئے تھے ہٹوا کر ان کی جگہ نئے ملبوسات لٹکوا رہی تھی کہ تبھی بڑے قیمتی تھری پیس سوٹ میں ملبوس فہد اندر داخل ہوا۔ اسے اتنے اچانک اور غیر متوقع دیکھ کر وہ گھبرا سی اٹھی۔ اور جلدی سے دوسری طرف گھوم کر بلا مقصد ہی ہینگرز پر لٹکے نئے ملبوسات کو دیکھنے لگی۔ اصل میں وہ اس سے بچنا اور کترانا چاہ رہی تھی۔ اسے یہ بالکل گوارا نہ تھا کہ فہد کے علم میں یہ بات آئے کہ وہ اسی فیکٹری میں ملازمت کر رہی ہے۔ یوں بھی اس کا خیال تھا کہ فہد نے صرف ایک بار ہی اسے دیکھا تھا وہ بھی بالکل سادگی کے ساتھ چادر میں لپٹے، لہٰذا ایک ہی نظر میں فہد کا اسے پہچان لینا ممکن ہی نہیں۔ وہ شاید کچھ خریدنے کی غرض سے آیا تھا اور وہ اس انتظار میں تھی کہ وہ خریداری کر کے چلا جائے گا تو وہ اطمینان سے اپنا کام کر سکے گی۔ مگر ہوا یوں کہ کچھ ہی دیر بعد ہینگرز کی قطار کے پیچھے سے گزر کر وہ عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ایک مسکراتی سی نظر اس پر ڈال کر اس نے کہا۔

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو غالباً آپ عنبرین شہباز خان ہی ہیں۔"

"جی غالباً نہیں بلکہ یقیناً میں عنبرین شہباز ہی ہوں۔ اور آپ ۔ تم فہد بختیار ہی ہونا ۔ مگر بڑے ہی بے مروّت ہو۔ ایسے گئے کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی تم نے۔"

"آپ نے بلایا ہی کب جو آپ کی خبر لیتا ۔ اطلاعاً عرض ہے کہ بہت نکیلا آدمی ہوں ۔ بغیر بلائے تو خدا کے یہاں جانے کی زحمت بھی گوارا نہ کروں گا۔" فہد نے شوخ لہجے میں کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

"اُف توبہ۔ باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔ مگر یہاں کیسے نظر آ رہے ہو؟ کیا کچھ خریداری کرنے آئے ہو؟"

"جی میں خریدتا نہیں بلکہ بیچتا ہوں۔ یہاں کی بڑی شہرت سُنی تھی، اس لیے دیکھنے آ گیا۔" فہد نے کہا۔

"کس کی شہرت سُنی تھی۔ کیا یہاں کے گارمنٹس کی؟" اس نے قدرے فخریہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں، آپ کے حسن کی۔" فہد نے شوخ سے انداز میں کہا۔

"دیکھو تم نے اگر ایسی باتیں کیں تو میں سب کے سامنے سچ مچ تمہیں مار بیٹھوں گی۔" وہ بُری طرح جھینپ کر بولی

"بصد شوق۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔"

فہد نے اپنے سر کو تھوڑا سا خم کر کے کہا۔ وہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ رقیہ اس کے قریب آ گئی اور اس پہ ایک قہر آلود نظر ڈال کر فہد سے بولی۔

"سر! آپ پہلے اندر چل کر فیکٹری کا معاینہ کر لیں ۔ سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، آپ چلیں ہم ابھی آتے ہیں۔" فہد ایک دم ہی سنجیدہ سا ہو کر بولا۔ پھر اس نے عنبر سے کہا۔

"دیکھیں بھلا ۔ یہ تو یوں ظاہر کر رہی ہیں جیسے میں انسپکٹر آف فیکٹریز ہوں اور یہاں معاینہ کرنے آیا ہوں۔"

اور پھر رقیہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اور وہ جو ابھی کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ آخر رقیہ اسے فیکٹری کا معاینہ کرانے کیوں لے گئی ہے۔ کہیں وہ سچ مچ انسپکٹر آف فیکٹریز ہی تو نہیں۔

تبھی سیلز گرل ۔ فریدہ نے اس کے قریب آ کر کہا۔

"مس خان! یہ کام اب دوپہر میں جب لنچ کے لیے وقفہ ہوتا ہے کرایئے گا۔ کیونکہ اتنے دن بعد اب کہیں جا کر تو باس یہاں آئے ہیں۔ اب ان کے سامنے اِدھر کی چیزیں اُدھر کرائیں گی تو آپ کی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔" اور فریدہ کی زبانی ...ن کر کہ فہد فیکٹری کا باس ہے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی بلکہ ایک دم ہی یقین بھی نہیں آیا۔

"... یہ ۔ یہ تمہاری فیکٹری کے باس ہیں یہ مسٹر فہد۔ مگر وہ تو کوئی مسٹر تیمور ہیں جن کو مس رقیہ ساری رپورٹیں پیش کرتی رہتی ...تیں۔" اس نے اپنے یقین کو الفاظ میں ڈھالا۔

"...ہیں ۔ آپ کو یہ بھی پتا نہیں ۔ تیمور انہی کا نام تو ہے۔ فہد تو میں نے آپ کے منہ سے پہلی بار ہی سُنا ہے۔"

فریدہ ہنس کر بولی تو جواب میں وہ خاموش ہو گئی۔ اصل میں یہ سُن کر اسے ایک شاک سا لگا تھا کہ فہد فیکٹری کا باس ہے ...فریدہ کے مشورے پہ نہیں بلکہ اس شاک کی وجہ سے الجھا ہوا ذہن لیے اپنے آفس آ گئی ۔ اُف تو سعد نے میرے ساتھ فراڈ کیا ...ہے۔ اپنے بھائی کی فیکٹری میں ملازمت دلوا کر مجھ پر میری اوقات جتلانے کی کوشش کی ہے۔ تبھی تو کیسی دھونس جما رہا تھا مجھ ...پر۔ کیسا تپا دکھا رہا تھا اور کتنی حقارت سے کہہ رہا تھا کہ میں نے یہ دو ہزار کی رقم آپ کو بخشش میں نہیں دی ہے بلکہ قرض دی ...ہے اور یہ نوکری بھی اسی لیے دلوائی ہے کہ آپ دو تین قسطوں میں میرا پیسہ ادا کر دیں۔ تو بھلا پیسہ بھی ادا کروں گی تو اس کے بھائی ...کی جوتیاں سیدھی کرنے کا جو معاوضہ ملے گا اس سے۔ اُف حد ہو گئی خباثت کی بھی۔

"یہ تو میری کھلی توہین ہے۔"

اس کا میٹر گھوم گیا تھا اسی لیے کوئی اچھا خیال اس کے ذہن میں جگہ ہی نہیں پا رہا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس چیپ سی نوکری پر لعنت بھیج کر ابھی ابھی گھر چلی جائے اور وہ جانے کے لیے تیار بھی ہو ...گئی تھی کہ تبھی فیکٹری کی ایک پرانی ورکر نے اس کے آفس روم میں آ کر کہا۔

"مس خان باس نے آپ کو بلایا ہے۔" تو اس کا دل چاہا صاف انکار کر دے۔ مگر پھر اس نے سوچا کیوں نہ خود جا کر ...اُسے کہہ دے کہ مجھے تمہارے بھائی کی دی ہوئی اس بھیک کی ضرورت نہیں، لہٰذا میں اس ملازمت کو چھوڑنے کا تہیہ کر چکی ہوں بس اسی خیال کے تحت وہ خاموشی سے اٹھ کر اسی ورکر کے ساتھ اپنے آفس سے ــــ باہر نکل آئی۔ فہد شوروم کے کونے میں ...بڑی میز کے آگے اسی کرسی پر بیٹھا تھا جس پر رقیہ بیٹھی تھی۔ جب کہ رقیہ میز کے سرے پہ رکھی کرسی پر براجمان تھی۔ اس کی کرسی کے قریب ہی ایک اور خالی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ وہ فہد کے سامنے پہنچی تو وہ ایک بڑا سا رجسٹر کھولے اسے دیکھنے میں محو تھا۔ وہ میز کے قریب ...آ کر کھڑی ہوئی تو رقیہ نے فہد سے کہا

"سر! یہ مس خان آ گئی ہیں۔" تو فہد نے بدستور رجسٹر پہ نظریں جمائے جمائے کہا

"اچھا اچھا ٹھیک ہے آپ بیٹھ جائیں مس خان۔"

وہ اس وقت سچ مچ ایک باس کا کردار ادا کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک رجسٹر کے اوراق کو اُلٹتا پلٹتا رہا پھر اسے بند کر کے رقیہ ...سے مخاطب ہو کر بولا

"اور تو سب ٹھیک ہے لیکن ہماری اس فیکٹری کے لیے شروع سے لے کر اب تک جتنا اور جو بھی میٹریل آیا ہے اس ...کا اندراج اس رجسٹر میں نہیں کیا گیا جب کہ ایک معمولی سی سوئی کے بارے میں بھی لکھنا چاہیے تھا۔ اور یہ بھی کہ ہمارے یہاں ...اب تک کیا کیا اور کتنا مال آیا۔ کتنی سیل ہوئی۔ کتنا کنڈم ہوا اور کتنا گودام میں پڑا ہے اور اس کی کنڈیشن کیا ہے اور یہ بھی کہ روزانہ ...کتنے آرڈر بک ہوتے ہیں اور کس چیز کی ڈیمانڈ زیادہ ہوتی ہے ۔ اور پھر اتنی بڑی فیکٹری کے حسابات کے لیے چار رجسٹر ناکافی ...ہیں یعنی ایک رجسٹر ورکرز کی حاضری کا ہے۔ دوسرا تنخواہوں کا۔ تیسرے میں میٹریل کا اندراج ہے کہ کیا کیا خریدا گیا اور ...چوتھے میں سیل کا سارا حساب لکھا گیا ہے۔ کم از کم دو رجسٹر آپ اور بنایئے جن میں فروخت نہ ہو سکنے والے مال اور ردّی ...باتیں تفصیل سے ہونی چاہئیں۔"

"جی بہتر ہے سر، لیکن یہ کام تو اب ان کا ہے۔ یہ فیکٹری کو سپروائز کر رہی ہیں۔" رقیہ نے عنبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ان کا کام ضرور ہے مگر اب تک آپ ہولڈ کرتی آ رہی تھیں یہ کام۔ اب آپ ایسا کریں کہ کیشیئر، اکاؤنٹنٹ، اسٹور منیجر اور ...ان کے ساتھ مل کر تمام رجسٹرز میں سارا حساب کتاب درج کرالیں مگر یاد رہے کہ چھ رجسٹر ہونے چاہئیں۔ یہ سارا کام ایک ہفتے کے

اندر اندر مکمل ہونا چاہیے۔ انڈر اسٹینڈ۔"

اس نے آخری فقرہ خاصے ——— رعب داب کے ساتھ کہا۔

"بہتر سر۔ میں آج ہی سے یہ کام شروع کروا دوں گی۔" رقیہ نے نہایت تابعداری سے کہا۔ پھر وہ عنبر سے مخاطب ہو کر بولا۔

"آپ یہاں نئی نئی آئی ہیں مس خان اور یہاں کام کرنے کا تجربہ بھی آپ کے لیے نیا ہی ہو گا۔ مگر مجھے امید ہے آپ جلد ہی خود کو یہاں ایڈجسٹ کر لیں گی۔ مزید یہ کہ میں کسی بھی قسم کی بے اصولی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس بات کا آپ خاص طور پر خیال رکھیے گا۔ دیٹس آل۔ ناؤ یو مے گو۔"

وہ تو ایسا انجان بن گیا تھا جیسے اس سے کوئی شناسائی ہی نہ ہو اور بات بھی ایسی اکڑ مکڑ سے کر رہا تھا جیسے واقعی وہ اس کی ڈیل ہو۔ اسے تاؤ تو بہت آیا مگر رقیہ کے سامنے وہ اس کا اظہار نہ کر سکی۔ اور تیزی سے اُٹھ کر اپنے آفس میں چلی آئی۔ ہونہہ کہہ رہا تھا کہ میں بے اصولی کو برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ واہ خدا کی شان۔ پیسہ آ گیا ہے تو باس بن بیٹھا اور رعب گانٹھنے لگا وہ بھی رقیہ کے سامنے۔ جب کہ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ آج یہ نوکری چھوڑ دوں گی۔ اچھا ہے بعد میں پتا چلے گا تو ساری اکڑ مکڑ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ پتا نہیں کیسے مین رشتے دار ہوتے ہیں آج کل کے بھی جو اپنوں کو نیچا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

پھر وہ سوچنے لگی۔ اے کاش! یہ فہد اس فیکٹری کا باس نہ ہوتا تو میں کچھ عرصے تو جم کر یہاں کام کر لیتی۔ میں نے تو سوچا تھا سعد کا قرضہ اتار کر سب سے پہلے بیٹھک میں قالین بچھواؤں گی۔ پھر قسطوں پر ایک فرج خریدوں گی اور پھر پیسہ جمع کر کے ایک ٹی وی لے لوں گی۔ تھوڑا سا فرنیچر بھی گھر میں ڈال دوں گی۔ مگر یہ بھی میری قسمت کا فتور ہی ہے کہ جو ارادہ کرتی ہوں وہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔ اب نہ معلوم کب۔ کیسے اور کہاں دوسرا کوئی کام ملے۔ کوئی ہمدرد ہے نہ مددگار۔ ایک صرف عالیہ تھی جو تھوڑی بہت مدد کر دیا کرتی تھی سو اس سے بھی کٹ آف ہو گئی۔ وہ اپنے خیالات میں غلطاں اور پیچاں تھی کہ تبھی آہستہ سے دروازہ کھول کر فہد اندر داخل ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

"اوہ۔ یہاں کا موسم تو بہت خراب معلوم ہو رہا ہے۔ تیز ہواؤں کے ساتھ پتھر اور کنکر بھی برس رہے ہیں۔" وہ دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ وہ جل بھن کر رہ گئی۔

"آپ کی آمد کی غرض و غایت تو بعد میں پوچھوں گی مسٹر باس لیکن میں بھی یہ برداشت کرنے کی عادی نہیں ہوں کہ کوئی یوں دندناتا میرے کمرے میں گھسا چلا آئے۔"

"اوہ۔ تو آپ واقعی سنجیدگی سے خفا ہو گئی ہیں۔ ورنہ باہر تو میں اپنے باس ہونے کی فارمیلٹی نبھا رہا تھا۔ ڈیئر کزن۔"

"لیکن میرے لیے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا فہد۔ آپ باہر فارمیلٹی نبھا رہے تھے تو اندر بھی نبھا سکتے ہیں کیونکہ آپ باس ہیں آخر۔ کوئی معمولی شے تو نہیں۔" وہ طنز بھرے لہجے میں بولی۔

"ارے ارے کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ پھر یہی کہوں گا کہ چونکہ آپ کے لیے یہ ایک نیا تجربہ ہے اس لیے آپ بزنس کے قواعد و ضوابط کو سمجھنے سے قاصر ہی ہوں گی۔" فہد بولا۔

"قاصر ہونا دوسری بات۔ میں سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتی۔ مجھے افسوس تو اس بات پر ہے کہ آپ کے بھائی صاحب نے مجھ سے یہ بات چھپا کر کہ آپ اس فیکٹری کے باس ہیں مجھے سخت بے وقوف بنایا ہے۔" وہ بگڑے بگڑے انداز میں بولی۔

"ارے ارے یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، میں یہاں کا باس ضرور ہوں مگر باس نمبر ٹو۔ ورنہ اس فیکٹری کے اصل باس اور مالک تو بھائی جان ہی ہیں لیکن چونکہ وہ آج کل ایک پراجیکٹ کی تعمیر کے منصوبے پر کام کر رہے ہیں اس لیے انہوں نے مجھے یہاں کا چارج دے رکھا ہے مگر اس میں آپ کو بے وقوف بنانے کی بھلا کیا بات ہے۔ ممکن ہے انہوں نے یہ بات اس لیے آپ سے چھپائی ہو کہ آپ ان کی فیکٹری میں کام کرنے سے انکار نہ کر دیں۔" فہد نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"انکار اُس وقت تو نہیں مگر اب ضرور کر رہی ہوں۔ کیونکہ میں نے اس ملازمت کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" عنبر بولی۔

"ارے نہیں۔ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ میں تو اس وقت آپ کو آپ کا اپائنٹمنٹ لیٹر دینے یہاں آیا تھا۔ یہ لیجیے یہ رہا آپ کا اپائنٹمنٹ لیٹر۔ اور معلوم بھی ہے آپ کی سیلری ڈھائی ہزار کے بجائے ساڑھے تین ہزار رکھی گئی ہے علاوہ کنوینس کے۔"

فہد نے اپنے کوٹ کی جیب سے اس کا اپائنٹمنٹ لیٹر نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں فہد۔ بلکہ مسٹر تیمور۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپائنٹمنٹ لیٹر نہیں لے سکتی۔ ویسے آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے ازراہ ہمدردی یا دوسرے معنوں میں مجھ پر ترس کھا کر میری سیلری میں ایک ہزار روپے کا اضافہ کر دیا ہے۔"

اس کے ایک ایک لفظ میں طنز شامل تھا جب کہ فہد سے اس کی ایسی بے تکلفی بھی نہیں تھی۔ بس دوسری بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ فہد کو اس کی بات ناگوار تو گزری مگر بھائی کا خیال کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ارے واہ کیسے نہیں لیں گی آپ یہ اپائنٹمنٹ لیٹر۔ اب ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں کہ خود بہ نفسِ نفیس چل کر آپ کو لیٹر دینے آئیں اور آپ لینے سے انکار کر دیں۔"

"آپ کی اس کرم فرمائی کا شکریہ مگر آپ ـ"

"ارے یہ کیا آپ جناب لگا رکھی ہے آپ نے۔ آپ یہ بھی کان کھول کر سن لیں کہ فہد تیمور بھی اپنے نام کا ایک اور کام کا بہت پکا ہے۔ اگر آپ نے یہاں سے جانے کی کوشش کی تو پھر وہ ایک اور طریقے سے آپ کو یہاں لے آئے گا۔"

فہد یوں بولا جیسے دھمکی دے رہا ہو۔ کم از کم عنبر کو تو ایسا ہی لگا۔

"کیا مطلب۔ اور کس طریقے سے لاؤ گے تم مجھے؟" اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"بھابی بنا کر لاؤں گا وہ بھی بہت مخلصانہ طریقے سے۔" فہد نے ایک دم ہی شوخ ہو کر بتایا۔ اس کے تو سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی بڑی بات اس قدر بے باکی سے کہہ دے گا۔ وہ اس بُری طرح جھینپی کہ اتنی غلط اور بے ہودہ بات پر اپنے غصے کا اظہار بھی نہیں کر سکی اور کرسی سے اٹھ کر بولی۔

"تم بہت آؤٹ اسپوکن ہو۔ بے ہودہ کہیں کے۔ مگر مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔" اس نے کہا تو غصے میں ہی تھا مگر اس کے لہجے میں غصہ نہیں تنبیہہ تھی۔ وہ بھی کمزور سی۔

"آپ کو نہ سہی مجھے تو پسند ہے اور آپ کو ساتھ کے ساتھ تنبیہہ کیے دیتا ہوں کہ آپ نوکری چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیے گا ورنہ میں کل ہی بھائی جان اور قاضی سمیت آپ کے گھر پہنچ جاؤں گا۔"

فہد نے پوری قطعیت کے ساتھ کہا اور پھر اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور وہ گم صم سی اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ کہ اس کے پاس سوچنے کو رہ بھی کیا گیا تھا ماسوا اس کے جو فہد کہہ کر گیا تھا۔ مگر اس کے بارے میں وہ کچھ سوچنے کی روادار نہیں تھی

کیونکہ فہد نے جو کچھ کہا تھا وہ اس کے خیال میں ناممکن ہی تھا۔

بھلا جس شخص کا تصور تک گوارا نہ تھا اس سے وہ فہد کی خواہش کے مطابق کیسے کوئی ناتا جوڑ سکتی تھی۔

اگر یہ بات ممکن بھی ہوتی تو وہ اُس وقت اس مسئلے پر غور و خوض کرنے کی کوشش کرتی جب ریحان نے اسے سعد سے شادی کر لینے کا مشورہ دیا تھا بلکہ دوسرے معنوں میں سعد کا پرپوزل ہی دیا تھا۔

کیونکہ اس نے کہا تھا کہ خود اُس نے اس کے لیے سعد کا انتخاب کیا ہے۔

پھر اسے یاد آیا کہ سعد کی والدہ تو اس کی شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہتی ہیں اور اس معاملے میں اتنی سیریس ہیں کہ اس سے خفا ہونے کی وجہ سے کراچی بھی نہیں آئیں اور بھتیجی کے ساتھ ملتان میں ہی رہ رہی ہیں۔ پھر بھلا فہد نے یہ کیسے کہہ دیا کہ وہ مجھے اپنی بھابی بنانا چاہتا ہے۔ وہ بھی اتنی سنجیدگی اور قطعیت کے ساتھ۔

کیونکہ مذاق میں بھی وہ کوئی ایسی غیر ذمہ دارانہ بات نہیں کہہ سکتا اور پھر — میرے ساتھ اس نے رشتے داری ضرور نبھائی اخلاق اور مروت سے پیش آیا۔ لیکن مجھے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہاں اس فیکٹری میں اس کا کیا رتبہ اور اہمیت ہے وہ ایسی بے جا بات بلا وجہ تو نہیں کہہ سکتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دونوں بھائیوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ماں کی ضد کے خلاف یہ فیصلہ کیا ہو کہ وہ اپنی اپنی مرضی سے شادی کریں گے۔ خیر جو کچھ بھی سہی مگر میں کسی قیمت پر بھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔

اس کا موڈ اس قدر آف ہو گیا تھا کہ اسے ایک منٹ بھی وہاں رکنا دوبھر ہو رہا تھا۔ اور اسے اس کی بھی پروا نہ تھی کہ اس کے اٹھ کر چلے جانے پر فہد اُس سے باز پرس کرے گا یا رقیہ اعتراض کرے گی۔ یوں بھی وہ غصے میں ہوتی تھی تو کسی کو بھی خاطر میں نہیں

لاتی تھی۔ حتیٰ کہ ماں کی اتنی تابعدار ہونے کے باوجود ان سے بھی بحث کرنے کھڑی ہو جاتی تھی۔ اور اب وہ گھر جانے کا عزم کر چکی تھی تو کس کی مجال تھی جو اُسے روک سکتا۔ اپنی میز کی دراز یں مقفل کر کے اُس نے چابیاں میز پر رکھ دیں اور اپنا پرس اٹھا کر آفس سے باہر قدم ہی نکالا تھا کہ وہی دونوں ورکرز جن سے وہ ہینگرز کی ترتیب بدلوا رہی تھی اس کے نزدیک آ کر ان میں سے ایک نے کہا۔

”لنچ ٹائم ہو گیا ہے میڈم۔ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ کون سے ڈریسنز اگلی قطار میں رکھنے ہوں گے اور کون سے پچھلی قطاروں میں۔“ تو یہ کہنے کے بجائے کہ میں تو گھر جا رہی ہوں جاؤ تم خود ہی اپنی سمجھ کے مطابق ہینگرز کی ترتیب بدل دو۔“ اس نے کہا۔

”یہ تو میں خود ہی بتاؤں گی۔ مگر کیا تم دونوں نے لنچ لے لیا ہے؟“

”بس ایسے ہی تو چل ہیں آیا کر کے حلق سے نوالے اتارے۔ آخر کام بھی تو مکمل کرنا تھا نا۔“ دوسری ورکر بولی۔

”مگر آپ نے تو ابھی لنچ نہیں لیا نا۔ آپ کا لنچ تو راحت ابھی لے کر آتا ہی ہو گا۔“ پہلی بولی۔

”نہیں، آج مجھے بھوک نہیں ہے اس لیے میں نے انڑکام پر اُسے منع کر دیا ہے۔“ عنبر بولی۔ اُس کا موڈ اب بھی آف تھا۔

”تو پھر چلو۔ جلدی کرو۔ پتا ہے بیس منٹ کے اندر اندر سارا کام ختم کرنا ہے۔“ پہلی ورکر نے دوسری ورکر سے کہا اور پھر عنبر سے بولی

”آئیں میڈم آپ بھی آجائیں ورنہ باس گھر چلے بھی گئے ہیں تب بھی یہ میڈم رقیہ اُن سے ہماری شکایت لگا دے گی۔“

”ہاں۔ یہ اسی طرح جھوٹی سچی چغلیاں لگا کر کئی ورکرز کو نکلوا چکی ہے۔“ دوسری نے پہلی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

اور وہ جو ایک تذبذب کے عالم میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ گھر چلی جائے یا پھر یہ کام کروا دے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چپ چاپ اُن دونوں کے پیچھے چل دی۔

پھر اُس نے ہینگرز اور شوکیسز کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ رضیہ اپنی جگہ سے غائب تھی۔ غالباً وہ لنچ کھانے گئی ہوئی تھی۔ اس نے پہلی والی ورکر سے پوچھا۔

”یہ فریدہ کہاں چلی گئی رضیہ۔ صبح سے تو وہی اس کام میں لگی ہوئی تھی۔

”وہ فریدہ کو اس کا خاوند چھٹی کرا کے لے گیا ہے۔ اس کے بچے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا نا۔ سر میں چوٹ آئی ہے۔“ اور جواب میں اس نے

”اوہ“ کہہ کر افسوس کا اظہار کیا۔ گھر جانے کی تو ٹھان ہی چکی تھی۔ مگر اس نے سوچا۔ پہلے یہ ہینگرز کی ترتیب ٹھیک کرا نی چاہیے۔ ورنہ یہ کام ادھورا ہی پڑا رہ جائے گا۔

پھر اس نے شوکیسوں سے گزشتہ ماہ کے تیار شدہ ڈریسز نکلوائے اور اُن کی جگہ نئے ڈریس رکھوائے۔ اسی طرح ہینگرز پر بھی پہلی قطار میں بالکل نئے ڈریسز اور پچھلی قطاروں میں ایک نیا تیار شدہ اور ایک پرانا سلا ہوا۔ رقیہ نے بھی آکر اسے کام کراتے دیکھا مگر قریب آئی نہ اس سے کچھ کہا۔ منہ پھلائے چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”دیکھا تم نے ثریا۔ یہ ابھی نہیں آئے گی بلکہ ہمارے کام میں عیب نکالنے اسی وقت آئے گی جب یہ کام مکمل ہو جائے گا“ رضیہ نے نیچی آواز میں اپنی ساتھی ورکر ثریا سے کہا۔

”سنو۔ میں یہاں موجود ہوں اور میرے سامنے کسی کی مجال نہیں جو تمہارے کاموں میں عیب نکالے۔ یوں بھی یہ کام میں تم سے کروا رہی ہوں۔“ اسے ان دونوں کی گفتگو نامناسب لگی تو اس نے دونوں کو ڈانٹ دیا۔ جواب میں اس کی نظر بچا کر رضیہ اور ثریا ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

رضیہ نے تو کہا تھا کہ وہ یہ کام بیس منٹ کے اندر اندر ختم کرے گی مگر وہاں دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ عنبر تو ایک اسٹول پر بیٹھ گئی تھی مگر وہ دونوں کھڑے کھڑے ہی سارا کام کرتی رہیں۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ اس اثنا میں کوئی گاہک نہیں آیا۔ ورنہ گاہکوں کو ڈیل کرنا اس کا کام تھا نہ وہ گاہکوں کے سامنے پڑنا پسند ہی کرتی تھی۔

اور وہ تو گھر جانے کی غرض سے اپنے آفس سے نکلی تھی اور یہ سوچے بیٹھی تھی کہ کام ختم کراتے ہی چلی جائے گی۔ مگر اب ایس نہیں کہ اسی وقت اسٹور منیجر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جو دیکھا دیکھا سا لگ رہا تھا۔ کہاں دیکھا تھا، کب دیکھا تھا یہ بالکل یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ مگر وہ شخص بہت عمدہ لباس میں ملبوس تھا اور گاہک کی حیثیت سے ہی آیا تھا۔ کیونکہ آتے ہی اُس نے بانچتی نظروں سے ہینگرز پر لٹکے ہوئے ڈریسز کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ جب کہ اُس سے کچھ کہہ کر اسٹور منیجر عنبر کی طرف بڑھتا چلا آیا اور اس کے قریب ہی رک بولا۔

”السلام علیکم میڈم خان۔“

”وعلیکم السلام۔“ وہ جو حافظے پر زور ڈال کر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی اُس شخص کو اس نے کہاں دیکھا ہے اس بری طرح چونک کر اسٹور منیجر قیوم شاہ کے سلام کا جواب دیا۔

”وہ میں باس کے ساتھ آفس گیا ہوا تھا۔ ان کا آرڈر ہے کہ آج ہی گودام کی جانچ پڑتال کا کام مکمل ہو جانا چاہیے۔ آپ میڈم رقیہ میرے ساتھ چل کر سارا مال چیک کرا لیں۔ باقی رجسٹروں میں اندراج کا کام تو پھر کسی روز فرصت سے کریں گے۔ یہ چار نئے رجسٹرز میں خرید لایا ہوں۔ میں نے باس کو یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ حاضری اور تنخواہوں کے رجسٹرز کو بدلنے کی ضرورت نہیں، وہ ان کاروباری معاملات سے بالکل علیحدہ ہیں۔“

قیوم شاہ نے اسے کھڑے ہی کھڑے ساری تفصیل سنائی تو اس کے آخری فقرے پر وہ تھوڑا سا چمک کر بولی۔

”لیکن یہ دونوں رجسٹرز کاروباری معاملات سے علیحدہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ حاضریوں کی اوسط نکال کر کم از کم۔ یہ اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے کہ کون سی ورکر کس قاعدے سے کام کرتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں ورکر نے کتنی چھٹیاں کیں۔ کون وقت پر پہنچی اور کون دیر سے آئی۔ رہ گیا تنخواہوں کا رجسٹر تو سب سے زیادہ اہمیت تو ان ساری چیزوں میں وہی رکھتا ہے۔ ساری ورکرز کی بندھی تنخواہیں مقرر ہیں مگر رجسٹر سے یہ تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کس نے پیشگی تنخواہ لی۔ اور لی تو کتنی لی۔ غیر حاضری پر کس کی تنخواہ میں سے کتنا کاٹا گیا یا پھر کچھ بھی نہیں کاٹا گیا۔ کس نے کتنا اوور ٹائم کیا اور اسے وقت کے مطابق کتنا پے کیا گیا۔ یہ تو سب سے اہم اور ضروری باتیں ہیں مسٹر قیوم۔“

اور جواب میں مسٹر کا منہ بن گیا اور وہ ادھر چونکہ ہینگرز کی قطاروں سے پیچھے ہی بیٹھی تھی اُس کی آواز اس نو وارد گاہک کے کانوں تک پہنچی تو اس نے قطار کے سرے سے منہ نکال کر اُس کی طرف دیکھا اور بری طرح چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ عنبر نے بھی اسے جھکتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا۔ اس پر قیوم شاہ نے جب یہ کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے میڈم لیکن جب باس نے ان سب حسابات کا رجسٹر بنانے کی ضرورت نہیں سمجھی تو پھر ہمیں اس جھنجٹ میں اپنا سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ تو میرے ساتھ چل کر ذرا گودام کی چیزیں چیک کر لیں۔“ تو عنبر جو گھر جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی درشتی سے بولی۔

”یہ کام مجھ سے بہتر رقیہ انجام دے سکتی ہیں۔ یوں بھی وہ وہاں کی نگراں ہیں۔ اور یہاں کی ہر چیز یہ اُن کا ہی کنٹرول ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں میڈم رقیہ کو ہی لے جاتا ہوں۔ مگر یہ کام باس نے آپ کے ذمے ہی ڈالا تھا۔“ قیوم شاہ نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی کہ رقیہ آ گئی۔

”کیوں جی کیا چکر ہے منیجر صاحب؟ آپ تو یہیں چپک کر رہ گئے۔ کیا ادھر سریش لگا ہوا ہے۔“ رقیہ نے کولہوں پہ ہاتھ رکھ کر بڑی معنی خیزی سے کہا۔ تو قیوم شاہ رخ پھیر کر عنبر سے اپنی مسکراہٹ چھپا کر بولا۔

”نہیں۔ وہ میں مس خان سے باتوں میں لگ گیا تھا۔ باس کا آرڈر ہے کہ آج ہی گودام کی چیکنگ کر کے سارے سامان کا اندراج رجسٹر میں کر لیا جائے۔“

”باس کا آرڈر ہے تو پھر آپ گودام میں جائیں۔ یہاں کھڑے وقت ضائع کیوں کر رہے ہیں؟“ رقیہ تڑختے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مگر آپ دونوں میں سے ایک کو میرے ساتھ چلنا چاہیے۔ کیونکہ آپ ہی تو سامان چیک کریں گی۔“ قیوم شاہ بولا۔

”تو پھر ان کو ساتھ لے جائیے۔ انتظار کس بات کا ہے؟“ رقیہ بولی۔

”نہیں، آپ ہی چلی جائیں رقیہ کیونکہ مجھے تو ان کاموں کا بالکل تجربہ نہیں۔ یوں بھی آپ یہاں کی نگراں ہیں اور یہاں کا نظم و نسق اب تک آپ نے ہی سنبھال رکھا ہے۔ آپ ہی اس کام کو مجھ سے بہتر طور پر کرسکیں گی۔“ قیوم شاہ کے کچھ کہنے سے قبل ہی عنبر نے رقیہ سے کہا۔ مگر وہ تو کچھ اس طرح بھڑک بولی جیسے عنبر نے اس کے شتابہ لگادیا ہو۔

”ارے واہ میں چلی جاؤں۔ اور تم کیا اپنی خوبصورتی دکھانے یہاں آتی ہو۔ کسی کام کا تجربہ ہے نہ کچھ کر ہی سکتی ہو تو پھر گھر بیٹھی ہوتیں۔ یہاں آکر مفت میں باس کی جیبیں خالی کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔“

اور وہ جو اس بیہودہ لب و لہجے اور رکیک باتوں کی بالکل عادی نہ تھی وہ ڈپٹ کر رقیہ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

”شٹ اپ یو ایڈیٹ۔ تم انتہائی بے ہودہ اور بداخلاق عورت ہو۔ تمہاری طرح مجھے تمہارے باس کی جیبیں خالی کرنے کا بالکل شوق نہیں۔ میں تو اس نوکری پر لعنت بھیجنے کا تہیہ بہت پہلے ہی کرچکی تھی اور اس وقت گھر جانے کے ارادے سے ہی یہاں آکر بیٹھی تھی۔ لو یہ میرا اپائنٹمنٹ لیٹر اسے تم اپنے گلے میں تعویذ بنا کر ڈال لینا۔“ اپنی بات کہتے ہوئے عنبر نے اپائنٹمنٹ لیٹر اپنے پرس سے نکالا تھا جسے رقیہ کی طرف اچھال کر عنبر ہینگرز کی آخری قطار کے پیچھے سے اپنا راستہ بناتی شوروم سے باہر نکل گئی۔

گاہک اب بھی وہیں موجود تھا اور بڑی حیرت اور تعجب سے یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ گو کاؤنٹر پر پڑے اپنے مطلوبہ ڈریسز کی طرف متوجہ تھا مگر اس کی سماعت تو بیدار تھی۔ اس نے عنبر کو باہر کو باہر نکلتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔

”لیں دیکھیں بھلا کیسی بد دماغ اور لڑاکا لڑکی ہے۔ اس کے مزاج تو ملتے ہی نہیں۔ خود کو یوں ظاہر کرتی ہے جیسے کسی لاٹ گورنر کی بیٹی ہے۔ اب میں نے اسے ایسا کیا کہا تھا جو یہ میرے متھے پے گئی۔ منیجر صاحب جو کچھ ہوا آپ کے سامنے ہی ہوا ہے۔ آپ تو گواہ ہیں کہ میں نے اسے نوکری چھوڑ کر جانے پر مجبور نہیں کیا۔ اب اگر اس نے باس سے میری شکایت کی تو۔“

”اگر اس نے باس سے آپ کی شکایت بھی کی تو باس آپ سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کتنی محنت سے کام کرتی ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس فیکٹری کو ترقی دینے کا سہرا بھی آپ کے ہی سر ہے۔“ قیوم شاہ بولا۔

”ہاں، آپ خود بھی بہت اچھے ہیں اسی لیے میری محنت کو سراہ رہے ہیں۔ ورنہ آج کل تو زیادہ تر لوگ دوسروں کے کام میں کیڑے نکالتے ہیں۔ آئیے میں ہی چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔ رضیہ تو بھی میرے ساتھ آ۔“ رقیہ نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہہ کر رضیہ کو پکارا۔

”ہاں چلیں۔ اس لڑکی نے تو خواہ مخواہ ہی اتنا ٹائم ویسٹ کرادیا۔ ویسے یہ ہے کون۔ اور کس کی سفارش پر یہاں رکھی گئی ہے۔“ قیوم شاہ نے اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھ کر بڑی کوفت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو پتا نہیں کہ کون ہے مگر شاید بڑے باس کی سفارش پر ہی آئی ہے۔ اصل میں تو انہوں نے ہی اس کا دماغ آسمان پر چڑھایا ہے۔ بڑی منتیں کررہے تھے اس دن وہ اس کی۔“ رقیہ جلے کٹے لہجے میں بولی اور پھر پہلے روز کی ساری روداد قیوم شاہ کو سنادی۔

”میرے خیال میں تو معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ چھوٹا باس بھی اس سے بہت گھل مل کر باتیں کررہا تھا۔“ رقیہ نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیا۔

”ہاں دیکھو تو بھلا۔ اس کا اپائنٹمنٹ لیٹر کسی چپڑاسی کے ہاتھ بھجوانے کے بجائے خود لے کر گیا تھا اس کے گھر میں۔“ رقیہ بولی۔

”اصل میں بہت خوبصورت ہے نا اور خوبصورت چیزوں پر یہ دولت مند لوگ فوراً ہی پھسل جاتے ہیں۔ خیر آیئے اب گودام میں چلتے ہیں۔“ قیوم شاہ نے اپنی قیاس آرائی کرنے کے بعد اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ تو وہ دونوں بھی اس کے ساتھ ہولیں۔

گاہک ابھی تک دوکان میں ہی موجود تھا اور ڈریسز پسند کرنے کے بہانے کاؤنٹر کے آگے کھڑا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ ان کے جاتے ہی اس نے ان چند ڈریسز کی جنہیں وہ پسند کرچکا تھا قیمت ادا کی اور پھر ہینگر سمیت۔ یعنی انہیں پیکٹ میں بندھوائے بغیر ہاتھ میں لٹکائے شوروم سے باہر نکل گیا۔ باہر آکر وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مگر جب عنبر کا کہیں دور دور تک نشان بھی نظر نہ آیا تو وہ فٹ پاتھ کے آگے کھڑی اپنی نئی ماڈل کی لانسر میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہ فیکٹری سے تو سخت غصے میں بھری باہر آئی تھی اور اسی کیفیت میں سامنے سے جاتی ایک موٹر رکشہ کو روک کر اس میں بیٹھی تھی مگر گھر آتے آتے اس نے چند مصلحتوں کے پیش نظر کسی طرح اپنے غصے پر قابو پا ہی لیا۔ کیونکہ اگر وہ عالم طیش میں گھر پہنچ جاتی وہ بھی وقت سے پہلے تو اس کی والدہ اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھتیں۔ جب کہ وہ ان کے علم میں یہ نہیں لانا چاہتی تھی کہ اس فیکٹری کا مالک یا باس سعد ہی ہے۔ اور اس کا چھوٹا بھائی اس فیکٹری کو چلا رہا تھا۔ نیز یہ بھی کہ ملازمت چھوڑ آئی ہے۔ کس وجہ سے چھوڑ آئی؟ ماں کے ان سوالوں کا جواب دینے سے وہ خود کو قاصر سمجھ رہی تھی۔ گھر پہنچتے ہی وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔

ماں اور بہن نے چھوٹتے ہی پوچھا کہ وقت سے پہلے کیسے آگئی ہے۔ بہانا تو اس کے پاس پہلے سے ہی تیار تھا۔ مضمحل سے لہجے میں بولی۔

”بس وہ صبح ہی سے ہلکا ہلکا درد تھا سر میں۔ دوپہر تک اتنا شدید ہوگیا کہ میں برداشت نہ کرسکی اور چھٹی لے کر گھر آگئی۔“

”ارے تو تم نے کچھ کھایا پیا بھی ۔۔۔؟“ ماں نے پوچھا۔

”نہیں۔ درد میں کچھ کھایا جاتا بھلا۔ میں تو بس کپڑے بدلتے ہی لیٹ جاؤں گی۔“

”مگر تھوڑا سا ہی سہی کچھ کھا ضرور لو۔ ممکن ہے پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے ہی درد ہورہا ہو۔“ ماں نے کہا۔

”نہیں امی۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں کھایا جائے گا۔ میری طبیعت مالش کررہی ہے۔ میں تو اب سوؤں گی۔“ وہ اپنے کپڑے اٹھاتی ہوئی بولی۔

”مگر آپا وہاں تو میڈیکل مفت ہے۔ آپ نے کسی ڈاکٹر کو دکھا کر کوئی دوا لے لی ہوتی۔“ چھوٹی بولی۔

”میڈیکل مفت ضرور ہے مگر وہاں کوئی ڈاکٹر تو بیٹھا نہیں ہوتا۔ وہ تو کسی ڈاکٹر کے کلینک پر جاکر اسے دکھانا پڑتا ہے جو دوا وہ لکھ کر دے اس کا بل فیکٹری والوں کے پاس جمع کرانا پڑتا ہے۔ جب کہیں جاکر پیسے ملتے ہیں۔ اب میرا کیس ایسا بھی نہیں تھا جو میں یہ ساری کھکیڑ اٹھاتی۔“

اس نے بیزاری سے کہا اور اپنے کپڑے اٹھا کر غسل خانے کا رخ کیا۔ اور پھر پڑ کر جو سوئی تو شام ہی کو اٹھی۔ اٹھنے کے بعد بھی یہی ظاہر کرتی رہی کہ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ کیونکہ اگلے روز بھی تو اسی عذر کے بل بوتے پر فیکٹری سے چھٹی کرنی تھی۔ گو ماں، بہن اور بھائی نے کتنا کہا بھی ۔۔۔ بہت اصرار بھی کیا کہ اور کچھ نہیں تو عذیر کسی ڈاکٹر کو اس کی کیفیت بتا کر اس کی تجویز کردہ دوا لادے۔ مگر وہ انکار کرتی رہی۔ البتہ ماں کے کہنے پر اس نے شام کا کھانا ضرور کھایا کہ یوں بھی بھوک کے مارے انتڑیوں میں بل پڑ رہے تھے۔

ایک تو غصہ اس پر سے نوکری چھوڑ آئی تھی۔ اس پر مستزاد سارا دن بھوک کی تکلیف برداشت کرتی رہی۔ شام تک منہ اتر گیا تھا کہ ماں اور بہن یہی سمجھیں کہ وہ واقعی بیمار ہے۔ چھوٹی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے زبردستی اسے ڈسپرین کی دو گولیاں کھلادی تھیں۔

”آپا! اگر یہ درد صبح تک نہ گیا تو پھر آپ آفس نہیں جایئے گا۔“ اس نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

”ارے نہیں اگر چلا بھی گیا تب بھی یہ کل کام پر نہیں جائے گی۔ ذرا صورت تو دیکھو اس کی۔ ایک ہی دن میں کیسی اتر گئی ہے۔“ ماں نے اپنی ممتا میں یہ کہہ کر گویا اس کی ایک بہت بڑی مشکل آسان کردی تھی۔ ایک بہت بڑی پریشانی سے اسے نجات دلادی تھی۔

”نہیں امی ۔۔۔ اب تو درد کافی کم ہوگیا ہے۔ صبح تک بالکل جاتا رہے گا۔ پھر خواہ مخواہ چھٹی کرکے کیا کروں گی؟“ اس نے یہ بات کہی تاکہ ماں اس کے باہر قدم نکالنے پر پابندی لگادیں۔

”آرام کروگی اور کیا کروگی۔ ارے ہاں وہی مثل ہے کہ جان ہے تو جہان ہے۔ صحت ہوگی تو کام بھی کرسکوگی اور تمہارے ایک دن کی چھٹی کرنے سے ان لوگوں کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ ماں نے کہا۔

”ہاں آپا۔ امی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ ایک دن کی چھٹی سے بھلا کیا فرق پڑ جائے گا۔ تنخواہ ہی کٹے گی نا ایک دن کی تو وہ

آپ کی صحت سے زیادہ نہیں ہے۔" چھوٹی نے بھی ماں کی تائید میں کہا تو وہ بڑی تابعداری سے بولی۔

"اچھا اگر امی کی مرضی یہی ہے کہ میں کل کی چھٹی کر لوں تو پھر یہی سہی۔" اور سادہ لوح ماں اس کی اس بات سے اتنی خوش ہوئیں کہ دل ہی دل میں اسے دعائیں دینے لگیں کہ ان کے لیے وہ کماؤ پوت کی حیثیت ہی رکھتی تھی۔ اور جب سے اس نے نوکری کی تھی کم از کم کھانے پینے اور کپڑے لتے کا تو آرام ہو گیا تھا۔ یوں بھی وہ اپنی ساری تنخواہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیتی تھی جس میں سے وہ صرف ہزار روپے نکالتیں اور باقی پیسے اسے واپس کر دیتیں۔ کیونکہ انہیں بھی معلوم تھا کہ وہ سعد کا قرضہ لوٹانے کی غرض سے پیسے جمع کر رہی ہے اور ابھی یہ تیسرا مہینہ ہی تو چل رہا تھا۔ اسے فیکٹری میں ملازمت کرتے۔

بہرحال وہ دن تو جوں توں کر کے گزر ہی گیا۔ اس کے سر میں گو نام کو بھی درد نہ تھا مگر سوچتے سوچتے ضرور اس کا ذہن دکھنے لگا۔

اسے غصہ، کوفت، رنج و افسوس تو اس بات پر تھا کہ سعد نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اسے حقیقت سے لاعلم رکھ کر اسے بے وقوف بنایا ہے بلکہ دوسرے معنوں میں اس کی توہین کی ہے۔ یہ جتا کر کہ دیکھو تم اس قابل بھی نہیں ہو کہ کوئی اچھی ملازمت حاصل کر سکو۔

میرا قرض اتار سکو۔ اس لیے میں اپنی فیکٹری میں تمہیں ملازمت دلوا رہا ہوں۔ یا میں نے تمہیں یہ ملازمت دلوائی ہے اور یہ بات تو اس نے بہت واضح طور پر مین روڈ پر اسے ڈراپ کرتے وقت کہی تھی اور یہ ساری باتیں جن کا آج اس پر انکشاف ہوا تھا یہ تو بعد کی باتیں تھیں۔ اس پر فہد نے بھی کمینگی کی انتہا کر دی تھی۔ یہ کہہ کر کہ وہ اسے اپنی بھابی بنا کر لائے گا۔ اور پھر دھونس بھی کتنی گانٹھ رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ دل سے نہیں بلکہ دوسرے کی زبان سے محض دوسرے کی خواہش کا احترام کرنے کی غرض سے کہہ رہا ہو۔

کیونکہ اس کی نگاہیں، اس کا انداز ـــ اس کے لب و لہجے کی چغلی کھا رہا تھا۔ چنانچہ وہ اس کے گھر کبھی نہیں آئے گا۔

اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ بالفرض اگر وہ آیا بھی تو اس کے پاس نوکری چھوڑنے کا یہ عذر بھی تو موجود ہو گا کہ اس نے یہ نوکری اپنی مرضی سے نہیں بلکہ رقیہ کے معاندانہ رویے اور اس کے ساتھ منہ ماری کرنے کی وجہ سے ہی چھوڑی ہے۔ یہ سب سوچنے کے باوجود بھی اگلے روز وہ بڑی ہراساں رہی۔

اس روز اتفاق سے محلے کے ایک متمول شخص ٹھیکیدار نور الٰہی کے ہاں کوئی تقریب تھی جس کا بلاوا صبح ہی صبح ان کا بیٹا دے کر گیا تھا۔ چھوٹی اس وقت کالج جانے کے لیے نکل ہی رہی تھی کہ عذیر نے آ کر ایک دعوتی کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چھوٹی نے ایک نظر کارڈ پر ڈالی اور پھر بھاگتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

"امی۔ امی۔ یہ ٹھیکیدار صاحب کے یہاں سے انویٹیشن کارڈ آیا ہے۔ پتا ہے آپا۔ ان کی چھوٹی بہو کے یہاں اکٹھے دو دو بیٹے ہوئے ہیں نا بس اسی خوشی میں۔"

"دو۔ دو یعنی چار بیٹے۔" عنبر نے اس کی بات کاٹ کر انتہائی تعجب سے پوچھا۔

"ہائے نہیں کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ میرا مطلب ہے جڑواں بیٹے ہیں دو ان کے یہاں اس خوشی میں انہوں نے محفل میلاد بھی منعقد کی ہے اور رات کا کھانا بھی سارے محلے والوں کو دیا ہے۔" چھوٹی نے بتایا اور پھر ماں سے بولی۔

"امی! میں تو ضرور جاؤں گی اس دعوت میں۔ آج اتفاق سے آخری پیریڈ بھی خالی ہو گا اس لیے جلدی آ جاؤں گی۔"

"ہاں ہاں محلے داری کی بات ہے۔ ایک دوسرے کے خوشی اور غم میں شریک ہونا ثواب کا کام ہے بیٹی۔ میں بھی ضرور جاؤں گی۔" ماں نے یوں خوش ہو کر کہا جیسے ان کے اپنے گھر میں کوئی تقریب ہونے والی ہو۔

"میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ امی۔ یوں بھی ایک عرصے سے مجھے میلاد شریف کی محفل میں شریک ہونے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی ایسا ہی ہے تو رات کا کھانا ان کے ہاں نہیں کھاؤں گی۔" عنبر بولی۔

"اے ایسا ویسا کیا ہے۔ جب انہوں نے ہمیں رات کے کھانے پر بلایا ہے تو پھر تم کیوں نہیں کھاؤ گی۔ تمہارا تو کوئی پرہیز بھی نہیں ہے۔ آرام سے رات کا کھانا کھا کر ہی آنا۔"

ماں نے کہا تو عنبر خاموش ہو گئی۔ چھوٹی تو اسی وقت چلی گئی تھی۔ مگر چھوٹی کی واپسی تک وہ ایک خلجان میں مبتلا رہی

پھر آہٹ پر یہ دھڑکا کہ کہیں فہد نہ آ گیا ہو۔ اسی خدشے کے تحت اس نے پہلے جلد جلد ماں کو تیار کرایا پھر خود بھی تیار ہو کر بیٹھ گئی۔

ماں نے کہا بھی کہ اب ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ دیکھ لینا میلاد شریف شروع ہوتے ہوتے چار پانچ بج جائیں گے کیونکہ ہمارے دیسی حساب کتاب میں کب کوئی وقت پر آتا ہے اور مہمان اگر دیر سے بھی آتے ہیں تو میلاد پڑھنے والیاں انہیں بھی انتظار کروا کے آتی ہیں۔ چھوٹی کو تو آ لینے دو۔ پھر سب ساتھ ہی چلیں گے۔ مگر عنبر جو خود کو اس وقت مجسم اخلاق اور سب سے زیادہ محلے داری نبھانے والی ظاہر کر رہی تھی اس نے کہا۔

"جائیں گے تو ہم چھوٹی کے آنے کے بعد ہی۔ مگر ذرا پہلے ہی جائیں گے۔ امی اب عین وقت کے وقت جانا بھی تو اچھا نہیں لگتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چھوتا اتارنے یا مٹھائی بٹورنے کی غرض سے آئے ہیں۔ پہلے سے جا کر ان کی خوشی میں شریک ہوں گے۔ ان کو مبارکباد دیں گے۔ اور آپ دے کیا رہی ہیں ٹھیکیدار کے پوتوں کو۔۔؟"

یہ پوچھ کر تو عنبر نے بات کا رخ ہی دوسری طرف موڑ دیا۔

"اے میں کیوں دینے لگی کسی کو کچھ۔ میرے یہاں کسی نے کیا دیا ہے۔ میں تو بس یونہی محلے داری نبھانے جا رہی ہوں۔ اور بس۔" خورشید جہاں کچھ دینے کی بات پر چڑ کر بولیں۔

"لیکن ہماری بات تو دوسری ہے امی۔ ہمارے یہاں آج تک کوئی تقریب ہی کہاں ہوئی ہے جو کوئی ہمیں کچھ دیتا۔ اور یہ تو دینے کی ہی رسم ہے۔ عقیقہ کیا ہے نا ٹھیکیدار نے پوتوں کا۔ کم از کم میں تو خالی ہاتھ جانا کبھی پسند نہیں کروں گی۔" عنبر نے کہا۔

"مگر میرے پاس اتنا ہے ہی کہاں جو کسی کو کچھ دوں۔ اور جو بھی ہے اس میں سے دوں گی تو یہ سمجھو کہ تم بچوں کا پیٹ کاٹ رہی دوں گی۔" ماں نے دینے دلانے سے کتراتے ہوئے کہا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں اور یہ بتائیں کہ کتنے دینا چاہ رہی ہیں آپ؟" عنبر نے پوچھا۔

"اے یہی پچیس روپے ٹھیک رہیں گے۔ بلکہ گیارہ گیارہ روپے دے دوں گی دونوں کو۔" خورشید نے کہا تو عنبر اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔

"اُف۔ آپ بھی حد کرتی ہیں۔ صرف گیارہ گیارہ روپے امی! کیا خیرات میں دے رہی ہیں یہ اتنے کم پیسے۔ معلوم بھی ہے ایک مرتبہ تائی کی ایک رشتے کی بہن نے قمرہ کے بچوں کو پچیس پچیس روپے دیے تھے تو تائی نے کہا تھا کہ بعض لوگوں کو اتنی تمیز بھی نہیں ہوتی کہ کس کو کیا اور کتنا دینا چاہیے۔ بس آنکھیں بند کر کے یوں دے دیتے ہیں جیسے خیرات دے رہے ہوں اور پھر ان دونوں کے سامنے ہی وہ پچیس پچیس روپے قمرہ کے بچے کے اوپر سے اتار کر اپنی ایک ملازمہ کے ہاتھ میں تھما دیے تھے۔"

"اگر تھما دیے تھے تو یہ تمہاری تائی کی کم ظرفی تھی۔ ورنہ احسان تو ایک تنکے کا بھی ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق چار آنے بھی دے تو انہیں بھی خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہیے۔ ویسے تمہارے دماغ میں جو یہ اونچا بننے کی سنک پیدا ہو گئی ہے یہ تمہارے تایا اور تائی کے ماحول کی وجہ سے ہی ہوئی ہے۔ مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ تم نے میری تربیت کا ذرا سا بھی اثر نہیں لیا۔"

ماں نے ملامت بھرے لہجے میں افسوس کا اظہار کیا تو وہ بات کو ٹالتی ہوئی بولی۔

"امی! چھوڑیں ان باتوں کو اور اس وقت تو وہاں چلنے کی تیاری کریں۔ یہ لیں سو روپے۔ اپنی طرف سے دونوں بچوں کو پچاس پچاس روپے دے دیجیے گا۔ دیکھیں امی، ان سے کسی کا پیٹ کٹے گا نہ حق ہی مارا جائے گا کیونکہ یہ میں آپ کو دے رہی ہوں۔"

اس نے بات کے اختتام پر سو کا نوٹ ماں کی طرف بڑھایا جسے وہ اس کے ہاتھ سے لے کر بولیں۔

"تم بھی دے رہی ہو تو تمہاری بھی بہت گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔ بس پچیس پچیس بہت ہوں گے۔ دیکھو بیٹی ایسے لین دین میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ دوسرا تمہیں واپس کیا کرے گا۔ تو یہاں دور دور تک واپسی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔"

ماں نے سمجھایا تو وہ جو ان کی باتوں سے زچ ہو گئی تھی اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہے امی جیسے آپ کی مرضی۔ مگر۔ میں غیروں سے ایسے لین دین کی توقع رکھنے کی سرے سے قائل ہی نہیں ہوں۔ ہاں

البتہ رشتے داروں سے ایسی توقع رکھی جاسکتی ہے۔"

"خیر، تمہارا کیا ہے تم تو ہو ہی سدا سے شاہ خرچ اور دریا دل۔ بچپن میں بھی تم اپنے پیسے اپنی سہیلیوں پر لٹا آتی تھیں۔" ماں نے کہا اور اٹھ کر اپنے بکس میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔

"لو یہ پچاس روپے سنبھال کر رکھو۔ بس پچاس بہت ہیں۔ وہ میں خود دے دوں گی۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ میں نے غربت اور مفلسی دیکھی ہے تو میں پائی پائی پہ جان دیتی ہوں۔ دل تو میرا بھی تھا بلکہ ہے مگر میں نے جس طرح ترس ترس کر زندگی گزاری ہے اور کیسے کیسے اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹا ہے وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مگر میں نے بری حالت میں نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا اور نہ کسی سے ایک پائی بھی قرض لی۔ کیونکہ قرض کا چکر ایک بار چل جائے تو پھر انسان سود کے پہیے کی طرح اس میں بندھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک وہ تمہارے مرحوم دادا تھے بے چارے۔ اس مکان کے لیے محکمے سے قرض لیا تھا جو مرتے دم تک انہیں اپنا پیٹ کاٹ کر قرض اتارنا پڑا تھا۔ بیٹے تو اس قابل ہی نہیں تھے کہ باپ کا قرضہ اتار سکتے۔ تم بھی ذرا دیکھ بھال کے بلکہ ہاتھ روک کر خرچ کیا کرو کہ ڈھکی چال چلنے میں انسان کا اپنا ہی فائدہ ہوتا ہے۔"

خورشید جہاں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ناصحانہ انداز میں کہا تو اس نے بھی سوچا کہ امی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ پیسہ تو آج کل پانی کی طرح بہہ کر دیکھتے دیکھتے خرچ ہو جاتا ہے۔ اور اب تو میری نوکری بھی نہیں رہی ہے۔ نہ معلوم کب ملے اور کیا ہو۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ماں کو تیار کرانے کے بعد وہ خود بھی تیار ہو کر بیٹھ گئی تھی اور اس کے تیار ہوتے ہوتے چھوٹی بھی آ گئی تھی لیکن چونکہ اس کی تیاری میں ہمیشہ دیر لگتی تھی اور ادھر اس خیال سے عنبر کی جان پر بن رہی تھی کہ اگر فہد یا سعد آ گیا تو امی کو یہ معلوم ہوتے دیر نہیں لگے گی کہ میں نوکری چھوڑ آئی ہوں۔ گو ملازمت چھوڑ دینے کا بھی بڑا معقول عذر تھا اس کے پاس لیکن چونکہ وہ فہد کے سامنے نوکری چھوڑنے کا اظہار کر چکی تھی اسی لیے اس قدر گھبرا رہی تھی۔

اور اس لیے بھی کہ ماں کو جب پتا چلے گا کہ وہ سعد کی فیکٹری میں ملازمت کر رہی ہے تو وہ ملازمت چھوڑ دینے پر الٹا اسے برا بھلا کہیں گی اور سعد سے بہت زیادہ مرعوب ہو جائیں گی۔ اور اگر منہ پھٹ سے فہد نے ان کے سامنے بھی وہی بھابی بنانے کا مذاق کیا تو امی سچ مچ سیریس ہو جائیں گی۔ جب کہ اس نے تو ماں کو ریحان کے مشورے کی ہوا تک نہ دی تھی۔ اسی خدشے کے تحت کہ مبادا اماں زبردستی سعد سے اس کی شادی کر دیں۔ اپنی اسی پریشانی میں وہ یہ تو بالکل بھول ہی گئی تھی کہ سعد کی امی اس کی شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہتی ہیں۔

بہرکیف! اس نے جب یہ دیکھا کہ پونے تین بج گئے ہیں تو اپنا پرس اٹھاتے ہوئے چھوٹی سے کہا جو جلدی جلدی اپنے کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔

"سنو چھوٹی تمہارے تیار ہونے میں تو ابھی کافی دیر ہے۔ تم تیار ہو کر بعد میں آ جانا۔ میں امی کو لے کر ٹھیکیدار صاحب کے یہاں جا رہی ہوں۔"

"ارے نہیں آپا۔ بس دس منٹ اور ٹھہر جائیں پھر ہم تینوں ساتھ ہی چلیں گے۔ ویسے بھی ابھی تو میلاد شریف شروع ہونے میں کافی دیر ہے۔"

"نہیں بھئی، میں عین وقت کے وقت جانے کی قائل نہیں۔ پہلے سے جاؤں گی تو ذرا میزبانوں سے باتیں کرنے کا موقع تو ملے گا۔ اور سنا ہے کہ آج کل بتول بھی آئی ہوئی ہے۔ اس سے بھی ذرا گپ شپ ہو جائے گی۔ چلیے امی آپ میرے ساتھ چلیں۔" عنبر نے چھوٹی سے بات کرتے کرتے ماں سے چلنے کو کہا تو وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"پہلے اندر سے کھٹکا لگا لو چھوٹی اور پانچ منٹ کے اندر اندر آ جانا۔ اور وہاں بیٹھک کے دروازے کو تالا لگا کر اچھی طرح کھینچ کر دیکھ لینا کہیں کھلا نہ رہ جائے۔" ماں نے چلتے چلتے چھوٹی کو ہدایات دیں تو وہ "جی اچھا" کہہ کر ان کے پیچھے چلتی ہوئی اندر سے دروازے کا کھٹکا لگانے آ گئی۔

پھر چھوٹی بھی تیار ہو کر طاق میں رکھے بڑے سے آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ بالوں کو اس نے قدرے کس کر باندھا تھا اور پیچھے بڑا سا کلپ لگا کر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ یہ اسے کچھ اچھا نہ لگا تو اس نے بالوں کو کھولا اور پھر کنگھا کرنے لگی۔ تبھی

دروازے پر بہت دھیمے انداز میں دستک ہوئی۔ وہ گھر میں چونکہ تنہا تھی اس لیے دستک کی آواز اسے کمرے میں بھی آ گئی۔ یقیناً امی نے کسی کو بھیج کر مجھے بلوایا ہو گا۔ بال یوں ہی کھلے چھوڑ کر اس نے بیٹھک میں آ کر دروازہ کھولا تو دروازے پر کسی اور کو کھڑا دیکھ کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ آنے والا کھلے ہوئے پٹ کے درمیان کھڑا ہو کر بولا۔

"کیا اندر آنے کی اجازت مل سکتی ہے؟"

"جی نہیں، آئی ایم سوری۔ اس وقت چونکہ گھر میں کوئی نہیں ہے اس لیے میں معذرت خواہ ہوں۔" میرا مطلب ہے۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں مگر پھپھو جان اور عنبر باجی کیا کہیں گئی ہوئی ہیں اس وقت۔؟" اس نے چھوٹی کو وضاحت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور خورشید جہاں اور عنبر کے بارے میں استفسار کیا۔

"ظاہر ہے اگر وہ دونوں موجود ہوتیں تو پھر میں یوں آپ کا راستہ روک کر نہ کھڑی ہوتی۔" اس کے سامنے آتے ہی چھوٹی نے فوراً پہچان لیا تھا کہ وہ فہد ہے۔

"اچھا۔" وہ ہنستے ہوئے انداز میں بولا۔ اس کی نظریں چھوٹی کے سراپا پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک تو اس نے ہلکا ہلکا میک اپ کر رکھا تھا۔ اس پر اس کے سنہری جھلک دینے والے بال بھی کھلے ہوئے تھے۔ اور ہلکے ہلکے میک اپ پر جدید طرز کا وہ دودھیا کاسنی رنگ کا سوٹ جو اس نے بڑی چھان بین کے بعد عید کے موقع پر خریدا تھا، اس پر غضب ڈھا رہا تھا۔ وہ اس کی نظروں سے بچنے کے لیے تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی۔ یوں بھی اس کی کار عین دروازے کے سامنے کھڑی تھی اور اس میں فرنٹ سیٹ پر ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اور دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اس کے سامنے پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

"آپ کا نام کیا صرف چھوٹی ہی ہے یا اور کچھ بھی۔؟" اس نے عجیب سے انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ میرا اصلی نام تو فرحین ہے لیکن لاڈ میں چھوٹی چھوٹی کہا گیا تو اب وہ جیسے میرے دم کے ساتھ چپک ہی گیا۔" چھوٹی نے بڑی بیزاری سے کہا۔

اصل میں اسے اس طرح اس کا —— دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ محلے والوں کی گلی میں آمد و رفت اتنی تھی کوئی دیکھ لیتا تو برا کیا سوچتا۔ یوں بھی وہ گھر پر تنہا تھی۔ اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے بہت جلدی میں ہو۔

"ادھر امی اور آپا تو میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ کافی دیر بھی تو ہو گئی ہے۔" اس نے کہا تو فہد کو بھی احساس ہوا کہ وہ جانے کے لیے تیار کھڑی ہے اور میں ہوں کہ بس یہاں چپک کر ہی رہ گیا ہوں۔ ایک دم ہی پیچھے ہٹ کر بولا۔

"ویری سوری آپ کو میری وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ میں تو اس وقت آپ کی آپا کو یہ باور کرانے آیا تھا کہ ملازمت نگراں خاتون رقیہ خاتون سے جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے نہیں چھوڑی بلکہ وہ بہت پہلے ہی ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ سنا چکی تھیں۔ اور اب میں بھی وہی کر کے رہوں گا جو زبان سے ایک مرتبہ کہہ چکا ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔" اپنی بات کہتے کہتے فہد تیزی سے واپس مڑا اور کار میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔

جب کہ چھوٹی گم سم سی کھڑی رہ گئی۔

کہ بہن کے نوکری چھوڑ دینے کی خبر کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

اسے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اسے جلدی سے تیار ہو کر دعوت میں جانا ہے۔

یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ ابھی تو دروازے کی اوٹ میں ہی کھڑی ہے۔ جب کہ دوسرا پٹ کھلا ہوا ہے۔

اس خبر سے کہ بہن نے نوکری چھوڑ دی ہے اس کا دماغ ہی کچھ ایسا گھوما تھا کہ کچھ دیر کے لیے تو اسے کسی بات کا ہوش تک نہیں رہا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ دماغ معمول پر آتا گیا تو خیالات کی ایک رو سی دماغ میں دوڑنے لگی۔

"او ہو تو آپا کی طبیعت خراب نہیں تھی بلکہ انہوں نے جان کر چھٹی لی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے سر درد کا بہانا بنایا تھا کہ چھٹی کر کے بیٹھ جائیں اور مجھے یا امی کو پتا ہی نہ چلے کہ انہوں نے نوکری چھوڑ دی ہے مگر کیوں چھوڑی انہوں نے یہ ملازمت کس سے جھگڑا ہو گیا تھا آخر؟

لیکن فہد تو کہہ رہے تھے، وہ بہت پہلے ہی ملازمت چھوڑنے کا تہیہ کر چکی تھیں۔

اُف پتا نہیں کیا چکر ہے۔ یہ آپا تو ایک دم ہی معمہ بنتی چلی جا رہی ہیں۔

"ہائے کتنی اچھی ملازمت تھی۔ محفوظ بھی، معزز بھی اور معقول بھی اور پھر ڈھائی ہزار بھی مل رہے تھے۔ اس پر کھانا، ٹرانسپورٹ اور میڈیکل وغیرہ سب مفت تھا اور عید کے موقع پر کتنا خوبصورت سوٹ ملا تھا فیکٹری کی طرف سے آپا کو۔

اب بھلا کہاں مل سکے گی ایسی اچھی ملازمت۔ یہ تو سعد بھائی کا ہی دم تھا جو انہوں نے کھڑے کھڑے دلوا دی تھی۔ اس پر بھی آپا سو نخروں سے کام پر گئی تھیں۔

آپا واقعی کسی کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتیں۔ وہاں بھی کسی سے لڑ بیٹھیں۔ حالانکہ جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ہی ہیں انہیں فیکٹری میں کام کرتے۔ مگر ان کے مزاج میں شروع ہی سے جو تنک ہے وہ بھلا کبھی جا سکتی ہے؟

اف اللہ اب کیا ہو گا۔ کیا ہم پھر اپنی پریشانیوں میں گھر جائیں گے جو ہمارا مقدر رہی ہیں۔

اب تو آپا اپنا تاہ تینوں ٹیوشنیں بھی واپس لے لیں گی جو انہوں نے مجھے دے رکھی ہیں۔ ورنہ میں نے تو سوچا تھا کہ ان ٹیوشنوں کے پیسے جمع کر کے اپنے لیے طلائی زیور بنواؤں گی۔ کیونکہ میرے پاس تو سونے کا ایک تار تک نہیں ہے۔" چھوٹی کو بہن کے ملازمت چھوڑ دینے کی حرکت پر غم تھا۔

بڑی ملول سی کیفیت میں یہی سب سوچتے سوچتے دروازہ بند کر کے وہ کمرے میں پہنچی۔ بڑی بے دلی سے بال باندھے۔ دعوت میں جانے کا شوق بھی (کہ عرصے بعد تو کسی تقریب میں شرکت کرنے کا اتفاق ہو رہا تھا) اسی ملال کی نذر ہو گیا تھا اور... اپنا پسندیدہ لباس جو بڑے چاؤ سے اس نے پہنا تھا وہ بھی ہیچ لگ رہا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ سرے سے جائے ہی نہیں گھر میں ہی بیٹھ رہے۔ لیکن اس خیال سے کہ ماں اور بہن انتظار کر رہی ہوں گی اگر وہ نہ گئی تو وہ تشویش میں مبتلا ہو جائیں گی۔ وہ گھر کو مقفل کر کے ٹھیکیدار کے ہاں چلی ہی آئی۔ ماں نے تو اسے دیکھ کر صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا۔

"واہ چھوٹی تم اب نکل کر آئی ہو۔ تالے کو بھی اچھی طرح ہلا جلا کر دیکھ لیا تھا تم نے۔" مگر عنبر جو اس کے دیر سے آنے پر جزبز سی ہو رہی تھی، اس نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"ایسا کیا بناؤ سنگھار کر رہی تھیں جو اتنی دیر لگ گئی۔ حد بھی ہوتی ہے کاہلی کی۔"

تو اس کا دل چاہا بہن کو اپنے دیر سے آنے کا سبب بتا دے۔ مگر بہن کی فطرت اور مزاج سے بخوبی واقف تھی کہ وہ نہ صرف زود رنج تھی بلکہ بے حد حساس تھی۔ اگر چھوٹی اسے اپنے دیر سے آنے کا سبب بتا دیتی تو اس کا موڈ بالکل آف ہو جاتا اور اپنے ساتھ دوسروں کا مزا بھی کرکرا کر کے فوراً گھر چل دیتی۔ جب کہ وہ بھی بہت عرصے بعد کسی تقریب میں شریک ہونے آئی تھی اور بڑے ذوق و شوق سے آئی تھی۔ جب کہ اس ذوق و شوق کی وجہ پہلے تو نہیں مگر اب چھوٹی کو اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ فیکٹری سے کوئی نہ کوئی اس کے ملازمت چھوڑ دینے کا سبب معلوم کرنے آئے گا۔ تبھی تو وہ وقت سے پہلے ہی ماں کو ساتھ لے کر ٹھیکیدار کے یہاں چلی آئی تھی۔ جب کہ جس قسم کی گیدرنگ ٹھیکیدار کے یہاں تھی یعنی ___ رشتے دار ___ برادری اور محلے والے یا پھر چند جان پہچان والے ہی شرکت کر رہے تھے۔ ایسی گیدرنگ میں وہ کبھی بھول کر بھی نہ جاتی۔

بہرحال بہن کے ملازمت چھوڑ دینے کے غم نے اس کی چونچالی بھی چھین لی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی صورت لیے سب سے الگ تھلگ ہی بیٹھی رہی۔ میلاد شریف سہ پہر چار بجے کے بعد شروع ہوا تھا جو مغرب کی اذانوں کے وقت ختم ہوا۔ پہلے مٹھائی بانٹی گئی پھر مغرب کی نماز کے بعد پروجیکٹر پہ ایک پرانی پاکستانی فلم دکھائی گئی کیونکہ اس وقت تک وی سی آر اور ویڈیو اتنا عام نہیں ہوا تھا کہ جس کی وجہ سے پروجیکٹر پہ فلم دکھانے کا کاروبار بالکل ہی ٹھپ ہو کر رہ جاتا۔ فلم ساڑھے نو بجے رات کو ختم ہوئی تو اس کے بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوا اور رات کے ساڑھے دس بجے کے قریب کہیں جا کر ان تینوں کو گھر آنے کی مہلت ملی۔ چھوٹی کے مزاج میں شگفتگی اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ہمیشہ چہکتی اور لہکتی ہی رہتی تھی۔ خاص طور پر ایسی محفلوں میں مگر وہ بھی انسان تھی۔ بہن کے ملازمت چھوڑ دینے کا اسے بہت غم تھا اور اسی وجہ سے اس کا موڈ بھی آف ہو گیا۔

اسکول سے واپسی پر عذیر بھی جلد جلد تیار ہو کر دعوت میں شریک ہونے آ گیا تھا۔ چھوٹی نے کئی بار کہا بھی کہ اس کی طبیعت مضمحل سی ہے اور وہ عذیر کے ساتھ گھر جانا چاہتی ہے مگر ماں اور بہن نے اسے روک روک لیا۔ اور جب کھانے سے فارغ

ہو کر وہ ماں اور بہن کے ساتھ گھر پہنچی تو عنبر نے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے جلی کٹی سنانی شروع کر دیں۔

"امی ہم تو کچھ ایسی قسمت لے کر پیدا ہوئے ہیں کہ دوسروں کی خوشی کو بھی انجوائے نہیں کر سکتے۔ اب نہ معلوم اس چھوٹی کے موڈ کو ایک دم کیا ہو گیا تھا۔ سارا وقت یوں تربوز کی طرح منہ پھلائے بیٹھی رہی کہ بتول وغیرہ نے بھی مذاق میں پوچھا کہ کہیں پیٹ وٹ کر تو نہیں آئی جب کہ ہم تو اسے اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے۔ بھلا وہ لوگ کیا سوچ رہے ہوں گے کہ یہ ان کے یہاں کے کر و فر دیکھ کر جل اٹھی ہے۔"

اور وہ جو نہیں چاہ رہی تھی کہ ماں کے سامنے اس کی بیماری کے ڈھونگ کا بھانڈا پھوڑے یا ان کو یہ بتائے کہ وہ بلاوجہ ہی ملازمت چھوڑ بیٹھی ہے یا یہ کہ فہد نے اسے یہ خبر سنائی ہے وہ بھی ایک دم ہی پھٹ سی پڑی۔

"آپا میں حاسد ہوں نہ اتنی چھچھوری جو دوسروں کے کر و فر دیکھ کر جلوں گی۔ مجھے تو آپ کی ایک بہت ہی غیر ذمہ دارانہ حرکت نے ڈسا ہے۔ وہ سعد بھائی کے چھوٹے بھائی فہد آئے تھے آپ کے جاتے ہی، وہ بتا رہے تھے کہ آپ بلا کسی وجہ اور جواز اچھی بھلی ملازمت سے استعفیٰ دے کر آ گئی ہیں۔ آپا کیا یہ ایسی خبر تھی جس سے میں خوش ہوتی۔ ہنستی اور قہقہے لگاتی۔"

"ہیں یہ کیا کہہ رہی ہو تم چھوٹی۔ کب آیا تھا فہد ___ اے عنبر یہ کیا معاملہ ہے آخر۔ کیا یہ چھوٹی سچ کہہ رہی ہے؟" چھوٹی کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ خورشید جہاں نے ہول کر دونوں بیٹیوں کو ہی مخاطب کر ڈالا۔

"ہاں امی یہ سچ کہہ رہی ہے۔ میں واقعی ملازمت چھوڑ آئی ہوں۔" عنبر نے سوچا کہ اب جھوٹ چلے گا نہ بہانا اس لیے سچ کہہ دینا ہی بہتر ہے۔

"مگر کیوں چھوڑ دی تم نے وہ نوکری۔ اتنی اچھی تو تھی اور پھر یہ کہ ہر طرح کی سہولت بھی دی گئی تھی۔" ماں کو توقع نہیں تھی کہ اتنی صفائی اور دلیری سے انہیں جواب دے گی اس لیے وہ بھی اس کا فضیحتہ کرنے کے بجائے کچھ دب سی گئیں۔

"ہر طرح کی سہولت ضرور دی گئی تھی مگر عزت اور توقیر کی وہاں کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ وہاں کی نگراں ایک فرنٹ قسم کی عورت ہے جس نے ساری فیکٹری کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا اور فیکٹری کے حساب کتاب میں دوسرے ملازموں کے ساتھ مل کر خرد برد بھی کر رکھی تھی۔ کل باس نے میرے سامنے اسے بلا کر اسے فیکٹری کے حساب کے لیے رجسٹر بنانے کے لیے کہا تھا۔ دوپہر کو فیکٹری کا اسٹور منیجر نئے رجسٹر لے کر آ گیا۔ وہ چونکہ اس عورت رقیہ سے ملا ہوا تھا جب میں نے اس سے کہا کہ وہ ملازمین کی حاضری اور فیکٹری کی سیل کے حساب کا رجسٹر بنائے تو رقیہ مجھ سے لڑنے لگی اور بہت ہی ناشائستہ کلمات کہے اس نے میرے بارے میں کہ میں برداشت نہ کر سکی اور نوکری چھوڑ کر آ گئی۔ رنج و کوفت کی وجہ سے ہی تو میرے سر میں اتنا شدید درد ہو گیا تھا۔"

اس نے دیکھا ماں بگڑنے کے بجائے نرمی سے بات کر رہی ہیں تو اس نے بھی تفصیل سے ساری بات بتا دی۔

"مگر آپا فہد تو کہہ رہے تھے کہ آپ کا اس عورت سے جھگڑا تو بعد میں ہوا تھا۔ ورنہ آپ نے صبح ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ ملازمت چھوڑنے کا تہیہ کر چکی ہیں۔" چھوٹی نے کہا تو ماں بول لیں۔

"اے یہ فہد کہاں سے بیچ میں کود گیا۔ یہ نوکری تو سعد نے دلوائی تھی اپنے کسی دوست کے ہاں۔"

"سعد بھائی کے کوئی دوست ہیں تو ممکن ہے فہد بھی وہاں آ گئے ہوں۔" چھوٹی نے قیاس آرائی کی۔

"کیا باتیں کر رہی ہو چھوٹی۔ یہ فیکٹری کوئی سعد کے دوست کی تھوڑی ہے۔ خود انہی کی ہے جسے فہد بھائی چلا رہے ہیں۔ سعد بھائی نے اسی وجہ سے اپنے دوست کا نام لیا ہو گا کہ کہیں آپا انکار نہ کر دیں۔" عذیر جو کچھ دیر پہلے ہی باہر سے آیا تھا چھوٹی کی قیاس آرائی پر ہنس کر بولا۔

"ہاں دیکھو اسی بات پر تو مجھے غصہ ہے کہ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔" عنبر پول کھل جانے پر تنک کر بولی۔

"اور اسی وجہ سے آپ نے نوکری چھوڑ دی۔" چھوٹی نے طنز سے کہا۔

"ہاں چلو اسی وجہ سے چھوڑ دی۔ کیوں دیا انہوں نے مجھے اتنا بڑا دھوکا۔ صرف مجھے ذلیل کرنے اور نیچا دکھانے کے لیے نا۔ یہ جتانے کو کہ دیکھو تمہاری یہ حیثیت ہے کہ تم ہماری فیکٹری میں ملازمت کرو کیونکہ اور کہیں تو تمہیں اچھی ملازمت نصیب ہی نہیں ہو گی۔ اس پر سے اس چھچھورے شخص کو اس وقت ہی آ نا رہ گیا تھا جب وہ موٹی بھینس ہماری عزت خاک میں ملانے پر تلی ہوئی تھی۔ ورنہ میں تو اس کاغذ پر دستخط کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ کم از کم اس گھٹیا ملازمت سے تو اس کی ملازمت ہی

بہتر ہوتی۔" عنبر بڑے طیش کے عالم میں بولی۔

"ارے جاؤ ناشکری کہیں کی۔ ایک تو اس بے چارے نے تیری عزت بچائی۔ اس پر تجھے اتنی اچھی اور شریفانہ نوکری دلوائی اس پر اسے چھچھورا اور دھوکے باز کہہ رہی ہے۔ احسان فراموش۔ جا نہیں کرتی نوکری تو نہ کر۔ ہمیں تیرے کمائے ہوئے پیسے کی ضرورت بھی نہیں ــ اے ہاں جیسے اب تک ایڑیاں رگڑ رگڑ کر یہ زندگی گزارتے آرہے ہیں اسی طرح آئندہ بھی گزار دیں گے۔ چل عذیر ذرا بلا کر تو لا سعد کو۔ میں بھی آج اس سے صاف صاف بات کروں گی۔"

خورشید جہاں کو اس کی بے سروپا باتوں پر غصہ آگیا۔ انہوں نے اچھی طرح اس کے لتے لے کر عذیر کو مخاطب کر کے کہا تو چھوٹی بولی۔

"امی۔ اس وقت رات کے پونے گیارہ بج رہے ہیں۔ اس وقت یہ عذیر بھلا کیسے سعد بھائی کے ہاں جائے گا۔ اس وقت تو کوئی سواری بھی نہیں ملے گی اسے۔"

"ہاں ایسا ہی ہے تو میں صبح ناشتا کرتے ہی ان کے ہاں چلا جاؤں گا۔" عذیر بولا۔

"نہیں، صبح بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ اب یہ کوئی نوکری نہیں کرے گی۔ بس انہی تین ٹیوشنوں پر گزارہ کرے گی جو اس نے چھوٹی کی جھولی میں ڈال دی تھیں۔ اے ہاں اس نوکری کے چکر میں میری عزت پر بن گئی۔ اب میں اس سے نوکری کرا کے اپنی عزت کو داؤں پر نہیں لگاؤں گی۔" خورشید جہاں نے غصے کے عالم میں کہا تو عنبر ان تینوں سے اپنے آنسو چھپاتی جلدی سے باہر برآمدے میں چلی گئی جب کہ خورشید جہاں اور چھوٹی جو اس نکا فضیحتی میں آتے ہی بیٹھک میں ٹک گئی تھیں۔ منہ ہی منہ میں عنبر کو برا بھلا کہتی کمرے میں چلی آئیں۔ چھوٹی بھی اٹھ کر ان کے پیچھے ہی آگئی تھی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ "امی۔ آپا باہر لڑی ہیں آپ انہیں اندر بلا لیجیے نا۔"

"نہیں۔ میں تو نہیں بلاؤں گی اسے۔ وہ کوئی مہمان ہے نہ میری ساس نند۔ گھر کی ہی بچی ہے اور یہ گھر اسی کا ہے اور رو دھو کر دل کا غبار نکال کر خود ہی آجائے گی۔ میں یوں بھی اس حد تک اپنی اولاد کے نخرے اٹھانے کی قائل نہیں ہوں۔" خورشید جہاں پہ واقعی غصہ سوار تھا۔ اور غصے کے عالم میں وہ کسی کو بھی نہیں گردانتی تھیں۔ چھوٹی کا دل بہن کے لیے کڑھ رہا تھا بلکہ دوسرے معنوں میں وہ چور سی بن گئی تھی ماں کے سامنے اسے فہد کے بارے میں بتا کر ــ بے چاری آج اتنے عرصے بعد تو ایک تقریب میں گئی تھیں اور کتنی خوش نظر آرہی تھیں۔ اور گھر آتے ہی ساری خوشی کافور ہو گئی ــ امی کو بھی ایک دم غصہ آجاتا ہے۔ پھر وہ یہ نہیں دیکھتیں کہ ان کی باتیں کسی کے دل کو کتنا آزار پہنچائیں گی۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی۔ کہ بہن کو جا کر چپ کرا لے یا منا لے۔

"اے بھلا دیکھو تو کیسی منہ پھٹ اور منہ زور ہو گئی ہے۔ بھلا ہمارے سامنے ہی سعد کو چھچھورا اور پتا نہیں کیا کیا کہنا شروع کر دیا۔ ذرا سا بھی تو لحاظ نہیں رکھا میرا۔ ارے اسے تو شروع ہی سے خدا واسطے کا بیر ہے سعد سے۔ لیکن جس وجہ سے ہے میں بھی پہلے نہیں تو اب قسم کھاتی ہوں کہ اس کی شادی سعد سے کروا کے رہوں گی۔"

یہ باتیں گو خورشید جہاں خود کلامی کے سے انداز میں منہ ہی منہ میں کہہ رہی تھیں۔ مگر چھوٹی نے صاف صاف سن لی تھیں وہ خوش ہو کر بولی۔

"ہائے سچ امی۔ کاش ایسا ہی ہو۔ میری تو یہ دلی آرزو ہے۔ مگر امی سعد بھائی کی والدہ تو اپنی بھتیجی سے ان کی شادی کرنے پر تلی بیٹھی ہیں۔ پھر بھلا کس طرح ــ؟" تو خورشید جہاں اسے گھور کر بولیں۔

"تم سے کس نے کہا ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑانے کو۔ تمہاری اسی للّو کی وجہ سے ہی تو گھر میں اتنی بک بک جھک جھک ہوتی ہے۔ چلو جاؤ یہاں سے اور جا کر اپنا کام کرو۔"

ماں نے اپنا بچا کھچا غصہ چھوٹی پہ اتارا۔ اصل میں انہیں یہ بات بہت ناگوار گزر رہی تھی کہ اس نے ان کی آہستہ سے کہی گفتگو یا بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ ماں کی بات تیر کی طرح چھوٹی کے دل پر لگی۔ وہ منہ بسور کر بولی۔

"کمال ہے ہر غلط بات کا ذمہ دار مجھے ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔ جب کہ میں نے ایسا کیا جرم کیا تھا ٹھیکیدار کے یہاں جا کر۔ ایک صرف آپا کے نوکری چھوڑ دینے پر رنجیدہ ہی تو ہو رہی تھی مگر یہ تو آپا ہی کی عادت ہے کہ بات میں بات نکال کر ایک جھگڑا کھڑا کر لیتی ہیں۔" اتنا کہہ کر چھوٹی فوراً ہی کمرے سے نکل گئی۔

ماں کی بات تیر کی طرح چھوٹی کے دل پر لگی تھی اس لیے اسے بھی غصہ آگیا۔ وہ منہ بسورتی ہوئی کمرے سے نکل کر برآمدے میں چلی آئی۔ عنبر اسی وقت منہ دھو کر غسل خانے سے نکلی تھی اور اندر کا رخ کر رہی تھی۔ اس نے چھوٹی کے نزدیک رک کر سلگتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا فہد اندر آیا تھا؟"

"نہیں وہ بھلا اندر کیسے آسکتے تھے۔ میں نے تو انہیں آتے ہی بتا دیا تھا کہ میں گھر پہ تنہا ہوں اس لیے آپ کو اندر نہیں بلا سکتی۔ بس دروازے سے ہی انہیں ٹرخا دیا تھا۔" چھوٹی کا موڈ بھی آف تھا۔ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"مگر تمہاری اس سے کیا بات ہوئی تھی ــ؟" عنبر نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میری ان سے کیا بات ہوتی۔ وہ تو بس یہ کہہ کر فوراً ہی چلے گئے تھے کہ ــــــ" چھوٹی نے وہ ساری باتیں دہرا دیں جو فہد کہہ کر گیا تھا۔ تو عنبر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"تمہاری خصلت بھی ایک دم بی جمالو کی سی ہو گئی ہے جو جس میں چنگی ڈال کر دور کھڑی ہو جاتی ہے۔ ورنہ تم چاہتیں تو یہ بات علیحدگی میں بھی مجھے بتا سکتی تھیں مگر تم نے جان کر امی کے سامنے کی۔" تو چھوٹی اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولی۔

"امی کو بتانا ہوتا تو میں وہیں ٹھیکیدار کے یہاں انہیں بتا دیتی۔ بلکہ میں نے تو سوچا تھا کہ گھر آکر چپکے سے آپ کو بتا دوں گی لیکن آپ نے آتے ہی خواہ مخواہ میرے فضیحتے کرنے شروع کر دیے تو مجھے بھی تاؤ آگیا۔ ورنہ آپ کے نوکری چھوڑنے کی خبر سن کر سب سے زیادہ مجھے ہی رنج ہوا تھا۔"

"ہاں تمہیں رنج نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا۔ تمہارے تو عیش ہی عیش ہو جاتے نا میرے سروس کرنے سے اور تمہیں تو سب سے زیادہ رنج اس بات پر ہوا ہوگا۔ وہ جو تمہارا چہیتا سعد ہے نا اس فیکٹری کا مالک میں نے اس کی باندی بننا کیوں منظور نہیں کیا۔" عنبر جلے کٹے انداز میں کیسی زبردست چوٹ کر گئی تھی۔ چھوٹی کا بھی مارے غصے کے برا حال ہو گیا

"آپا! مجھے کیا ضرورت پڑی ہے ایسی بے کار بات پر رنج کرنے کی ــ یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ کسی کی باندی بننا منظور

کریں یا نہ کریں۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ کے ٹکڑے کھا کر میرے عیش ہو جائیں گے تو میں بھی آپ کے سامنے اپنے پیدا کرنے والے کی قسم کھاتی ہوں کہ آیندہ آپ کی کمائی کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام سمجھوں گی۔"

"ہونہہ یہ بات تو تم پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکی ہو لیکن جب میرے ہاتھ میں پیسہ آتا ہے تو سب کچھ بھول کر فرمائشیں کرنے لگتی ہو کہ آپا یہ لے دو۔ وہ لے دو بلکہ یہ لمبی فہرست بھی تیار کر کے بیٹھ جاتی ہو۔ بڑی آئیں قسمیں کھانے والی۔"

عنبر اس کے قسم کھانے پر جل کر بولی۔ اور جواب میں آگ بگولا سی ہو کر چھوٹی بھاگتی ہوئی کمرے میں پہنچی اور اپنا صندوق کھول کر دو روز قبل عنبر کی دلائی ہوئی ساری چیزیں نکال نکال کر اس کے بکس پر رکھ دیں۔ اسی اثنا میں عنبر بھی کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے دیکھ تو لیا تھا کہ چھوٹی اس کی دلائی ہوئی ساری چیزیں اپنے صندوق سے نکال رہی ہے مگر کچھ بولی نہیں تھی۔

"لیجیے آپا! بہت بہت شکریے کے ساتھ یہ اپنی ساری چیزیں واپس لے لیجیے۔" چھوٹی نے ساری چیزوں کی طرف اشارہ کر کے بڑے جذب کے عالم میں کہا تو عنبر جیسے پھٹ سی پڑی۔

"میں تمہاری طرح تھوک کر چاٹنے کی عادی نہیں ہوں۔ بس جو دے دیا سو بخشش۔ اور پھر نہ صورت شکل نہ تعلیم نہ حیثیت پھر کس بات پر اتنا اکڑتی ہو کہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔ ایسا ہی واپس کرنے کا شوق ہے تو اٹھاؤ یہ ساری ——— چیزیں اور باہر صحن میں لے جا کر انہیں آگ لگا دو۔ چھچھوری ذلیل کہیں کی۔ اچھا لاؤ میں خود ان چیزوں کو دیا سلائی دکھاتی ہوں۔"

چیزیں واپس کرنے پر عنبر کچھ زیادہ ہی طیش میں آگئی اور جھپٹ کر ساری چیزیں خود ہی اٹھانے لگی۔ وہیں کمرے میں نماز کی چوکی پر خورشید جہاں عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ لیکن ان کے کان تو بند نہیں تھے۔ دونوں بہنوں کے درمیان جو تکرار ہو رہی تھی اس کی آواز ان کے کانوں میں بھی جا رہی تھی اور اس طرح نماز پڑھنی انہیں دوبھر ہو گئی تھی۔ انہوں نے اونچی آواز میں وتر پڑھنے کے بعد سلام پھیر کر پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"اُف توبہ توبہ تم دونوں بہنوں نے کفار کو بھی مات کر دیا۔ مجھے نماز پڑھنی دوبھر ہو گئی تمہارے اس جھگڑے فساد سے۔ ارے یہ ساڑھ ستی تمہاری اسی پر روز روز کی دانتا کل کل سے ہی آئی ہوئی ہے اس گھر پر۔ آخر ایسی کیا آفت نازل ہو گئی تجھ پر جو تو ان چیزوں کو آگ لگانے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ کوئی حرام کی کمائی کی تو نہیں ہیں بلکہ اس بے چارے بچے کے محنت سے کمائے ہوئے پیسے کی ہیں۔ چل رکھ انہیں بکسے میں اور دفعان ہو جا یہاں سے۔"

ماں نے اپنے غصے کا ہدف عنبر کو بنایا تھا۔ پھر بھلا وہ اتنی سخت سست سن کر وہ ساری چیزیں اپنے بکس میں رکھ سکتی تھی۔ وہ دھپ سے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر رونے لگی تو خورشید جہاں کا نزلہ پھر چھوٹی پر گرا۔

"اے یہ تجھ پر کیا مار پڑی تھی چھوٹی جو تو نے بہن کی دی ہوئی چیزیں واپس کر دیں۔ دیکھ خود کو درست کر لے ورنہ یہ مری جوتی ہو گی اور تیرا سر۔" چھوٹی کو بھی غصہ آ رہا تھا۔ ماں کی ڈانٹ سن کر وہ بھی رونے لگی۔

"امی آپ ہمیشہ مجھے ہی کہتی ہیں۔ میں ہی آپ کو قصور وار نظر آتی ہوں۔ کبھی اپنی ان چہیتی کی بھی تو خبر لے لیا کیجیے جو باتوں ہی باتوں میں دل پر ایسے آرے چلاتی ہیں کہ دوسرا خودکشی ہی کرے۔" چھوٹی نے روتے ہوئے کہا۔

"لے یہ تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے کیوں پڑ گئی۔ یہ تیری بڑی بہن ہے۔ اگر کچھ الٹی سیدھی کہتی بھی ہے تو تو چپ ہو جایا کر۔"

"تو میں نے کون سا انہیں کچھ کہہ دیا۔ یہی کہہ رہی تھیں کہ میں ان کی کمائی پر عیش کرتی ہوں۔ فرمائشوں کی لمبی فہرست تیار کر کے انہیں دیتی ہوں اور ہر وقت انہیں کھانے کی فکر میں لگی رہتی ہوں۔ تب اسی بات پر میں نے بھی ان کی دی ہوئی چیزیں واپس کر دیں اور اب میری توبہ جو میں ان کا دیا ہوا ایک تنکا بھی قبول کروں۔" چھوٹی روتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اچھا اچھا مت کرنا قبول۔ اس کی بھی جوتی کو غرض نہیں پڑی جو تمہاری خوشامد درآمد کرے گی۔ اے ہاں قرض تو سارا اس بے چاری کو اُتارنا ہے۔ چلو جا کر کپڑے بدلو اور پڑ کر سو جاؤ۔ صبح تمہیں کالج بھی جانا ہے۔"

وہ بہت معاملہ فہم خاتون تھیں اور اپنی دونوں بیٹیوں کے رگ و ریشے سے واقف تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ جب عنبر سے کوئی چوک یا غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو وہ کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے کی کوشش میں ہمیشہ چھوٹی کو ہی نشانہ بناتی ہے کیونکہ کسی پر تو اس کا بس چلتا نہیں۔ چھوٹی کے باہر جاتے ہی انہوں نے عنبر سے کہا جو ابھی تک رو رہی تھی۔

"اے بس بند کرو یہ رونا دھونا اور یہ ساری چیزیں سمیٹ کر اپنے بکسے میں بند کر دو۔ ہاں بھلا کوئی تم مفت تو نہیں لائیں یہ سب چیزیں جو کسی کی خوشامد درآمد کرو۔ ویسے بھی یہ بڑے چھچھورپن کی دلیل ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو جتانا اور دوسرے کی دی ہوئی چیزوں کو واپس کر دینا۔ اس چھوٹی کے مزاج میں بھی بڑی تنک پیدا ہو گئی ہے جو ذرا ذرا سی بات کا برا مان جاتی ہے۔"

انہوں نے جانماز کو تہہ کر کے سجدہ گاہ کی طرف رکھتے ہوئے کہا۔ تو عنبر اپنے آنسو پونچھ کر چھوٹی کی لوٹائی ہوئی چیزوں کی طرف دیکھ کر درشت سے لہجے میں بولی۔

"ہونہہ مزاج میں تنک پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کا لحاظ کرتی ہوں ورنہ میرا بس چلے تو جوتے مار مار کر تنک تو کیا ایک ہی منٹ میں اس کی صورت بگاڑ کر رکھ دوں۔"

"خیر اب صورت بگاڑنا اتنا آسان بھی نہیں۔ یوں بھی جب بھائی بہن برابر کے ہو جاتے ہیں تو بڑوں کو بھی ان کا لحاظ رکھ کر بات کرنی چاہیے۔ ورنہ وہ جواب میں اگر کوئی تیکھی بات کہہ دیں تو وقعت بڑے کی ہی گھٹتی ہے۔" خورشید جہاں نے برا لگنے کے باوجود بہت رسانیت سے کام لے کر سمجھایا۔

"چھوڑیں امی۔ یہ آپ کے زمانے میں ہوتا ہوگا۔ آج کل تو جوتی ہاتھ میں لے کر ہی چھوٹوں سے بات کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ پیار و محبت سے تو بالکل ہی سر چڑھ جاتے ہیں۔" عنبر نے ماں کی نصیحت آمیز بات کو رد کرتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا تو انہیں بھی تاؤ سا آگیا۔

"ہاں جوتی ہاتھ میں لے کر بات کرنے کا انجام تو تم اسی روز دیکھ چکی ہو جس روز وہ پیاز کی گٹھی تم پر کھینچ کر مارنے والی تھی۔ اگر اتفاق سے اس وقت میں نہ آ جاتی تو نہ معلوم وہ گٹھی تمہارے سر پر لگتی یا منہ پر جب کہ اس روز قصور سارا تمہارا ہی تھا۔ پھر بھی میں نے اس بے چاری کو لے کر پیٹ ڈالا۔"

"ہاں ہاں قصور تو ہمیشہ میرا ہی ہوتا ہے۔ جب آپ ماں ہو کر یہ کہتی ہیں تو ـــ"

عنبر نے تڑخ کر کہا تو خورشید جہاں نے اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں اسے جھڑکا۔

"اے بس خبردار جواب ایک لفظ بھی کہا ورنہ اس جوتی سے تیرے سارے دانت جھاڑ دوں گی۔ لو بھلا۔ غضب خدا کا آج تیری اتنی جرأت ہو گئی کہ تو میرے بھی منہ لگنے لگی۔ آخر کس بات کا زعم ہے تجھے کہ اچھی بھلی نوکری کو لات مار آئی۔ کیونکہ وہ سعد نے دلوائی تھی نا تجھے۔"

اور ماں کی ڈانٹ پھٹکار کے جواب میں ساری چیزیں یونہی چھوڑ کر عنبر اپنے پلنگ پر منہ لپیٹ کر پڑ گئی۔ تبھی شامتِ اعمال چھوٹی بھی جو ماں کی باتوں کی آواز سن کر دروازے پر ہی رک گئی تھی اندر آگئی۔ اسے دیکھتے ہی خورشید جہاں بولیں۔

"اے چل بتی بجھا اور پڑ کر سو جا۔ بہت دماغ ہو گئے ہیں تیرے۔ اگر اب تیری ذرا سی آواز بھی سنی تو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دوں گی تجھے۔" اور ماں کی بات پر چھوٹی نے تلملا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے بتی بجھا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ مگر اسے بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔

وہ یہ سوچ سوچ کر اپنے آپ پر کڑھتی رہی کہ وہ کتنی بری قسمت لے کر پیدا ہوئی ہے۔ اور کتنی بے بس اور مجبور ہے کہ خود ہی کفالت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ کھانے پینے اور تن ڈھانپنے سے لے کر تعلیمی اخراجات کے معاملے میں بھی بہن کی دست نگر بنی ہوئی ہے۔ تبھی تو بات بات میں وہ اسے اتنا خوار کرتی ہے۔ اصل میں ماں جائی ہونے اور ایک ساتھ پروان چڑھنے کے باوجود بھی چھوٹی کو عنبر کے مزاج کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ جو پل میں تولہ پل میں ماشہ کی طرح کبھی خوش ہوتی تو ایسی دریا دلی کا مظاہرہ کرتی کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو جاگیر ہی بخش دیتی اور اگر خراب ہوتا تو وہ اگلا پچھلا سارا حساب برابر کر کے رکھ دیتی۔ جب کہ چھوٹی کے نزدیک اپنے احسانات یا لیے دیے کو جتانا کم ظرفی کی نشانی تھا۔

ادھر عنبر کو بھی کافی دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔ اس پر سخت غصہ سوار تھا اور وہ کروٹیں بدل بدل کر سوچ رہی تھی۔ امی ہر بات میں موردِ الزام مجھے ہی ٹھہراتی ہیں اور مجھ پر ہی اپنا سارا غصہ اُتارتی ہیں۔ گویا چھوٹی بہن کے سامنے مجھے ہی بے وقعت کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور میں خاموشی سے سب کچھ سہہ لیتی ہوں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں ہی کماؤں، میں ہی سب کو کھلاؤں پلاؤں اور پہناؤں اور میں ہی سخت سست بھی سنوں۔ میں کوئی اتنی گری پڑی ہوں کیا۔ میری اپنی بھی ایک حیثیت ایک مقام ہے۔ میں تعلیم یافتہ ہوں، عزت دار اور حسین ہوں۔ کتنے ہی لوگ میرے اس حسن کے

پرستار ہیں۔

امی نے بیچ میں بول کر خواہ مخواہ ہی معاملہ بگاڑ دیا ورنہ میں تو غزل کے لائے ہوئے کاغذ پر دستخط کرنے کو تیار ہوگئی تھی۔ غزل تو مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتی اور مجھ پر روپے پیسے کی بارش ہی کر دیتی۔ عزت الگ ملتی مجھے وہاں جا کر۔ کم از کم ان حالات کا سامنا تو کبھی نہ کرنا پڑتا جو سعد کی گارمنٹ فیکٹری میں جا کر پیش آئے ہیں۔ وہ کمبخت رقیہ نہ معلوم خود کو کیا سمجھتی ہے اور پھر قصور اس کا بھی نہیں، قصور تو سارا سعد کا ہے جس نے مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ وہاں فیکٹری میں کسی کو بتا دیتا کہ لیڈی سپروائزر کی حیثیت سے میں وہاں کام کرنے آرہی ہوں۔ اس پر فہد کو بھی اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ کم از کم ساری ورکرز سے میرا تعارف ہی کرا دیتا۔ جب کہ ہر ادارے اور کمپنی میں یہی اصول چلتا ہے کہ نئے آنے والے کسی کارندے کا وہاں کے عملے سے تعارف ضرور کرایا جاتا ہے۔ مگر سعد نے مجھے اتنی امپورٹنس ہی کب دی ہوگی جو فہد میرا تعارف کراتا۔

یہ اچھا ہی ہوا جو میں بقول امی اس کی نوکری پر لات مار آئی۔ اس طرح یہ اندازہ تو ہوا ہوگا کہ میں اتنی گری پڑی نہیں ہوں جتنا وہ مجھے سمجھتا ہے۔ اصل میں تو وہ ہمارے تمام حالات سے بھی تو واقف ہے۔ اس پر ایک تو امی کی سادگی، عذیر کے تعلیمی مسائل اور اب یہ غزل کا معاملہ بلکہ ساری باتیں اس کے سامنے تو ہوتی رہی ہیں اور اس کے ساتھ اسے وہ دن یاد آگیا جب وہ ریحان کے کمرے میں گئی تھی تو سعد بھی وہیں چھپا بیٹھا تھا۔ نہ معلوم کیوں۔

سعد کا ذکر آتے ہی اسے ہمیشہ وہ دن یاد آجاتا تھا جس نے اسے سعد سے اس حد تک بدظن یا متنفر کر دیا تھا کہ وہ اس کا ذکر تو کجا اس کا تصور بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔

اگلے روز عذیر کے جگانے پر ہی اس کی آنکھ کھلی تھی جو اپنی بھاری سی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"آپا آپا! اٹھیے۔ حد ہوگئی آج تو۔ کیا چودھری صاحب کے یہاں سے رات کے کھانے کے ساتھ ساتھ سحری بھی کھا آئی تھیں جواب تک پڑی سو رہی ہیں، مگر میرا تو کباڑا ہی کر دیا آپ نے۔ میں تو آج سارا دن بھوکا پیاسا ہی رہوں گا۔" اور اس نے گہری نیند سے بیدار ہوتے ہوئے اس کے صرف آخری فقرے ہی سنے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھتی ہوئی بولی۔

"ہائیں ہائیں، یہ صبح ہی صبح کیسی بدفالیں منہ سے نکال رہے ہو بدتمیز کہیں کے۔"

"اجی صبح تو اب کل ہی ہوگی اس وقت تو ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں اور آپ اب جگانے پر اٹھی ہیں۔ اتنا بھی نہیں ہوا کہ کم از کم سحری پر اٹھنے کی زحمت کر لیتیں۔ میرے پیٹ میں تو بس ابھی سے چوہے دوڑ لگانے کو تیار بیٹھے ہیں اور پیاس بھی لگ رہی ہے۔ آج سورج بھی شاید تندور سے سینک کر نکلا ہے جو ابھی سے آگ برسا رہا ہے۔" عذیر پر سخت جھنجلاہٹ سوار تھی۔

"اُفوہ تو میں کیا کروں اگر ابھی سے اتنی گرمی پڑ رہی ہے۔ اور کیا میں ہی رہ گئی تھی تمہیں سحری کھلانے والی۔ چھوٹی سے کہا ہوتا نا — وہ بھی تو اسی گھر میں رہتی ہے۔" وہ نیند میں خلل پڑنے کی وجہ سے چڑ کر بولی۔

"اجی چھوٹی — وہ تو کب کی اڑن چھو ہوگئی۔ شاید بغیر سحری کے روزہ رکھ کر گئی ہے کالج۔ کیونکہ باورچی خانہ بند ہی نہیں بلکہ ٹھنڈا پڑا ہے۔ امی بھی ابھی اٹھ کر بیت الخلاء گئی ہیں۔ کیا کوئی نشہ آور چیز تو نہیں کھلا دی تھی چودھرائن نے آپ لوگوں کو کھانے کے اندر۔"

"اچھا اب زیادہ بک بک نہ کرو۔ آج واقعی ابھی سے بہت گرمی ہے۔ پنکھے میں سے بھی بہت گرم ہوا نکل رہی ہے اور تمہیں اسکول بھی جانا ہے۔ بغیر سحری کا روزہ رکھو گے تو افطار تک حالت پتلی ہو جائے گی تمہاری۔" وہ اٹھنے کی غرض سے چپل میں پیر ڈال کر بولی۔

"ہاں اتنی دیر سے میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں مگر حالت پتلی ہو یا چکلی میں ہر حالت میں روزہ رکھ کر رہوں گا۔" عذیر بولا۔

"خیر، تمہاری مرضی ورنہ میں تو اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ آج گرمی بھی بہت ہے۔ اگر خدانخواستہ تمہاری طبیعت خراب ہوگئی تو پھر کئی روزوں سے جاؤ گے اور مجھے تو تعجب اس بات پر ہے کہ چھوٹی بغیر بتائے اور جگائے چپکے سے کالج چل دی۔ وہ کم از کم امی کو جائے اور ناشتا تو دے کر جاتی۔" عنبر کھڑی ہو کر بولی۔

"اے تو تمہارے خیال میں، میں کافر یا فاسق ہوں جو سحری نہ کھانے کی وجہ سے اپنا اتنا قیمتی روزہ ہی ہڑپ کر جاؤں گی

...نے جانے سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا ناشتا کرنے کو مگر میں نے انکار کر دیا تو وہ کالج چلی گئی۔ مگر تُو آج کا روزہ نہ رکھ بیٹے۔ ...ہے تو بعد میں پورا کر لینا۔" خورشید جہاں نے کہا جو وضو کر کے اسی وقت اندر آئی تھیں۔

"اچھا امی دیکھوں گا۔" عذیر نے جواب میں کہا اور بیٹھک میں چلا گیا۔

"اے جاؤ عنبر اسے جلدی سے کچھ کھلا پلا دو۔ ابھی دن چڑھا ہے، نہ اس نے روزے کی نیت ہی کی ہوگی۔ ابھی کچھ ...ے گا تو کچھ گناہ بھی نہیں ہوگا۔" انہوں نے عنبر سے کہا تو وہ چپ چاپ کمرے سے باہر جانے لگی تو انہوں نے اس سے کہا "تم بھی جا کر جلدی سے کچھ کھا پی لو۔ تمہیں تو —" مگر ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے عنبر نے بڑی تیکھی نظروں سے ان ...ن دیکھ کر کہا۔

"امی! اب میں اتنی کمزور اور نازک بھی نہیں ہوں کہ سحری کے بغیر روزہ رکھ کر مر ہی جاؤں گی۔ جب کہ آپ ...اس ضعیفی میں روزہ رکھ لیا۔ یوں بھی امی روزے کو لوگ خواہ مخواہ ہی ہوّا بناتے ہیں یا پھر جی چُراتے ہیں۔ ورنہ ...ہم جو اور مصور وغیرہ ہوتے ہیں یہ تو بغیر کھائے پیے کئی کئی دن گزار دیتے ہیں اور روزہ تو انسان کو کچھ ایسی پاکیزگی کا ...اس دلاتا ہے کہ انسان کی روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔" اتنا کہہ کر عنبر باہر نکل گئی اور اس دن کا روزہ قدرے سخت ...را تھا مگر کسی نہ کسی طرح گزر ہی گیا۔

...سہ پہر کو افطاری عنبر نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھی مگر چھوٹی نے کھانا تو بڑی بات کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا ...پڑوس کے ایک لڑکے کے ہاتھ بازار سے تھوڑے سے پکوڑے منگوا کر ان سے روزہ افطار کر لیا۔ خورشید جہاں کے ...منے ہی یہ سب ہوا تھا مگر انہوں نے ایک لفظ تک نہ کہا اور یہی بات عنبر کو بڑی شاق گزرتی تھی کہ ماں چھوٹی کے ...ملے میں ہمیشہ خاموشی اختیار کیے رہتی تھیں۔ عنبر نے بھی دل میں ہنس کر سوچا کہ آخر چھوٹی کا یہ نخرہ کب تک چل سکے گا۔ ...دن کھانے کو کچھ نہیں ملے گا تو خدا یاد آجائے گا۔

...مگر دو دن تو کیا پانچ روز ہوگئے چھوٹی نے پانی پینے کے سوا گھر کی کوئی چیز چکھی ...پھر خود ہی کھانا شروع کر دے گی۔ ...نہیں۔ بس افطاری کے وقت پڑوس کے کسی لڑکے سے پکوڑے وغیرہ منگوا کر روزہ کھول لیتی اور اسی پر اکتفا ...کے رات کو سحری کیے بغیر روزہ رکھ لیتی۔ اس طرح وہ بہت کمزور سی نظر آنے لگی۔ خورشید جہاں آخر ماں تھیں۔ کہاں ...چھوٹی کی یہ روش برداشت کرتیں۔ انہوں نے ایک دن اس کے کالج جاتے ہی عنبر کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"اے تم نے اس چھوٹی سے ایسا کیا کہہ دیا تھا جو اس نے گھر کا کھانا اور چائے وغیرہ اپنے اوپر حرام کر لیا ہے؟"

"...میں نے تو کچھ نہیں کہا تھا۔ بس وہ میرے نوکری چھوڑ دینے پر بڑا تیہا دکھا رہی تھی۔ اس پر میں نے اسے ڈانٹا ضرور تھا۔"

"خیر، ڈانٹنے ڈپٹنے پر تو وہ کبھی اس طرح نہیں روٹھتی کہ گھر کا کھانا بھی اپنے اوپر حرام کر لیتی۔ تم نے یقیناً کوئی ایسی ...بات کہی ہوگی جسے اس کی غیرت برداشت نہیں کر سکی۔"

"اُفوہ امی! مجھے تو بالکل یاد نہیں کہ میں نے ایسا کیا کہہ دیا تھا اور امی! آپ اس کے روٹھنے کو اتنی اہمیت کیوں ...دے رہی ہیں۔ خود ہی مزاج ٹھکانے آجائیں گے اس کے جب بھوک برداشت سے باہر ہو جائے گی۔" عنبر نے چڑ کر کہا۔

"اے واہ! تمہاری بھی وہی مثل ہے کہ پھٹے کو سئیں گے نہ روٹھے کو منائیں گے۔ خود تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے ...دیتیں اور اسے کہہ رہی ہو کہ فاقے کر کر کے خود ہی اس کے مزاج ٹھکانے آجائیں گے۔ جب کہ گھر میں یہ کھانے پینے کو جتنا ...بھی موجود ہے، تمہاری کمائی کا تو نہیں ہے۔ یہ تو سعد کے دیے ہوئے قرض کے پیسے سے خرید اگیا ہے۔ اب یہ تو خدا ہی ...جانے کہ یہ قرض کب اور کیسے اترے گا۔"

خورشید جہاں تڑخ کر بولیں۔

"اگر یہی بات ہے تو پھر مجھے جتانے کے بجائے آپ کو اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ مگر آپ نے تو ہر معاملے میں اسے ڈھیل ...دے رکھی ہے۔ ورنہ آپ اسے کھانا کھانے پر مجبور کرتیں تو اس کی مجال ہوتی جو وہ نہ کھاتی۔" عنبر ماں کی باتوں پر تنک ...کر بولی۔

"ہاں، اس بات کا تو واقعی مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ وہی مثل ہے کہ پچھلی ٹکیا کھائی پچھلی عقل آئی۔ خیر۔ اب وہ ...آجائے کالج سے تو میں اسے سمجھاؤں گی۔"

ماں نے بیٹی کی طنزیہ بات کا بُرا مانے بغیر گویا اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا اور عنبر ان کے پاس سے اٹھ کر برآمدے میں چلی آئی۔

پیسے والوں اور پیٹ بھروں کو تو خانساماں یا ملازمہ سے صرف اتنا ہی کہنا پڑتا ہے کہ آج یہ بنا دو یا فلاں فلاں چیزیں پکا لو۔ افطار پر تو ہلکی پھلکی چیزیں، پھل اور جوس ہی ٹھیک رہیں گے وغیرہ۔ مگر غریبوں کے لیے جو مل جائے وہ روزی کے مصداق دال روٹی اور چٹنی ہی کافی ہوتی ہے۔ جب کہ دل تو غریبوں کا بھی ہوتا ہے۔ جس کے اندر بہتر سے بہتر چیز کھانے کی خواہش ہوتی ہے مگر وہاں تو ٹھنڈا شربت بھی میسّر نہیں آتا۔

برآمدے میں آکر عنبر بڑی دیر تک یہی سوچتی رہی کہ افطاری کے لیے پکائے تو کیا پکائے۔ کیونکہ سبزیاں اور گوشت تو ختم ہو چکا تھا البتہ تھوڑے سے آلو باقی رہ گئے تھے یا پھر دالیں تھیں اور تھوڑے سے چاول اور روزہ کھولنے کے بعد صرف دال چاول کھانے پر طبیعت راغب نہیں ہوتی تھی۔ اس کے پاس تھوڑے سے پیسے پڑے تھے جن میں سے چند روپے نکال کر اس نے فوراً ہی عذیر سے گائے کا قیمہ، ٹماٹر اور بیسن منگوا لیا کیونکہ رمضان کی وجہ سے عذیر کے اسکول کے اوقات بھی بدل گئے تھے اور ان دنوں وہ ڈیڑھ گھنٹے پہلے ہی اسکول چلا جاتا تھا۔

پھر عذیر نے جلدی سے قیمہ وغیرہ لا کر دیا تو اس نے یہ سوچ کر نعمت خانے میں رکھ دیا کہ ظہر کی نماز کے بعد تھوڑی دیر آرام کر کے اطمینان سے کھانا پکا لے گی۔ کیونکہ پچھلے چند روز سے ایسی العطش گرمی پڑ رہی تھی کہ گیارہ بجے سے ہی چیل انڈا چھوڑتی نظر آتی تھی اور باورچی خانہ تو بلا چولھا جلائے ہی اتنا تپتا تھا کہ وہاں چند منٹ کھڑا ہونا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ اسی لیے اس نے سوچا تھا کہ ذرا دھوپ کی تمازت میں کمی آجائے تب افطار کے ساتھ ساتھ سحری کے لیے بھی کھانا تیار کر لے گی۔ کرنے کو کوئی اور کام تو تھا بھی نہیں۔

اس نے بیٹھک کی جھاڑ پونچھ کے بعد برآمدے میں پھیلی ہوئی چیزوں کو سمیٹ کر رکھا اور پھر ماں کے پاس بیٹھ کر ان کے لیے خرید کر لائے ہوئے دوپٹے پر بیل ٹانکنے لگی۔ کیونکہ ماں کو شروع ہی سے بیل اور ٹھپک لگے دوپٹے اوڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اور یوں دیکھتے دیکھتے دن کا ایک بج گیا۔ کچھ ہی دیر بعد محلے کی مسجد سے اذان کی آواز آئی تو خورشید جہاں جو کمزوری کی وجہ سے نڈھال سی پڑی تھیں اٹھ کر وضو کرنے چلی گئیں۔

اس نے بھی دوپٹہ تہہ کر کے ایک طرف رکھا اور ماں کے آتے ہی خود بھی وضو کرنے چلی گئی۔ بہرحال وضو کرنے کے بعد اس نے ظہر کی نماز بیٹھک میں ادا کی اور جب نماز سے فارغ ہو کر کمرے میں پہنچی تو دیکھا روزہ دار ماں ضعف اور گرمی کی شدت سے نڈھال ہو کر نماز کی چوکی پر ہی بے سدھ پڑی سو رہی ہیں۔ اس نے انہیں ہلا جلا کر بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور ٹیبل فین (جو ریوالونگ نہیں تھا) کو ان کے قریب کر کے آہستگی سے بیٹھک میں چلی آئی اور چھت کا پنکھا کھول کر فرش پر بچھی دری پر چادر اور تکیہ ڈال کر خود بھی لیٹ گئی۔ صبح سے اب تک اس نے آئندہ ملازمت کرنے کے بارے میں نہ معلوم کیا کیا سوچ ڈالا تھا اور غزل کے ساتھ معاملہ بگڑ جانے کا بھی اسے بڑا قلق تھا۔ کیونکہ اگر وہ اس کی پیش کردہ آفر کو قبول کر لیتی تو اس کے سیچ مچ وارے نیارے ہی ہو جاتے۔

وہ چھت کے پنکھے کے نیچے لیٹی تھی جسے چھوٹی اس کی گھر گھر کرنے کی آواز پر ممبو جمبو کہتی تھی۔ اس پر ہلکی سی غنودگی طاری ہوئی ہی تھی کہ بیٹھک کے داخلی دروازے پر دستک دینے کی آواز آئی اور اس نے اپنی نیم خوابیدہ سی آنکھیں کھول کر دیوار پر لگے گھنٹے کی طرف دیکھا۔ ابھی صرف پونے دو ہی بجے تھے جب کہ رمضان کی وجہ سے چھوٹی کے کالج کے اوقات بھی بدل گئے تھے اور وہ ڈھائی بجے کے بعد ہی گھر واپس آتی تھی۔ عذیر کے آنے کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔ کہیں سعید یا فہد میں سے کوئی نہ آیا ہو۔

وہ خاموش لیٹی یہی سوچتی رہی۔ ٹھیک ہے اگر ان دونوں بھائیوں میں سے کوئی آیا ہے تو دروازہ بند دیکھ کر خود ہی چلا جائے گا۔ امی سو رہی ہیں اور میں تو ہرگز بھی ان کے سامنے نہیں پڑوں گی۔ مگر جب وقفے وقفے سے دروازے کو زور سے کھٹکھٹایا جانے لگا تو وہ بادلِ ناخواستہ اٹھی۔ دوپٹے کو قرینے سے اوڑھا اور بڑے ناگوار سے تاثرات کے ساتھ بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور دروازے پر ایک پکی عمر کی عورت کو سرخ بارڈر کی آسمانی سوتی ساڑھی باندھے اور اپنے مختصر بالوں کا جوڑا بنائے اور ایک کالا سا پرس تھامے کھڑا پایا۔ اسے دیکھ کر تو اس کی تیوری چڑھ گئی۔ پتا نہیں کون ہے جس لیے یہاں آئی ہے بھلا کیا ضرورت تھی اتنی گرمی اور دوپہر میں دوسروں کے آرام میں خلل ڈالنے کی۔ اس نے کوفت کے عالم میں سوچا۔ وہ برا مان کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ نووارد نے سرتاپا اس پر ایک گہری نظر ڈال کر پوچھا۔

"بی بی! کیا مس خان یہیں رہتی ہیں؟"

"کون سی مس خان؟" اس نے درشتی سے پوچھا تو وہ عورت کچھ دیر تک الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولی۔

"کون سی کہہ کر تو آپ نے مجھے پزلڈ کر دیا بی بی۔ کیونکہ میں ذاتی طور پر تو ان سے واقف نہیں ہوں، البتہ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ اے۔ ایس گارمنٹس میں لیڈی سپروائزر کے طور پر کام کر رہی تھیں۔"

اور اس عورت کے منہ سے اے۔ ایس گارمنٹس کا نام سُن کر تو اس کے تیور ہی بگڑ گئے۔ یقیناً ان دونوں بھائیوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ عورت اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مجھے رام کر لے گی مجھے سمجھانے بجھانے کے لیے اسے بھیجا ہے۔ اس نے دل میں سوچا اور بڑے طیش کے عالم میں بولی۔

"دیکھیں، اگر ان لوگوں نے آپ کو اس غرض سے میرے پاس بھیجا ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر شیشے میں اتار لیں گی تو یہ محض ان کی ہی نہیں آپ کی بھی خوش فہمی ہی ہوگی۔ ورنہ میں تو—"

"اچھا تو آپ ہی مس خان ہیں۔ چلیں، یہ اچھا ہی ہوا کہ براہ راست آپ سے ملاقات ہو گئی۔" اس کے غصے کو نظر انداز کر کے عورت خوشی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

"جی ہاں میں ہی مس خان ہوں اور مجھ ہی سے آپ کی ملاقات بھی ہو گئی ہے مگر ٹو بی ویری فرینک، اس سے زیادہ میں آپ سے کوئی بھی بات کرنے کی متحمل نہ ہو سکوں گی۔" عنبر نے گویا صاف گوئی کی انتہا کر دی۔ اور وہ عورت جو اس کے اس قدر غیر روادارانہ رویّے کو نہ صرف سمجھ ہی نہ سکی بلکہ سخت متعجب سی ہو رہی تھی اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"مگر میں اس بھری دوپہر میں بڑی دور سے اور انتہائی ضرورت کے تحت آئی ہوں مس خان۔ اس پر روزے سے بھی ہوں۔ آپ ازراہ اخلاق اور انسانیت کم از کم میری بات تو سُن لیں۔ میں آپ کا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گی بس صرف پانچ منٹ بات کروں گی۔" عورت کے کہنے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ عنبر مزید اسے دھتکار نہ سکی اور قدرے تامل کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا آئیے۔ اندر آجائیے۔"

"اوہ بڑا شکریہ بڑی مہربانی آپ کی۔" عورت نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

عنبر نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا اور وہ جلدی سے بیٹھک میں چلی آئی۔ اور خود ہی صوفے پر بیٹھ کر تھوڑی دیر تک پنکھے کی ہوا لیتی رہی۔ پھر اس نے عنبر کی طرف دیکھ کر کہا جو اس کی بات سننے کی منتظر سی بڑی بیزاری کے عالم میں کھڑی تھی۔

"پتا نہیں آپ کیا سمجھیں ورنہ میں تو آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔"

"دیکھیں خاتون میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں آپ کی کوئی بات نہیں سُنوں گی کیونکہ میرا اب اس اے۔ ایس گارمنٹ سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا ہے۔" عنبر تیز لہجے میں بولی۔

"ہاں ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے اور اسی لیے میں اپنی کمپنی کی طرف سے آپ کے لیے ایک آفر لے کر آئی ہوں۔" عورت جلدی سے بولی۔

"آپ کی کمپنی؟" عنبر نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"جی ہاں ہماری کمپنی کا نام رنگینز ہے جہاں صرف ڈیزائننگ کی جاتی ہے اور آپ کو جو آفر ہم دے رہے ہیں اس میں ہینڈسم سیلری کے ساتھ دوپہر کا کھانا، چائے، کنوینس، میڈیکل وغیرہ سب فری ہوگا۔ ہاؤس الاؤنس بھی دیا جائے گا اور سال میں دو مرتبہ بونس بھی!"

عورت نے گویا اپنے آنے کی غرض و غایت بیان کی۔

اور عنبر نے اسے امدادِ غیبی سمجھ کر دل ہی دل میں خوش ہو کر بظاہر اس آفر کو غیر اہم ثابت کرتے ہوئے سنجیدہ سی شکل بنا کر پوچھا۔

"جب آپ مجھ سے واقف تک نہیں تھیں تو پھر میرا پتا آپ نے کیسے معلوم کر لیا؟"

"بتول سے۔" عورت نے بتایا۔

"کون بتول؟ میں تو کسی بتول کو نہیں جانتی۔"

"مگر وہ آپ کو اچھی طرح جانتی ہے۔ شاید آپ کو خیال نہ رہا ہو۔ وہی سیل گرل جو اے۔ ایس گارمنٹس میں کام کرتی ہے۔"

عورت نے کہا تو اس نے بھی سوچا کہ اس نے چند روز ہی تو اس فیکٹری میں کام کیا تھا اور اس کا تعارف بھی وہاں کے عملے سے نہیں کرایا گیا تھا اور وہاں جو کئی سیل گرلز ہیں ممکن ہے انہی میں سے کسی کا نام بتول ہو۔ یہی سوچ کر اس نے کہا۔

"ہاں وہاں تو کئی سیل گرلز کام کرتی ہیں، مگر میں نے آپ کو تو وہاں نہیں دیکھا تھا۔ پھر آپ۔"

"نہیں میں وہاں تو کام نہیں کرتی۔ میں تو بہت عرصے سے "رینکنز" سے وابستہ ہوں۔ ہماری کمپنی میں لیڈیز جینٹس اور بچوں کے کپڑوں کی ڈیزائننگ ہوتی ہے۔ اور جتنے بھی گارمنٹس کے شعبے ہیں۔ ان سب کو ہمارا ہی ڈیزائن کردہ مال سپلائی ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارا شمار اعلا پیمانے کی کمپنیوں میں ہوتا ہے، اور چونکہ شادی ہو جانے کی وجہ سے ہماری ایک ڈیزائنر چلی گئی ہے اس لیے میں اس کی جگہ آپ کو اپائنٹ کرنے آئی ہوں۔ اسکیل اور بیسک پے ملا کر آپ کو ساڑھے تین ہزار ملا کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری آفر کو ضرور قبول کر لیں گی اور مجھے شکریہ کا موقع دیں گی۔"

"اوہ۔ ساڑھے تین ہزار اور اس کے ساتھ اتنی ساری فیسیلیٹیز (FACILITIES) عنبر کا حالات اور گرمی سے کملایا ہوا دل اچانک ہی باغ باغ سا ہو گیا۔ مگر اپنی اس کیفیت کو اس عورت پر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"مگر آپ کو یہ کس نے بتایا کہ میں ڈیزائننگ جانتی ہوں۔"

"اسی بتول نے بتایا تھا۔" عورت بولی۔

"اُف پتا نہیں یہ بتول کون ہے جسے میں جانتی تک نہیں، اور اس نے میرے بارے میں خوامخواہ ہی بڑ ہانک دی۔ ورنہ میں تو ڈیزائننگ کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہوں۔" اس نے بتانے کو تو بتا دیا مگر دل میں اس بات پر ڈرتی رہی کہ کہیں یہ عورت اپنی اتنی عمدہ آفر واپس نہ لے۔ کیونکہ عورت کسی سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"خیر کوئی مضائقہ نہیں اگر آپ کو ڈیزائننگ نہیں بھی آتی تو بھی آپ اس آفر کو قبول کر لیں۔" قدرے توقف کے بعد عورت نے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ جو کام میں کرنے کے قابل نہیں اُسے آپ کے کہنے پر قبول کر لوں۔ یہ تو دھوکا دینا ہوا آپ کی کمپنی کو۔" عنبر کو خیال گزرا کہ آخر یہ اجنبی عورت اسے مجبور کیوں کر رہی ہے، تو اس نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔

"اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں مس خان۔ دراصل میرے باس بہت سخت گیر ہیں ان ہی ایمپلائز کو پسند کرتے ہیں جو کمپنی کے دوسرے کاموں میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ ڈیزائنر کی جگہ خالی ہوئی تھی، میں نے سوچا۔ یہ کسی معقول آسامی کو ڈھونڈ کر ان کی نظروں میں چڑھ جاؤں گی۔ میں نے بتول سے پوچھا کہ اُسے کسی ڈیزائنر کے بارے میں معلوم ہو تو مجھے بتا دے۔ اس نے مجھے آپ کا پتا دیا۔ اور میں نے بلا جانے بوجھے باس سے آپ کا ذکر کر دیا کہ میں نے آپ کی کمپنی کے لیے ایک بہت اچھی اور مشاق ڈیزائنر ڈھونڈ لی ہے۔ بس پھر کیا تھا باس نے آپ سے کونٹیکٹ کرنے اور آپ کو آفر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ اب اگر آپ نے یہ آفر ٹھکرا دی تو میں اپنی نوکری سے جاؤں گی۔ میں تو پہلے ہی حالات کا شکار ہوں۔ بیوہ اور چار بچوں کی ماں ہوں۔ خدا کے لیے مس خان مجھ پر رحم کیجیے اور اس آفر کو قبول کر لیجیے۔" آخری فقرہ کہتے کہتے اس عورت کا گلا رندھ گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ ہی سوچیے، جب آپ کے باس اتنے سخت گیر ہیں تو وہ بھلا میرے ناکارہ وجود کو کیسے برداشت کر لیں گے؟" عنبر نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔

"نہیں آپ اس کی فکر نہ کیجیے۔ آپ بس کسی طرح ہماری کمپنی میں آ تو جائیں۔ پھر میں مینجر صاحب سے کہہ سن کر آپ کو کسی اور کام پر لگوا دوں گی اور باس کو پتا بھی نہیں چلے گا۔" وہ عورت اس طرح بولی، جیسے بس ہاتھ جوڑنے کی کسر باقی رہ گئی ہو۔

"اچھا۔ مگر پھر وہ ڈیزائنر کی آسامی کا کیا بنے گا؟" عنبر کا دل کسی طرح ٹھک ہی نہیں رہا تھا۔

"وہ اصل میں میرے علاوہ بھی چند اور ورکرز ہیں جو ڈیزائنر کی تلاش میں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کسی کو جلد ہی کوئی ڈیزائنر مل جائے گی۔ مگر میری طرف سے اتنا تو ہو گا کہ میں نے بھی کسی کو کمپنی میں رکھوایا ہے پلیز اب آپ زیادہ سوچیں نہیں اور ہاں کر دیں۔" عورت بولی۔

"ویسے یہ آپ کی کمپنی ہے کس علاقے میں؟" عنبر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔

"کمپنی تو انڈسٹریل ایریا میں ہے، مگر ان کا مین آفس کورنگی کریک کے علاقے میں ہے۔"

"اُف اتنی دور۔" عنبر نے تھوڑی سی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں، دور اور نزدیک کا تو کوئی پرابلم ہی نہیں ہے۔ کمپنی کی وین روز آپ کو پک اینڈ ڈراپ کیا کرے گی۔ ہاں البتہ کل آپ کو خود آفس پہنچنا پڑے گا۔ واپسی میں وین آپ کو گھر چھوڑ جائے گی۔ اس طرح ڈرائیور بھی آپ کا گھر دیکھ لے گا۔"

"وہ تو دیکھ ہی لے گا۔ لیکن اتنی جلد تو میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی نا۔ جبکہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھے کس قسم کا کام کرنا ہو گا۔ کیا پوسٹ ہو گی میری۔ کیونکہ ڈیزائننگ کے معاملے میں تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں بالکل نابلد ہوں۔" عنبر بولی۔ وہ واقعی فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ ڈیزائنر کی آفر کو قبول کرے یا پھر مسترد کر دے۔ کیونکہ ڈیزائنر کی آفر تو اسے دے دی گئی تھی۔ اور اس کی جگہ کوئی دوسرا کام دلوانا تو بعد کی بات ہوئی نا۔ عنبر کو افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی اچھی آفر کو ایک بار پھر اسے مسترد کرنا پڑے گا۔

"آپ کیا سوچنے لگیں مس خان۔ آخر آپ کو تامل کس بات پر ہے۔ اچھا ایسا کریں؟ آپ کل ہمارے آفس آ کر خود مینجر سے بات کر لیں۔ ٹھہریں میں آپ کو اپنی کمپنی کا کارڈ دیتی ہوں۔ آپ ساڑھے نو بجے تک وہاں پہنچ جائیے گا۔" عورت نے اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا اور اپنا پرس کھول کر کارڈ نکالنے لگی۔ عنبرین نے بھی سوچا کہ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ ساتھ کے ساتھ مینجر سے بھی بات ہو جائے گی۔ اس لیے وہ خاموش رہی۔

"اوہو۔ نامعلوم یہ کارڈ کدھر چلا گیا۔ میں نے تو پرس میں ہی ڈالا تھا۔" عورت پرس کو کھنگالتی ہوئی بولی۔ پھر پرس کو بند کر کے اُس نے کہا۔

"کارڈ تو ملا نہیں، شاید کہیں گر گیا ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ آپ کو ساری لوکیشن سمجھا دیتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی آپ پتا بھی لکھ لیں۔"

"ہاں بشرطیکہ میں ٹھیک پتے پر پہنچ جاؤں۔" عنبر پہلی بار مسکرا کر بولی۔

"کیوں کیا آپ تنہا آئیں گی؟" عورت نے پوچھا۔

"ہاں تنہا ہی آنا پڑے گا۔ کیونکہ بھائی تو اسکول چلا جاتا ہے۔"

"کیا آپ اس وقت گھر پر تنہا ہیں؟" اس عورت نے پوچھا۔

"نہیں والدہ بھی ہیں، اندر کمرے میں سو رہی ہیں۔" عنبر بولی۔

"اور کتنے بھائی ہیں آپ کے؟" عورت نے پھر سوال کیا۔

"بس ایک بہن اور ایک بھائی ہے میرا۔ ویسے مجھے بڑا افسوس ہو رہا ہے اس وقت کہ آپ ایسے موقع پر آئیں کہ میں آپ کی خاطر بھی نہیں کر سکی۔" عنبر پر ایکدم ہی اخلاقیات نے دھاوا بولا۔ تو اُسے انجانے مہمان کی خاطر تواضع کا خیال آیا۔

"ارے نہیں، آپ نے محبت سے بات کر لی میرے لیے یہی بہت ہے۔ یوں بھی رمضان کا مہینہ ہے اور اس میں

کب کسی کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔" عورت نے اس کی بات کے جواب میں کہا، اور پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔

" او ہاں۔ مجھے ابھی ابھی یہ خیال آیا کہ آپ تنہا آئیں گی تو آپ کو پتا ڈھونڈنے میں بڑی دقت ہو گی۔ ایسا کیوں نہ کروں کہ ڈرائیور کو پتا سمجھا کر آپ کے گھر بھیج دوں۔ وہ آپ کو آرام سے آفس پہنچا دے گا۔"

" نہیں میں ڈرائیور کے ساتھ تنہا نہیں جاؤں گی۔ بس آپ اطمینان رکھیں۔ میں خود ہی وقت پر وہاں پہنچ جاؤں گی۔" عنبر بولی۔

" نہیں آپ کو تکلیف ہو گی اچھا میں ایسا کروں گی کہ کمپنی کی گاڑی میں خود آپ کو لینے آ جاؤں گی، اور اگر اس پر بھی اطمینان نہ ہو تو آپ اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لے چلیے گا۔" عورت نے کہا۔

" نہیں جب آپ آئیں گی تو پھر بھائی کو ساتھ لے جانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ آپ خود ہی دیکھیں ناں۔ تنہا تو ایک ڈرائیور کے ساتھ میرا جانا مناسب نہیں ہوتا نا۔ والدہ تو ہرگز کبھی اجازت نہیں دیتیں۔" عنبر نے اس کی تجویز کو قبول کرتے ہوئے اپنی مجبوری سے اسے آگاہ کیا۔

" ہاں اسی لیے تو میں نے سوچا کہ میں خود کیوں نہ آپ کو پک کرنے آ جاؤں۔" عورت نے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

" اچھا تو پھر کل صبح ٹھیک نو بجے تیار رہیے گا۔ اصل میں وہ کام کا وقت ہوتا ہے۔ ڈرائیور کو وین لے کر دوسری ورکرز کو بھی پک کرنا پڑتا ہے۔"

" ٹھیک ہے، آپ میری طرف سے تو اطمینان رکھیے، میں کیل کانٹے سے بالکل لیس ملوں گی آپ کو۔" عنبر تھوڑا سا ہنس کر بولی۔ عورت ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی بات پہ خود بھی ہنس کر بولی۔

" اچھا تو پھر اب اجازت دیں باقی آئندہ۔ عورت نے بڑے جونجال لہجے میں کہا۔

" اچھا۔ اچھا۔ او کے دین بائی۔" عنبر بولی۔ اس عورت نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اور خدا حافظ کہہ کر دروازے کا رخ کیا۔ عنبر دروازہ بند کرنے کی غرض سے اس کے ساتھ ہی دروازے تک آئی، تو اس عورت نے جاتے جاتے دروازے پر رک کر اس کی طرف دیکھا، اور ہنستے ہوئے انداز میں بولی۔

" میں نے اپنے ذہن میں آپ کی جو تصوراتی شبیہہ بنائی تھی۔ وہ تو کچھ ایسی تھی جیسے وہ عام سی ایمپلائز ہوتی ہیں۔ سکڑی سمٹی سانولی یا موٹی بھدی اور ٹھوس بدن کی، مگر آپ تو ماشاءاللہ چندے آفتاب چندے مہتاب نکلیں۔"

اور جیسا کہ تقریباً ہر انسان کی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو جاتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے۔ اسی طرح عنبر بھی ہنسنے لگی۔ پھر وہ عورت بیٹھک کی مختصر سی سیڑھیاں اتر کر گلی میں آگے بڑھ گئی تو عنبر نے بھی بیٹھک کے دروازے کا اندر سے کھٹکا لگایا۔ کچھ دیر وہیں کھڑی کچھ اپنی تعریف پر اور کچھ بیٹھے بٹھائے ایک اتنی اچھی آفر آنے پر۔۔۔ خوشی سے سرشار ہوتی رہی۔ پھر قدم بڑھا کر کمرے میں جھانکا۔ ماں ابھی تک سو رہی تھیں۔ بلکہ چوکی پر نہیں وہ پلنگ پر لیٹی تھیں۔

اس سمے ڈھائی بجنے کو تھے، اور چھوٹی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ ادھر صبح کا منگایا ہوا سودا ابھی نعمت خانے میں جوں کا توں پڑا تھا۔ حتیٰ کہ قیمے کو اس نے دھویا تک نہ تھا۔ مگر اب پروا کسے تھی۔ اس کا ذہن تو طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سب سے پہلے تو یہ خیال کہ اس کمپنی میں زیادہ تر خواتین ہی کام کرتی ہیں۔ بڑا خوش کن تھا۔ کیونکہ اب ماں کے اعتراض اور منع کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ دوسری یہ بات بھی سعد کو نیچا دکھانے کے لیے کیا کم تھی کہ اسے اس کی پیش کردہ ملازمت سے کہیں اچھی ملازمت مل رہی ہے، اور پھر سب سے زیادہ اس بات کی خوشی کہ اب اچھا کھانے اور اچھا پہننے کو تو نصیب ہو گا وہ بھی عزت کے ساتھ۔

اسی خوشی کے عالم میں پہلے اس نے سوچا کہ ماں کو جگا کر یہ مژدہ سنا دے کہ اسے گھر بیٹھے بیٹھے ایک اتنی

اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ اگر امی کو بتاؤں گی تو وہ بال کی کھال کھینچنے کے مصداق کمپنی کے بارے میں ایک ایک بات پوچھیں گی۔ اور سعد سے نہ صرف اس کا ذکر کریں گی بلکہ معلومات بھی کرائیں گی۔ اور سعد یقیناً اس معاملے میں میری کاٹ ہی کرے گا۔ اس پہ چھوٹی بھی ایک چلتر ہے کوئی نہ کوئی چرکہ ضرور لگائے گی اپنی زبان سے۔۔۔ اور یوں کل کل ہی نہیں، ایسی بدمزگی پیدا ہو گی کہ یہ نوکری بھی ہاتھ سے چلی جائے گی۔

یوں بھی جب میں اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا چاہ رہی ہوں تو مجھے اس قدر کمزور اور بودا تو نہیں ہونا چاہیے کہ دوسروں کے اشاروں پر ہی ناچتی رہوں یا دوسروں کے مشوروں پر ہی عمل کروں۔ آخر میری اپنی بھی تو کوئی حیثیت اور مقام ہے۔ میں امی کو بتاؤں گی ضرور مگر پوری قطعیت کے ساتھ، فیصلہ کن انداز میں ہی بتاؤں گی کہ میں نے ایک اور کمپنی میں ملازمت ڈھونڈ لی ہے۔

ہاں ڈھونڈنا ہی زیادہ بہتر رہے گا کیونکہ اگر کر لی ہے کہہ دیا، اور وہاں ان فٹ ثابت ہوئی تو خواہ مخواہ ہی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ مگر نہیں وہ عورت تو بڑے دعوے سے کہہ رہی تھی کہ وہ وہاں مجھے کوئی اور کام دلوا کر رہے گی۔ اور کوئی اور کام ملنا بھی ایسا مشکل نہ ہو گا۔

اس روز اس کا موڈ بھی بڑا خوشگوار تھا۔ عصر کی نماز اول وقت ادا کرنے کے بعد باورچی خانے میں گھس گئی۔ اور بڑے شوق و لگن سے قیمہ پکایا۔ پکوڑے تلے اور باریک باریک چپاتیاں ڈالیں اور ان سب کے ساتھ ہی سحری کے لیے شامی کبابوں کا قیمہ چولہے پر چڑھا دیا۔ اور جب افطار کا وقت آیا، تو اس نے آہستہ سے ماں سے کہا۔

" میں نے یہ ساری چیزیں کتنے شوق سے بنائی ہیں امی! آج تو چھوٹی سے کہہ دیجیے کہ وہ بھی کچھ کھا لے۔"

" مگر میں کیوں کہوں۔۔۔ تم خود ہی کہہ دو۔۔۔ آخر تو اس کی بڑی بہن ہو۔" ماں نے گویا ٹکا سا جواب دے دیا۔

" میں تو سو بار کہہ دوں۔ مگر آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ کتنی ضدی ہے۔ اگر انکار کر دیا تو میری بات جائے گی۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے اس کا، نہ کھا کھا کر۔ کمزور الگ ہو گئی ہے۔ مجھے تو اس پر بڑا ترس آتا ہے۔"

چونکہ اس کا موڈ اچھا تھا اس لیے ماں کی بات کا برا مانے بغیر بہن کی حالت زار پہ وہ ملول سی ہو کر بولی۔۔۔ ماں نے اس کی بات کا کوئی جواب تو نہیں دیا۔ مگر دسترخوان پر بیٹھتے ہی انہوں نے وہ پکوڑے جو چھوٹی نے عذیر سے اپنے لیے منگوائے تھے اس کے آگے سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

" لاؤ یہ پکوڑے مجھے دے دو اور تم یہ بہن کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں کھاؤ۔ اے ہاں اب یہ تمہاری نخرے بازی زیادہ نہیں چلے گی۔ لو بھلا اچھا خاصا رزق چھوڑ کر بازار کی چیزیں کھائی جانے لگیں۔ اب ایسی بھی نہیں ہو۔"

" نہیں امی میں نوبت غریب ہوں۔ مگر اتنی بے غیرت نہیں ہوں کہ دوسروں کے ٹکڑوں پر عیش کروں۔ میری تو بس۔۔۔"

" اے بس خاموش۔ خبردار جو میرے منہ لگیں۔ اے اگر بڑی بہن نے غصے میں کچھ کہہ بھی دیا تو تم ایسی نکیلی ہو کر دل پہ لے کر ہی بیٹھ گئیں۔ چلو کھاؤ سیدھی طرح ورنہ میں اگر اٹھ گئی نا تو تم لاکھ جتن بھی کر لو گی تو میں ایک بھورا بھی زبان پہ نہیں رکھوں گی۔ اے ہاں ایک تو رمضان کا بابرکت مہینہ، اس پہ عین افطار کے وقت۔ نا۔ نا۔ تمہارے دل میں تو کسی بات کا احترام بھی نہیں رہا۔"

ماں نے لتاڑا تو چھوٹی نے اسی ڈر سے کہ اگر واقعی ماں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تو پھر خواہ ادھر کی دنیا ادھر بھی ہو جائے، وہ ہرگز ہرگز کھانے کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔ ادھر عنبر نے بھی کہا۔

" بھئی اب غصہ تھوک دو اور جلدی سے روزہ افطار کر لو ورنہ مکروہ ہو جائے گا۔" تو طوعاً و کرہاً اسے کھانا ہی پڑا۔ عنبر خود ہی اسے قیمہ وغیرہ پیش کرتی رہی۔ مگر چھوٹی کا منہ پھولا ہی رہا۔

" اے یہ آپ کے رخ روشن نے غبارے کی شکل کیوں اختیار کر رکھی ہے مس فرحین شہباز خان۔ کہیں امی یا

آپا نے آپ کی پٹائی تو نہیں کر دی صبح کو۔" عذیر نے چھوٹی کے بھولے بھولے چہرے پہ چوٹ کی۔

"کاش پٹائی ہی کر دی جاتی مگر وہاں تو۔" چھوٹی نے آزردگی سے کہنا چاہا۔

"اے بس۔ چپ بیٹھ بدذات۔ بڑا آیا بہن کی پٹائی کرانے والا۔ یہ تجھ سے بڑی ہے، سمجھا اس سے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہ کیا کر۔" ماں نے چھوٹی کی بات ان سُنی کر کے عذیر کو جھڑکا۔ تو وہ گدی دبا کر مسکراتا ہوا پلیٹ پر جھک گیا۔ پھر مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد عنبر کا دل چاہا کہ ماں کو نوکری مل جانے کی خوشخبری سُنا دے۔

مگر وہ اس ڈر سے اپنی اس چاہت کو دل میں ہی دبا کر رہ گئی کہ کہیں ماں اس نوکری کے بارے میں معلومات کرانے سعد کو نہ بُلالیں۔ لہٰذا اب تو سحری پر ہی انہیں بتائے گی۔ مگر سحری کے وقت کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک تو ان تینوں ماں بیٹیوں کی آنکھ دیر سے کھُلی، اس پر کبابوں کا قیمہ پیسنے اور کباب تلنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ نوالہ منہ میں اور پانی کا گلاس ہاتھ میں، ڈھنگ سے چائے بھی نہیں پی جا سکی کہ اوقاتِ سحر کا اختتامی سائرن بجنے لگا تھا۔ عذیر تو بھاگ کر نمازِ فجر ادا کرنے محلے کی مسجد میں چلا گیا تھا۔ اور ان تینوں ماں بیٹیوں نے گھر میں نماز ادا کی تھی۔ نماز کے بعد تلاوتِ کلامِ پاک۔

اتنا وقت ہی نہیں ملا تھا کہ وہ ماں کو کچھ بتا سکتی۔ اِدھر ماں تو تلاوتِ کلامِ پاک اور درود و وظائف سے فارغ ہو کر سو جاتی تھیں۔ اور خود وہ بھی، حتیٰ کہ عذیر بھی مسجد سے آتے ہی لمبی تان لیتا تھا۔ ایک صرف چھوٹی ہی جاگتی رہتی تھی۔ کیونکہ اسے کالج کے لیے آٹھ بجے گھر سے نکلنا ہوتا تھا۔ مگر اس روز عنبر خلافِ معمول جاگ رہی تھی۔

بلکہ اپنے اس لباس پہ جو کمپنی پہن کر جانے کے لیے اس نے رات ہی کو نکال کر رکھ دیا تھا استری کر رہی تھی۔ پھر جب چھوٹی کے کالج جانے کا وقت ہونے لگا تو عنبر نے آخر ماں کو جگا ہی دیا۔ کیونکہ وہ چھوٹی کو بھی یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی۔ اور چھوٹی چونکہ اس سے روٹھی ہوئی تھی، اس لیے اس نے چھوٹی سے بات کرنے میں پہل کرنا اور اسے بتانا مناسب۔ نہیں سمجھا تھا۔

"امی پتا بھی ہے میں آپ کو ایک زبردست خوشخبری سُنانے آئی ہوں، آج صبح ہی صبح۔" اس نے ماں کو جگا کر بڑے پرچنچال انداز میں کہا۔

"اچھا۔ کیا تمہارا بانڈ وانڈ نکل آیا ہے۔" ماں نے خوشخبری کو اہمیت نہ دیتے ہوئے یونہی سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں امی، بانڈ تو لاٹری کی طرح ہوتا ہے جو قسمت سے ہی کسی کو ملتا ہے۔ مجھے تو ملازمت ملی ہے ملازمت۔ ساڑھے تین ہزار روپے ماہوار، اور اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا، شام کی چائے اور آمدورفت کا کرایہ۔ علاج معالجہ سب مفت۔ سال میں دو مرتبہ بونس۔ یعنی اکیس ہزار روپے ہر چھ ماہ بعد۔"

"ہائیں، تم ٹھیک ٹھاک تو ہو بچی۔ یہ ایک دم ہی کیا عرش سے اتاری گئی ہے تمہارے لیے نوکری۔ ورنہ صبح تک تو تم نے ایسی بہکی بہکی بات نہیں کی تھی۔" اور وہ ماں کے حیرت آمیز طنز پہ خوب ہنس لینے کے بعد بولی۔

"نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ دراصل کل دوپہر کو جب آپ سو رہی تھیں تو۔" پھر اس نے عورت کے آنے کی غرض و غایت بیان کر کے کہا۔

"میں تو آپ کو کل ہی بتا دیتی، مگر میں نے سوچا صبح ہی صبح آپ کو سرپرائز دوں گی تو زیادہ اچھا رہے گا۔"

"ہیں کیا دوگی؟" خورشید جہاں نے بھنویں اُچکا کر پوچھا۔

"حیرت آمیز خوشی یا خبر جو اچانک ہی کسی کو دی جاتی ہے، اور میں نے یہی سوچا کہ صبح ہی صبح آپ کو یہ خوشخبری سُنا دوں گی۔ تو آپ کو مشکل سے ہی یقین آئے گا۔" عنبر نے انہیں سرپرائز دینے کا مطلب سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں تو یقین کیسے آسکتا ہے کیونکہ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ ایک دم ہی کسی عورت کا آنا اور نوکری کی پیش کش کرنا۔ مگر آخر وہ تھی کون۔ تمہاری اس سے کچھ واقفیت تو ہوگی؟" خورشید جہاں کے انداز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں واقعی یقین نہ آیا ہو۔

"نہیں، واقفیت کیسی، میری تو اس سے کل ہی ملاقات ہوئی ہے۔" عنبر نے بتایا۔

"اے لو یہ تو وہی مثل ہو گئی کہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ تمہاری اس سے واقفیت بھی نہیں ہے پھر وہ کیسے تمہیں جانتی ہے، جو تمہیں نوکری دلوانے چلی آئی۔" خورشید جہاں کو تجسس نے بُری طرح آگھیرا تھا۔

"وہ اصل میں فہد کی فیکٹری میں بتول نامی ایک سیل گرل کام کرتی ہے، بس اس نے اس عورت کو میرا پتا بتایا تھا۔"

عنبر نے کہا اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اس عورت کو اپنی کمپنی کے لیے ایک ورکر کی تلاش تھی۔ اس نے بتول سے ذکر کیا کہ وہ کسی لڑکی کو جانتی ہو تو اس کا پتا بتا دے۔ لہٰذا بتول نے میرا نام لے دیا۔ شاید قدرت کی مہربانی تھی یہ بھی۔ ورنہ اتنی اچھی ملازمت تو بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد قسمت سے ہی کسی کو ملتی ہے۔" اور ماں اس کی بات سن کر چپ سی ہو گئیں۔

"امی آپ ہی تو کہا کرتی ہیں کہ ایک در بند تو ستر کھلے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اور اس نوکری میں تو مجھے تین ہزار سے زیادہ ہی ملیں گے۔ اس پہ سال میں دو مرتبہ بونس بھی ملے گا۔ پچھلی ملازمت سے تو یہ کہیں اچھی ملازمت ہے امی۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ بغیر جوتیاں گھسے گھر بیٹھے بیٹھے اتنی اچھی ملازمت مل گئی ہے مجھے۔" ماں کو خاموش سا دیکھ کر عنبر نے کہا۔

"ہاں ملازمت تو واقعی بہت اچھی ہے بچی۔ مگر میں سوچ رہی ہوں کہ پہلے اس کمپنی کے بارے میں تو چھان بین کرا لو۔ صرف ایک اجنبی عورت کا آنا۔ اور نوکری کا پروانہ ہاتھ میں دے دینا ہی تو کافی نہیں ہوتا۔" خورشید جہاں سوچتے ہوئے انداز میں بولیں۔

"خیر، ابھی نوکری کا پروانہ تو ہاتھ میں نہیں دیا، اس نے صرف ملازمت کی پیش کش ہی کی ہے۔ البتہ ابھی نو بجے اپنے مین آفس میں ضرور بلایا ہے مجھے۔ اب وہیں جا کر سارے معاملات طے ہوں گے۔" عنبر ماں کی باتوں پر زِچ سی ہو کر بولی۔

"مگر یہ کمپنی ہے کس علاقے میں آپا۔" چھوٹی جو بڑی دیر سے ماں اور بہن کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے اپنی خفگی کو ایک طرف رکھ کر پوچھا۔

"کمپنی تو انڈسٹریل ایریا میں ہے، اور مین آفس کورنگی کریک کے علاقے میں ہے۔" عنبر نے بتایا۔

"کورنگی کریک آپا؟ میں نے تو آج تک ایسے کسی علاقے کا نام نہیں سُنا۔" چھوٹی بولی۔

"لو کورنگی کا ذکر تو اخباروں میں بھی آتا ہے۔ اور کورنگی کریک بھی کورنگی کا ہی ایک علاقہ کہلاتا ہے۔ ادھر کالے پُل سے جو شیطان کی آنت کی طرح ایک لمبی سڑک جا رہی ہے۔ وہ کورنگی کو ہی تو جاتی ہے۔" عنبر نے یوں فخریہ بتایا، جیسے اسے کراچی کے ایک ایک علاقے کے بارے میں پوری معلومات ہوں۔

"مگر آپا! انڈسٹریل ایریا تو منگھوپیر کی طرف ہے اور کورنگی بالکل ہی مخالف سمت۔ یعنی ایک مغرب میں اور ایک انتہائی مُشرق میں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ کمپنی کا مین آفس کورنگی کریک میں کیوں رکھا گیا ہے۔" چھوٹی نے اپنے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"ارے بھئی آخر اتنی بڑی کمپنی ہے اس کا مین آفس اگر کورنگی کریک میں ہے تو ممکن ہے کہ شہر کے دوسرے علاقوں میں بھی اس کی شاخیں کھلی ہوئی ہوں۔" عنبر نے کہا۔

"اچھا تو کیا تم تنہا ہی وہاں جاؤ گی۔" ماں نے پوچھا۔

"جی ہاں، اور کوئی ایسا ہے بھی نہیں۔ جسے ساتھ لے کر جاؤں۔" عنبر بولی۔

"آپ عذیر کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں آپا، ایسا ہی ہے تو وہ اسکول سے ایک دن کی چھٹی کر لے گا۔" چھوٹی نے فوراً مشورہ دیا۔

"نہیں بھئی۔ عذیر کو اپنے ساتھ لے جا کر کیا کروں گی۔ وہ عورت کمپنی کی گاڑی لے کر مجھے پک کرنے آئے گی۔ بس اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اس نے تو اس خیال سے کہ مجھے تنہا جا کر دفتر ڈھونڈنے میں دشواری ہوگی۔ خود ہی کہہ

دبا کر وہ مجھے لینے آئے گی"۔ عنبر نے چھوٹی کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے بتایا۔

"مگر واپسی کیسے ہو گی تمہاری؟" ماں نے پوچھا۔

"اسی گاڑی میں ہو گی امی۔ لیکن مجھے دفتر کے اوقات پورے ہونے تک وہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ کیونکہ دفتر کی وین دوسری ورکروں کو بھی ان کے گھروں پر چھوڑنے جائے گی۔۔۔ اور طرح وین کا ڈرائیور میرا گھر تو دیکھ لے گا۔ ہاں البتہ۔ ہو سکتا ہے مجھے واپسی میں چار بج جائیں!"

"مگر آپا! آپ کم از کم بتول سے مل کر یہ تو معلوم کر لیتیں کہ یہ عورت کون ہے؟" چھوٹی وسوسوں میں گھر کر بولی۔

"کیوں، کیا ضرورت ہے یہ معلوم کرنے کی؟ خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے تو پہچانا ہے۔ وہ عورت انتہائی بردبار اور سیدھی سادی سی ہے۔ بے چاری بیوہ بھی ہے۔ چار بچے ہیں اس کے اور تعلیم یافتہ بھی لگتی ہے تبھی تو بڑی شائستگی اور رسانیت سے بات کرتی ہے کہ مخاطب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ پہلے ذرا کمپنی میں اپنے پاؤں جما لوں، پھر اسے بلا کر ملواؤں گی تم سے۔"

"وہ تو بعد کی بات ہو گی آپا۔ مگر۔ مگر یہ کوئی اور ہی چکر نہ ہو" چھوٹی نے دبی زبان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"کیسا چکر؟" عنبر نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہی غزل نے کوئی چکر نہ چلایا ہو۔ میرا مطلب ہے کہیں اس نے اس عورت کے ذریعے آپ کو ٹریپ نہ کیا ہو۔" چھوٹی نے ڈرتے ڈرتے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"کمال ہے تمہارا ذہن تو ڈولیز ورکشاپ بنا رہتا ہے۔ جبھی تو تمہیں غزل کا خیال آ گیا۔ لو بھلا وہ میرے لیے کیا جال بچھا سکتی ہے۔ جبکہ اس کا معاملہ تو اس کی رقم واپس کرنے کے بعد ہی ختم ہو گیا تھا" عنبر چھوٹی کے اندیشوں پر جھلا کر بولی۔

"ہاں ختم تو ہو گیا تھا مگر کیا یہ بھول گئیں آپ کہ اس نے چلتے چلتے دھمکی دی تھی کہ میں تم سے اپنی توہین کا بدلہ ضرور لوں گی"، چھوٹی چبھتے سے لہجے میں بولی۔

"ارے وہ تو محض اس کی گیدڑ بھبکی تھی۔ یا پھر چونکہ اسے میری وجہ سے سخت مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس لیے وہ کھسیانی بلی سی بن گئی تھی اس وقت۔ اصل میں مجھے اتنی آسانی سے جو یہ ملازمت ملی ہے، اس لیے تمہارا دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا۔ ورنہ ایسی تو دور تک کوئی بات ہی نہیں۔" عنبر نے گویا بہن کو اطمینان دلایا۔

"خیر جو کچھ بھی سہی۔ تمہارا آج ہی وہاں جانا کیا ضروری ہے۔ کل چلی جانا" خورشید جہاں بولیں۔

"کل کیوں امی۔ جبکہ آج تو کمپنی والوں نے مجھے خاص طور پر بلایا ہے۔ اور پھر وہ بے چاری عورت اتنا پیٹرول خرچ کر کے مجھے لینے آئے گی۔ اب میں نے اگر جانے سے انکار کر دیا تو وہ بھلا کیا سوچے گی" عنبر نے کہا۔

"لیکن آپا! وین خصوصی طور پہ آپ کے لیے تو نہیں بھیجی جائے گی۔ وہ تو دوسری ورکرز کو بھی پک کرتی ہوئی آئے گی، یا جاتے ہوئے پک کرے گی۔ آپ اگر آج نہیں بھی جائیں گی تو کم از کم ڈرائیور تو آپ کا گھر دیکھ لے گا۔ اس طرح کل اس عورت کے آنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی" چھوٹی نے اس کے عذر کے جواب میں کہا۔ تو وہ بگڑ کر بولی۔

"بھئی، آخر تم چاہتی کیا ہو۔ گھر میں بٹھا کر کیا میرا اچار ڈالو گی۔ خوامخواہ رنگ میں بھنگ ڈالنا۔"

"اے یہ کیوں رنگ میں بھنگ ڈالنے لگی۔ اس کی تو بس بیچ میں بولنے کی عادت ہے ورنہ روکنا تو میں چاہ رہی تھی تمہیں۔ تاکہ سعد کو بلوا کر کم از کم یہ تو معلوم کرا لوں کہ کمپنی کے لوگ کیسے اور کس قسم کے۔۔۔ ہیں۔ یوں منہ اٹھا کر بلا سوچے سمجھے تمہارا وہاں جانا کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہو گا۔" خورشید جہاں نے اس کے برا ماننے پر کہا۔

"ہاں آپا! امی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ سعد بھائی کے ذریعے اگر معلومات کرا لی جائیں تو اس میں کوئی حرج تو نہ ہو گا" چھوٹی بھی اپنی عادت سے مجبور تھی۔ بیچ میں بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہاں ہاں مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ تم یہی کہو گی۔ لیکن مجھے تمہاری طرح سعد کی انگلی پکڑ کر چلنا بالکل پسند نہیں۔

کمانے کے لیے گھر سے نکل رہی ہوں۔ اپنے پیروں پہ مجھے کھڑا ہونا ہو گا۔ میں اگر تمہاری طرح الٹے سیدھے اندیشوں میں گھری رہی تو شاید ساری عمر بھی کچھ نہ کما سکوں گی۔ اور پھر میں اتنی نادان یا بے وقوف بھی نہیں ہوں، خود ہی دیکھ لوں گی کہ وہاں کا ماحول کیسا ہے، اس کے بعد میں وہاں ملازمت کروں گی" عنبر تڑخ کر بولی۔

"اچھا بیٹی جیسی تمہاری مرضی۔ ہم تو صرف سمجھانے والوں میں سے ہیں۔ ہماری کیا حیثیت اور کیا اوقات ہے۔" خورشید جہاں نے بیزاری سے کہا۔

"امی اگر آپ نے ایسی باتیں کیں تو پھر میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔ یوں بھی اپنے شوق سے زیادہ مجھے گھر کی اور آپ سب کی بہبود کا خیال ہے" عنبر ماں کی بات پر چمک کر بولی۔

"ہاں یہ ناس پیٹے حالات ہی تو ہیں جن کی وجہ سے تمہیں مرد بن کر کمانا پڑ رہا ہے۔ ورنہ تم تو اس وقت اپنے گھر میں راج کر رہی ہوتیں" ماں نے کہا۔ باتوں ہی باتوں میں وقت نکلا جا رہا تھا۔ اور آٹھ بج چکے تھے عنبر کو تیار بھی ہونا تھا۔ اس لیے وہ اپنے کپڑے اٹھا کر باہر نکل گئی۔ چھوٹی تو کالج جانے کے لیے تیار ہی کھڑی تھی۔ عنبر کے جانے کے بعد اپنی کتابیں اٹھا کر اس نے ماں سے کہا۔

"امی! جب آپا جانے لگیں تو آپ عذیر کو ضرور جگا دیجیے گا تاکہ وہ گاڑی کا نمبر ضرور دیکھ لے، اور یہ بھی کہ گاڑی میں وہ عورت بھی موجود ہے یا نہیں۔ اور ہاں میں تو ڈھائی بجے تک واپس ہی آ جاؤں گی۔ اور آنے کے بعد خود ہی کھانا وغیرہ تیار کر لوں گی۔ آپ کسی کام کو ہرگز ہاتھ نہ لگائیے گا۔"

"ارے بچی ہے تو شرم کی بات لیکن اب میری طاقت سلب ہو گئی ہے، اتنی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ اٹھ کر وضو ہی کر لوں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح کرنا ہی پڑتا ہے۔ اب کمزوری کی وجہ سے اپنی نمازیں تو گنوانے سے رہی" ماں نے کہا چھوٹی بھی عجلت میں تھی۔ وہ ماں کو خدا حافظ کہہ کر جلدی سے باہر نکل گئی۔

عنبر کی کچھ شروع سے ہی یہ عادت تھی کہ وہ تیار ہونے میں بڑی دیر لگا دیتی تھی۔ اس وقت ہی ماں کے پاس آئی، جب کمپنی کی گاڑی باہر رک کر ہارن دینے لگی۔

"اچھا امی! میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔"

"اچھا جاؤ۔ تمہارا ہواؤ تو بہت کھلا ہوا ہے۔ خیر اللہ تمہارا بیلی اور نگہبان۔ مگر جلدی آنے کی کوشش کرنا، تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میرا دل کتنا واہی ہو گیا ہے۔"

"ہاں ہاں امی مجھے خود اس کا خیال ہے۔ میں ان شاء اللہ جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔ یوں بھی پہلا دن ہو گا امی اور پہلے دن کچھ کام ہی نہیں ہوتا۔"

عنبر نے ماں کو تسلی دی۔ اور پھر باہر جانے لگی تو خورشید جہاں اٹھ کر بڑی تیزی سے اس کے پیچھے آئیں تاکہ عذیر کو جگا کر اس کے ساتھ کار تک بھجوائیں۔ مگر عذیر پہلے سے ہی جاگ رہا تھا۔ وہ عنبر کے پیچھے جانے لگا تو خورشید جہاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"دیکھو، گاڑی کا نمبر اچھی طرح دیکھ لینا۔ اور یہ بھی کہ گاڑی کے اندر کون بیٹھا ہے۔"

اور عذیر نے بڑے تعجب سے ماں کی طرف دیکھا، اور خاموشی سے عنبر کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اور بہن کو گاڑی میں بٹھوا کر اس وقت تک کھڑا رہا، جب تک گاڑی گلی کے آخری سرے پہ پہنچ کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ پھر اندر آتے ہی سب سے پہلے پنسل لے کر گاڑی کا نمبر ایک کاغذ پر لکھا۔ خورشید جہاں بھی دروازے کی درز سے جھانک کر بیٹی کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھتی رہی تھیں اور عذیر کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ عذیر جب تک پنسل سے نمبر لکھتا رہا انہوں نے اس سے متعدد سوالات کر دیے۔

"کون سی گاڑی تھی؟ اندر کتنے لوگ بیٹھے تھے؟ کیا ایک ادھیڑ عمر کی عورت بھی کار میں موجود تھی۔ عنبر تم سے کیا کہہ رہی تھی" وغیرہ۔ اور کاغذ پہ نمبر درج کرنے کے بعد وہ کاغذ عذیر ان کی طرف بڑھا کر بولا۔

"امی یہ سب کیا تھا؟ آپا اس وقت کیوں گئی ہیں؟ اور کہاں گئی ہیں؟"

"اے جانی کہاں ملازمت پر گئی ہے۔ کورنگی میں ہے اس کا دفتر۔ مگر گاڑی میں اور کون کون بیٹھا تھا؟" خورشید جہاں

کو صرف یہ جاننے کی پڑی تھی۔ کہ گاڑی میں کون کون تھا۔ اور کیا وہ پکی عمر کی عورت بھی موجود تھی۔

"گاڑی میں تو آگے دو مرد بیٹھے تھے، اور پیچھے تین عورتیں۔ اب مجھے تو یہ دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کہ ادھیڑ عمر کی عورت کون سی تھی۔" عذیر نے بتایا۔

"اور عنبر تم سے کیا کہہ رہی تھی؟"

"وہ تو کہہ رہی تھیں کہ امی کو منع کر دینا کہ کسی کام کو ہاتھ نہ لگائیں۔ میں بس چار بجے تک واپس آجاؤں گی اور سارا کام خود ہی کر لوں گی۔"

اور اس بات پر خورشید جہاں خوش ہوگئیں کہ عنبر کو ان کا کتنا خیال رہتا ہے۔

"امی یہ آخر چکر کیا ہے۔ کل تک تو کسی نوکری دوکری کا کوئی خیال بھی نہیں تھا آپا کو۔ پھر یہ ایک دم۔"

"ارے کل دوپہر ہی کو تو وہ عورت آئی تھی، اس کے پاس نوکری ہے کہ جس کا میں بار بار پوچھ رہی تھی تم سے۔ کوئی کمپنی ہے، بہت بڑی، بس اسی میں ملازمت ملی ہے اسے۔"

ماں نے مختصراً عذیر کو بتایا۔ تو وہ چپ سا ہوگیا۔ کہ وہ ایک لاابالی سا لڑکا تھا اور گھر کی سب سے چھوٹی اولاد تھا۔ نو تو بج ہی چکے تھے۔ اس لیے وہ اپنے اسکول جانے کی تیاری میں لگ گیا۔ اس کے اسکول جانے کے بعد خورشید جہاں گھر پر بالکل تنہا رہ گئیں۔

تنہائی میں تو خیالات ٹڈیوں کے دل بادل کی طرح انسان کے ذہن پر ٹوٹتے ہیں۔ کچھ دیر تو وہ وسوسوں میں ہی گھری رہیں۔ یہ سوچ سوچ کر کہ جوان جہان لڑکی ہے۔ تنہا گئی ہے۔ نامعلوم کیسے لوگ ہوں، کیسا ماحول ہو وہاں کا، اور اس سے کس طرح پیش آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سارے ملازمین مرد ہی ہوں۔ مگر نہیں، سارے ملازمین تو مرد ہی نہیں ہو سکتے کیونکہ عذیر بتا رہا تھا کہ تین عورتیں اور بھی بیٹھی تھیں گاڑی میں۔ اور گاڑی بھی کتنی لمبی اور قیمتی معلوم ہو رہی تھی۔ نئی بھی تھی جبھی تو آتے اور جاتے ذرا سی بھی آواز نہیں نکلی اس میں سے۔ کمپنی تو واقعی بہت بڑی معلوم ہوتی ہے، تنخواہ بھی بہت معقول ہے۔ چند ماہ کے اندر اندر سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔

عنبر کو تو گھر کو بنانے اور سجانے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ مگر میں تو اسے یہی مشورہ دوں گی کہ پہلے اپنا زیور بنوائے۔ بلکہ پورا جہیز ہی تیار کرے۔ کوئی ساری عمر تو نوکری کرنے سے رہی۔ حیثیت ہوگی تو کسی اچھی جگہ اس کا رشتہ بھی طے ہو جائے گا۔ اور ساتھ کے ساتھ چھوٹی کا مستقبل بھی سنور جائے گا۔ اور چھ سات سال بعد خیر سے میرا عذیر بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔ یہی سب سوچتے سوچتے اتنا وقت گزر گیا کہ ظہر کی اذانیں ہونے لگیں۔ اور وہ ظہر کی نماز ادا کرنے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر ڈھائی بجے چھوٹی بھی کالج سے واپس آگئی۔ تپتی دھوپ میں چل کر آئی تھی۔

تقریباً پانچ چھ روز سے کھانا کھانا بھی چھوڑ رکھا تھا۔ اس پر روزے سے تھی۔ آتے ہی نڈھال سی ہو کر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے پلنگ پر بیٹھی تو ایسی سوئی کہ عذیر نے ہی اسکول سے واپس آکر اسے اٹھایا۔ دیکھا تو چار بج رہے تھے، گویا عنبر کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر وضو کیا اور جب تک ظہر کی قضا نماز ادا کی عصر کا وقت بھی ہوگیا، عصر کی نماز ادا کر کے وہ سیدھی باورچی خانے میں پہنچی۔

بیسن نکال کر متھا اور پھر کھانا پکانے کے لیے ڈبے کھنگالے، نعمت خانے میں دیکھا صرف گزشتہ رات کا بچا ہوا تھوڑا سا کبابوں کا قیمہ ہی پڑا تھا۔ جس سے ہلکی ہلکی بساند اٹھ رہی تھی، اس نے پتیلی نکال کر قیمے میں گرم مسالا اور تھوڑی سی ادرک کتر کر ڈالی اور اسے گرم کرنے کی غرض سے چولہے پر چڑھا دیا۔ تاکہ بساند کم ہو جائے۔ تھوڑے سے آلو بھی پڑے تھے اور دو ٹماٹر بھی۔ اور تھوڑی سی دال بھی بچی تھی یا پھر مٹھی دو مٹھی چاول۔ اس نے اپنی اس بدحالی کو دیکھ کر دل میں سوچا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ آپا نے سروس جوائن کر لی ورنہ اگر گھر کا یہی حال رہتا تو کچھ دن بعد پھر فاقوں کی نوبت آجاتی۔ آپا خواہ کتنی ہی پھوہڑ زبان اور چھوٹے ظرف کی سہی، مگر ہم سب کے لیے کتنی زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے روزی کمانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ ٹیوشن پڑھا پڑھا کر تعلیم مکمل کی۔ شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھی اور عنزل کی گالیاں سننے کے علاوہ چند دن کے لیے سہی، ملازمت تو کی۔ حقیقت میں تو یہ انہیں ان کے صبر اور محنت کا پھل ملا ہے۔ یہ گھر بیٹھے نئی ملازمت۔ اے کاش کہ میں بھی کچھ کر سکتی۔

کسی قابل ہوتی۔

تو پھر مجھے آپا کی اتنی سخت سست نہ سننی پڑتی۔

مگر ہم غریب اور حالات کی شکار لڑکیاں بھی کتنی مجبور اور بے بس ہوتی ہیں۔ ہمیں تو کچھ بننے میں بھی ایک عمر بیت جاتی ہے۔

امیر لڑکیوں کا تو یہ ہوتا ہے کہ انہیں بغیر ہاتھ پیر ہلائے ماں باپ کی طرف سے سب کچھ مل جاتا ہے۔ مگر ہم غریب لڑکیاں کچھ پانے کی خواہش میں اگر کوئی قدم بھی اٹھاتی ہیں تو ہمیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ہماری عزت پر نہ بن جائے۔ کیونکہ ایک عزت ہی تو ہوتی ہے ہمارے پاس۔ متاع عزیز کی طرح جان سے زیادہ پیاری۔

اسی کی حفاظت کرتے کرتے ہم غریب لڑکیاں دکھوں کی چادر میں لپٹی لپٹی اپنی پوری جوانی اپنے سروں سے گزار لیتی ہیں۔

پھر جب سیاہ بالوں میں چاندی سی اتر آتی ہے تو پھر ہم اپنی آرزوؤں کے مدفن پر کھڑے ہو کر اپنی بیتی ہوئی زندگی کا نوحہ ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔

خیالوں کے اس گورکھ دھندے میں الجھے الجھے اس نے آٹا بھی گوندھ لیا تھا، اور ادھر وقت بھی ہوا کی طرح گزر گیا تھا۔ آگ برساتے سورج کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تھالی میں سرخی مائل زردیاں سی گھل گئی تھیں۔ اور اس طرح دھوپ کی حدت میں بھی خاصی کمی آگئی تھی۔ کہ کراچی کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے دھوپ ڈھلتے ہی ہواؤں میں نمی اور نرمی سی آجاتی ہے۔ افطار کا وقت چھ بج کر کچھ منٹ پر ہوتا تھا۔ اور اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ آٹا گوندھنے کے بعد باورچی خانے سے وقت دیکھنے کی غرض سے باہر نکلی تو ماں کو برآمدے میں حیران و پریشان سا کھڑا پایا۔

"ساڑھے پانچ بجنے کو ہیں چھوٹی، اور عنبر ابھی تک واپس نہیں لوٹی۔" انہوں نے چھوٹی کو دیکھتے ہی پرتشویش لہجے میں کہا۔

"آج پہلا دن تھا امی! اور آپا کہہ رہی تھیں کہ کمپنی کی وین دوسری ورکرز کو بھی ان کے گھر چھوڑنے جاتی ہے اس لیے دیر ہوگئی ہوگی۔" چھوٹی نے گویا انہیں اطمینان دلایا۔

"ہاں خدا کرے ایسا ہی ہو۔" ماں نے منہ ہی منہ میں کہا۔

"امی عذیر کہاں ہے؟" چھوٹی نے پوچھا۔

"عذیر کو تو آغا جی کا بیٹا زمان بلا کر لے گیا ہے، اس نے اپنے دوستوں کو افطار کی دعوت دی ہے نا۔"

اور جواب میں چھوٹی سوچنے لگی کہ اس نے ناحق ہی اتنا سارا بیسن متھا۔ امی تو دو پکوڑوں سے زیادہ کھاتی نہیں۔ میرے اور آپا کے لیے تو وہ بہت ہوں گے۔ خیر میں تھوڑے سے پکوڑے سحری کے لیے اٹھا کر رکھ دوں گی۔ وقت تنگ ہوگیا تھا۔ چھوٹی پکوڑے تلنے جلدی سے باورچی خانے میں آگئی۔ مگر اس کے کان برابر دستک کی آواز پر لگے رہے مگر افطار کا وقت بھی گزر گیا عنبر نہیں آئی۔ اور خورشید جہاں کے دل میں ہول سے اٹھنے لگے۔ انہیں پہلے ہی طرح طرح کے وسوسوں نے آگھیرا تھا۔ نوالا حلق سے اتارنا ان کے لیے مشکل ہوگیا۔ وہ تو چھوٹی نے انہیں دم دلاسے دے دے کر بڑے اصرار سے تھوڑا بہت کھلا پلا دیا۔ جبکہ بہن کی اتنی طویل غیر حاضری پر فکر اسے بھی لاحق ہوگیا تھا۔ اور اس فکر نے پریشانی کی صورت اس وقت اختیار کی جب رات کے نو بج گئے اور عنبر لوٹ کر نہ آئی۔ ہول اور پریشانی کے مارے خورشید جہاں کی تو حالت ہی غیر ہونے لگی۔

اتنی دیر تک تو وہ یہ سوچ سوچ کر اپنی طبیعت پر جبر کرتی رہیں کہ ممکن ہے کسی وجہ سے اسے آنے میں دیر ہوگئی ہو۔ اور اب کسی لمحے بھی وہ آنے والی ہو، مگر جب گھڑیال کی سوئیاں نو کے ہندسے سے بھی آگے نکل گئیں۔ تو انہوں نے چھکوں اور پھکوں رونا شروع کر دیا۔ عذیر بھی دوست کے یہاں سے دعوت کھا کر آگیا تھا اور ماں کے رونے دھونے اور طرح طرح سے خدشات کا اظہار کرنے سے سخت ہراساں ہو رہا تھا۔

چھوٹی بھی اب ماں کو تسلی دلاسا دینے کے بجائے چپکے چپکے رو رہی تھی، وہ بیٹھک کا داخلی دروازہ کھول کر کبھی گلی میں دور تک نگاہ ڈالتی، کبھی دروازہ بند کر دیتی۔ مگر دروازے کے پاس سے ہٹتی نہ تھی۔ اس اُمید میں کہ آپا کسی دم بھی آتی نظر آجائیں۔ وہ دل ہی دل میں دعا بھی کرتی جا رہی تھی کہ خدا اس کی آپا کو خیر و سلامتی کے ساتھ گھر بھیج دے اور اس کی حفاظت فرمائے۔ مگر گیارہ بھی بج گئے، عنبر کو آنا تھا نہ آئی۔ اب تو خورشید جہاں کے ہوش ہی اُڑ گئے، اور وہ رو رو کر کہنے لگیں۔

"ارے میری جوان جہان نازک سی بچی نامعلوم کہاں چلی گئی۔ کن ظالموں کے ہاتھوں میں پڑ گئی وہ۔ ارے میرے مولا! میں اسے کہاں سے لاؤں، کیا کروں، کوئی ہمدرد ہے نہ مددگار سوائے تیری ذات کے۔ ارے وہ تو میری پلی پلائی بچی ہے اس کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو میں تو جیتے جی مر جاؤں گی۔"

"امی خدا کے لیے اپنا دل سنبھالیے اور آہستہ بولیے اوپر کرائے دار ہیں۔ اور برابر میں پڑوسی، کسی نے آپ کی باتیں سن لیں تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔" چھوٹی ان کی واویلا سے گھبرا کر بولی۔

"ہاں امی۔ ابھی تو کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں کہ آپا غائب ہیں یا گھر نہیں لوٹیں۔ اگر کسی نے آپ کو روتے دھوتے سن لیا تو اس کے کان کھڑے ہوں گے۔" عذیر نے بھی چھوٹی کی بات کی تائید میں کہا۔

"تو پھر میں کیا کروں اور کس سے کہوں۔ کہاں سے لاؤں اپنی بچی کو۔ ہائے کتنا منع کیا تھا اس بچی کو انجانی کام اجنبی جگہ تنہا مت جا۔ مگر وہ تو ہے ہی سدا کی خودسر، اس نے میری ایک نہیں سُنی۔ اور میرے منع کرنے کے باوجود چلی گئی۔ آہ ایک عزت ہی تو بچی ہے ہمارے پاس اگر وہ بھی چلی گئی تو میں تو بن آئی ہی مر جاؤں گی۔"

خورشید جہاں نے سسکیاں لیتے ہوئے موٹی آواز میں کہا۔ ایک تو بے چاری پہلے ہی فاقے جھیلتے جھیلتے کمزور ہو گئی تھیں۔ اس پر روز روز کی لڑائی نے ان کے اندر کچھ زیادہ ہی ضعف پیدا کر دیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ اچانک آ پڑنے والی افتاد۔ کمزوری کے مارے ان سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اور کمزوری کی وجہ سے چونکہ پورا زور لگا کر بول رہی تھیں۔ اس لیے اتنی اونچی آواز نکل رہی تھی۔

"خدا کے لیے امی۔ آپ اس قدر نا امید تو نہ ہوں۔ خدا نے چاہا تو آپا جلد ہی آ جائیں گی۔ آپ ماں ہیں۔ ایک دکھی اور پریشان حال ماں۔ آپ ان کی خیر و سلامتی کی دعا کرتی رہیے۔ آپ کی دعا کبھی رائیگاں نہ جائے گی۔" ماں نے ایسی مایوسانہ اور دل گرفتہ باتیں کر کے چھوٹی کے ہاتھ پیر پھلا دیے تھے۔ وہ ان کی باتوں پہ دل ہی دل میں ہول کر بولی۔

"چھوٹی بہتر یہی ہے کہ امی کو کسی طرح تھوڑی دیر کے لیے سلوا دو۔ ورنہ سچ مچ انہیں کچھ ہو جائے گا۔ دیسے بھی اگر یہ اسی طرح بولتی رہیں اور کسی کے کان میں ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی، تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے۔"

عذیر نے کتنی سمجھ داری کی بات کہی تھی۔ چھوٹی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ماں کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگی۔ خورشید جہاں جو چھوٹی کے مشورے پر زیر لب دعائیں مانگنے لگی تھیں۔ انہوں نے اس کے ہاتھ ہٹانے بھی چاہے، اس کے باوجود بھی چھوٹی ان کا سر دباتی رہی۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ خورشید جہاں کی پہلے آہستہ آہستہ آنکھیں بند ہوئیں، اور پھر وہ سچ مچ سو گئیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے اتنی سخت پریشانی میں انہیں بھی نیند نے آلیا تھا۔ ماں کی طرف سے یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہ اچھی طرح سو گئی ہیں۔ چھوٹی آہستہ سے ان کے پاس سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ماں کے نحیف سے چہرے پر نظر پڑی تو دل کٹ کے رہ گیا۔ اتنا سا منہ نکل آیا تھا۔ ان کا اس پریشانی میں، پژمردہ چہرے پر آنسوؤں کی نمی بلب کی روشنی میں بڑے واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

ماں پریشانی اور گھبراہٹ میں بیٹھک میں ہی آبیٹھی تھیں۔ اور چھوٹی نے انہیں اسی صوفے پر ہی سُلا دیا تھا۔ وہ عذیر کو باہر آنے کا اشارہ کر کے دبے پاؤں چلتی برآمدے میں آئی تو عذیر نے سرگوشی کے انداز میں اس سے پوچھا۔

"اب کیا ہو گا چھوٹی۔ اب تو بارہ بجنے کو ہیں اور آپا کا دور دور تک بھی پتا نہیں۔"

"میں کیا بتاؤں بھائی۔ اگر خدانخواستہ وہ رات کو بھی نہیں آئیں تو پھر۔ پھر تو محلے والوں کو بھی ان کی گمشدگی کا پتا چل جائے گا۔" چھوٹی روتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ایسا کیوں نہ کروں چھوٹی کہ عالیہ آپا کے یہاں انہیں دیکھ آؤں، ابھی تو بسیں بھی چل رہی ہیں۔" عذیر نے

پوچھا۔

"نہیں عذیر، عالیہ آپا کے یہاں تمہارا جانا بیکار ہی ہوگا۔ اور پھر ایک تو آدھی رات ہونے کو ہے، دوسرے عالیہ آپا نامعلوم کیا سمجھیں آپا کے اچانک غائب ہو جانے پر۔ یوں بھی عنزل کے جھگڑا کرنے کے بعد آپا نے عالیہ آپا سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ پھر تم ہی سوچو آپا، ان کے یہاں کیوں جانے لگیں۔ وہ تو کورنگی کر یک پر کہیں گئی تھیں۔"

"چھوڑو چھوٹی ۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کورنگی کریک ہی گئی ہوں۔ جو عورت ان کو لے کر گئی ہے اس نے [illegible] پھر بھی اگر دن کا وقت ہوتا تو میں خود جا کر آپا کو وہاں تلاش کر لیتا۔"

"[illegible] ہوتیں۔ تبھی تو تم انہیں تلاش بھی کرتے۔ مگر وہ عورت تو انہیں کہیں اور ہی لے گئی ہے [illegible]" چھوٹی اپنے [illegible] کو دوپٹے میں جذب کر کے بولی۔

"لیکن آخر کون تھی وہ عورت؟ کیا تمہیں اس کا حلیہ یاد ہے۔" عذیر نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تو کالج میں تھی اس وقت جب وہ چڑیل آپا سے ملنے [illegible] تھی۔ ویسے اگر دن کا وقت ہوتا یا پہلے سے معلوم ہوتا کہ آپا رات تک نہیں آئیں گی، تو اسکول سے آتے ہی [illegible] سعد بھائی کے پاس بھیج دیتی۔ ایک وہی تو ایسی ہستی ہیں، جو ہر مشکل میں ہمارے کام آتے ہیں۔" چھوٹی نے عذیر [illegible] سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مگر دن پر ہی کیا موقوف، اگر تم کہو تو میں ابھی بھی ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ دیکھو نا چھوٹی اگر آپا رات کو بھی نہیں آئیں تو بات بالکل ہی بگڑ جائے گی۔ اور سعد بھائی الگ خفا ہوں گے۔ کہ تم نے رات کو ہی مجھے کیوں نہ بتا دیا۔" عذیر نے بڑی عقل کی بات کہی تھی۔ چھوٹی سوچ میں پڑ گئی۔

"لیکن اگر آپا رات میں واپس آگئیں تو پھر وہ الگ ہم پر خفا ہوں گی کہ سعد بھائی کو کیوں بلا لیا اور خود سعد بھائی پر بھی اس بات کا کچھ اچھا امپریشن نہیں پڑے گا۔"

"تم بھی کیسی بے وقوفی کی بات کر رہی ہو چھوٹی۔ یہ کسی کے امپریشن کا نہیں بلکہ ہماری آپا کی جان اور عزت کا معاملہ ہے، اور یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ اب وہ شاید ہی واپس آسکیں۔ سعد بھائی آئیں گے تو کم از کم تھانے میں آپا کی گمشدگی کی رپورٹ تو درج کرا دیں گے۔ تم خواہ کچھ بھی کہو میں تو سعد بھائی کو بلانے جا رہا ہوں۔" عذیر نے جھلاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے عذیر مگر ذرا یہ تو سوچو اس وقت رات کے ایک بجے جا کر ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤ گے، تو وہ نہ سہی ان کے بھائی فہد بھلا دل میں کیا سوچیں گے کہ آخر آدھی رات کو تم پر ایسی کیا افتاد پڑ گئی۔ جو تم کو ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اور اگر فہد کو تم نے یہ بات بتا دی تو وہ بالکل ہی مختلف ذہنیت اور مزاج رکھتے ہیں۔ اور ہم تو پہلے ہی اپنی غربت کی وجہ سے ان کی نظروں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

"واہ کیا پاگل سمجھ رکھا ہے تم نے مجھ کو جو میں وہاں جا کر آپا کی گمشدگی کا ڈھنڈورا پیٹوں گا۔ ویسے بھی میں فہد بھائی سے اتنا فری نہیں ہوں۔ اچھا اب مجھے جانے دو، ورنہ واپسی میں بہت دیر ہو جائے گی۔ ہاں اگر تمہارے پاس کچھ پیسے ہوں تو مجھے دے دو۔ بس کا کرایہ بھی تو دینا ہوگا۔"

عذیر نے چھوٹی کو اطمینان دلا کر پیسے مانگے تو چھوٹی جلدی سے پیسے نکال لائی، اور اسے دیتے ہوئے بولی۔

"دیکھو جلدی واپس آنا بھائی۔ امی تو سو رہی ہیں، اور تنہائی میں مجھے اور بھی وحشت ہو گی۔"

"اچھا اچھا۔ بس جانے میں ہی تھوڑی دیر لگے گی، ورنہ واپسی تو سعد بھائی کی کار میں ہی ہو گی۔" عذیر نے کہا۔ اور پھر جوتا پہن کر سعد کو بلانے چلا گیا۔

پھر تیزی سے بھاگتے ہوئے وقت کی ساعتوں کے جیسے کسی نے پیر پکڑ لیے بہن کی واپسی کا خیال پس منظر

میں چلا گیا۔ اور وہ بھائی کی واپسی کے انتظار میں ایک ایک پل گننے لگی۔

ایک ایک پل جو ایک صدی پر محیط ہوتا لگ رہا تھا۔

اور کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

کبھی بہن کا خیال۔ بلکہ بہن کے بارے میں برے برے خیالات۔ وسوسے اندیشے اور خدشات۔ کہ نامعلوم وہ عورت کون تھی، اور کس کی بھیجی ہوئی آئی تھی۔

آپا کو کہاں لے گئی ہو گی۔

کس کے حوالے کیا ہوگا۔ اور۔ اور ۔ آپا ۔ اور پھر اس نے عنبر کے متعلق ایسی ایسی [illegible] باتیں سوچ ڈالیں کہ خود اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

چھوٹی کی حالت اس سمے اس پرندے کی طرح تھی، جس کا گھونسلا اس کے بچوں سمیت ایک درخت پر ہو۔ اور انہی بچوں میں سے ایک بچہ پھدک پھدک کر دوسرے درخت پر جا بیٹھا ہو۔ اور پرندہ بے چارا اس ڈر سے کہیں فضاؤں میں پرواز کرتا کوئی عقاب، چیل، شکرا یا کوا دوسرے درخت پر بیٹھے بچے کو دبوچ کر نہ لے جائے یا پھر گھونسلے میں موجود [illegible] پر حملہ نہ کر دے۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں اڑ کر کبھی گھونسلے کی طرف جاتا ہو اور کبھی دوسرے درخت پر بیٹھے ہوئے بچے کی طرف۔

تو چھوٹی کا طائر خیال بھی۔ کچھ ایسی ہی سیمابی کیفیت میں مبتلا تھا۔ وہ کبھی عذیر کی طرف جاتا تو ایک دھڑکا سا لگا کہ کہیں رات کے ان مہیب اندھیروں میں اکلوتا پلا پلایا اور عزیز از جان بھائی بھٹک نہ جائے یا یہ اندھیرے اسے نگل ہی نہ لیں۔ خدا کرے صحیح سلامت سعد تک پہنچ جائے۔ مگر وہ سعد بھائی سے آخر کہے گا کیا۔؟

اُف میری تو اس پریشانی نے بالکل مت ہی مار دی۔ ورنہ کم از کم اس کو یہ تو سمجھا دیتی کہ وہ سعد بھائی کو جاتے ہی نہ بتائے کہ آپا غائب ہیں۔ بلکہ کسی اور بہانے سے انہیں گھر لے آئے۔

پھر وہ سوچنے لگتی اگر سعد بھائی آگئے تو یقیناً سب سے پہلے تھانے میں آپا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائیں گے۔ اس کے بعد ہی ان کو ڈھونڈنے نکلیں گے۔ اور آپا اگر خدانخواستہ ان کو بھی نہیں ملتیں تو پھر۔

ان کی گھر سے غیر حاضری کا علم سارے محلے کو ہو جائے گا۔ اور یہ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔

اُف کتنی بدنامی ہو گی ہماری اس طرح۔

اُف آپا نے یہ کیسا ستم ہم پر توڑا ہے۔

ہیں نا ہمیشہ کی خودسر اور خود مختار۔

ورنہ امی نے کتنا منع کیا تھا۔ میں نے بھی بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی، مگر انہوں نے اپنی سرکشی میں ہماری ایک نہ سنی، اور آنکھیں بند کر کے اس منحوس عورت کی باتوں پر ایمان لے آئیں اور خوشی خوشی اس کے ساتھ چلی گئیں۔

اگر عذیر کو ساتھ لے لیا ہوتا تو ہرگز ہرگز یہ نوبت نہ آتی۔

کاش ایسا ہی ہو گیا ہو کہ آپا جس گاڑی میں گئی تھیں۔ اس کا کہیں ایکسیڈنٹ ہو گیا ہو، اور وہ زخمی حالت میں کسی ہسپتال میں پڑی ہوں۔ یا پھر۔ زخموں کی تاب نہ لا کر۔

اس سے زیادہ چھوٹی مزید کچھ نہ سوچ سکی۔

کہ یہ جتنا بھی سوچا تھا۔ صرف اور صرف بدنامی کے خیال سے۔

مگر جوں ہی اسے خیال آیا کہ اس کی سوچ کتنی نیچ اور خود غرضانہ ہے۔ اور وہ اپنی عزیز ترین پیاری سی بہن کے بارے میں ایسی باتیں سوچ رہی ہے، جو اس کا کوئی جانی دشمن ہی سوچ سکتا ہے۔ تو اس نے دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کی۔

گو چھوٹی کو اپنی پریشانی میں وقت رینگ رینگ کر گزرتا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وقت اپنے معمول کے مطابق

اتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ جیساکہ اس کا وطیرہ یا قاعدہ ہے۔ اور عذیر کا انتظار کرتے کرتے دو بج گئے تھے۔ اور دو پون گھنٹے بعد اوقاتِ سحر کا آغاز ہونے والا تھا۔

مگر بھائی کے انتظار میں وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔

اس کے دل میں تو طرح طرح کے وسوسے اُتر رہے تھے کہ پتا نہیں وہ سعد کے یہاں پہنچا بھی ہوگا یا رستے میں ہی کہیں۔ کہ تبھی باہر کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو وہ دوڑتی ہوئی بیٹھک میں آئی۔ اور جلدی سے دروازہ کھول کر دیکھا۔ تب اس کی جان میں جان آئی۔ عذیر کار سے اُتر چکا تھا اور سعد اُتر رہا تھا۔ اور سعد کو دیکھ کر اتنی پریشانی میں بھی اس کا دل خوش ہوگیا۔ یہ سوچ کر کہ سعد بھائی کتنے اچھے ہیں۔ اور ہمارا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ ہمارے بلانے پر آدھی رات کو بھی دوڑے دوڑے چلے آئے۔ وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ عذیر نے سعد کو اصل بات بتا دی ہوگی مگر سعد نے اندر آتے ہی چھوٹی کو ہراساں سا دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں بھئی۔ خیریت تو ہے۔ نہ سلام نہ دعا۔ یہ ٹکر ٹکر مجھے دیکھ کر کیا پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔" وہ چھوٹی سے بات کرتے کرتے صوفے کے قریب آ گیا تھا۔ خورشید جہاں پہ ایک نظر ڈال کر بولا۔

"کیوں کیسی طبیعت ہے پھپھو جان کی اور یہ انہیں ایک دم کیا ہوگیا۔" اور چھوٹی جو اس کی بات پر پہلے ہی خود پر بُری طرح ضبط کر رہی تھی۔ رقت بھری آواز میں بولی۔

"انہیں بیماری نے نہیں غم اور پریشانی نے ادھ موا کر دیا ہے سعد بھائی۔" اتنا کہہ کر وہ بُری طرح آنسو بہانے لگی۔

"غم اور پریشانی نے۔ کیوں بھئی عذیر تم تو کہہ رہے تھے کہ انہیں دو دن سے سخت بخار ہے اور اب۔"

"میں وہاں فہد بھائی کے سامنے اس کے سوا اور کیا کہتا سعد بھائی۔ میں چھوٹا ضرور ہوں مگر دو جوان بہنوں کا بھائی ہوں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی آن اور عزت پر بن رہی ہو تو۔ تو۔ اصل میں سعد بھائی۔ میری زبان نے اس وقت میرا ساتھ دیا نہ غیرت نے ہی گوارا کیا کہ میں آپ کو اصل بات بتا سکتا۔ اس لیے میں نے امی کی بیماری کا بہانا کر دیا۔ تاکہ آپ کسی طرح میرے ساتھ گھر آ جائیں۔" اتنا کہتے کہتے عذیر کا گلا بھی رندھ گیا۔

"کمال ہے۔ یہ تم دونوں نے کیا رونے کی ڈوئٹ ریہرسل کی ہے۔ یا یہ کسی قسم کا مذاق ہے جس کا تمہیں اب آدھی رات کو شوق چڑھ آیا ہے۔ ویسے یہ عنبر کہاں ہے؟"

وہ واقعی یہی سمجھا کہ ان دونوں بہن بھائی نے اسے بیوقوف بنانے یا اس سے مذاق کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا ہے۔ مگر یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ہلکا سا تردد ضرور تھا۔

"وہی تو گھر پر نہیں ہیں سعد بھائی۔" عذیر نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہا ہیں وہاٹ۔ یہ کیا بک رہے ہو تم۔ دماغ تو ٹھیک ہے نا تمہارا۔" سعد یوں بھبک کر بولا جیسے عذیر نے اسے بجلی کا ننگا تار چھوا دیا ہو۔

"نہیں سعد بھائی! یہ سچ ہی کہہ رہا ہے۔ آپا واقعی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ صبح کو گئی تھیں اور اب تک نہیں لوٹیں، تبھی تو میں نے اتنی رات میں اسے بھیج کر آپ کو بلوایا ہے۔" چھوٹی نے گویا یقین دہانی کراتے ہوئے بتایا۔

"مگر وہ کہاں گئی تھیں۔ آخر کیا تم کو بتا کر نہیں گئی تھیں۔" سعد نے بڑی کرخت اور اونچی آواز میں پوچھا۔

"نہیں بتا کر تو گئی تھیں۔" چھوٹی نے کہا اور پھر اس عورت کے آنے اور ملازمت کی آفر دینے کا سارا قصہ سنایا۔

"مگر پھپھو جان اس وقت کہاں تھیں کیا وہ عنبر کو اس عورت کے ساتھ جانے سے روک نہیں سکتی تھیں۔ کیا انہیں اپنی اولاد پہ کوئی کنٹرول نہیں رہا ہے۔ جو ان کی موجودگی میں عنبر تنہا ہی وہاں چل دیں۔"

"ارے تم سعد۔ تم کیسے آ گئے۔ ارے بیٹا! میں تو لٹ گئی برباد ہوگئی بیٹے۔ میری جوان پلی پلائی بچی مجھ سے بچھڑ گئی۔ اب میں اسے کہاں سے لاؤں گی۔"

خورشید جہاں جن کی آنکھ سعد کی آواز سن کر کھل گئی تھی انہوں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے

لگیں۔ سعد کے دل پر تو پہلے ہی ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی تھی اور چھوٹی اور عذیر کی زبانی عنبر کی گمشدگی کا سارا احوال سن کر وہ ایسا حواس باختہ ہوا تھا کہ اور تو کچھ نہیں کر سکا۔ بس خورشید جہاں کو اس ساری مصیبت کا ذمہ دار ٹھہرا کر اپنا غصہ ان پر اتارا۔ اور اب اس کی ساری باتوں کے جواب میں اپنی بے بسی کا اظہار کر کے وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ گویا عنبر کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھیں۔ سعد کی کچھ شروع ہی سے یہ عادت تھی کہ وہ عام حالات میں تو بالکل خاموش اور پرسکون سا رہتا تھا۔ مگر جب اس پر غصہ چڑھتا جو شاذ ہی کبھی چڑھتا تھا یا کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا تو چیخنے چلانے لگتا تھا۔ یا پھر غصہ دکھاتا تھا۔ خورشید جہاں اس کی باتوں کے جواب میں اپنی بپتا سنا کر رونے لگیں تو اسے تاؤ آ گیا۔

"اب رونے رلانے سے حاصل بھی کیا ہوگا۔ پھپھو جان! جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا۔ مگر ساری غلطی آپ کی ہی ہے آخر آپ نے عنبر کو کسی انجان اور اجنبی عورت کے ساتھ جانے کی اجازت کیسے دے دی۔ کیوں جانے دیا اسے۔ کیا آپ کو اپنی اولاد پر ذرا بھی کنٹرول نہیں؟" تو خورشید جہاں روتے روتے اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

"اے کیسا کنٹرول اور کس کا کنٹرول۔ میری تو وہی مثل ہے کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ اور وہ تو ہے ہی سدا کی خودسر جو اس کے دل میں آتا ہے وہی کرتی ہے ورنہ میں نے تو اسے کتنا منع بھی کیا تھا کہ آج نہیں جاؤ۔ نئی جگہ ہے اور اجنبی لوگ۔ میں پہلے سعد سے اس کمپنی کے بارے میں معلومات کرا لوں۔ اس کے بعد چلی جانا۔ مگر توبہ کرو جو اس نے میری ایک بھی سنی ہو۔"

"خیر خیر، میں یہ سب نہیں جانتا۔ میں تو صرف آپ کی بات کر رہا ہوں۔ آپ نے اگر سختی برتی ہوتی تو عنبر کی مجال نہ ہوتی کہ گھر سے قدم باہر نکالنے کی۔ اور پھر آپ نے اس عورت کو اندر بلا کر اس سے بات تو کی ہوتی۔ مگر آپ نے تو بلا جانے بوجھے اور دیکھے بھالے اپنی جوان بیٹی کو اس کے حوالے کر دیا۔ اور اب خود ہی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ وہی مثل ہے کہ خود کردہ را علاج نیست۔" سعد سخت کوفت کے عالم میں بولا۔

"ہاں، یہی تو چوک ہوگئی مجھ سے۔ جس پر بعد میں، میں بہت پچھتائی بھی۔ ارے میری تو سدا سے یہی عادت ہے کہ عین موقع پر مجھے کوئی بات سوجھتی ہی نہیں۔ ہمیشہ بعد میں خیال آتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں نہ کیا، ویسا کیوں نہ کیا۔ اور پھر بیٹے۔ ہونی تو ہو کر ہی رہتی ہے۔ اگر میں اس عورت سے بات بھی کر لیتی تو فرق ہی کیا پڑ جاتا۔ ان کے دل میں کھوٹ تھا اس تک تو نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہائے وہ چڑیل میری بچی کو کہاں لے اُڑی!"

"خیر، اگر آپ کا خیال یہی ہے کہ ہونی ہو کر ہی رہتی ہے تو پھر آپ کے یہ خدشات، یہ رونا دھونا سب فضول ہی ہے۔" وہ خورشید جہاں کی باقی باتوں کو نظرانداز کر کے طنز بھرے لہجے میں بولا۔ جب سے میل جول ہوا تھا اب تک کے اس عرصے میں پہلی بار وہ ان سے اتنی تلخی اور غیر رواداری سے بات کر رہا تھا۔

"ارے نہیں بیٹے۔ میرا تو اس وقت دماغ ہی ٹھکانے نہیں ہے۔ نہ معلوم میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ ورنہ اس بھری دنیا میں خدا کے بعد ایک تم ہی تو میرے ہمدرد اور غمگسار، میرے مددگار ہو۔ تم بھی اگر روٹھ گئے تو پھر میں تو۔"

"افوہ پھپھو جان! کیوں مجھے گناہگار کرتی ہیں۔ میں تو کسی قابل بھی نہیں ہوں۔ البتہ مجھے اس بات پر رہ رہ کر غصہ آ رہا ہے کہ آپ نے مجھے شام کو اطلاع کیوں نہیں دی۔ اتنے غیر وقت یعنی آدھی رات کو کیوں بلوایا۔ آخر کیا مصلحت تھی آپ کی۔"

"ارے میری کیا مصلحت ہوتی بیٹے۔ مجھے تو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اطلاع تو ان دونوں کو دینی چاہیے تھی نہیں۔ آخر اس آدھی رات کے وقت بھی تو تمہیں بلوایا ہے۔" خورشید جہاں نے کہا۔

"ہاں سعد بھائی۔ امی کی حالت تو اتنی ابتر ہو رہی تھی کہ روزہ کھولنے سے پہلے ہی ان کے ہاتھ پاؤں چھوٹ رہے تھے اور افطار کے بعد تو یہ اپنے حواس میں ہی نہیں رہی تھیں۔ اور میں نے اس خیال سے کہ ممکن ہے آپا افطار کے بعد کھانا کھا کر آئیں آپ کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ پھر دس بج گئے تو میں نے عذیر کو آپ کے پاس تنہا بھیجنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ یہ۔"

"ہاں یہ چھوٹی تو اب بھی مجھے آپ کے پاس جانے سے روک رہی تھی۔ مگر میں نے اس کی ایک نہیں سنی اور آپ کے پاس چلا آیا۔" عذیر نے چھوٹی کی بات کاٹ کر کہا۔

"مگر تمہارے جانے کے بعد معلوم بھی ہے میں نے کتنی پریشانی اٹھائی ہے۔ یہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں نے تمہارے انتظار میں ٹہل ٹہل کر گزارے ہیں کہ خدا کرے تم صحیح سلامت واپس آجاؤ۔" چھوٹی قدرے تیز لہجے میں بولی۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے — میں تو اس وقت یہ سوچ رہا ہوں چھوٹی کہ مجھے عنبر کی گمشدگی کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ عنبر نے تمہیں کم از کم یہ تو بتایا ہوگا کہ اس کمپنی کا کیا نام ہے اور وہ کس جگہ واقع ہے۔"

تب چھوٹی نے اسے ساری تفصیل بتائی۔ سعد جو خورشید جہاں کے پاس ہی صوفے پر ایک طرف ٹک گیا تھا اٹھ کر تھوڑی دیر وہیں کمرے کے وسط میں ٹہلتا رہا۔ پھر بولا۔

"مگر میں تو ایسی کسی ڈیزائننگ کمپنی سے بالکل واقف نہیں بلکہ میں نے یہ نام بھی پہلی بار تمہاری زبان سے سنا ہے۔ کیونکہ یہ گارمنٹس کی فیکٹریاں وغیرہ بھی اسمال انڈسٹریز میں آتی ہیں اور ہمارا آپس میں گہرا لنک ہوتا ہے۔ مگر یہ ڈیزائننگ کمپنی — اور ہاں۔ یہ ڈیزائننگ ویزائننگ کی تو کوئی کمپنی ہوتی ہی نہیں۔ ہر گارمنٹس کمپنی ذاتی طور پر خود اپنے ڈیزائنز آپ ہی تیار کراتی ہے۔ تو یہ بھی ایک فراڈ ہی ہوا۔ اور کورنگی کریک کا علاقہ کچھ فوجی نوعیت کا ہے اور کچھ شہری۔ وہاں اس قسم کی کسی کمپنی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر اس وقت تو رات ہو رہی ہے، میں کل صبح ساری معلومات کرالوں گا۔ اب تو جو کچھ بھی ہو سکے گا کل ہی ہوگا۔"

"لیکن کیا اس وقت ایسا نہیں ہو سکتا کہ تھانے میں آپا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی جائے؟" چھوٹی نے دبی زبان سے کہا۔

"ارے نہیں۔ ایسا تو بھول کر بھی نہ سوچنا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہماری پولیس کی کارکردگی کس قدر لچر اور ناقص ہے۔ وہ رپورٹ درج کرانے والے کو الٹا پھنسا لیتی ہے۔ اور کبھی تھانے بلا لیتی ہے۔ کبھی خود گھر آجاتی ہے۔ اس پر جیب بھی خالی کرالیتی ہے۔" سعد نے کہا تو خورشید جہاں بولیں۔

"اے نہیں نہیں۔ رپٹ لکھوا کر کیا بدنامی مول لینا چاہتی ہو چھوٹی۔ یہ موئے پولیس والے اگر پوچھ گچھ کرنے گھر پر آگئے تو سارے محلے کو خبر ہو جائے گی کہ عنبر گھر سے غائب ہے۔"

"مگر امی! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپا صبح تک واپس آجائیں۔ پھر تو واقعی رپورٹ درج کرانا فضول ہی ہوگا۔" ماں کے منہ سے بدنامی کا لفظ سن کر چھوٹی نے گویا بہن کی لاج رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اگر ایسا ہو جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہ رہے۔" سعد نے جو ابھی تک کھڑا ہی تھا منہ اونچا کر کے پنکھے کی طرف دیکھتے ہوئے عجب سے انداز میں کہا۔

"ہاں، خدا اسے عزت و آبرو اور خیر و سلامتی کے ساتھ گھر پہنچا دے۔ میری تو یہی دعا ہے۔ ارے میں تو روزے کے منہ سے دعائیں مانگتی رہی ہوں۔ پھر بھی وہ ابھی تک تو آئی نہیں۔" خورشید جہاں آزردہ اور گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"امی! اس طرف سے تو آپ مطمئن رہیے۔ آپا جان دے دیں گی۔ مگر اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دیں گی۔ یہ بات تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں۔" چھوٹی ماں کو اطمینان دلانے کی غرض سے بولی۔

تبھی سحری پر جگانے والے زور زور سے کنستر پیٹتے اور آوازیں لگاتے ہوئے عین ان کے گھر کے قریب آگئے۔

"چھوٹی کیا تم روزہ رکھو گی؟" عذیر نے آہستہ سے چھوٹی سے پوچھا۔

"ہاں۔ کیوں نہیں۔" چھوٹی نے کہا۔

"اچھا تو پھر میں بھی رکھوں گا۔ لیکن امی کا روزہ رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔" عذیر بولا۔

"ہاں، یہ تو میں بھی کہتی ہوں مگر امی سنیں جب نا۔" چھوٹی نے کہا اور پھر سعد سے گویا ہوئی۔

"سعد بھائی۔ کیا آپ بھی روزے رکھ رہے ہیں۔؟"

"ہاں۔ بالکل رکھ رہا ہوں۔ بلکہ ہر سال ہی پورے روزے رکھتا ہوں۔" سعد نے کہا۔

"پھر تو آپ بھی ہمارے ساتھ ہی سحری کھالیں۔ وقت تو ہو ہی گیا ہے۔" عذیر نے سعد کو سحری کھانے کی دعوت دی تو چھوٹی نے جز بز ہو کر اس کے ایک ٹہوکا مارا کہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے نہیں اور وہ سعد سے کہہ رہا ہے کہ ہمارے ساتھ سحری کھالے۔ سعد بھی چھوٹی کے چہرے سے ہویدا کشمکش کو بھانپ گیا تھا۔ جلدی سے بولا۔

"نہیں شکریہ۔ فہد میرے ساتھ سحری کھانے کا عادی ہے۔ اگر میں نے یہاں کچھ کھالیا تو پھر وہ بغیر سحری کے روزہ کھینچ جائے گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ اس وقت تو کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ صبح کو عنبر کا پتا لگانے کی کوشش کروں گا۔"

"ہاں بیٹے۔ خدا تمہیں عمر دے۔ تمہارے سوا ہمارا ہے ہی کون جو ہمارے اس بُرے وقت میں ساتھ دے گا—" خورشید جہاں بولیں۔

"امی، آپ کل کا روزہ نہ ہی رکھیں تو بہتر ہوگا کیونکہ آپ تو پہلے ہی کمزور ہو رہی ہیں۔ اس پر آپا کی پریشانی۔"

"اے مٹو بھی۔ پریشانی اور کمزوری سے کیا ہوتا ہے۔ ابھی مجھ میں اتنا دم ہے کہ میں بغیر سحری کے بھی روزہ رکھ سکتی ہوں۔" خورشید جہاں نے کہا۔

"افوہ سعد بھائی، ذرا آپ ہی امی کو سمجھائیے۔ اب یہ اس حالت میں روزہ رکھیں گی تو—"

"ہاں۔ جب کہ کھانے کو بھی کوئی خاص چیز نہیں ہے۔" عذیر چھوٹی کی بات کاٹ کر بولا۔ اور چھوٹی دانت کچکچا کر رہ گئی کہ بھلا سعد کے سامنے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ کھانے کو بھی کچھ نہیں ہے۔

"عذیر! تم الٹی سیدھی نہ بولا کرو۔ افطار کے وقت بھی آپا کی پریشانی میں نوالہ حلق سے اتارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ پھر بھلا میں سحری کے لیے کیسے کچھ تیار کر سکتی تھی۔ بس جو کچھ بھی میسّر ہے چُپ چاپ کھالینا۔" چھوٹی نے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا اور سعد صاف سمجھ گیا کہ سحری کے موقع پر کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ خورشید جہاں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میرے خیال میں تو آپ کل کا روزہ نہ ہی رکھیے پھپھو جان۔ آپ کی حالت واقعی اس قابل نہیں ہے کہ آپ اتنی شدید گرمی میں پورا دن بغیر کھائے پیے کھینچ سکیں۔ ایسا ہی ہے تو جتنے روزے بھی چھٹیں وہ آپ رمضانوں کے بعد رکھ لیجیے گا۔"

"اچھا اگر بغیر روزے کے میری جان نکل گئی تو پھر اللہ میاں مجھ سے نہیں پوچھیں گے کہ تو نے بلاوجہ اور بلا کسی عذر کے روزہ کیوں چھوڑا۔ پھر میں انہیں کیا جواب دوں گی۔" خورشید جہاں نے کچھ اتنی معصومیت سے یہ بات کہی کہ اتنی پریشانی میں بھی سعد کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"پھپھو جان! آپ اس کی فکر نہ کیجیے۔ اللہ میاں کو پہلے سے ہی سب کچھ معلوم ہے آپ نے کن وجوہ کی بنا پر روزہ نہیں رکھا یا نہیں رکھ سکیں۔ اور یہ اللہ میاں ہر معاملے میں اپنے بندوں سے نرمی برتتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس کی مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں تبھی تو حرج، مرض اور سفر کی حالت میں یہ رعایت دی ہے کہ اگر بندے کا روزہ قضا ہو جائے تو وہ بعد میں رکھ سکتا ہے۔"

سعد نے بالکل اس طرح سمجھایا جیسے بچوں کو سمجھایا کرتے ہیں کہ بوڑھا اور بالک برابر ہوتے کے مصداق ضعیفی میں انسان بچوں کی طرح ہی سوچنے لگتا ہے۔ مگر خورشید جہاں اتنی ضعیف تو نہ تھیں۔ زیادہ سے زیادہ باون یا چون برس کی تھیں مگر مصیبتیں اٹھانے اور فاقے سہنے کی وجہ سے اپنی عمر سے دس برس زیادہ ہی لگتی تھیں۔

بہرحال سعد سب کو خدا حافظ کہہ کر جانے لگا تو عذیر نے پوچھا۔

"سعد بھائی اگر آپا کل بھی نہیں آئیں تو—"

"تو پھر تن بہ تقدیر کے مصداق تمہیں خود کو حالات کے رحم و کرم پر ہی چھوڑ دینا پڑے گا۔" سعد نے عجیب تلخ سے انداز میں کہا۔

"نہیں، میرا مطلب ہے کیا میں کل اسکول سے چھٹی کر کے آپ کے پاس آجاؤں؟" سعد کے جواب پر عذیر کا منہ اُتر سا گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"نہیں تمہیں کوئی ضرورت نہیں اسکول سے چھٹی کرنے کی۔ بلکہ یہ چھوٹی بھی آج اطمینان سے کالج جائیں۔ تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ گزرے کہ تمہارے گھر میں کوئی غیر معمولی بات ہو گئی ہے۔ اور رہاں اول تو ابھی کوئی بھی عنبر کے بارے میں کچھ نہیں پوچھے گا۔ اور بالفرض کسی نے پوچھ بھی لیا تو یہی کہہ دینا کہ وہ اپنی ملازمت پر گئی ہوئی ہیں۔ میں بھی جلد سے جلد ان کا پتا لگانے کی کوشش کروں گا۔"

سعد نے گویا تاکیداً کہا۔ اور پھر فوراً ہی باہر نکل گیا۔ عذیر اس کے پیچھے باہر آیا۔ مگر سعد کچھ اتنی عجلت میں تھا کہ عذیر

کے باہر آنے سے قبل ہی جلدی سے کار میں بیٹھا اور زن سے کار لے اُڑا۔ عذیر اندر آیا اور دیوار میں لگے گھنٹے میں وقت دیکھا تین بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ سحری کا وقت ختم ہونے میں صرف پون گھنٹہ ہی رہ گیا تھا اور چھوٹی ابھی تک کھڑی ماں سے کچھ بات کر رہی تھی۔ عذیر قدرے تیز لہجے میں بولا۔

"واہ چھوٹی۔ سحری کا وقت ختم ہونے میں صرف پون گھنٹہ رہ گیا ہے اور تم یہاں کھڑی امی سے باتیں کر رہی ہو۔ اگر کھانے والے کو کچھ نہیں ہے تو صاف صاف بتا دو تاکہ میں بھاگ کر بازار سے کچھ لے آؤں۔"

"نہیں، کھانے کو تھوڑا بہت ہے۔ چار شامی کباب ہیں اور تین چپاتیاں۔ اور میں نے پکوڑوں کا تھوڑا سا بیسن بچا کر رکھ لیا تھا۔ اس کے پکوڑے تلے دیتی ہوں ابھی ابھی۔ مگر پہلے چائے دم دوں گی۔ ایک ہی چولہا ہے نا، اس لیے ہمیشہ چائے پینے سے رہ جاتے ہیں۔"

چھوٹی نے بڑی عجلت میں باورچی خانے کا رخ کرتے ہوئے کہا اور پھر چائے دم دینے کے بعد جلد جلد پکوڑے تلے کباب گرم کر کے تو وہ پہلے ہی عذیر کو دے چکی تھی۔ پکوڑے تیار کرنے کے بعد اس نے عذیر کے ہاتھ ماں کو صرف چائے بھجوائی اور پھر دونوں بہن بھائی نے ساتھ بیٹھ کر سحری کھائی اور سائرن ہونے سے قبل ہی کھا پی کر اٹھ گئے۔

سحری کھانے کے دوران دونوں ہی چپ چپ سے رہے تھے

سعد اپنے گھر پہنچا تو سحری کا وقت ختم ہونے میں پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ فہد نے سحری نہیں کی ہو گی بلکہ اس کے انتظار میں بیٹھا بار بار وقت دیکھ رہا ہو گا۔ اور ہوا بھی یہی۔ خانساماں نے ٹرالی میں کھانے کے لوازمات سجا کر کب کے اس کے کمرے میں رکھ دیے تھے۔ اور فہد نے اب تک کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ حالانکہ جب وہ ملتان یا شہر سے کہیں باہر گیا ہوا ہوتا تھا تو فہد تنہا ہی سب کچھ کھا پی لیتا تھا مگر اس کی موجودگی میں وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہی کھاتا تھا۔ اس بات پر سعد کئی بار اسے ٹوک بھی چکا تھا۔ مگر جواب میں وہ کچھ یہی کہتا۔

"جب آپ کے بغیر نوالہ حلق سے اترتا ہی نہیں تو پھر کیسے کچھ کھا پی سکتا ہوں۔"

یا پھر کہتا۔

"بھائی جان۔ اصل میں تنہا بیٹھ کر مجھ سے کھایا پیا ہی نہیں جاتا۔ اس لیے جب آپ یہاں موجود ہوتے ہیں تو آپ کا انتظار کر لیتا ہوں۔"

گو اس روز بھی اسے فہد کے اب تک سحری نہ کھانے پر سخت کوفت ہوئی تھی۔ لیکن چونکہ سعد کا موڈ سخت آف تھا یا پھر وہ سخت پریشان تھا۔ اس پر سحری کا وقت بھی تنگ ہو رہا تھا اس لیے اس نے فہد سے کچھ نہ کہا اور جلدی سے ہاتھ دھو کر اپنے بستر پر آ بیٹھا اور ٹرالی اپنے آگے سرکالی اور پلیٹ میں سالن ڈال کر فہد سے بولا۔

"چلو، اب جلدی سے جتنا کھا سکتے ہو کھا لو۔ سحری کا وقت ختم ہونے میں مشکل سے دس منٹ ہی رہ گئے ہیں۔ آج تو چائے پینے کا موقع بھی شاید ہی مل سکے۔"

تو فہد نے نہایت خاموشی سے پلیٹ اٹھائی اور کھانا شروع کر دیا۔ دونوں بھائی آسودہ حال تھے اسی لیے اپنی مرضی اور پسند کا کھانا کھاتے تھے۔ وہ ہلکے مرچ مسالے کھانے کے عادی تھے اس لیے افطار پر بھی پکوڑے، چاٹ، دہی بڑے اور کچالو وغیرہ نہیں کھاتے تھے۔ بلکہ سیدھے سبھاؤ کھانا کھا لیتے تھے اور شربت یا لسی کے بجائے پھلوں کا جوس استعمال کرتے تھے۔ بعد میں یعنی مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد رات تک پھل، آئس کریم اور کولڈ ڈرنکس وغیرہ بھی چلتی تھیں۔ اور سحری پر بھی وہ دونوں بھاری اور ٹھوس غذائیں نہیں کھاتے تھے۔ قیمہ ہوتا یا قورمہ پسندے یا کوفتے سب بھنا ہوا ہی کھاتے تھے۔ مٹھاس میں ٹھنڈی ٹھنڈی پڈنگ اور دودھ میں بھیگے ہوئے کھجلے اور سینیاں جو انہیں بہت مرغوب تھیں کھاتے تھے۔ مگر اناڑی کی بندوق کی طرح ساری چیزیں پیٹ میں نہیں ٹھونستے تھے بلکہ تھوڑا تھوڑا کھاتے تھے تاکہ سارا دن طبیعت پر گرانی محسوس ہو نہ سینے پر جلن۔

بہر حال دونوں بھائیوں نے لشتم پشتم جس قدر ممکن ہو سکا کھا پی لیا اور ابھی چائے کے چند گھونٹ ہی لیے تھے کہ سائرن بجنے لگا۔ سعد نے پیالی ٹرالی میں رکھی اور اٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا تاکہ لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ وضو بھی کر لے۔

پھر دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ ہی فجر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد سعد قرآن پاک کے چند رکوع کی تلاوت کرنے کے بعد لیٹنے کی غرض سے کہ اسے سخت نیند آ رہی تھی بستر پر آ بیٹھا۔

اس نے آج سحری کے وقت سے لے کر فہد سے بالکل بات نہیں کی تھی اور یہ بات فہد کو غیر معمولی پن کا احساس دلا رہی تھی جب کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ عذیر آدھی رات کو بڑی پریشانی کے عالم میں آیا تھا اور یہ کہہ کر اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ اس کی والدہ کی حالت اچانک ہی نازک ہو گئی ہے۔ اس نے بھائی کے بستر پر بیٹھتے ہی آخر اس سے پوچھ ہی لیا۔

"خیر تو ہے بھائی جان! آپ بہت پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔ کیا پھپھو جان کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات ہی نہیں۔ وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہ بس۔" اس نے سوچا فہد کو ساری بات بتا دے مگر وہ بتاتے بتاتے خاموش ہو گیا۔

"ہیں، کیا مطلب بھائی جان۔ کیا عذیر کو آدھی رات کے وقت کوئی مذاق سوجھا تھا۔ یا پھر۔۔۔؟" فہد نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔ مگر وہ اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

"نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" اصل میں وہ مخمصے میں پڑ گیا تھا کہ بھائی کو بتائے یا نہ بتائے۔ کیونکہ بات بھی کوئی ایسی معمولی نہیں تھی بلکہ ایک غریب خاندان کی عزت کا معاملہ تھا۔ یوں تو واپسی میں تمام راستے وہ پریشانی کے نہیں شدید غم و غصے کے عالم میں یہی سوچتا آیا تھا کہ اس نے ایک ایسی لڑکی کے پیچھے اپنے سارے وقار۔ عزت اور شخصیت کو اتنا کیوں گرا دیا تھا کہ جو غریب اور بے حیثیت ہوتے ہوئے بھی اتنی مغرور اور بد دماغ ہے کہ اسے منہ تک لگانا گوارا نہیں کرتی۔ اتنی خود سر اور ہوائی دیدہ ہے کہ جدھر منہ اٹھتا ہے بلا سوچے سمجھے چلی جاتی ہے۔

یوں جیسے اسے اپنی عزت کا ذرا سا بھی پاس نہ ہو۔

پہلے غزل کے ہاتھوں اتنی خوار ہوئی تھی اور اب نہ معلوم کن ہاتھوں میں چلی گئی ہے اور اس ایک رات میں اسے اغوا کرنے والوں نے نہ معلوم اس کا کیا حشر کیا ہو گا۔ اب کیا تم اتنے گر جاؤ گے کہ ایک ایسی لڑکی کی محبت کا دم بھرتے رہو گے جو نہ معلوم کس کس کی ہوس کا نشانہ بنے گی یا بنی ہو گی۔

پھر اسے وہ دن یاد آ گئے جب عنبر کا دل جیتنے کی کوشش میں اس سے بہت سی احمقانہ باتیں سرزد ہو گئی تھیں یعنی اسے اتنا زیادہ کمپلیکسڈ دیکھ کر خود کو بے حیثیت اور جاہل اُجڈ ظاہر کرنا۔ اسے خوش کرنے کے لیے بھاگ بھاگ کر خورشید جہاں چھوٹی اور عذیر کے کام کرنا، اس کے پاس ہونے پر مٹھائیاں لانا اور بہانے بہانے سے خورشید جہاں کی مالی مدد کرنا۔ ریحان کی بے وفائی پر اس سے لڑ کر بیٹھ جانا۔ بلکہ ترکِ تعلق کر لینا۔ عنبر کے طنز اور جھڑکیوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتار لینا۔ اور فہد کی مخالفت کے باوجود عنبر کو زبردستی ہی اپنی کمپنی میں لیڈی سپر وائزر کی جاب پر لگا دینا۔ اُف ایک دو یا تین باتیں ہوتیں اپنی گراوٹ کے مظاہرے کی تو وہ یاد بھی رکھتا۔ وہاں تو اتنی ساری باتیں تھیں کہ یاد ہی نہیں آ رہی تھیں۔

مگر پچھتانے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ان حرکتوں پر خجل بھی ہو رہا تھا اور خود کو برا بھلا بھی کہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی اس کا ذہن برابر عنبر میں لگا رہا تھا۔

کہ وہ کہاں ہو گی۔ آخر کن لوگوں نے اسے اغوا کرایا ہے۔ اور کیوں کرایا ہے۔ اور اس عورت نے جو عنبر کو نوکری کا چکر دینے آئی تھی اس نے میری کمپنی کا حوالہ دیا تھا۔ کہ میری کمپنی کی ایک سیل گرل نے اسے عنبر کا پتا بتایا تھا۔ لیکن ایسا کون ہو سکتا ہے جس نے خاص طور پر عنبر کو ہی نشانہ بنایا۔ ہماری تو کسی سے دشمنی بھی نہیں ہے۔

نہ اپنے بزنس کے معاملے میں کسی سے جوڑ توڑ ہی چلتا ہے۔

یہ گتھی کسی طرح سلجھ ہی نہیں رہی تھی۔

گو دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہ اس معاملے کو حالات کے رحم و کرم اور عنبر کی قسمت پر ہی چھوڑ دے۔

کیونکہ یہ معاملہ ہی اتنا سنگین تھا کہ نہ تو وہ پولیس میں اس کی رپورٹ درج کرا سکتا تھا نہ خود اپنے طور پر اس کی جانچ پڑتال ہی کرا سکتا تھا سوا اس کے کہ صبح ہونے کے بعد اپنی فیکٹری میں جا کر بتول نامی لڑکی کے بارے میں معلومات کرائے۔ جب کہ بتول نام کی کوئی لڑکی اس کی فیکٹری میں ملازم ہی نہیں تھی۔

اسی لیے اس نے سوچا تھا کہ جاتے ہی ساری باتیں فہد کو بتا دے گا۔

مگر اب۔ جب بتانے کا موقع آیا تو اس نے سوچا کہ یہ۔۔۔ غریب ہی سہی مگر ایک شریف خاندان کی عزت کا معاملہ ہے بلکہ خود اس کی عزت کا بھی کیونکہ فہد کو معلوم تھا کہ اسے عنبر سے والہانہ عشق ہے جس کا اظہار وہ۔۔۔ اس کے سامنے خود اپنی زبان سے کر چکا ہے۔ اب اگر وہ چھوٹے بھائی سے یہ کہے گا کہ عنبر کو کوئی اغوا کر کے لے گیا ہے تو بھائی کے سامنے خود اس کی ہیٹی ہوگی۔

بھائی یہی سوچے گا کہ عنبر اتنی گری پڑی لڑکی ہے جو ملازمت ملنے کے لالچ میں ایک اجنبی عورت کے ساتھ آنکھیں بند کر کے چلی گئی۔ جب۔۔۔ اس نے شروع ہی سے عنبر کو بہت اونچا کر کے اس کے سامنے پیش کیا تھا۔

جب کہ فہد کے خیالات اور ذہنیت یکسر جدا گانہ تھی۔ وہ حیثیت اور اسٹیٹس کو بہت اہمیت دیتا تھا اور عورت کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ بالخصوص ملازم پیشہ عورت کے بارے میں۔

"تو پھر کیا بات تھی بھائی جان؟" فہد نے اسے اس قدر گم صم دیکھ کر پھر اپنا سوال دہرایا۔

"ہیں۔۔۔!" اس نے چونک کر کہا۔

"بھئی اب کیا بتاؤں۔ تم کو تو معلوم ہی ہے کہ پھوپھو جان کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ فکر اور مالی پریشانیوں نے ان کی صحت کو بھی متاثر کر دیا ہے۔ اس پر انہوں نے جو لگاتار کئی روزے رکھے تو آج افطار کے بعد یک دم ہی ان پر غشی طاری ہو گئی۔ رات تک ہوش نہیں آیا تو عذرا نے گھبرا کر مجھے بلانے دوڑ پڑا۔" پتا نہیں کس طرح یہ کہانی گھڑنے کے بعد وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"ہوں تو کیا آپ نے انہیں ڈاکٹر کو دکھایا۔۔۔؟" فہد نے پوچھا۔

"نہیں، ڈاکٹر کو دکھانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کیونکہ میرے وہاں پہنچنے سے چند منٹ پہلے ہی انہیں ہوش آ گیا تھا۔" سعد نے جواب میں کہا اور پھر ایک طویل جمائی لے کر بیٹھتا ہوا بولا۔

"مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ میرے خیال میں تو تم بھی تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ ساڑھے چھ تو بج ہی چکے ہیں۔ ہاں تم جب بھی اٹھو، مجھے ضرور جگا دینا۔ ممکن ہے میری آنکھ۔۔۔ دیر سے کھلے۔"

"او کے چیف۔" فہد بھی اپنے بستر پر بیٹھتا ہوا بولا۔

پھر سعد واقعی فہد کے دیکھتے دیکھتے ہی فوراً سو گیا۔ اور اس وقت جاگا جب فہد تیار ہو کر گھر سے نکلنے والا تھا اور دن کے دس بج رہے تھے۔ پتا نہیں کیسے آنکھ کھل گئی تھی۔ کم از کم فہد نے تو اسے نہیں جگایا تھا۔ اس بات پر چڑ کر اس نے بھائی سے کہا۔

"عجیب چغد انسان ہو۔ میں نے تو کہا تھا کہ جب تمہاری آنکھ کھلے تو مجھے بھی جگا دینا۔"

"میری آنکھ تو آٹھ بجے کھل گئی تھی بھائی جان۔ بس آپ کو یہی سوچ کے نہیں جگایا کہ آپ ساری رات کے جاگے ہوئے ہیں۔ اور آپ کو فکر کس بات کی ہے۔ اگر باہر ہی جانا ہے تو آج ذرا دیر سے چلے جائیے گا۔" فہد نے کہا۔

تب معاً کچھ یاد آیا تو وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ دراز میں رکھا ہوا ایک چھوٹا کاغذ نکالا اور پھر فہد کے نزدیک آ کر وہ کاغذ اسے تھماتا ہوا بولا۔

"یہ ایک گاڑی کا نمبر ہے۔ وہ تمہارے ایک دوست کے چچا ٹریفک پولیس میں کوئی بڑے افسر ہیں نا؟ انہیں یہ نمبر دکھا کر ذرا ان سے معلوم کرانا کہ یہ اس نمبر کی کار کس کی ہے۔"

اور فہد نے اس کاغذ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انتہائی تعجب سے پوچھا۔

"مگر اس نمبر کے بارے میں انکوائری کرانے کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی بھائی جان؟" تو اس نے الماری کو مقفل کرنے کے بہانے اس کے سوال کا جواب ڈھونڈا اور پھر اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

"وہ میرے ایک بہت اچھے واقف کار ہیں۔ ان کے ملازم کو اسی نمبر کی کار نے ٹکر ماری تھی۔ کار کے ڈرائیور کو روکنے کی کوشش بھی کی گئی تھی مگر وہ بڑی صفائی سے کار لے کر بھاگ نکلا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ مگر آپ کے ان دوست کا کیا نام ہے۔ میرا مطلب ہے اب میں ایک پولیس آفیسر سے نمبر معلوم کرنے کو کہوں گا تو وہ یقیناً مجھ سے اس حادثے کی تفصیل معلوم کرے گا۔" فہد نے شہادت کی انگلی سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

"بھئی، اسے تفصیل معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کیس اگر فائل کیا گیا ہوگا تو میرے دوست کی طرف سے ہی اور کیا گیا ہوگا۔ تم صرف آم کھانے سے غرض رکھو۔ پیڑ گننے سے نہیں۔ اگر تم سے ہو سکے تو اس نمبر کے بارے میں معلومات کرا دو۔ ورنہ لاؤ یہ مجھے دے دو۔ میں خود ہی کرا لوں گا۔" اس نے فہد کے الٹے سیدھے سوالات سے بچنے کے لیے جان کر نخرہ سا کیا۔

"ارے نہیں بھائی جان۔ اس نمبر کے بارے میں تو میں آج ہی معلوم کرا لوں گا کہ کس کار کا ہے۔ میں تو بس یونہی احتیاطاً آپ کے دوست کا نام پوچھ رہا تھا کہ شرف آصفانی کو بتا سکوں۔ مگر خیر، اب اس کی بھی ضرورت نہیں ہے اچھا میں اس وقت سیدھا اسی کے پاس جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔" فہد نے کہا جو آفس جانے کے لیے پہلے سے ہی تیار کھڑا تھا۔

"ارے ہاں سنو فہد۔ ہمارے شوروم میں صرف آٹھ سیلز گرلز ہیں نا؟" اس نے جاتے ہوئے فہد کو روک کر یوں کہا جیسے اسے ایک دم ہی یاد آیا ہو۔

"جی ہاں۔" جاتے ہوئے فہد نے رک کر اس کے اس سوال پر یوں دیکھا جیسے اسے اس کی دماغی صحت مشکوک نظر آ رہی ہو۔

"کیا ان لڑکیوں میں کوئی بتول نامی لڑکی بھی ہے؟" اس نے فہد کے تجسس کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"نہیں۔ تقریباً ساری لڑکیوں کے نام ہی میری انگلیوں کی پوروں پر ہیں۔ مگر بتول نامی کسی لڑکی کا تو دور تک کوئی نشان نہیں ہمارے ہاں۔ لیکن آپ۔۔۔"

فہد نے پھر کچھ پوچھنا چاہا۔ مگر وہ اس کے تجسس کو ختم کرنے کی غرض سے خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

"ہوں، تو گویا ابھی اس نے اپلائی نہیں کیا۔" اور پھر اس نے فہد سے مخاطب ہو کر کہا۔

"وہ اصل میں پچھلے ہفتے وہ ہمارے گودام کے قریب جو بوڑھا سا چوکیدار رہتا ہے اس نے مجھ سے ایک یتیم لڑکی کی سفارش کی تھی سیلز گرل کی جاب کے لیے۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ اور فہد نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا البتہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

رات کو نیند میں خلل پڑنے کی وجہ سے سعد کا سر بھاری سا ہو رہا تھا اور طبیعت بھی بوجھل بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی فہد کے جانے کے بعد اس کا دل تو بہت چاہا کہ آرام سے پڑ کر سو جائے کیونکہ ابھی اسے کوئی کام نہیں تھا لیکن چونکہ عنبر کی طرف سے ایک پریشانی اس پر مسلط تھی اور سب سے بڑھ کر خورشید جہاں کی بے بسی اور پریشانی کا احساس اتنا شدید تھا کہ گھر میں بیٹھ کر وقت گزارنا اسے بالکل گوارا نہ ہوا۔ ورنہ اس کے نزدیک عنبر کا یہ ایک اجنبی عورت کے ساتھ چلے جانے کا یہ اقدام احمقانہ نہیں بلکہ خود سرانہ تھا اور اس کی اس غیر محتاط غیر ذمہ دارانہ حرکت پر وہ اس سے سخت کبیدہ ہو گیا تھا۔ یوں بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ عنبر کو کیسے ڈھونڈے۔

کہاں کہاں تلاش کرے۔

وہ بھی اس طرح کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

کیونکہ پولیس کا سہارا لینا تو اسے بالکل گوارا نہ تھا۔

تو پھر کرے تو کیا کرے۔

تبھی معاً اسے خیال آیا کہ وہ انڈسٹریز کے محکمے سے کم از کم ریکنز کے بارے میں تو معلوم کرے کہ آیا اس نام کی کسی کمپنی کا کراچی میں کوئی وجود بھی ہے یا نہیں اور اس خیال کے آتے ہی اس نے فوراً نمبر ملا کر ایک ذمہ دار افسر سے ریکنز کے بارے میں پوچھا تو تھوڑی دیر کے بعد ہی اسے جواب مل گیا کہ کراچی میں دور تک بھی ایسی کسی کمپنی کا وجود نہیں ہے۔ اسے تو پہلے ہی معلوم

تھا کہ کچھ ایسا ہی جواب ملے گا۔ کیونکہ خود اس نے بھی کبھی ایسی کسی کمپنی کا نام نہیں سنا تھا۔ اس کے باوجود بھی اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اب تو ایک ہی ذریعہ رہ گیا تھا عنبر کا پتا اور نشان ملنے کا اور وہ تھا کار کا نمبر معلوم کرنا کہ اس سے تو کچھ امید بھی بندھتی تھی عنبر کا پتا چلانے کی۔

ڈیڑھ کا گجر بجا تو وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور پھر کمرے میں آ کر ظہر کی نماز ادا کی۔ اصل میں اسے فہد کا انتظار تھا جو ڈھائی بجے تک گھر لوٹ آتا تھا۔ ظہر کی نماز پڑھتے پڑھتے دو تو بج ہی گئے تھے اور اس کا چونکہ شروع سے ہی خیال تھا کہ یہ معلوم کیے بغیر کہ مطلوبہ نمبر کس کی کار کا ہے عنبر کا سراغ لگانا ممکن ہی نہیں ہو گا۔ اس لیے اس نے گھر سے نکلنا فضول ہی سمجھا تھا۔ ابھی وہ نماز سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ وقت سے کچھ پہلے ہی فہد آ گیا اور اسے سلام کرنے کے بعد بولا۔

"یہ اچھا ہی ہوا کہ آپ گھر میں ہی مل گئے۔ میں بھی آج آپ کی وجہ سے آفس نہیں گیا۔ بلکہ جب سے یہاں سے گیا تھا اب تک شرف آصفانی کے پاس ہی بیٹھا رہا۔"

"اچھا۔ مگر اتنی دیر وہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔؟" اصل میں وہ پوچھنا تو یہ چاہ رہا تھا کہ اچھا پھر تم نے کار کے نمبر کے بارے میں کیا معلوم کیا۔ مگر فہد کے سامنے اتنی بے تابی کا مظاہرہ کرنا اسے مناسب نہیں لگا۔

"لیجیے۔ اگر اتنی دیر نہیں بیٹھتا تو پھر کار کے نمبر کے بارے میں کیسے کچھ معلوم کر سکتا تھا۔ شرف نے پہلے رجسٹریشن آفس سے کار کا نمبر چیک کرایا۔ پھر یہ معلوم کیا کہ یہ نمبر کس کی کار کا ہے تو معلوم ہوا کہ کسی رینٹ اے کار والے کی گاڑی کا ہے تب اس نے فوراً ہی وہاں اپنے ایک سپاہی کو بھیجا۔ جو پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد ساری رپورٹ لے کر آیا۔

وہ کار اصل میں بلیک لیموزین تھی۔ جسے ایک نادر خان نامی شخص نے ایک روز کے لیے ہائر کیا تھا۔ شام کو وہ واپس کر دی گئی تھی۔" فہد نے اپنے پیروں کو موزوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے بتایا۔

"او۔ نادر خان۔ مگر یہ نادر خان کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ یہ بھی معلوم کرایا تمہارے دوست نے؟"

"معلوم تو نہیں کرایا مگر معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس نے اس سلسلے میں رینٹ اے کار والے سے پوچھ گچھ کرنے اپنے ایک حوالدار اور ہیڈ کانسٹیبل کو بھیجا ہے۔ اور وہاں سے جو کچھ بھی معلوم ہو گا وہ شام کو چھ بجے فون پر بتا دے گا۔"

فہد نے کہا۔

"چلو خیر، کسی طرح کار کے ماڈل اور چلانے والے کا اتا پتا تو معلوم ہوا۔ اب شام کو تمہارا دوست مزید تفصیلات بتائے گا۔ تو میں اپنے دوست سے جا کر بات کروں گا۔"

سعد نے لباس تبدیل کرنے کی غرض سے اٹھتے ہوئے کہا۔ کہ اس بھری دوپہر میں عنبر کی تلاش میں سڑکیں ناپنا اس کے خیال میں بے سود ہی تھا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ پڑ کر سویا تو فہد کے جگانے پر ہی اٹھا۔ اس وقت سہ پہر کے سوا پانچ بج رہے تھے۔ خاصی دیر سونے پر بھی اس کی کسلمندی دور نہیں ہوئی تھی۔ لیکن چونکہ عصر کا وقت نکلا جا رہا تھا اس لیے اس نے سستی اور کاہلی کو ایک طرف رکھ کر وضو کیا اور عصر کی نماز ادا کی۔

بہرحال عصر کا وقت ختم ہو کر افطار کا وقت آ گیا بلکہ اس نے روزہ بھی افطار کر لیا مگر اس کی بے چینی میں کمی نہیں آئی۔ وہ چاہتا تو فہد سے بھی پوچھ سکتا تھا کہ اس کے ایس پی دوست کا فون کب آئے گا مگر اس ڈر سے نہیں پوچھا کہ کہیں فہد معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ جائے۔ حالانکہ ایسا ممکن ہی نہ تھا مگر وہی مثل تھی کہ چور کی ڈاڑھی میں تنکا یعنی وہ خواہ مخواہ کے وہم میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ تو یہ اس نے تو کئی بار دل ہی دل میں یہ دعا بھی کی تھی کہ عذیر اسے پوچھتا اس کے گھر ہرگز نہ آئے۔ یوں بھی عنبر کو ڈھونڈنے کے بجائے سارا دن گھر میں گزار دینے پر وہ خود کو مجرم سا محسوس کر رہا تھا کیونکہ خورشید جہاں نے اپنی ساری امیدیں اس سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ عنبر کی بازیابی کے معاملے میں اسے ہی اپنا معاون اور مددگار سمجھ بیٹھی تھیں۔ اور اب وہ بھی آس لگائے بیٹھی ہوں گی کہ وہ یا تو عنبر کی کوئی خبر لائے گا یا پھر خود عنبر کو لا کر

ان کے سامنے حاضر کر دے گا۔ جب کہ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ بھی ان کی طرح اس معاملے میں کتنا بے بس اور مجبور ہے۔ اب تو خواہ ایس پی کا فون آتا یا نہ آتا اسے ہر صورت میں خورشید جہاں کی خیر خبر لینے جانا ہی تھا اسی لیے مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے چائے پی کر لباس تبدیل کیا۔ فہد بھی کہیں جانے کے لیے پر تولے بیٹھا تھا۔ سعد کو کہیں جانے کے لیے تیار کھڑا دیکھ کر اس نے کہا۔

"ارے آپ بھی کہیں جانے کے لیے تیار کھڑے ہیں بھائی جان ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ آپ گھر پر ہوں گے تو خود ہی شرف سے بات کر لیں گے۔"

"نہیں بھئی، اب میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ میں تمہارے دوست کی فون کال کے انتظار میں گھنٹوں ٹوکتا رہوں۔ وہ تو میرے خیال میں شاید ہی اب تمہیں فون کرے کیونکہ وہ بہت مصروف آدمی ہے۔" سعد بیزار کن سے لہجے میں بولا کہ عنبر کے اغوا کا عقدہ نہ کھلنے کی وجہ سے اس کا ذہن سخت الجھا ہوا تھا۔

"اوہ ہاں۔ واقعی۔ لیکن ایسا کیوں نہ کروں بھائی جان کہ جانے سے پہلے خود ہی شرف کو فون کر کے پوچھ لوں کہ اب تک اس نے کون سا تیر مارا ہے۔ کیونکہ ہماری غیر موجودگی میں اگر اس کا فون آیا تب بھی بعد میں مجھے ہی اسے فون کرنا پڑے گا۔"

"واہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔" سعد نے اس کی بات پر دل میں سوچا مگر لاپروائی سے کام لے کر بولا۔

"ٹھیک ہے اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو ضرور پوچھ لو۔" اور تب فہد نے جلدی سے شرف کا نمبر ڈائل کیا۔ ادھر سے خود شرف نے ہی اس کا فون ریسیو کیا۔

"ارے بھئی، کہاں ہو شرف۔ شام کو فون کرنے کو کہا تھا تم نے۔ اور اب رات ہو گئی ہے مگر تمہارا کوئی اتا پتا ہی نہیں۔" فہد نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"بس میں وہ راؤنڈ پر چلا گیا تھا۔ ابھی ابھی آیا ہوں اور کچھ دیر بعد ہی تمہیں فون کرنے والا تھا۔" ادھر سے جواب ملا۔

"اچھا تو پھر کیا بنا میرے کام کا۔؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں بن سکا کیونکہ نادر خان نامی جس شخص نے وہ گاڑی کرائے پر لی تھی اس کا تو کوئی سراغ ہی نہیں مل رہا۔ البتہ اس نے جو پتا لکھوایا تھا وہ ضرور مل گیا ہے۔ مگر جن لوگوں کا پتا لکھوایا تھا ان کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ وہ پوری فیملی سیزن منانے کی غرض سے ایک ہفتے قبل سوات جا چکی تھی۔ بنگلے میں صرف ایک چوکیدار اور مالی ہی رہ رہا ہے اور ان دونوں کا کہنا ہے کہ وہ نادر خان نامی کسی شخص سے واقف نہیں ہیں۔ اور ان کا شوفر بھی گزشتہ چار روز سے اپنی آنکھوں کے آپریشن کی غرض سے ہسپتال میں ہی پڑا ہوا ہے۔ اس نے نادر خان نامی کسی شخص کے وجود سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔" شرف نے گویا تفصیل بتائی۔

"تو پھر اب اس سلسلے میں مزید کارروائی کے بارے میں تمہارا کیا ارادہ ہے؟" فہد نے پوچھا۔

"ارے ارادہ وراداہ کیسا۔ ہمیں تو بس یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کار کس کی ہے، سو معلوم کر لیا۔ باقی کارروائی بھی کسی نہ کسی طرح کر ہی لیں گے۔" شرف بولا۔ اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس معاملے میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں ہے۔ فہد کچھ سوچ کر بولا۔

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ جس شخص نے کار ہائر کی تھی اس نے اپنا نام بھی غلط لکھوایا ہو۔ مگر جن لوگوں کا اس نے پتا لکھوایا تھا وہ کس علاقے میں رہتے ہیں؟"

"وہ محمد علی سوسائٹی میں رہتے ہیں۔ کوئی بزنس مین ہیں۔ ان کا نام ایم ایم ملک ہے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے ان کی۔ بڑا بیٹا اسٹیٹس میں تعلیم پا رہا ہے اور باقی دونوں اولادیں ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ لیکن یار تم کار کے متعلق جاننا چاہتے تھے سو میں نے تمہیں بتا دیا۔ ویسے بھی یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ پھر بھلا دوسرے کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے سے فائدہ جو تم پولیس والوں کے چکر میں پڑو۔ جب کہ تم کو معلوم ہی ہے کہ میرا تعلق ٹریفک پولیس سے ہے

اور تمہارا یہ کیس ۔"

"ہاں ہاں سمجھ گیا۔ اور میں بھی اتنا فالتو یا بے وقوف نہیں ہوں کہ بلاوجہ اور بلا تعلق پولیس کے چکر میں پڑوں گا۔ تم اس معاملے کو اب ختم ہی سمجھو۔ بلکہ میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے میرے ایک اتنے فالتو معاملے کے لیے اپنا قیمتی وقت برباد کیا۔"

اتنا کہہ کر فہد نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ وقت تیزی سے نکلا جا رہا تھا اور آٹھ تو تقریباً بج ہی گئے تھے۔ فہد نے ڈریسر کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ٹائی کی گرہ کو درست کرتے ہوئے سعد سے پوچھا جو بظاہر بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا مگر اس کے کان اور پورا دھیان فہد کی گفتگو کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔

"آٹھ تو بج ہی گئے ہیں بھائی جان ۔ اگر آپ کا ارادہ واقعی کہیں جانے کا ہے تو آیئے ہم دونوں ساتھ ہی نکل جاتے ہیں۔"

"ہاں چلو۔ مجھے بھی فون کے انتظار میں کافی دیر ہو گئی ہے۔" سعد نے ــــ ٹیبل پر رکھی کار کی چابی اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر فہد کے ساتھ باہر نکل آیا۔ پھر فہد نے کار کی طرف بڑھنے کے دوران میں شرف کی بتائی ہوئی ساری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔ اور بڑی عجلت میں کار میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے زن سے لے اُڑا۔

اس نے اپنی عجلت میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ رینٹ اے کار والے کے رجسٹر میں نادر خان نامی شخص کے لکھوائے پتے کا سُن کر بڑے بھائی پر کیسے سناٹے سے گزر گئے ہیں اور وہ خورشید جہاں کے پاس جانے کے بجائے محمد علی سوسائٹی کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ جب کہ اس کا وہاں جانا بے سود ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ گھر کے مکینوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہاں جا کر وہ کچھ بھی معلوم نہ کر سکا۔ بس چوکیدار سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ وہ پوری فیملی دس روز سے سوات وغیرہ گئی ہوئی ہے۔ اور دو ماہ بعد ہی واپس آئے گی۔ گویا وہاں جانا بھی بے سود ہی ثابت ہوا تھا۔ اس کے باوجود بھی چوکیدار سے پوچھ گچھ کرنے کے دوران میں سعد نے مقفل گیٹ سے اندر کی طرف بنگلے کے ماحول کو گہری نظروں سے دیکھ لیا تھا۔ لانز کے پرلی طرف برآمدے میں جلتے مدھم سے بلب کی روشنی میں چہار سو سناٹا ہی بکھرا نظر آیا تھا۔ بنگلہ بھی گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور وہاں کسی بھی متنفس کے دور دور تک آثار ہی نظر نہیں آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ باتوں ہی باتوں میں اس نے چوکیدار سے پوچھ لیا تھا کہ آج صبح یا کل کسی وقت ایک کالے رنگ کی لیموزین کار میں بیگم صاحبہ سے ملنے چند مہمان تو نہیں آئے تھے۔ تو جواب میں چوکیدار نے اپنی سیر سوا سیر کی کھوپڑی ہلاتے ہوئے یہی کہا کہ نہیں جناب ادھر تو جب سے صاحب لوگ پہاڑ پر گئے ہیں کوئی بھی نہیں آیا۔

تب سعد نے مایوس ہو کر خورشید جہاں کے گھر کا رُخ کیا۔ حالانکہ وہ یوں بے نیل مرام ان کے پاس جانے سے کترا رہا تھا۔ مگر صرف اس خیال سے کہ کہیں اس کے نہ آنے کی وجہ سے عذیر پھر اسے لینے نہ آ جائے۔ کیونکہ فہد کی موجودگی میں عذیر کا پھر رات گئے آنا اسے شک میں مبتلا کر سکتا تھا، اس لیے سعد کو گویا نہ چاہتے ہوئے بھی خورشید جہاں کے پاس جانا پڑ رہا تھا۔

اس کا گھر نرسری کے بلاک چھ میں تھا اور وہ شہید ملت روڈ سے ہوتا ہوا نرسری کے مین چوراہے پر کھڑا سگنل کھلنے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اس کی نظر اپنے بائیں ہاتھ پر کی کار پر پڑی۔ تو دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کیونکہ کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر غزل بیٹھی تھی اور اس کے پاس فرنٹ سیٹ پر ایک اور لڑکی جس نے دوپٹے سے اپنا سر اور چہرہ ڈھانپ رکھا تھا صرف پیشانی اور تھوڑا سا چہرہ ہی کھلا ہوا تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا اور وہ صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا کیونکہ سگنل کھل جانے کی وجہ سے غزل نے تیزی سے کار آگے بڑھا لی تھی۔ سعد کو معاً پھوپی کے ان شبہات کا خیال آ گیا جو اس نے غزل کے لیے ظاہر کیے تھے۔

چنانچہ بڑے غیر ارادی طور پر اس نے بھی تیزی سے کار آگے بڑھائی اور غزل کی کار کا تعاقب کرنے لگا۔

وہ لڑکی جس کی وہ صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا یقیناً عنبر ہی تھی۔ اس خیال نے اس کے اندر چنگاریاں سی بھر دی تھیں۔ رات کے ساڑھے دس بجے کا عمل تھا اور چونکہ رمضان کا مہینہ تھا اس لیے سڑک پر ٹریفک بھی

زیادہ نہیں تھا اس لیے غزل کی کار کا تعاقب کرنے میں دشواری بھی نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ ایک تو ٹریفک کم تھا دوسرے غزل معتدل رفتار میں کار چلا رہی تھی مگر جوں ہی وہ ہوٹل میٹروپول کے چوراہے پر پہنچی اس نے کلفٹن کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے پرل کانٹینینٹل کا رُخ کیا اور اگلا چوراہا پار کرتے ہی کار کی اسپیڈ بڑھا دی۔ وہ کبھی غزل کی کار کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا۔ کبھی آگے بڑھ جاتا۔

اصل میں وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ فرنٹ سیٹ پر غزل کے پاس کون لڑکی بیٹھی ہے مگر سڑک پر لگے بجلی کے کھمبوں کی روشنی اتنی مدھم ثابت ہو رہی تھی کہ کوشش کے باوجود وہ اس لڑکی کو نہیں دیکھ سکا تھا جو اس کے خیال میں صد فی صد عنبر ہی تھی اور کسی دباؤ کے تحت یا خوف کی وجہ سے فرنٹ سیٹ پر سمٹی سکڑی اور دبکی ہوئی تھی اور آخر غزل اسے لے کر کہاں جا رہی تھی۔ یہ خیال ہی اسے اس وقت آیا جب ستر اسی کی رفتار میں کار چلاتی غزل نے شیر شاہ کا علاقہ بھی پار کر لیا۔ شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے ٹرک اور بسوں کے علاقے میں بھی کسی خطرے کی پروا نہیں کی تھی۔

سعد کو شبہ تھا کہ فرنٹ سیٹ پر غزل کے ساتھ عنبرین بیٹھی ہے اس لیے اس نے کسی خطرے کی پروا نہیں کی تھی۔ وہی تیز رفتار برقرار رکھی تھی۔ جب کہ دو تین جگہ راستہ صاف نہ ہونے کی وجہ سے سعد کو مجبوراً رکنا بھی پڑا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ اس کے تعاقب میں لگا رہا تھا۔ آخر کوئی پون گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد کار ماری پور جانے والے راستے کی ایک کچی سڑک پر مڑی اور تیزی سے یہ راستہ طے کرتی ایک ویران اور سنسان علاقے میں پہنچی جہاں کئی ہزار کے رقبے پر کسی عمارت کے چہار طرف پھیلی اونچی چار دیواری نظر آئی۔ اس کے انتہائی وسط میں ایک اونچا مضبوط اور آہنی پھاٹک تھا۔ جونہی غزل کی کار اس کے نزدیک پہنچی وہ پھاٹک خود بخود کھل گیا اور غزل اپنی کار کو اندر لے گئی۔ سعد نے بھی ایک لمحے کا توقف نہیں کیا اور اسی تیزی سے پھاٹک کے اندر داخل ہو گیا۔ مگر ابھی وہ بیس پچیس گز آگے ہی آیا تھا کہ نہ معلوم کس سمت سے گولیوں کی ایک باڑھ چلی۔ اور اسے کچھ خبر ہی نہ رہی۔

فہد پچھلی رات عذیر کے آجانے اور سعد کے جانے کی وجہ سے ڈسٹرب رہا تھا۔ اس پر میٹنگ کہیں گیارہ بجے جا کر ختم ہوئی تھی۔ وہ گھر واپس آیا تو بھائی کو موجود نہ پا کر یہی سمجھا کہ کسی دوست سے باتوں میں لگ گئے ہوں گے یا پھر پھپھو کی خیریت پوچھنے چلے گئے ہوں گے۔ بس یہی سوچ کر لباس تبدیل کرتے ہی وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اور ایسا پڑ کر سویا کہ صبح اذانوں کے وقت ہی آنکھ کھلی۔ وہ بھی ملازم کے شاید تیسری بار دستک دینے پر۔ گو وہ دروازے کا اندر سے کھٹکا لگا کر نہیں سویا تھا بلکہ دروازہ محض بھڑا ہوا تھا۔ مگر ملازم کو یہی ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ اجازت لیے بغیر اندر نہ آئے۔ اذانوں کے وقت آنکھ کھلی تو ظاہر ہے کتنی کوفت ہوئی ہوگی۔ اس پر بھائی کو بھی ہنوز غائب پایا۔ اور یہ ایک غیر معمولی بات ہی تھی۔ کیونکہ سعد اوّل تو اتنی دیر گئے تک کبھی باہر نہیں رہتا تھا اور اگر کبھی اتفاق سے کسی دوست کو ایئرپورٹ سی آف کرنے یا کسی شادی بیاہ میں شرکت کرنے جانا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ ایک بجے تک واپس آجاتا تھا۔
کجا کہ پوری رات غائب رہنے کے باوجود وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ فہد کا اس کے لیے پریشان ہونا ایک قدرتی

بات تھی۔ اس نے سب سے پہلے تو ملازم کو بلا کر اس سے پوچھا کہ رات کو بھائی جان کا کوئی فون وغیرہ تو نہیں آیا تھا۔ اور جب ملازم نے جواب نفی میں دیا تو پھر اس نے ان جگہوں پر جہاں بھائی کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا فون کر ڈالا۔ حتیٰ کہ ...کی کا فون بھی کھڑ کھڑا لیا مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ تقریباً سب نے یہی کہا کہ ان سے تو کئی روز سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ تب فہد نے یہی سوچا کہ یقیناً بھائی جان پھپھو جان کے یہاں گئے ہوں گے۔ ممکن ہے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہو اس لیے وہیں رک گئے ہوں اور انہیں کسی ہسپتال میں داخل کر دیا ہو۔
وہ بالکل دوسرے ہی خیالات اور ذہنیت کا حامل تھا۔ اور پھر ایک آسودہ حال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ کچھ اس لیے بھی حیثیت اور اسٹیٹس کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ عنبر کی ذات میں بھائی کی حد درجے بڑھی ہوئی پسندیدگی گو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن کچھ بڑے بھائی سے مرعوب بھی تھا اور اس کا بہت احترام بھی کرتا تھا اور محبت بھی۔ کھلم کھلا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار تو نہیں کر سکتا تھا مگر متعدد بار دبے دبے لفظوں میں اس نے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کسی کی ذات میں دلچسپی لینے سے پہلے یہ دیکھ اور سوچ لینا چاہیے کہ وہ اپنی ٹکر کا بھی ہے۔ اپنے معیار پر پورا بھی اترتا ہے یا نہیں۔
اس کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ بھی قائم ہو سکتی ہے یا نہیں۔
اور پھر یہ کہ زندگی بھر کی رفاقت میں وہ اس کا ہاتھ تھام کر چلنے کے قابل بھی ہو سکے گا۔ اور جواب میں وہ ہمیشہ یہی کہتا۔
”ہاں، جہاں تک کسی کی ذات میں دلچسپی لینے کا معاملہ ہے تو یہی سب دیکھنا اور سوچنا چاہیے جو تم کہہ رہے ہو۔ مگر یہ دل کا معاملہ ہے۔ اور دل کے معاملات میں حیثیت، اسٹیٹس تو کیا ذات پات کو بھی نہیں دیکھا جاتا۔ اور عنبرین تو صرف حیثیت ہی میں ہم سے کم ہے۔ ورنہ خاندان، شرافت، صورت شکل اور تعلیم کے لحاظ سے تو بڑی بڑی دولت مند لڑکیوں کو مات دے سکتی ہے۔ اور تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ تمہیں اگر وہ اپنی غریبی کی وجہ سے پسند نہیں تو کم از کم میری خوشی کی خاطر ہی اسے قبول کر لینا چاہیے اور وہ تو ایک ان چھوا اور بغیر تراشا ہوا ہیرا ہے۔ جب اسے تراشنے کا وقت آئے گا تو اس کی چمک دمک تمہاری آنکھوں کو بھی خیرہ کر دے گی۔ لہٰذا تمہیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ میں پوری صداقت اور دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ اسے چاہتا ہوں۔ اس کی محبت میں سر تا پا غرق ہوں۔ سمجھے۔“
فہد کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا بڑا بھائی کچھ فطرتاً ہی خدا ترس ہمدرد اور دوسروں کی مدد کرنے کا عادی ہے۔ گو عنبرین کی چاہت میں اس کے گھر جاتا ہے مگر اس کے وہاں جانے میں خدا ترسی اور ہمدردی کا جذبہ بھی شامل ہے اور وہ بہانے بہانے سے ان کی مدد بھی کرتا رہتا ہے۔ اب وہ یقیناً انہی کے یہاں ہوگا اور پھپھو جان کا علاج معالجہ کرانے میں لگا ہوگا۔
یہی سب سوچنے کے بعد اس نے اٹھ کر شیو کیا۔ سحری چھٹ جانے کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکا تھا اس لیے ہلکا سا ناشتہ کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر سیدھا خورشید جہاں کے گھر کا رخ کیا۔
اس سمے صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے جب اس نے گاڑی سے اتر کر خورشید جہاں کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ عذیر تو کب کا اسکول جا چکا تھا۔ مگر اس روز چھوٹی ماں کی دگرگوں حالت کے پیش نظر گھر پر ہی رک گئی تھی اور اسی نے آ کر دروازہ کھولا تھا۔ اس نے کواڑ کی درز سے جھانک کر دیکھ لیا تھا کہ ایک کار باہر کھڑی ہے اور یہی سمجھی تھی کہ یقیناً سعد عنبر کے بارے میں کوئی خبر لے کر آیا ہے مگر دروازہ کھولتے ہی اس نے سعد کی جگہ فہد کو کھڑا دیکھا تو ایسی سٹ پٹائی کہ بس اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ تو کیا فہد کو بھی آپا کی گمشدگی کا علم ہو گیا ہے۔ مگر سعد بھائی تو کہہ رہے تھے کہ انہوں نے فہد سے یہ بات راز میں رکھی ہے۔ پھر آخر یہ فہد اس وقت یہاں کیوں آیا۔ فہد کو ایک ٹک دیکھنے کے ساتھ اس کے ذہن میں یہی سوچ گردش کرتی رہی۔
”کیا آج بھی اندر آنے کی اجازت نہیں ملے گی؟“ آخر فہد نے اسے یوں اجنبیوں کی طرح گھورتے دیکھ کر خود ہی کہا۔
”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ یہ کوئی دیوان خاص تو نہیں ایک معمولی سی بیٹھک ہی ہے جس میں آپ کے بیٹھنے کے لیے ڈھنگ کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔“
اسے واقعی فہد کو اندر بلاتے ہوئے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ عنبر کی پریشانی میں کئی روز سے بیٹھک کی صفائی ستھرائی بھی نہیں ہوئی تھی اور ہر چیز بے ترتیب پڑی ہوئی تھی۔
”پھر وہی کمپلیکس کی بات۔ بھئی آخر آپ بھی تو اسی کمرے میں اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ پھر میرے اوپر کیا سرخاب کے پر لگے ہیں جو یہاں بیٹھنے سے ٹوٹ کر گر جائیں گے۔“

فہد نے محض اس کی شرمندگی دور کرنے کی غرض سے کہا۔ مگر وہ کچھ زیادہ ہی شرمندہ ہوگئی۔ دل چاہا کہے کہ یہ کمپلیکس کی بات نہیں بلکہ قسمت کی بات ہے مگر اس سمے وہ فہد کی غیر متوقع آمد پر بوکھلاسی گئی تھی۔

"گھر میں اس وقت کون کون موجود ہے؟" فہد نے بیٹھک میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ زیادہ ہی بوکھلا کر بولی۔

"وہ ۔ وہ عذیر تو ٹائمنگ تبدیل ہونے کی وجہ سے نو بجے ہی اسکول چلا جاتا ہے ۔ اور ۔ اور میں آج امی کی طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے کالج نہیں جاسکی۔"

"ہوں۔ تو آج بھی آپ گھر میں اکیلی ہیں۔؟" فہد نے اس پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ امی بھی اندر کمرے میں سو رہی ہیں۔"

"اور عنبر باجی کیا کر رہی ہیں ۔ ؟" چھوٹی کے سٹ پٹائے ہوئے سے انداز پر فہد نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ جسے معنی خیز مسکراہٹ سے تعبیر کرتے ہوئے وہ یہی سمجھی کہ وہ سب کچھ جانتے ہوئے انجان بن کر آپا کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ وہ گڑبڑا کر بولی۔

"وہ ۔ وہ آپا بھی گئی ہوئی ہیں۔"

"اچھا تو پھر وہ سعد بھائی جان بھی کہیں گئے ہوئے ہوں گے۔"

"سعد بھائی ۔ وہ تو کہیں نہیں گئے ۔ بلکہ ۔ بلکہ میں تو آپ کے دروازہ کھٹکھٹانے پر یہی سمجھی تھی کہ سعد بھائی آئے ہوں گے۔"

"آئے ہوں گے؟ تو کیا وہ صبح سے کہیں گئے ہوئے تھے؟" اس کے گڑبڑا جانے سے فہد یہی سمجھا کہ وہ اس سے کچھ چھپانا چاہ رہی ہے۔

"نہیں، صبح کو تو وہ آئے ہی نہیں۔ وہ تو رات کو آئے تھے۔ وہ بھی بس تھوڑی دیر کے لیے۔" چھوٹی نے کچھ اس انداز میں بتایا کہ فہد کو اس کی بات کا یقین کرلینا ہی پڑا۔

"اچھا مگر رات کو کس وقت آئے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کوئی نو بجے کے قریب۔ مشکل سے کوئی بیس پچیس منٹ ہی بیٹھے تھے۔ میرا مطلب ہے کچھ عجلت میں تھے۔" چھوٹی نے کہا۔

"عجلت میں تھے ۔ ؟ میں سمجھا نہیں۔" فہد نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ان کا کسی سے بہت اہم اپائنٹمنٹ تھا۔ کہہ رہے تھے کہ اگر دیر ہوگئی تو وہ شخص نکل جائے گا۔" چھوٹی نے قدرے وضاحت سے بتایا اور فہد نے کچھ سوچنے کے بعد پوچھا۔

"اچھا تو کیا انہوں نے اس شخص کا نام بھی بتایا تھا جس سے ان کا اپائنٹمنٹ تھا۔؟"

"نہیں۔" جواب ملا۔

"ہوں ۔ تو کیا یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ جا کہاں رہے ہیں ۔ ؟"

"نہیں۔ وہ بھلا یہ سب مجھے کیوں بتاتے۔" چھوٹی نے کہا اور پھر بولی۔

"مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا آپ کو سعد بھائی نے نہیں بتایا۔"

"وہ ملتے تو بتلاتے بھی۔ وہ تو کل رات سے غائب ہیں۔ جب کہ یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔ زندگی میں آج تک تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے علم میں لائے بغیر انہوں نے گھر سے باہر کہیں رات گزاری ہو۔" فہد تردّد سے بولا۔

"اچھا لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کسی دوست کے ہاں رک گئے ہوں۔ اور ادھر آپ گھر سے نکلے ہوں اور ادھر وہ پہنچے ہوں۔" چھوٹی نے اپنی قیاس آرائی کی۔

"ہاں اس کا بھی امکان ہوسکتا ہے۔ مگر ان کے جتنے دوست ہیں میں ان سب کو فون کرکے پوچھ چکا ہوں۔ سب نے یہی جواب دیا کہ بھائی جان ان کے یہاں آئے ہی نہیں۔" فہد نے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"اب آپ نے کہا تو میں گھر جا کر بھی انہیں دیکھ لیتا ہوں۔ بس خدا کرے وہ گھر پر مل ہی جائیں۔"

"مگر آپ کا گھر تو کافی دور ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بات آپ گھر پر فون کرکے بھی معلوم کرسکتے ہیں۔" چھوٹی نے گویا اسے عقل کی بات بتائی تو فہد نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"ارے واہ آپ تو بڑی انٹیلیجنٹ ہیں کہ یوں بھی مجھے اس وقت سائٹ ایریا جانا تھا۔ گھر فون کروں گا تو وقت بچ جائے گا۔" اور چھوٹی بس مسکرا کر رہ گئی۔

"اچھا اب چلوں گا۔ ویسے کیا عنبر باجی کسی جاب پر لگ گئی ہیں؟" فہد نے جاتے جاتے پوچھا۔ گو اس نے سادگی سے ہی پوچھا تھا مگر چھوٹی کو اس کا لہجہ معنی خیز سا لگا۔

"نن ۔ نہیں ۔ ابھی جاب پر تو نہیں لگیں، البتہ جاب کے لیے کوشش ضرور کر رہی ہیں۔" چھوٹی ایک بار پھر گڑبڑا گئی تھی۔

"اوکے بائی۔" فہد جانے کی غرض سے گھوما۔

"اچھا خدا حافظ۔ مگر ذرا سعد بھائی سے کہہ دیجیے گا کہ وہ اپنی خیر و عافیت سے ہمیں بھی مطلع کردیں۔" چھوٹی نے کہا۔

"ٹھیک ہے کہہ دوں گا مگر پہلے خدا سے یہ دعا کریں کہ وہ اب تک گھر واپس آگئے ہوں۔" فہد نے کہا اور قدم بڑھا کر دہلیز پار کر گیا۔

تب چھوٹی نے سکھ کا سانس لیا۔

فہد کے جانے کے بعد اسے تھوڑا سا احساس تو ہوا تھا کہ فہد نے اس کی امی کی خیریت پوچھی نہ ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر وہ خود اپنی پریشانی میں مبتلا تھی۔ ادھر جوان اور عزت دار بہن غائب اور ادھر ماں کی ناگفتہ بہ حالت۔ اس پر مستزاد پیسے بھی ختم ہوگئے تھے اور گھر میں کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں رہا تھا۔ اور اب سعد کی طرف سے بھی ایک نئی پریشانی لاحق ہوگئی تھی۔ اور وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ خدا کرے سعد بھائی اپنے گھر واپس آگئے ہوں۔ ورنہ پھر آپا کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کون کرے گا۔

جوں جوں وقت آگے بڑھتا جا رہا تھا خورشید جہاں ہی نہیں بلکہ چھوٹی بھی عنبر کی واپسی کی طرف سے مایوس ہوتی جا رہی تھی۔ چھوٹی کچھ فطرتاً ہی بہت زیرک اور معاملہ فہم تھی اور اندازے لگانے میں بڑی ماہر۔ اسے پیچیدہ معاملات جو دوسروں کے لیے معمہ بنے ہوتے سلجھانے کا بڑا شوق تھا اور اسے پورا پورا یقین تھا کہ عنبر کو اغوا کرانے والی غزل کے سوا اور کوئی ہستی ہو ہی نہیں سکتی اور اس سلسلے میں اس نے کئی بار عالیہ سے ملنے کا قصد بھی کیا تھا۔ مگر ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی تبخ پیدا ہو جاتی کہ اس کا ارادہ دھرا کا دھرا رہ جاتا۔ اصل میں اس کا خیال تھا کہ عالیہ کو بھی عنبر کی گمشدگی سے باخبر کردینا چاہیے۔ کیونکہ اگر عالیہ اس معاملے میں ملوث ہوگی تو کم از کم اسے یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا شبہ کس پر ہے۔ اگر نہ ہوگی تو آپا کی گمشدگی کے بارے میں تو علم ہو جائے گا۔ اور اب فہد کے جانے کے بعد اس نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ وہ اگلے روز عالیہ سے ملنے جائے گی اور اپنے آخری دو پیریڈ مس کرکے کالج سے سیدھی عالیہ کے یہاں چلی جائے گی۔ کیونکہ اگر ماں سے پوچھا تو ہرگز ہرگز اسے عالیہ کے یہاں جانے کی اجازت نہیں دیں گی۔

عنبر چلتے چلتے عذیر کو ماں کا خیال رکھنے کی تاکید کرکے کار کی طرف گھومی تو وہ اجنبی عورت جس نے پہلے سے اس کے لیے کار کا دروازہ کھول رکھا تھا اور خود دروازے سے بالکل لگی بیٹھی تھی عجلت میں بولی۔

"آئیے مس خان جلدی سے بیٹھ جائیے۔ ہم پہلے ہی کافی لیٹ ہوچکے ہیں۔"

تو عنبر نے بھی بیٹھنے میں عجلت دکھائی۔ گاڑی گو خاصی بڑی تھی لیکن چونکہ اس اجنبی عورت سمیت پچھلی سیٹ پر دو عورتیں اور بیٹھی تھیں اس لیے انہیں اپنے درمیان عنبر کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنانی پڑی اور عنبر گھٹ گھٹا کر اس اجنبی عورت اور ان عورتوں کے درمیان جو لباس اور وضع قطع سے ورکر ہی نظر آرہی تھیں کسی طرح بیٹھ ہی گئی۔

ایک تو نئی اور اتنی معقول ملازمت مل جانے کی خوشی، دوسرے نئے باس کے سامنے پیش ہونے کے خیال سے دل بُری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ اس پر یہ دھڑکا کہ کہیں کوئی محلّے والا اسے ان اجنبی لوگوں کے ساتھ جاتا نہ دیکھ لے غرضیکہ

وہ کچھ ایسے ہی وسوسوں اور خیالات میں گھری بیٹھی تھی۔ اس نے نہ ان تینوں عورتوں کی طرف کوئی توجہ دی اور نہ آگے بیٹھے دونوں مردوں کی طرف۔ اس نے تو یہ دیکھنے یا محسوس کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ کار اس کا محلہ ہی نہیں بلکہ علاقہ بھی کب کا پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ یا اس کار کا رخ کس طرف ہے۔ اس پر تو ایک خود فراموشی کا سا عالم طاری تھا۔ اور نہ معلوم کب تک رہتا کہ فراٹے بھرتی کار کو دفعتاً ایک ایسا زبردست دھچکا لگا کہ عنبر اس اجنبی عورت پر اور وہ دونوں عورتیں عنبر پر لڑھکنے کے سے انداز میں آگریں۔

اصل میں چونکہ کار کا ڈرائیور اتنے بھاری ٹریفک میں بھی بہت تیز رفتار میں کار چلا رہا تھا اچانک ہی ایک ٹرک کار کے سامنے آجانے کی وجہ سے ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگایا تو نتیجے میں یہ صورت حال پیش آئی تھی۔ اجنبی عورت کی کہنی بری طرح دروازے سے ٹکرائی تھی۔ وہ غرانے کے سے انداز میں ڈرائیور سے بولی۔

"کیا تیرے پیچھے کتے چھوڑے ہوئے تھے شیدے جو اتنی اسپیڈ میں کار چلا رہا تھا کم بخت میری تو کہنی ہی توڑ کر رکھ دی تو نے۔"

"سوری میڈم۔ قصور میرا نہیں اس ٹرک والے کا تھا۔ پتا نہیں کدھر سے بیچ میں آگیا ایک دم۔" شیدے نے ٹرک والے کو ایک گندی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔

"ارے جا۔ تیرا تو کبھی کوئی قصور ہی نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اپنی غلطی دوسرے کے سر تھوپتا ہے۔ مگر اب ذرا دیکھ بھال کر گاڑی چلانا۔" اجنبی عورت جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جو حکم میڈم۔" شیدے نے جواب میں بڑی تابعداری سے کہا۔

اور پھر اپنے قریب بیٹھے آدمی سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ اسی اثناء میں عنبر ہی نہیں بلکہ وہ تینوں عورتیں بھی سنبھل کر بیٹھ گئی تھیں۔ جب کہ اجنبی عورت اپنا چوٹ والا ہاتھ اونچا کر کے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنی کہنی کو سہلائے جارہی تھی۔ یہ دیکھ کر عنبر نے ازراہ ہمدردی اس سے کہا۔

"لائیے۔ میں آپ کی کہنی سہلا دوں۔ ویسے بھی کہنی کی چوٹ بہت محسوس ہوتی ہے۔"

"نہیں۔ میں خود ہی سہلا لوں گی۔ یوں بھی میں اپنے کسی بھی معاملے میں کسی دوسرے کی مدد لینے کی عادی نہیں ہوں۔" اجنبی عورت نے زور دے کر لہجے میں کہا تو عنبر یہی سمجھی کہ کہنی میں تکلیف ہونے کی وجہ سے وہ کھسیانی سی ہو رہی ہے۔ اس نے گردن گھما کر ان دونوں عورتوں کی طرف دیکھا۔ مگر وہ دونوں ہی کھڑکی سے باہر کا نظارہ دیکھنے میں مگن تھیں۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی تھی۔ اور کار کے اندرونی ماحول میں خاموشی نے پھر ڈیرے سے جما لیے تھے۔ عنبر چونکہ اب اپنے پورے ہوش و حواس میں آگئی تھی اس لیے یہ خاموشی اسے گراں گزرنے لگی۔ یوں بھی اجنبی عورت کے غیر روادارانہ سے رویے پر اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس پر مستزاد یہ خاموشی اور تینوں عورتوں کا اس قدر لاتعلق اور بے نیاز سا ہو کر بیٹھنا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ ساری سچویشن کو خاموشی سے جھیلتی رہی۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اجنبی عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"سنیں میڈم۔ کل آپ کے جانے کے بعد مجھے اپنی بے وقوفی پر دیر تک ہنسی آتی رہی کہ آپ سارے معاملات طے کر کے چلی بھی گئیں اور میں نے آپ کا نام تک نہ پوچھا۔" تو اس عورت نے اس کی طرف عجیب سے انداز میں دیکھا اور رکھائی سے بولی۔

"اگر نہیں پوچھا تو اس سے فرق بھی کیا پڑ گیا۔ بس یہ سمجھ لو کہ مجھے میڈم ہی کہتے ہیں۔" اس کا رویہ ہی نہیں لہجہ بھی بدلا ہوا سا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جو گزشتہ روز اس سے کتنی منت سماجت سے بات کر رہی تھی اور کس قدر با اخلاق اور خوش گفتار تھی۔ عنبر نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کرنے کے باوجود مسکرا کر کہا۔

"ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ میری کل کی باتوں پر خفا ہو گئی ہیں یا بدلہ لے رہی ہیں۔ میں نے یہی کہا تھا ناکہ بس آپ مجھے مس خان ہی سمجھ لیں۔ مگر آپ میرا نام پوچھ کر ہی رہیں۔ اسی طرح میں بھی میڈم کے علاوہ آپ کا اصلی نام پوچھنے کی خواہاں ہوں۔"

"اُفوہ بھئی تم تو میڈم کی جان کو ہی آگئیں۔ ورنہ میڈم کے علاوہ یہاں ان کا اصلی نام کوئی جانتا ہی نہیں۔" عنبر کے

برابر بیٹھی ہوئی عورت نے بڑے بیزار کن لہجے میں کہا۔

"ہاں بھئی تمہارے لیے یہی اچھا ہوگا کہ تم چپکی بیٹھی رہو۔" اس عورت کے برابر بیٹھی ہوئی دوسری عورت بولی۔

"لیکن میں میڈم کی جان تو نہیں کھا رہی۔ میں نے تو صرف ان سے ان کا نام ہی پوچھا ہے آپ دونوں سے تو نہیں۔" عنبر تنک کر بولی۔

"لیکن اب تو تمہیں جواب مل ہی گیا ہے۔ اب تم خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔" اس کے بالکل برابر میں بیٹھی عورت نے تیکھے سے لہجے میں کہا۔

"کمال ہے یا تو اتنی خوشامد در آمد کر کے جاب کی آفر دی جارہی تھی یا اب یہ عالم ہے کہ بات کرنی بھی گوارا نہیں۔" عنبر بھی چپ رہنے والوں میں سے نہ تھی۔ اس نے میڈم کو سنانے کی غرض سے اس کی طرف منہ کر کے کہا مگر میڈم نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ کہنی پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھی رہی۔

عنبر اس کے اس رویے پر حیران ہونے سے زیادہ پریشان سی ہو گئی تھی اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ میڈم ان لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے اپنا رعب ان پر جمانے کی غرض سے اتنی خاموش بیٹھی ہے یا پھر کسی اور وجہ سے۔ کہ باہر کے منظر پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی۔

گاڑی اب شیر شاہ کے علاقے میں پہنچ چکی تھی۔ جب کہ یہ راستہ نہ انڈسٹریل ایریا کی طرف جاتا تھا نہ کورنگی کریک کی طرف۔ اس نے بری طرح چونک کر میڈم سے پوچھا

"آپ تو کہہ رہی تھیں کہ کورنگی کریک کے علاقے میں کمپنی کا ہیڈ آفس ہے مگر یہ راستہ تو انڈسٹریل ایریا کی طرف بھی نہیں جاتا جس سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں۔"

"تمہیں آم کھانے سے غرض رکھنی چاہیے پیڑ گننے سے نہیں۔ بس تم خاموشی سے دیکھتی رہو کہ یہ کس طرف جاتا ہے۔" میڈم نے جواب میں کہا۔ اس کے لہجے میں غراہٹ سی شامل تھی۔

"واہ۔ میں کوئی فالتو ہوں جو خاموشی سے دیکھتی رہوں خواہ آپ مجھے کہیں بھی لے جائیں۔" عنبر چمک کر بولی۔

"اچھا تو پھر خوب چیخو چلاؤ۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر پوچھتی رہو۔ ہم تو جہاں کا ارادہ کر کے آئے ہیں وہیں تمہیں لے جائیں گے۔" میڈم بولی۔

"مگر آخر کہاں لے جائیں گی آپ مجھے۔ آپ تو ایک طرح میرا انٹرویو کرانے مجھے کورنگی کریک لے جارہی تھیں۔" عنبر غصے سے بولی۔

"لیکن اب ہمارا پروگرام بدل گیا ہے۔ ہم کورنگی کریک نہیں بلکہ ایک اور جگہ تمہارا انٹرویو کرانے تمہیں لے جارہے ہیں۔" میڈم نے بڑی خباثت سے مسکرا کر کہا۔

"مگر کہاں ہو میرا انٹرویو ہونے والا ہے تو کم از کم مجھے اتنا تو معلوم ہونا چاہیے نا۔" عنبر زچ سی ہو کر بولی۔

"جہنم میں ہونے والا ہے تمہارا انٹرویو سمجھیں۔" وہی عورت جو عنبر سے لگی بیٹھی تھی جل کر بولی۔

"جہنم میں تو تم ہی جاؤ نا۔ اور میں تم سے بات نہیں کر رہی۔ میں تو میڈم سے پوچھ رہی ہوں۔" عنبر بھنّا کر بولی۔ پھر اس نے میڈم کو مخاطب کر کے کہا۔

"میڈم! میرے گھر آئی تھیں جاب کی آفر لے کر۔ اور آپ ہی مجھے لے بھی جارہی ہیں تو کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ مجھے کہاں لے جارہی ہیں۔"

"جہاں لے جارہی ہوں وہ جگہ تم خود ہی دیکھ لوگی۔ اصل میں باس کی آج میس میں میٹنگ تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہیں وہیں لے کر آجاؤں اور بس اب تم چپ رہو اور کچھ نہ پوچھنا۔" میڈم نے قدرے رسانیت سے کام لے کر بتایا۔ مگر عنبر پھر بھی بات کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"مگر یہ بات آپ نے مجھے گھر پر ہی کیوں نہیں بتادی۔ صاف ظاہر ہے آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔"

نامعلوم آپ کون ہیں اور کس کردار اور قماش کی عورت ہیں۔ یہ میری کم عقلی ہی تھی کہ میں نے آنکھیں بند کر کے آپ کی باتوں پر یقین کر لیا۔"

"یقین تم نے میری باتوں پر نہیں بلکہ اچانک ہی چار ہزار کی نوکری مل جانے کی وجہ سے کیا تھا۔ کیونکہ تم اسی تلاش میں تھیں کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ پیسوں کی نوکری مل جائے۔ اور اس نوکری میں تو تم راج کرو گی راج۔" میڈم بولی۔

"ہونہہ! کیا خاک راج کروں گی نامعلوم یہ کیا چکر چلایا ہے تم نے۔ شکل سے تو بڑی مسکین لگتی ہو۔ مگر ہو بڑی دھوکے باز۔" عنبر غصے اور کوفت کے عالم میں بولی۔ کہ چاپلوسی اور کسی کی خوشامد درآمد کرنا اسے تو آتا ہی نہ تھا۔ اسے دھوکے سے اغوا کیا گیا تھا۔ یہ بات اسے اب اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی۔ اور اس بات پر غصے اور پشیمانی کے مارے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اور اپنی صاف گوئی عادت کے بموجب حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بھی وہ میڈم کو بہت سخت سُست کہہ گئی تھی۔ مگر میڈم ایک دم چکنا گھڑا ثابت ہوئی تھی۔ وہ جواب دینے کے بجائے صرف مسکراتی ہی رہی۔ اور اس کی مسکراہٹ نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ عنبر اپنے آپے میں نہ رہی۔

"تم بڑی مکار عورت ہو۔ مگر تم نے مجھے اغوا کر کے اچھا نہیں کیا۔ کیونکہ میں بالکل ہی دوسری فطرت اور مزاج کی لڑکی ہوں۔ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی مگر تمہیں تمہاری مکروہ خواہشات میں کامیاب نہ ہونے دوں گی سمجھیں تم چڑیل کہیں کی۔"

"ارے ارے میڈم ذرا دیکھو تو یہ کیا بکواس کر رہی ہے۔ تم اس کو منع کیوں نہیں کرتیں۔" عنبر کے برابر بیٹھی ہوئی عورت نے زور زور سے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"ایسا کریں میڈم کہ اسے آگے بشیرے کے پاس بٹھا دیں۔ وہ خود اسے چپ کرا دے گا۔" دوسری عورت نے مشورہ دیا۔

"ہاں میڈم نشو ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ ورنہ یہ تو میس پہنچتے پہنچتے ہمارا مغز کھا جائے گی۔" دوسری عورت نے نشو کی تجویز پر صاد کرتے ہوئے کہا۔ تو آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھے بشیرے نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اسے اِدھر میرے پاس پارسل کر دو۔ میرے ایک جھانپڑ میں یہ ایسی چپ ہو گی کہ پھر ساری زندگی کبھی بول ہی نہ سکے گی۔" اور عنبر جو نشو کی تجویز سن کر پہلے ہی پوری جان سے لرز اٹھی تھی بشیرے کی بات پر تو جیسے اس کا سارا خون خشک ہو کر رہ گیا۔ وہ خوشامدانہ سے انداز اور کانپتی سی دھیمی دھیمی آواز میں۔ میڈم کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"نہیں نہیں میڈم مجھے آگے نہیں بھیجیے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اب ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالوں گی۔ میں بالکل خاموش رہوں گی۔" مگر میڈم نے اسے جواب دینے کے بجائے نشو سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نشو تو نے مشورہ تو اچھا ہی دیا ہے پر یہ کہہ رہی ہے کہ اب یہ بالکل نہیں بولے گی تو اسے ایک موقع تو دینا ہی چاہیے۔"

"جب آپ کہہ رہی ہیں تو چلو یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔" نشو کے بجائے بشیرے نے اپنی سرخ سرخ اور ڈراؤنی سی آنکھوں سے عنبر کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ اور عنبر کے لبوں پر جیسے چپ کی مہر سی لگ گئی۔ اسے ماں اور بیٹی کے وہ خدشات یاد آنے لگے جن کا اظہار انہوں نے روانگی کے وقت کیا تھا۔

خاصی دور کا سفر تھا کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ سمت تو مغرب کی ہی تھی مگر نامعلوم کونسی جگہ تھی اور ایسا راستہ کہ کہیں کچی سڑک سی نظر آ جاتی اور کہیں میدانی اور ٹوٹا پھوٹا سا علاقہ اور دائیں بائیں سمت خاصی دوری پر کہیں ریتیلے ٹیلے اور کہیں پتھریلی سی چٹانیں۔ مگر خوف و دہشت کی وجہ سے عنبر کچھ ایسی حواس باختہ سی ہو رہی تھی کہ اس نے کسی طرف بھی توجہ نہیں دی تھی بس ایک تسلسل سے رونے

چلی جا رہی تھی۔ اور وہ تینوں عورتیں اور دونوں مرد بھی ایسے خاموش بیٹھے تھے جیسے ان کے منہ میں زبان ہی نہ رہی ہو۔ پھر یہ خاموش اور اوسان خطا کر دینے والا سفر بالآخر ایک صاف ستھری سڑک پر جو ڈامر کی تو نہیں تھی مگر اس پر ریتی بچھا کر ہموار کیا گیا تھا اور جس کے دونوں اطراف میں حد نظر تک اینٹوں کی باڑ سی لگائی گئی تھی۔ اور اس پہ آگے چل کر گویا اس سڑک کا اختتام ایک اونچی اور بلند و بالا چار دیواری پہ ہوتا ہے جس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا چوبی دروازہ تھا جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ اور جس کے اندر داخل ہوتے ہی قدیم طرز سے تعمیر شدہ ایک حویلی نما عمارت کے آگے گاڑی روک دی گئی۔ مگر کار داخلی دروازے کے آگے نہیں بلکہ ایک بغلی دروازے کے آگے روکی گئی تھی اور کار رکتے ہی ڈرائیور شیدا اور اس کا ساتھی بشیرا کار سے اتر کر عقب میں کسی سمت چلے گئے تھے۔ جبکہ سب سے پہلے میڈم اتری تھی پھر وہ دونوں عورتیں اور اس کے بعد نشو نے عنبر کا بازو بڑی سختی سے پکڑ کر اسے کار سے باہر اتارا تھا۔ پھر نشو تو میڈم کے ساتھ تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی ہو کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی تھی اور دوسری عورت سائے کی طرح عنبر کے سر پر ہی محیط رہی تھی۔ جو پہلے سے بھی زیادہ روانی سے آنسو بہا رہی تھی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد نشو سے باتیں کر کے میڈم عنبر کے قریب آئی۔ اور اس کا بازو پکڑ کر بولی۔

"چلو آؤ تم میرے ساتھ اندر چلو۔ اور ہاں اب یہ رونا دھونا بند کر دو۔ باس کو روتی دھوتی شکلوں سے سخت چڑ ہے۔"

اور عنبر اپنے آنسو پونچھنے کے بجائے اس کی اس بات پر بری طرح بلک اٹھی۔ اور اس کے بازو پر جھول کر بولی۔

"سنیں میڈم! آپ بھی تو ماں ہیں۔ آپ بتا رہی تھیں کہ آپ کی چار بیٹیاں ہیں۔ تو کیا چار بیٹیوں کی ماں ایک بے بس اور لاچار لڑکی پر ترس نہیں کھا سکتی۔ کیا اس لڑکی کی جگہ اپنی بیٹیوں کو رکھ کر نہیں سوچ سکتی۔ آپ۔ آپ اگر مجھے اغوا کر کے بھی لائی ہیں تو اپنی مرضی سے تو نہیں لائی ہوں گی نا۔ آپ۔"

"ارے کیسی بیٹیاں اور کس کی بیٹیاں، میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تو بیٹیاں کیا آسمان سے میری گود میں آ کر گری ہوں گی۔" میڈم نے اس کی التجا آمیز بات کا جواب استہزائی سے انداز میں دیا۔

"اچھا اگر آپ کی شادی نہیں ہوئی اور آپ کی بیٹیاں بھی نہیں ہیں تب بھی آپ خود بھی تو ایک عورت ہیں نا۔ کیا آپ یہ گوارا کر لیں گی کہ آپ کی ہی صنف کی ایک پاکباز لڑکی کی عزت لوٹی جائے۔ اسے برباد کر دیا جائے۔ پلیز میڈم! آپ کو مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا۔ آپ کے سینے میں بھی تو ایک عورت کا نرم و نازک سا دل ہے۔ آپ کیوں مجھے برباد کرنے پر تلی ہوئی ہیں میڈم! خدارا مجھے اس قید سے اس عذاب سے نکال دیجیے۔ پلیز میڈم میری مدد کیجیے۔"

عنبر ہر طریقے سے یہی چاہ رہی تھی کہ میڈم کے دل کو اس کی کوئی بات تو لگ جائے۔ کچھ تو اثر ہو۔

میڈم اس کی باتوں سے تھوڑی سی متاثر تو ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ اس کی باتوں پر نہ تو بگڑی تھی اور نہ سخت رویہ ہی اختیار کیا تھا۔ بلکہ چپ سی ہو گئی تھی۔

"دیکھیں نا۔ جس کسی نے بھی آپ کے ذریعے مجھے اغوا کرایا ہے۔ اس میں آپ کی مرضی کو تو کوئی دخل نہیں ہو گا نا میڈم! میرے منہ میں روزہ ہے اور میں آپ سے سچ کہتی ہوں میڈم کہ ہم غریب ضرور ہیں مگر انتہائی شریف لوگ ہیں۔ اور شریفوں کی کل متاع ان کی آبرو ہی ہوتی ہے۔ اور جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے آپ کو یہاں خاصے اختیارات حاصل ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو۔"

"دیکھو لڑکی۔ اب بہت ہو گیا۔ خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔ اور مجھے ورغلانے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ میرا کام بس تمہیں یہاں تک پہنچانا تھا اس کے بعد جو باس کی مرضی ہو گی وہی ہو گا سمجھیں۔"

"مگر باس کون ہوتا ہے مجھ پر اپنی مرضی چلانے والا۔ جب کہ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ اچھا اتنا ہی بتا دو کہ اس نے مجھے کیوں اغوا کرایا ہے۔ کس بات کا انتقام لیا ہے اس نے مجھ سے۔ آخر میں نے اس کا کیا

لگاڑا تھا جو" اتنی سختی سے جھڑک دینے کے باوجود عنبر بولے ہی گئی۔

"دیکھو لڑکی، زیادہ فیل نہ مچاؤ۔ ورنہ میرا غصہ بھی بہت خراب ہے۔ میں تمہارے دو چار ہاتھ ایسے رسید کروں گی کہ تمہیں چھٹی کا کھایا یاد آجائے گا۔" میڈم اس کی باتوں پر بھڑک کر بولی۔

"ہاں ہاں مارلو۔ بلکہ اتنا مارو کہ میں مر جاؤں۔ مگر خدارا مجھے اپنے خبیث باس کی ہوس کا نشانہ نہ بنواؤ۔ ورنہ میں بھی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اپنی جان دے دوں گی یا پھر اس کی جان لے لوں گی مگر اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ میری یہ بات کوئی گیدڑ بھبکی نہیں ہے بلکہ میری رگوں میں غیرت مند پٹھانوں کا خون ہے اور ہم جو بات کہتے ہیں اسے کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔" عنبر اس کے مارنے کی دھمکی پر مشتعل سی ہو کر بولی۔

میڈم اس کی باتوں سے عاجز آگئی تھی۔ اس پہ ہاتھ پکڑ کر کھینچنے کے باوجود عنبر اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ بپھری ہوئی سی کیفیت میں اپنی جگہ پہ مضبوطی سے قدم جمائے کھڑی تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے میڈم نے مڑ کر پہلے پیچھے دیکھا۔ وہ دونوں عورتیں کہیں اندر جا کر غائب ہو گئی تھیں۔ اور اتنے وسیع اور عریض احاطے میں ان دونوں کے سوا اس وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ آخر میڈم کو نرمی سے کام لینے پر مجبور ہونا پڑا۔

"دیکھو عنبرین شہباز! یہ پہلا موقع ہے جو میں تمہارے ساتھ نرمی اور رعایت سے کام لے رہی ہوں۔ ورنہ ہمارا اصول یہ ہے کہ ہم کسی کو بھی بیہوش کیے بغیر یہاں تک نہیں لاتے۔ راستے میں بھی نشو اور زرینہ بھی چاہ رہی تھیں کہ میں تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں تک لاؤں مگر میں نے انہیں ڈانٹ دیا۔ لیکن میں نے غلطی ہی کی تمہارے ساتھ اتنی رعایت برت کر لیکن اب اگر تم اسی طرح اکڑی کھڑی رہیں تو میں بشیرے کو بلا لوں گی اور وہ تمہیں اٹھا کر خود ہی اندر پہنچا دے گا۔" آخری فقرہ کہتے کہتے میڈم کی آواز میں سختی آگئی۔

"نہیں نہیں بشیرے کو بلانے کی ضرورت نہیں اب میں ضد نہیں کروں گی جہاں تم کہو گی میں وہیں چلی چلوں گی۔" میڈم کی دھمکی نے فوری اثر دکھایا عنبر اندر ہی اندر دہل کر جلدی سے بولی۔

"ہونہہ۔" میڈم نے صرف اتنا ہی کہا اور پھر عنبر کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک بڑی سی ڈیوڑھی میں جسے ہسپچ بھی کہا جا سکتا تھا لے آئی۔ ڈیوڑھی خاصی تاریک تھی۔ میڈم نے اسے وہیں رک جانے کو کہا۔ اور پھر تالی بجائی تو ایک لمبی تڑنگی سی عورت قریب ہی کہیں سے نمودار ہوئی۔ میڈم نے اسے کچھ اشارہ سا کیا تو وہ عنبر کے پیچھے آکھڑی ہوئی اور اپنے شانے پر پڑی ایک سفید سی پٹی نکال کر عنبر کی آنکھوں پہ باندھنے لگی اور اس اچانک افتاد پر عنبر مچل مچل کر کہنے لگی۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں میڈم۔ میری آنکھوں پر پٹی کیوں باندھی جا رہی ہے۔ میں نے تو تم سے کہہ دیا تھا کہ اب میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ اور اب تو میں اندر آگئی ہوں۔ کوئی باہر تو نہیں کھڑی۔ تم اس عورت سے کہو کہ یہ میری آنکھوں پر پٹی نہ باندھے۔ پلیز میڈم کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ کیا تمہارے دل میں رحم نامی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔"

"دیکھو تم اتنا شور نہ مچاؤ لڑکی۔ یہ پٹی صرف تھوڑی دیر کے لیے باندھی جا رہی ہے۔ جب تم اس کمرے میں پہنچ جاؤ گی جہاں تمہیں رکھا جائے گا تو یہ پٹی فوراً کھول دی جائے گی۔ اتنا گھبرانے کی اور واویلا مچانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میڈم بولی۔ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

"مگر۔ مگر۔ میں اندر کا راستہ اگر دیکھ بھی لوں گی تو کیا فرق پڑ جائے گا میں تو ایک بے بس اور بے ضرر سی لڑکی ہوں۔ میں یہاں سے بھاگوں گی تو نہیں۔" عنبر دونوں ہاتھوں سے وہ پٹی ہٹانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"پہلے اس کے ہاتھ باندھو پھر پٹی کو دوبارہ کس کر باندھنا۔" میڈم نے اسے جواب دینے کے بجائے اس عورت سے کہا۔ جس نے فوری طور پہ اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اور ایک جھٹکے سے عنبر کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کھینچ کر ایک مضبوط ڈوری سے باندھ دیے جب کہ عنبر پوری مزاحمت کے ساتھ ساتھ چیخیں مارنے لگی۔ میڈم کا چہرا غصے سے تپ سا اٹھا۔

"چلو ساتھ کے ساتھ اس کے منہ پر ٹیپ بھی لگا دو۔ ورنہ یہ سارے راستے شور کرتی ہوئی جائے گی۔"

اس نے بڑے جذب کے عالم میں اس عورت سے کہا اور عورت نے ایک منٹ ضائع کیے بغیر ایک چکلا سا ٹیپ کا ٹکڑا عنبر کے ہونٹوں پر چپکا دیا۔ پھر آنکھوں پر بندھی پٹی کو مضبوطی سے باندھا اور میڈم کے ساتھ عنبر کو دھکیلتی ہوئی ایک سمت بڑھ گئی۔ تھوڑے فاصلے تک تو یہ تینوں سیدھی چلتی رہیں پھر کئی موڑ مڑنے کے بعد میڈم کی آواز آئی۔

"یہ زینہ ہے۔ اس پہ آرام سے اوپر چڑھو۔" عنبر جو خوف و دہشت کے مارے بالکل سہم سی گئی تھی۔ اس پر دورے سے بھی تھی۔ اور اتنی زیادہ پریشانی اٹھائی تھی کہ خوف کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق چپ چاپ زینہ عبور کر کے اوپر آگئی۔ اور زینہ عبور کرنے کے بھی کافی دور تک چلنے کے بعد۔ ایک جگہ آکر میڈم نے اسے رکنے کو کہا۔ تو کسی معمول کی طرح اس نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے۔ میڈم نے آہستہ سے اس عورت سے کچھ کہا۔ تو اس نے سب سے پہلے اس کے بازو کھولے پھر آنکھوں پر بندھی پٹی اور آخر میں اس کے منہ پر چپکا ہوا ٹیپ ہٹایا۔ پٹی چونکہ بہت کس کر باندھی گئی تھی اس لیے اس نیم تاریک جگہ کا ماحول اسے ایک دم ہی سمجھ میں نہ آیا۔ مگر کچھ دیر بعد بینائی بحال سی ہوئی تو اس نے دیکھا وہ ایک بڑے سے نیم تاریک کمرے کی وسط میں کھڑی ہے۔ جو قدرے خنک بھی تھا اور حبس میں ہلکی ہلکی سیلن کی بو سی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ دروازے کے مقابل کی دیوار کے آگے صرف ایک دری بچھی تھی۔ جس پر میڈم نے اسے بیٹھنے کو کہا اور پھر یہ دیکھے بغیر کہ وہ دری پر بیٹھی بھی ہے یا نہیں۔ فوراً ہی اس عورت کے ساتھ اس کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور باہر جا کر اس نے کمرے کا دروازہ مقفل کر دیا۔

خوف و دہشت۔ سراسیمگی اور کمزوری کی ملی جلی کیفیت میں عنبر کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں سنسنیاں سی ہو رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی وقت بھی چکرا کر گر پڑے گی۔ اس کے باوجود بھی اس نے اپنے گرتے ہوئے وجود کو سنبھالا اور بھاگ کر دروازے کے قریب جا پہنچی تاکہ اندر سے دروازے کا کھٹکا لگا لے مگر یہ دیکھ کر اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ دروازے میں اندر کی طرف کوئی کھٹکا یا کنڈی وغیرہ ہی موجود نہیں ہے۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتی دھپ سے دری پر جا بیٹھی۔ پریشانی اور کمزوری کی وجہ سے اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ جبکہ دل تھا کہ بڑی طرح بھرا چلا آرہا تھا۔ اس قید خانے سے رہائی کی ہر آس ٹوٹ چکی تھی۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی نڈھال اور شکستہ دل سی ہو رہی تھی۔ ذہن بھی ایسا ماؤف ہو رہا تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔ بس ایک خیال گردش کر رہا تھا۔

اب کیا ہو گا۔

مجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا؟

وہ دری پر بیٹھتے ہی ڈھیر سی ہو گئی تھی۔

آپ ہی آپ پلکیں جڑتی گئیں اور بے سدھ سی ہو کر سو گئی۔ اور ـــــ

پھر اسی وقت اس کی آنکھ کھلی جب ایک اجنبی شکل کی خرانٹ سی عورت نے آکر اسے ہلا جلا کر جگایا۔

"او تی کر وٹیے چل اٹھ۔ کیسے آرام سے سوئی پڑی ہے۔" اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"لے یہ روٹی کھا لے۔ تیرا روجا ہے نا۔ چل چھیتی کر کچھ کھا لے۔"

عورت نے دری پر اس کے آگے رکھی کھانے کی ٹرے کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ ہلنا جلنا تو درکنار عنبر نے ایک نظر ٹرے کی طرف بھی نہیں دیکھا۔

"اوئے کھاتی کیوں نہیں سو ہنیے! کھانے کا ویلا ٹل گیا تے تیرا روجا بھی کھراب ہو جاوے گا۔"

عورت اسے بے حس و حرکت بیٹھا دیکھ کر پھر بولی۔ مگر عنبر نے تب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ نگاہیں

جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ حالانکہ بھوک کی وجہ سے کلیجہ کھرچ سا رہا تھا۔ اور سخت پیاس بھی لگ رہی تھی مگر عورت کے لائے ہوئے کھانے کا اسے بالکل اعتبار نہ تھا۔ کہ کہیں اس کھانے میں کوئی نشہ آور چیز نہ ملا دی گئی ہو۔ بس اسی خدشے کے تحت اس نے کھانے کی طرف توجہ دی نہ عورت کی باتوں کی طرف۔ اس کی خاموشی نے عورت کو کھولا سا دیا۔ اس نے سخت تپہا دکھاتے ہوئے جھک کر ٹرے اٹھائی اور بولی۔

"او ٹے در فٹے۔ نئیں کھاتی تو نہ کھا۔ ہون میں نے تیرے آگے ہتھ تے نہیں جوڑنے۔" اور پھر ہونہہ کہہ کر سر کو جھٹکتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اور عنبر اسی طرح خاموش اور ساکت سی بیٹھی رہی مگر وہ عورت جونہی دروازے کی دہلیز تک پہنچی میڈم نے اچانک ہی کہیں سے نازل ہو کر اس کا راستہ روک لیا۔ اور آہستہ سے اس سے کچھ پوچھا تو اس عورت نے مڑ کر عنبر کی طرف دیکھتے ہوئے میڈم سے اس کی شکایت کر دی۔

"نہیں لاؤ یہ ٹرے مجھے دے دو اور تم جا کر اپنا کام کرو۔" میڈم نے اس کے ہاتھ سے کھانے کی ٹرے لیتے ہوئے کہا اور پھر اسی سے دروازہ بھڑوا کر ٹرے اٹھائے عنبر کے نزدیک چلی آئی اور بولی۔

"بھئی یہ کیا حماقت ہے مس خان۔ آپ نے روزہ افطار کیوں نہیں کیا؟ جبکہ مغرب کا وقت کب کا گزر چکا ہے۔" اور پھر یہ بات کہتے کہتے اس نے ٹرے کو عنبر کے سامنے رکھا اور خود بھی دری پر بیٹھ گئی۔ عنبر نے اس کی آمد پر کوئی توجہ نہ دی نہ ہی اس کی بات کا جواب ہی دیا۔

"کمال ہے تم یہ کیوں بھول گئیں کہ تم روزے سے ہو۔ اگر تم روزہ افطار نہیں کرو گی تو وہ فسق ہو جائے گا۔ اور ہم الگ گنہگار ہوں گے۔" میڈم پھر بولی۔

تو عنبر نے سلگتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بڑے طنز سے کہا۔

"جو لوگ اپنے ضمیر اور دین و ایمان کو بیچ دیتے ہیں انہیں بھلا گناہ اور ثواب کا فرق کب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے تو اسلامی نام بھی ایسے لگتے ہیں جیسے تیزاب کی بوتلوں پر خوشنما لیبل۔ لے جاؤ اپنا یہ کھانا وانا۔ میں تمہارا لایا ہوا یہ راتب ہرگز نہیں کھاؤں گی۔"

"ارے نہیں یہ رزق ہے اور رزق کو راتب کا نام دینا اچھا نہیں ہوتا۔ لو شاباش زیادہ نہیں تو چند نوالے ہی کھا لو۔" میڈم اس کی کڑوی کسیلی اور تحقیر آمیز باتوں کا بالکل برا نہیں مانی اور بڑی نرمی اور دلار سے بولی۔

"جب میں نے کہہ دیا کہ میں یہ کھانا ہرگز نہیں کھاؤں گی تو پھر تم ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔ کیا زہر ملا کر لائی ہو اس میں یا نشہ۔" عنبر نے سختی سے انکار کرتے ہوئے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

"اوہو۔ تو تم کو یہ شک ہے کہ ہم نے اس کھانے میں کوئی نشہ آور چیز ملائی ہے۔ اچھا اگر اس ڈر سے نہیں کھا رہی ہو تو ٹھہرو۔ پہلے میں ہی آدھا کھانا کھا کر دکھاتی ہوں۔ اس کے بعد میری حالت دیکھ کر تم کو کھانا پڑے گا۔ ہاں بس میں اسی شرط پر کھا رہی ہوں۔" میڈم بات کی تہہ کو پہنچ کر بولی۔

"میں کسی شرط کی پابند نہیں ہونا چاہتی خواہ تم کھاؤ یا نہ کھاؤ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا سمجھیں۔" عنبر نے تنک کر کہا۔

"دیکھو عنبرین! اتنی ضد بھی نہ کرو۔ نہیں کھاؤ گی تو بھلا کیسے زندہ رہو گی۔ اچھا دیکھو۔ میں یہ کھانا کھاتی ہوں۔"

میڈم نے نرمی سے سمجھایا اور پھر ٹرے میں رکھے ہوئے کھانے۔ جس میں روٹی سالن اور سیخ کے کباب تھے۔ پانی کا جگ اور گلاس بھی موجود تھا اور پھلوں میں دو کیلے اور دو کینو رکھے ہوئے تھے۔ میڈم نے اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سالن بھی کھایا اور کباب بھی۔ اور پھر گلاس میں پانی انڈیل کر پیا۔ اور پھر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتی رہی۔ اور کوئی پندرہ منٹ تک انتظار کرنے کے بعد اس نے عنبر کو قائل کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"اب دیکھ لیا نا تم نے اچھی طرح۔ پندرہ منٹ گزر گئے ہیں مگر میرے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شاباش اب

تم بھی کھانا شروع کر دو۔ اگر تم روزے سے نہ ہوتیں تو میں کبھی اصرار نہ کرتی۔ دیکھو ہمت ہارنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ ہر مصیبت کا پوری دلیری سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ چلو اب بسم اللہ کرو۔"

ہر چند کہ عنبر نے کھانا نہ کھانے کا تہیہ کر لیا تھا مگر۔ بھوک کی شدت اور پریشانی نے اس کے اندر جو ضعف پیدا کر دیا تھا۔ اس کے پیش نظر عنبر وہ کھانا کھانے پر مجبور ہو گئی۔ مگر بس چند نوالے ہی حلق سے اتار سکی۔ کہ وہ بھی حلق سے نہیں اتارے جا رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا میڈم سے پوچھے کہ اس سے کس بات کا انتقام لیا ہے۔

اسے اغوا کرنے کا ستم کیوں توڑا ہے۔

مگر اب کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی۔ کہ جتنا کچھ کہا تھا وہ سب بے سود ثابت ہوا تھا۔ اپنی اس بے بسی کے احساس پر ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میڈم نے اسے روتے دیکھ لیا تھا مگر بالکل نظر انداز کر گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے جلدی کھانے سے ہاتھ کھینچا تو میڈم نے مزید کچھ کھانے پہ اصرار بھی نہ کیا۔ بلکہ زور سے تالی بجائی۔ تو وہی عورت جو شاید دروازے سے چپکی ہی کھڑی تھی۔ اگلے ہی لمحے اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تکیہ تھا جسے دری پر ڈال کر۔ اس نے چپ چاپ ٹرے اٹھائی اور باہر نکل گئی۔ تب میڈم بھی اس کے پاس سے اٹھتی ہوئی بولی۔

"شنواب دو تین روزے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اگر نہ رکھو تو بہتر ہی ہو گا۔ ورنہ میں رات کو تمہیں کھانا بھجوا دوں گی۔"

"نہیں کچھ بھجوانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اگر روزہ رکھنا ہوا تو بغیر سحری کے ہی رکھوں گی۔" عنبر نے تڑخے ہوئے لہجے میں کہا۔ تو میڈم بڑی خباثت سے مسکرا کر بولی۔

"ہاں بشرطیکہ رکھنے کا موقع مل جائے۔" اور اس کے اس فقرے پر عنبر نے چونک کر پوچھا۔

"ہائیں کیا مطلب۔" مگر میڈم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر اس کے ایک مختصر سے فقرے میں جو معنے پوشیدہ تھے۔ انہوں نے عنبر کو لرزا کر رکھ دیا۔

اُف تو مجھے آج رات کو اس منحوس شخص کے سامنے پیش کیا جائے گا جس نے مجھے اغوا کرایا ہے۔

گویا آج کی رات میری۔ اور اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ بس اپنی بے بسی اور بربادی کے خیال نے آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی ایک چادر سی تان دی۔

اس قید خانے سے نجات کا کوئی ذریعہ تھا نہ کوئی آس۔

نجات پانے کا صرف ایک ہی طریقہ ایک ہی ترکیب رہ گئی تھی اس کے پاس کہ اپنی جان دے دے۔ خودکشی کر کے اس ساری مصیبت سے پیچھا چھڑا لے۔

مگر خودکشی کرنے کے لیے بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا اس کے پاس۔ کہ ایک تو چھت بہت اونچی تھی اس پر چھت میں کوئی کنڈا وغیرہ نام کی کوئی چیز بھی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ایک دروازہ تھا سو وہ بھی بند حتیٰ کہ بجلی کا کوئی کنکشن بھی نہ تھا جس کے ذریعے بجلی کا کرنٹ اس کے جسم میں سرایت کر جاتا۔ اس پر دوپٹے کے بجائے سلکن چادر اپنے گرد لپیٹ کر آئی تھی۔ جس سے پھندا تیار کر کے اگر گلے میں ڈال بھی لیتی تو اس سے بھی اس کا گلا گھٹ نہیں سکتا تھا۔

وہ بڑی دیر تک تو یہی سوچتی رہی کہ کرے تو کیا کرے۔ پھر مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آس کا ایک ننھا سا جگنو چمکا۔ تو اس کے سامنے بھولی پھیلائی جو مالک و خالق کون و مکاں ہے۔

جو مددگار اور کارساز ہے۔ جو اپنی رحیمی اور کریمی کے مرہم سے گہرے سے گہرا زخم بھر دیتا ہے جو اپنی مہر و مہربانی کے ریشوں سے ٹوٹے پھوٹے شکستہ اور ریزہ ریزہ دلوں کی رفوگری کرتا ہے۔

جس کی رحمت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

جو مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں اپنے نور کی کرنیں چمکا کر اپنے بندوں کی آس بندھاتا ہے۔

جو بُرے سے بُرے اور مایوسی کے حالات میں اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔
جو اپنے ہر بندے کی شہ رگ سے بھی قریب تر رہتا ہے۔ مگر ہمیشہ بُرے وقت میں ہی بندے کو یاد آتا ہے۔ لیکن عنبرا اپنے رب کو بھول جانے والوں میں سے تو نہ تھی۔ وہ اس کے عاید کردہ فرائض بھی ادا کرتی تھی اور اسے یاد بھی رکھتی تھی مگر اس جان گسل اور جان سوز صورتِ حال میں جس انداز میں وہ اسے یاد آیا تھا اس کی کیفیت بالکل ہی جداگانہ تھی۔ وحشت دہشت اور مایوسی کی ملی جلی سی کیفیت میں وہ سارے کمرے میں کسی ایسی وحشی ہرنی کی طرح گھومتی رہی تھی جیسے صیاد نے جنگل سے اٹھا کر کسی اندھیرے اور تنگ سے پنجرے میں مقید کر دیا ہو۔ یا یعنی دیگر کمرے کے در و دیوار سے سر ٹکراتی رہی تھی مگر جونہی اپنے رب سے رجوع کرنے کا احساس جاگا وہ جہاں کھڑی تھی وہیں سجدے میں گر گئی اور رو رو کر اس رب رحیم سے مدد اور رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ جس کی رحمت کا دامن ہمہ وقت اپنے بندوں کے لیے وا رہتا ہے۔

اے ربّ العالمین!
اے پروردگارِ عالم!
اے خالق و مالک کون و مکاں!
تو جو اپنے ہر بندے کی شہ رگ سے قریب رہتا ہے۔
ہر بات دیکھتا ہے۔ سُنتا ہے اور جانتا ہے۔
تو میری اس وقت کی بے بسی اور مجبوری سے بھی بخوبی واقف ہوگا۔ کہ تیری یہ ناچیز اور ذرہ خاک سے بھی حقیر بندی اس سمے کتنی کٹھن آزمائش سے گزر رہی ہے۔
یا ارحم الراحمین مجھ پر رحم فرما۔
یا ربّ العزت میری عزت بچالے۔

میرے باپ کا سایہ میرے سر پر نہیں ہے بڑی ہوں نا میرے رب! اس لیے مجھ پر میری بیوہ ماں اور اور دو لوتوں چھوٹے بہن بھائی کی ذمہ داری آن پڑی ہے۔ اور تو میرے دل کا حال اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ تو داتا اور بینا ہے۔ میں تو صرف اس خیال سے اس نوکری کے لیے راضی ہوگئی تھی کہ عزت کے ساتھ گزر بسر ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے فوراً ہامی بھر لی تھی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ اس آفر کے پیچھے کتنا بڑا دھوکا چھپا ہوا ہے۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں ان چالباز اور مکار لوگوں کی باتوں میں آ کر والدہ کے منع کرنے کے باوجود ان کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی۔ اب تو مجھے اس کی اتنی بڑی سزا تو نہ دے۔

اے میرے مولا! تیری یہ بندی تجھے مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ تو اس کی فریاد سن لے۔ تو اس کی حالتِ زار پر رحم فرما کر اس کی مدد فرما۔

اف۔ آنسو تھے کہ کسی سیل کی طرح اتنی شدّت سے اس کی خوبصورت آنکھوں سے بہہ رہے تھے کہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس سیل اشک کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی بہہ جائیں گی۔

پھر جانے کتنی دیر اور کب تک وہ سجدے میں پڑی اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے گڑگڑاتی اور آہ و زاری کرتی رہی۔ پہلے ہی نقاہت سے زیادہ وحشت اور دہشت کی وجہ سے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ روزہ بھی کھولا تھا تو صرف دو نوالوں اور چند گھونٹ پانی سے۔ اب جو سجدے میں پڑ کر بلک بلک کر روئی تو پھر کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ اور وہ یونہی پڑے پڑے بے سدھ سی ہو کر سو گئی۔

فہد نے سعد کو ہر اس جگہ ڈھونڈ لیا تھا جہاں اس کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا۔ آخر جب شام تک اس کا کوئی سراغ ہی نہ ملا تو پھر وہ سیدھا اپنے ایس پی دوست شرف کے پاس پہنچا اور اسے بھائی کے اچانک گم ہو جانے کی ساری تفصیل بتائی تو وہ تھانے میں بھائی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کے حق میں نہ تھا

مگر شرف نے اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ فوراً سعد کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دے۔ کیونکہ گزشتہ روز کی واردات یعنی کار والے واقعے کی روشنی میں وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ جیسا کہ آج کل جرائم پیشہ لوگوں کا ایک چلن سا بن گیا ہے کہ وہ موٹی موٹی اسامیوں کو اغوا کر کے تاوان کے طور پر ان سے بھاری رقوم وصول کرتے ہیں۔ کسی دہشت گرد تنظیم کے افراد نے سعد کو بھی اغوا کر لیا ہے۔ اگر فہد اپنے بھائی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دے گا تو پولیس جلد ہی اس کے بھائی کا سراغ لگالے گی۔

جبکہ فہد پولیس کی کارکردگی سے بالکل مطمئن نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس خیال کے بموجب کسی جرائم پیشہ گروہ نے بھاری رقم وصول کرنے کی غرض سے اس کے بھائی کو اغوا کیا ہے تو پولیس اس معاملے کو اُلٹا بگاڑ کر رکھ دے گی۔ مگر چونکہ شرف رپورٹ پر مصر تھا اس لیے فہد کو نہ چاہتے ہوئے بھی رپورٹ درج کرانی ہی پڑی تھی مگر اس معاملے کو صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا کیونکہ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا۔

جا سکتا تھا کہ آیا سعد کو اس مقصد سے ہی اغوا کیا گیا ہے۔ یا پھر اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ اپنے اسی خیال کے تحت فہد نے شہر کے بڑے اسپتالوں سے رابطہ قائم کر کے وہاں سے بھی سعد کے بارے میں معلوم کر لیا تھا۔ بلکہ دو تین اسپتالوں میں تو خود ہی پہنچ گیا تھا۔ مگر وہاں بھی مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کیونکہ وہاں سعد کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

پھر وہ بھائی کی پریشانی میں مبتلا ناکام اور نامراد گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ شرف نے احتیاط کے طور پر فون میں فکس کرنے کے لیے اسے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ دے دیا تھا تاکہ اگر اغوا کنندگان کی طرف سے کسی قسم کا مطالبہ کیا جائے تو وہ ٹیپ ہو جائے اور پولیس کو مجرموں کا سراغ لگانے میں آسانی ہو۔ مگر فہد نے یہ سوچ کر کہ بھلا ٹیپ کو فون سے چپکا دینے سے حاصل ہی کیا ہوگا جبکہ فون پر کسی کے مطالبہ کرنے کا کوئی جواز ہے نہ امکان۔ ٹیپ کو بے دلی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ڈال دیا تھا۔

بھائی کی تلاش میں تمام دن سرگرداں رہنے اور سخت پریشانی اٹھانے کی وجہ سے وہ اتنا تھک گیا تھا کہ اس کا بدن چور چور ہو رہا تھا۔ لباس تبدیل کرتے ہی وہ بستر پر لیٹ گیا۔

مگر آنکھیں بند کرتے ہی بھائی کی صورت اس کی آنکھوں میں گھوم گئی تو دل وسوسوں اور وہم کی آماجگاہ بن گیا۔

نہ معلوم بھائی جان کس حال میں ہوں۔
کہاں ہوں اور کیسے ہوں۔
کہیں خدانخواستہ ان کا ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔ یہ بھی کسے معلوم کہ انہیں طبی امداد بھی نہ پہنچائی گئی ہو اور وہ زخموں سے چور بیہوش اور بے سدھ پڑے ہوں یا لب دم۔

یا پھر۔ خدانخواستہ وہ حادثے کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ برے برے خیالات اور خدشات نے اسے بُری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس لیے اس قدر تھک جانے کے باوجود اس کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا خیالات کے جال بُنتا رہا۔ پھر اس نے سوچا کہ کہیں شرف کے خیال کے مطابق بھائی جان کو واقعی کسی دہشت گرد گروہ نے اغوا نہ کر لیا ہو۔ گو کہ ایسا کوئی جواز بنتا ہے نہ امکان ہی موجود ہے۔

پھر بھی یہ دہشت گردی اور مجرمانہ حرکات آج کل کچھ عام سی ہو گئی ہیں۔ ممکن ہے بھائی جان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔

پھر اُسے اچانک ہی اُس ٹیپ ریکارڈر کا خیال آیا تو اس نے سوچا کہ اسے ٹیلی فون کے ساتھ منسلک کر دینے میں حرج ہی کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے فون کے ذریعے ہی بھائی جان کی کوئی اطلاع مل جائے اسی خیال سے اس نے اٹھ کر وہ ٹیپ فون کے ساتھ چسپاں کر دیا جب سے اس نے بھائی کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں درج کرائی تھی اس وقت سے رات تک پولیس سعد اور اس کی کار کی تلاش میں سرگرداں رہی تھی مگر جب

رات گئے فہد گھر واپس لوٹا تھا اس وقت تک تو نہ سعد کے مل جانے کی اطلاع آئی تھی نہ کار کے مل جانے کی۔ اور شرف نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ جونہی اُسے سعد کے بارے میں کوئی اطلاع ملی وہ فہد کو فون کر کے بتا دے گا اور فہد دیر تک شرف کے فون کا انتظار کرتا رہا مگر اس کا فون آیا ہی نہیں۔ اور انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

اگلے دن۔ فون کی گھنٹی کی وجہ سے ہی اس کی آنکھ کھلی جو خاصی دیر سے مسلسل بجے جا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سرہانے رکھے فون کا ریسیور اٹھایا۔ ادھر سے شرف کی آواز آئی۔ جس نے یہ معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا کہ رات کو کسی کا فون تو نہیں آیا تھا۔ جس کا جواب فہد نے نفی میں ہی دیا تھا۔ بلکہ شرف کے اس خیال کا تمسخر بھی اُڑایا کہ دہشت گرد تمہارے خوف سے اپنا مطالبہ بھی نہ کر سکے۔ اور اب ان کے بجائے صرف تمہاری گفتگو ہی ٹیپ کی جا سکی ہے بہر حال شرف سے بات کرنے کے بعد اس نے اٹھ کر کمرے کا کھڑکا کھولا۔ اور ملازم سے بیڈ ٹی لانے کو کہا اس سمے دن کے نو بج رہے تھے اور ادھر دیر سے سونے اور بھائی کی پریشانی کی وجہ سے دوسرا روزہ بھی نہیں رکھ سکا تھا۔ جس کا اسے تھوڑا تھوڑا افسوس بھی تھا۔ شرف سے بات کرنے کے بعد اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ بھائی ملا تھا نہ اس کی کار کا ہی کوئی سراغ مل سکا تھا۔

بیڈ ٹی لینے کے بعد اس نے جلد جلد شیو بنایا اور لباس تبدیل کر کے بڑی پریشانی کے عالم میں یہی سوچتا رہا کہ بھائی کو ڈھونڈے تو کہاں ڈھونڈے ؟

اس کے بارے میں کس سے پوچھے اور کہاں جائے ؟

گزشتہ روز تو ایک ایک جگہ کی خاک چھاننے میں پورا دن صرف ہو گیا تھا۔ اور وہ شوروم بھی نہیں جا سکا تھا۔

جبکہ گزشتہ روز نئے مال کی سپلائی بھی کرانی تھی جو اس کی اجازت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ادھر عید بھی بالکل سر پر آ گئی تھی۔

اگلا دن جمعۃ الوداع کا دن تھا۔ اور آج کل سیل بھی بڑے زوروں پر ہو رہی تھی۔ ملبوسات کے ڈیلرز یقیناً کل شوروم آ کر واپس چلے گئے ہوں گے اور آج بھی میرا وہاں جانا مشکل ہی ہے۔ کیونکہ شرف نے ابھی ابھی اپنے آفس میں بلایا ہے۔ آج تو میں ہر قیمت پر بھائی جان کو ڈھونڈ کر رہوں گا نتیجے میں خواہ مجھے اپنی جان پر ہی کیوں نہ کھیلنا پڑے۔ اسی تہیّے کے ساتھ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کار کی چابی اٹھائی اور ملازم کو بلا کر اسے ہدایت کی کہ اگر اس کی غیر حاضری میں کسی کا فون آئے تو فون کرنے والے سے کہہ دے کہ اسے رات کے دس بجے کے بعد دوبارہ فون کرے، وہ اپنی کار لے کر گھر سے روانہ ہو گیا۔

نا معلوم عنبر کتنی دیر تک سوتی رہی تھی۔ کیا وقت تھا اور کونسا دن۔ اسی خرانٹ سی عورت کی کرخت سی آواز اور بری طرح جھنجوڑنے پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اتنے وحشیانہ انداز میں جھنجوڑے جانے پر ہڑبڑا ضرور گئی تھی مگر کمزوری کی وجہ سے اپنے اندر اتنی سکت نہیں پا رہی تھی کہ اُٹھ کر بیٹھ سکے۔ بس وحشت بھرے انداز میں نیند بھری آنکھوں سے وہ عورت کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ جو خاصی بلند آواز میں میڈم سے کہہ رہی تھی۔

”لو اپنی تسلّی کر لو میڈم، یہ جاگ پڑی ہے ہوش میں آ گئی ہے۔“

تب دوسرے ہی لمحے اسے میڈم کی صورت نظر آئی جو اس اثنا میں اس کے نزدیک ہو کر اس پر جھک گئی تھی۔

”چلو جاگ گئی ہو تو اب اٹھ جاؤ عنبر بن۔ اور اٹھ کر تھوڑا سا کچھ کھا لو پھر تمہیں باس کے پاس بھی جانا ہے۔“ میڈم نے اس کی نیند میں ڈوبی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تو یک لخت اس کی نیند ہوا ہو گئی بلکہ بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔

بدلنے کا سوچ کر تو عنبر کو اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی اس نے نیچے فرش پر اپنے نزدیک ہی کھانے کی ٹرے کو غصّے میں الٹتے ہوئے کہا۔

”نہیں تم مجھے کہیں بھی لے جانے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔ ایسا ہی شوق ہے تو خود ہی باس کے سامنے پیش ہو جاؤ۔ میں اپنی جان دے دوں گی مگر اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکوں گی۔“

”لو یہ تو بڑی ٹیڑھی شے ہے میڈم! ایسے بول رہی ہے جیسے بڑی لاٹ گورنر ہو۔ لو بھلا کھانا وی سُٹ دتا آپ اس کے ایک چپیڑ لگا دو نا۔“ وہ اس کی ٹرے کو اُلٹ دینے کی حرکت پر تلملا کر بولی۔

”نہیں، چپیڑ لگانے کی ضرورت نہیں اس کا علاج تو میرے پاس پہلے سے موجود ہے، میں ابھی بشیرے کو بلوا کر اسے کھانا بھی کھلواتی ہوں اور کپڑے بھی پہنواتی ہوں۔“ میڈم جیسے خود بھی عنبر کی باتوں پر سخت غصہ آ رہا تھا اس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ کر بولی۔

”تو پھر میں بشیرے کو بلا لاؤں۔ ورنہ دیر ہو گئی تو باس خوامخواہ مجھ پر لال پیلا ہو گا۔“ میڈم بولی۔

”ہاں ہاں بلا لو جس کو بھی چاہو۔ مگر آج میں کسی سے بھی نہیں ڈروں گی، کسی سے بھی قابو میں نہیں آؤں گی۔ سمجھیں تم۔“

اپنی عزت پر بن جانے کے احساس نے عنبر کو پاگل سا کر دیا تھا۔ وہ بشیرے کو بلانے کی دھمکی سے بالکل بھی خائف نہیں ہوئی۔ اس نے اس عورت کو باہر کا رخ کرتے دیکھ کر بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ اور جواب میں ایک سفاکانہ سی مسکراہٹ میڈم کے خبیث چہرے پر غلاظت سی بکھیر گئی۔ جبکہ عنبر اس دوران میں خود کو بشیرے سے نمٹنے کے لیے تیار کرتی رہی۔ مگر اس عورت کو گئے ابھی مشکل سے تین منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ ہانپتے کانپتے سے عالم میں آگے آگے نشو اور اس کے پیچھے ایک دوسری عورت بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

”میڈم میڈم غضب ہو گیا۔ وہ۔ وہ۔“ نشو اور اس عورت نے بیک زبان ہو کر کہنا چاہا تو میڈم

تیزی سے اس کی طرف جھپٹی اور دانت کچکچا کر بولی۔
"یہاں کیا بکواس کر رہی ہو ایسی کیا آفت نازل ہو گئی تم دونوں پر چلو باہر چل کر بات کرو۔" اور پھر ان دونوں کو لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"وہ۔ وہ بڑا باس آ گیا ہے میڈم اور۔ اور۔" نشو نے بتایا۔ اس کی آواز سے خوف نمایاں تھا۔
"اوہ خانہ خراب۔ یہ ایک دم کیسے نازل ہو گیا یہاں۔" میڈم ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔
"ہیں ہیں یہ کیا کہہ رہی ہو میڈم۔" دوسری عورت نے گویا اسے ٹوکا۔
"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں میڈم۔ یہ پتا نہیں ایک دم ہی کیسے یہاں آ گیا۔" نشو بولی۔
"اب تو یہ کسی کو بھی نہیں معلوم مگر وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔" دوسری عورت نے کہا۔
"ہیں ادھر آ رہا ہے اور تم اتنے آرام سے یہاں کھڑی ہو۔ چلو جلدی سے اس کمرے کو بند کر کے اس میں تالا ڈالو۔ اتنے میں اُدھر جا کر دیکھتی ہوں۔"
میڈم نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا اور پھر تیزی سے کسی سمت بڑھ گئی۔ وہ تینوں کمرے کے آگے کھڑی ہی باتیں کر رہی تھیں۔ گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں وہ کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گئی تھیں اس لیے عنبرین نے بھی ان کی گفتگو سن لی تھی۔ پھر نشو نے میڈم کے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی۔ اور فوراً ہی عنبرین کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس میں قفل ڈال دیا۔ اور عنبرین یہی سوچتی رہ گئی کہ آخر ایسا کون آ گیا ہے جس نے ان سب کو سہما کر رکھ دیا ہے۔ پھر وہ اپنی طاقت مجتمع کر کے تیزی سے اٹھی اور پہلے تو مقفل دروازے میں کوئی درز تلاش کرنے کی کوشش کی پھر مایوس ہو کر دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد۔ بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور کچھ آوازیں بھی جن میں مردانہ آوازیں بہت صاف اور واضح تھیں۔
اے کاش اس سمے عنبر اندر سے دروازہ دھڑ دھڑا دیتی۔
یا پھر چیخنے چلانے لگتی۔
اے کاش۔
مگر یہ بات اس کے ذہن میں آئی ہی نہیں۔ اور اس کی تقدیر یا پھر ناسمجھی نے اسے ایک نامعلوم وقت تک اسی زنداں میں مقید رہنے پر مجبور کر دیا۔

سعد کو راستے میں اچانک ہی غزل نظر آ گئی۔ اور اس کے پاس فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی پر اسے عنبر کا گمان ہوا تھا۔ اس لیے اس نے غم و غصے۔ جوش اور عنبر کو ——— غزل کے پھندے سے چھڑانے کی دھن میں اپنی کار غزل کی کار کے پیچھے لگا دی تھی۔ اور اپنے جوش میں یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ کار کہاں جا رہی ہے۔ کدھر کا رخ کر رہی ہے۔ بس وہ تو غزل کی کار کا تعاقب کرتا ہوا نامعلوم کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ حتیٰ کہ غزل کے تعاقب میں اس دیو قامت آہنی گیٹ بھی پار کر گیا تھا جس کے اندر داخل ہوتے ہی کسی طرف سے گولیوں کی باڑھ سی آئی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے بازو میں کسی نے دہکتی ہوئی سلاخ اُتار دی ہو۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا۔ اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک بڑے سے ڈھنڈار کمرے میں ایک عام سے پلنگ پر پڑا پایا۔
اور اس کے ساتھ ہی بازو میں شدید درد کا احساس ہوا تو اس نے کراہ کر کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ تبھی ایک دراز قامت کسرتی جسم اور بھاری تن و توش کا شخص اس پر جھک آیا۔ اور پھر اسے ہوش میں دیکھ کر فوراً ہی کہیں غائب ہو گیا۔ کیونکہ سعد نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر اسے کوئی نظر ہی نہیں آیا۔ سعد نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر بازو میں ہوتی ٹیسوں نے اسے بیٹھنے ہی نہیں دیا۔ سعد کا دماغ بھی ڈھنگ

سے کام نہیں کر رہا تھا۔
وہ لیٹے لیٹے سوچنے لگا کہ آخر اسے کیا حادثہ پیش آیا ہے تب دماغ پر زور دینے سے اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وقت کا تعین کرنا تو اس کے لیے مشکل ہی تھا مگر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر اسے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ اسے اس اجنبی جگہ پر آئے دو روز ہو گئے ہیں۔ وہ کہاں ہے اور کن لوگوں میں رہ رہا ہے اس خیال کے آتے ہی اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اس نے گھبرا کر پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور کمرے میں تنہائی اور سناٹے کا راج دیکھ کر وہ زور زور سے چلانے لگا۔
"ارے کوئی ہے۔ کوئی یہاں موجود ہے تو میرے سامنے آئے۔"
وہ وقفے وقفے سے یونہی چیختا رہا۔ تب کچھ دیر بعد جا کر اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے غزل اس کے پلنگ کے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک اور بھی شخص تھا۔ ڈھیلا ڈھالا سا۔ لباس پہنے بلکہ خود بھی ڈھیلا سا۔ اس کے گلے میں اسٹیتھسکوپ جھول رہا تھا۔ یعنی غالباً وہ کوئی ڈاکٹر تھا مگر شکل و صورت سے وہ سعد کو ڈاکو نظر آیا۔
"چلو ڈاکٹر اس کی پٹی کھولو۔ اور دوا لگا کہ جلدی سے نئی بینڈیج باندھ دو۔ اور ہاں ساتھ کے ساتھ اس کے انجکشن بھی لگا دو تاکہ کچھ دیر کے لیے یہ اور سو جائے۔ بڑا شور مچا رہا ہے بے چارا۔" غزل نے اس شخص سے کہا۔
"نہیں نہیں۔ میں پٹی کھلواؤں گا نہ انجکشن لگواؤں گا۔ مجھے تو تم صرف اتنا بتا دو کہ اُسے تم نے کہاں چھپایا ہے۔" سعد نے پٹی کھلوانے سے انکار کرتے ہوئے غزل سے پوچھا۔
"کسے بھئی۔ تم کسے چھپانے کی بات کر رہے ہو؟" غزل نے تنک کر پوچھا۔
"عنبرین کو اور کسے۔ تم میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش نہ کرو میں نے خود اُسے تمہارے ساتھ تمہاری کار میں بیٹھے دیکھا ہے۔" سعد تیوری چڑھا کر بولا۔
"لو بھئی ایک نہ شد دو شد۔ اب اس نے اپنی لیلیٰ کو میرے ساتھ بیٹھے بھی دیکھ لیا۔ ارے وہ تو میری سہیلی رشنا تھی۔ جو میرے ساتھ یہاں کی سیر کرنے آئی تھی۔" غزل اُس کا تمسخر اُڑاتی ہوئی بولی۔
"نہیں تم جھوٹ بول رہی ہو۔ وہ تمہاری سہیلی وہیلی نہیں عنبرین ہی تھی۔ دیکھو اب تو میں تم تک پہنچ گیا ہوں اب تم شرافت سے بتا دو کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بھی اچھی طرح سُن لو کہ اسے حاصل کیے بغیر میں یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گا۔"
سعد نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر غصے میں سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"ارے چل پاجی بدمعاش کہیں کا۔ لو بھلا مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ تو ہمارے قبضے میں ہے۔ اور ابھی تو ہم نے تیرا ایک بازو ہی توڑا ہے زیادہ بکواس کی تو ہم تیری دونوں ٹانگیں بھی توڑ ڈالیں گے۔" غزل نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بڑے طیش کے عالم میں کہا۔
"ہاں ہاں ٹانگیں تو کیا تم خواہ گولیوں سے میرا سارا بدن چھلنی کر دو۔ مجھے کوئی پروا نہیں مگر خدارا اس معصوم اور بے سہارا لڑکی کو اپنے چنگل سے آزاد کرا دو۔ اپنی قید سے اُسے رہائی دلا دو۔ تم اگر اب بھی یہی کہو گی کہ تمہیں اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تو میں تمہاری اس بات پر ہرگز بھی یقین نہ کروں گا کیونکہ تم نے میرے سامنے اس روز اسے دھمکی دی تھی کہ تم اس سے بدلہ لیے بغیر چین سے نہ بیٹھو گی اور تم نے کیا بھی وہی ——— کسی آلۂ کار کے ذریعے اسے نوکری کا جھانسہ دے کر بڑی آسانی سے اغوا کرا لیا۔ ورنہ آج تک تو اس کا اور اس کے خاندان کا کوئی دشمن تھا اور نہ ہے۔"
سعد غم و غصے کے عالم میں بولے چلا گیا۔
"لو جی۔ یہ تو بالکل ہی پاگل ہو گیا۔ اسے تو اب کسی پاگل خانے میں ہی داخل کرانا پڑے گا۔" غزل نے ہنس کر گویا اس کی ہر بات ھوئی کر دی۔ اور جواب میں بھنا کر سعد کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ تبھی دھڑ سے دروازہ

کھول کر ایک آدمی اندر آگیا اس کے کرخت سے چہرے سے پریشانی سی ہویدا تھی۔

"بے بی، بے بی۔ ایک منٹ ذرا ادھر آکر میری بات سنیں۔" اس نے دروازے سے ہی لگ کر غزل کو بلایا۔

"کیوں کیا مصیبت آگئی۔ ٹھیک ٹھاک تو ہو نا تم۔" غزل نے تیوری پر بل ڈال کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا اور اس کے نزدیک پہنچتے ہی اس آدمی نے اس سے جو کچھ بھی کہا۔ اس کے چند الفاظ ہی سعد کے کان میں پڑ سکے۔

"ہائے تو اب کیا ہو گا۔"

"اگر دیکھ۔ شامت ہی۔"

"اچھا تو چھوٹے۔"

"وہ تو سنتے ہی بھاگ پڑے۔"

"مگر۔ کیسے۔ کس نے اسے۔"

"نادر نے فون۔"

"اوہو تو اب کیا ہو گا۔"

"یہ کمرا لاک کر کے۔"

"مگر یہ تو بڑا چلا رہا ہے۔ اگر اس کی آواز۔"

جواب میں مرد نے نامعلوم کیا کہا۔ غزل فوراً ہی پلٹ کر سعد کے نزدیک آکھڑی ہوئی اور ہونقوں کی صورت بنائے یا پھر حالات کی نزاکت کو جانچنے کی کوشش کرتے ڈاکٹر کو ڈانٹنے کے سے انداز میں اس سے کہا۔

"یہ اگر بینڈیج نہیں کھلواتا تو نہ سہی مگر پھر اسے جلدی سے انجکشن لگا دو۔ یوں ٹکر ٹکر کھڑے میری صورت کیا دیکھ رہے ہو۔ چلو جلدی کرو۔ مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔"

"نہیں میں انجکشن نہیں لگواؤں گا۔" سعد نے ہٹیلے سے انداز میں کہا۔

"بکنے دو اسے اور تم اپنا کام کرو۔ ورنہ یہ چیخ چیخ کر ہماری شامت بلا دے گا۔ چلو جلدی سے سرنج تیار کرو۔ میں تو موجود ہوں — دیکھوں گی یہ کیسے نہیں لگواتا۔" غزل ہنکارنے کے انداز میں بولی۔ اور ڈاکٹر سرنج کا کیس کھول کر جلدی جلدی اس میں دوا بھرنے لگا۔ مگر تبھی اس شخص نے جو ہنوز دروازے پر اس کا منتظر کھڑا تھا۔ اس نے بڑی عجلت اور گھبراہٹ میں غزل سے کہا۔

"آپ جلدی سے آجائیں بی بی، یہ ڈاکٹر اس سے خود ہی نمٹ لے گا۔" تو غزل بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس اثنا میں ڈاکٹر سرنج میں دوا بھر چکا تھا۔ سعد کے نزدیک آیا تو اس نے جھپٹ کر وہ سرنج اس کے ہاتھ سے لے لی اور اسے قوت سے فرش پہ دے مارا۔ اور پھر اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے لگا تو ڈاکٹر اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ مگر اس نے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر کے باہر سے اس کا کھٹکا لگا دیا۔ اور سعد بھی نڈھال سا ہو کر پھر لیٹ گیا۔ انجکشن کے تصور سے ہی اسے خوف آرہا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے اندر سے اٹھتی چیخوں کو روک لیا۔ یا پھر۔ قسمت کی گردش ابھی باقی تھی۔ جس نے اسے چپ سادھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ چیخنے چلانے کا اصل موقع تو یہی تھا۔ کہ اس کی چیخیں اسے فوری طور پہ رہائی — دلوا سکتی تھیں۔
مگر وائے قسمت وائے نصیب۔

فہد شرف کے آفس پہنچا تو دن کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اور شرف اپنے آفس میں موجود نہ تھا۔ جاتے ہی اس کے اسسٹنٹ نے فہد کے ہاتھ میں — شرف کا دیا ہوا ایک رقعہ تھما دیا۔ جس میں لکھا تھا۔

ویری سوری دوست۔ میری اس وقت ایک اہم میٹنگ ہے ڈھائی بجے تک ہی فارغ ہو سکوں گا۔ تم ٹھیک چار بجے یہاں پہنچ جانا۔ پولیس بھائی جان کو تلاش کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہی ہے خدا نے چاہا تو جلد ہی ان کا سراغ لگا لے گی۔ تم اطمینان رکھو۔

فقط تمہارا شرف

مگر یہ رقعہ پڑھ کر فہد کو اطمینان نہیں سخت کوفت ہوئی۔ اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ گھڑی کی چوتھائی میں اپنے بھائی کو کہیں سے کھوج نکالے۔

اس سے اس کا ذہن بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ اور طبیعت پر بھی سخت گرانی محسوس ہو رہی تھی — وہ سوچ رہا تھا کہ کل کا پورا اور آج کا آدھا دن تو اِدھر اُدھر کے چکروں میں ہی گزر گیا۔ اب تک کچھ حاصل ہی نہیں ہوا۔ اور شام یا رات تک بھی پولیس ایسا کونسا تیر مار لے گی۔ جبکہ آج رمضان المبارک کی آخری جمعرات ہے اور کل جمعۃ الوداع۔ کل تو پولیس ڈیپارٹمنٹ والوں کی بھی چھٹی ہی ہو گی۔ اور کل کا روزہ تو میں بھی ضرور رکھوں گا۔ یوں بھی اس مصیبت اور پریشانی میں خوامخواہ ہی دو روزے قضا ہو گئے۔

اب تو مجھے شرف کے اس خیال سے اتفاق ہی کرنا پڑے گا کہ بھائی جان کو بدمعاشوں کے کسی ٹولے نے بطور تاوان اغوا کیا ہے۔ ورنہ خدانخواستہ اگر انہیں کوئی حادثہ پیش آجاتا تو اب تک تو کب کی اطلاع مل چکی ہوتی۔

بس اسی خیال کے تحت تھانے سے نکل کر اس نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔ اس آس میں کہ مبادا بھائی جان سے متعلق کوئی فون کال آئی ہو۔

یوں بھی وہ ملازم کو تاکید کر آیا تھا کہ اس کی غیر حاضری میں اگر کوئی فون آئے تو کہہ دے کہ وہ رات کو دوبارہ فون کر لے۔ اب رات تک پھر انتظار کی کوفت اٹھانی پڑے گی۔ مگر خیر۔ اتنا اطمینان تو ہو جائے گا کہ کوئی گمنام فون آیا تھا۔

اس نے گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے ملازم سے فون کے بارے میں ہی استفسار کیا۔ تو معلوم ہوا کہ اس کے صبح کو گھر سے نکلتے ہی فیکٹری سے کسی عورت کا فون آیا تھا۔ اس کے بعد کوئی کال نہیں آئی۔ اور فہد کی یہ آس بھی ٹوٹ گئی۔

بہر حال گھر میں آتے ہی بھوک ایکدم چمک اُٹھی تھی۔ گزشتہ روز سے ڈھنگ سے کچھ کھایا ہی نہیں تھا اور صبح ناشتہ بھی بس برائے نام ہی کیا تھا۔ اس لیے اس نے ملازم سے کھانا لگانے کو کہا اور پھر شاور باتھ لینے کے بعد لباس تبدیل کر کے بستر پہ آبیٹھا۔ تبھی ملازم اس کا کھانا لے کر آگیا۔ کھانا کھانے کے بعد ذہن پر صدر رجے بوجھ سا محسوس کرنے کے باوجود بھی وہ لیٹا نہیں کہ — یوں بھی وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ کہ ابھی صرف پونے دو ہی بجے تھے ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ یوں تو عام دنوں میں وہ صرف جمعے کی نماز پڑھتا تھا مگر آجکل چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اس پہ بھائی کی پریشانی نے اُسے بیکل سا کر رکھا تھا اس لیے اس نے وضو کر کے بڑی دل جمعی سے ظہر کی نماز ادا کی اور بہت خشوع و خضوع کے ساتھ بھائی کے خیر و سلامتی سے مل جانے کی دعا مانگی۔ اور پھر بستر پہ آبیٹھا۔

نماز پڑھ لی تھی۔ خداوند عالم سے گڑگڑا کر دعا مانگ لی تھی، پھر بھی ذہن ہنوز الجھا ہوا ہی تھا۔

اصل میں اپنی تئیس چوبیس سالہ زندگی میں ایسے پریشان کن حالات سے سابقہ پڑا تھا نہ ایسی پیچیدہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا اور معاملہ بھی بھلا کیا تھا۔ اپنے عزیز از جان بھائی کے اچانک گم ہو جانے کا۔

ایسی پریشانی — جس نے اس کی جان پہ بنا رکھی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آج بھی بھائی جان کا کہیں سراغ نہ ملا تو میرا کیا ہو گا کیا اسے ان کی طرف سے مایوس ہونا پڑے گا۔

تو کیا اماں بیگم اس خبر کو برداشت کر لیں گی۔ جبکہ وہ بے چاری تو پہلے ہی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں اور عام طور پر علیل ہی رہتی ہیں۔ ان کے دل پہ کیا بیتے گی۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح پونے چار بج جائیں اور وہ فوراً ہی شرف کے دفتر جا پہنچے۔ اس کا دھیان فون ہی کی طرف چلا گیا۔ جو یوں خاموش پڑا تھا جیسے ڈس کنیکٹ کر دیا گیا ہو۔ اسے معاً یاد آیا کہ فیکٹری سے کسی نے اسے فون کیا تھا۔ بھائی کی گمشدگی کا روبار پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ گزشتہ تین روز سے اس نے پلٹ کر فیکٹری کی خبر نہیں لی تھی۔ اس نے سوچا رقیہ کو فون کر کے کم از کم اتنا ہی بتا دے کہ کون کون سا مال سپلائی کرنا ہے۔ تاکہ دوکان کی سیل تو نہ رُکے۔ یہی سوچ کر اس نے شوروم کا نمبر ڈائل کیا۔ تو نمبر انگیج ملا۔ اس نے تھوڑا توقف کر کے پھر فیکٹری کا نمبر ملایا۔ تو کوئی اور لائن مل گئی کیونکہ ایک عورت اور ایک مرد آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"او ڈیم اٹ!" کہہ کر ریسیور رکھنا ہی چاہا تھا کہ عورت کی آواز آئی۔

"ایں یہ تم خوامخواہ کی شیخی بگھار رہے ہو، ورنہ اس کا سارا کریڈٹ تو میری طرف جاتا ہے۔ لہٰذا رقم بھی مجھے تگڑی ملنی چاہیے۔" یہ آواز اتنی مانوس تھی کہ فہد برسوں بعد بھی اسے اچھی طرح پہچان سکتا تھا۔ اس آواز کو سُن کر وہ بُری طرح چونکا کہ یہ میڈم رقیہ کی آواز تھی۔

"بھئی، اب رقم وقم کی کیا بات کرنی۔ ہم تمہیں جتنا ایڈوانس دے چکے ہیں، وہی بہت ہے۔" مرد بولا۔

"واہ۔ اب تم اپنا اَنّ سیدھا کر کے یوں ہیٹھ دکھا رہے ہو۔ ورنہ وہ تو صرف پتا بتانے کا معاوضہ تھا۔ اور کسی کا اتا پتا بتانا اتنا آسان تو نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ اگر میں تمہیں اس سونے کی چڑیا کا پتا نہ بتاتی تو تم اسے آسانی سے اغوا کرا سکتے تھے۔" رقیہ نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ معاملہ کسی کے اغوا کا ہے۔ فہد کے کان کھڑے ہو گئے۔

"مگر میں نے یہ کب کہا کہ اس کا سہرا میرے سر ہے۔ تم نے تو واقعی ہمارے لیے بہت بڑا کام کیا ہے۔" مرد نے کہا۔

"بس تو پھر اب تم ہی انصاف کرو کہ اتنے بڑے اور خطرناک کام کا معاوضہ کتنا کم دیا گیا ہے مجھے۔" رقیہ بولی۔

"ہوں، تو اب تم مزید کتنا لو گی؟"

"جتنا ایڈوانس دیا تھا اس سے دُگنا۔ بلکہ یہ بھی میں کم ہی مانگ رہی ہوں۔ چلو تم بیس ہزار اور دے دینا۔ ویسے بھی اپنی جیب سے تو نہیں دو گے نا۔ اپنے باس کی جیب سے دو گے۔ تو اس کی جیب تو بہت بھاری ہے۔" رقیہ نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

"نہیں بھئی، یہ تو تم زیادتی سے کام لے رہی ہو، بیس ہزار تو بہت ہیں۔ چلو ایسا ہی ہے تو پانچ ہزار اور تمہاری جھولی میں ڈال دوں گا۔" مرد بولا۔

"ارے واہ۔! میں کوئی بھکارن ہوں کیا جو تم پانچ ہزار کی پچی رقم میری جھولی میں ڈال دو گے۔ میں تو اب بیس ہزار سے ایک پائی بھی پیچھے نہیں آؤں گی۔ واہ بھلا اتنا بڑا کام کرایا ہے تمہارا اور تم عین وقت پر لال جھنڈی دکھا رہے ہو۔" رقیہ چٹخنے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں خیر، لال جھنڈی کیوں دکھانے لگا۔ بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ کام میرا نہیں میرے باس کا تھا۔ اس نے جو مناسب سمجھا تمہیں۔"

"مگر میں تمہارے باس واس کو کیا جانوں۔ میں تو تم کو جانتی ہوں۔ یوں بھی یہ کام کرانے تمہارا باس نہیں، تم میرے پاس آئے تھے۔ اور پاس کیا آئے تھے بلکہ جھاڑ کا کانٹا بن کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔" رقیہ جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے رقیہ مگر میری بھی کچھ مجبوری ہے اور میں۔"

"ارے بھاڑ میں ڈالو اپنی مجبوری وجبوری کو۔ مجھے تو بس بیس ہزار اور دلوا دو۔ ورنہ شاید تم مجھ سے واقف نہیں ہو۔"

"ارے نہیں نہیں۔ تم اتنی گرمی تو نہ دکھاؤ، پہلے میری پوری بات تو سُن لو۔"

"اچھا سُناؤ۔ آخر ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے تم پر۔"

"ارے نہیں افتاد وفتاد کیسی۔ بلکہ بیٹھے بٹھائے ایک نیا شکار ہاتھ لگ گیا ہے ہمارے۔ اور اس طرح باس کی جیب پر بہت بوجھ پڑا ہے۔ وہ تو مر کر بھی کبھی بیس ہزار کی رقم نہیں دے گا۔"

"اجی واہ کیسے نہیں دے گا۔ اور میں تو تم کو جانتی ہوں۔ میں تو تمہارے اچھوں سے بھی نکلوا لوں گی۔ ہاں کیا سمجھتے ہو آخر تم مجھے۔ آج شام تک مجھے بیس ہزار مل جانے چاہئیں۔ سمجھے تم۔"

"اوہو پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ کچھ معلوم بھی ہے کہ ہم نے کس کو شکار کیا ہے۔"

"مجھے کچھ معلوم ہے نہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی سمجھتی ہوں۔ مجھے تو بس اپنے کام سے غرض ہے اور میں کچھ نہیں جانتی۔"

"نہیں جاننا چاہتیں۔ یہ تمہاری مرضی مگر میں تمہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہارا باس بھی آجکل ہمارے قبضے میں ہے۔"

"ہیں کیا مطلب؟"

"بھئی مطلب یہی کہ۔ وہ جو تمہاری کمپنی کا باس ہے نا سعد عالمگیر۔ اسے بھی ہم نے شکار کر لیا ہے۔"

"ہائیں کیا بک رہے ہو تم کیا اپنے ہوش میں تو ہو۔"

"ہاں میں پوری طرح اپنے حواسوں میں ہوں۔ یوں بھی جھوٹ بول کر تم سے کوئی تمغہ جرأت تو حاصل نہیں کرنا۔"

اور اس خبر پر فہد تلملا اٹھا۔ اور خود پر قابو پانا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ اس نے بڑی سمجھداری اور تحمل سے کام لیا۔ اور چپ سادھے ان دونوں کی گفتگو سنتا رہا۔

"مگر اسے کیوں اٹھایا تم لوگوں نے۔ اس کا بھلا اس معاملے سے کیا تعلق۔" رقیہ کے لہجے سے بے یقینی صاف عیاں تھی۔

"تعلق وعلق تو نہیں۔ مگر وہ خود ہی شیروں کی کچھار میں گھُس آیا تھا۔ تو مفت میں ہاتھ آئی آسامی کو بھلا ہم چھوڑ دیتے۔"

"دیکھو تم میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش نہ کرو۔ اب بیس ہزار تمہارے دل سے نہیں نکل رہے تو تم نے باس کو اغوا کرنے کی ہوائی چھوڑ دی۔ اور اگر تمہارا کہنا سچ بھی ہے تو میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے تو اپنی رقم چاہیے ورنہ اگر میرا متھا گھوم گیا تو میں تھانے میں جا کر تمہاری ساری پول کھول دوں گی، سمجھے۔"

"خیر خیر، تھانے پولیس کی دھمکی نہ دو۔ ورنہ اُلٹی آنتیں گلے میں پڑ جائیں گی کیونکہ ہم کچا کام نہیں کرتے۔ اور لڑکی کو اغوا کرانے میں سب سے زیادہ تو تمہارا ہی ہاتھ ہے۔"

"ارے جاؤ مسٹر شیخ، میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ میں نے تمہاری وہ ساری گفتگو ٹیپ کر رکھی ہے جو تم نے پہلی بار فون پر مجھ سے کی تھی اور مزے کی بات یہ کہ میں تمہاری ہر بات پر سختی سے انکار کرتی رہی تھی یوں بھی میں صاف مکر جاؤں گی۔ ویسے بھی میں نے اس ٹیپ میں حفظِ ماتقدم کے طور پر یہ بھی ٹیپ کر دیا ہے کہ مجھے تمہاری طرف سے خدشہ ہے کہ کہیں تم میرے انکار پر مجھے کوئی زک نہ پہنچا دو۔ سُنا تم نے میں بھی تمہاری طرح پکا کام کرنے کی عادی ہوں۔ لہٰذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم مجھ سے پنگا نہ لو۔" رقیہ ڈرنے یا دبنے کے بجائے کچھ زیادہ ہی شیر ہو کر بولی۔

"اوہو بھئی، تم تو ذرا ذرا سی بات پر ایک دم سلگ ہی اُٹھتی ہو۔ میرا مقصد تمہیں دھوکا دینا یا دھوکے میں رکھنا تو نہیں بلکہ میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم کچھ دن اور صبر کر لو۔ آسامی تگڑی ہے۔ تو ہم باس سے تگڑا معاوضہ ہی وصول کریں گے اور اس میں سے بیس ہزار نکالنے ہمارے لیے مشکل نہیں ہوں گے۔"

"ارے چھوڑو، اپنی یہ طفل تسلیاں اپنے ہی پاس رکھو۔ تم اپنے باس سے بعد میں وصول کرتے رہنا۔ پہلے میرا حساب چکتا کر دو۔"

تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میری چھوٹی بہن کی شادی جلدی ہونے والی ہے۔ اور مجھے پیسے کی سخت ضرورت ہے۔"

"اچھا بھئی، ذرا چھری کے نیچے دم تو لینے دو۔ میرا مطلب ہے، دو چار روز اور صبر کر لو۔ پھر تمہارا مطالبہ بھی پورا کر دیں گے۔"

"چلو خیر، دو چار روز میں تو کوئی حرج نہیں۔ مگر اس سے زیادہ مجھ سے صبر نہیں ہو سکے گا۔ چلو چار دن نہ ہی، تم چھ روز بعد دے دینا مگر دینا ضرور۔ ورنہ ساتویں روز میں وہ ٹیپ تھانے میں پہنچا دوں گی۔ اور ہاں میرے ساتھ کوئی اور چکر بھی نہ چلانا۔ ورنہ خود ہی نقصان اٹھاؤ گے۔"

"ارے نہیں کیسی بات کرتی ہو تم بھی۔ بس آج سے پانچویں روز تمہاری مطلوبہ رقم تم کو مل جائے گی۔ تم اطمینان رکھو۔"

اس کے ساتھ ہی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اور ادھر۔ یہ مختصر ترین سا عرصہ یا دورانیہ جو فہد کو صدیوں پر محیط لگا تھا اور اس دوران میں اس نے جس صبر و تحمل اور خاموشی سے کام لے کر یہ ساری گفتگو سنی تھی بلکہ سعد نے جیسے ضبط کیا۔ یہ اسی کا ہوتا تھا۔ ورنہ وہ رقیہ کے ایک ایک فقرے پہ بُری طرح تلملاتا رہا تھا۔ انگاروں پہ لوٹتا رہا تھا۔

کئی بار تو ضبط کا دامن اسے اپنے ہاتھ سے چھوٹتا محسوس ہوا تھا۔ اور اس کا جی کتنا چاہا تھا کہ رقیہ کو بڑی گندی گالیوں سے نواز کر کم از کم اسے اتنا تو بتا دے کہ وہ اس کی اور اس کے آلہ کار کی تمام گفتگو اچھی طرح سُن چکا ہے۔ اور ان دونوں کی گردن ناپنے کو تیار بیٹھا ہے۔ مگر اس نے بڑی سمجھداری اور صلاحیت سے کام لیا تھا۔ اپنی جلتی سلگتی یعنی مشتعل سی کیفیت پر بڑی سختی سے قابو پائے خاموش بیٹھا سب کچھ سنتا رہا تھا۔ اور اب بھی جونہی فون کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ گو اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ سیدھا شوروم پہنچ کر رقیہ کی گردن مروڑ دے یا پھر اسے شوٹ کر دے۔ کیونکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ رقیہ ابھی موجود ہو گی۔ مگر اس نے ایسا کوئی سنگین سا جذباتی اقدام کرنے سے گریز ہی کیا۔ اور ٹیپ کو فون سے علیحدہ کر کے کوٹ کی جیب میں احتیاط سے رکھ کر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شرف کے پاس چلا آیا۔ حالانکہ ابھی ساڑھے تین ہی ہوئے تھے مگر اتفاق سے شرف اس وقت اپنے آفس میں ہی موجود تھا۔

"لو بھئی شرف میں نے خود ہی اغوا کنندگان کو پکڑ لیا ہے۔" اس نے چھوٹتے ہی گویا اپنی کارکردگی کو جتانے کی غرض سے شرف کو بتایا۔

"اچھا کیا واقعی؟" شرف نے اس کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھ کر کہا جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ وہ طنز کر رہا ہے یا مذاق۔ فہد اس کے سوال کرنے کے انداز پہ چڑ کر بولا۔

"ہاں تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں یا مذاق کر رہا ہوں تم سے۔ ویسے تفصیلات میں بھی ہرگز نہیں جاؤں گا ورنہ تم یونہی دیدے پھاڑ پھاڑ کر پوچھو گے کہ کیوں۔ کیسے۔ کیا واقعی۔ بس یہ تمہارا دیا ہوا ٹیپ لایا ہوں گو میں تو ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ان دونوں کی گفتگو یقیناً اس ننھی سی ڈبیا نے اپنے اندر ضم کر لی ہو گی۔" فہد نے اپنی گفتگو کے درمیان وہ ٹیپ جیب سے نکال کر اس کے سامنے میز پہ رکھ دیا۔

"او۔ ہاں ہاں۔ مگر کتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے ان لوگوں نے؟" شرف اصل بات جاننے کی دھن میں اس کی بات ڈھنگ سے سمجھ نہیں سکا۔

"یار! ایک ذمے دار پولیس آفیسر کے بجائے ایک دم گھسیارے لگ رہے ہو اس وقت۔ بھئی کہہ تو دیا کہ میری کسی سے براہِ راست کوئی گفتگو ہی نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے تو اتفاقاً دو جرائم پیشہ افراد یا اس جرم میں ملوث افراد کی گفتگو سُن لی تھی، جو ٹیپ ہو گئی۔"

"اوہو پتا نہیں تم کیا بک رہے ہو۔ خیر ٹھہرو۔ میں ٹیپ آن کر کے دیکھتا ہوں۔" شرف نے اُلجھے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور پھر ایک چھوٹے سے پلیئر میں وہ کیسٹ فکسڈ کر کے بڑے غور سے رقیہ اور اس مرد کی تمام گفتگو سُنتا رہا۔

"ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ کسی لڑکی کو بھی اغوا کیا گیا ہے۔" پلیئر بند کر کے شرف نے کچھ سوچنے کے انداز میں کہا۔

"ہاں رقیہ کی گفتگو سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے مگر یہ بھائی جان کا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر چلو ابھی چل کر رقیہ سے سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں۔" فہد بولا۔

"رقیہ سے معلوم کر لیتے ہیں؟ تو کیا تم رقیہ سے واقف ہو؟" شرف نے پوچھا۔

"ہاں بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ کیئر ٹیکر کی حیثیت سے میری فرم میں عرصے سے کام کر رہی ہے۔" فہد نے بتایا۔

"او آئی سی!" شرف نے کہا۔ پھر میز پہ رکھے فون کا ریسیور اٹھا کر اپنے اسسٹنٹ کو کچھ ہدایات دیں، اور پھر فہد کے ساتھ باہر نکل آیا۔

فہد شرف کو لے کر شوروم پہنچا تو رقیہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ فہد کے ساتھ ایک پولیس آفیسر کو آتا دیکھ کر وہ بُری طرح بوکھلا اٹھی۔ جلدی سے ریسیور کو کریڈل پہ رکھا اور اُٹھ کر بڑی سراسیمگی کے عالم میں دونوں کی طرف دیکھنے لگی جو اسی اثنا میں قدم بڑھا کر عین اس کے سر پہ ہی آ کر کھڑے ہو گئے۔

"او۔ آپ سر۔ ! آپ سلام علیکم سر!" اس نے دونوں کو عین سر پر ٹنگا دیکھ کر ٹپٹائے ہوئے انداز میں فہد کو سلام کیا۔ تو جواب میں فہد اپنے آفس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

"ابھی اور اسی وقت میرے آفس میں چلی آؤ۔ تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔" پھر وہ تیزی سے اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

فہد اور شرف کو دیکھتے ہی رقیہ کا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا تھا۔ اب اس نے اپنے کمرے میں آنے کو کہا تو وہ اندر ہی اندر دہل سی اٹھی۔ اور دھک دھک کرتے دل کے ساتھ فوراً ہی فہد کے کمرے میں چلی آئی۔

"جی سر!" اس نے فہد کو مخاطب کر کے مری مری سی آواز میں کہا۔ فہد کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اُسے بے نقط سُنائے بلکہ اس جی سر کے جواب میں دو چار ہاتھ بھی رسید کر دے۔ کیونکہ رقیہ نے اس کے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔ اپنی اتنی پرانی ملازمہ پہ وہ بہت اعتماد کرتا تھا۔ کتنا معتبر سمجھتا تھا۔

اسی اعتماد اور اعتبار کی بنیاد پر تو اپنی فیکٹری اور دکان کی ساری ذمہ داری اس نے رقیہ کو سونپ رکھی تھی۔ اور وہ اس کا احترام بھی کرتا تھا۔ مگر فون سُننے کے بعد جب اس پر اس کی اصل حقیقت منکشف ہوئی۔ کہ وہ کتنی مجرمانہ ذہنیت اور خیالات رکھتی ہے۔ بلکہ جرائم پیشہ افراد کے جرائم میں ملوث بھی ہے، اور اتنی لالچی ہے کہ محض پیسے کی خاطر اس نے کسی شریف لڑکی کو اغوا کرانے میں جرائم پیشہ افراد کی مدد بھی کی ہے۔

اسے اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر تو فہد کو اپنی رگوں میں دوڑتا خون کھولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تو شرف نے اسے بڑی سختی سے منع کر دیا تھا۔ کہ وہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے نہ رقیہ سے کچھ پوچھے گچھے، چنانچہ جوں ہی فق ہوتی رنگت کے ساتھ رقیہ نے جی سر کہا۔ جواب میں شرف نے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت تمہارے پاس اغوا کے ایک کیس کے سلسلے میں تفتیش کرنے کی غرض سے آیا ہوں، چنانچہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم سے جو کچھ بھی پوچھا جائے، اس کا صحیح صحیح جواب دو۔"

"ہیں۔ یس۔ یس۔ سر۔" شرف کی بات پر رقیہ نے گڑبڑا کر کہنا چاہا۔

"یہ یس یس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بس میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ اور سچ سچ بتاؤ کہ تمہارے بڑے باس سعد عالمگیر کو کن لوگوں نے اغوا کیا ہے؟" شرف نے اپنی پیشہ ورانہ رعونت سے کام لے کر پوچھا۔

"ہے ۔ باس کو کس نے اغوا کر لیا ۔ ہائے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر! ۔ باس تو ۔" رقیہ نے کچھ اس طرح حیران و پریشان ہو کر کہا، جیسے شرف نے اسے کوئی بہت ہی سنسنی خیز خبر سنائی ہو۔

"دیکھو رقیہ! یوں چندرا چندرا کر بات کر کے تم میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتیں۔ جبکہ مجھے ہر بات معلوم ہے اور میں صرف تمہارے منہ سے اس کی تصدیق کرانی چاہتا ہوں۔" شرف بڑے سخت اور کرخت لہجے میں بولا۔

"لیکن سر! میں آخر کس بات کی تصدیق کروں، جبکہ میں نے تین چار روز سے بڑے باس کی شکل ہی نہیں دیکھی۔ بلکہ یہ چھوٹے باس کو بھی آج کئی روز بعد دیکھ رہی ہوں۔" رقیہ نے بدستور خود کو انجان ثابت کرنے کی کوشش میں کہا۔

"بکواس بند کر مکار عورت! ۔ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ عورت ہونے کے ناتے تجھ سے نرمی برتوں گا، اور آہستہ آہستہ سب کچھ اگلواؤں گا۔ مگر تو تو بڑی گھاگ نکلی ۔ اب مجبوراً تجھے تھانے لے جا کر ہی سب کچھ اگلوانا پڑے گا۔" شرف ایک دم ہی طیش میں آکر بولا، تو اندر ہی اندر لرزتی اور کانپتی رقیہ نے بڑی بے بسی سے فہد کی طرف دیکھا، اور بولی۔

"سر! آپ کیوں خاموش ہیں آپ ہی انہیں سمجھائیے نا کہ میں پچھلے کئی سال سے آپ کے یہاں ملازمت کر رہی ہوں۔ اور نہایت ایماندار اور اپنے کام سے کام رکھنے والی ہوں، میں بھلا انہیں یہ کیسے بتا سکتی ہوں کہ باس کو کن لوگوں نے اغوا کیا ہے، جبکہ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ باس اغوا کر لیے گئے ہیں۔" تو فہد کے بجائے شرف انتہائی غصے کے عالم میں اٹھتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہے تم یوں نہیں مانو گی ۔ چلو ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ تھانے چلو، میں وہاں ایک منٹ میں تم سے سب کچھ اگلوا لوں گا۔" تب فہد نے آہستہ سے انگریزی میں اس سے کہا۔

"تم اسے ٹیپ پر اس کی گفتگو کیوں نہیں سنا دیتے ۔ اسے سننے کے بعد تو اس کے اچھے بھی سب کچھ اگل دیں گے۔"

"میں اسی غرض سے تو اسے تھانے لے جا رہا ہوں تاکہ وہاں اس کے خلاف باقاعدہ کارروائی کر سکوں۔ ویسے بھی یہاں تمہارے شو روم میں اسے ٹیپ سنوانا میرے اصولوں کے خلاف ہے۔" پھر وہ رقیہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سیدھی طرح تھانے چلنا پسند کرو گی، یا پھر کڑے چوڑیاں پہن کر جانا۔"

"مگر میں کیوں تھانے جاؤں آخر، میرا قصور کیا ہے جناب! آپ کیوں سب کے سامنے مجھے خوار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ سر آپ خاموش کیوں ہیں، کچھ تو بولیے نا۔"

رقیہ خود کو بے قصور اور لاعلم ظاہر کرنے کی کوشش میں بولی ۔ مگر شرف نے اس کی ایک نہ سنی، اور شو روم میں کام کرنے والے ایک سیلز بوائے کو باہر بھیج کر ان دونوں سپاہیوں کو بلایا، جنہیں وہ باہر ہی چھوڑ آیا تھا۔ اور ان سے رقیہ کو باہر کھڑی اپنی جیپ تک لے جانے کو کہا۔

اس اثناء میں سپاہیوں کو اندر آتا دیکھ کر شو روم میں موجود ملازمین اور گاہکوں کی ایک بھیڑ سی لگ گئی تھی ۔ آخر رقیہ کو چار و ناچار ان سپاہیوں کے ساتھ باہر جانا ہی پڑا

تھانے پہنچ کر ہچکیوں اور ہچکیوں روتی اور بکتی جھینکتی رقیہ سے شرف نے ایک لفظ نہیں کہا ۔ بلکہ اسے کرسی پر بٹھوا کر تھانے دار کی موجودگی میں ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا ۔ اور یوں گویا اس کی اور اس مرد کی ساری گفتگو اس کے گوش گزار کر دی، جسے سنتے سنتے رقیہ کی رنگت دھوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ گئی اور وہ تھر تھر کانپنے لگی ۔ اور پھر اس نے سب کچھ اگل دیا۔

عنبر کے اغوا کی خبر سن کر فہد سناٹے میں آ گیا ۔ مگر سعد کو اغوا کرنے کا عقدہ پھر بھی نہ کھل سکا ۔ آخر رقیہ کی نشاندہی پر شرف نے شیخ کو پکڑا ۔ شیخ سے بہت اگلوانے کی کوشش کی، لیکن اس نے کچھ قبول کر کے ہی نہیں دیا۔ تب شرف نے بقول اس کے شیخ کی اس بری طرح پھینٹی لگوائی کہ وہ سب کچھ اگلنے پر مجبور ہو گیا مگر سعد کے بارے میں وہ یہی کہتا رہا کہ اس نے سعد کو اغوا نہیں کیا تھا ۔ بلکہ سعد خود اس کے باس کی رکھیل غزل کا پیچھا کرتا ہوا اس کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گیا تھا۔ جو۔

ماری پور سے بھی دس بارہ میل آگے ایک ویرانے میں واقع تھا۔ اور اس وقت سے وہ انہی لوگوں کے قبضے میں ہے۔

اور اپنے باس کے بارے میں بھی شیخ نے بڑے سنسنی خیز سے انکشافات کیے تھے۔ جن کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ اس کا باس فلم ڈسٹری بیوٹر بھی ہے اور اس نے اپنا ایک علیحدہ اسٹوڈیو بھی قائم کر رکھا ہے۔ جس میں وہ خوبصورت لڑکیوں کو بڑی بڑی تنخواہوں کا فریب دے کر ملازمت دیتا ہے اور پھر انہیں جبریہ ٹریننگ دے کر چرس اور ہیروئن کا کاروبار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور عنبرین کو بھی اس نے اسی غرض سے اغوا کرایا ہے۔ علاوہ ازیں وہ دوسرے بھی بہت سے غیر قانونی یا کالے دھندوں میں ملوث ہے۔ اور یہ سارے انکشافات شیخ نے جس کا اصل نام صدرالدین تھا۔ تمام رات پولیس سے کھال کھنچوانے کے بعد کیے تھے۔

بہرحال پولیس کو اس عمارت تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی، جس کی نشاندہی شیخ نے کی تھی ۔ اور شرف پوری فوج ظفر موج کے ساتھ کہ تھانے کا ایس ایچ او ۔ اے ایس آئی ۔ اور دو جیپوں میں بھرے کم و بیش بیس سپاہیوں کے ساتھ اس مقام تک پہنچا تھا۔ توقع تو یہی تھی کہ ادھر سے اندر داخل ہونے کا موقع آسانی سے نہیں ملے گا ۔ یعنی راستہ روکا جائے گا ۔ شدید مزاحمت کی صورت میں گولیوں سے بھی تواضع کی جائے گی ۔ مگر یہ سب بالکل نہ ہوا۔

عمارت کا دیو قامت آہنی گیٹ کھلا ہوا ملا۔ جس پر دو مسلح پہرے دار ایستادہ نظر آئے ۔ جنہوں نے پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر مطلقاً کوئی تعرض نہیں کیا۔ اور نہایت خاموشی سے انہیں اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ اور اس بات پر شرف ہی کو نہیں تقریباً سبھی کو اچنبھا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی دوسری پولیس پارٹی، جس میں رینجر پولیس کے ہونے کا بھی امکان ہو سکتا ہے، ہم سے پہلے ہی یہاں پہنچ گئی ہو ۔ شرف نے دل میں سوچا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے سر! کہ کوئی بہت اونچا داؤں لگا دیا گیا ہے۔" ایس ایچ او نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ہاں عام طور پر بھی ایسے لوگ بہت اونچی سفارش رکھتے ہیں۔" فہد بولا۔

"خیر سفارش خواہ کسی لاٹ گورنر کی ہی کیوں نہ ہو، میں اپنے فرض کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لوں گا۔" شرف نے پوری قطعیت کے ساتھ کہا۔

گاڑیاں ڈامر کی سڑک پر جس کے اطراف میں باغات تھے تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں ۔ پھر کوئی تین فرلانگ کا راستہ طے کرنے کے بعد سڑک کے انتہائی سرے پر محل نما عمارت کے صدر دروازے پر تھوڑا سا فاصلہ چھوڑ کر شرف نے گاڑی رکوائی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیچے اتر آیا۔

سامنے عالیشان صدر دروازے پر بھی دو پہرے دار کھڑے نظر آئے ۔ شرف اپنی پارٹی سمیت ان کے نزدیک آیا تو ان میں سے ایک پہرے دار نے انٹرکام پر اندر اطلاع دی کہ پولیس پارٹی آگئی ہے ۔ اندر سے ایک بھاری اور پاٹ دار آواز گونجی "ٹھیک ہے ہم بھی ابھی آتے ہیں۔" اور شرف جو چاہ رہا تھا کہ دندناتا ہوا اندر جائے اور اندر جا کر اپنی پولیس پارٹی کے افراد کو ہر طرف پھیلا دے ۔ تاکہ ایک ایک مجرم کو چن چن کر گرفتار کیا جا سکے ۔ مگر پہرے دار کی انٹرکام پر پولیس کے آجانے کی اطلاع دینے پر وہ تعجب اور تجسس کی ملی جلی سی کیفیت میں ایک دم ہی ایکشن نہ لے سکا ۔ اور ابھی کچھ دیر نہ گزری تھی کہ اندر سے اپنے دو لحیم شحیم محافظوں کے جلو میں ایک بہت ہی بھاری بھرکم سی شخصیت جس کے چہرے پر دبدبہ بھی تھا اور شرافت بھی، اور جس کا شمار خوبرو انسانوں میں کیا جا سکتا تھا نمودار ہوئی تو شرف پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ سے ٹوٹ پڑے۔

"آغا جان آپ۔" اس نے آگے بڑھنے کے بجائے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"ہاں بھتیجے ۔ مگر تم یہاں کیسے؟ کیا تمہیں رب نواز خان نے یہاں بھیجا ہے۔" آغا جان جو واقعی رشتے میں شرف کے چچا ہوتے تھے، نے قدرے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ اور شرف نے دل میں سوچا کہ یا تو پولیس پہلے سے اپنی کارروائی کر چکی ہے، یا پھر چچا محض اس پر رعب ڈالنے کی غرض سے ڈی آئی جی کا نام لے رہے ہیں۔

"جی نہیں ۔ ڈی آئی جی صاحب نے مجھے یہاں نہیں بھیجا ۔ بلکہ میں خود ہی آیا ہوں۔"

"اچھا اگر خود بھی آئے ہو تو آگے بڑھ کر میرے گلے کیوں نہیں لگتے ۔ آج مدتوں بعد تو قسمت سے ہماری ملاقات ہوئی ہے" آغا جان نے بڑی لگاوٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جی میں آغا جان ۔ میں یہاں کسی خوش وقتی میں نہیں آیا بلکہ اسمگلروں کے اڈے پر چھاپہ مارنے آیا ہوں ۔ یوں بھی میں

رشتے داری پر اپنے فرض کو زیادہ فوقیت دیتا ہوں۔ اور بڑی معذرت کے ساتھ آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یُو آر انڈر اریسٹ۔ آپ خاموشی سے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیجیے۔" شرف نے جواب میں انتہائی بے گانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہائیں کیا بک رہے ہو تم۔ کیا مجھے گرفتار کرنے آئے ہو۔ کہیں تم گھاس تو نہیں کھا گئے بھتیجے، یا پھر افسری کا نشہ کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا ہے!۔ جو اپنے بڑوں کا لحاظ بھی تم نے کھو دیا۔" آغا جان ایک دم ہی طیش میں آکر بولے۔

"فرض کی ادائیگی کے آگے میرے لیے مروّت اور لحاظ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ جناب آغا صاحب اور میں تو آپ سے پہلے معذرت کر چکا ہوں، للہٰذا آپ میرا وقت کھوٹا کریں نہ اپنا۔ اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیں۔" شرف نے واقعی مروت و لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر ــ اے ایس آئی کے ہاتھ سے ہتھکڑی لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن آخر کس جرم کی پاداش میں میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دوں؟ وارنٹ گرفتاری کہاں سے لے آئے ہو تم، اور کون سی فردِ جرم لگائی ہے تم نے مجھ پر آخر۔ مجھے بھی تو کچھ معلوم ہو۔" آغا جان شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"اسمگلنگ ــ اغوا ــ حبس بے جا۔ حشیش کا کاروبار اور دوسرے کئی ناجائز اور غیر قانونی دھندوں میں آپ ملوث ہیں، اور آپ کے ان سنہری کارناموں کو دہراتے ہوئے میں شرم سے گڑا جا رہا ہوں۔"

شرف نے طنز کے زہر میں ڈوبے ہوئے الفاظ کی ایک بارش سی پھینکی ــ اور ہتھکڑی لے کر آغا جان کی طرف بڑھا۔ تبھی آگے آگے ڈی آئی جی کی کار اور اس کے پیچھے دو عدد پولیس وین عین اس کے قریب آکر رُکیں۔ تو آغا جان ــ اس کے ہتھکڑی والے ہاتھوں کو پیچھے جھٹک کر ڈی آئی جی کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"آیئے۔ خوش آمدید خان جی۔ بڑے بروقت آئے ہیں آپ، ورنہ یہ میرا ڈی ایس پی بھتیجا تو مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر جیل کی ہوا کھلانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔"

جواب میں ڈی آئی جی نے کار سے اُتر کر ان سے مصافحہ کیا، اس کے آنے سے شرف والی پارٹی بھی اٹینشن سی ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور سب نے انہیں سیلوٹ کیا تھا۔ شرف بھی تھوڑا سا گڑبڑا گیا تھا۔ جبکہ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے مجرمانہ ذہنیت اور فطرت رکھنے والے چچا نے خود کو قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ بھاری رقم بھی کھلائی ہو۔

بہرکیف! وہ ایک فرض شناس اور با اصول پولیس افسر تھا۔ گو ڈی آئی جی کی اچانک آمد نے اندر ہی اندر اس سمیت اس کے ساتھیوں کو لرزا سا دیا تھا۔ پھر بھی وہ ہتھکڑی ہاتھ میں لیے ڈٹا سا کھڑا تھا۔ ڈی آئی جی نے آغا جان سے مصافحہ کرنے کے بعد ــ ایک نظر اس کے ساتھیوں پر ڈال کر اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کرتے ہوئے بڑے طنز بھرے لہجے میں آغا جان سے پوچھا۔

"ہوں ــ تو یہ آپ کا منہ بولا بھتیجا ہے۔ یا سچ مچ اصلی ہی ہے۔"

"ہے تو اصلی ہی مگر فرض کی ادائیگی کو رشتوں پر ترجیح دیتا ہے۔ مگر ابھی تو نوآموز ہے۔ مجھے ہتھکڑی پہننے پر مجبور کر رہا تھا۔ ذرا اس سے یہ تو کہیں کہ میرا وارنٹ گرفتاری نکال کر تو دکھائے۔" آغا جان کے طنز بھرے لہجے میں غصہ سا شامل تھا۔ جب کہ وارنٹ گرفتاری شرف کے پاس سرے سے تھا ہی نہیں مگر وہ بالکل نہیں گھبرایا اور بڑے مضبوط لہجے میں ڈی آئی جی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سر! وارنٹ گرفتاری کا موجود ہونا ان حالات میں کوئی ضروری نہیں ہوتا، جن کے تحت میں یہاں تک آیا ہوں۔ اصل میں ان ہی کے گروہ کے ایک آدمی کی نشاندہی پر جو اغوا کے جرم میں ملوث ہے، میں اسمگلروں اور جرائم پیشہ افراد کے اس اڈے پر اپنی پارٹی کے ساتھ چھاپہ مارنے آیا ہوں، اور جو ملزمان رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں، ان کے لیے وارنٹ گرفتاری تیار کرانے کی ضرورت تو نہیں ہوتی۔"

"ہاں ــ وہ تو ٹھیک ہے مگر بلا سوچے سمجھے کسی شریف اور معزز آدمی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا بھی کسی سنگین جرم سے کم نہیں ہوتا۔ جن جرائم پیشہ افراد پر چھاپہ مارنے تم اپنی پارٹی کے ساتھ یہاں آئے ہو، ان کی گرفتاری تمہارے یہاں آنے سے پہلے ہی عمل میں آچکی ہے، اور یہ سب آغا صاحب کے ہی ایما اور حکم پر ہوا ہے۔ سمجھے آپ ڈی ایس پی صاحب!" ڈی آئی جی

کے بجائے آغا جان کے دائیں جانب کھڑے ان کے محافظ نے یہ کہہ کر گویا حقیقت سے آگاہ کیا۔

"او آئی ایم ایکسٹریملی سوری چچا ــ اس کے باوجود بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کے ساتھ مجھ سے جو یہ گستاخی سرزد ہو گئی ہے، اپنے فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں ہی ہوئی ــ اور میں اس کے لیے مجبور تھا۔" ڈی آئی جی اور اپنے سے بڑے اور چھوٹے افسروں کے سامنے بھی شرف یہ بات کہنے سے نہیں چُوکا۔

"بہرحال، لاعلمی کی حالت میں ہوئی، اس لیے تمہیں معاف کیا جاتا ہے۔ ویسے خان جی اگر یہ معاملہ آپ کی پارٹی کی پریسٹیج کا نہ ہو تو میری یہ خواہش ہو گی کہ میرا یہ اپنے اصولوں میں ناقابلِ تسخیر بھتیجا ہی ایکشن لینے میں پہل کرے۔" آغا جان نے شرف کو معاف کر کے ڈی آئی جی کو مخاطب کر کے گویا اسے اجازت دلوائی۔

"ہاں۔ ہاں ود آؤٹ، اینی آبجیکشن۔ یوں بھی یہ دوسری پارٹی بھی اپنی ہی ہے، کم آن ــ ڈی ایس پی شرف آپ اپنا کام شروع کریں۔" اور جواب میں دونوں پیر جوڑتے ہوئے شرف نے ڈی آئی جی کو سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"بہتر جناب جو حکم۔"

"سنو بھتیجے!" آغا جان نے شفقت سے شرف کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جس مہم کو سر کرنے کی غرض سے تم یہاں آئے ہو، اس کی اطلاع مجھے ایک روز پیشتر ہی مل گئی تھی اور میں نے فوری طور پر خان جی سے رابطہ قائم کیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے خدمتگاروں کی مدد سے تمام مجرموں کو پکڑ کر ایوانِ صدر میں قید کر دیا تھا۔ وہ گل شیر خان میرا چھوٹا سوتیلا بھائی ضرور ہے مگر اس کے خون میں اس کی ننھیال کی غدارانہ فطرت شامل ہے ــ اس نے میری محبت اور چھوٹ سے بہت غلط فائدہ اٹھایا۔ لیکن یہ بھی اچھا ہوا کہ اس نے اس جگہ کو اپنے جرائم کا اڈہ بنا ڈالا۔ یہ جگہ جو تم دیکھ رہے ہو، یہاں کبھی میرے فارم تھے، جنہیں دیکھنے تمہاری مرحومہ چچی میرے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اور اس بے چاری کو رمضان کے دنوں ہی میں وہ جان لیوا حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ یہیں مدفون ہے، اور میں نے یادگار کے طور پر یہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اور آج اس بدبخت چھوٹے بھائی نے اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے ہی تمہاری چچی بخت ربانی کے منہ پر تکیہ رکھ کر اس کا سانس گھونٹا تھا۔ اور اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ امید سے تھی بیٹا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے وارث پیدا کر کے اس کا حق غصب کر لے۔ جاؤ بھتیجے وہ اور اس کے تمام ساتھی اندر بند ہیں۔ انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانا اب تمہارا کام ہے۔"

اپنی بات کہتے سمے آغا جان کا وجیہہ چہرہ بے تاثر ضرور تھا مگر ان کی آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ گو شرف پر اس وقت ایکشن لینے کی دھن سوار تھی۔ پھر بھی وہ چچا کی مختصر سی داستانِ غم سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

سب کچھ پہلے سے ہی تیار تھا۔ یعنی عمارت میں موجود سارے جرائم پیشہ افراد پہلے سے ہی باندھ کر ڈال دیے گئے تھے، شرف۔ ایس ایچ او۔ دو ہیڈ کانسٹیبل اور پولیس کی دوسری پارٹی کے اے ایس آئی اور چند کانسٹیبل ان سب کو چند منٹ بعد ہی باہر نکال لائے، اور باہر کھڑی قیدیوں کی دونوں گاڑیوں میں جو دونوں پارٹیاں اپنے ساتھ لائی تھیں۔ پولیس کے سپاہیوں کی کڑی نگرانی میں اندر بھر دیے گئے۔ ان جرائم پیشہ افراد میں غزل سمیت پانچ عورتیں بھی شامل تھیں، مگر فہد غزل کو پہچانتا تھا نہ شرف۔

اِدھر یہ کارروائی عمل میں لائی جا رہی تھی۔ آغا صاحب۔ ڈی۔ آئی۔ جی سے باتیں کرتے ہوئے کہیں اندر چلے گئے تھے، اور شرف ابھی اندر سے برآمد نہیں ہوا تھا۔ اور ادھر فہد ابھی تک اسی جگہ کھڑا جہاں وہ شرف وغیرہ کے ساتھ آکر کھڑا ہوا تھا، بڑے مضطربانہ سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ آغا صاحب کی یہاں موجودگی کا عقدہ بھی کھُل گیا تھا اور پولیس کی کارروائی بھی بلا کسی دشواری کے مکمل ہو گئی تھی۔ مگر سعد کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا تھا۔ جبکہ وہ بھائی کی ہی لگن اور جستجو میں یہاں آیا تھا۔ اور اسے اس کے بارے میں جاننے کی پڑی تھی مگر پوچھتا کس سے۔

شرف ابھی اندر ہی کہیں مصروف تھا۔ اور ایس ایچ او۔ کچھ فاصلے پر کھڑی قیدیوں کی گاڑیوں کے قریب سپاہیوں میں گھرا کھڑا تھا۔ اور ابھی فہد سوچ ہی رہا تھا کہ بھائی کے بارے میں کس سے معلوم کرے۔ کس سے پوچھے کہ وہ کہاں ہے، کہ کچھ ہی دیر بعد آگے آگے دو آدمی ایک اسٹریچر پر کسی کو ڈالے اور ان کے پیچھے شرف باہر آتے نظر آئے۔ شرف

نے باہر آتے ہی اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا تو فہد بھاگنے کے سے انداز میں اس کے پاس جا پہنچا۔ اصل میں اسٹریچر پر کسی کو پڑا دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اسی خیال سے وہ سعد ہی ہے۔ اور وہ شرف کے قریب پہنچ کر اسٹریچر کی طرف مڑا ہی تھا کہ شرف نے اس کا بازو پکڑ کر اسے وہیں روکتے ہوئے کہا۔

"یہ وہی لڑکی ہے جو رقیہ کی حرص و ہوس کا شکار بنی تھی۔ بے چاری کل سے بے ہوش ہے، نامعلوم ان بدمعاشوں نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے، اس لیے آغا جان اسے سول ہاسپٹل میں، ایڈمٹ کرا رہے ہیں۔" اور شرف کی اس بات پر ایک باطل سے خیال نے فہد کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ مگر اس نے شرف سے ایک لفظ نہ کہا۔ بلکہ دل ۔ میں اس بات پر شکر کیا کہ شرف اس بات سے لاعلم ہے کہ عنبر سے اس کی کچھ رشتے داری ہوتی ہے۔ اور پھر اسے تو صرف اپنے بھائی کے متعلق جاننے کی پڑی تھی۔ بلا توقف کیے اس نے بڑے سراسیمگی کے عالم میں پوچھا۔

"مگر۔ مگر بھائی جان کو کہاں چھپا رکھا ہے ان لوگوں نے، وہ تو کہیں نظر ہی نہیں آ رہے۔ میں نے تو ان بدمعاشوں کے ٹولے میں بھی ایک ایک کی شکل دیکھ لی ہے، کہیں خدانخواستہ ان لوگوں نے انہیں"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں دوست، بھائی جان اندر آرام کر رہے ہیں۔ مگر ابھی وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ تم سے کھل کر بات کر سکیں۔"

"کیوں۔ خیر تو ہے۔ آخر انہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم صاف صاف کیوں نہیں بتلاتے۔" فہد نے بے تابانہ سے انداز میں پوچھا۔

"بھئی فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ان مردودوں نے بھائی جان کا بایاں بازو زخمی کر دیا تھا۔ اس کے بعد۔ سیدھی ٹانگ بھی زخمی کر دی، تفصیلات تو ابھی تک معلوم ہی نہیں ہو سکیں۔ ویسے وہ آؤٹ آف ڈینجر ہیں اور بس یہی بات تمہارے لیے بڑی خوش آئند ہے۔" شرف نے قدرے عجلت میں کہا اور پھر یہ کہتا ہوا ان آدمیوں کی طرف بڑھ گیا جو اسٹریچر کو اٹھائے کافی آگے نکل گئے تھے۔

"جاؤ اندر جو دائیں سمت پہلا کمرہ ہے، اس میں چلے جاؤ۔" اور فہد نے بھی پھر اندر جانے میں تامل نہیں کیا وہ بھاگنے کے سے انداز میں سیدھا اس کمرے میں جا پہنچا۔ جو کافی آراستہ تھا اور جس کے وسط کے انتہائی سرے پر بچھی مسہری پر سعد آنکھیں بند کیے نڈھال سا پڑا تھا۔ فہد بے تابانہ اس کی طرف بڑھا اور اس پر جھک کر بڑی بے قراری سے بولا۔

"بھائی جان۔ بھائی جان یہ آپ کو کیا ہو گیا۔ یہ کس نے آپ کو ان حالوں کو پہنچایا ہے۔ خدارا ہوش میں آئیے۔ مجھے تو امید ہی نہیں تھی کہ آپ زندہ سلامت مجھے مل جائیں گے۔ مگر آپ تو۔ آپ تو۔"

فہد کا گلا رندھ گیا۔ اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اس سے مزید کچھ بولا نہ گیا۔ مگر سعد جو ہوش میں تھا۔ اور اپنی تکلیف اور کمزوری کی وجہ سے نڈھال سا پڑا تھا۔ اس نے بھائی کے آنسوؤں اور بے کل سے لب و لہجے پر کوئی توجہ نہیں دی اور آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"عنبر کہاں ہے فہد۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے، جلدی بتاؤ فہد کہیں وہ ان درندوں کے انتقام کی بھینٹ تو نہیں چڑھ گئی۔ جاؤ فہد غزل سے جا کر پوچھو کہ اس نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔ جاؤ جلدی کرو۔"

تب فہد کا جی چاہا کہ بھائی کو عنبر کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ یا پھر وہ سب بتا دے جو شرف کی باتوں سے اس نے اخذ کیا ہے مگر بھائی کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں تھی اور حالت بھی کچھ اتنی خستہ تھی کہ اسے یہ بات بھائی سے چھپانی ہی پڑی۔ وہ سعد کو اطمینان دلانے کی غرض سے بولا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔ عنبر تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آغا صاحب نے انہیں صبح سویرے ہی ان کے گھر بھجوا دیا ہے۔ ان کی طرف سے تو آپ اطمینان ہی رکھیے۔"

"آغا صاحب؟ کون آغا صاحب۔ آخر تم کس کی بات کر رہے ہو۔ یہاں تو سب شیطان اور درندے ہی ہیں۔ وہ غزل

کے پاس فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی، میں اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک چلا آیا تو ان درندوں نے میرے اوپر گولیوں کی باڑ پھینکی۔ اور میرا دایاں بازو زخمی ہو گیا۔ پھر انہوں نے مجھے نشہ آور زہریلا انجکشن لگانا چاہا۔ اور میرے انکار پر میری، بائیں ٹانگ بھی توڑ دی اور پھر مجھے یہاں اس کمرے میں ڈال کر کہیں غائب ہو گئے۔

سعد نقاہت بھرے لہجے میں کراہ کراہ کر بولا۔ تب فہد کو اسے ساری بات بتانی پڑی کہ اصل قصّہ کیا تھا۔ اور آغا صاحب نے ان سب کو گرفتار کرا کر ان کے ناپاک وجود سے اس جگہ کو پاک کر دیا ہے۔" ابھی فہد نے بات ختم ہی کی تھی کہ تبھی دو سپاہیوں کی ہمراہی میں ایک اے ایس آئی نے اندر داخل ہو کر اس سے کہا۔

"سر ڈی ایس پی صاحب نے کہلوایا ہے کہ آپ اپنے بھائی کو لے کر فوراً باہر آ جائیں کیونکہ گاڑیاں کوچ کے لیے تیار کھڑی ہیں۔"

"مگر بھائی جان تو ہل جل بھی نہیں سکتے، پھر میں ان کو لے کر باہر کیسے جا سکتا ہوں۔" فہد نے بھائی کے قریب سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر اسٹریچر تو ہم ساتھ لے کر آئے ہیں، اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔" اے ایس آئی بولا اور پھر اس نے دونوں سپاہیوں کو اسٹریچر اندر لانے کے لیے کہا۔ دونوں نے فوراً حکم کی تکمیل کی۔ اور بڑی احتیاط سے سعد کو اسٹریچر پر لٹا کر سب باہر نکل آئے۔

پھر فہد بھائی کو گھر لے جانے کے بجائے سیدھا کلفٹن کے ایک بڑے ہاسپٹل میں لے آیا۔ اور اسے وہاں داخل کرا دیا۔ اسے اگر کوئی فکر تھی تو یہی کہ اب پولیس اس کا بیان لینے ہسپتال آ کر بار بار اسے پریشان کرے گی۔ مگر شرف نے یہ کہہ کر اس کی پریشانی دور کر دی کہ یہ اسمگلروں اور جرائم پیشہ افراد کا کیس ہے۔ اور اس کی نوعیت بالکل دوسری ہی ہے۔ اور فی الحال بھائی جان کا بیان لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

گولی سعد کے بازو کے گوشت میں پیوست ہوئی تھی اور ہڈی صاف بچ گئی تھی۔ اور گولی کو تو ان ظالموں نے فوراً ہی نکال دیا تھا۔ مگر زخم چونکہ گہرا تھا اس پر ڈھنگ سے مرہم پٹی بھی نہیں کی گئی تھی اس لیے بڑی تکلیف دے رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر سے انجکشن نہ لگوانے پر مزاحمت کرنے کی وجہ سے زخمی ہاتھ پر بہت زور پڑا تھا۔ اور اس مزاحمت کے نتیجے میں ڈاکٹر نے غصے میں آ کر ——— قریب ہی پڑا لکڑی کا ایک ٹھوس تختہ اتنی زور سے اس کے گھٹنے پر مارا تھا کہ گھٹنے کی ہڈی اپنی جگہ سے نہ صرف کھسک گئی تھی بلکہ کھال بھی، اس بری طرح لپٹ گئی تھی کہ ایک گہرا سا زخم بن گیا تھا۔ اور اس پر یہ ستم اسی شب توڑا گیا تھا۔ جس روز اس نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے سرنج لے کر دور پھینکی تھی۔ اس وقت تو۔ نامعلوم ڈاکٹر کس سے خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا تھا مگر رات کو پھر آیا تو اتنی بڑی چوٹ دے گیا تھا۔

بہر حال۔ تقریباً بارہ روز تک ہسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد سعد اس قابل ہو گیا تھا کہ تھوڑا سا چل پھر سکے۔ بازو کا زخم ابھی پوری طرح مندمل تو نہیں ہوا تھا مگر وہ ناقابلِ برداشت درد اور تکلیف جاتی رہی تھی۔ اور وہ ہاتھ ہلانے کے قابل ہو گیا تھا۔ فہد تو چاہ رہا تھا کہ وہ مزید چند روز ہسپتال میں گزار دے، لیکن سعد کو اب ہسپتال کے ماحول سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ اس لیے وہ ضد کر کے گھر چلا آیا تھا۔ سعد ہسپتال میں تھا تب بھی متعدد بار فہد سے عنبر کے متعلق پوچھ چکا تھا کہ وہ کیسی ہے۔ حتیٰ کہ فہد سے یہ بھی کہہ چکا تھا کہ وہ اس کے گھر جا کر اس کی خیر خبر لے اور دیکھے کہ وہ کن حالات سے دوچار ہے۔ مگر فہد اپنی مصروفیت کا بہانہ کر کے ٹال گیا تھا۔ یوں بھی فہد ان دنوں بہت مصروف رہا تھا۔ ادھر بھائی کی تیمارداری اور دیکھ بھال ادھر فیکٹری اور شوروم کا تمام نظم و نسق سنبھالنا کہ اب رقیہ بھی نکال دی گئی تھی۔ اور اپنے ملازمین پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ اور سعد بھی دیکھ رہا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی کس قدر مصروف اور اس کی طرف سے متفکر ہے، مگر جب سعد ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آیا تو اگلے ہی روز فہد کے سر ہو گیا کہ وہ عنبرین کے یہاں جائے اور عذیر کو کسی طرح اس کے پاس لے آئے۔

اور تب بہت مجبور ہو کر فہد نے وہ ساری بات سعد کو بتا دی جو اس نے شرف کی باتوں سے اخذ کی تھی۔ جسے سن کر سعد کچھ دیر کے لیے سناٹے میں آ گیا۔ اور پھر اس نے کہا تو شاکی سے انداز میں صرف اتنا کہا۔

"لیکن یہ بات تم نے اب تک مجھ سے کیوں چھپائی۔ مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے رہے کہ وہ گھر میں ہے اور بالکل

ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"بتا کر سوائے آپ کو دُکھ دینے کے اور تو کچھ حاصل نہیں ہوتا نا بھائی جان۔ اور اب تو وہ کسی قابل ہی نہیں رہی۔" فہد بھائی کے شاکی سے انداز پر چڑ کر بولا۔

"خیر، یہ ایک علیحدہ بات ہے لیکن۔ یہ جو کچھ بھی تم نے بتایا ہے اس پر میرا دل یقین کر لینے کو آمادہ ہی نہیں ہو رہا۔ اور اگر یہ خدانخواستہ سچ بھی ہے تو پھر وہ اب اس دنیا میں رہی ہی نہیں ہوگی۔ ہسپتال میں دو مرتبہ شرف مجھے دیکھنے آیا۔ تو کیا تم نے اس سے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا۔"

"نہیں بھائی جان۔ میں چھوٹا ضرور ہوں مگر تھوڑی بہت عزت ضرور رکھتا ہوں۔ میں آخر کس حوالے سے ایک ایسی لڑکی کے بارے میں شرف سے پوچھتا جو اس کے علم میں تو میرے لیے بالکل غیر اور غیر واسطہ ہی تھی۔"

فہد بھائی کی باتوں پر جل کر بولا۔ اس نے جان کر عزت کا لفظ استعمال کیا تھا۔ مگر بھائی پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ کہ بھائی نے جواب میں کہا بھی تو کیا۔

"خیر اگر وہ شرف کی نظر میں تمہارے لیے غیر بھی تھی تب بھی پوچھنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔"

فہد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تھکا ہارا شوروم سے آیا تھا اس لیے لباس تبدیل کرنے غسل خانے میں گھس گیا۔ مگر سخت کوفت کے عالم میں سوچتا رہا کہ بھائی جان کو آخر عنبر میں ایسی کیا خوبی نظر آئی جو وہ اس کے گرویدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر وہ خوبصورت ہے بھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ زمانے کا سارا حُسن اس پر ختم ہو کر رہ گیا ہو۔ دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر حسین صورتیں ہیں۔ جو حیثیت اور تعلیم کے لحاظ سے بھی عنبر سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ اور عنبر کی حیثیت تو اب جھوٹے دونے کی سی ہی رہ گئی ہے۔ اس کے باوجود بھی بھائی جان اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ کیا بھائی جان نے اپنی عزت بھی اس کے ہاتھوں نیلام کر دی ہے۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جو وہ اپنے عزیز از جان بھائی سے دل میں ایک کبیدگی سی محسوس کر رہا تھا۔

ایک تحقیر آمیز کدورت سی بھر گئی تھی اس کے سارے وجود میں اس کے خلاف۔

اس دوران میں ایک ماہ سے بھی کچھ زائد عرصہ گزر گیا تھا۔ سعد پہلے سے بہت بہتر ہو گیا تھا۔ بازو کا زخم تو بالکل مندمل ہی ہو گیا تھا۔ البتہ گھٹنے کی چوٹ تھوڑی سی چیک ضرور دیتی تھی۔ وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ چل پھر سکے۔ حتیٰ کہ کار بھی ڈرائیو کر سکے۔ مگر وہ گوشہ نشینی کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جس دن سے اس نے فہد کی زبانی عنبر کے اُجڑنے کی خبر سُنی تو اس روز سے وہ کچھ ایسا بجھ سا گیا تھا جیسے اس دنیا کی کسی چیز سے بھی دلچسپی نہ رہی ہو۔ گو اس روز کے بعد سے فہد کے سامنے وہ عنبر کا نام بھی زبان پر نہ لایا تھا مگر فہد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بھائی نے محض عنبر کے غم میں ہی ایک دنیا تیاگ رکھی ہے۔ وہ بھی بھائی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ اور اس کے سامنے یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ بہت مصروف رہتا ہے۔

پولیس ملزمان کا ایک ہفتے کا ریمانڈ لینے کے بعد فوراً ہی چالان پیش کر چکی تھی۔ اور چونکہ وہ سب قانون کے مجرم تھے، اس لیے عدلیہ ان پر مقدمہ چلانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ شرف اس روز بڑے دن بعد فہد سے یہ پوچھنے اس کے گھر آیا تھا کہ تھانے میں سعد کے اغوا کی جو رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔ اس کیس کی پیروی کرنے کے لیے وہ اپنا کوئی وکیل مقرر کرے گا یا۔ خود شرف اس کے لیے کسی اچھے اور قابل وکیل کا بندوبست کر دے۔ تب فہد کے کچھ کہنے سے پہلے سعد نے یہ کہہ کر سارا قصہ ہی ختم کر دیا۔

"نہیں نہیں کسی وکیل کا بندوبست کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر فہد نے بے وقوفی میں میرے اغوا کی رپورٹ بھی درج کرائی تھی تو یہ اغوا کا کیس نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا۔ بلکہ میں خود اس لڑکی کا پیچھا کرتا ہوا بھیڑیوں کے اس بھٹ میں گھس گیا تھا۔"

"کس لڑکی کا بھائی جان؟" شرف نے لڑکی کے لفظ پر چونک کر پوچھا۔ تو سعد بات کہہ کر سٹپٹا سا گیا۔ وہ بھی عنبر کے ذکر

کو بیچ میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ جلدی سے عذر تراش کر بولا۔

"وہی۔ بگل شیر کی بہن غزل کا۔" اور اس کی اس بات پر شرف نے کچھ ایسی مُسکراتی ہوئی معنی خیز نظروں سے فہد کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، لو تمہارے بھائی بھی لڑکیوں کا پیچھا کرنے لگے۔

"بھئی اصل میں بھائی جان نے خود اپنی آنکھوں سے غزل کو زبردستی ایک لڑکی کو اپنی کار میں بٹھا کر ایک ویرانے کا رُخ کرتے دیکھا تھا۔ بس ان کی بھی غیرت ایمانی جوش میں آ گئی اور یہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے۔ اور یہاں ہماری جان پر بنا دی۔" فہد نے جلدی سے بھائی کی پوزیشن صاف کی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اغوا کی رپورٹ کا تو عدلیہ کے رجسٹر میں اندراج بھی ہو چکا ہے۔" شرف بولا۔

"اگر ہو بھی چکا ہے تو اُسے کاٹا یا مٹایا بھی جا سکتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو بھی خود تحریری بیان دے دوں گا کہ میرے بھائی نے نافہمی کی بنا پر غلط رپورٹ درج کرائی تھی۔"

سعد نے کچھ اس قدر سنجیدہ ہو کر کہا کہ جواب میں شرف صرف کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ اور پھر آہستہ سے اس نے فہد سے کہا۔

"یہی کچھ وہ لڑکی بھی کہہ رہی تھی۔"

"کون لڑکی؟" فہد نے جس کا ذہن ابھی اس معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ بے دھیانی میں پوچھا۔

"وہی جسے تم نے اسٹریچر پر پڑے دیکھا تھا۔" شرف نے بتایا۔ اور فہد نے بُری طرح چونک کر پہلے بھائی کی طرف دیکھا۔ اور پھر شرف کی طرف جھک کر آہستہ سے پوچھا۔

"تو کیا وہ ابھی تک زندہ ہے۔ میرا مطلب ہے اس کی کنڈیشن تو بڑی سیریس تھی۔ بے ہوش — تھی نا وہ اس وقت۔"

"ہاں تھی تو۔ مگر۔" شرف نے قدرے ہچکچاہٹ سے کام لے کر کہا اور پھر قدرے توقف کر کے بولا۔

"یار بعض اوقات انسان اپنی بے خبری اور غلط اندازوں سے اتنی غلط بات کہہ جاتا ہے کہ پھر اس کا نبھانا اس کے لیے مشکل ہی ہو جاتا ہے۔"

"یہ ڈی ایس پی ہو کر جو بھی فلسفہ جھاڑ رہے ہو۔ میری یہ موٹی سی عقل اسے سمجھنے سے بالکل قاصر نظر آ رہی ہے۔" فہد کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی بات میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش میں کہا۔

"بھئی میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی لاعلمی میں بلا سوچے تھے جو کچھ بھی اس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا وہ محض بکواس ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ ہم نے اس کا میڈیکل چیک اپ بھی کرایا۔ لیڈی ایم پی آئی (میڈیکل پولیس انچارج) سے اس کا معاینہ بھی کرایا۔ مگر ضربات کا کوئی نشان تو کیا اس کے جسم پر ایک ہلکی سی خراش تک نظر نہیں آئی۔ اور اس کے ہوش میں آنے کے بعد اس کی بے ہوشی کے متعلق یہی معلوم ہوا کہ اغوا کے وقت وہ روزے سے تھی۔ اور چار دن تک مسلسل بھوکی پیاسی رہنے۔ اور انتہائی دہشت و خوف کی وجہ سے اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ بروقت طبی امداد مل گئی ورنہ بے ہوشی کا عرصہ کچھ اور طویل ہو جاتا تو وہ اسی حالت میں اللہ کو پیاری ہو جاتی۔ ویسے یار وہ ہے واقعی بہت خوبصورت، بلکہ خوبصورتی کے علاوہ بھی اس کے اندر کوئی ایسی کشش، ایسی خصوصیت ہے جو دیکھنے والے کا دل اپنی طرف کھینچتی محسوس ہوتی ہے۔"

فہد جو نہ جانے کس طرح دل پر جبر کر کے عنبر کے بارے میں یہ ساری تفصیل سُنتا رہا تھا۔ شرف کے آخری فقروں پر ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

"یار اس کا مطلب ہے کہ پھر تو بالکل ہی کام سے گئے۔ کیا واقعی اس کے بارے میں سیریس ہو گئے ہو۔"

"نہیں میرا حرم رکھنے کا تو دور تک بھی ارادہ نہیں۔ پہلے ہی ایک بیوی اور تین بچوں کی بھاری ذمہ داری کا بوجھ اس جانِ ناتواں پر اُٹھائے پھر رہا ہوں۔ ویسے سوچنے کے لیے تمہیں ضرور موقع دیتا ہوں۔ اب یہ تمہاری مرضی کہ۔ گر قبول افتد۔"

شرف نے یہ بات محض مذاق میں گویا اس پر لوٹائی تھی مگر فہد کا منہ اُتر گیا۔ اور وہ جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا

کہ سعد نے جو نمعلوم کیا سوچ رہا تھا اپنی محویت سے چونک کر شرف سے پوچھا۔
"یہ کس کا ذکر خیر ہو رہا ہے بھئی؟"
"کسی کا بھی نہیں بھائی جان! اس شرف کی تو عادت ہی چٹکلے چھوڑنے کی ہے۔"
"ارے بھئی یہ تم بھائی جان سے ہر بات کیوں چھپاتے ہو فہد۔" شرف نے ایک غلط بات کہنے پر گویا فہد کو گھُورا اور پھر سعد سے مخاطب ہو کر بولا۔
"بھائی جان میں اس لڑکی کی بات کر رہا تھا۔"
"کس لڑکی کی؟" سعد نے پوری بات سُننے سے پہلے ہی پوچھا۔
"وہی جسے کل شبیر نے اغوا کرایا تھا۔" اور سعد نے بُری طرح چونک کر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔
"اچھا۔ اچھا مگر کہاں ہے وہ لڑکی؟"
"آج کل تو ایک دارالامان میں رہ رہی ہے۔ مگر کیا آپ اس سے واقف ہیں؟" شرف نے قدرے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں۔ نہیں۔ مگر کون سے دارالامان میں ہے وہ؟ میرا مطلب ہے کیا نام ہے اس دارالامان کا۔ اور وہ کس علاقے میں واقع ہے؟" سعد کے لہجے سے عیاں بے تابی نے شرف کو تجسس میں مبتلا کر دیا۔ پوچھنے کے لیے کتنے ہی سوالات اس کے ذہن میں آئے مگر وہ پوچھ نہ سکا۔ بلکہ تجسس اور تعجب کی کیفیت میں گھرے گھرے اس نے سعد کو اس دارالامان کا نام اور پتا بتا دیا۔ جبکہ فہد اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا کہ بھائی کے سامنے شرف کو پتا بتانے سے باز رکھ سکتا تھا۔ نہ کوئی معقول بہانا ہی تراش سکتا تھا۔ بڑی بے زاری سے اٹھتا ہوا شرف سے بولا۔
"اچھا شرف تم بیٹھ کر بھائی جان سے باتیں کرو۔ اور مجھے اجازت دو۔ میرا اس وقت کسی سے ایک اہم اپائنٹمنٹ ہے۔"
"ارے نہیں۔ تمہارا تو صرف اپائنٹمنٹ ہی ہے اور میری تو ڈیوٹی کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ ٹھہرو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ اچھا بھائی جان۔ اب مجھے اجازت دیں، پھر کسی روز حاضر ہو جاؤں گا۔" شرف نے بھی اُٹھتے ہوئے کہا۔ اور پھر دونوں باہر نکل گئے۔

"ارے ہاں بھائی جان کی باتوں میں میں پوچھنا بھول ہی گیا۔ وہ تم کیا کہہ رہے تھے اس لڑکی کے بارے میں۔" شرف کے ساتھ باہر کا رخ کرتے ہوئے فہد کو معًا کچھ یاد آیا تو اس نے کہا۔
"کس لڑکی کے بارے میں؟" شرف کا ذہن شاید اپنے کسی کیس میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے خیالوں سے چونک کر پوچھا۔
"بھئی اسی مس یونیورس کے بارے میں جس کی تعریف میں ابھی کچھ دیر پہلے تم رطب اللسان تھے۔" فہد سمجھا وہ تجاہل سے کام لے رہا ہے۔
"اچھا اچھا اس مہ جبیں کی بات کر رہے ہو تم۔" شرف تھوڑا سا مسکرا کر بولا۔
"ہاں اسی کی۔ تم کہہ رہے تھے نا کہ وہ بھی یہی چاہ رہی ہے جو بھائی جان چاہ رہے ہیں۔ بھئی وہی بیان دینے کا۔" فہد قدرے چڑ کر بولا۔
"او ہاں۔ مگر اس کا معاملہ یکسر دوسرا ہی ہے۔ وہ چونکہ ایک شریف اور مظلوم لڑکی ہے اس لیے اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی وہ کچہری عدالت کے چکروں میں پڑے اور سب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اغوا کیے جانے کی تصدیق کرے۔ وہ کہتی ہے کہ اب تو سارا معاملہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ تو اس کا بیان لینے کی ضرورت ہی کہاں رہی ہے۔ وہ تو یہ بھی کہتی ہے کہ آپ رقیہ کو معاف ہی کر دیں ورنہ بہت سی غلط باتیں منظرِ عام پر آئیں گی یعنی اس کے اغوا کے بارے میں غلط سلط باتیں مشہور ہوں گی تو وہ کسی کو منہ دکھلانے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔" شرف نے تفصیل سے بتایا۔
"اچھا تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟" فہد نے پوچھا۔
"بھئی میرا ارادہ کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو عدالت میں مقدمہ درج کر ہی لیا گیا ہے۔ ہاں البتہ اگر آغا جان چاہیں تو اس بار معاملہ ٹل بھی سکتا ہے۔ اور میں نے سوچا ہے کہ اب میں اس مسئلے کو آغا جان کے سامنے رکھوں گا۔ اور جیسا وہ کہیں وہی کروں گا۔" شرف نے جواب میں کہا اور پھر اس سے مصافحہ کر کے اپنی جیپ میں جا بیٹھا۔ کیونکہ جب وہ آن ڈیوٹی

ہوتا تھا تو ہمیشہ جیپ ہی استعمال کرتا تھا۔

”ہاں مگر میرے خیال میں تو اسے اس مقدمے میں نہ ہی الجھاؤ تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے وہ کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔“ فہد نے جو اس کے ساتھ جیپ تک چلا آیا تھا گویا اپنی رائے پیش کی۔

”ہوسکتا ہے ہی نہیں بلکہ وہ ہے ہی ایک شریف گھرانے کی لڑکی۔ رقیہ نے اس کے بارے میں مجھے سب کچھ بتادیا ہے کہ وہ پڑھی لکھی ہے اور تمہاری فیکٹری میں کچھ عرصے کام کرچکی ہے۔“ شرف نے بڑے جتانے والے انداز میں کہا۔ اور پھر جیپ اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا لی اور فہد دہم سا کھڑا رہ گیا۔

آغا محمد سکندر بخت عرف گل جان ایک متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے اور تھوڑی سی جائیداد اور اراضی کے مالک بھی۔ آباؤ اجداد سمور اور پشمینے کا کام کرتے تھے تعلیم سب کی واجبی سی تھی۔ کنبہ اتنا وسیع نہیں تھا۔ خاندان میں اگر لڑکیوں کی کمی تھی تو لڑکوں کی بھی افراط نہیں تھی۔

وہ دو بہن بھائی تھے اور ان کے چچاؤں کے یہاں بھی اولاد کا کچھ یہی حساب کتاب تھا۔ بہن ان سے عمر میں دو سال بڑی تھی اور عنفوانِ شباب میں زچگی کے دوران میں انتقال کرگئی تھی۔ خاندان میں تعلیم کا اتنا چرچا نہیں تھا لیکن گل جان کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ جسے والد کی مخالفت کے باوجود انہوں نے پورا کرکے ہی چھوڑا۔ پہلے پشاور کے ایک کالج سے بی۔ اے کی سند لی اور پھر گومل یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔

والدین چاہتے تھے کہ خاندان کے رواج کے مطابق ان کی شادی نوعمری میں کردی جائے۔ مگر پڑھ لکھ جانے کی وجہ سے ان کے خیالات میں چونکہ تبدیلی آگئی تھی اس لیے وہ شادی کے مسئلے کو ہمیشہ ٹالتے ہی رہے تھے۔ وہ تو زمیندار خاندان کی ایک لڑکی زرمینہ۔ زندگی کے ایک حسین موڑ پر اچانک ان سے آٹکرائی تو انہوں نے شادی کے لیے رضامندی دے دی۔ والدہ ان کے بچپن میں ہی انتقال کرگئی تھیں۔ اسی لیے والد نے عقدِ ثانی کرلیا تھا۔ جب کہ خاندان والے اس نکاح کے خلاف ہی تھے۔ کیونکہ جن لوگوں کی انہوں نے لڑکی لی تھی ان لوگوں کے متعلق عرصے سے یہی مشہور تھا کہ ان کے خون میں غداری شامل ہے اور وہ ہمیشہ دھوکا ہی دیتے ہیں اور ہوا بھی کچھ یہی تھا۔ سوتیلی ماں کے بطن سے جنم لینے والا بیٹا گل شیر خان سترہ برس کا ہوا تو اس کی ماں نے اپنے بھائیوں کی شہہ پر آغا جان کے والد سے جائیداد میں اس کا حصہ الگ کردینے کا مطالبہ کیا۔

اس مطالبے نے پورے خاندان میں ایک کھلبلی سی مچادی کیونکہ باپ کی زندگی میں ان کے یہاں جائیداد کا بٹوارہ کرنے کا دستور ہی نہ تھا۔ بلکہ باپ کے بعد جائیداد کا نظم و نسق بڑا بیٹا سنبھالتا تھا اور جب بڑا بیٹا مرجاتا تب چھوٹے بھائی کی تحویل میں یہ ساری جائیداد چلی جاتی تھی۔ جب کہ ادھر باپ بھی زندہ تھا اور بڑا بھائی بھی۔ اس بات پر خوب لے دے ہوئی جو بعد میں جھگڑے کی شکل اختیار کرگئی۔

گل شیر کی ماں شوہر سے روٹھ کر میکے جابیٹھی۔ پھر یہ قضیہ اتنا بڑھا کہ دونوں خاندان آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ گل شیر کی ماں بھائیوں کے ورغلانے سے جانے کو میکے تو چلی گئی تھی مگر تھوڑے عرصے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ادھر اس کا دل بیٹے اور شوہر کے بغیر کسی طرح میکے میں لگتا ہی نہ تھا۔ ایک دن بھائیوں سے جھگڑا کرکے شوہر کے پاس جانے کی غرض سے چپکے سے میکے سے فرار ہوگئی۔ بھائیوں کو خبر ہوئی تو وہ اسے پکڑنے کے لیے بھاگے اور راستے میں ہی اسے جالیا۔ اور اپنے ساتھ واپس چلنے کا مطالبہ کیا۔ مگر اس نے سختی سے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ اس بات پر مشتعل ہوکر بڑے بھائی نے اس کے گولی ماردی اور اسے زخمی حالت میں وہیں چھوڑ کر دونوں بھائیوں کے ساتھ فرار ہوگیا۔

اتفاق سے آغا جان کے گاؤں کا ہی ایک آدمی اس لمحے اُدھر سے گزر رہا تھا۔ گل جانہ کو زخمی حالت میں اور بے ہوشی کے عالم میں اس بیابان میں پڑا دیکھا تو اپنے خچر پر ڈال کر اسے اس کے شوہر کے پاس لے آیا۔ تب گاؤں کے ہی ایک ماہر طبیب نے بڑی کوشش کی کہ گل جانہ کی جان بچ جائے لیکن اس کا خون اتنا زیادہ بہہ گیا تھا کہ وہ جانبر نہ ہوسکی۔ البتہ دواؤں وغیرہ کے اثر سے جب تھوڑا سا ہوش آیا اور شوہر نے پوچھا کہ اسے کس نے گولی ماری ہے تو اس نے اپنے بڑے بھائی کا نام بتادیا کہ وہ اس کی اور بیٹے کی محبت میں گھر سے فرار ہوئی تھی تو اس کا یہ انجام ہوا۔

یوں تو وہاں انتقام لینا ایک شان اور ایک دستور سا تھا مگر آغا جان کا باپ ان دنوں گٹھیا کے مرض میں مبتلا تھا اور اس سے چلا پھرا بھی نہیں جاتا تھا۔ ویسے بھی وہ خاصا ضعیف ہوگیا تھا۔ اس لیے گل شیر نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے ماموں سے اپنی ماں کے خون کا بدلہ ضرور لے گا۔ لیکن ہوا یوں کہ کچھ عرصے بعد ناجائز اسلحہ لے جاتے ہوئے پولیس فائرنگ سے اس کا ماموں خود ہی ہلاک ہوگیا۔

ادھر اس دوران میں گل جان نے شروع ہی سے گل شیر کو پڑھائی پر لگادیا تھا۔ میٹرک کے فوراً بعد ہی کالج میں داخل کرادیا۔ اور پھر کچھ عرصے بعد والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ سوائے گل جان کے چھوٹے بھائی کے گل جان کا اب کوئی قریبی رشتہ دار بھی گاؤں میں نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ خود بھی مستقل رہائش کی غرض سے پشاور چلا آیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی چھوٹے بھائی پر جان چھڑکتا تھا۔ اس نے کبھی گل شیر پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس کا ماں جایا نہیں ہے یا سوتیلا بھائی ہے۔ گل شیر کو بھی اس سے بڑی انسیت تھی بلکہ انسیت سے زیادہ وہ شروع ہی سے اس سے بہت ڈرتا تھا۔ کالج میں داخلہ لینے کے بعد شہر کی ہوا لگی اور ایک نئی دنیا اسے اردگرد نظر آئی تو وہ اپنی روایات اور رسم و رواج سب کچھ بھول گیا۔

یوں بھی وہ ہمیشہ سے لاابالی اور لاپروا سا تھا۔ ہر ماہ ایک معقول رقم ہاتھ خرچ کو ملتی تھی۔ بس اسے اور کیا چاہیے تھا۔ اس پر فطرت بھی کچھ عیاش سی تھی۔ بس اپنے ہی چفندوں میں مگن رہتا تھا۔ ادھر گل جان کی شادی کو پانچ برس ہوگئے تھے مگر بیوی کی کوکھ اب تک ہری نہیں ہوئی تھی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ کسی بڑے شہر جاکر بیوی کا اور اپنا علاج کراؤ تو وہ پشاور کی رہائش چھوڑ کر کراچی چلا آیا۔

کراچی میں چونکہ مستقل سکونت اختیار کرنے کی غرض سے آیا تھا اس لیے اس نے اپنی زمینیں فروخت کرکے کراچی کے ایک نواحی علاقے میں فارمز خرید لیے تھے۔

بیوی کا علاج بھی دو برس تک مسلسل لگ کر کراتا رہا تھا۔ مگر ہنوز کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ یوں بھی کراچی کی آب و ہوا زرمینہ کو راس نہیں آئی تھی۔ اس لیے وہ اسے لے کر پھر پشاور چلا گیا تھا۔ مگر گل شیر خان کراچی چھوڑ گیا تھا تاکہ اس نے جو فلمیں ڈسٹری بیوٹ کرنے کا کام شروع کیا تھا وہ اسے چلاتا رہے۔ پھر کچھ روز بعد ہی زرمینہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ اور چند ہی روز میں وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ کیونکہ استفراغ کی بیماری نے اس کا برا حال کردیا تھا۔ گل جان زرمینہ کا دیوانہ تھا۔ اس کا علاج کرانے کی غرض سے پھر اسے لے کر کراچی چلا آیا۔ کراچی آکر زرمینہ کا میڈیکل چیک اپ کرانے کے بعد یہ مژدہ جانفزا اسے سننے کو ملا کہ زرمینہ امید سے تھی اور اسے دو ماہ کا حمل ہے۔ اور گل جان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ زرمینہ کی خواہش تھی کہ اپنے آبائی گاؤں واپس چلی جائے۔ کیونکہ کراچی کی آب و ہوا اسے راس آتی تھی نہ ماحول ہی اسے پسند تھا۔

کیونکہ اپنا تو کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ صرف اجنبی اور غیر لوگ ہی تھے — جن سے اس کی شناسائی ہی نہیں تھی اور گل جان تو اس کی خواہش پوری بھی کردیتا مگر انہی دنوں بھائی سے کہہ سن کر گل شیر نے قالینوں کا کاروبار شروع کیا تھا جس کی سرپرستی خود گل جان ہی کررہا تھا۔ اس لیے اس نے سمجھا بجھا کر زرمینہ کو کراچی رہنے پر ہی راضی کرلیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بوریت کا شکار ہورہی ہے اس لیے خاص طور پر اس کے لیے خریدی مرسیڈیز میں اسے گھمایا پھرایا کرتا تھا۔ جب سے فارمز خریدے تھے ایک دو بار ہی انہیں دیکھنے کے لیے جاسکا تھا۔ ایک دن اس نے پروگرام بنایا کہ وہ زرمینہ کو ساتھ لے کر فارمز پر جائے گا اور چند دن وہیں گزار کر آئے گا۔ اس نے ایک چھوٹی سی کاٹیج بھی وہاں تعمیر کرائی تھی۔ لہٰذا رہائش کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ گل شیر ان دنوں اپنے کاروبار میں کچھ اتنا مصروف تھا کہ بھائی کے بہت اصرار کے باوجود اس کے ساتھ فارمز پر نہ جاسکا۔ بہرحال گل جان صرف ایک ہفتے کا قلیل سا عرصہ گزارنے فارمز پر گیا تھا۔ چھ روز تو بڑے آرام اور مزے سے گزر گئے تھے۔ زرمینہ بھی شوہر کا اتنا زیادہ پیار اور ساتھ پاکر پھولے نہیں سمارہی تھی۔ اسی کی خواہش پر گل جان نے وہاں ایک خوبصورت سا بنگلہ تعمیر کرانے کا قصد کرلیا تھا۔ بلکہ بنگلے کا نقشہ بنانے کے لیے اس نے ایک واقف کار آرکیٹکٹ کو بھی بلوایا تھا۔

جو اسی روز اپنے ساتھ ایک ٹھیکیدار کو بھی لایا تھا۔ اور چونکہ وہ دونوں سہ پہر کو پہنچے تھے اور ان سے باتیں کرتے اور بنگلے کے لیے موزوں جگہ دکھانے میں شام ہوگئی تھی اس لیے گل جان نے رات کو وہیں روک لیا تھا۔ وہ کھانے کے بعد

بھی رات گئے تک بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہا تھا اور جب کوئی بارہ بجے کے قریب اپنی خوابگاہ میں پہنچا تو زرمینہ کو بے سدھ سوتا پایا۔ پہلے تو وہ اس کے بے آرام ہونے کے خیال سے نہایت خاموشی سے لباس تبدیل کرکے آہستہ سے اس کے پاس ہی لیٹ گیا مگر پھر اچانک ہی اس کی چھٹی حس نے کچھ غیر معمولی سا احساس دلایا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ مدھم سی خوابناک روشنی میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے باہر تاریکی میں جھانکا۔ پھر دروازے کے کھٹکے کو چیک کیا۔ اس کے بعد پھر بستر پر آ بیٹھا مگر چونکہ اس پر گھبراہٹ میں ایک وحشت سی طاری تھی اس لیے وہ لیٹ نہ سکا۔ ادھر زرمینہ بہت ہوشیار نیند سوتی تھی۔ گہری نیند میں بھی ذرا سے کھٹکے پر اس کی آنکھ کھل جایا کرتی تھی۔ مگر اس روز وہ اسی طرح بے سدھ پڑی سوتی رہی۔ گل جان کو اس کے اس طرح سونے میں بھی غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو اس نے پہلے زرمینہ کو آواز دی اور پھر بڑے پیار سے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا تو معاً اسے اپنے دل کی حرکت ـــ بند ہوتی محسوس ہوئی۔

کیونکہ اس کا بازو بالکل سرد اور بے جان سا محسوس ہوا۔ اس نے وحشت زدہ ہو کر اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا لیکن اس کے بے جان جسم نے جنبش تک نہ کی۔ اس نے جھک کر اس کے سینے پر کان رکھ کر اس کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ مگر وہاں کچھ ہوتا تو سننے میں بھی آتا۔ معاملے کی نزاکت محسوس کرکے وہ پاگل سا ہو گیا۔ جنونیوں کی طرح اس نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے اور گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔

سنسان ـ ویران اور بیابان علاقہ تھا۔

چوکیدار ـ اس کے گارڈ اور دونوں مہمان ہڑبڑا کر جاگ اٹھے اور برہنہ پا دوڑتے ہوئے اس کے کمرے کے قریب آ گئے۔

پہلے کچھ دیر باہر کھڑے معاملے کی نوعیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ آخر تھوڑا سا انتظار کرانے کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور ان سب کے استفسارات کے باوجود اس نے کہا تو اتنا کہا کہ جلدی سے گاڑی نکال کر ادھر لے آئے۔ زرمینہ کو شاید سکتہ ہو گیا ہے اور اسے فوری طور پر ہسپتال لے جانا ہے۔

ڈرائیور نے حکم کی بجا آوری میں چند منٹ بھی نہیں لگائے۔ وہ جھٹ پٹ گاڑی لے آیا۔ اس نے خود زرمینہ کو ہاتھوں پر اٹھا کر سیٹ پر ڈالا اور اپنے دو محافظوں کو اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بٹھا کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔ پھر ہسپتال میں فی الفور زرمینہ کا معائنہ کیا گیا اور بڑے افسوس کے ساتھ اسے یہ اطلاع دی گئی کہ زرمینہ دو گھنٹے قبل ہی اس دارِ فانی سے کوچ کر چکی ہے۔ اس کی اچانک موت کا سبب ڈاکٹرز کے اندازوں سے تو یہی بتایا گیا تھا کہ حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہے۔

بہر حال گل جان روتا پیٹتا ـ پھر اس کے بے جان لاشے کو لے کر اسی ویرانے میں آ گیا اور وہیں اس کی تجہیز و تکفین کرائی۔ کچھ عرصے تو اس کے غم میں خود سے بھی بیگانہ رہا۔ کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، ملنا جلنا اور آنا جانا ترک کر دیا اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کیے رہا۔

مگر پھر وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج اور کچھ دوستوں کے اور خصوصاً گل شیر کے سمجھانے بجھانے اور دلجوئی کرنے کی وجہ سے اُس نے خود پر کسی قدر قابو پا لیا اور پھر وہاں زرمینہ کی یاد میں ایک عمارت تعمیر کرانے کی دُھن سوار ہوئی تو اس نے ایک محل نما عمارت خود اپنی نگرانی میں تعمیر کرائی۔ وہ تو ایک دنیا تیاگ کر وہیں مستقل رہائش کا تہیہ کر بیٹھا تھا۔ مگر چھوٹے بھائی گل شیر نے جسے بھاوج کی اچانک موت کا غم اپنے بھائی سے کم نہ تھا اور اس نے بھاوج کی موت کا کئی ماہ تک سوگ منایا تھا، اسی نے بھائی کو سمجھا بجھا کر اور اس کی دلدہی اور دلجوئی کرکے اس کا غم بھلایا تھا اور اسے دنیاوی جھمیلوں کی طرف راغب کرایا تھا۔ لیکن بس زندہ رہنے کی حد تک ہی اس نے بھائی کی باتوں کا اثر قبول کیا تھا۔ یہ بھائی جو دنیا میں اسے بہت پیارا تھا۔

اتنا کہ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی عزیز از جان بیوی کو دو تین ماہ کا حمل ہے تو وہ جو اولاد کو ترسا ہوا تھا کیونکہ

یوں بھی اس کی شادی کچھ تاخیر سے ہوئی تھی۔ اس پر شادی کے بعد بھی پانچ برس تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اور اب زرمینہ کی سُوکھی کوکھ میں ایک ننھی سی کونپل پھوٹی تھی تو میاں بیوی دونوں کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ حد درجے مگن ہوتا تو زرمینہ سے کہتا۔

"اگر خدا نے ہمیں لڑکی بھی عطا کی تو بھی میں اس کا شکر ہی ادا کروں گا کیونکہ مجھے تو صرف اور صرف اولاد ہی چاہیے خواہ وہ لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔"

"لیکن میں نے تو اللہ سے ـــ لڑکے کی ہی خواہش کی ہے اور مجھے اس کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے لڑکے ہی سے نوازے گا۔"

"ہاں امید پر تو دنیا قائم ہے ـ اور خدا سے اچھی ہی امید کرنی چاہیے۔ لیکن تمہیں صرف لڑکے پر ہی تکیہ کرکے نہیں بیٹھنا چاہیے ـ بلکہ لڑکی کے لیے بھی۔"

"اُفوہ آپ نے یہ لڑکی لڑکی کی رٹ کیوں لگا رکھی ہے۔ آپ خدا سے لڑکا کیوں نہیں مانگتے۔ کیا آپ کو اتنی بڑی جائیداد کا وارث نہیں چاہیے ـ" زرمینہ چڑ کر کہتی ـ

"بھئی جہاں تک وارث کا سوال ہے تو یہ اپنا گلشی بھی تو ایک طرح ہمارا وارث ہی ہے۔ کیونکہ اس کے سوا اور ہمارا ہے ہی کون ـ اور رہی لڑکی کی بات تو کیا وہ ہماری جائیداد کی وارث نہیں ہو سکتی ـ بھئی میری نظر میں تو جیسا بیٹا ویسی بیٹی۔"

"ٹھیک ہے ـ مگر بھائی میں اور اولاد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بلکہ اولاد کی تو بات کچھ اور ہوتی ہے۔ جبھی تو بھائیوں کے ہوتے ہوئے انسان اولاد کی تمنا کرتا ہے۔ خود آپ کو بھی کتنی خواہش تھی کہ آپ کے ہاں بھی اولاد پیدا ہو۔"

"ہاں کیوں نہیں تھی ـ اور میں نے یہ کب کہا ہے کہ مجھے لڑکے کی خواہش نہیں میری تو سب سے بڑی تمنا یہی ہے ـ اور جہاں تک گلشی کا سوال ہے تو میں نے ہمیشہ اسے اولاد کی طرح ہی عزیز رکھا ہے۔ اس پر بابا جان بھی مجھے کچھ ایسی ہی نصیحت کر گئے تھے ـ بلکہ بوقتِ مرگ انہوں نے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا تھا کہ میں اسے اولاد کی طرح ہی عزیز رکھوں۔ اور پھر اس کا بھی تو بہت حق ہے اس جائیداد پر۔"

"خیر آپ کی جائیداد آپ کے بھائی کو مبارک ہو۔ مجھے تو بس ایک بیٹا چاہیے۔ لیکن سرتاج! مجھے ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔"

"کس بات کا؟"

"یہی کہ کیا سچ مچ میں ماں بن جاؤں گی۔ کیا میں اپنے بچے کو دیکھ بھی سکوں گی؟"

"کیوں نہیں دیکھ سکو گی بھلا ـ یہ کیسی بدشگونی کی باتیں سوچتی ہو تم جانم ـ اصل میں چونکہ اتنے عرصے کے بعد ایک آس بندھی ہے اس لیے تم توہمات کا شکار ہو گئی ہو۔" یہ بات زرمینہ کئی مختلف طریقوں سے کئی بار کہہ چکی تھی۔

اور ہر بار گل جان اس کے خیالات کی تردید کرکے اسے تسلی ہی دیتا تھا۔

یوں بھی زرمینہ بہت خاموش اور مضمحل سی رہنے لگی تھی۔ گل جان اس کا دل بہلانے کی کوشش بھی کرتا۔ مگر وہ اس کی باتوں پر توجہ ہی نہیں دیتی تھی۔ بس کچھ شوق تھا تو اپنے گاؤں واپس جا کر رہنے کا۔ جو گل جان کے لیے کم از کم ناممکن سی بات تھی کیونکہ کراچی میں زرمینہ کا علاج بھی ہو رہا تھا ـــ دیر سے اولاد ہونے کی وجہ سے کچھ اندرونی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ ورنہ ویسے تو وہ خاصی صحت مند تھی۔ اس کی وحشت کے پیشِ نظر گل جان اسے فارمز کی سیر کرانے لایا تھا کہ شہری ماحول اسے بالکل راس نہیں آیا تھا۔

وہ گل شیر کو بھی اپنے ساتھ فارمز پہ لے جانا چاہتا تھا۔ مگر گل شیر ان دنوں اپنا کوئی بزنس سیٹ کرنے میں مصروف تھا اور بھائی کو معلوم تھا کہ اس پر جب کوئی دُھن سوار ہوتی ہے تو بس وہ اس کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے ـ مگر یہ گل شیر کی ایک چال تھی۔

اوّل تو یہ کہ زرمینہ اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی ـ دوسرے زرمینہ کا رویہ بھی اس کے ساتھ کچھ اچھا نہ تھا۔ وہ اس سے بہت مغائرت برتتی تھی اور کئی بار باتوں باتوں میں اسے یہ جتا چکی تھی کہ گل جان کی جائیداد کا اصل وارث اس کا بیٹا ہی ہوگا ـــ اور یہ بھی کہ گل شیر اس کے شوہر کا سوتیلا بھائی ہے۔ یہ تو گل جان کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ اسے سگے بھائی سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس پر وہ گل شیر کی شاہ خرچی سے بھی بہت نالاں تھی اور کبھی کبھی بڑی بھاوج کی حیثیت سے ٹوک بھی دیا کرتی تھی کہ اتنی فضول خرچی ٹھیک نہیں۔ کیونکہ پیسہ کوئی درختوں سے تو نہیں ٹپکتا۔ بلکہ محنت مشقت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ گل شیر سدا کا کینہ پرور تھا۔ وہ جان چھڑکنے والے بھائی سے بھی دل میں کدورت رکھتا تھا اور شروع سے یہی توقع کرتا آیا تھا کہ بھائی کے بعد سارے سیاہ سفید کا وہی مالک ہوگا۔ مگر وہاں بھاوج کا پیر بھاری ہوگیا تھا۔ وہ امید سے تھی اور یہ امید چند ماہ بعد حقیقت کا روپ دھارنے والی تھی۔ چنانچہ اس نے یہی سوچا کہ سرے سے بھاوج کا ہی خاتمہ کر دینا چاہیے کہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

لہٰذا وہ پورے ایک ہفتے بھاوج کو قتل کرنے کے منصوبے بناتا رہا۔ شہر میں ایسا کوئی مجرمانہ قدم اٹھاتا تو فوراً ہی لپیٹ میں آجاتا، اس لیے وہ چھٹے روز پوری تیاری کے ساتھ فارمز کے حدود میں جا پہنچا۔ اور پورے ایک روز فارم کے قریب ہی ایک ویران علاقے میں چھپا رہا۔ وہ اپنے معتمد خاص کو بھی اپنے ساتھ لے گیا جو گیٹ پر متعین دو مسلح چوکیداروں میں سے ایک کا شناسا تھا اور صرف ان دونوں کو باتوں میں لگا کر رات کی تاریکی میں گل شیر کو اندر داخل ہونے کا موقع دینے کی غرض سے گیا تھا۔ اصل میں گل شیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بھائی کے پاس اس رات دو مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں اور بھائی یقیناً ان کی میزبانی میں مصروف ہوگا۔ کیونکہ گل جان کے کہنے پر ان دونوں کو گل شیر نے اس کے پاس بھیجا تھا اور گویا موقع غنیمت تھا۔ چنانچہ گل شیر نے چوکیداروں کی بے خبری سے فائدہ اٹھایا اور گربہ قدم چلتا کسی نہ کسی طرح اندر پہنچ گیا۔ اور اسی چھوٹی سی کاٹج میں جہاں گل جان اور اس کی بیوی رہائش پذیر تھے ایک تاریک گوشے میں چھپا موقع کی تاک میں بیٹھا رہا۔

اس لمحے رات کے صرف آٹھ ہی بجے تھے۔ خاصے انتظار کے بعد بھائی اندر سے باہر برآمدے میں برآمد ہوا اور اپنے ایک خدمتگار کو بلا کر اسے شاید چوکسی کے لیے برآمدے میں بیٹھنے کو کہا اور پھر نیچے اتر کر سامنے ہی چند گز کے فاصلے پر بنے ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا اور پھر خدمت گار برآمدے میں بیٹھنے کے بجائے برآمدے کی سیڑھیوں کے آگے بنی روش پر ٹہلنے لگا۔ گل شیر تاریکی میں رینگتا ہوا اس طرف آگیا جہاں۔ خواب گاہ کی کھڑکیاں تھیں جو گرمی کی وجہ سے اس وقت کھلی ہوئی تھیں۔ گل شیر بہت محتاط انداز میں کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھا اور بڑی آسانی سے اندر کود گیا۔ گو وہ احتیاط کے طور پر اپنے ساتھ بھرا ہوا پستول بھی لایا تھا اور اس کی جیب میں ایک بڑا سا گراری اور تیز دھار دار چاقو بھی پڑا تھا۔ مگر دونوں ہتھیاروں کو استعمال کرنے کی صورت میں اسے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا پورا پورا امکان تھا۔ اس لیے اس کے فہم رسا مجرمانہ دماغ نے تیزی سے کام کیا اور اس نے پھرتی سے بھائی کے سرہانے پڑا تکیہ اٹھا کر زرمینہ کے چہرے پر رکھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں سے دبا کر اپنا سارا بوجھ تکیے پر ڈالے اس وقت تک بیٹھا رہا، جب تک زرمینہ کا مزاحمت کرتا اور لرزتا ہوا جسم سرد نہ ہوگیا۔

پھر اس کے بعد وہ اطمینان سے اٹھا۔ بھائی کے تکیے کو اس کی جگہ پر رکھا اور بھاوج کے دونوں ہاتھ پہلوؤں سے ہٹا کر اس کے سینے پر رکھے اور اس کے بعد بڑی پھرتی سے جس کھڑکی کی راہ اندر آیا تھا اسی کی راہ باہر کود گیا۔ اور وہ بے چارا گل جان یہی سمجھتا رہا کہ اس کی پیاری سی بیوی پر اچانک شدید دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اسے اس ہری اور ننھی سی کونپل کے مرجھانے کا بھی غم تھا مگر اس سے زیادہ زرمینہ کی وسوسوں سے پُرمایوسانہ باتیں اسے خون کے آنسو رُلاتی تھیں۔

گل شیر اسے پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہوگیا تھا۔ کہ وہ بھی اس کے غم میں برابر کا شریک رہا تھا۔ اور اس کا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ یوں بھی اب اولاد کی طرف سے تو وہ بالکل ناامید ہوگیا تھا کچھ اس لیے بھی گل شیر کو اس نے اپنے لخت جگر کا درجہ دے دیا اور چونکہ ایک طرح وہ بھائی کے سیاہ وسپید کا مالک ہوگیا تھا اس لیے اس نے بھائی کو راہ کا پتھر سمجھ کر اپنے سامنے سے نہیں ہٹایا تھا۔ اس نے بھائی سے کہا کہ وہ فلم ڈسٹری بیوٹر بننا چاہتا ہے۔ تو اس نے تھوڑی سی رد و قدح کے بعد۔ کہ وہ فلم سے تعلق رکھنے والے ہر کاروبار کے خلاف تھا۔ بھائی کے یہ سمجھانے پر کہ فلم انڈسٹری اور فلم ڈسٹری بیوشن دو علیحدہ شعبے ہیں، اسے اجازت دے دی جب کہ گل شیر نے فلم ڈسٹری بیوشن کی آڑ میں کچھ ناجائز کام کرنے کا پہلے سے ہی منصوبہ بنا رکھا تھا۔

بہرحال۔ اُس نے بھائی کی لاعلمی اور اس کی ذات پر اندھے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر بہت سے کالے دھندے

شروع کر دیے تھے۔ بھاوج کے انتقال کو بھی دس سال کا عرصہ ہوگیا تھا۔ فارمز کی ہی وسیع عریض زمین پر گل جان نے زرمینہ کی یادگار کے طور پر ایک محل نما عمارت تعمیر کرائی تھی جس میں وہ کچھ عرصہ رہا بھی تھا۔ مگر پھر کچھ عرصے کے بعد اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔

اس کے ٹھاٹ باٹ بالکل نوابوں اور جاگیرداروں کے سے تھے۔ اس کا دل دنیاوی عیش و عشرت سے ضرور بھر گیا تھا مگر وہ رہتا بڑی شان سے تھا۔ آن بان اسے ورثے میں ملی تھی اور رعب و دبدبے کا یہ عالم تھا کہ گل شیر بھی اس سے بات کرتے ڈرتا تھا۔ اور اس کے سامنے بھیگی بلی۔ بلکہ مذکر ہونے کے لحاظ سے بھیگا بلا بنا رہتا تھا۔ پہلے تو نہیں مگر بیوی کی وفات کے بعد سے روزے نماز کا پابند ہوگیا تھا۔

فطرتاً بھی وہ بہت نیک اور شریف النفس تھا اور حد درجہ دریا دل اور فیاض بھی۔ یعنی اعلا کردار ہونے کی تمام صفات اُس کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس پر تعلیم نے اس کے خیالات میں بالیدگی سی پیدا کر دی تھی۔ اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ اس کا بھائی کیسے کیسے نئے نئے گل کھلا رہا ہے۔ یا پھر اس نے اس کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر زرمحل کو ایک طرح اپنے جرائم کا اڈہ بنا رکھا ہے۔

اسے معلوم تو اس وقت ہوا جب گل جان جسے اس کے ملنے جلنے والے اور دوست احباب آغا صاحب اور رشتے دار آغا جان کہہ کر پکارتے تھے کئی ماہ بعد کراچی لوٹا تو اس کے ایک معتمدِ خاص غلام محمد نے دبے دبے لفظوں میں بتایا کہ گل شیر خان بہت غلط دھندوں میں پڑ گیا ہے۔ وہ منشیات کی اسمگلنگ کرتا ہے اور زرمحل کو اس نے اپنے اس ناجائز کاروبار کا اڈہ بنا رکھا ہے۔ نیز فلم اسٹوڈیو بھی کھولا ہے جس میں وہ خوبصورت اور بھولی بھالی لڑکیوں کو پھانس کر ملازم رکھتا ہے اور ان سے ناجائز کام کراتا ہے۔ اس اطلاع پر وہ آگ بگولا سا ہو کر بولا۔

”کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں اتنی بڑی اور غلط الزام تراشی پر کہنے والے کا کیا حشر کرتا ہوں“۔ اور غلام محمد جس نے ان ساری باتوں کی اچھی طرح تصدیق کر لی تھی اس کے خوفناک لب و لہجے سے خائف ہو کر بولا۔

”میں آپ کا پرانا نمک خوار ہوں مالک! اور آپ خواہ مجھے جان سے کیوں نہ مار دیں یا پھر میری کھال ہی کیوں نہ اُتروا دیں میں کبھی گوارا نہ کروں گا آپ کے بھائی کی اتنی غلط روش کی وجہ سے آپ کی عزت پر حرف آئے۔ میں نے بذات خود ان ساری باتوں کی تصدیق کرنے کے بعد ہی آپ کو یہ اطلاع دی ہے۔ معاملہ اتنا بگڑ چکا ہے مالک! پولیس بھی گل شیر خان کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور کسی وقت بھی اس پر ہاتھ ڈال سکتی ہے“۔

”ہوں۔ اچھا۔ مگر اس وقت گلشی کہاں ہوگا؟“ وہ جیسے کسی طرح غلام محمد کی باتوں یا الزام تراشی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر تک ایک عجیب ناقابل فہم سی کیفیت میں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں سختی سے دبائے ہوئے باہر خلا میں کچھ دیکھتا ہوا بولا۔

”جی اس وقت تو پتا نہیں کہاں ہوں گے مگر شام کو ان کا پروگرام زرمحل جانے کا ہے۔ میں نے انہیں فون پر کسی کو یہی بتاتے سُنا ہے“۔ غلام محمد نے بتایا تو گل جان کچھ سوچ کر بولا۔

”ٹھیک ہے تم جا کر سردار خان۔ گل زمان اور راول خان سے کہو کہ وہ تیار ہو کر پانچ بجے تک میرے پاس یہاں آجائیں۔ اور ہاں، تم اپنے ان تینوں یاروں کو بھی ساتھ لے آنا“۔

”جو حکم“۔ غلام محمد نے کہا اور پھر اسی وقت کہیں چلا گیا۔

پھر پانچ بجے پوری تیاری کے ساتھ وہ ان چھ عدد نفوس کو لے کر جن کو گل جان نے طلب کیا تھا اس کے پاس آموجود ہوا۔ گل جان نے بھی اپنے چاروں محافظوں یا باڈی گارڈز کو ساتھ لیا اور اپنی پجارو میں سب کو بھر کر اور صرف دو محافظوں کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر زرمحل کی طرف روانہ ہوگیا۔

زرمحل پہنچتے ہی سب سے پہلے تو اس نے گیٹ پر متعین پہرے داروں کو چند ضروری ہدایات دیں اور پھر اپنے خدمت گاروں کے ساتھ اندر آگیا۔ اندر آتے ہی سب سے پہلے اس کی مڈبھیڑ ان چاروں عورتوں سے ہوئی جو پیسے کے لالچ میں گلشی کے لیے ناجائز کام کر رہی تھیں۔ اس کے بعد بشیرا اور رفیقا جو گل جان کے آدمیوں سے بچنے کی کوشش

میں کہیں فرار ہونے کے لیے پر تول رہے تھے بڑی آسانی سے ان کے ہاتھ آ گئے اور گل جان کے آدمیوں کے لیے ان ہی چھ افراد کو قابو میں کر لینا کافی ہوا۔ کیونکہ عورتوں کو کھال ادھیڑنے کی دھمکیاں دے کر جب ان کے سامنے بشیرے اور رفیقے کی بری طرح پٹائی کی گئی تو عورتوں نے سب کچھ اگل دیا اور یوں۔۔۔ انہیں وہاں غزل اور اس کے آکاروں کی موجودگی کا بھی علم ہو گیا۔ حتیٰ کہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گل شیر نے جس لڑکی کو اغوا کرایا ہے وہ بھی یہیں موجود ہے۔ اور گل جان اس کے دوسرے سیاہ کارناموں پر اتنا برافروختہ نہیں ہوا تھا جتنا یہ سن کر ہوا کہ اس نے کسی لڑکی کو اغوا کیا ہے۔ وہ اتنا غضبناک ہوا کہ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا کہ گل شیر جہاں بھی ہو اسے پکڑ کر اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ کچھ ہی دیر بعد گل شیر کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے گل جان کے سامنے حاضر کر دیا گیا۔

اصل میں تو گل جان پہلے ہی سے پہریداروں کو تاکید کر آیا تھا کہ جو کوئی بھی زرمحل کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے خواہ وہ میرا بھائی گل شیر ہی کیوں نہ ہو اسے پکڑ کر اپنے کمرے میں ہی بند کر دینا۔ خبردار کوئی بھاگنے نہ پائے۔ چنانچہ گل شیر جیسے بسنت کی کچھ خبر نہ تھی یعنی یہ معلوم ہی نہ تھا کہ گل جان زرمحل میں موجود ہے۔ وہ تو پولیس سے بچتا بچاتا اور چھپتا چھپاتا جھٹ پٹے کے وقت وہاں پہنچا تھا تو پہنچتے ہی دھر لیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو چیلے بھی تھے۔ گل جان کی آنکھوں میں بھائی کو دیکھ کر خون اتر آیا۔ اس نے ایک بھی نہ دوا پنے ہاتھ سے چمڑے کا کوڑا لے کر اس پر گویا پل سا پڑا۔ اور اسے اتنا مارا اتنا مارا کہ بس جان لینے کی کسر رہ گئی تھی۔ تبھی اس کے سب سے پرانے نمک خوار اور جاں نثار ملازم قربان علی نے آگے بڑھ کر اس کا تیزی سے اٹھتا ہوا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"بس۔۔۔ بس کریں مالک۔ یہ جتنی سزا کا مستحق تھا آپ نے اس سے کہیں زیادہ سزا دے دی ہے۔"

"نہیں چھوڑو میرا ہاتھ۔ میں تو اسے آج جان سے مار کر ہی دم لوں گا۔ اس نے میرے اعتماد کو نہیں بلکہ میرے خاندانی اعتماد کو بھی خاک میں ملا دیا ہے۔ یہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے زندہ رہنے کا حق دیا جائے۔ اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔"

گل جان نے قربان علی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے نہایت غضبناک لہجے میں کہا تو گل شیر جو کوڑوں کی مار کھاتا ہوا چیخ چیخ کر اور کراہ کراہ کر۔۔۔ مسلسل بھائی سے رحم کی اپیل کرتا رہا تھا۔ بھائی کی بات پر اپنے آپے میں نہ رہا اور چلا کر بولا۔

"ہونہہ تو اگر مجھے جان سے بھی مار دے گا گل جان! تو مجھے اس کا ذرا سا بھی غم نہ ہوگا۔ تو یہ شکر کر کہ میں نے تجھے جان سے نہیں مارا۔ اور میں تجھے جینے کا موقع دیتا رہا۔ ورنہ مجھے تو اسی وقت تجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے تھا جب میں نے تیری بیوی زرمینہ کے منہ پر تکیہ رکھ کر ہمیشہ کے لیے گہری نیند سلا دیا تھا۔"

"ایں!" چند ثانیوں کو تو اس دل شگاف انکشاف نے گل جان پر سکتہ سا طاری کر دیا تھا مگر پھر اس نے جھپٹ کر اپنے ایک خدمت گار کی پیٹی میں اڑسا ہوا ریوالور نکالا اور گل شیر پر اسے تان کر ٹریگر دبانا ہی چاہا تھا کہ سردار خان نے پوری قوت سے اس کا بازو پکڑ کر گولی چلانے سے اسے باز رکھتے ہوئے چلا کر کہا۔

"نہیں نہیں مالک! ایسا غضب نہ کیجیے گا۔ آپ اپنے پاک اور صاف ستھرے ہاتھ اس کے ناپاک خون سے ہرگز نہ رنگیے۔ آپ اسے پولیس کے حوالے کر دیجیے۔ اور اس پر مقدمہ چلا کر اسے کیفر کردار تک پہنچائیے۔"

"نہیں سردار خان! یہ میرا مجرم ہے۔ اس نے میری بیوی اور بچے کا خون کیا ہے۔ انہیں موت کے گھاٹ اتارا ہے اور ہمارے دستور کے مطابق اس لعین کو قتل کرنے کی ذمے داری مجھے ہی پوری کرنی چاہیے۔" اتنا کہتے کہتے گل جان نے ٹریگر دبا دیا۔ اور چونکہ سردار خان نے ریوالور سمیت اس کا بازو بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور ریوالور کا رخ فرش کی طرف ہو گیا تھا اس لیے ریوالور میں بھری چھ کی چھ گولیاں گل شیر کی پنڈلی اور ٹانگ کے ہی پرخچے اڑا سکیں۔ اور وہ بے ہوش ہو کر فرش پر ڈھے سا گیا۔ گل جان نے خالی ریوالور دور اچھال دیا۔ اور گل شیر کے منہ پر تھوکتا ہوا کہیں اندر چلا گیا۔

غم و غصے کی انتہا کو پہنچی ہوئی کیفیت نے اس کے حواس معطل کر دیے تھے۔ وہ پھر اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ تمام رات اندر ہی اندر بند رہا۔ نہ کسی کی مجال ہی ہوئی اس کا احوال پوچھنے کی۔

پھر اگلی صبح اپنی خواب گاہ سے نکلتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ڈی۔ آئی۔ جی رب نواز خان کو

فون کر کے جس سے اس کے گہرے مراسم تھے گل شیر خان کے بارے میں ساری تفصیل بتا دی۔

بیوی اور بچے کے غم کا بار اٹھائے تو وہ اب تک اپنی زندگی کی گاڑی کو کسی نہ کسی طرح کھینچتا ہی رہا تھا۔ جبکہ اس انکشاف نے کہ اس بھائی نے جسے وہ اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ جان چھڑکتا تھا۔

اس کے بیوی اور بچے کو قتل کیا تھا۔ اس کے غم میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ مگر وہ بڑی مضبوط قوت ارادی اور قوت برداشت کا مالک تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اس غم کو بھی اپنے اوپر سے گزار لیا تھا۔

جو مغویہ لڑکی اسے مردہ سی حالت میں زرمحل کے ایک کمرے سے ملی تھی، اسے اس کی زندگی برباد ہونے کا بھی بڑا غم تھا۔ اور وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس مظلوم لڑکی کو بری طرح پائمال کیا گیا ہے۔ اس نے اسے اس امید پر اسپتال میں داخل کر دیا تھا کہ شاید اس کی زندگی کو بچایا جا سکے۔ اور اس نے احکامات صادر کیے تھے کہ اسے ہر ممکنہ طبی امداد فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اچھی طرح معائنہ کیا جائے۔ جبکہ اس لڑکی کے قریب گلشی کو پھٹکنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ بے چاری تو اسی کمرے میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ جب وہاں پہنچائی گئی تھی تو روزے سے تھی۔ اور محض روزہ افطار کرنے کی غرض سے اس نے میڈم کے بہت اصرار پر صرف دو نوالے روٹی اور چند گھونٹ پانی کے ہی حلق سے اتارے تھے۔ اس کے بعد تو خوف و غصے کی وجہ سے ہی وہ کتنی کمزور اور لاغر ہو گئی تھی۔ کہ اس کے اندر ہاتھ پیر ہلانے کی سکت بھی باقی نہ رہی تھی۔ اور اسی کیفیت میں اسے وقت کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔ کہ پورے چار روز ہو گئے تھے اسے اسی سرد اور تاریک سے قید خانے میں بند ہوئے کہ یوں بھی وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس کی حالت بہت غیر تھی اور اسے اگر چند گھنٹے مزید طبی امداد نہ ملتی تو یہ عارضی بے ہوشی ابدی بے ہوشی کا روپ دھار لیتی۔

جب سے اسے اسپتال میں داخل کیا گیا تھا گل خان کو برابر اس کی کیفیت کے بارے میں ساری رپورٹیں ملتی رہتی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کنواری باکرہ ہے اور اس کے ناموس پر ایک ہلکا سا داغ بھی نہیں آیا۔ اس کے باوجود بھی گل خان کو اس نزاکت کا بخوبی احساس تھا کہ ایک مغویہ لڑکی کی پوزیشن معاشرے کی نظر میں کیا ہوتی ہے۔ یعنی اس کا دامن خواہ، کتنا ہی پاک صاف کیوں نہ ہو مگر ایک دنیا کی نظروں میں وہ مغویہ ہی ہوتی ہے۔ کوئی بھی اس کی پاک دامنی پر یقین کرتا ہے نہ اسے اچھی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور وہ بے چاری کہیں کی بھی نہیں رہتی۔

صرف تین روز تک شدید نگہداشت میں رہنے کے بعد وہ بڑی تیزی سے زندگی کی طرف لوٹی تھی اور اس کی صحت دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ گل جان کبھی خود تو اسے دیکھنے نہیں گیا تھا مگر اس کی پوری پوری خبر گیری رکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ وہ اس کے عیاش اور شیطان صفت بھائی کے ہاتھوں گھر سے بے گھر ہوئی تھی۔ اسے اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے۔ حالانکہ وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے ان معاشرے کی بھٹکی ہوئی عورتوں سے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر سکتا تھا جو گل شیر کے جرم میں برابر کی شریک تھیں مگر وہ وقت بھی کچھ ایسا تھا کہ اس وقت اسے اس بات کا خیال ہی نہ آیا۔ اور کچھ دیر بعد تو وہ حوالات اور جیل کی ہوا کھانے چلی گئی تھیں۔

بہرحال اس نے اسپتال کے بڑے سرجن کو جس سے اس کے پرانے مراسم تھے، ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنے طور پر لڑکی سے اس کے ورثا کا پتا معلوم کرے۔ مگر سرجن ہی کیا۔ اسے روزانہ اٹینڈ کرنے والے ڈاکٹر نے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی تھی کہ وہ عنبر سے اس کے بارے میں کچھ معلوم کر سکے مگر ان کے سارے سوالوں کے جواب میں ایک ہی بات کہتی تھی کہ اس کا اس بھری دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ اب تک کہاں رہتی رہی تھی؟

اس کا ماضی کیا تھا؟

ان سوالوں کے جواب میں وہ ہمیشہ خاموشی ہی اختیار کیے رہتی تھی۔ سرجن، ڈاکٹر اور نرس اس سے پوچھتے پوچھتے عاجز آ گئے تھے۔ اصل میں تو اس کے بارے میں یہ سب معلوم کرنا ان کے لیے اس لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اسے اسپتال میں رہتے پندرہ یوم ہو گئے تھے۔ اور اب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی۔ اور اس کا مزید بستر پر قابض رہنا

اسپتال والوں کے اصولوں کے خلاف تھا۔ اور اسی وجہ سے سرجن نے گل جان سے کہہ دیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس کی رہائش کا کہیں اور بندوبست کر دیں۔ کیونکہ وہ کسی دن بھی اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیں گے۔ گل جان نے عنبر کی خاموشی سے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس لڑکی کی خاموشی کی وجہ یہی ہے کہ چونکہ وہ مغویہ ہے۔ یا رہ چکی ہے۔ اس لیے اس کے خاندان والے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ یا پھر وہ بہت غیور اور خوددار ہے اور اپنے خاندان والوں کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتی۔ بہرحال وجہ جو کچھ بھی تھی۔ گل جان۔ جو بڑھاپے کی سرحد پر کھڑا تھا۔ سدا سے اولاد کو ترسا ہوا تھا۔ کچھ اسی وجہ سے صلۂ رحمی کے طور پر اس نے یہی سوچا کہ وہ اس لڑکی کو متبنیٰ کرے گا۔ اور اسے سگی بیٹیوں کی سی شفقت اور محبت دے گا۔ بس یہی سب سوچ کر یا تہیہ کر کے ایک روز وہ عنبر سے ملنے اسپتال جا پہنچا۔

دن کے دس بجے کا عمل تھا۔ وہ اسپتال کے کپڑوں میں ملبوس بیڈ پر بیٹھی نرس کے لائے ہوئے دن کے تازہ اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔

علاج معالجے۔ اچھی خوراک اور آرام کرنے کی وجہ سے بے سکون اور ملول رہنے کے باوجود اس کے خوبصورت چہرے پر نکھار سا آ گیا تھا۔

جھکی ہوئی دراز پلکیں۔

صبیح چہرے سے تشرح سنجیدہ سا تاثر۔

پاکیزگی اور شرافت۔

گل جان کے دل میں اس کے لیے ڈھیر سا پیار اتر آیا۔

”سنیں مس خان! یہ آغا صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں“ نرس نے قریب پہنچتے ہی بتایا۔

”آغا صاحب؟“

یہ نام اس نے صرف سنا ہی تھا۔

مگر یہ نام اس کے لیے اجنبی نہ تھا۔

بلکہ اس نام میں کچھ ایسی کشش، ایسی چاشنی تھی کہ اس کے دل نے اس نام کے حامل کو دیکھنے کی بارہا تمنا کی تھی۔ اسے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ آغا صاحب نہ صرف اس کے نجات دہندہ ہیں بلکہ محسن بھی ہیں کیونکہ انہوں نے ہی اسے بے بسی اور بے کسی کے عالم میں اسپتال میں داخل کرایا تھا کہ جب کوئی اس کا پرسان حال تھا نہ خیرخواہ۔

اس پر اس کا علاج بھی کرایا تھا۔ اور اس پر مستزاد ان ہی کی مہربانی اور عنایت کی وجہ سے وہ اب تک اسپتال میں رہ رہی تھی۔

اب وہی بنفس نفیس خود چل کر اس کے پاس آئے تھے۔ اس نے نرس کے بتانے پر جلدی سے سر کو دوپٹے سے ڈھانپا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ جس کا جواب انہوں نے اسی شفقت سے دیا۔

”یہ آغا سکندر بخت صاحب ہیں مس خان، جنہوں نے آپ کی علالت کے دوران نہ صرف آپ کی پوری پوری خبرگیری“ سرجن نے آغا صاحب سے اس کا تعارف کرانا چاہا تو وہ ان کی بات قطع کر کے ممنون سے لہجے میں بولی۔

”جی ہاں کرنل صاحب، گو مجھے آغا صاحب سے پہلے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ میرے بہت بڑے محسن اور مربی ہیں اور میں تو شاید مر کر دوبارہ بھی پیدا ہو جاؤں تب بھی ان کے احسانوں کا بدلہ نہیں اتار سکوں گی۔“

”ارے ارے۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی۔ میں نے تو تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اور نہ اس وقت تمہارے پاس اس غرض سے آیا ہوں کہ تمہارے منہ سے اپنے احسانوں کا ذکر سن کر خوشی اور فخر محسوس کروں۔ میں تو صرف تمہاری خیریت پوچھنے اور تمہارے پاس بیٹھ کر تم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔ بشرطیکہ تم پسند کرو۔“

گل جان یا آغا صاحب نے بڑی یگانگت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ عنبر سمجھ تو گئی کہ وہ کیا باتیں ہو سکتی ہیں جو وہ کہنے آئے ہیں۔ اور کچھ چپ سی بھی ہو گئی۔ اور دھیمے سے لہجے میں بولی۔

”آپ تشریف رکھیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ اس کی گفتگو سے آغا صاحب کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے۔ وہ اس کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور انہیں بیٹھتا دیکھ کر ڈاکٹر اور نرس سمیت سرجن بھی اس کے کمرے سے نکل گئے۔ تب ادھر ادھر کی باتوں کے بعد آغا صاحب نے اس سے وہی سوال کیا جو سرجن، ڈاکٹر اور نرس اس سے متعدد بار کر چکے تھے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہا۔ اس نے اپنے بارے میں کچھ بتا کر ہی نہیں دیا۔ اور جب عاجز آ کر آغا صاحب نے اسے یہ بتانے کے بعد کہ اب وہ مزید ایک دن بھی اسپتال میں نہیں رہ سکتی۔ اسے بیٹی بنانے کی پیشکش کے ساتھ ساتھ اسے اپنے گھر لے جا کر اپنے پاس رکھنے کی تجویز پیش کی تو جواب میں اس نے کہا۔

”میں آپ کو اپنے والد کا درجہ دیتی ہوں آغا صاحب! حالانکہ میں نے آپ کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اس کے باوجود بھی آپ کے لیے میرے دل میں کچھ ایسے ہی جذبات تھے۔ اس پر آپ میرے محسن بھی ہیں۔ اور کسی کے احسانوں کا بدلہ تو کوئی اتار ہی نہیں سکتا لیکن آپ کے احسانات کے پیش نظر مجھ پر یہ لازم تھا کہ آپ کے گھر چلنے کی پیشکش کو فوراً قبول کر لوں۔ لیکن سر! میری بھی کچھ مجبوریاں اور مصلحتیں ہیں۔ اور میں آپ سے صرف اتنی درخواست کر دوں گی کہ آپ فی الوقت مجھے کسی دارالامان جیسے ادارے میں داخل کر دیں۔ لیکن حقیقت میں روٹیاں توڑنے کے لیے نہیں بلکہ وہاں کسی کام پر لگوا دیں کیونکہ بفضل تعالیٰ میں پڑھی لکھی ہوں اور آفس ورک کرنے کے علاوہ معلّمہ بننے کی بھی صلاحیت رکھتی ہوں۔ یہ آپ کا میرے اوپر سب سے بڑا احسان ہوگا۔“ اس نے بلاتمہید اور بلاتوقف یہ ساری بات کہی تو آغا صاحب بھی سوچ میں پڑ گئے۔ جہاندیدہ شخص تھے انہیں بھی مصلحتوں اور نزاکتوں کا پورا پورا احساس تھا کہ لاکھ وہ اس کے محسن اور مربی سہی لیکن ایک اجنبی جوان اور معاشرے کے بھٹکے ہوئے لوگوں سے چوٹ کھائی ہوئی لڑکی ایک دم ہی تو آنکھیں بند کر کے ان پر اعتماد نہیں کرے گی۔ اور پھر یہ بیٹی وبیٹی بنانے کی پیشکش بھی انہوں نے اسے اس قدر بے بس اور بے سہارا دیکھ کر ہی کی تھی۔ اب وہ ان کی پیشکش کو ٹھکرا رہی تھی تو وہ اسے مجبور تو نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے خوب تسلی دلاسا دیا۔ حتیٰ کہ جلد ہی کسی دارالامان میں داخل کرانے کا وعدہ بھی کر لیا۔ اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

پھر اسے تیسرے دن ہی انجمن فلاح و بہبود برائے خواتین کے ایک ادارے القدسیہ میں داخل کرا دیا گیا۔

اس نے تو آغا صاحب سے یہی درخواست کی تھی کہ ادارے میں اسے ملازمت پر لگا دیا جائے۔ مگر وہاں انہوں نے اسے ملازمت پر لگانے کے بجائے ایک طرح بیگار پر لگا دیا تھا۔ کیونکہ وہاں اس جیسی اور بھی کئی لاوارث اور بے سہارا لڑکیاں تھیں۔ جن سے کھانا پکانے، کپڑے دھونے، جھاڑو بہارو اور دستکاری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور یہ سارے کام لڑکیاں مل جل کر اپنی اپنی باری سے کیا کرتی تھیں۔

اصل میں اس ادارے کو چند مخیر اور صاحب ثروت افراد نے سماجی کارکن اور کرتا دھرتا قسم کی خواتین کی شراکت میں قائم کیا تھا۔ مخیر افراد اس کے لیے ماہانہ ایک مقرر کردہ فنڈ جمع کر دیا کرتے تھے۔ اور باقی اخراجات لڑکیوں کے ہاتھوں بنی دستکاری سے پورے کیے جاتے تھے۔ سوائے نگران خاتون، منتظمہ اور چپراسیوں کے کسی کو کوئی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی۔ سوشل ورکرز اس ادارے کے لیے جو خدمات بھی انجام دیتی تھیں محض فی سبیل اللہ ہی دیتی تھیں۔ عنبر کے ساتھ شاید آغا صاحب کی وجہ سے کچھ رعایت برتی گئی تھی۔ کہ اس سے جھاڑو لیپ نچھا۔ اور کپڑے وغیرہ دھونے کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ البتہ کھانے پکانے اور دستکاری کا کام اس کے ذمہ ضرور ڈالا گیا تھا۔ جبکہ دستکاری سے اسے تھوڑا سا بھی شغف نہ تھا۔ پھر بھی مارے باندھے وہ یہ کام کر دیا کرتی تھی۔ اصل میں وہاں کا ماحول اس کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ وہ اپنی زندگی رائیگاں کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس پر وہاں پر پناہ گزیں لڑکیاں بھی علیحدہ علیحدہ طبقوں کی تھیں۔ اس لیے ان کی عادات و اطوار بھی یکسر جداگانہ تھیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ سب کی سب تقریباً ان پڑھ تھیں۔ عنبر تو یوں بھی پیدا ہوتے ہی وقت کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ اور اب تو گویا اس پر کڑا وقت پڑا تھا۔ ایسی آزمائش

کہ جس نے اُس کے لبوں سے مسکراہٹ اور زبان سے گویائی بھی چھین لی تھی۔ وہ بیشتر وقت مایوس اور کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ اسپتال میں بھی رہائش کے دوران خاموش لیٹی اور بیٹھی نہ معلوم کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔

تو سُرور انگیز یادیں ہی احساسات اور خیالات میں چشمک زنی کرتی نظر آتیں۔ اور یہاں آکر تو وہ کچھ زیادہ ہی سوچنے لگی تھی۔ نہ معلوم امی کیسی ہوں گی اور کس حال میں ہوں گی۔

میری جُدائی کے غم اور رسوائی کے زخم کو انہوں نے کیونکر سہا ہوگا۔ اب تو پورے محلّے میں یہ بات الم نشرح ہوگئی ہوگی کہ عنبر کہیں غائب ہے یا پھر اغوا کر لی گئی ہے۔

ہائے محلے والوں اور پاس پڑوس کے لوگوں نے تو میری غم زدہ ماں کو جینے کے قابل ہی نہیں چھوڑا ہوگا۔ اُف نہیں نہیں۔ خدا کرے امی کو میری عمر بھی لگ جائے۔ اور میرے بہن اور بھائی۔

اُن کے دلوں اور غیرت پر کیا بیتی ہوگی۔ عید بھی ایک قیامت بن کر گزری ہوگی۔ وہ گھر سے باہر نکلتے ہوں گے تو کس طرح لوگوں کی زہر آلود نظروں کا مقابلہ کرتے ہوں گے۔

اُن کے کانوں میں سیسے کی طرح کیسے کیسے طعنے اتارے جاتے ہوں گے۔ کیسا عذاب جھیلنا پڑتا ہوگا انہیں۔

وہ کیسی منحوس گھڑی تھی جب میں امی کے منع کرنے کے باوجود صرف ایک معقول ملازمت کے لالچ میں گھر سے نکلی تھی۔

اس سے تو بہتر تھا کہ میں مر ہی جاتی۔

آخر میرے جینے کا مصرف ہی کیا ہے؟

جہاں بھی رہوں گی اسی طرح بے بس اور ذلیل و خوار ہو کر۔ دوسروں کے رحم و کرم پر۔ دوسروں کی محتاج ہو کر۔

آخر یہ بی۔ اے تک کی تعلیم میرے کس کام آئی۔

اور یہ صورت شکل اور اٹھان۔

اُف پیسے اور عزّت کے بغیر یہ سب کچھ ہیچ ہے۔

نہ معلوم میری یہ بُری تقدیر مزید کیا کیا رنگ دکھلائے گی۔ پھر اس کے خیالات کا دھارا اسے ماضی بعید میں لے جاتا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد کی ایک ایک بات۔ ایک ایک یاد اس کے دل میں کچوکے سے لگانے لگتی۔

ریحان سے اپنا رشتہ۔

اپنی یک طرفہ محبت۔

خود کو کئی برس تک فریب دیتے رہنا۔

اور پھر ایک دم ہی ریحان کی اصلیت کی قلعی کھلنا۔

وہ سوچتی کہ اس نے تو خود کو تایا کے لیول پر لانے کی غرض سے اتنے پاپڑ بیلے تھے۔

یعنی انگریزی بولنی اور سمجھنی سیکھی تھی۔

اخلاق و آداب۔ اور علم مجلسی سیکھے تھے۔

تعلیم بھی صرف اسی شوق میں حاصل کی تھی کہ وہ تایا کی بہو بن کر کسی معاملے میں ان کی اولاد سے پیچھے نہیں رہے۔

مگر جب خود ریحان نے اُس سے منگنی توڑ کر اپنے ہاتھوں سے اس کی ساری محنت اور لگن پر پانی پھیر دیا تھا اس کے بعد بھی وہ تایا کی اولاد کی ریس اور برابری کرنے میں لگی رہی۔ اور نتیجے میں اسے کیا ملا۔ یہ ذلت اور رسوائی۔

اور اپنی ماں، بہن بھائی اور گھر سے ہمیشہ کے لیے جُدائی۔

اف رنج ہی رنج تھا۔

پچھتاوا ہی پچھتاوا تھا۔

مستقبل بھی ایسا تاریک نظر آرہا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کا سرے سے کوئی مستقبل ہی نہ رہا ہو۔

اور تعجب کی بات یہ تھی کہ ان ساری سوچوں اور باتوں کے پیچھے ہمیشہ ایک سراپا سا جھلک مارتا نظر آتا۔

ایک مہربان اور مخلص سا سراپا۔

ہمدرد اور بہی خواہ سی صورت۔

جو ہر لحاظ سے ریحان سے بدرجہا بہتر تھی۔

ہاں وہی شخص۔ جسے اُس نے ہمیشہ پھٹکارا اور دھتکارا ہی تھا۔

سدا پچھوڑا اور حقیر ہی جانا تھا۔ جس کی بات سننی تو درکنار، شکل تک دیکھنی گوارا نہ تھی۔

جو اسے مجسم زہر لگتا تھا زہر۔

وہی ناپسندیدہ اور قابل نفرت شخص جانے کیوں اور کیسے بار بار اس کے خیالوں میں حائل ہو کر اس کے دل میں ایک میٹھی سی کسک پیدا کرتا نظر آتا تھا۔

وہ اتنی شدّت سے اس کے خیالوں پر محیط ہوتا کہ وہ اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی۔

اور جو کچھ بھی سوچتی بڑے پچھتاوے اور ندامت کے ساتھ ہی سوچتی تھی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان کی قدر اس کے زندگی سے نکل جانے کے بعد ہی ہوتی ہے۔

اور وہ بھی اب اس کی زندگی سے نکل گیا تھا۔

ہمیشہ کے لیے اُس سے دُور چلا گیا تھا۔

کہ اب وہ مُنہ رکھتی بھی نہ اتنی ہمت کہ اس سے سامنا کر سکے۔ کہ اس کی ایک ذرا سی لغزش نے۔ ایک غلط قدم نے اسے بھی مُنہ دکھانے کے قابل نہ رکھا تھا۔

وہ جو اس سے اتنی محبت کرتا تھا۔ اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ اس کی عزّت کرتا تھا۔

اس کی نظروں میں بھی اب وہ ہمیشہ کے لیے گر گئی تھی۔

دُنیا کا کوئی بھی مرد اتنا بڑا ظرف نہیں رکھتا جو اپنی چاہتیں ایک ایسی لڑکی پر نچھاور کرتا ہے جس کا کردار مشکوک ہو۔

جو خواری کی دلدل میں گلے تک دھنس گئی ہو۔

وہ بڑے دُکھ سے سوچتی۔

یہ بہت صاف اور واضح ثبوت ہے میری اس نا قدری کا جو میں اس اتنے محبت کرنے والے پیارے سے انسان کے ساتھ کرتی رہی ہوں۔ یہ سزا ہے میرے غرور و ناز کی جو مجھے خود پر تھا۔ اُف کتنے پیارے پیارے لوگ میری سرکشی اور حیثیت بنانے کے چکّر میں مجھ سے جُدا ہو گئے۔ یہی غم تو تھا جس نے اُس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین لی تھی۔ زبان کو کیل ڈالا تھا۔

بس ایک دماغ ہی تھا جس میں ہمہ وقت خیالات کی برقی لہریں سی دوڑتی رہتی تھیں۔

اسے القدوسیہ میں آئے بیس بائیس روز ہو گئے تھے۔ اور ان بیس بائیس دنوں میں اور تو کسی کے آنے کا امکان نہ تھا۔ مگر آغا صاحب نے بھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اور اگر نہیں بھی لی تھی تو اس سے ان کا کوئی واسطہ تھا نہ تعلق۔ بلکہ ان کا یہی احسان کیا کم تھا کہ انہوں نے اس کی خواہش کے مطابق اسے القدوسیہ میں بھجوا دیا تھا۔ جہاں کم از کم اُسے ہر طرح کا تحفظ تو میسّر تھا۔ مگر وہاں گزرتا ایک ایک دن اس کے لیے سوہان روح بنتا جا رہا تھا۔ کیونکہ اپنی ٹوٹی ہوئی زندگی کو یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ رسوائی کا داغ ضرور لگ گیا تھا مگر اس کا اپنا دامن اور کردار تو بے داغ تھا۔ اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کی خود داری خواہ کتنی ہی مجروح کیوں نہ ہو وہ کسی طرح آغا صاحب تک رسائی حاصل کر کے ان کی وساطت سے کوئی نہ کوئی ملازمت ضرور حاصل کرے گی۔ اور اس روز وہ آغا صاحب کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ تبھی ایک چپراسی نے آکر اسے اطلاع دی کہ کوئی شخص اُس سے ملنے آیا ہے۔

وہ کون شخص ہو سکتا ہے؟ آغا صاحب کی آمد اتنی خاموشی سے تو نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان کا شمار ان مخیّر افراد میں ہوتا تھا جو اس ادارے کی کفالت کر رہے تھے۔

کہیں ملاقات کے لیے آنے والا یہ شخص کوئی پولیس والا تو نہیں۔ اُف کہیں ڈی۔ ایس۔ پی شرف نہ آئے ہوں۔ اس خیال نے تو اسے بوکھلا سا دیا۔ کیونکہ وہ پولیس والوں کا سامنا کرنے سے کتراتی رہی تھی۔ بہر طور ملاقات کے لیے آنے والے سے ملنے تو جانا ہی تھا۔ اس لیے قرینے سے دوپٹا اوڑھ کر وہ ادارے کے آفس میں پہنچی۔ اور

ملاقات کے لیے آنے والے کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔
وہ سعد تھا۔
جو ایک خوش رنگ سے سوٹ میں ملبوس۔ اس کی نظروں کے سامنے کھڑا ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔
یوں جیسے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔
یا پھر پہلی بار دیکھا ہو۔
اس کی روشن سی آنکھوں میں شوق و مسرت کے چاند سے مسکرا رہے تھے۔ جبکہ وجیہہ سے چہرے پر بے یقینی کا تعجب آمیز سا تاثر تھا۔ مگر عنبر نے اپنی شرمندگی اور ندامت میں اس کی طرف دیکھا ہی کہاں۔ وہ تو نگاہیں جھکائے کچھ اس انداز میں کھڑی تھی جیسے اسے دیکھ کر اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔
آفس میں اس وقت وہ چپراسن جو اسے اطلاع دینے گئی تھی اور نگران خاتون بھی موجود تھی۔ سعد نے عنبر کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔
"یہ میری کزن ہی نہیں بلکہ منگیتر بھی ہیں۔ میڈم کیا مجھے تنہائی میں ان سے گفتگو کرنے کی اجازت مل سکتی ہے؟"
نگران خاتون نے سعد کی بات سُن کر عنبر کی طرف دیکھا۔ جو ہنوز نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔
"یہ ہمارے اصول کی خلاف ورزی ضرور ہے لیکن میں آپ کو اجازت ضرور دوں گی۔ لیکن خیال رہے کہ پانچ منٹ سے زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے ان سے گفتگو کرتے ہیں۔" اور پھر اس نے عنبر سے کہا کہ وہ بغلی کمرے میں جو وزیٹرز کے لیے مختص ہے' سعد کو لے کر چلی جائے۔ عنبر نے تو سعد کو اس کمرے میں لے جانے میں تامل ہی کیا مگر سعد خود ہی قدم بڑھاتا۔ آیئے کہتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ تو ناچار اسے بھی اس کے پیچھے اس کمرے میں آنا پڑا۔ وقت چونکہ بہت کم تھا گفتگو کرنے کا اس لیے سعد نے بلا توقف کہا۔
"مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ سے سخت نفرت کرتی ہیں اور میرا آنا آپ کو سخت ناگوار گزرا ہے کجا کہ آپ کو اپنا منگیتر ظاہر کرنا۔ مگر میں بھی کیا کرتا مصلحت کا کچھ تقاضا ہی یہی تھا۔"
اور جواب میں وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ نہیں نہیں میں تو آپ سے بالکل نفرت نہیں کرتی اور نہ ہی آپ کی آمد مجھے ناگوار گزری ہے۔ اور جس مصلحت کے تحت آپ نے مجھے منگیتر کہا اس کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ مگر وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ کہ یوں لگا جیسے زبان تالو سے چپک گئی ہو اور ہونٹوں پر بھاری تالے سے پڑ گئے ہوں۔
"ٹھیک ہے اگر میری آمد آپ کو ناگوار گزری تو اب یہ کہنا کہ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں حماقت ہی ہوگا کیونکہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ واپس نہیں لیے جا سکتے البتہ میں آپ سے معذرت ضرور چاہوں گا۔"
وہ اُسے خاموش دیکھ کر سنجیدہ سا ہو کر بولا۔ اور وہ تو پہلے ہی اپنی صفائی پیش کرنا چاہ رہی تھی اور بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ اس کی بات پر بے کل سی ہو کر بولی۔
"اب یہ سب کہہ کر مجھے اتنا شرمندہ بھی نہ کیجیے کہ میں خود اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں۔ میں تو پہلے اپنی صفائی پیش کرنا چاہ رہی تھی۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ میرا دامن ہر آلودگی سے پاک ہے۔ میں... میں خدا کے فضل و کرم سے ان درندہ صفت لوگوں کے ناپاک ارادوں کی بھینٹ نہیں چڑھی۔ اس بات کی تصدیق آپ میرے اسپتال کے ریکارڈ سے بھی کر سکتے ہیں۔" یہ بات اٹک اٹک کر کہتے ہوئے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں اشکوں کی بدلیاں سی اُمنڈ آئیں۔ اور وہ جیسے تڑپ سا اُٹھا۔
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو عنبر۔ میں ایک ایسی واہیات بات کی تصدیق کرنے تو تمہارے پاس نہیں آیا۔ یہ میری اور تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تم آج بھی کنواری مریم کی طرح پاک اور صاف ہو۔ لیکن اگر خدانخواستہ نہ بھی ہوتیں تب بھی یہ تمہارا دیوانہ سعد آنکھیں بند کر کے تمہارا ہاتھ تھام لیتا۔"
وہ اس کے نزدیک ہو کر اس کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر بولا۔ تو عنبر نے ڈبڈبائی آنکھوں میں سارے زمانے کی بے یقینی بھر کر اُس کی طرف دیکھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر صداقت کی کرنیں سی دمک رہی تھیں۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"تم کو شاید سچی محبت کی گہرائی اور شدت کا اندازہ نہیں عنبر! جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے تو اس میں وہ ذات پات کو اہمیت دیتا ہے نہ ایک دوسرے کے عیوب اور برائیوں کو ہی گرداتا ہے۔ میں تو اس وقت گھر سے یہ قصد کر کے چلا تھا کہ آج میں اپنے اس سچے اور یک طرفہ جذبے کے بل بوتے پر تم سے تمہاری محبت کی بھیک مانگوں گا۔ بلکہ تم سے تم کو مانگوں گا۔ اور خواہ تم مجھے بُری طرح ٹھکرا بھی دو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لا کر ہی دم لوں گا۔"
وہ آپ سے تم پر اُتر آیا تھا اور جو کچھ کہہ رہا تھا عنبر کو اپنی سماعت پر کسی طرح یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے بہتے ہوئے اشکوں کو اپنے دوپٹے میں جذب کر کے آبگوں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور روٹھی ہوئی مسکراہٹ کو بہت دنوں بعد اپنے چہرے پر سجا کر آہستہ سے بولی۔
"آپ مجھے مجھ سے مانگنے آئے تھے اور میں نے آج اپنا سب کچھ آپ کو سونپ دیا ہے۔ اس جذبے سے مغلوب ہو کر جو عرصے سے آپ کے لیے میرے دل میں بھی آبسا تھا۔"
"اچھا کیا واقعی؟" سعد نے خوش ہو کر پوچھا۔
"ہاں واقعی۔" وہ آہستہ سے بولی۔
"اچھا تو پھر ابھی میرے ساتھ میرے گھر چلو۔" سعد نے بے تابانہ سے انداز میں کہا۔
"چلنے میں مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن آغا صاحب کی اجازت کے بغیر میرا یہاں سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔" عنبر نے مجوبہ سے انداز میں کہا۔ اس کا نازک سا دل بھی خوشی سے جھوم رہا تھا۔

"لیکن میں آغا صاحب سے اجازت لے کر ہی یہاں آیا ہوں۔ یہ ان کا لیٹر بھی ہے میرے پاس۔ اب تو آپ کو کوئی تامل نہیں ہوگا میرے ساتھ چلنے میں۔"
سعد جیب سے آغا صاحب کا وہ خط نکالتا ہوا بولا جو انہوں نے نگران خاتون کے نام لکھا تھا۔
"بالکل نہیں۔" اس نے دھیرے سے مسکرا کر پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا مگر پھر فوراً ہی اس کی جذبوں کی لپک دیتی آنکھوں کی تاب نہ لا کر اس نے نگاہیں جھکا لیں اور نگران خاتون سے اجازت لینے چل دی۔
سہ پہر کے ساڑھے چار کا عمل تھا۔
عذیر حسبِ معمول اسکول گیا ہوا تھا۔
چھوٹی کالج سے آ کر کھانا کھانے کے بعد بستر پر لیٹی تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ بھی بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ اور دوسرے پلنگ پر خورشید جہاں بظاہر تو سو رہی تھیں مگر وقفے وقفے سے کروٹ بدلتے وقت آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر ضرور دیکھ لیتی تھیں۔ ان کی مثال ایک زندہ لاشے کی سی ہو گئی تھی۔
کہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھیں۔
آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔
انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بس زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔
کہ ان پر افتاد ہی کچھ ایسی پڑی تھی۔
پریشانی۔ رسوائی۔ ذلت و خواری اس پر فاقہ فقر اور عسرت۔ ایسے حالات میں زندگی کے عذاب جھیلتے جھیلتے انسان عموماً اپنی موت ہی مانگتا ہے مگر افسوس کہ اسے موت بھی نہیں ملتی البتہ وہ خود مُردوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ جبکہ ان بے چاری کی زندگی تو دُکھوں اور آزمائشوں سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔
پہلے چند روز تک بیٹی کے مل جانے کی امید اس کے بعد مکمل ناامیدی۔ مایوسی۔
اس پر رسوائی کا خوف۔ جو ہو کر رہی۔
اس پر مستزاد غربت و افلاس۔
کہ جب تک کرائے داروں کا کرایہ ہاتھ میں ہوتا تھا اس وقت تک تو کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح پیٹ کا دوزخ

بھرتا رہتا تھا۔

اس کے بعد تو آخری تاریخوں تک زیادہ تر فاقے ہی کرنے پڑتے تھے۔ گھر پر نظر ڈالو تو بالکل خالی اور ویران سا لگتا تھا۔ گھر کی بعض کرسیاں اور برتن بھی پیٹ کا ایندھن بن گئے تھے۔

حتیٰ کہ خود چھوٹی کی صحت بھی کافی متاثر ہوئی تھی۔ اور رنگت بھی سنولا گئی تھی۔ کہ اس سال گرمی بھی اتنی شدید پڑی تھی کہ چیل سچ مچ انڈا چھوڑتی نظر آتی تھی۔

اب تو چونکہ عنبر کے ملنے کی ہر آس ہی ٹوٹ گئی تھی اس لیے خورشید جہاں اس کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ یہی دعا کرتی تھیں کہ وہ نہ ہی آئے تو بہتر ہے کیونکہ اس کی آمد ان کے لیے مزید رسوائی اور خواری کا باعث ہی ہو گی۔

انہوں نے صبر کی وزنی سل سے اپنی ممتا کی تڑپ کو جس طرح کچلا تھا یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔

وہ دن بھی آخری تاریخوں کا ایک دن ہی تھا۔

چھوٹی کے حصے کی آدھی روٹی بچی تھی۔ جسے مسور کی پتلی آنسو دال کے ساتھ حلق سے اتار کر وہ سو گئی تھی۔ کہ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو خورشید جہاں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"اے اٹھو چھوٹی ذرا دیکھو تو دروازے پر کون آیا ہے۔" تو چھوٹی نے کروٹ بدلتے ہوئے نیم خوابیدہ سی کیفیت میں کہا۔

"اس وقت کون آ سکتا ہے امی۔ ابھی تو عذیر کے آنے کا وقت بھی نہیں ہوا۔"

"مگر کوئی آیا ضرور ہے۔ ابھی ابھی کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ تم جا کر دیکھو تو۔" خورشید جہاں بولیں۔

"اوہو امی۔ آپ کے کان بجے ہوں گے ورنہ میں نے تو کوئی کھٹکا نہیں سنا۔" نیند میں خلل پڑنے کی وجہ سے چھوٹی سخت جھنجلاہٹ کے عالم میں اٹھ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"لو اب میں ایسی بھی نہیں سٹھیائی کہ میرے کان بھی بجنے لگے ہوں۔"

خورشید جہاں نے اتنا ہی کہا تھا کہ تبھی دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ تو ماں کو جھٹلانے پر ان کی صلواتیں سننے سے پہلے ہی چھوٹی جلدی سے اٹھ کر بیٹھک میں چلی گئی۔ اور آگے بڑھ کر کھٹکا کھولا۔ اور دہلیز کے آگے بہت غیر متوقع سعد کو کھڑا دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"بھئی السلام علیکم۔ پہچانتی نہیں کیا جو یوں اجنبیوں کی طرح کھڑی میری شکل تک رہی ہو۔ تیور بھی خاصے خونخوار نظر آ رہے ہیں تمہارے۔" سعد نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی نہیں، بلکہ سخت حیران ہوں یہ دیکھ کر آج آپ کیسے راستہ بھول کر ادھر آ نکلے۔" کہنے کو ہزاروں شکوے تھے اور کہنے کو بہت سی باتیں مگر چھوٹی بڑے تلخ سے انداز میں صرف اسی قدر کہہ سکی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ وہ اس سے سخت شاکی اور کبیدہ ہو گی مگر وہ انجان سا بن گیا۔

"کمال ہے تم بھی کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں اور بھلا اس گھر کا راستہ کبھی بھول سکتا ہوں۔ اس گھر سے تو میری ساری امیدیں وابستہ ہیں۔" وہ تھا کہ ایکساں مسکرائے ہی جا رہا تھا۔

"جی ہاں ضرور۔ تبھی تو ہمیں بیچ منجدھار میں چھوڑ کر ایسے غائب ہوئے کہ آج کہیں جا کر شکل دکھائی ہے۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ ہم پر کیا کیا قیامتیں گزر گئی ہوں گی۔" اس کی بات سے زیادہ چھوٹی اس کے مسکرانے پر جل کر بولی۔

"ارے بھئی وہ تو ہم پر بھی یکساں ہی گزری ہیں۔ خیر یہ گلے شکوے تو تم بعد میں کر لینا پہلے مجھے اندر آنے کی اجازت تو دے دو۔ اس وقت تو میں تمہاری بھابھی کو تم سے ملوانے لایا ہوں۔"

سعد نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا۔ تو اس کی بات کو مذاق پر محمول کرتے ہوئے اس نے تنک کر کہا۔

"واہ آپ بھی عجیب انسان ہیں سعد بھائی۔ یہاں ہماری جانوں پر بنی ہے۔ ایک منٹ بھی سکھ کا سانس لینے کی ہمیں اجازت نہیں اور آپ کو مذاق سوجھا ہے۔ کمال ہے انسان کو اتنا بے حس بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

"اُفوہ بھئی تم نہ معلوم کیا سمجھ رہی ہو۔ میں مذاق کیوں کرنے لگا۔ بلکہ سیدھی سی بات ہے کہ ابھی پچھلے ماہ میری شادی ہوئی ہے اور آج میں اپنی بیوی کو تم سے ملوانے لایا ہوں۔ لیکن اگر تم اس سے ملنا پسند نہیں کرتیں تو میں اسے واپس لیے جاتا ہوں۔" سعد نے بہت سنجیدگی سے اسے اپنی شادی کی خبر سنائی۔ تو چھوٹی کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں لے کر بڑی بے دردی سے بھینچ دیا ہو۔ اس نے اچک کر سعد کے پیچھے دیکھا۔ سامنے گاڑی میں صرف زرق برق لباس کی جھلک ہی نظر آ سکی۔ گو اس کا دل سعد کی بیوی سے ملنے کو بالکل نہ چاہا مگر اب وہ اسے لے ہی آیا تھا تو وہ انکار تو نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ جلے کٹے انداز میں اتنا ضرور بولی۔

"خیر پسند کرنا یا نہ کرنا تو علیحدہ بات ہے مگر اب آپ اپنی بیوی کو لے ہی آئے ہیں تو انہیں اندر بلائیے۔ لیکن کیا یہاں آنے سے پہلے آپ نے انہیں یہ بھی بتایا ہے کہ آپ انہیں ایسے فقنڈ لوگوں سے ملوانے لے جا رہے ہیں جو انہیں ایک گلاس شربت پلانے کے بھی قابل نہیں ہیں۔"

"اوہو تم بھی کیسی واہیات باتیں سوچتی ہو۔ میں اسے تمہارے گھر یا حیثیت سے ملوانے نہیں لایا بلکہ تم سے اور اپنی پھپھو سے ملوانے لایا ہوں اور اس کے لیے یہی سمجھ لینا بہت کافی ہے۔ چلو جاؤ اندر جا کر پھپھو جان کو ہمارے آنے کی اطلاع دو۔"

سعد نے اسے بری طرح جھڑک کر کہا تو وہ منہ پھلائے ماں کو اطلاع دینے کمرے میں چل دی۔ "اتنے دن بعد آئے ہیں تو ہمارا احوال پوچھا نہ آپا کے بارے میں کچھ معلوم کیا۔ بلکہ مزے سے اپنی شادی رچا کر ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے اپنی بیوی کو ملوانے کے لیے آ گئے۔" چھوٹی نے سخت کوفت کے عالم میں سوچا۔ جبکہ سعد کو بہنوئی کے روپ میں دیکھنا اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ اور بہن نہ معلوم کہاں گم ہو گئی تھی۔ کس حال میں تھی۔ زندہ بھی تھی یا۔ انہی دل آزار خیالوں میں الجھی۔ ماں کے پاس پہنچنے کے باوجود وہ انہیں سعد اور اس کی بیوی کی آمد کی اطلاع نہیں دے سکی۔ وہ تو سعد خود ہی اس کے پیچھے آ گیا۔ اور بڑے پرجوش انداز میں خورشید جہاں کو سلام کیا۔ جواب میں انہوں نے منہ ہی منہ میں اس کے سلام کا جواب دیا۔ کہ وہ اس سے سخت شاکی اور کبیدہ تھیں۔ اس نے واقعی انہیں بیچ منجدھار میں چھوڑ کر پلٹ کر ان کی خبر ہی نہیں لی تھی۔ اور اتنی ساری قیامتوں کو انہوں نے تن تنہا اپنے اوپر سے گزارا تھا۔ پھر بھلا وہ اس کی آمد کو کیا اہمیت دیتیں۔ روٹھے روٹھے سے انداز میں خاموش بیٹھی رہیں۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی پھپھو جان؟" سعد نے ان کے قریب ہی پلنگ کی پٹی پر ٹک کر پوچھا۔

"بس زندہ ہیں بلکہ زندگی کے دن گن رہے ہیں۔" وہ سخت نروٹھے پن سے بولیں۔

"اوہو تو سخت خفا ہیں میری پھپھو جان مجھ سے۔ ہاں ہونا بھی چاہیے۔ میں واقعی بقول چھوٹی بیچ منجدھار آپ کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مگر میری بھی کچھ مجبوری تھی پھپھو جان۔ میری طلبی کے ساتھ ساتھ اماں بیگم کی علالت کا تار آیا تھا اس لیے مجھے فوراً ہی ملتان جانا پڑا تھا۔" اس نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

"اچھا تو کیا تم اب تک ملتان میں ہی تھے۔" خورشید جہاں نے چبھتے سے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں وہیں تھا۔ وہ اصل میں۔" اس نے گدی کھجاتے ہوئے اس امید میں چھوٹی کی طرف دیکھا کہ وہی انہیں اس کی شادی کی خبر سنا دے مگر دل کو آزار پہنچانے والی یہ خبر ماں کو سنانی چھوٹی کو گوارا نہیں ہوئی۔ اس کا دل تو بہت کچھ یاد کر کے بھرا چلا آ رہا تھا۔ آخر سعد کو خود ہی انہیں یہ خبر سنانی پڑی۔

"وہ اصل میں پھپھو جان! اماں جان کی علالت سنجیدگی اختیار کر گئی تھی اور ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں میرا سہرا دیکھ لیں۔ چنانچہ میرے بہت انکار کے باوجود انہوں نے میری شادی کر کے ہی دم لیا۔" اور خورشید جہاں کے غم زدہ دل پر اس خبر سے ایک دھچکا سا پڑا۔ تھوڑی دیر کو تو وہ کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہیں کہ ان کی تو دلی خواہش تھی کہ سعد ان کا داماد بنے مگر وہاں میدان کسی اور لڑکی نے مار لیا تھا۔

"اچھا تو تم شادی کر کے آئے ہو۔" چند ثانیے بعد انہوں نے یوں کہا جیسے اس نے ان کے سامنے محض بڑ ہانکی ہو۔

"جی ہاں نہ صرف شادی کر کے آیا ہوں بلکہ آپ کو سلام کرانے اپنی بیوی کو ساتھ لایا ہوں — بھئی آ جاؤ نا ادھر گلبدن! آخر اس قدر شرمانے کی کیا بات ہے۔" اس نے خورشید جہاں کو جواب دے کر اپنی بیوی کو پکارا۔ وہ بیٹھک

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں آکر کمرے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے بُلانے پر بڑے ہلتے جلتے سے انداز میں چلتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ اُس نے تلّے کے کام کا سُرخ دوپٹہ اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اور چہرے کو پلّے سے گھونگٹ میں ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر چھوٹی کو نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ ہوا۔ کہ جب انسان کا اپنا دل خوش نہ ہو تو دوسرے کی خوشی بھی بے مزہ سی لگتی ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ سعد کی نئی نویلی دُلہن اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش میں کس بُری طرح کانپ رہی ہے۔ اور کمرے میں آتے ہی جونہی اس کی نظر خورشید جہاں پر پڑی ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ گھونگٹ اُٹھا کر روتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی۔

خورشید جہاں کو ایک جھٹکے کے ساتھ دنوں بعد بڑے غیر متوقع طور پر اور اچانک گمشدہ بیٹی کا چہرہ نظر آیا۔ تو ان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یا پھر اس کے زندہ سلامت اور صحیح وسالم مل جانے کی خوشی نے انہیں شادیٔ مرگ کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

کچھ دیر کے لیے تو واقعی ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

جو وہ گم صم اور ساکت وصامت سی ہو کر رہ گئی تھیں۔

ادھر عنبر صرف امّی امّی کی رٹ لگائے اشکوں کا دریا بہائے جا رہی تھی۔ شدّت گریہ نے شاید اس کی زبان کو کیل رکھا تھا۔

چھوٹی بھی اس کے پاس ہی فرش پر اکڑوں بیٹھ کر زور زور سے گریہ وزاری — کر رہی تھی۔ تبھی اچانک اشکوں کے بند ٹوٹے تو خورشید جہاں کی آنکھوں سے بھی طوفانی سی بارش ہونے لگی۔

"ارے تو کہاں کھو گئی تھی بچّی۔ تیری راہ دیکھتے دیکھتے تو میری آنکھوں کی جوت بھی ماند پڑ گئی۔ میں نے تو تیرے لیے کیسی کیسی اذیتیں اٹھائی ہیں۔ کس کس طرح تڑپی ہوں۔ کتنی دعائیں کی تھیں مَیں نے گڑگڑا کر ربّ رحیم سے۔ اسے میں تجھے کیسے بتاؤں کہ میرے دل پہ کیسی کیسی قیامتیں گزری ہیں۔ ارے میری بیٹی"، شاید وہ اتنے دِنوں کا دل پر پڑا پریشانیوں اور تکلیفوں کا بوجھ تھا جو الفاظ کے ذریعے زبان سے اتار رہی تھیں۔

سعد دل گرفتہ سا ہو کر بولا۔

"خدا کے لیے پھپھو جان اپنے دل کو سنبھالیے۔ یہ تو خوشی کا موقع ہے اور شکر کا مقام۔ جسے آپ آنسو بہا کر رائیگاں کر رہی ہیں۔ ذرا ان کو تو دیکھیے یہ آپ کی باتیں سُن کر کس قدر نڈھال ہو رہی ہیں"۔

"ہاں امّی آپ کی آواز بھی خاصی بلند ہو گئی ہے۔ پڑوسیوں نے سُن لیا تو وہ بھاگے بھاگے آپ کی خیریت پوچھنے آئیں گے"۔ چھوٹی نے بھی، جو بہن کے گھٹنے سے لگی ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اسے بھاڑ میں جائیں پڑوسی۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ خدا نے ہمیں سعد کی شکل میں ایک بڑا مضبوط سہارا مہیا کر دیا۔ اے میرا تو رواں رواں اس کا شکر ادا کر رہا ہے بچّے۔ یہ آنسو بھی خوشی کے آنسو ہیں بیٹے"۔

خورشید جہاں کو بھی سعد کے ٹوکنے پر احساس ہوا کہ ایک بڑی خوشی کے موقع پر انہیں اتنے زیادہ آنسو نہیں بہانے چاہئیں۔ مگر دل اور جذبات پر بھلا کسے اختیار ہوتا ہے۔ آنسوؤں پر بند باندھنے کی لاکھ کوشش پر بھی ان کی آنکھوں سے اشکوں کے قطرے گرتے ہی رہے۔ چھوٹی اس دوران بہن کی ایک ایک چیز کو بڑے شوق اور دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ گو عنبر نے میک اپ نہیں کر رکھا تھا۔ مگر ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک ضرور لگا رکھی تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے جڑاؤ جھالے۔ گلے میں دو بھاری جڑاؤ طلائی ہار۔ ہاتھوں میں طلائی کنگن اور چوڑیاں اور انگلیوں میں کئی کئی انگوٹھیاں۔ اسے اپنی بہن کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا۔ اور ادھر بہن، ماں کو مبالغہ آرائی سے کام لے کر سعد کی سکھائی ہوئی داستان یا روداد سُنانے لگی۔

"امّی! وہ عورتیں مجھے لے کر سیدھی غزل کے پاس پہنچیں اور وہاں میرے چیخنے چلّانے کے باوجود مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ میں روزے سے تھی اور انہوں نے مجھے کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں دیا تھا۔ اس پر خوف و دہشت۔ مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی تھی۔ پھر مجھے کچھ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ان عورتوں نے کب تک اور کتنے دن مجھے کمرے میں بند رکھا۔ ہاں اتنا یاد ہے رات کا وقت تھا جب دوبارہ انہوں نے مجھے کار میں سوار کر دیا اور کسی نامعلوم

جگہ کا رُخ کیا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ بڑا لمبا سفر تھا۔ جس کے دوران میں دوبارہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر ہوش میں آئی تو خود کو ان کی کار میں پڑا پایا۔ پھر اچانک ہی گولیاں چلنے کی آواز آئی اور سہم کر تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ تبھی میری نظر ان کے بازو پر پڑی جس سے ڈھیر سا خون بہہ رہا تھا۔ اتنا خون دیکھ کر میرے ہوش گم ہو گئے اور میں پھر بے ہوش ہو گئی"۔ تو سعد فوراً ہی بولا۔

"جی ہاں انہوں نے بے ہوش ہو کر تو اور بھی میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیے ورنہ میں اس گولی کی چوٹ برداشت کر جاتا جو میرے بازو میں پیوست ہو گئی تھی۔ وہ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ آگے جا کر مجھے دو شخص نظر آئے جن کی کار کے انجن میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ اور وہ اس خرابی کو دُور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ان کے قریب کار روک کر ان سے کہا کہ ڈاکوؤں نے مجھ پر گولیاں چلائی تھیں اس لیے ایک گولی میرے بازو میں پیوست ہو گئی ہے۔ آپ کو اگر جلد ہی اپنی کار کا انجن ٹھیک ہونے کی امّید نہیں تو پھر آپ اتنی زحمت کریں کہ میری کار میں بیٹھ جائیں اور مجھے جلد از جلد شہر کے کسی کلینک میں پہنچا دیں۔ کیونکہ میرے بازو سے کافی خون بہہ گیا ہے۔ ان نیک دل افراد نے بلا تامّل میری پیشکش کو قبول کر لیا اور میری کار میں بیٹھ کر مجھے شہر کے ایک اسپتال میں لے گئے جہاں مجھے اور انہیں داخل کرا کے۔ اور میرے ہاتھ میں کار کی چابی تھما کر وہ ایسے گئے کہ پھر کبھی اپنی شکل ہی نہیں دکھائی"۔

"ہاں اور پھر میرا علاج تو وہاں کچھ دن ہی ہوا مگر ان کا کافی دن تک ہوتا رہا۔ کیونکہ کافی خون بہہ جانے سے ان کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس لیے انہیں خون کی بوتلیں بھی چڑھائی گئیں"۔

"اے ہے حسبی اللہ"، خورشید جہاں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جی مگر مجھے تو ان سب باتوں کا بعد میں پتا چلا کیونکہ مجھے تو انہوں نے زبردستی اپنے ایک دوست کی والدہ کے پاس بھجوا دیا تھا جو بہت ہی مشفق اور مہربان خاتون ہیں"، عنبر بولی۔

"اسے تو تم یہاں اپنے گھر کیوں نہیں آ گئیں۔ کیا تمہیں میری پریشانی کا بھی خیال نہیں آیا"، خورشید جہاں شاکی سے انداز میں بولیں۔

"لیجیے امّی، آپا بھلا یہاں آتیں یہاں"، چھوٹی نے ماں کو مصلحت کا احساس دلایا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے مگر تم ملتان کیسے پہنچیں؟"، خورشید جہاں کو بس یہی جاننے کی پڑی تھی۔

"بتا تو رہی ہوں امّی۔ انہیں گولی لگنے کی خبر نہ معلوم کیسے ان کے گھر پہنچ گئی۔ فہد فوراً ہی بھاگے بھاگے آئے اور انہیں زبردستی ملتان لے گئے۔ کیونکہ اماں بیگم کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی۔ ان کی پریشانی میں۔ پھر ایک دن"، اتنا کہہ کر عنبر خاموش سی ہو کر سوچنے لگی کہ اب مزید کیا قصّہ گھڑے۔ مگر سعد نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور جلدی سے بولا۔

"پھر ایک دن اماں بیگم کی خواہش پر فہد انہیں لے کر ملتان پہنچ گیا۔ اماں بیگم تو انہیں دیکھتے ہی اُن پر ہزار جان سے عاشق ہو گئیں۔ اور پھر ایسا ہوا کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ اور کھٹ "بچہ"۔ مگر بچّے کا لفظ کہنے سے پہلے ہی اس نے اپنی زبان دانتوں میں بھینچ لی۔ اور عنبر شرم سے سمٹ کر رہ گئی۔

اور خورشید جہاں جنہیں بیٹی کی شادی ہونے کی خوشی تو بہت ہوئی تھی مگر دل میں اس بات پر بڑا ملال ہو رہا تھا کہ زندگی کی پہلی خوشی کے موقع پر ان کی تقدیر نے انہیں شریک ہونے سے محروم رکھا تھا۔ ایک گہرا سانس کھینچنے کے بعد بولیں۔

"چلو۔ خوش رہو۔ شاد و آباد رہو۔ خدا تمہاری جوڑی بنائے رکھے اور زمانے بھر کی خوشیوں سے نوازے۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو"۔

"بس بس۔ امّی بس۔ اب یہ اتنے آگے کی دعائیں آئندہ کے لیے رکھیے"، چھوٹی نے شرماتی لجاتی عنبر کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ زیور کیا تمہاری ساس نے تمہیں پہنایا ہے"، خورشید جہاں نے بھی مسکرا کر بات پلٹی اور اس کے زیورات کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں یہ تو صرف میری طرف سے ہے۔ اماں بیگم نے تو اپنا آدھے سے زیادہ زیور ان کے لیے اپنے پاس رکھ رکھا ہے۔" سعد نے فوراً ہی بتایا۔

"ہاں خدا اسے پہننا نصیب کرے اور تمہیں پہنانا۔ یہاں تو بیٹے ہم کسی قابل ہی نہیں ہیں۔ صرف خالی خولی دعائیں ہی دے سکتے ہیں۔ ہماری تو اتنی حیثیت بھی نہیں کہ اپنے اکلوتے اور پیارے داماد کے ہاتھ پر چند سکے سلامی کے ہی رکھ سکیں۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں پھپھو جان۔ کیا آپ کا داماد بن کر میں آپ کے لیے غیر بن گیا ہوں۔ میرے لیے تو آپ کی دعائیں ہی سب سے بڑا سرمایہ ہیں اور میرا سب کچھ میری عنبر کا ہے۔ حتیٰ کہ میں خود بھی ان کا ہوں۔" سعد ان کی باتوں پر آزردہ سا ہو کر بولا۔

"جی ہاں، امی، ہمیں تو بس آپ کی دعائیں ہی درکار ہیں۔ اور آپ کا مشفق سایہ۔"

عنبر اور بھی نہ معلوم کیا کیا کہتی رہی۔ اور ادھر چھوٹی خوشی سے دیوانی ہو کر باہر بھاگی اور ہمسائی کے یہاں پہنچ کر انہیں آوازیں دے دے کر کہنے لگی۔

"روشن خالہ! روشن خالہ آپا اپنے دولہا کے ساتھ آئی ہیں۔ سچ بڑی پیاری لگ رہی ہیں۔ یہ ڈھیر سا زیور پہنے۔" اور اندر عنبر کو اشارے سے اپنے پاس بلا کر سعد نے آہستہ سے کہا۔

"اب جلدی سے چل کر نکاح پڑھوا لیجیے ورنہ کہیں یہ ڈراما بازی اُلٹی میرے گلے نہ پڑ جائے۔ یوں بھی قاضی صاحب ہماری راہ دیکھتے دیکھتے سوکھ گئے ہوں گے۔"

"اوہو مگر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ اگر قاضی صاحب انتظار بھی کر رہے ہیں تو تھوڑی دیر اور کر لیں گے۔ پہلے میں اپنے اکلوتے بھائی سے تو مل لوں۔" عنبر نے اس سے نگاہیں کتراتے ہوئے کہا۔

"بھائی سے آپ نکاح کے بعد بھی مل سکتی ہیں۔ بس آئیے اب دیر نہ کیجیے اور جلدی سے چلی چلیے۔" سعد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو اس نے شرما کر جلدی سے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور پھر پلٹ کر ماں سے بولی۔

"امی، ان کی اماں بیگم کا فون آنے والا ہے۔ بس ہم ان سے بات کر کے ابھی آتے ہیں۔ آپ عذیر کو گھر میں روکے رکھیے گا۔"

اور پھر ماں کو کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ اور جلدی سے ماں کے گلے لگ کر ان کی گردن کو چوما۔ پھر انہیں خدا حافظ کہتی سعد کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ اور ان کے جاتے ہی پلنگ پر ہی سجدے میں گر کر خورشید جہاں رو رو کر خدا کا شکر ادا کرنے لگیں۔

****